DUE DATE

*Acc. No.*____________________

/ine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book
/- per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

ڈاک کے [illegible]

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مارچ ۱۹۴۰ء

جلد ۱۹ تصاویر:- ۱-پھر اس انداز سے بہار آئی ۲-لب ساحل نمبر ۳

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

[illegible] صلاح الدین احمد ایڈیٹر و پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ ادبی دنیا [illegible] لاہور سے شائع ہوا

دُنیائے کاروبار

آروند ملز احمد آباد

ہندوستان بھر میں کپڑے کی ساخت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اگرچہ کانپور وغیرہ میں بھی اس صنعت کے کارخانے ہیں لیکن احمد آباد کو اس سلسلے میں ہندوستان کا مانچسٹر کہنا بجا نہ ہوگا۔ جتنی ملیں یہاں ہیں ہندوستان کے کسی صوبے اور شہر میں نہیں۔ ان ملوں میں ہندوستانی ضروریات سے کپڑا تیار ہوتا ہے۔ جو ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچتا ہے۔

اروند ملز احمد آباد کو ان تمام ملوں میں ایک خاص امتیازی درجہ حاصل ہے۔ جہاں فنی نقطہ نگاہ سے کپڑا بنانے کے لئے بہترین ماہرین فن کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اروند ملز میں کپڑے کی ساخت میں جس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کپڑے میں ذوق ترتیب ہندوستانی معاشرت کے لباس کی نوعیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور قیمت کے اعتبار سے بھی اس کا نرخ عوام کی مالی حالت کے مطابق ہوتا ہے۔ اروند ملز کا انتظام نہایت اعلےٰ اور تجربہ کار لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی خصوصیات کے پیش نظر اروند ملز اپنے کپڑے کو ہندوستان کے ہر قصبے اور شہر میں پہنچانے کے لئے ہر قسم کا اشتہار دیتی ہے ہم ناظرین کرام سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرور اروند ملز کے کپڑے آزمائیں۔

لٹن واچ کمپنی کلکتہ

گھڑیوں کی دنیا میں کلکتہ کی لٹن واچ کمپنی ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ صحیح وقت کے علم کی ضرورت نہ صرف کاروبار بلکہ سوشل زندگی کے لئے بھی ضروری ہے۔ لٹن واچ کمپنی کی گھڑیاں ہندوستانی عوام کی جیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بالکل مناسب قیمت کی ہوتی ہیں اور صحیح وقت دینے کے اعتبار سے بھی بہت قابل تعریف ہیں۔ ان گھڑیوں میں مشینری کی ساخت بہت قابل تعریف عنصر ہے۔ جس پر ان کے صحیح وقت دینے کی صلاحیت کا دارومدار ہے۔

ان گھڑیوں کی مختلف خصوصیات ناظرین ادبی دنیا کی خدمت میں متعدد دفعہ پیش کی جا چکی ہیں۔ اس لئے ہم ان کے استعمال کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

ایم۔ اے۔ جے۔ نوبل

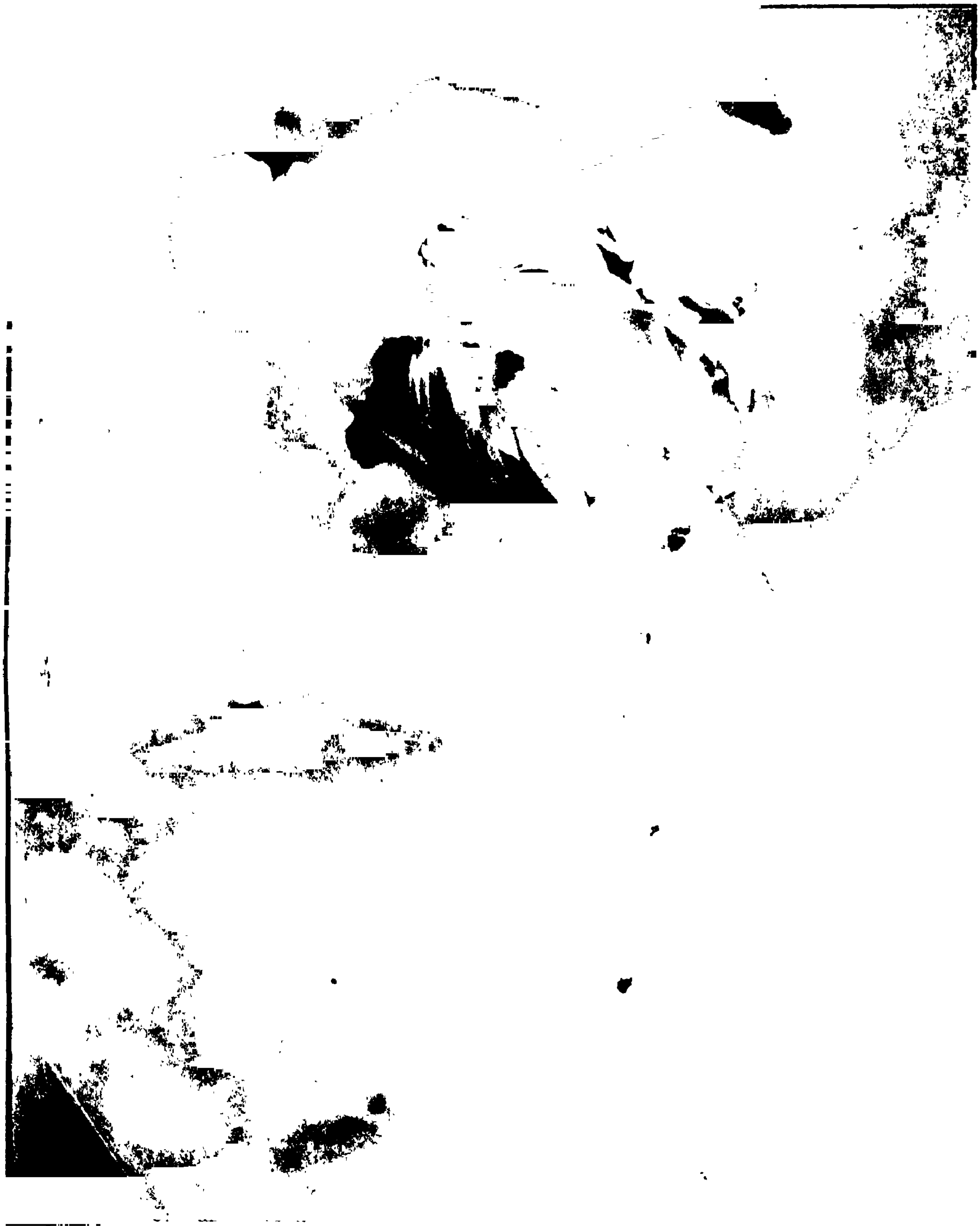
ادبی دنیا کے بمبئی کے مشتہرین میں میسرز ایم اے جے نوبل اینڈ کمپنی بہت پرانی کمپنی ہے۔ کمپنی ہذا کی ادویات بہت مدت سے ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

یہ ادویات فائدے کے اعتبار سے بہت بے نظیر ہیں اور ہندوستان بھر میں مقبول ہو چکی ہیں۔ یہ چار ادویات ڈرائیگو۔ گلائیکو تھائمولین۔ نوبل انفی بلورائیڈ اور آنٹیپکس ہیں۔ اور شہرہ آفاق حیثیت رکھتی ہیں۔

ان خصوصیات کی بنا پر ہم ناظرین ادبی دنیا سے ان کے استعمال کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

کتب خانۂ ادبی دنیا

ادبی دنیا نے اب اپنی خدمت زبان وادب کے دائرے کو وسیع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس سلسلے میں کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور باقی اشاعت کے مختلف مرحلوں سے گذر رہی ہیں۔ امید ہے کہ اردو دان حضرات علم وادب کی خدمت کے اس اقدام کو لبیک کہیں گے اور عملی طور پر اپنی ہمدردی کا ثبوت دیں گے۔ کتب خانہ ادبی دنیا کی کتب کے خریدنے سے آپ ہندوستان کے مقبول ترین رسالے کے استحکام میں بھی حصہ لیں گے۔



پھر اِس انداز سے بہار آئی !



لبِ ساحل

بزمِ ادب

بہت سے احباب نے ہماری درخواست کے بغیر سالنامہ کے متعلق اپنی قیمتی آرا کا اظہار فرمایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی رائیں خلوص اور صداقت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ہم درحقیقت اپنی کوششوں کو وہ درجہ نہیں دیتے جو احباب کا حسنِ ظن اُنہیں بخشتا ہے۔ منزل ابھی دور ہے اور کاروانِ اُردو کی رفتار عوام کی عملی ناقدری کے طفیل نہایت سُست۔ اس لئے اس عالمِ یاس میں احباب کی حوصلہ افزائی ہی ہمارا اکیلا سہارا ہے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ اس سہارے پر ہم ناسازگار حالات کا کب تک مقابلہ کر سکیں گے۔

اگر یہاں ان تمام آرا کو درج کیا جائے تو بہت سی جگہ درکار ہوگی۔ جو ہمیں میسر نہیں اور درج نہ کیا جائے تو کمال درجہ ناشکری ہوگی۔ اس لئے ہم نے احباب کے گرامی قدر ارشادات سے محض چند سطور کا انتخاب کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

برادر عزیز **شاہد احمد** صاحب مدیر ساقی لکھتے ہیں:۔ "اُردو کی حریف زبانوں میں جن میں ہم انگریزی کو بھی شامل کر سکتے ہیں اس سالنامہ کا جواب نہیں ملتا۔ کرشن چندر کا طویل افسانہ اور میرا جی کا علمی مضمون خاص طور پر مستحقِ مطالعہ ہیں۔ رنگین تصویروں سے اعلیٰ درجہ کا مذاقِ حُسن ظاہر ہوتا ہے۔ مدیرانِ ادبی دُنیا مستحق مبارکباد ہیں اور ان کی ہمت لائق داد ہے کہ محض صحافتِ اُردو کی ترقی کے خیال سے اُنہوں نے اتنی مالی زیرباری گوارا کی"

سید **علی منظور** صاحب ارشاد فرماتے ہیں:۔ "آپ کی سعی مشکور کو سالنامۂ ادبی دنیا کے روپ میں دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اتنا ضخیم رسالہ اور اتنا دل آویز اور مقامِ لائق دید ہے۔ یعنی ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست"

اُپندر ناتھ صاحب **اشک** مدیر پریت لڑی رقمطراز ہیں:۔ "آپ نے سالنامہ نکال کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ اسے کوئی دوسرا توڑ سکے گا، مجھے اُمید نہیں۔ آپ ہی اسے توڑیں تو توڑیں۔ محترمہ عصمت کی کہانی بے حد اچھی ہے۔ دوسری کہانی جو مجھے بہت اچھی لگی دھرم پرکاش آنند کی ہے، مگر میں کہتا ہوں کون سی اچھی نہیں۔ آپ کی محنت، ہمت اور شناخت کی جتنی داد دی جائے کم ہے"

جناب **باقی صدیقی** فرماتے ہیں:۔ "نظم و نثر کا بلند معیار نفاستِ فکر اور مذاقِ سلیم کا آئینہ دار ہے"۔

مرزا **عظیم بیگ** صاحب چغتائی لکھتے ہیں:۔ "سالنامہ کو اس شان سے شائع کرنے پر زبردست مبارکباد دیتا ہوں"۔

علی احمد صاحب خلف نواب فصاحت جنگ **جلیل** کا ارشاد ہے کہ "سالنامہ نہایت دیدہ زیب اور اپنی جملہ خصوصیتوں کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے"

جناب **اشرف صبوحی** نے فرمایا:۔ "گرانی اور کساد بازاری کے باوجود آپ نے سالنامہ کی روایات قائم رکھنے کی جو کاوش کی ہے وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے"

جناب **ناکارہ** حیدر آبادی رقمطراز ہیں:۔ "سالنامہ کے متعلق حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ آپ کی ہمتوں کی بلندی کی داد کوئی کور ذوق ہی ہوگا، جو نہ دے"۔

ماہر القادری صاحب فرماتے ہیں:۔ "میں سمجھتا ہوں کہ سالنامہ ۱۹۳۹ء کا ادبی شاہکار ہے۔ اس زمانے میں اتنے ضخیم حسین اور متنوع شمارہ کا نکالنا ادبی کرامت ہے"۔

محمد فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ "سالنامے کی ظاہری و باطنی دل آویزی اور رنگینی پر کچھ لکھنا سورج کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔ اُردو ادب آپ کی کاوشوں کا ہمیشہ رہینِ منت رہے گا"۔

ابو محمد امام دین صاحب لکھتے ہیں:۔ "دنیائے ادب کی تمام منتخب اور بہترین چیزیں اس سالنامے میں بدرجۂ اتم و اکمل مہیا ہیں"۔

اندرجیت صاحب شرما فرماتے ہیں۔ "مضامین ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں، کس کس کی داد دی جائے۔ کرشن چندر کا افسانہ، ظہیر الدین احمد کا تنقیدی مضمون۔ میرا جی کا یہودی شاعر اور قیوم نظر کا "سالِ گذشتہ" اُردو علم و ادب میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں"۔

دھرم پرکاش صاحب آنند رقمطراز ہیں:۔ "عصمت چغتائی کی کہانی تو اتنی اچھی ہے کہ اگر میں لکھنے کے معاملے میں اتنا سست نہ ہوتا تو اُن کو ایک مبارکباد کا خط ضرور لکھ دیتا۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ کی کہانیوں کو میں نے وقت کی قلت کے باوجود دو دو بار پڑھا ہے۔ اور اُپندر ناتھ اشک کی نظم "کونپل" کونپل ہی کی طرح نازک اور نفیس ہے"۔

سہیل عظیم آبادی صاحب: "میں ایسا کامیاب سالنامہ شائع کرنے پر آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔"

ڈاکٹر محی الدین صاحب زور قادری ارشاد فرماتے ہیں: "میں نے محسوس کیا کہ ادبی دنیا کا سالنامہ اس سال کا بہترین سالنامہ ہے۔ تعجب ہے کہ آپ کے ادارے پر جنگ کے اثرات نہیں۔ آپ نے رنگین تصویروں میں چغتائی کی تصویر بہت پسند آئی۔"

سعید احمد صاحب اعجاز لکھتے ہیں: "حیرت ہے کہ ملکی ادبی مضامین کی داد دیجیے یا افسانوں اور ڈراموں کی لطیف فن کاری کو سراہیے یا بیش قیمت تصاویر کے نگارخانے میں کھو جائیے۔ ادبی دنیا اردو ادبیات کا ایک نہایت خوش رنگ پھول ہے جو سال بہ سال نو بہ نو رنگ سامانیوں کے ساتھ کھلتا ہی جا رہا ہے۔ اس میں شگفتگی بھی ہے اور تازگی بھی اور تازہ پاشی بھی۔"

احمد ندیم صاحب قاسمی فرماتے ہیں: "اس سالنامے سے پہلے سالنامے کو میں آپ کی کوششوں کی معراج سمجھتا تھا، لیکن اب مجھے احساس ہوا ہے کہ صحیح ادب کی آخری منزل کوئی نہیں۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، میراجی، حمید احمد خاں، ن م راشد اور عدم کی زبان زندہ رہے گی اور رہتی دنیا تک زندہ رہے گی۔"

شبیر حسن صاحب رقمطراز ہیں: "حقیقت سے دور نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ آپ کا سالنامہ دیکھ لینے کے بعد یہ معلوم کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ایک سال کے اندر اہل قلم حضرات نے اردو ادب کو کتنی ترقی دی ہے۔ آپ کے حسن ترتیب اور حسن انتخاب نے خالص علمی مضامین اور ادب لطیف کے امتزاج سے سالنامہ کو خاص و عام دونوں کے لئے دلچسپ بنا دیا ہے۔"

جناب اختر انصاری تحریر فرماتے ہیں: "غالباً یہ کہنا کہ ادبی دنیا کا یہ خاص نمبر ایک بے مثل چیز ہے۔ ایک فرسودہ سی بات ہوگی۔ ملک کے ادبی حلقوں میں یہ امر ایک امر مسلمہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ ادبی دنیا کا سالنامہ ادب اور آرٹ کا ایک عدیم النظیر مرقع ہوتا ہے۔"

جناب سادھو رام صاحب تاجور سامری لکھتے ہیں: "سالنامہ شروع سے آخر تک پڑھ چکا ہوں لیکن ابھی طبیعت نہیں بھری۔ کرشن چندر کا افسانہ ایک بالکل نئی چیز ہے۔ میں خود اب تک اس کی فضا میں کھویا ہوا پاتا ہوں۔ عصمت صاحبہ ایک جدید طرز کی موجد ہیں۔ مستقبل میں ان کی ذات سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔"

تو یہ ہیں چند گرامی قدر آرا کے خلاصے۔ امید ہے کہ آپ انہیں پڑھ کر مسرور ہوں گے کہ ادبی دنیا کی کامیابی آپ کے ذوق ادب کی رہین ہے۔

موجودہ نمبر کے مضامین میں دو خاص چیزیں ہیں۔ ممتاز مفتی صاحب کا "اندھیرا" اردو میں ایک جدید قسم کا افسانہ ہے اور ممتاز مفتی صاحب کے فلسفیانہ انداز نگارش کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ زندگی کے اندھیرے میں ہم لوگ پتلوں کی طرح اپنا پارٹ ادا کر کے آگے روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے جذبات اور احساسات، ہماری حرکت اور سکون، ہمارا اٹھنا بیٹھنا، ہمارا ہنسنا اور رونا یہ سب کچھ ایک میکانکی عمل کی طرح ہم سے سرزد ہوتا ہے۔ ہمارے دل رو رہے ہوں لیکن لوگوں کے سامنے ہم مسکرانے پر مجبور ہیں۔ ہم اپنے انفرادی جذبات و خیالات کے لحاظ سے خواہ کیسے ہوں مگر دنیا کے نزدیک ہمیں ایک مقررہ ظاہری صورت اختیار کرنا ہوتی ہے۔ پھر اس وحشت انگیز اور تاریک ماحول میں اگر کبھی کبھار روشنی کی وہ کرن ہمیں اس ذہنی حالت میں مبتلا کر دیتی ہے جو عورت کے تبسم سے پھوٹتی ہے۔ تو ہم اسی طرح مجبور ہیں جس طرح مفتی صاحب کے افسانے کے پتلے۔

یادش بخیر ہمارے عزیز دوست مالک رام صاحب ایم اے آج کل مصر میں مقیم ہیں اور وہاں وطن کی اور محبوب چیزوں کی طرح ادبی دنیا کو بھی یاد رکھتے ہیں اس دفعہ ان کا ایک بہت اچھا مضمون شائع ہو رہا ہے جو اگرچہ مرزا اسد علی کی کتاب "قیس اور غالب" کی بعض غلط بیانیوں کا جواب ہے، لیکن درحقیقت غالبیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ غالب سے دلچسپی لینے والے حضرات میں سے اگر کوئی صاحب اس کا جواب لکھیں تو ہمیں اس کی اشاعت میں کوئی اعتراض نہ ہوگا بلکہ خود مالک رام صاحب کی بھی یہی خواہش ہے۔

سالنامہ کے سلسلے میں جن افسانوں اور مضامین پر ہدیے پیش کئے جا رہے ہیں اُن کا اعلان کہیں اور ملے گا۔ یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ سالنامے کا افسانوی حصہ بہت زیادہ پسند کیا گیا تھا، اس لئے تمام افسانوں اور ڈراموں کو انعامی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ البتہ ہمارے دوست کرشن چندر صاحب نے غالباً کسی مصلحت کی بنا پر، ہمیں اپنا نام اس فہرست میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ان کی اس دست برداری کا ہمیں افسوس ہے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

پچھلے مہینے حصۂ نظم میں سلام مچھلی شہری کی ایک نظم "ملاح کی بیوی" شائع ہوئی تھی۔ بعض لوگوں نے اس نظم کو سرقہ خیال کیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے پیشتر جنوری ۱۹۳۶ء میں "ادبی دنیا" ہی میں تخت سنگھ کی ایک نظم "ماہی گیر کی بیوی" کے عنوان سے چھپی تھی۔ میں نے دوسری نظم کی اشاعت سے پہلے پہلی نظم نہ دیکھی تھی۔ اور اگرچہ سلام مچھلی شہری نے پروفیسر فراق گورکھپوری کے سمجھانے پر یہ کہہ کر مجھے نظم کی اشاعت روکنے کے لئے لکھ دیا تھا کہ اس قسم کی کوئی نظم دوسری جگہ شائع ہو چکی ہے لیکن جب ان کا خط پہنچا تو فروری کا شمارہ پریس میں تھا۔ میرے خیال میں غالباً دونوں نظمیں کسی انگریزی نظم کا ترجمہ ہیں کیونکہ اردو شعراء کے لئے ساحلِ سمندر کی دوری کے باعث ماہی گیر کی بیوی اور اس کے جذبات ایک دور ہی کی بات ہیں۔ برعکس اس کے مغرب کی زندگی میں ایسے تصورات ایک لازمہ بہرحال اگر میرا خیال صحیح ہے تو ایک ہی مغربی نظم کے ان دو ترجموں میں توارد کی ایک دلچسپی یہ بھی ہے کہ تین مصرعے یکساں ہو گئے ہیں۔ باقی نظم مفہوم میں یک رنگ لیکن الفاظ میں مختلف ہے۔

یہ شمارہ مارچ کا ہے۔ بسنت آچکی ہے۔ اور شاعروں کے دلوں میں معلوم نہیں کیسے کیسے خیالات اور جذبات کی لہریں کروٹیں لے رہی ہوں گی۔ ممکن ہے کہ کوئی انفرادی شاعر میر تقی کا ہمنوا ہو کر کہہ رہا ہو کہ "دھوم ہے پھر بہار آنے کی۔ کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی" یا شاید حفیظ جالندھری کی زبان میں یہ پیغام دینے کو تیار بیٹھا ہو کہ "یہ دامن ہے یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں، موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا"۔

لیکن اندرجیت شرما ادبی دنیا کا مستقل نغمہ خواں ہے۔ اور بسنت کی دیوی کے چرنوں میں ایک احساسِ ستائش کی بھینٹ چڑھانے کو تیار ہے۔ مناظرِ قدرت سے ایسا احساسِ ستائش آریاؤں کے وقت سے ہندوستانیوں کی فطرت کا خاصہ ہے۔ اگرچہ اس نظم کی ہیئت گیت کی نہیں، لیکن موضوعی لحاظ سے نیز اپنی ایک اندرونی خاصیت کے باعث (جو شاید مجھی کو محسوس ہوتی ہو) اس میں گیت کا ایک ایسا بہاؤ ہے جس نے میرے دل کو رقص میں لا دیا اور میرے ذہن کو شاداں اور مگن کیفیتوں سے بھر دیا۔ اور میں کہوں گا کہ آپ بھی (اگر گا سکتے ہوں تو) اسے گا ہی کر پڑھیں"۔

بسنت کے اس چھلکتے ہوئے نغمے کے بعد اگر میں ایک اس سے بالکل مختلف چیز کا ذکر کروں تو اسے محض تضاد پرستی تصور کیا جائے "خاکبازی" میں امین حزیں کا فلسفیانہ اندازِ نظر پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اگرچہ اس کے ہر مصرعے پر ابہام کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن یہی ابہام ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کس شدت سے تفکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اگرچہ اس کا موضوع صرف خاک، خاکی، خاکبازی ہی ہے لیکن اس کی نظر میں مقابلے کے لئے اس تحریکِ شعری کے وقت نظامِ شمسی تو کیا، نظامِ قدرت کی تمام کائناتیں ہیں۔ اس نظم کے متعلق ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ترقی پسند کلام کے لئے ضروری نہیں کہ شاعری سے دست بردار ہوا جائے۔ شاعری ایک اندازِ نظر کا نام ہے۔ جس میں انفرادیت کا زور خود بخود لوگوں کو جگا سکتا ہے۔

سعید احمد اعجاز کی "دو نظمیں" اپنی ایک منفرد شان رکھتی ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ اختصار چین کا اثر ہے یا جاپان کا۔ البتہ اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ "دورِ خطابت" ایک جوہر ہے۔ جس کے پرکھنے کو نہ صرف جدید اردو شاعری کے ارتقا سے واقفیت ضروری ہے بلکہ دینیات، اور ارضیات و نجمیات میں سدھ بدھ بھی درکار ہے۔ دوسری نظم "ارادہ" پنجابی شاعری کا تاثر ہے اور اس بات کا ثبوت کہ پنجاب کے شاعر اپنے وطن سے دور رہ کر بھی اپنی وطنی روح کو برقرار رکھتے ہیں۔

تاجور سامری ہمیشہ اپنی نظم میں ایک مستقل فضا قائم کر دیتا ہے۔ اور اس کی یہ نظم بھی اس لحاظ سے استثنا نہیں ہے "اندھیری رات کے سناٹے میں"۔ اگر اس عنوان کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو نظم کے پہلے آدھے حصے میں وہ صرف منظر باندھتا ہے۔ پھر راہیں چپ چاپ آہیں بھرتی ہیں۔ ایسے مصرعوں سے وہ اپنی دلی کیفیت اور حزن و ملال کی طرف قاری کو غیر شعوری طور پر متوجہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ نظم کے مرکزی مقام تک پہنچ کر اپنے شاعرانہ کردار کو سامنے لے آتا ہے۔ اور پھر اس کی

دلی کیفیت کے بارے میں ایک آدھ بات کہہ کر اپنے ساز کو رکھ دیتا ہے۔ یوں اپنے موضوع کے لئے قاری کے ذہن کو تیار کرنے کا طریقہ ہی ایسی نظموں کی کامیابی کا راز ہوتا ہے۔

میراجی کی نظم "سنگ آستاں" میں ایک دو باتوں کی طرف بھی آپ کی توجہ درکار ہے۔ پہلی بات اس کا فنی پہلو ہے۔ آزاد نظم میں بھی قوافی کی کثرت غیر شعوری اور بے ساختہ طریق سے ہو سکتی ہے کہ اس کا اظہار اس نظم میں ہو رہا ہے۔ دوسری بات اس کے استعارے اور اشارے ہیں جن پر غور کئے بغیر اس کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ مثلاً استاد کے الجھنے کا جلوہ ہے سے مراد وہ پہلا منظر تخلیق ہے جب ایک ستارہ سورج کے قریب آیا تھا اور دونوں کی باہمی کشش سے سورج کا کچھ حصہ فضا میں بکھر کر ہمارے موجودہ نظامِ شمسی کی تخلیق کا باعث بنا۔ اسی طرح پیچیدہ جنگل، تاریک غار، گوہر مقصود۔ ان سب کے متعلق مطالعے سے پیشتر تعین مفہوم کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ اور تیسری بات نظم کے پانچویں مصرعے میں ہے جہاں لکھنے والے نے محبوب کو استعارات کے ساتھ لایا ہے۔ یعنی صیغۂ مذکر میں مخاطب کیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ لکھنے والے کو مدنی احساس تذکیر و تانیث نہیں ہے وہ نر اور مادہ کے بنیادی تصور کو نگاہوں میں رکھے ہوئے ہے۔

میراجی

مضمون نگار حضرات سے

بعض مضمون نگار حضرات نے فروری کا شمارہ نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے اس لئے جن اصحاب کو یہ نمبر نہیں ملا وہ دفتر میں اطلاع دے دیں تاکہ انہیں پرچہ دوبارہ بھجوا دیا جائے۔

مینجر

سالنامے کے انعامات

نظیر اکبر آبادی — جناب ظہیر الدین احمد — منصور گولڈ میڈل

(عطا کردہ ملک عطاء اللہ حکیم)

۱۔ مہدی الافادی الاقتصادی کا اسلوب نگارش	جناب احمد صدیق مجنوں گورکھپوری	پندرہ روپے
۲۔ شادی	محترمہ عصمت چغتائی	گیارہ روپے
۳۔ کونپل	جناب اُپندر ناتھ اشک	دس روپے
۴۔ شعر کی بھوک ہڑتال	جناب ناکارہ حیدرآبادی	دس روپے
۵۔ نفرت	جناب ممتاز مفتی	دس روپے
۶۔ یہ بھی۔ وہ بھی	جناب دھرم پرکاش آنند	دس روپے
۷۔ چھوکری کی لوٹ	جناب راجندر سنگھ بیدی	دس روپے
۸۔ تاثر	جناب شاہد احمد	دس روپے
۹۔ دیہاتی لڑکی	جناب طاہر قریشی	سات روپے
۱۰۔ بستر پر	جناب محمد صادق قریشی	سات روپے
۱۱۔ تیسری بہن	جناب فاروق علی خاں	دس روپے

حصہ نظم

۱۲۔ بے کراں رات کے سناٹے میں	جناب ن۔ م۔ راشد	سات روپے
۱۳۔ سپاہی کی واپسی	جناب احمد ندیم قاسمی	پانچ روپے
۱۴۔ نسیم شوق (غزل)	جناب روش صدیقی	پانچ روپے
۱۵۔ غزل	جناب ماہر القادری	پانچ روپے

اس ماہ کے ہدیے!

۱۔ قتیل اور غالب	(مضمون)	دس روپے
۲۔ اندھیرا	(افسانہ)	دس روپے

آئینۂ عالم

روس، جرمنی اور فن لینڈ

پچھلے سال سے یورپی سیاست ایک ایسا معمّہ بن کر رہ گئی ہے۔ جس کا حل کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اس معمّے کا بنانے والا ایک ہٹلر ہے۔ اور دوسرا جوزف سٹیلن یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ان دونوں کا ملاپ صرف سطحی اور عارضی ملاپ ہے۔ لیکن اس سطحی اور عارضی ملاپ نے دنیا کو ایک ایسی جنگ میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس کا انجام وہ خود بھی نہیں جانتے۔ جرمنی اور روس دونوں باقی یورپی طاقتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ اور ان دونوں کو باقی طاقتوں نے اس طرح دبایا ہوا تھا کہ انہیں اپنی اپنی طاقت بڑھانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

اٹلی حبشہ اور البانیہ کو نگل چکا تھا۔ جاپان چین کو ہڑپ کر رہا تھا۔ برطانیہ اور فرانس کے پاس پہلے ہی ضرورت سے زیادہ علاقے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر جرمنی کو آگ کیوں نہ لگتی۔ ہٹلر نے پہلے تو آسٹریا اور چیکوسلوویکیہ سنبھالا اس کے بعد اس کی نظر پولینڈ پر پڑی ادھر جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی آنکھیں بھی کھول دیں۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر آئندہ جرمنی اپنی طاقت کے ذریعے سے کسی ملک کو دبوچنے کی کوشش کرے گا تو اس صورت میں اسے ہوش میں لانا ضروری ہوگا۔ جرمنی کو شک سا ہو گیا تھا کہ ممکن ہے مغربی جمہوریتیں اس کی اس خواہش کو کہ وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس حاصل کرے۔ پورا نہ ہونے دیں اس لئے اسے روس سے گانٹھنے کی سوجھی۔ وہ جانتا تھا کہ روس بھی برطانیہ، فرانس امریکہ، جاپان، اور اٹلی سے سخت بیزار ہے۔ اور وہ جرمنی کی مدد حاصل کرنے کے لئے کچھ قربانی پر بھی تیار ہو جائے گا۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔

وہی روس جو لیگ آف نیشنز کا زبردست حامی تھا۔ اور کمزور طاقتوں کو بچانے کے لئے برطانیہ اور فرانس سے زیادہ بیقرار نظر آتا تھا۔ اسی روس نے پولینڈ کی تباہی کی داستان سنی لیکن کان بند کر لئے۔ اُسے اجڑتے ہوئے دیکھا لیکن خاموش رہا۔ پولینڈ کے دو حصے کئے گئے۔ ایک تو جرمنی نے سنبھال لیا۔ اور دوسرا وہ حصہ جس پر ایک زمانے میں روس قابض رہ چکا تھا روس میں شامل کر لیا گیا۔

اب سٹالین کی دوربین نگاہوں نے دیکھا کہ اگر وہ فن لینڈ کو اپنے قبضے میں لینے میں کامیاب ہو جائے تو اس سے نہ صرف روس کا ہی ایک پہلو محفوظ ہو جائیگا۔ بلکہ سویڈن، ناروے اور چند ایک اور طاقتیں اس کے زیر اثر آ جائینگی۔ چنانچہ

اکتوبر کو مولوٹاف نے فن لینڈ کو ان الفاظ میں دھمکی دی "روس چاہتا ہے۔ کہ فن لینڈ اس کے ساتھ ایک دوستانہ معاہدہ کرے اگر ایسا نہ ہو سکا تو وہ مجبور ہو جائے گا کہ ضرورت کے مطابق کوئی قدم اٹھائے۔

۱۷ اکتوبر کو فن لینڈ سے مطالبہ کیا گیا کہ اپنے نمائندۂ خصوصی کو بات چیت کرنے کیلئے روس بھیجے۔

۱۹ اکتوبر ڈاکٹر پیاسے کوی (Paasikivi) فن لینڈ کی شرائط لیکر روس روانہ ہو گیا۔

۹ اکتوبر سے یکم نومبر تک دونوں حکومتوں میں تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔

یکم نومبر کو فن لینڈ کے وزیر خارجہ نے ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ فن لینڈ یہ کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ کہ اپنی حفاظتی تدابیر کو چھوڑ دے اور فن لینڈ کو ایک ایسا چبوترہ بنا دے جس پر چڑھکر کوئی دوسری طاقت کسی اور پر حملہ کرنے کا کام لے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس نے لینن گراڈ کو زیادہ محفوظ بنانے کے لئے روس کی مدد کرنے کا وعدہ دیا۔

۱۲ نومبر۔ روس میں ایسے بیانات اخبارات میں نکلنے شروع ہو گئے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ روس فن لینڈ پر حملہ کرنے کے بہانے تلاش کر رہا ہے، ایک روسی اخبار میں یہ مضحکہ انگیز خبر شائع کی گئی کہ فن لینڈ روس پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے جسے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک چیونٹی ایک پہاڑ سے ٹکرانے کے لئے جا رہی ہے۔

۲۸ نومبر۔ روس نے اقدام جنگ نہ کرنے کا معاہدہ منسوخ کر دیا

۲۹ نومبر ۱۹۳۹ء کو مسٹر مالوٹوف نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا۔ ہم فن لینڈ کی اندرونی حکومت میں کسی قسم کا دخل نہیں دینا چاہتے۔ ہم نہیں چاہتے کہ فن لینڈ اپنی سرزمین دوسروں کی چھاؤنی بنائے۔ لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ فن لینڈ ہمارے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے۔ دراصل روس کا خیال تھا کہ فن لینڈ اگرچہ بہت چھوٹی سی ریاست ہے۔ لیکن وہ بہت سے دشمنوں کے لئے ہمارے ملک میں داخل ہونے کے لئے ایک گذرگاہ کا کام دے سکتی ہے۔

اس سے پہلے ہی فن لینڈ نے حفاظتی تدابیر اختیار کرلی تھیں لیکن فن لینڈ والے ابھی تک اس خیال میں تھے کہ روس انہیں محض ڈرا رہا ہے انہیں امید تھی کہ روس ۱۹۳۲-۳۳ء کے معاہدۂ عدم اقدام جنگ کا ضرور کچھ خیال رکھے گا۔ اس معاہدہ کو ۱۹۴۵ء تک رائج رہنا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں ملکوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ ۱۹۴۵ء تک اپنے تمام باہمی جھگڑے آپس کی گفت و شنید سے طے کریں۔ اس کے علاوہ فن لینڈ کی اس غلط فہمی کی ایک اور بھی وجہ تھی اور وہ یہ کہ باقی تمام دنیا کی طرح وہ اس مغالطے میں مبتلا تھا کہ روس جرمنی کی دوستی پر زیادہ اعتبار نہیں کرے گا۔ روس کو ابھی ۱۹۱۸ء کا وہ واقعہ یاد تھا جب جرمن فوجوں نے روسی فوجوں کو بری طرح فن لینڈ سے باہر نکالا تھا۔ روس کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ ۱۹۱۹ء میں جرمنی کی مدد کی وجہ سے ہی فن لینڈ نے ایک آزاد ملک کی حیثیت حاصل کی تھی۔ فن لینڈ کو یہ جاننا چاہیئے تھا کہ ۱۹۱۸ء کے جرمنی اور ۱۹۴۰ء کے جرمنی میں زمین آسمان کا فرق آچکا ہے۔ اور یہی حال روس کا ہے۔

۳۰ نومبر کو اچانک روسی ہوائی جہازوں نے فن لینڈ پر گولے برسانے شروع کر دیئے۔ روسی فوجیں فن لینڈ کے برفانی علاقوں میں بڑھنی شروع ہوگئیں اور روس نے ایک ایسی جنگ شروع کر دی جسے نہ صرف برطانیہ اور فرانس نے بلکہ امریکہ، اٹلی اور سویڈن نے بھی ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ ممالک نہ صرف روس کے اس وحشیانہ حملے کی مذمت کر رہے ہیں بلکہ فن لینڈ کی ہر طرح سے مدد بھی کر رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ننھی سی حکومت اپنے سے ساٹھ گنا بڑی طاقت کا نہایت بہادری سے مقابلہ کر رہی ہے۔

وارسا

دنیا میں چند ایک شہر ایسے بھی ہیں جن کی سرزمین ہمیشہ چالیس پچاس سال کے بعد خون سے نہانے کی متمنی رہتی ہے۔ اور قدرت بھی ان کی یہ خواہش ہمیشہ پورا کرتی رہتی ہے۔ ان شہروں میں سے ایک وارسا ہے جو پولینڈ کا دارالحکومت تھا۔ ۱۹۳۹ء سے پہلے یہ شہر بیسیوں بار تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ اور لاکھوں ہی انسان اسے فتح کرنے یا اس کی حفاظت کرنے میں اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ ۱۵۹۶ء میں پہلی بار وارسا پولینڈ کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابھی ۶۰ برس بھی نہ گذرے تھے کہ اسے ہوہنزولیرن خاندان کے ایک ممتاز رکن نے پامال کیا۔ حملہ آور کا مقصد چونکہ محض لوٹ کھسوٹ تھا۔ اس لئے وہ چند ہزار جانیں تلف کرنے اور مال و زر لوٹنے کے بعد چلتا بنا۔ مگر اہل وارسا نے دو چار سال کے عرصے میں ہی اپنی محنت اور ہمت سے شہر کی حالت پھر درست کرلی۔ اس کے بعد ۵۰ سال تک اس شہر میں امن و امان رہا۔ لیکن اس کے بعد اسے متواتر دو ایسی بلاؤں کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے یہ پر رونق شہر صحرا کی طرح بے رونق اور بے جان ہوگیا پہلے تو سویڈن کی فوجوں نے اسے بری طرح لوٹا اور ابھی اس لوٹ کو چند مہینے ہی گذرے تھے کہ پلیگ نے آن گھیرا۔ اور پلیگ کے ساتھ ہی قحط بھی آپہنچا۔ پھر کیا تھا۔ آبادی کا ۹۰ فی صدی حصہ موت کی نیند سو گیا قدرت نے وہ کچھ کر دکھایا جو بیرحم سے بیرحم دشمن بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے اس کے خاتمے تک وارسا کی بے جان لاش کو دو تین بار چیرا پھاڑا گیا۔ روس اور پرشیا نے انتہائی کوشش کی کہ اس بدنصیب شہر کا نقشہ اس طرح بگاڑا جائے کہ یہ پھر کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ ہوسکے۔ لیکن پولش جوانمردوں پر ان حوادث کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ۱۷۹۴ء میں بہادر پولوں نے روسی محافظ فوج کو شکست دے کر اسے مجبور کر دیا کہ وہ شہر چھوڑ کر چلی جائے۔ روسی نکل تو گئے مگر زیادہ عرصہ کے لئے نہیں۔ وارسا کی خوبصورتی اور مال و دولت نے انہیں مجبور کیا کہ دوسرے سال ہی وہ پھر ادھر کا رخ کریں اور اس دفعہ وہ اکیلے نہیں آئے بلکہ اپنے ساتھ پرشیا کی فوجیں لے آئے۔ ان دونوں فوجوں نے مل کر شہر پر قبضہ کرلیا۔ ہزاروں بے گناہ شہریوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ اس حملے کے کئی سال بعد تک بربادی، بیماری قحط یکے بعد دیگرے اس بدنصیب شہر کے مہمان بنے رہے۔

تنسیخ ۱۸۱۵ء کے معاہدے نے پولوں کی ایک بار پھر ہمت افزائی کی۔ وارسا کی آبادی سرعت کے ساتھ ترقی کرنے لگی۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد روسی سازشوں نے سے پھر آن گھیرا۔ مگر اس کے باوجود شہر کی آبادی جلد ہی ایک لاکھ چالیس ہزار تک جا پہنچی۔ ۱۸۶۳ء میں پولوں نے ایک بار پھر آزاد ہونے کی کوشش کی۔ وہ لگاتار ایک سال روسی فوجوں سے لڑتے رہے۔ بے شمار آزادی کے پرستار آزادی کی دیوی کی بھینٹ ہو گئے پھر بھی وہ دیوی کو خوش نہ کر سکے۔

اوین پیکویچ پولش فوجوں کو شکست دے کر شہر پر قابض ہو گیا اور اس نے مصیبت زدہ شہریوں پر ایسے ایسے ظلم ڈھائے کہ دنیا کی تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ شہر کا کونہ کونہ خون میں رنگ دیا گیا۔ شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو گا جس کے باہر لاشیں تڑپتی ہوئی نظر نہ آئیں۔ بچے بوڑھے۔ عورتیں بے دریغ قتل کر دی گئیں۔ عورتوں کو ننگا کر کے بازاروں میں پھرایا گیا۔ لیکن مشکل سے تیس سال ہی گذرے ہوں گے کہ یہ شمع آزادی کے پروانے اپنی جانیں ہاتھوں میں لئے ایک بار پھر روسی فوجوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ کئی بار روسی سپاہی ان بھوکے، کمزور پولوں کے حملوں کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد تازہ دم روسی فوجیں پھر شہر کا محاصرہ کر لیتی تھیں۔ آٹھ مہینے کے کشت و خون کے بعد شہر پر روسیوں کا پھر سے قبضہ ہو گیا۔ اور پہلے کی طرح شہیدوں کے خون کی ندیاں گلی کوچوں میں چل نکلیں۔ لیکن یہ تمام جسمانی اذیتیں اور تکلیفیں پولوں کی آزادی کی خواہش کو دبا نہ سکیں۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی پولینڈ ایک بار پھر آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک اگرچہ بظاہر جرمن پولینڈ پر قابض رہے۔ لیکن اس عرصے میں بھی سوائے چند ایک بڑے شہروں کے باقی تمام پولینڈ آزاد تھا۔ اور ان بڑے شہروں میں سے ایک آفت کا مارا وارسا بھی تھا۔ جہاں جرمنوں نے بڑی مضبوطی سے پاؤں جما رکھے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں پولینڈ آزاد ملک قرار دیا گیا۔ لیکن روسی پہلے سے ہی تاک میں تھے۔ ان کے غول کے غول آئے دن پولینڈ کے کسی نہ کسی حصے پر حملہ آور ہونے لگے مگر ۱۹۲۰ء میں تو پولش فوجوں نے ان کے ایسے دانت کھٹے کئے کہ پھر انہیں اس طرف کا رخ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ان کی ہمت نے جواب دے دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ان کی جگہ جرمنی نے ڈنزگ اور کرائیڈر Corridor کا بہانہ تلاش کر کے اپنی توپوں کا منہ پولینڈ کی طرف پھیر دیا۔ وارسا کو یکبارگی توپوں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس شہر کے بہادر باشندوں نے ایک دفعہ پھر بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کو بھی اعتراف کرتے ہی بن پڑی۔ اہلِ وارسا نے موت کو غلامی پر ترجیح دی، اور ہنستے ہوئے جرمنی کی بے رحمی کی آگ میں جل گئے، لیکن پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیا۔ کئی دن تک جرمنی ہوائی جہاز نہتے شہریوں پر بمباری کرتے رہے جرمنی ٹینک اس آفت زدہ شہر کی دیواریں توڑتے۔ اور جرمن توپوں کے زہر آلودہ گولے لاکھوں، جوانوں، بوڑھوں بچوں اور عورتوں کو موت کے آغوش میں سلاتے گئے۔ آخر جانِ ناتواں کب تک مقابلہ کرتی۔ ایک وقت آ گیا کہ وارسا میں سوائے زخمیوں بچوں اور بوڑھوں کے کوئی نہ رہا۔ وارسائیوں کی عام قربانیاں اسے ان درندوں کے پنجوں سے نہ بچا سکیں۔ اور جرمن فوجیں کافی نقصان اٹھانے کے بعد آخر شہر پر قابض ہو گئیں۔

لیکن ہم آج بھی وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شہر زیادہ عرصہ غیر ہاتھوں میں نہیں رہ سکتا اور نہیں رہے گا پولوں کی نہ مٹنے والی ہمت ایک دفعہ پھر حملہ آور سے بدلہ لینے کے لئے شمشیر بکف ہو جائے گی۔ اور اپنے عمر رسیدہ معزز شاعر پیڈر وسکی Pedur... کے لئے ایک بار پھر ایسی فضا پیدا کر دے گی جس میں وہ پہلے کی طرح آزادی کے گیت گائے۔

عنایت احمد

شعر

یہ دامن ہے یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

(ابوالاثر) حفیظ جالندھری

بسنت کی دیوی

کیاشان ہے تری دیوی بسنت کی اب نام کو کہیں افسردگی نہیں
پھولا ہوا ہے بن خوش رنگ ہے چمن بیدار ہے جہاں ہشیار ہے جہاں
سبزے کا یہ نکھار پھولوں کی یہ بہار دل میں امنگ ہے ذرّوں میں جنگ ہے
دلکش ہیں قہقہے ہیں خوب چہچہے عالم پہ چھا گئی دیوی بسنت کی
کیاشان ہے تری دیوی بسنت کی

اے انبساطِ دل تو ہے نشاطِ دل
سرسوں کا راج ہے سونے کا تاج ہے سینے میں اب چمک جذبات میں بھڑک
چلتی ہے کیا ہوا اُڑتا ہے کیا طلا اونچی ہوا میں اُڑ رنگیں فضا میں اُڑ
پھولوں کی ساریاں کیسر کی کیاریاں تو ہے مری پری
رکھتی ہے دل کشی دیوی بسنت کی دیوی بسنت کی

اندرجیت شرما

قتیل اور غالب

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمک داں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خونِ دل — سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کئے ہوئے

۱۹۶۳ء کی گرمیوں کا ذکر ہے جب مجھے پہلی دفعہ خیال پیدا ہوا کہ غالبؔ کے سلسلے میں آج تک جو کچھ شائع ہوا ہے اسے جمع کیا چاہئے لا زماً سب سے پہلا کام "قاطع برہان" اور اس معرکے کی جملہ مطبوعات کو جمع کرنا تھا۔ میں نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بہادر کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ آپ کے یہاں کتب خانۂ حبیب گنج میں کون کونسی کتاب موجود ہے۔ اب یہ تو مجھے یاد نہیں رہا کہ "قاطع برہان" کے علاوہ انہوں نے کونسی دوسری کتاب کا نام لکھا تھا مگر اس کے ساتھ ہی تحریر فرمایا کہ یہ وقتی اور ہنگامی بحثیں تھیں اس لئے میں نے ان تمام کتابوں کو مہیا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

یہ رائے ہے اہلِ نظر کی اُن ایک درجن کتابوں اور رسالوں کے متعلق جو طرفین سے شائع ہوئے تھے اور جن کی اشاعت سے سات آٹھ برس تک ہندوستان بھر کے علمی اور ادبی حلقوں میں گویا ایک طوفان سا بپا رہا۔ اس لئے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب تھوڑے دن اُدھر مجھے معلوم ہُوا کہ دہلی سے ایک کتاب "قتیل اور غالب"[۱] شائع ہوئی ہے۔ کیونکہ قاطع برہان والے جھگڑے کی تو کچھ بنیاد بھی تھی قتیلؔ کے متعلق تو غالبؔ نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ لے دے کے ان کے خطوط میں دس پندرہ جگہ قتیلؔ کا ذکر ہے اور وہ بھی ان کے مخصوص طنز اور ظرافت کے انداز میں۔ نہ سنجیدگی سے کوئی اعتراض کیا ہے، نہ اُن کی کسی عبارت یا تحریر پر نکتہ چینی ہی کی ہے پھر یہ "قتیل اور غالب" کے موضوع پر کتاب کیسی! اور بالآخر جب میں نے یہ کتاب دیکھی تو یہ حیرت، افسوس اور تعجب کے جذبات میں تبدیل ہو گئی۔ افسوس مکتبہ جامعہ پر اور تعجب جناب اسد علی انوری فریدآبادی کی جرأت پر۔

جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے یہ کتاب دو حصّوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جس میں اُن موہوم اعتراضوں کا جواب دیا ہے جو مصنف کے خیال میں مرزا نے قتیلؔ پر کیے ہیں اور دوسرا وہ جو غالبؔ کی زندگی اور کلام پر اعتراضات اور نکتہ چینی پر مشتمل ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی زندگی پر صحیح اور غلط، جا اور بے جا جو اعتراض بھی آج تک کئے گئے ہیں یا کئے جا سکتے تھے وہ جناب اسد علی صاحب فریدآبادی نے اس میں درج کر دیئے ہیں اور مرزا غالب کے خلاف فردِ جرم اچھی خاصی طویل ہو گئی ہے۔ آپ بھی سن لیجئے:۔

۱۔ مرزا کی قصیدہ خوانی بھٹئی کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ جہاں ذرا سے فائدے (صلے) کی امید نظر آتی تھی یہ جھٹ اپنا قصیدہ پیش کر دیتے تھے۔
۲۔ اُنہیں ستائش کی بھی اتنی ہی تمنا تھی جتنی بروئے اعتراضِ سابق صلے کی پروا تھی۔
۳۔ وہ ابن الوقت اور بے غیرت تھے۔
۴۔ اُن کی اسلام دوستی اور وطن پرستی بھی محض برائے بیت تھی۔
۵۔ انہیں اپنی بیوی سے قطعاً کوئی محبت نہیں تھی بلکہ وہ اُن سے بیزار تھے۔
۶۔ بیوی کے علاوہ اور سب متعلقین سبھی سے بھی اُن کے تعلقات

[۱] از سید اسد علی انوری فریدآبادی ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی نمبر ۱۳ صفحے قیمت ۸ ر۔

اپنے آپ بیزار ہو گئے تھے۔

۷۔ وظیفہ قتیل کے معاملے میں انہوں نے نواب شمس الدین احمد خاں کی بے وجہ دشمنی مول لی۔

۸۔ انہوں نے اپنے بھائی میرزا یوسف اور ان کے اہل و عیال کی مدد اس کے بعد کوئی خاص مدد نہ کی۔

۹۔ ان کی اپنی مسند تیں آپ بڑھی ہوئی تھیں کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے اور نہ اسے نہیں خطرے میں ڈالتے تھے۔

۱۰۔ انہوں نے دوران غدر میں دستنبو کی تصنیف اس لئے شروع کی تا آئندہ چل کر اس کی وجہ سے اپنی برّیت ثابت ہو۔

۱۱۔ انہوں نے دساتیر اور برہان قاطع کی مدد سے دستنبو لکھی۔

۱۲۔ ان کے حالات ایسے رہے کہ غدر سے پہلے انہیں تنفس الفیمان نہ مل سکا کہ وہ قتیل سے پورا پورا انتقام لے سکیں۔ برہان قاطع کا تو بہانہ تھا۔ اصل مقصود قتیل سے بدلہ لینا تھا۔

۱۳۔ وہ بالارادہ شستہ اور بے ساختہ اردو نثر لکھنے کے اہل ہی نہیں تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ رقعات چھپوائے جائیں گے اور جو رقعات انہوں نے اس نیت سے لکھے کہ وہ اس مجموعے میں شامل ہوں وہ پہلے رقعوں کے مقابلے میں بہت کم درجے کے ہیں مثلاً نامہ غالب۔

۱۴۔ ان کے اردو کلام میں شتر گربہ، غیر مستحسن مقدرات، نامکمل مضمون، تحریف فی محاورہ، غلط محاورہ، حشو و زوائد، غیر فصیح الفاظ، موقیت وغیرہ کی عام مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بیشمار ایسے اشعار ہیں جو نہ اردو کے ہیں نہ فارسی کے اور گو توجیہہ اور تاویل کرنے کو کر لی جائے لیکن اکثر ان میں سے بے معنی ہیں۔

۱۵۔ وہ ایک معیار بناتے ہیں پھر اس خود ساختہ معیار کو قدم قدم پر ڈھاتے ہیں۔ ابھی کچھ کہتے ہیں ابھی کچھ اور۔ گویا معیار وعیار کچھ نہیں۔ اصل معیار میرزا غالب کا قول ہے اب جو جو اس سے متفق ہیں وہ سب مسلم الثبوت ورنہ ناقابلِ قبول۔

یہ ہیں پندرہ اہم اعتراض لیکن اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ تنقیص و تحقیر کی یہ داستان یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ انہیں خاکہ سمجھئے اس میں جنابِ اسد علی صاحب نے جو رنگ بھرے ہیں اور جن سطور

جو کچھ فرما گئے ہیں استغفر اللہ وہ بھلا کس طرح بیان ہو سکتا ہے۔ کتاب کا اسلوب بیان اور لب و لہجہ ایسا شریفانہ اور ادیبانہ بلکہ مودبانہ ہے کہ بے اختیار ان کے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ اسے دلئے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

آئیے اب ذرا ان اعتراضوں پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان میں کہاں تک صداقت ہے۔

قصیدہ جو نی جناب اسد علی صاحب فرماتے ہیں کہ میرزا کا یہ مصرعہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

واقعہ ہی وا ہمہ ہے۔ انہیں دونوں کی اتنی تمنا اور پروا تھی کہ جہاں سے ذرا سے فائدے کی امید نظر آتی تھی یہ جھٹ اپنا قصیدہ پیش کر دیتے تھے۔ سب سے اول تو پورا شعر سن لیجئے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور اب اس کا شان نزول دیکھا چاہئے۔

یہ شعر ان کے اس دیوان کے متن میں شامل ہے جو بھوپال سے نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے گویا یہ شعر میرزا نے چھبیس برس کی عمر سے پہلے کہا ہے اور اس کے حقیقی مخاطب وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کے کلام پر مہمل اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق ہونے کا اعتراض کیا تھا جن لوگوں نے برسر مشاعرہ کہا تھا۔

کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

جن لوگوں نے ان سے ہمیش کے اڑنے والا شعر منسوب کر کے در پردہ یہ کہنے کی جرات کی تھی کہ تم ایسے مہمل شعر کہتے ہو۔ اس قماش کے تمام لوگوں کو جن کے تتبع میں آج جنابِ اسد علی صاحب بھی میرزا کے اکثر شعروں کو مہمل بتا رہے ہیں، مخاطب کرتے ہوئے میرزا نے کہا کہ تم لوگ میرے شعروں پر اہمال کا اعتراض کرتے ہو۔ میری بلا سے۔ مجھے نہ تم ایسے ناشناسوں کی ستائش کی تمنا ہے اور نہ تم ایسے ذہنی افلاس کے ماروں کے صلے کی پروا۔ یہی دو چیزیں ہیں جن کی ایک شاعر کو آرزو ہوتی ہے! مجھے تم سے ایسی کوئی توقع ہی نہیں پھر میں تمہارے اعتراضوں کی کیوں پروا کروں!

مگر زمانے نے دیکھا کہ ان کی زندگی میں یہی منکر اور معترض ان پر ایمان لے آئے۔ ہندوستان کے بہترین نقادوں نے ان کے کلام کی

ستائش کی اور قدر شناس رئیسوں نے انہیں عطیے اور وظیفے عطا کئے اور ان کے مرنے کے بعد تو جو کچھ زمانے نے کیا ہے وہ "حسادِ تنگ چشم" کو آتش زیر پا کرنے کو کافی ہے۔

غرضکہ جب معلوم ہو کہ یہ شعر میرزا نے کب اور کن حالات میں کہا تو یہ مورد طنز و اعتراض نہیں ہو سکتا۔

لیکن یہ تو بتائیے کہ یہ قصیدہ نگاری اور بھٹئی ممنوع یا قابلِ اعتراض کب سے ہوئی ہے؟ کیا یہ گناہ صرف غالب ہی نے کیا جو اس پر زبان طعن و ساز ہو رہی ہے یا ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ فارسی شاعری کے ابوالآبا رودکی سے لے کر ملک الشعرا بہار تک سب ہی قصیدے لکھتے آئے ہیں اور آج بھی فارسی کے بیشتر شعرا کا نام اُنہی قصیدوں کی بدولت زندہ ہے اور ان قصیدوں کے مدح کے حصے میں جو زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں اور جس طرح غلو اور اغراق کو راہ دی گئی ہے، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ پھر اکیلا غالب کیوں معتوب ہو اور دوسرے کیوں فرشتے قرار پائیں۔ بالخصوص جب دونوں کے قصیدوں میں مابہ الامتیاز ہے۔ غالب کے کلیات میں بیسیوں قصیدے ہیں۔ ان سب کو دیکھ لیا جائے۔ تشبیب کا حصہ نہایت زوردار اور پرشوکت ہے۔ جونہی گریز کرتے ہیں اس میں کمزوری شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مدح پر آ کر سارا زور ختم ہو جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بے دلی سے اپنی خواہش کے خلاف تعریفی و توصیفی کلمات لکھ رہا ہے۔ یہ مدح دو چار شعروں میں ختم ہو جاتی ہے اور اس سے جلد جلد گذر کر وہ دعا پر قصیدے کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ آخری حصہ بہت کم جگہ آٹھ دس شعر سے زیادہ ہے۔

یہی حال اُن کی تقریظوں کا ہے۔ ان کے کلیات میں متعدد کتابوں پر تقریظیں ہیں۔ ان میں سے اکثر کے مصنف ان کے نہایت عزیز دوست تھے۔ لیکن دیکھ لیجئے نہ کہیں کتاب کو اچھالا ہے نہ اس کے مصنف کی بے جا تعریف کی ہے۔ چند فقرات میں مصنف کے حالات ہیں۔ اوّل اس کے اخلاق و اوصاف کا مختصر بیان ہے پھر اس سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں اور آخر میں ایک آدھ فقرہ کتاب کے متعلق بھی لکھ دیتے ہیں اور بس۔

کیا یہ طریقے ایسے شخص کے ہیں جس کو بھٹئی میں مزا آتا ہے یا جس کی فطرت میں بے غیرتی اور کمینہ پن ہے؟ لیکن یہ نفسیاتی باتیں ہیں اور غالباً جناب اسد علی صاحب کے سامنے ان کا بیان چنداں سودمند نہ ہو۔

غیرت کا ذکر آ گیا۔ میرزا کی غیرت کے بھی دو واقعات سن لیجئے

جناب اسد علی صاحب نے اس بات کا ذکر بڑے مزے لے لے کر کیا ہے کہ وہ بڑی امیدوں اور کافِ کرم کی "کششوں" کے ساتھ لکھنؤ گئے تھے اور اس لئے سال بھر کے قریب لکھنؤ میں پڑے رہے۔ لیکن اس شہر میں غالب کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ بادشاہ تو بادشاہ نائب السلطنت سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ تینوں باتیں غلط ہیں۔

اوّل قدر کا یہ عالم تھا کہ جیسے کہ مولانا حالی مرحوم نے لکھا ہے۔ میرزا لکھنؤ میں وہاں کے اکابر کی خواہش کو منظور کرتے ہوئے تشریف لے گئے تھے۔ یہ لوگ انہیں ایک مدت سے بلا رہے تھے اور غالب وہاں نہیں جا سکے تھے۔ اب جو دہلی سے نکلے تو راہ میں کان پور سے لکھنؤ چلے گئے گویا اس شہر میں غالب کے ایسے قدر شناس تھے کہ انہوں نے خود دعوت دے کر انہیں بلایا۔

ان کے اعزاز میں خاص مشاعرہ کیا اور خود میرزا نے بھی طرح پر غزل کہی۔ اس کے آخر میں مندرجہ ذیل قطعہ ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی   ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر   عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب   جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

جناب اسد علی صاحب نے یہ لکھ کر کہ "وہ بڑی امیدوں اور کافِ کرم کی کششوں کے ساتھ لکھنؤ گئے تھے"۔ اپنی سخن فہمی کا جو ثبوت دیا ہے اب میں اُس کی کیا داد دوں۔ قبلہ! ان کا "مقطعِ سلسلۂ شوق" لکھنؤ نہیں بلکہ کلکتہ تھا۔ انہیں توقع تھی پنشن کے مقدمے میں کامیابی کی "کرم" کا تعلق نہ لکھنؤ سے ہے نہ بادشاہ اور نائب السلطنت سے بلکہ انگریزی انصاف سے۔ اگر جناب اسد علی صاحب ذرا غور فرماتے تو ایسی بے پر کی نہ اُڑاتے۔ نیز یہاں "کشش" کے وہ معنی نہیں جو جناب انوری صاحب سمجھے ہیں۔

لیکن لکھنؤ آنے کے بعد انہوں نے یہ نامناسب جانا کہ نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر سے ملاقات نہ کی جائے۔ چونکہ قصیدہ لکھنے کا وقت نہ تھا اس لئے انہوں نے عجلت میں ایک دس پندرہ سطر کی مختصر فارسی نثر صنعتِ تعطیل میں لکھ لی۔ لیکن آغا میر بے چارے کو غنیمت نوازی کا سلیقہ کہاں۔ ستر ولدُ لابیہ۔ اس نے شرط لگائی کہ غالب یوں نذر پیش کریں اور یوں سلام بجا لائیں۔ میرزا کی غیرت نے ان شرطوں کو گوارا نہ کیا۔ اور انہیں اپنے لئے دوں مرتبہ خیال کیا اور ملاقات سے انکار کر دیا۔

گویا غالب میرزا کو اپنی بارگاہِ قدس میں بار دینے پر راضی تھا لیکن غالب ہی نے اس شرف کو قبول نہیں کیا۔

وہ سارا واقعہ بھی سن لیجئے۔ دلی کالج میں مولوی مملوک علی عربی کے صدر مدرس تھے جو مثال منشی کریم الدین صاحب بمتعلقات ... عالم بے بدل اور متقی بے عمل اور فاضل کامل تھے۔ کالج میں فارسی کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ ۱۸۴۲ء میں جب مسٹر ٹامسن مدرسے کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ عربی کی طرح فارسی کا بھی ایک معلم مدرس مقرر ہونا چاہئے۔ مولوی صدر الدین صدر الصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے تین استاد ہیں۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب، حکیم مومن خاں مومن اور شیخ امام بخش صہبائی۔ مسٹر ٹامسن صاحب نے میرزا کو بلا بھیجا۔ اگلے دن یہ سوار ہو کر وہاں پہنچے اور دروازے پر کھڑے اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ ابھی کوئی صاحب پذیرائی کو آتے ہیں۔ جب کوئی نہ آیا اور کسی نے آکے ان سے کہا کہ حضرت داخل ہو جئے تو کہا کہ صاحب کوئی آگے سے لینے کو آئے تو اتروں۔ جواب ملا کہ آپ ملازمت کے لئے آئے ہیں۔ ملاقات کے لئے نہیں آئے کہ کوئی استقبال کو حاضر ہو۔ تو فرمایا کہ ملازمت اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے میرے عز و وقار میں اضافہ ہو نہ کہ پہلے میں بھی کمی ہو جائے۔ اگر ملازمت کے معنی کمی مرتبہ کے ہیں تو ایسی ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام اور کہاروں کو حکم دیا کہ پلٹ چلو۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ باقی واقعہ بھی یہاں بیان کر دیا جائے۔ اس پر ٹامسن صاحب نے حکیم مومن خاں کو بلوایا۔ یہ پہنچے جب تنخواہ کی بات چلی تو انہوں نے کہا کہ مولوی مملوک علی صدر مدرس عربی سو روپیہ ماہانہ پاتے ہیں میں اس سے کم قبول نہیں کروں گا۔ چونکہ وہ چالیس سے زیادہ دینے پر تیار نہیں تھے اس لیے یہ انکار کر کے چلے آئے۔ صہبائی نے چالیس منظور کر لئے۔ بعد میں یہ پچاس کر دئے گئے۔ دیکھا آپ نے فرقِ مراتب!

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی میں غالب کی قصیدہ نگاری کا ذکر کر رہا تھا۔ اور گذارش کر رہا تھا کہ قصیدہ لکھنا غیرت کے منافی نہیں۔

اب اس اعتراض کو ایک اور پہلو سے لیجئے بعض حضرات نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ میرزا نے اتنے انگریزوں کی مدح کی۔ حالانکہ اس وقت یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی اور ابھی تخت طاؤس پر برائے نام ہی سہی، اکبر و جہانگیر، شاہجہان و عالمگیر کا نام لیوا موجود تھا۔ یہ اعتراض میں نے اور بہت سے حضرات کی زبان سے بھی سنا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ذرا تفصیل سے نظر ڈالی جائے۔

ان قصیدوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو انہوں نے گورنر جنرل ہندوستان یا گورنر پنجاب کی مدح میں لکھے۔ دوسرے وہ جو انہوں نے کم درجے کے انگریزوں کے لئے کہے۔ آخری گروہ میں بیشتر وہ اصحاب ہیں جو حکومت ہند کے سکرٹری یا دہلی میں کمشنر و ریزیڈنٹ یا پنجاب میں فنانشل کمشنر وغیرہ تھے۔ یہ سب قصیدے ان کے پنشن کے مقدمے کے دوران میں لکھے گئے ہیں۔ وہ شاعر تھے اور انہوں نے شاعری سے وہ کام لینا چاہا جو آج کل سفارشوں اور رشوتوں سے نکالا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے ان کے ممدوحین زمانہ حال کے انگریزوں کی طرح نہیں تھے کہ اردو تک ٹھیک طور پر نہیں جانتے۔ بلکہ ان میں سے بیشتر نہایت اچھی فارسی جانتے اور کلام کے حسن و قبح کو پرکھ کر داد دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ان سب قصیدوں کے آخر میں مقدمے کا بیان ہے۔ کہیں اپنے خاندان کا حال لکھا ہے اور کہیں اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذکر کر کے انصاف چاہا ہے۔ بس یہ قصیدے محض قصیدے نہیں بلکہ یوں کہو کہ ان کے مقدمے کی روئیداد کا اہم جزو ہیں۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے کہ اپنا حال اپنے مخاطبوں کو ان کی زبان میں سمجھا سکتے۔ خوش قسمتی سے یہ لوگ وہ زبان جانتے تھے جو غالب کی زبان تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی زبان میں یہ درخواستیں پیش کیں اور چونکہ وہ شاعر تھے اس لئے انہوں نے نثر پر نظم کو ترجیح دی۔ یہ قصیدے نہیں درخواستیں ہیں۔ اب جو کچھ ایک درخواست میں ہوتا ہے وہ سب کچھ ان میں ہے۔ مقدمہ اور اس کے کوائف، انصاف اور اپنے حق میں فیصلے کی خواہش کا اظہار اور مخاطب کے جاہ و اقبال میں ترقی کی دعا۔ آپ ان سب قصیدوں کو دیکھ جائیے۔ الا ماشاء اللہ آپ ان سب میں یہی کچھ پائیں گے۔ پیرایہ اور ترتیب کلام میں فرق ہو تو ہو لیکن ہوگا یہی کچھ۔ نہ کم نہ زیادہ۔

رہے گورنروں اور گورنر جنرلوں کے قصیدے تو یاد رکھنا چاہئے کہ میرزا کو ان دونوں صاحبوں کے درباروں میں کرسی نشینی کا اعزاز حاصل تھا۔ وہ ایسی تقریبوں میں داہنی طرف دسویں نمبر پر بیٹھا کرتے تھے اور انہیں سات پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت ملا کرتا تھا اور معلوم رہے کہ ایسے موقعوں پر ان کی نذر اشرفی یا پانچ اشرفی نہیں تھی بلکہ یہی قصیدہ یا مدحیہ قطعہ ان کی نذر تھی۔ پھر جتنے درباروں وہ شامل ہوئے ہوں گے

کم سے کم اتنے قصیدے اور قطعے تو ہونا ہی چاہئیں۔ اس پر نہ اعتراض ہو سکتا ہے نہ اس میں کوئی بے جا بات ہے۔

جب غدر کے دوران میں اور اس کے بعد بھی دو تین برس یہ دربار و خلعت بند رہا تو یہ قصیدے بھی ختم ہو گئے۔ انہی ایام میں جب انہوں نے نواب علاؤ الدین احمد خاں کو اپنے مخصوص پیرائے میں لکھا ہے۔

"اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ گورنمنٹ کا بھاٹ

بھٹئی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف بھٹئی متروک۔"

تو بتائیے اس میں کیا غلط بیانی کی اور اس پر طنز کیوں ہو؟

پھر یہ اعتراض بھی لغو ہے کہ بہادر شاہ کی موجودگی میں انہوں نے کسی انگریز کی مدح کیوں کی۔ اگر انگریزوں کی ملازمت گناہ نہیں تھی، اگر ان کی طرف سے مسلمان حکمرانوں کے خلاف جنگ کرنا گناہ نہ تھا۔ اگر خود بہادر شاہ کے لئے ان کے سامنے اپنے حقوق سے دست بردار ہو جانا اور ان سے ایک معقول وظیفہ قبول کر لینا گناہ نہ تھا تو غالب کا ان میں سے بعض کی مدح میں صرف قصیدے لکھنا ہی گناہ کیونکر ہو گیا۔

جناب اسد علی صاحب نے اس ضمن میں مرزا کی اسلام دوستی اور وطن پرستی پر بھی اعتراض کیا ہے اور ثبوت میں میرزا کے ایک قصیدے کا یہ شعر پیش کیا ہے جو انہوں نے سر جان میکلوڈ کی مدح میں لکھا تھا۔

ہے یہ دعا کہ زیر نگیں آپ کے رہے اقلیم ہند و سندھ سے تا ملک روم و شام

مجھے یہ اعتراض پڑھ کر صائب کا شعر "مرا مدرسہ کہ برد" والا فقرہ یاد آگیا۔ حضرت! اگر ایسی باتوں پر اعتراض ہونے لگے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کسی قصیدہ گو شاعر کو بھی مسلمان نہیں ثابت کر سکیں گے۔

رہی اُن کی وطن پرستی تو اگرچہ ہم بالکل ڈاکٹر سید محمود کے ہم نوا بھی نہیں کہ میرزا کو خواہی نخواہی پکا وطن پرست اور نیشنلسٹ ہی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ انہیں اپنے وطن سے بھی محبت تھی اور وہ اپنے ہم وطنوں کی مصیبت کو بھی اُسی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ جیسے اس زمانے کے کسی اور قوم پرست نے کیا ہوگا۔ اُردو رقعات تو ان کی زار نالیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ خط روشنائی سے نہیں بلکہ خون کے آنسوؤں سے لکھے ہیں۔ دستنبو میں بھی ہندوستانیوں کے مصائب پر اپنے دلی درد کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اردو کلام میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ صرف اُن کا وہ قطعہ ہی جس کا پہلا شعر

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہر سلح شور انگلستاں کا

ان کے جذبۂ وطن پرستی کا کافی ثبوت ہے۔

جناب اسد علی صاحب نے ایک اور اعتراض بھی تصنیف فرمایا ہے کہ

"جب سر سیّد علیہ الرحمۃ نے آئین اکبری کی تصحیح کر کے اس کے چھاپنے کا ارادہ کیا اور غالب سے تقریظ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو تقریظ لکھنے میں غالب نے اس قدر انگریز پرستی کا ثبوت دیا کہ سر سیّد جیسے انگریز پرست کے گلے سے بھی وہ تقریظ نہ اُتر سکی۔ اور انہوں نے اس کو داخل کتاب نہیں کیا۔"

ایسے ہی موقعہ پر سخن فہمی عالم بالا کی مثل صادق آتی ہے۔ قبلہ! غالب کی تقریظ کو شامل کتاب کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ غالب نے اس میں سر سیّد سے بھی زیادہ انگریز پرستی کا ثبوت دیا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں اکبر کے قوانین اور ابو الفضل کے طرز تحریر کی تنقیص کی تھی۔ یہ گویا سر سیّد کی ساری محنت پر پانی پھیرنے والی بات تھی۔ تقریظ کلیات میں موجود ہے۔ دیکھ لیا جائے کہ اس میں کونسی بات زیادہ نمایاں ہے۔ انہوں نے عہد اکبری کے آئین کو انگریزی آئین سے کمتر درجہ پر رکھا ہے اور اپنے آپ کو ابو الفضل سے بہتر نثر نگار ظاہر کیا ہے۔ آخر "آئین اکبری" میں اور تھا کیا جس کے لئے سر سیّد نے برسوں خون جگر کھایا تھا۔ آئین و قانون سو نکمے۔ تحریر سو گھٹیا۔ لہٰذا انہوں نے تقریظ کو شامل کتاب کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد مدتوں مرزا سے بگڑے رہے۔ سر سیّد میرزا کی انگریز پرستی سے ناراض نہیں تھے۔ میرزا بے چارے کیا کھا کر اس باب میں سر سیّد علیہ الرحمۃ کا مقابلہ کریں گے۔ اگر مرزا اکبر کے آئین کی بھی تعریف کر دیتے اور ابو الفضل کی تحریر کو بھی سراہ دیتے تو انگریز پرستی دھری کی دھری رہ جاتی اور تقریظ کتاب کے ساتھ چھپ جاتی لیکن اس صورت میں جناب اسد علی صاحب کا ایک اعتراض کم ہو جاتا۔

رہے بعض دوسرے والیان ریاست یا امرا کی مدح میں قصیدے تو یہ بھی کوئی بری بات نہیں معلوم ہوتی۔ ہمارے زمانے میں اقبال مرحوم سے زیادہ کسی اور شخص نے خودی اور عین دریا میں پیمانہ نگوں کرنے کی تعلیم نہیں دی لیکن کسی سے پوشیدہ نہیں کہ بھوپال سے انہیں پانسو روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔ اور دوسری بڑی اور چھوٹی ریاستوں سے جو رقوم انہیں ملا کیں

یہاں جناب اسد علی صاحب یا کوئی اور حضرت یہ نہ کہہ دیں کہ انہیں یہ وظیفہ ایک کتاب لکھنے کے لئے ملتا تھی۔ جس کا نام تھا "مطالعۂ قرآن کے اصول"!

ان کا علم تو محروم رہا۔ کے حقیقت یہ ہے کہ باہر کسی کو کچھ ہونے لگا۔ جوش ملیح آبادی بہت بڑے استبداد دشمن اور حریت نواز سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں بھی پٹیالہ سے دو سو ماہانہ وظیفہ ملتا ہے اور بعض دوسری ریاستوں سے بھی ان کے تعلقات رہتے ہیں اور اب بھی ہیں مگر کسی کو جرأت نہیں کہ وہ ان کے خلاف زبان اعتراض دراز کرے۔ کیونکہ ایک علم بردار خودی اور حکیم مشرق ہے اور دوسرا مصور فطرت اور شاعر انقلاب۔ اس بارے میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کا قول بھی یاد رکھنے کی چیز ہے۔ فرماتے ہیں:

> ...... جب خدا کے فضل سے جب ہمیں آزادی مل جائے گی اور ہماری حکومتیں بھی آزاد ہو جائیں گی اور ہماری جنگ آزادی کی تاریخ لکھی جائے گی۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ کس طرح ایک سیاست شناس شخص نے ہم دو بھائیوں اور ہمارے بال بچوں کو تین برس کے عرصے میں یعنی ۱۹۲۰ء میں اور پھر قید کے دو سال میں چالیس ہزار کی لاکھ قدر رقم دے کر فکر معاش سے فارغ اور مستغنی کر دیا۔
>
> صفحہ ۱۱۹ مضامین محمد علی
>
> ...... اسی طرح اگر حضور نظام یا کوئی اور مسلمان فرمانروا میری ذات پر احسان کرے اور مجھے فکر معاش سے فارغ کرنا چاہے تو ان کے لیے ہرگز نامناسب نہیں۔ اور مجھے بھی ان کی امداد قبول کرنے میں ہرگز عذر نہ ہوگا۔ صفحہ ۱۱۹، مضامین محمد علی

یہ محض قول ہی نہیں بلکہ ان کا عمل بھی اسی پر تھا۔ جب مرحوم مہاراجہ الور نے انہیں ۳۰۔۳۲ ہزار روپیہ علاج کے لئے پیش کیا تو انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ہم ذاتی طور پر بالکل مولانا مرحوم کے ہم خیال ہیں شاعروں اور ادیبوں، قومی کارکنوں اور رضا کاروں کا حق ہے کہ وہ قوم اور ملک سے اپنی معاش کا مطالبہ کریں۔ اگر قومی بیت المال نہیں تو پھر یہ امیر چشم امرا اور صاحب حشم روسا کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو معیشت کے تفکرات سے آزاد کر دیں تاکہ وہ بے خلل و غش اپنی مفید سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو قومی علم و ادب کی ترقی کا راز اسی سرپرستی میں مخفی تھا۔ اب کیوں ویسے لوگ نہیں پیدا ہوتے جن کا نام سن کر ہم بے اختیار فرط ادب سے سر جھکا دیتے ہیں یا جن کی تحریرات پر عرب و عجم کا سر فرط غرور سے آسمان کو دعوت مقابلہ دیتا ہے۔ اس کا جواب ہے۔ قومی سرپرستی کا فقدان۔ جب سے ان غریبوں کو کتابیں بیچنے کا کام کرنا پڑا ہے۔ ان کے تمام حوصلے پست اور ولولے سرد ہو گئے ہیں۔ پیٹ کا دھندا اور دماغ سوزی دونوں یکجا نہیں ہو سکتے۔

بیوی سے بیزاری! غالب کے لطائف میں بہت سے ایسے لطیفے ہیں۔ جہاں انہوں نے عورت اور متاہلانہ زندگی کا خاکہ اڑایا ہے۔ ان کے کلام میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جہاں انہوں نے عورت اور بیوی کو مصیبت کا گھر بتایا ہے۔ یہ ایسی ہی باتیں ہیں جیسی سب ذہین و فطین آدمی کیا کرتے ہیں وہ کسی ایک موضوع کو اپنا نشانہ بنا لیتے ہیں اور جب کبھی انہیں موقع ملتا ہے اس پر آوازے کستے اور پھبتیاں اڑاتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن کا نام کون نہیں جانتا۔ جب بھی ان کا بس چلتا تھا وہ سکوس کا چکر کاٹ کر بھی اسکاٹ لینڈ کے باشندوں پر کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیتے تھے۔

اب اگر کوئی شخص اس سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ انہیں اسکاٹ لینڈ کے لوگوں سے نفرت تھی یا وہ انہیں احمق سمجھتے تھے تو اس سے بڑی غلطی نہیں ہو سکتی۔ ان کے دوستوں میں خود اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے بھی تھے اور یہ لوگ بھی ان کے لطیفوں سے اتنے ہی مسرور ہوتے تھے جتنے انگلستان یا ویلز کے لوگ۔ میرے ایک مہربان ہیں انہیں سکھوں کے خلاف اسی طرح کے لطیفے وضع کرنے میں لطف آتا ہے بلکہ جب ان کا کوئی سکھ دوست ملنے کو آ جائے تو ان کی جولانیاں اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ وہ بلبل کی طرح چہکتے اور گل فشانیاں کرتے ہیں۔ مارے ہنسی کے حاضرین کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں اور ایسے موقعے پر ان سکھ دوستوں کا قہقہہ سب سے بلند ہوتا ہے۔

ایسے لطیفوں سے ان حضرات کی سوانح عمری مرتب کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شاعر کے دیوان سے اس کے مذہبی عقائد پر بحث کرنی یا جیسے پچھلے دنوں جناب پروفیسر شاہانی ساقی کے صفحات پر گلکاریاں کرتے رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب ایک رند مشرب اور آزادہ رو شخص تھے۔ وہ فطرتاً باغی تھے۔ ایسے لوگ کسی قسم کی پابندی اور قید کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یوں وہ اپنے معتقدات و مزعومات میں بہت پختہ اور راسخ ہوتے ہیں۔ لیکن صرف "بالقوۃ" کی حد تک۔ اس میں "بالفعل" یا "بالعمل" کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کردار کے مضبوط۔ دُھن کے پکے اور بات کے دھنی۔ ان کی زندگی ایک لفظ میں تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نوع

کے تمام افراد کی طرح غالب بھی کسی زنجیر کو اپنے پاؤں میں ڈالنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے اور تاہل سے بڑی اور مضبوط زنجیر اور کونسی ہو سکتی ہے پس وہ سرے سے شادی ہی کے خلاف تھے۔ نہ صرف اپنی شادی کے بلکہ جناب اسد علی صاحب کی ہوپا میری، امراؤ سنگھ کی ہو یا حاتم علی مہر کی، سب کی شادی کے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ انہیں اپنی بیوی سے نفرت یا بیزاری تھی۔ یہ غلط منطق ہوگی اور ایسے اشخاص کے کردار کے خلاف۔ لیکن بدقسمتی سے بات پھر نفسیاتی ہے۔

جناب اسد علی صاحب نے سخت ظلم کیا ہے جہاں انہوں نے میرزا کے ایک خط کے غلط معنی لے کر ان پر اتہام لگانے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں:۔

"پھر یہ محض زبانی واویلا نہ تھا بلکہ اس بیڑی کو کاٹنے کی انہوں نے کوشش بھی کی۔ یہ تصفیہ کیا کہ بیوی کو لوہارو بھیجا جائے اور خود آزادانہ زیست بسر ہو۔ ان کے (یعنی غالب کے) الفاظ ہی سنئے جو انہوں نے نواب علاؤ الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھے ہیں:۔

تمہارے والد ماجد اور تمہاری جدہ ماجدہ سے اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میرے بیوی بچوں کو کہ یہ تمہارے ہیں۔ مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل گئی تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔

غالب کی بیوی بھی مجبوراً اس پر راضی ہو گئی تھیں۔ لیکن پھر کسی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا:"

سب سے پہلے تو غالب کے خط کا اقتباس نامکمل ہے پورا یہ ہے:۔

"اپنا مقصود تمہارے والد ماجد اور تمہاری جدہ ماجدہ اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں۔ مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے پنشن اگر کھل جائے گا تو اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا وہ رہ گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا چل دیا۔"

اور دوسرے انہوں نے خط غدر کے بعد اس زمانے میں لکھا ہے جب ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ پنشن بند ہو چکی تھی، جب قلعہ کی تنخواہ ختم ہو گئی تھی۔ تمام ذرائع معاش مسدود تھے اور خرچ بدستور۔ ایک مدت انہوں نے گھر کے برتن اور کپڑے بیچ بیچ کر بسر کی لیکن یہ صورت حال کب تک برداشت کی جا سکتی تھی۔ ان حالات میں انہوں نے لوہارو والوں سے کہا کہ کچھ مدت کے لئے میرا بوجھ ہلکا کر دو وہ مان گئے۔ بیوی سے ذکر کیا وہ لوہارو جانے پر رضامند ہو گئیں۔ یقیناً ان حالات میں یہ بہترین انتظام تھا۔ اب جن لوگوں کو اس پر اعتراض کرنے کا حق تھا۔ انہوں نے تو کچھ کہا نہیں یعنی نہ نواب علاؤ الدین نے انکار کیا نہ امراؤ بیگم نے کچھ اس کے خلاف کہا۔ لیکن آج واقعہ کے اسی برس بعد جناب اسد علی صاحب آئے ہیں فریدآباد سے شکایت کرنے۔ چہ خوش۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر خط کو واقعات کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو اس میں اعتراض کی کوئی بات ہی نہیں رہتی یہ اُن لوگوں کا گھریلو معاملہ تھا اور وہ یہ انتظام میرزا کے حالات سے مجبور ہو کر باہمی مشورے سے طے کر رہے تھے۔ میرزا نے نواب امین الدین احمد خاں، نواب ضیاءالدین احمد خاں اور جناب بیگم جان صاحبہ سے اپنی مشکلات بیان کیں اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ جب تک کشائش کا سامان نہیں پیدا ہوتا۔ بیوی بچوں کو یہاں چھوڑ کر آپ کسی طرف کو نکل جاؤں۔ انہوں نے اس شرط پر اس خواہش کو قبول کیا کہ بیوی بچوں کو دہلی میں چھوڑ کے نہ جاؤ بلکہ لوہارو بھیج دو (جناب اسد علی صاحب کو معلوم رہے کہ انہوں نے کی ضمیر کا مرجع یہ تینوں ہیں نہ کہ غالب کی بیوی) چونکہ یہ لوگ دہلی میں موجود تھے۔ اس لئے ان سے مشورہ کرنا آسان تھا۔ اب ضرورت تھی لوہارو میں نواب علاؤ الدین احمد خاں کو اطلاع دینے کی۔ اس پر انہوں نے یہ خط لکھا۔ بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

اب میں ایک عینی شاہد کا بیان درج کروں ممکن ہے جناب اسد علی صاحب کی اس سے کچھ تسلی ہو جائے۔ نیر درخشاں کی صاحبزادی اور مرزا باقر علی خاں کامل کی بیوی جناب معظم زمانی بیگم صاحبہ دہلی میں موجود ہیں۔ وہ غالب کی زندگی کے آخری سات برس ان کے ساتھ رہیں پہلے پانچ برس ایک ہی مکان میں اور آخری دو برس علاحدہ مکان میں۔ میرے پوچھنے پر وہ فرماتی ہیں:۔

"بیٹا! میرزا صاحب کی تو غصے ہونے یا جھگڑا کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ وہ تو کسی سے بھی ناراض نہیں ہوتے تھے۔ بیگم

ہے ان کا ہاتھ تو ہمیشہ محبت کا دیکھا۔ گھر میں آتے تو ہر وقت لیٹے
پڑے رہتے۔ کبھی بیگم سے مذاق کرتے کبھی حسین علی خاں کو چھیڑتے
وہ ہم لوگوں سے تو دراز نہیں کرتے تھے حالانکہ میں ان کی بہو تھی۔
بیگم نے بھی کبھی ان کی بات کا برا نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ انہیں ایک
دوسرے سے محبت کرتے دیکھا۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو ہمارے
بس میں کم سے کم ایک بار بھی دیکھنے میں آتی"

متعلقین سبھی سے بیزاری جناب اسد علی صاحب لکھتے ہیں:

"بیوی کے علاوہ اور سب متعلقین سبھی سے بھی ان کے تعلقات
اچھے نہیں بیزاری کے تھے"

اور ثبوت میں غالب کے ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا ہے:

میرا ہمدم تو مرزا قید و بند میں نہیں ہمدم نفس میں دو ہی یادداشت
تنہائی میں سود و سودا ہوں گے۔ مگر اقربا سبھی ہیں مجھ پچیس برس
کی مدت سے ان کے دام میں اسیر ہوں۔ اک شعر ہے ستم اٹھائے
گر بہ شرح ستم ہائے عزیزاں غالب رسم امید ز دنیا و جہاں برخیزد

میرزا نے جو کچھ اپنے اس خط کے آخری شعر میں لکھا ہے وہ حرف بحرف درست ہے۔ ان کے عزیزان سبھی کے ستم کی شرح واقعی بہت طویل ہے۔ آپ بھی سنیں اور داد انصاف دیں۔

میرزا کی عمر مشکل سے پانچ برس ہوگی جب ان کے والد نے انتقال کیا اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ چچا کی سرپرستی میں آگئے۔ ان کی ننھیال بہت آسودہ حال تھی۔ چچا بھی پہلے مرہٹوں کی عملداری میں اکبرآباد کے صوبہ دار تھے۔ پھر انگریزوں کے عہد میں بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ سالانہ کے جاگیر دار اور سترہ سو ماہانہ کے مشاہرہ پانے والے رہے۔ اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ میرزا کا بچپن نہایت آرام و آسائش سے بسر ہوا ہوگا۔ بدقسمتی سے چچا کی وفات بھی جلد ہی ہوگئی۔ اس وقت غالب کی عمر نو برس سے کم تھی۔

یہاں سے ان کی مصیبت کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ نواب احمد بخش خاں نے رجن کی بہن میرزا کے چچا سے بیاہی تھی، اپنے بہنوئی کے انتقال کے بعد غالب اور ان کے چھوٹے بھائی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ سرکار انگریزی کی طرف سے ان کے چچا کی خدمات کے عوض میں اس خاندان کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر ہوئی۔ لیکن نہ معلوم نواب احمد بخش خاں نے کیا جوڑ توڑ کئے کہ پہلے حکم کے ایک ہی مہینہ بعد انہوں نے ایک دوسرا حکم حاصل کر لیا جس میں پنشن کی رقم دس کی جگہ پانچ ہزار کرالی اور تقسیم کچھ اس طرح کرائی کہ اس میں سے بھی غالب کو صرف ساڑھے سات سو سالانہ ملے۔

میرزا ۲۹ برس کے تھے جب نواب احمد بخش خاں نے ۱۸۲۶ء میں ریاست لوہارو اور فیروزپور سے دست برداری دے دی اور ان کی جگہ ان کے فرزند اکبر نواب شمس الدین احمد خاں فیروزپور کی گدی پر بیٹھے۔ ان حضرت نے ۱۸۳۰ء میں وہ ساڑھے سات سو دینے بھی بند کر دیئے۔

میرزا نے سرکار انگریزی میں مقدمہ دائر کیا کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ دس ہزار کا حکم تھا اور ملتا صرف تین ہزار ہے۔ اس میں سے بھی میرے حصے میں صرف سات سو پچاس آتے ہیں۔ پچھلا بقایا دلایا جائے اور آئندہ کے لئے پوری رقم ادا کرنے کا حکم صادر ہو (مقدمے کی تفصیلات آپ میری تالیف ذکر غالب میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں) اٹھارہ برس کامل انہوں نے یہ مقدمہ جاری رکھا۔ اس کے لئے خود کلکتہ کا سفر کیا اور پورا ڈیڑھ سال وہاں بیٹھے رہے۔ ہزار ہا روپے کی زیر باری ہوئی اور سچ پوچھئے تو ان کی زندگی بھر کی پریشانیوں کا باعث یہ مقدمہ اور اس کے اخراجات ہوئے۔ جو انہوں نے قرض لے لے کر کئے۔ مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا اور ان کی بقیہ عمر اس قرضے کے اتارنے میں کٹی۔

۱۸۴۷ء میں وہ ایک مقدمے میں گرفتار ہو کر چھ ماہ کے لئے قید کر دیئے گئے۔ خود رئیس ابن رئیس اور اقربائے سبھی خاندان لوہارو کے افراد بھلا سنسنی کیسے نہ پھیلتی۔ ایک اخبار کی جو شامت آئی اس نے چھاپ دیا کہ میرزا نوشہ جو خاندان لوہارو کے فرد ہیں فلاں جرم میں ماخوذ ہو کر چھ ماہ کے لئے سزایاب ہوئے ہیں۔ جناب اسد علی صاحب ہی بتائیں کہ اس خبر میں کیا غلطی تھی لیکن معلوم ہے خاندان لوہارو کے ایک فرزند رشید نے کیا کیا۔ انہوں نے اسی اخبار میں ایک خط چھپوایا کہ یہ غلط ہے کہ میرزا نوشہ خاندان لوہارو کا فرد ہے۔ ان کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دور کا رشتہ ہے یعنی ہمارے ایک بزرگ کی بیٹی ان سے منسوب بیاہی ہے۔ سو یہ بھی کوئی ایسی بڑی بات نہیں اس سے وہ ہمارے خاندان کے فرد تھوڑی ہو جاتے ہیں۔

پھر ان لوگوں نے قید کے دوران میں بھی غالب کی خبر تک نہیں لی۔ خدا مغفرت کرے نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کو کہ وہ بے چارے خبر سنتے ہی دوڑے آئے اور دہلی پہنچنے پر سیدھے زنداں میں پہنچے اور اس وقت تک شہر میں کسی سے نہیں ملے جب تک غالب کی خبر گیری

نہیں کرلی۔ بجائے اس کے کہ ان کے اقربائے سببی کو اس سے کچھ شرم محسوس ہوتی وہ الٹا شیفتہ سے ناراض ہوگئے کہ آپ نے میرٹھ سے آکے اور زنداں میں غالب سے ملاقات کرکے ہماری ناک کاٹی ہے۔

یہ داستان واقعی طویل بھی ہے اور دردناک بھی۔ کہاں تک لکھا جائے۔ گڑے مردے اکھیڑنے والی بات ہے۔ ان حالات میں اگر غالب نے کہا ؎

گر وہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

تو فرمائیے کیا غلط بیانی کی۔

جناب اسد علی صاحب نے دو تین جگہ لکھا ہے کہ غالب سسرال کے ٹکڑوں پر پل رہے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "سسرال میں پڑے ہوئے تھے" دوسری جگہ فرماتے ہیں "وہ خانہ داماد تھے" ایک اور جگہ یوں اپنی تاریخ دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔

"بلاذ اغالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں کی بہن سے ہوئی تھی۔ نصراللہ بیگ خاں نواب احمد بخش خاں کی معیت ہی میں لڑائی میں کام آئے تھے۔ اسی لئے نواب صاحب موصوف کو ان کے پس ماندگان کا بہت خیال تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ غالب اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کو کم عمری ہی میں دلی لے آئے اور غالب کی شادی تیرہ برس کی عمر ہی میں اپنے بھائی نواب الٰہی بخش خاں کی چھوٹی لڑکی سے کردی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد غالب مستقلاً دلی میں آبسے۔" (دربغ گو را حافظہ نباشد)

یہ بالکل غلط ہے۔ ان کی عمر کے پہلے سترہ اٹھارہ برس اپنی ننھیال میں بسر ہوئے۔ ان کے نانا عمائد اکبر آباد میں سے تھے اور اُن کے تمول کے نشان اب بھی وہاں موجود ہیں۔ پھر وہاں سے دہلی آئے تو اس کی وجہ سسرال کی کشش نہیں تھی بلکہ علمی لحاظ سے دہلی کی مرکزی حیثیت تھی۔ یہاں وہ اپنے خداداد جوہر اور قابلیت کو زیادہ مجلا اور نمایاں کرسکتے تھے۔ یہاں آنے پر انہوں نے علیحدہ مکان لیا۔ اول وہ شعبان بیگ کی حویلی میں رہے۔ اس کے بعد وہ جامع مسجد کے عقب میں اٹھ گئے۔ جہاں وہ ایک زمانہ تک رہے۔ اس کے بعد پھر واپس بلیماروں کے گرد و نواح میں آگئے غرضکہ نہ وہ سسرال میں پڑے رہے نہ ان کی حیثیت "خانہ داماد" کی تھی۔ وہ شروع سے آزادانہ علیحدہ مکان لے کر رہے اور یہ اُن پر بہتان اور واقعات کا منہ چڑانا ہے کہ وہ سسرال کے دست نگر ہو کر رہے۔ یوں ان لوگوں کی بیٹی غالب سے بیاہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے جتنا سلوک کرتے مستحسن تھا۔ لیکن اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ غالب ان کے محتاج تھے۔

جناب اسد علی صاحب لکھتے ہیں۔

"مرزا کے تعلقات اپنے برادر سببی مرزا علی بخش رنجور سے گو شروع میں خراب نہ تھے لیکن آگے چل کر ان سے بھی دل گرفتہ ہوگئے تھے۔"

دراصل یہ اعتراض یا جو کچھ بھی اسے کہو پہلے جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے غالب نامے میں کیا ہے۔ جناب اسد علی صاحب نے وہاں سے نقل کیا ہے۔ شیخ صاحب موصوف نے اس کے لئے دو ثبوت پیش کئے ہیں جن میں سے پہلا جناب اسد علی صاحب نے بغیر حوالہ اپنے یہاں درج کرلیا ہے اور دوسرا چھوڑ دیا ہے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہوجائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز (مرزا معین الدین) کا بہنوئی (نواب ضیاءالدین احمد خاں) مددگار ہے اور شاعر (غالب) کا سالا (مرزا علی بخش) بھی جانبدار نہیں۔"

واوین کے درمیان کے نام جناب شیخ صاحب کے اضافہ کیے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے یہ تلمیح درست ہو اور یہ بھی ممکن ہو کہ غلط ہو۔ بہر حال اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مرزا کے تعلقات رنجور سے اچھے نہیں تھے۔

دوسرا ثبوت انہوں نے یہ پیش کیا ہے کہ وہ رنجور کے جنازے میں شریک نہیں تھے اور غالباً یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے ایک خط میں رنجور کی غلط بیانی اور افسانہ طرازی کی عادت کا بھی ذکر کیا ہے۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے ان میں سے کوئی دلیل بھی قطعی نہیں ہوسکتی جس سے ہم یقین سے یہ کہہ سکیں کہ ان دونوں کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اگرچہ میں اس میں کوئی گناہ اور برائی بھی نہیں دیکھتا کہ ضرور اس کی تردید کی ضرورت بھی محسوس کروں۔ البتہ اس سلسلے میں ایک بات کا ذکر میں کر دینا چاہتا ہوں۔

رنجور کی وفات یکم جنوری ۱۸۶۲ء کو ہوئی۔ غالب ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء

کے دوران برس پھوڑوں کی تکلیف سے بیمار اور چلنے پھرنے سے معذور رہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جس دن رنجور کی وفات ہوئی ہے وہ بیماری کی وجہ سے ان کے جنازے کے ساتھ نہ جا سکے ہوں۔ اسی ضمن میں ایک اور بات بھی عرض کر دوں۔ رنجور کی وفات دلی شہر میں نہیں ہوئی جو کہا جائے کہ ان کی میت دفن کے لیے یہاں سے لے گئے اور میرزا دوسرے لوگوں کے ساتھ نہیں گئے۔ بلکہ رنجور غدر کے بعد ہی دہلی کی اقامت چھوڑ کر عرب سرائے میں اٹھ گئے تھے جو سلطان جی کے پاس ایک بستی ہے وہیں ان کی وفات ہوئی اور وہ سلطان جی ہی میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے۔

میرے خیال میں رنجور سے میرزا کے تعلقات آخر تک دوستانہ رہے۔ ہاں نواب علاؤالدین احمد خاں ضرور رنجور سے ناراض تھے اور جب انہوں نے رنجور کی وفات کے بعد ہی ایک خط میں ان کے خلاف لکھا تو غالب نے انہیں جواب میں لکھا ہے کہ یہ بات درست نہیں میت کو ہمیشہ کلمۂ خیر سے یاد کرنا چاہئے۔ آپ کو چاہئے کہ اب مرحوم کے خلاف دشمنی وغیرہ کے خیالات کو ترک کر دیں۔

میں اوپر ان متعلقین سببی کے سلوک کے کچھ حالات بیان کر چکا ہوں اس کے باوجود ایک نواب شمس الدین احمد خاں کو چھوڑ کر باقی سب کے ساتھ میرزا کا برتاؤ آخر تک نہایت دوستانہ رہا۔ ان میں سے بیشتر ان کے شاگرد تھے اور ان کی تعلیم و تربیت میں میرزا آخر تک گہری دلچسپی لیتے رہے۔ نواب امین الدین احمد خاں سے ان کا زندگی بھر بھائی چارہ اور یارانہ رہا۔ جیسا کہ ان کے اور علائی کے نام خطوط سے ظاہر ہے مرزا علی بخش خاں رنجور۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں اور نواب غلام حسن خاں محو تینوں ان کے شاگرد تھے۔ عارف اگرچہ شروع میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ لیکن غالب کے مستقلاً دلی آجانے کے بعد وہ بھی انہیں سے اصلاح لینے لگے اور انہوں نے اپنا پہلا دیوان بھی نظری کر دیا شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور ان کے چھوٹے بھائی سعید الدین احمد خاں طالب اور غلام فخر الدین خاں کی تعلیم و تربیت ہی ان کے ہاتھوں ہوئی۔ کامل اور شاداں کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ بمنزلہ ان کی اولاد کے تھے۔ ان سب کے ساتھ میرزا کے تعلقات آخر تک نہایت خوشگوار رہے اور اس کا ثبوت موجود ہے۔ پھر معلوم نہیں ان کے اقربائے سببی اور کون فرشتے تھے جن کے متعلق جناب اسد علی صاحب فرماتے ہیں کہ

"سب متعلقین سببی سے بھی ان کے تعلقات ایسے ہی بیزاری کے تھے"۔

اچھا ایک لمحہ کے لئے میں انہی کی مانے لیتا ہوں کہ واقعی ان کے تعلقات ان لوگوں سے اچھے نہیں تھے لیکن فرمایئے تو اگر یہ لوگ غالب کے متعلقین سببی تھے تو کیا غالب ہی ان کے کچھ نہیں ہوتے تھے۔ رنجور کی بہن امراؤ بیگم ضرور ان سے بیاہی تھیں گویا رنجور ان کے برادر نسبتی تھے۔ تو کیا اسی سبب غالب بھی رنجور کے برادر نسبتی نہیں تھے۔ پھر رنجور سے غالب کی بھانجی امانی خانم بیاہی تھیں۔ رنجور کے بیٹے مرزا غلام فخر الدین سے غالب کی بھتیجی عزیز النسا خانم منسوب تھیں۔ نیر رخشاں کی صاحبزادی معظم زمانی بیگم کامل کے گھر میں تھیں۔ جو میرزا کے پوتے کی حیثیت رکھتے تھے۔ تعلق نسبتی دو دھاری تلوار ہے اگر یہ لوگ غالب کے متعلقین سببی تھے۔ تو غالب بھی ان کے سببی رشتہ دار تھے۔ اگر ان لوگوں کے لئے اپنے بہنوئی سے اپنے ماموں سسر سے۔ اپنے چچا سسر سے۔ اپنے سمدھی سے ناخوشگوار تعلق رکھنا نازیبا نہ تھا تو غالب کے لئے ان سے کشیدہ رہنا نا روا کیوں ہو؟ پھر یہ کس طرح معلوم ہوا کہ ان حالات کے لئے ذمہ دار غالب تھے! ان کے خلاف کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی اور واقعات کا فیصلہ ان کے حق میں ہے۔

جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں میں تسلیم نہیں کرتا کہ میرزا کے تعلقات اپنے عزیزان سببی سے خراب تھے لیکن اگر شیخ محمد اکرام صاحب اور جناب اسد علی صاحب ہی کا نظریہ درست ہے تو اس کے لئے غالب کسی طرح ذمہ دار نہیں ٹھیرتے۔

نواب شمس الدین احمد خاں کی علیحدگی / نواب شمس الدین احمد خاں سے واقعی وہ دل گرفتہ تھے اور ایک وہ ہی نہیں بلکہ سب ہی ان سے بیزار تھے اس پر ذرا تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ نواب شمس الدین احمد خاں اور ان کا ایک چھوٹا بھائی اور دو بہنیں ایک عورت مدی کے بطن سے تھے۔ یہ عورت بخارہ کی رہنے والی تھی اور کسی اچھے گھرانے سے نہیں تھی۔ نواب احمد بخش خاں کی دوسری اولاد دو لڑکے اور تین لڑکیاں ان کی بیاہتا بیوی بیگم جان سے تھی جو ایک اعلیٰ خاندان سے تھیں۔ مدی کی وجہ سے نہ صرف دوسری بیگم کی اولاد ہی بلکہ خاندان کے باقی لوگ بھی نواب شمس الدین خاں کو اپنے سے کمتر درجے کا سمجھتے تھے۔ غالب بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ نہ معلوم خود انہیں بھی احساس کمتری تھا یا غیر شعوری طور پر خاندان

کے باقی افراد کے اس غیر ہمدردانہ رویے کا اثر ہوا یا کوئی اور بات ہوئی نواب شمس الدین احمد خاں شروع سے ان سب کے شدید مخالف تھے۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہے اور جب بھی انہیں موقعہ ملتا ان پر چوٹ کرنے سے نہ چوکتے۔ اس کا ایک اور بُرا نتیجہ نکلا کہ وہ طبیعت کے غصہ ور اور سخت گیر ہو گئے

لیکن اس کی خاندان کے لوگوں کو چنداں پروا نہیں تھی۔ کیونکہ بظاہر ان کے گدّی پر بیٹھنے کے امکانات کم تھے لیکن نواب احمد بخش خاں نے بعض مصلحتوں کی بنا پر ۱۸۲۲ء میں یہ فیصلہ کیا کہ فیروز پور جھرکہ کی گدّی پر شمس الدین احمد خاں کو بٹھایا جائے اور لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو دے دیا جائے لیکن بھائیوں کی آپس کی مخالفت اور کشمکش ان سے مخفی نہیں تھی وہ خوب جانتے تھے کہ اگر اس تقسیم پر میری زندگی میں عملدرآمد نہ ہوا تو بعد میں ضرور جھگڑا پیدا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے ۱۸۲۶ء میں ریاست کے نظم ونسق سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ اور یوں شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکہ کی گدّی کے مالک بن گئے۔

۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں نے کوشش شروع کی کہ کسی طرح لوہارو بھی انہیں مل جائے۔ اس ارادے کی کامیابی میں جو بھی ان کے سدِراہ ہوا وہ اس کے دشمن ہو گئے۔ چونکہ غالب کی ہمدردی دوسرے فریق سے تھی اس لئے نواب ان کے بھی سخت مخالف ہو گئے۔ نواب نے پہلا وار یہ کیا کہ ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہانہ پنشن جو انہیں فیروز پور کے خزانے سے ملتی تھی اور جو ان کے لئے توت لایموت کا حکم رکھتی تھی اس کی ادائیگی میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے جانے لگے اور اس کے بعد اپریل ۱۸۳۱ء میں یہ بالکل ہی بند کر دی گئی ادھر تہر زخستاں اور امین الدین احمد خاں کو لوہارو سے بے دخل کرنے کے لئے انہوں نے ہر طرح کے جوڑ توڑ شروع کئے۔ چونکہ یہ دونوں بھائی ابھی نابالغ تھے اس لئے آخر وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔

یہ صورت حالات تھی۔ جب ولیم فریزر ریذیڈنٹ ہو کر دہلی تشریف لائے۔ ان کے تعلقات نواب احمد بخش خاں مرحوم سے نہایت دوستانہ بلکہ برادرانہ رہے تھے۔ وہ ان دونوں بھائیوں کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور یہ دونوں بچے انہیں چچا کہہ کر پکارتے تھے ظاہر ہے کہ انہوں نے ریذیڈنٹ کی حیثیت میں نواب شمس الدین احمد خاں کے خلاف صدر میں رپورٹ کی اور لوہارو ان دونوں بھائیوں کو واپس مل گیا۔ اس سے نواب شمس الدین احمد خاں کے دل میں گرہ بیٹھ گئی اور وہ ولیم فریزر کے جانی دشمن ہو گئے۔

اس کے تھوڑے دن بعد فریزر کا قتل ہوا۔ سب سے پہلے نواب شمس الدین احمد خاں کا داروغہ شکار کریم خاں گرفتار ہوا۔ پھر وہ بندوق ایک کنوئیں سے ملی جس سے یہ قتل ہوا تھا اور جس کی کریم خاں کے قبضے میں ہونے کی شہادت موجود تھی۔ پھر نواب کا ایک دوسرا ملازم واصل خاں بعض مشکوک حالات میں گرفتار ہوا۔ ان دونوں کے بیانات سے مجسٹریٹ کو شبہ ہوا کہ یہ قتل خود نواب کے ایما پر ہوا ہے۔ اس پر اس نے نواب کو فیروز پور سے دہلی آنے کے لئے لکھا۔ جب یہ دہلی پہنچے اور مجسٹریٹ نے ان سے بعض سوال کئے تو ان کے جواب سے اس کی تسلّی نہ ہوئی۔ اور وہ نظر بند کر دیئے گئے۔

اب بتائیے کہ اس میں غالب یا کسی اور کے لئے چغلی کھانے کا موقعہ یا ضرورت ہی کیا تھی۔ قاتل گرفتار ہو چکا ہے۔ نواب کا ایک اور ملازم بھی زیرِ حراست ہے۔ قاتل کا بیان نواب کی اعانت مجرمانہ کا ثبوت ہے اور اس سے نواب کے خلاف شبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کے قبیدِ رستے تعلقات اس شبہ کو تقویت دیتے ہیں مجسٹریٹ انہیں دہلی طلب کرتا ہے اور ان کے جوابوں سے مطمئن نہ ہو کر انہیں نظر بند کر دیتا ہے۔ مقدمے کی باقاعدہ تفتیش شروع ہو جاتی ہے۔ کریم خاں کا ساتھی بھی اس دوران میں گرفتار ہو جاتا ہے اور سلطانی گواہ بن کر سارا راز طشت از بام کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کریم خاں اور نواب شمس الدین احمد خاں دونوں دار پر کھینچ دیئے جاتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں غالب بے چارے کا کیا قصور تھا میں نے جان بوجھ کر ذکرِ غالب میں خاص اس واقعہ پر تفصیل سے نہیں لکھا تھا۔ کیونکہ اس پر بحث بہت حد تک میرے موضوع سے خارج تھی، اب لوگوں کے شبہ کا حال سنئے۔

اگر نواب شمس الدین احمد خاں اور فریزر کے کشیدہ تعلقات کسی سے پوشیدہ نہیں تھے تو ان کی غالب دشمنی بھی کسی سے مخفی نہیں تھی۔ اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے غالب سب افسروں سے ملتے رہتے تھے۔ فریزر سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے اور وہ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ جو مجسٹریٹ اس مقدمے کی سماعت کر رہا تھا وہ بھی ان کا دوست تھا اور اس کے یہاں میرزا کی آمد و رفت تھی یعنی مقدمے کے

دوران میں بھی یہ رسم و راہ جاری رہی اور مجسٹریٹ نے انہیں اپنا ہمراز بنا لیا تھا۔

کیا یہ سب قرائن میرزا کے خلاف پیش گوئیاں کرنے کے لئے کافی نہیں تھے۔ نواب سے ان کی دشمنی، مجسٹریٹ سے دوستی، مجسٹریٹ سے یارانہ اور اس کے یہاں آنا جانا۔ لوگوں نے اگر کہا کہ غالب نے نواب کی چغلی کھائی ہے تو انسانی فطرت کے عین مطابق کیا۔ شبہ کے لئے کافی بلکہ اس سے زیادہ بنیاد موجود تھی۔ انہوں نے وہی کیا جو عام حالات میں ہوا کرتا ہے۔ مگر ہمارا فرض ہے کہ ہم تحقیق سے کام لیں۔ عوام کالانعام کی پیروی مؤرخ کا فرض نہیں۔ قطع نظر مندرجہ صدر واقعات سے جو لوگوں کے شبہ کی تغلیط کے لئے کافی ہیں، خود نواب شمس الدین احمد خاں کو غالب کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ انہوں نے بھی صرف اپنے عم زاد بھائی مرزا نعمت اللہ بیگ خاں کا نام لیا ہے کہ یہ شخص میرا دشمن ہے اور میرے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہا ہے۔ اگر غالب بھی ان کے خلاف سازش میں شریک تھے تو وہ آسانی سے ان کا نام بھی لکھ سکتے تھے۔ ایسے حالات میں تو لوگ اپنے دشمنوں کو پھانسنے کی غرض سے جھوٹ موٹ بھی ان کا نام لے دیتے ہیں۔ پھر تعجب ہے کہ انہوں نے غالب کا نام کیوں نہ لیا۔ جب کہ بقول جناب اسد علی صاحب وہ واقعی ان کے لئے پھانسی کھڑی کر رہے تھے۔

نہیں صاحب! حقیقت یہ ہے کہ نہ غالب نے نواب کی چغلی کھائی، نہ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت ہی تھی۔ لوگوں کا شبہ ضرور تھا۔ لیکن واقعات اس کی تائید نہیں کرتے۔ خود نواب کو ان کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی اور ہمارے نزدیک میرزا کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے یہ کافی ہے۔

لیکن میں بالفرض مان لیتا ہوں کہ غالب نے واقعی نواب کی چغلی کھائی۔ سو کیجئے اس پر اعتراض کیوں ہو؟ نواب ان کے دوست نہیں تھے بلکہ دشمن تھے۔ انہوں نے غالب کو نقصان پہنچانے میں کونسی کسر اٹھا رکھی تھی۔ ان کا روزینہ تک انہوں نے بند کر دیا تھا۔ وہ ان کے دوستوں کے خلاف سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح ان لوگوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیں۔ انہوں نے ان کے ایک اور دوست کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ وہ دوست جو ان کا مربی بھی تھا اور جس سے انہیں بہت نفع کی امید تھی۔ اگر ان سب باتوں کے پیش نظر انہوں نے نواب کی مخبری کی تو وہی کیا جو کوئی اور شخص غالب کی جگہ ہوتا ہوا کرتا۔ کیا دشمن سے بدلہ لینا حرام ہے؟ کیا ظالم کی مخالفت گناہ ہے؟ کیا قاتل کو اس کے کیفر کردار کو پہنچانا ناروا ہے؟ غالب انسان تھے۔ انہوں نے وہی کیا جس کی ایک انسان سے امید کی جا سکتی ہے اور کسی نے کب دعوے کیا ہے کہ وہ انسان نہیں فرشتہ تھے۔

قصہ کوتاہ اگر غالب نے نواب کی مخبری نہیں کی جیسا کہ واقعات سے ثابت ہے تو انہوں نے انسان سے بلند تر ہونے کا ثبوت دیا اور اگر انہوں نے واقعی مخبری کی تو اس سے وہ انسان سے کمتر ثابت نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میرزا یوسف کی مدد: جناب اسد علی صاحب نے شروع میں ایک فقرے کا اضافہ کر کے غالب نامہ سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا ہے۔

> اصل میں وہ انتہائی خود غرض اور خود پسند آدمی تھے۔" اور تو اور انہوں نے اپنے بھائی مرزا یوسف اور ان کے اہل و عیال کی غدر اور اس کے بعد کوئی خاص مدد نہ کی۔ غدر کی مصیبتیں میرزا یوسف کو تن تنہا جھیلنی پڑیں اور جب وہ مر گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نماز جنازہ میں بھی شریک نہ تھے۔ اس کی وفات کے بعد میرزا نے اپنی بھتیجی اور بھاوج وغیرہ کو ایک پائی نہ بھیجی (حالانکہ مرزا کی اپنی بسر اوقات بیشتر چچا کی پنشن پر تھی۔) بے شک یہ غیر معمولی وقت تھا اور میرزا اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ لیکن ان حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کی اپنی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے تئیں خطرے میں ڈالتے تھے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرزا غدر کے دوران میں میرزا یوسف اور اس کے بعد ان کے اہل و عیال کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ لیکن اس کے لئے کسی تحقیق و تجسس کی ضرورت نہیں۔ خود میرزا ایک خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں:۔

> "ابھی وہ یوسف بند نہیں۔ یوسف مصر سہی یوسف مصر میں یوسف علی خاں ہوں اُن کی زلیخانے ستم برپا کر رکھا ہے مجھے تو خبر نہیں کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہیں ساڑھے سات روپے مہینے بھیجے جاؤ گا۔ اب اُن کا تقاضا ہے رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں خرچ جلدی بھیجو ورنہ نالش کی جائے گی۔ اور تم کو [illegible] قرار دیا جائے گا۔"

کیا یہ لفظ اس شخص کے ہیں جو مدد کرنا نہ چاہے۔ یہاں میرزا اپنے افلاس اور شرم کا اظہار کر رہے ہیں کہ وہ اپنی بھاوج اور بھتیجی اور اس کی اولاد کی ان تین برس میں کوئی مدد نہیں کر سکے۔ اب آیئے ذرا حالات کا مطالعہ کریں۔

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو غدر شروع ہوا۔ میرزا نے مکان کا دروازہ بند کیا اور خانہ نشین ہو گئے۔ میرزا یوسف شروع سے ایک علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ چونکہ وہ بہت زمانہ سے دیوانہ ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی بیوی اور صاحبزادی بھی بہت کم ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ صاحبزادی جناب عزیز النسا خانم صاحبہ رنجور کے بیٹے مرزا غلام فخر الدین سے بیاہی تھیں اور میرزا یوسف کی بیوی بالعموم اپنی بیٹی کے پاس یا اپنے میکے میں رہتی تھیں۔ ان کے میکے دہلی میں تھے۔

غدر کے دوران میں میرزا یوسف کی بیوی اور بیٹی انہیں چھوڑ کر جے پور چلی گئی تھیں جہاں اُن لوگوں کے دیرینہ تعلقات اور کچھ عزیز داری بھی اقتباس مولہ فوق میں جو عبارت واوین میں ہے یعنی "حالانکہ مرزا کی اپنی بسر اوقات بیشتر چچا کی پنشن پر تھی" یہ غالباً جناب اسد علی صاحب کی اضافہ کی ہوئی ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ شیخ محمد اکرام صاحب یہ نہیں لکھ سکتے تھے بھلا اس سے زیادہ نادانی اور کیا ہوگی کہ غدر یا اس کے بعد میرزا کی پنشن کا ذکر کیا جائے۔ یہ پنشن مئی ۱۸۵۷ء میں بند ہوئی اور ایک طویل مدت تک دو کے بعد مئی ۱۸۶۰ء میں دوبارہ جاری ہوئی۔ ان حالات میں یہ لکھنا کہ میرزا کی اپنی بسر اوقات چچا کی پنشن پر تھی لیکن انہوں نے اپنی بھاوج اور بھتیجی کی کوئی مدد نہیں کی۔ اپنی انتہائی جہالت کا ثبوت دینا ہے۔

میرزا یوسف کو بھی غالب کی طرح پنشن کے ساڑھے سات سو روپے سالانہ ملتے تھے۔ گویا جب تک میرزا کو پنشن ملتی رہی۔ میرزا یوسف بھی پاتے رہے اور جب غدر ہوا تو دونوں کی بند ہو گئی۔ اگر اس کے بعد میرزا کے پاس کوئی اور آمدنی کا ذریعہ تھا اور انہوں نے بھائی کی مدد نہیں کی تو واقعی اعتراض کا مقام تھا لیکن یہاں تو کوئی اور ذریعہ تھا ہی نہیں دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے بلکہ میرزا کی حالت بدتر تھی۔ بھائی کے مقابلے میں ان کے اخراجات ہمیشہ بہت زیادہ رہے تھے۔ ممکن ہے میرزا یوسف نے کچھ پس انداز بھی کیا ہو اور یہاں تو اُلٹے مقروض تھے۔

لیکن سب سے زیادہ ستم کی بات مرزا یوسف کے جنازے کی نماز میں عدم شرکت کا الزام ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد اکرام صاحب کے نزدیک نماز جنازے میں شرکت غیر معمولی طور پر اہم بات ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے جنازے کی نماز میں شامل ہو تو گویا یہ قطعی ثبوت ہے اس کی میّت سے محبت اور دوستی کا اور اگر وہ اس میں شامل نہ ہو (اگرچہ عدم شرکت کے لئے کوئی معقول عذر بھی ہو) تو ظاہر ہے کہ ان کے تعلقات ناخوشگوار تھے اور اسے مرحوم سے کوئی محبت نہیں تھی۔ یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کیونکہ جناب شیخ صاحب نے رنجور اور میرزا کے تعلقات میں کشیدگی ثابت کرنے کے لئے بھی لکھا ہے کہ وہ رنجور کے جنازے کی نماز میں شریک نہیں تھے۔

لیکن یہ نماز جنازے کی بھی ایک ہی کہی! اجی حضرت کیسا جنازہ اور کیسی نماز جنازہ! میرزا یوسف کا انتقال ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کی رات کو ہوا یاد رہے کہ اس سے ایک ماہ پہلے انگریز دوبارہ دہلی پر قابض ہو چکے تھے۔ اور انتقام کشی اور سخت گیری اپنے پورے شباب پر تھی۔ لوگوں کے لئے اپنے گھروں سے باہر قدم رکھنا محال تھا۔ میرزا نے "دستنبو" میں اس کی ایک مثال پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں "پانی کا کنواں ہمارے کوچے کے باہر تھا۔ حالانکہ امن قائم ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہم میں سے کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہاں تک جا کر اپنی ضرورت کے لئے پانی ہی لا سکے۔ نہ معلوم ان غریبوں پر کیا گذرتی اگر خدا نے ان پر کرم کیا۔ موسلا دھار پانی پڑا اور ان لوگوں نے کپڑے تان تان کر گھر بھر کے برتن بھر لئے"۔ یہ تھی عام حالت جن دنوں میرزا یوسف کا انتقال ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ جن حالات میں سے شہر اس وقت گذر رہا تھا۔ دو چار آدمیوں کا مل کر کسی میّت کو قبرستان تک دفن کرنے کے لئے لے جانا محال تھا۔ کفن اور گورکن کی تلاش مزید مصیبت۔ آخر ہمسایوں نے مرزا کی بےکسی پر رحم کھایا۔ میرزا کے دو تین ملازم اور مہاراجہ پٹیالہ کا ایک سپاہی ان کے ساتھ گئے۔ کفن کے لئے دو تین سپید چادریں میرزا نے اپنے یہاں سے دیں۔ ان لوگوں نے قریب کی مسجد میں گڑھا کھودا اور لاش کو اس میں اُتار کر مٹی سے پاٹ دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اوپر کا بیان کم و بیش میرزا کی اپنی تحریر سے ماخوذ ہے۔ کیا کوئی صاحب انصاف اس سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ میرزا دفن کرنے کے وقت ان لوگوں کے ساتھ نہیں تھے۔ لیکن یہ باور نہیں ہوتا کہ ان کے ملازم اور ہمسائے تک تو ان کے بھائی کی تجہیز و تکفین میں شریک رہے ہوں اور یہ خود وہاں موجود نہ ہوں۔ نہ معلوم کیسے اس عبارت سے شیخ محمد اکرام صاحب اور ان کی نقل میں جناب اسد علی صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے ـــ

بیان چونکہ خود ان حضرات کا ہے اس لئے بارِ ثبوت بھی انہی کے سر ہے۔ میں اتنا لکھتا ہوں کہ یہ اعتراض غلط ہے۔

شیخ محمد اکرام صاحب نے آخری فقرے میں ایک اور عمومی اعتراض کر دیا ہے۔

"ان حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کی
اپنی غرض نہیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان
نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے تھے۔"

اے کاش کہ وہ ایسے ہی ہوتے لیکن جہاں تک میں واقعات کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ حقیقت بالکل اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ دیکھئے

(۱) جن دنوں ان کی بسر اوقات صرف ساڑھے باسٹھ روپے پنشن پر تھی وہ یوسف علی خاں عزیز کو غالباً دس روپے ماہانہ بطور امداد وظیفہ دیتے رہے کیونکہ عزیز ان ایام میں بیکار تھے اور ان کے گذارے کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوشش کی کہ عزیز کو کسی جگہ ملازمت مل جائے یا کوئی فتوح ہاتھ آ جائے۔

(۲) غدر کے دوران میں خود بھوکوں مر رہے تھے اور گھر کے برتن اور کپڑے بیچ بیچ کر اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پال رہے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی ملازموں کو علیحدہ نہیں کیا۔ غدر کے بعد جب آمدنی صرف سو روپیہ ماہوار (وظیفہ رام پور) تھی۔ اس وقت بھی یہی حالت تھی۔ بلکہ ایک ملازم مداری چلا گیا تھا یا مر گیا تھا اور اس کے بیوی بچے ان کے یہاں تھے۔ انہوں نے ان کی مدد سے ہاتھ نہیں روکا۔ ایک دوسرا ملازم کلیان نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک مہینہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار کے واپس آ گیا کہ صاحب کہیں جگہ نہیں ملی۔ آپ ہی آسرا دیں ورنہ بھوکا مرتا ہوں۔ میرزا کی مروّت نے اجازت نہ دی کہ انکار کر دیں۔ اچھا بھئی تم بھی رہو۔ اندر باہر بیس آدمی کھانے والے اور سو روپیہ آمدنی۔

(۳) غدر کے بعد ایک موقعہ پر ریاست جے پور سے کچھ یک مشت عطیہ ملنے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ ان بُرے حالوں میں بھی انہیں اپنے دوستوں کا خیال رہا۔ وہ میر مہدی کو لکھتے ہیں کہ الحمد اللہ کے فضل سے کچھ یافت ہوئی تو میں چاہتا ہوں آدھا آدھا تم سے بانٹ لوں۔

(۴) حسین مرزا ان کے نہایت عزیز دوستوں میں سے تھے۔ غدر نے ان کی عمارت کا بھی خاتمہ کر دیا اور وہ بے چارے ایک زمانے تک ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اس ابتلا میں میرزا ان کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر بے بس تھے اور اس پر وہ اپنے دلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

(۵) حالی مرحوم نے لکھا ہے کہ ان کے ایک دوست ملنے کو آئے جو کسی زمانے میں اچھے کھاتے پیتے تھے لیکن گردشِ ایام کے سبب نکبت کا شکار ہو گئے تھے۔ غالب نے نہایت سلیقے اور اسلوب سے ان کا معمولی کپڑے کا کوٹ اتروا لیا اور چلتے وقت اپنا قیمتی فرغل ان کی نذر کر دیا۔

کیا یہ حالات زیرِ نظر اعتراض کی تغلیط کے لئے کافی نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ حد درجہ زمانہ شناس بزرگ تھے۔ وہ اپنے نفع و نقصان کو خوب سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی کے متعلق جو تھوڑی بہت واقفیت بھی ہمارے پاس ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دوستوں پر جان چھڑکنے والے اور ان کے دُکھ درد میں ان کی حامی بھرنے والے اور حتی الوسع ان کی مدد کرنے والے تھے۔ نواب شمس الدین احمد خاں والے واقعہ ہی کو لے لیجئے۔ میرزا کی ماہانہ پنشن اُن سے متعلق تھی اور اگر یہ نواب کی ہاں میں ہاں ملاتے تو نہ صرف یہ پنشن ہی بلکہ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے زمانے کی فتوحات بھی جاری رہ سکتی تھیں۔ لیکن صریح نقصان کے یقین کے باوجود وہ فریق ثانی سے رشتہ نہیں توڑتے۔ آخر نواب شمس الدین احمد خاں کو ان سے لاگ تھی تو اسی وجہ سے نا کہ یہ نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں سے دوستی کا دم بھرتے تھے۔ ان کی سفارشیں کرتے اور ہر ممکن طریقے سے ان کی حمایت کرتے تھے۔ کیا جناب اسد علی ہمیں بتا سکتے ہیں کہ اس ترجیح کی کیا وجہ تھی۔ رشتہ برابر کا تھا۔ طاقت اور جاہ و مرتبت نواب شمس الدین احمد خاں کی طرف تھے اور ان کے ساتھ رہنے میں فائدے کی کہیں زیادہ امید تھی۔ اس کے باوجود کیوں انہوں نے اپنی پنشن اور زندگی کو خطرے میں ڈال لیا۔ میں نے زندگی اس لئے کہا کیونکہ یقیناً مرزا نہ ولیم فریزر سے زیادہ قوی تھے نہ ان کی پشت پر کوئی حکومت تھی۔ ان کے لئے ایک نہیں دس کریم خاں پیدا ہو سکتے تھے۔ ہاں! کوئی ہمیں بتائے کہ آخر میرزا جو ان حضرات کے نزدیک "انتہائی خود غرض اور خود پسند آدمی تھے"، "جو کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے تھے"۔ انہوں نے کیوں یہ خود کشانہ روش اختیار کی۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ وہ دوستی نبھانے کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔

ان کے نزدیک "وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے"۔ اور ان کے مذہب میں مصیبت کے وقت دوست کو اپنے حال پر چھوڑ دینا کفر ہے

دستنبو کی تصنیف جناب اسد علی صاحب نے دستنبو کے متعلق بھی دو اعتراض کئے ہیں۔ انہیں کے الفاظ سنئے، فرماتے ہیں:۔

> "غدر کی وجہ سے ہندوستانی بادشاہت کی بساط الٹ چکی تھی انگریز کی حکومت میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ سوچا اس انقلاب کے متعلق کچھ ایسا لکھوں کہ آیندہ چل کر اس کی وجہ سے اپنی بریت ثابت ہو بلکہ صاحبانِ انگریز سے رشتۂ یک جہتی استوار ہو تاکہ مددگاری اور وفاداری کے انعامات سے بہرہ ور ہو سکوں فارسی دانی اور ایرانی الاصل ہونے کا دعوے برسوں سے کرتے رہے تھے۔ عربی یوں بھی کم جانتے تھے۔ ارادہ کیا کہ اس طرح کی کتاب ہو کہ سوائے فارسی اور کسی زبان کا لفظ نہ آنے پائے یہ ارادہ کرنے کو تو کر لیا لیکن اس کے لئے ان کا وجدانی ذوق کافی نہ تھا اور ہندی فارسی دونوں کی لغت کے بغیر کام نہ چلا۔ اس وقت ان کے پاس دساتیر اور برہان قاطع ان دو کتابوں کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ تھی۔ انہی دو کتابوں کی مدد سے دستنبو لکھی گئی"۔

یعنی اول انہوں نے دستنبو اس خیال سے لکھی کہ آیندہ چل کر اس سے اپنی بریت ثابت کر سکیں جس سے انگریز ان کی مدد اور وفا کا صلہ انہیں عطا فرمائیں۔ دوم دستنبو انہوں نے دساتیر اور برہان قاطع کی مدد سے لکھی۔

یوں معلوم ہوتا ہے جناب اسد علی صاحب نے دستنبو کا مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ میرزا نے یہ اپنی بریت اور انگریز سے وفاداری اور اس کے انعام سے بہرہ ور ہونے کی امید میں لکھی تھی۔ دستنبو کے دو حصے ہیں پہلے میں انہوں نے غدر کے حالات اور باغیوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے اور دوسری میں فتح دہلی کے بعد انگریزوں کی انتقام کشی اور سخت گیری کی داستان لکھی ہے۔ اگر انہوں نے تلنگوں کے بیان میں ان وحشیوں کی بربریت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے تو دوسرے حصے میں بھی کسی لگی لپٹی کا اظہار نہیں کیا۔ اگر انہیں تملق اور دستگیری منظور تھی تو وہ ایسا نہ کرتے۔ اس کے برخلاف انہوں نے نہایت صاف گوئی سے واقعات قلمبند کر دیئے ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ بریت کس جرم سے ثابت کرنا منظور تھی اور وفاداری اور مددگاری کا کون فعل تھا جس کو ظاہر کرنا دستنبو سے مقصود تھا۔ نہ انہوں نے کسی انگریز کو قتل کیا نہ کسی بنک گھر یا میگزین کو لوٹا اور نذر آتش کیا۔ پھر بریت کیسی!؟ اور انہوں نے کونسا کام وفاداری یا رشتۂ یکجہتی استوار کرنے کا کیا! کیا کسی انگریز کو اپنے یہاں پناہ دی! کیا کسی انگریز عورت کو وحشی باغیوں کے ہاتھ سے نجات دلوائی! کیا غدر کے دوران میں وہ باغیوں کے خلاف جاسوسی کرتے رہے۔! اگر ان سب کا جواب نفی میں ہے تو بتایا جائے کہ انہوں نے کونسی مدد انگریزوں کی کی تھی جس کے صلے کی انہیں امید ہو سکتی تھی۔ انہوں نے خود نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ میں نے غدر کے زمانے میں انگریزوں کی کوئی خاص خیر خواہی نہیں کی جو کسی انعام کا مستحق ٹھہروں۔ اور یہاں تو اور الٹا اثر ہوا۔ انعام کی جگہ پہلی پنشن بھی بند ہو گئی دربار و خلعت کا اعزاز چھن گیا اور ان پر الزام لگا کہ تم غدر کے دوران میں باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اچھی کتاب تھی کہ بنے انعام کی، جگہ پنشن بھی بند ہو گئی اور زمانہ بھر میں وہ بدنام بھی ہوئے —

دوسرا اعتراض بھی عجیب مضحکہ خیز ہے کہ انہوں نے "دستنبو" کو دساتیر اور برہان قاطع کی مدد سے لکھا پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ واقعی ان کا "مذہب" کیا ہے۔ ان تینوں کا موضوع ایک نہیں کہ وجہ اشتراک پیدا ہو۔ اس صورت میں دستنبو لکھنے کے لئے ان دونوں کتابوں سے کوئی مدد لینے کا امکان بھی تھا۔ اس کے بعد کیا کسی لغت کی کتاب سے آپ کوئی کتاب لکھ بھی سکتے ہیں۔ بالخصوص دستنبو کی تصنیف میں وہ ان کتابوں سے کیا مدد لے سکتے تھے۔ دستنبو کے آخر میں سو ڈیڑھ سو ایسے لفظوں کی ایک فہرست دی گئی ہے جو خالص پارسی زبان کے ہیں اور نامستعمل ہونے کے سبب نامانوس اور بعید الفہم ہیں۔ جناب اسد علی صاحب مقابلہ کر کے دیکھ لیں کہ ان میں سے کتنے لفظ ان کی برہان قاطع میں موجود ہیں اور ان پر اس مدد کی حقیقت کھل جائے گی جو دستنبو کی تصنیف میں میرزا نے اس کتاب سے لی۔ دساتیر سے بھی مقابلہ کرنا چاہیں تو وہ میں مہیا کر دوں گا۔ کیا انہیں یہ معلوم ہے کہ دساتیر کا موضوع کیا ہے اور کیا اس میں ان لفظوں کے پائے جانے کا امکان بھی ہے؟

قاطع برہان کی تصنیف حالات اور واقعات سے آنکھیں بند کر کے جناب اسد علی صاحب نے ایک اور دعوے تصنیف فرمایا ہے۔

. . . غالب کے حالات [illegible] کہ غدر سے پہلے ان کو اتنی اطمینان [illegible] قتیل [illegible] مقدمے سکیں . . . غالب نے قتیل [illegible] فارسی دانوں کا سارا غصہ صاحب برہان قاطع پر [illegible] یہ بھی تھی کہ باوجود کوشش کے وہ قتیل کی تحریرات میں کوئی [illegible] گرفت نہ کر سکے۔ بہر حال مرزا غالب نے برہان پر [illegible] اعتراضات کا طومار باندھ دیا؟

مرزا کلکتہ سے نومبر ۱۸۲۹ء میں واپس دہلی پہنچے۔ فارسی ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ جناب اسد علی صاحب فرماتے ہیں کہ اس ۲۸-۲۹ برس کے طویل زمانے میں انہیں اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ ڈیڑھ دو سو صفحے کی ایک کتاب لکھ سکتے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے۔

پنشن کا مقدمہ ۱۸۴۴ء تک جاری رہا۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ پندرہ برس کامل دن رات اس مقدمے کی پیروی ہی میں لگے رہے۔ اس دوران میں ۱۸۳۵ء میں انہوں نے اپنا فارسی کلیات اور ۱۸۴۱ء میں اردو دیوان مرتب کیا۔ کیا وہ قتیل اور دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کے متعلق ڈیڑھ دو سو صفحے کی کتاب لکھنے کی فرصت بھی نہیں نکال سکتے تھے!

۱۸۴۷ء میں اسیری کا حادثہ پیش آیا۔ آخر ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۷ء تک وہ بالکل بیکار رہے۔ کیونکہ دیوان اردو کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں اور کلیات فارسی کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں شائع ہو گیا تھا۔ کیا ان تین برسوں میں یہ کام نہیں ہو سکتا تھا!

۱۸۴۷ء میں وہ جون سے ۷ اگست تک قید رہے۔ رہائی کے بعد ۱۸۵۰ء جون تک وہ پھر بیکار رہے۔ کیا ان تین برسوں میں وہ یہ کام نہیں کر سکتے تھے!

جون ۱۸۵۰ء میں وہ ڈیوڑھی کے ملازم ہوئے اور مہر نیم روز کے لکھنے یا ترجمہ کرنے پر مقرر ہوئے۔ یہ مارچ ۱۸۵۴ء میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد غدر تک کم و بیش پانچ برس کی طویل مدت میں کیا وہ یہ کام نہیں کر سکتے تھے!

یقیناً ظفر اور رمز اور تفتہ یا دوسرے شاگردوں کے کلام کی اصلاح اتنا وقت نہیں لے سکتی تھی کہ وہ ایک ایسے ضروری کام کے لئے بھی فرصت نہ نکال سکتے۔ جس کی تکمیل کی خواہش انہیں ۲۸-۲۹ برس سے تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی سنجیدگی سے ایسی کوشش کی ہی نہیں [illegible] قاطع کے خلاف بھی انہوں نے جو کچھ لکھا یہ محض اتفاق کی بات تھی۔ غدر کے ایام میں ان کی خانہ نشینی۔ باہر کی آمد و رفت بند اور مطالعہ کے لئے صرف دو کتابیں۔ وقت کاٹنے کو وہ برہان قاطع کا مطالعہ کرنے لگے۔ شروع میں ان کا ارادہ کوئی مستقل کتاب لکھنے کا بھی نہ تھا۔ وہ محض اس کے حاشیے پر اعتراض لکھتے گئے۔ وہ بھی اشاروں میں۔ غدر کے بعد انہوں نے ان اشارات کو قابل فہم طریقے پر جمع کر کے کتاب سے خوشخط لکھوا لیا۔ غالباً اب بھی ان کا ارادہ اسے شائع کرنے کا نہیں تھا۔ وہ تو جب بعض دوستوں نے اسے دیکھا تو اس کی اشاعت پر اصرار کیا اور اس طرح یہ تکمیل کے پورے دو برس بعد ۱۸۶۲ء میں پہلی بار چھپی۔

کیا یہ سہل انگاریاں کوئی ایسا شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں انتقام کی آگ ۳۰-۳۲ برس سے سلگ رہی ہو۔ جناب اسد علی صاحب نے انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا ہی نہیں۔

پھر یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ غصہ تو قتیل پر ہے اور نکالا جا رہا ہے محمد حسین دکنی پر اور یہ کیا فرمایا کہ باوجود کوشش کے وہ قتیل کی تحریرات میں کوئی واقعی گرفت نہ کر سکے۔ کیا ثبوت ہے اس امر کا کہ مرزا نے کوئی ایسی کوشش کی بھی؟ کیا جناب اسد علی صاحب کی یہ خواہش ہے کہ کوئی قتیل پر ضرور اعتراض کرے۔ اگر غالب کو یہ فرصت نہیں ملی تو ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اب ان کی یہ خواہش پوری کر دے۔ لیکن اس سے فائدہ!

کلام میں غلطیاں آخر میں جناب اسد علی صاحب نے میرزا کے کلام نظم و نثر پر بھی متعدد اعتراض کئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ان کی زبان اور معانی و بیان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں اور اگر ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ ان کے متعلق پھر کبھی لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے آپ بھی سن لیجئے۔

۳۰-۳۵ برس کی بات ہے یعنی جس زمانے میں برنارڈ شا اور مشہور انگریز ڈرامہ نگار، کچھ ایسا مشہور نہیں تھا اور نہ بہت زیادہ لوگ اس کے صورت آشنا تھے۔ وہ تھیٹر میں بیٹھا کھیل دیکھ رہا تھا۔ اس کے برابر میں ایک اور صاحب تشریف فرما تھے۔ ڈراما جو کھیلا جا رہا تھا وہ اس کا اپنا تھا۔ تماشے کے دوران میں ناظرین طرح طرح سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ دوسرے صاحب اس پر ناک بھوں چڑھاتے اور بڑبڑاتے اور جھک کر آہستہ سے برنارڈ شا کے جو خاموش بیٹھا تھا اور جس کے معنی ان کے پڑوسی نے کچھ اور لئے کان میں کہتے کہ عجب احمق لوگ ہیں یہ۔ آخر اس ڈرامے میں کونسی خوبی ہے جس پر یہ تالیاں بجا رہے ہیں۔ برنارڈ شا خاموشی اور استقلال سے سب

کچھ سنتا رہا۔ جب آخری سین ختم ہوا تو منتظمین میں سے ایک صاحب اسٹیج پر آئے اور کہنے لگے کہ خوش قسمتی سے ڈرامے کے مصنف خود بھی تھیٹر میں موجود ہیں۔ ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ یہاں قدم رنجہ فرمائیں اور حاضرین سے خطاب کریں۔

اس پر برنارڈ شا اپنی جگہ پر سے اٹھا۔ اب ان صاحب کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی جو کھیل کے دوران میں اس میں کیڑے ڈالتے رہے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا مخالف خود برنارڈ شا تھا۔ برنارڈ شا نے اسٹیج پر پہنچ کر ان حضرت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"قبلہ! میں آپ سے متفق ہوں کہ اس ڈراما میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی تعریف کی جائے۔ پلاٹ سو سست مکالمہ سو کمزور تمثیل سو غیر فطری۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ان سب خامیوں کے باوجود ان سینکڑوں ناظرین کے خیال میں یہ ڈراما بہت اچھا ہے۔ اب فرمائیے اتنے آدمیوں کے مقابلے میں ہم دو کی مخالفانہ رائے کیا وقعت رکھتی ہے۔"

میں بھی جناب اسد علی صاحب سے اتفاق کرتا ہوں کہ میرزا کا سارا کلام کیا نظم اور کیا نثر کیا اردو اور کیا فارسی، اغلاط کا طومار ہے اس میں زبان و بیان کی بے شمار خامیاں ہیں۔ بیشتر کلام بے معنی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ہندوستان بھر کے نقادانِ علم و فن اور صاحبانِ ذوقِ سلیم اور اس میں ماضی و حال کی کوئی قید نہیں، اسی پر از اغلاط اور بے معنی کلام کو بقول مولانا آزاد مرحوم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ اب ان سب کے خلاف ہم دو کی آواز کہیں نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر تو نہیں رہ جائے گی؟

خاصہ مضمون اچھا خاصا لمبا ہو گیا۔ واقعی مجھے جناب اسد علی صاحب کی جرأت پر تعجب ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ مکتبہ جامعہ نے ایسی کتاب کو اپنی طرف منسوب کرنا منظور کیا۔ جس میں واقعات غلط اور نتائج غلط تر ہیں۔ جس کا طرزِ تحریر پریشان اور بیانات متضاد ہیں۔ جس کے مصنف کو مزاح اور تحقیق کے درمیان امتیاز تک کا سلیقہ نہیں۔ جس نے دوسری جگہ سے نقل کرتے وقت اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ میں اصل کی غلطیاں ہی درست کر لوں۔ جس نے اپنے سارے گھروندے کی بنیاد ثانوی ماخذوں کی ریت پر رکھی ہے۔ کیا واقعی یہ تعجب کا مقام نہیں کہ غالب کی تصنیفات کے اقتباس اور حوالے ہیں اور ماخذ ایک جگہ بھی غالب کی اپنی کتاب نہیں بلکہ موقت الشیوع رسائل اور بعض انتخابات ہیں۔

مجھے تو قتیل پر رحم آتا ہے کہ انہیں وکیل بھی ملے تو وہ حضرت جنہیں اپنے موکل کا صحیح نام بھی معلوم نہیں۔ پھر شبہ ہوتا ہے کہ قتیل کا تو محض بہانہ تھا۔ کیونکہ کتاب کے ۱۳۰ صفحوں میں سے قتیل پر اعتراضوں کے جواب ۲۰ صفحوں میں آ گئے ہیں باقی سو صفحے غالب کے خلاف سیاہ کئے ہیں۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

مالک رام

دو نظمیں

زورِ خطابت

عرش سے اک ندائے کُن آئی کائنات اُٹھی لے کے انگڑائی
کتنی پُرزور یہ خطابت تھی!

(۲)

ارادہ

میرے غم خانے میں جب تُو آئے گا
بیٹھ کر روؤں گا تیرے سامنے اور بتاؤں گا نہ دُکھ اپنا تجھے!

سعید احمد اعجاز

خاکبازی

یہ ماحول کس کا بنایا ہوا ہے؛ مری روح پر کیوں یہ چھایا ہوا ہے؛
شکنجہ ہے بیرنگ فطرت نہیں یہ فریبِ تخیل ہے صنعت نہیں یہ
چمن کیا ہے؟ اک دام ہے رنگ و بو کا برا حال ہے "بلبلِ جستجو" کا
کھنچے جا رہے ہیں نگاہوں کے دامن کہ ہے خاک ہی گویا ان کا مدفن
اُلجھ کر خس و خار میں رہ گئی ہے نظر جھاڑ جھنکار میں رہ گئی ہے
زمیں کے تلے آسماں ڈھونڈتی ہے، حقیقت کو ظالم کہاں ڈھونڈتی ہے!
دلِ زار کی نو نیازی نے مارا نگاہوں کی اس خاکبازی نے مارا
زر و زور کی راجدھانی بنی ہے طلسمات دنیائے فانی بنی ہے

یہ فرعون گردی، یہ قارون نگاہی،
ٹلے گی بھی دنیا کے سر سے الٰہی؟

امینِ حزیں

غزل

پرسشِ پنہاں کو اک دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم
اس نگاہِ آشنا کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ غیر اپنی ہی نظر میں ہو گئے
واہ ری غفلت تجھے اپنا سمجھ بیٹھے تھے ہم

گوش بر آواز ہونا ہی شکستِ ساز ہے
اک سکوتِ غم کو ہنگامہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

ہوش کی توفیق بھی کب اہلِ دل کو ہو سکی
عشق میں اپنے کو دیوانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

پردۂ آزردگی میں تھی وہ جانِ التفات
جس ادا کو رنجشِ بے جا سمجھ بیٹھے تھے ہم

صد پیامِ ہوش لائی سختیٔ راہِ جنوں
غفلتوں کو عشق کا سودا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کیا کہیں الفت میں رازِ بے حسی کیونکر کھلا
ہر نظر کو تیری غم افزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

نیستی کی منزلیں بھی تھیں جہاں اندر جہاں
عاشقی کو تارکِ دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بے نیازی کو تری پایا سراسر سوز و درد
تجھ کو اک دنیا سے بیگانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

انقلابِ پے بہ پے ہر گردش و ہر دور میں
اس زمین و آسماں کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اب سکون و بے حسی، رنج و خوشی کچھ بھی نہیں
عشق کو اک درد کی دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بھول بیٹھی وہ نگاہِ ناز عہدِ دوستی
اس کو بھی اپنی طبیعت کا سمجھ بیٹھے تھے ہم

صاف الگ ہم کو جنونِ عاشقی نے کر دیا
خود کو تیرے درد کا پردا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کان بجتے ہیں محبت کے سکوتِ ناز کو
داستاں کا ختم ہو جانا سمجھ بیٹھے تھے ہم

باتوں باتوں میں پیامِ مرگ بھی آ ہی گیا
ان نگاہوں کو حیات افزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اب نہیں تابِ سپاسِ حسن اس دل کو جسے
بے قرارِ شکوۂ بے جا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ایک دنیا درد کی تصویر نکلی عشق کو
کوہکن اور قیس کا قصہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

دیکھتا کیا ہوں کہ دنیا میں قیامت آ گئی
اس نظر کو یونہی اک فتنہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

جلوۂ بے نقش و صورت کی بہاریں دیکھ لیں
موجِ رنگ و بو کو اک دھوکا سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہوتا چلا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

فراق گورکھپوری

اندھیرا

وہ مردانہ ٹوپیوں کی دکان تھی۔ بلوری دروازے پر گہرے نیلے رنگ کا بورڈ آویزاں تھا۔ اُس پر ایک شیشے کی نلی بل کھاتی ہوئی "ٹوپی والا" بن گئی تھی۔ رات کے وقت اس شیشے کی نلی سے بنے ہوئے حروف میں ایک برقی چمک لپک کر یہاں سے وہاں تک دوڑ جاتی اور "ٹوپی والا" روشن ہو جاتا اور پھر آپ ہی آپ گُل ہو جاتی۔ دکان کی سامنی دیوار شیشے کی بنی ہوئی تھی تاکہ دُکان میں سجے ہوئے سامان کی نمائش ہوتی رہے۔ اس بلوری دیوار کی دونوں جانب نہ کیا ہوا ایک آہنی جنگلا تھا جسے رات کو کھینچ کر مقفل کر دیا جاتا تھا۔ اور اس کے قریب دکان کا چوکیدار رات بھر پہرا دیا کرتا تھا۔

دکان میں ایک وسیع کمرا تھا۔ دودھیا دیواریں اور ستون گہرے نیلے رنگ کی پھولدار چھت سر پر اٹھائے کھڑے تھے۔ شیشے کی الماریوں میں گتے کے ڈبوں میں قسم قسم کی مردانہ ٹوپیاں رکھی تھیں۔ فرش پر نمائشی الماریوں میں رنگ رنگ کی ٹوپیاں چمک چمک کر آنے جانے والوں کو سر ڈھانپنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ قدِ آدم آئینوں پر سر اور ٹوپیوں کے متعلق دلچسپ ہدایات لکھی ہوئی تھیں: "سولا ہیٹ پہنئے۔ اور اپنے سر کو ٹھنڈا رکھئے"۔ "سر کو ایک ٹوپی میں قید مت کیجئے"۔ "ہر سمجھدار سر مناسب موقع پر مناسب ٹوپی پہنتا ہے"۔ وغیرہ۔

دُکان میں یہاں وہاں چاروں طرف خدا جانے کس چیز سے بنے ہوئے روغنی پتلے سروں پر ٹوپیاں رکھے کھڑے تھے۔ وہ سب کے سب مردانہ پتلے تھے۔ ہر پتلے کے سر پر مختلف قسم کی ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ سولا ہیٹ، فلٹ، گاف کیپ، نائٹ کیپ، رومی، کالی کرسٹی، شکاری ٹوپی، اونی ٹوپی وغیرہ تاکہ لوگوں پر الماری میں رکھی ہوئی ٹوپی اور سر پر پہنی ہوئی ٹوپی کا فرق واضح ہو جائے۔ یا شاید اس لئے کہ یہ امر اُن کے ذہن نشین ہو جائے کہ ٹوپی سر پر پہنی جاتی ہے یا اس لئے کہ اُن کی قوتِ متخیلہ ناجائز طور پر پریشان نہ ہو۔

ان پتلوں کے روغنی متبسم چہرے اور خوشنما لباس بہت جاذبِ نظر تھے۔ رات کا وقت تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک لٹکتی ہوئی برقی قندیل روشن تھی۔ آہنی جنگلے کے پرے چوکیدار کی پیٹھ دُھندلی دُھندلی نظر آ رہی تھی۔ ایک بھاری سے اوورکوٹ پر ایک لپٹی ہوئی پگڑی رکھی ہوئی تھی۔

دُکان کی دیوار پر گھڑی نے بارہ بجائے۔

سولا ہیٹ والے پتلے نے انگڑائی لی۔ آنکھیں ملیں۔ "اُف"! اُس نے دونوں باہوں کو سر کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ کمبخت ٹوپی جو میرے سر پر چڑھی ہوئی ہے۔ میں اسے اٹھا اٹھا کر اکتا چکا ہوں۔ خدا کی قسم! یہ ملعون ٹوپی! دن رات اسے سر پر اٹھائے کھڑے رہنا جیسے زندگی کا مقصد صرف ٹوپی اٹھا کر کھڑے رہنا ہی ہوا"۔

"کون ہے؟ کون ہے؟" گاف کیپ والے نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"وہی دیوانہ۔ سولا ہیٹ والا۔ اور کون"۔ رومی ٹوپی والے نے جواب دیا۔

"کیا کہتا ہے۔؟"

"خدا جانے کیا بکتا ہے"

"خدا کی قسم! مجھے شک ہے۔ مجھے تو اسی میں شک ہے کہ زندگی کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہم ٹوپیاں اٹھا کر کھڑے رہیں"۔

"ہا ہا۔ ہا ہا۔ ہا ہا" گاف کیپ والا اپنا تھیلا سنبھالتے ہوئے ہنسا "خوب خوب! گویا زندگی کا مقصد صرف ٹوپی اٹھائے کھڑے رہنا ہے۔ پاگل! پاگل! ہا ہا۔ ہو۔ ہو۔ ہو ہو۔ ہی ہی! قسم ہے اگر اس کے سر پر ٹوپی نہ ہوتی تو بھی اسے گلہ ہوتا کہ اُسے اپنے شانوں پر سر اٹھانا پڑتا ہے۔ یقین جانو!"

"ہاں۔ ہاں!" فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ کو سنوارتے ہوئے کہا۔ "اس فلسفی سے بھلا کوئی پوچھے کہ بڑے میاں اگر زندگی کا مقصد صرف ٹوپی اٹھائے کھڑا رہنا ہے تو تم نے اتنا لمبا اوورکوٹ کیوں پہنا ہوا ہے؟"

"ہاں ہاں۔ اوورکوٹ کیوں پہنا ہوا ہے؟"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔"

"آپ کیوں نہیں بولتا؟"

"ارے دیوانہ ہے دیوانہ۔"

کمرے میں چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔

"اوورکوٹ"! سولاہیٹ والے نے نفرت سے کہا۔ "کس نے کہا تھا کہ مجھے اوورکوٹ چاہئے کون اوورکوٹ مانگتا ہے اوورکوٹ! ــــ تمہیں کو یہ اوورکوٹ خوشنما نظر آتا ہوگا۔ میرے لئے یہ محض ایک مجبوری ہے۔ اوورکوٹ! ــــ جسے میں اتار نہیں سکتا۔ خود پہن بھی نہیں سکتا۔ جو خواہ مخواہ میرے گلے کا ہار ہو رہا ہے۔ میری لاچاری کا زندہ ثبوت ہے۔ خدا کی قسم! زندہ ثبوت ــ اور یہ ملعون ٹوپی جو میرے سر پر چڑھی بیٹھی ہے۔ خدا کی قسم یہ بڑی دلیر ٹوپی۔ آخ۔۔۔۔"

فیلٹ والے نے اپنے مکلف کالر سمیت گردن موڑی۔ اس دائمی مسکراہٹ کو جو اس کے ہونٹوں پر مہر کی طرح ثبت تھی بھینچ کر کہا۔ "دیوانے تم زندگی کو کیا جانو؟ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اتنی بڑی بات! ــــ یہ دودھیا دیواریں۔ یہ خوبصورت ستون۔ یہ رنگا رنگ کے ڈبے۔ یہ روشنی کا فوارہ۔ آئینے۔ بلوری ساز و سامان ــــ انہیں دیکھو۔"

"آہا!" سولاہیٹ والا دیوانہ وار ہنسا۔ "انہیں دیکھو! کسے دیکھوں! کیا دیکھوں! یہ دھندلی دھندلی دیواریں جو یہاں سے چل کر خدا جانے کہاں جا ختم ہوتی ہیں۔ یہ نیلے پیلے گتے کے ڈبے جن کے متعلق ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ ان میں کیا ہے۔ اور یہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی جو اندھیرے سے جھگڑ جھگڑ کر اکتا چکی ہے۔ اور اب۔ اب اپنی تھکی ہاری کرنیں سمیٹ رہی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ روشنی، یہ اندھیرا۔ یہ کون سی جگہہ ہے؟ ہم کون ہیں؟ کیوں ہیں؟ انہیں بنانے والا کہاں ہے؟ اور یہ ٹوپی خدا کی قسم! یہ ملعون ٹوپی۔"

"اس قدر کفران نعمت۔ نعوذ باللہ! نعوذ باللہ!" رومی ٹوپی والا بولا۔

"یہ نفس نہیں۔ یہ جوانی۔ اندھا ہے اندھا!"

"بھگوان دیا کرے" کالی ٹوپی والے نے کہا۔

"میں کہتا ہوں۔ بے چارہ معذور ہے" فیلٹ والے نے مسکراتے ہوئے کہا "جسے یہ ٹوپی کا بوجھ سمجھتا ہے۔ وہ درحقیقت اس کے پراگندہ خیالات کا بوجھ ہے۔"

کالی ٹوپی والے نے سر اٹھایا "گرو مہاراج۔ اگنی کے متعلق ایسے شبد کہنا۔ بھگوان دیا کرے۔ بھگوان دیا کرے۔"

"ہاں ہاں اس کے نور کے متعلق ایسی باتیں منہ پر لانا۔ استغفر اللہ! استغفر اللہ!" رومی ٹوپی والا بولا۔

"اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ جگہہ کون سی ہے جنٹلمین! یہ جگہہ ہمارے رہنے کے لئے بنی ہے۔ یہ سب خوشنما چیزیں ہمارے لئے ہیں۔ مجھے مجھے اس گاف سٹک کی قسم!" گاف کیپ والے نے اپنی سٹک گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ ہمارے لئے ہے۔ یہ دھاری دار سوٹ ـــــ"

"اس لئے کہ تم روشنی میں کھڑے ہو۔ یہاں آکر دیکھو۔ اس کونے میں۔" دائیں کونے سے نائٹ کیپ والے کی آواز آئی۔ "جہاں اچھی طرح سے اجالا۔ اندھیرے سے جدا نہیں ہوا۔ جہاں دودھیا دیواروں کی بجائے گدرے گدرے سائے گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ ان دھندلی وسعتوں کو آکر دیکھو تو ــــ تمہیں کسی کا مذاق اڑانے کا حق نہیں۔ تم اپنے آپ کے سوا اور کسی کو بھی سمجھ نہیں سکتے۔"

"خوب! اپنا آپ سمجھنا ــــ واللہ! کیا خوب! اپنا آپ کون سمجھتا ہے! کون! اتنا بھی نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ہی سمجھ سکیں۔ کیسا مذاق ہے جیسے دنیا کسی مداری کا تھیلا ہو۔ خدا کی قسم مداری کا تھیلا!" سولاہیٹ والا قہقہہ مار کر ہنسا۔

"گڈ لارڈ۔" فیلٹ والے نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "کون کہتا ہے کہ اپنا آپ سمجھو! ضرورت ہی کیا پڑی ہے کہ ہم اپنا آپ سمجھنے میں اپنی زندگی حرام کریں۔ جینا بذات خود ایک نعمت ہے۔ چاہے تم اسے سمجھ سکو یا نہ سمجھ سکو۔ یہ سانس لینا۔ یہ سونا۔ یہ جاگنا۔ یہ چمکدار روشنی!"

"خدا گواہ ہے کہ مجھے جینے پہ ناز ہے۔ الحمد للہ کہ میں جیتا ہوں۔ الحمد للہ کہ میں دیکھتا ہوں۔" رومی ٹوپی والے نے کہا۔

"کون کہتا ہے کہ زندگی کو سمجھو! کون کہتا ہے؟" گاف کیپ والے نے کہا۔ "میں کہتا ہوں۔ تم یا تو کیک کو کھا کر اس کی لذت سے محظوظ ہو سکتے ہو اور یا اسے اپنے سامنے رکھ کر اس پر غور و خوض کر سکتے ہو۔ تمہاری اپنی مرضی ہے۔ دونوں باتوں میں سے کوئی ایک چن لو۔ مگر ایک ہی وقت میں اس پر غور و خوض کرنا اور اُسے کھانے کی بھی خواہش رکھنا حماقت ہے۔ زندگی کو سمجھنا اور جینا دو متضاد باتیں ہیں۔ سنا آپ نے مسٹر! ذرا غور کیجئے نا!"

فلیٹ والے نے ہاتھ جیب میں ڈالے اور اطمینان سے کہا۔ "جو کچھ ہم ہیں وہ تو ہم ہی بدل نہیں سکتے۔ پھر اس بات کے متعلق سوچنے سے فائدہ؟"

"حماقت! اور کیا؟"

"ایسے احمق بھی ہیں!" اودی ٹوپی والے نے کہا۔ "ایسے شرفا بھی ہوتے ہیں جو جب تک دانت ہوں بادام کو سامنے رکھ کر اس پر غور و خوض کرتے رہتے ہیں اور جب دانت گر جائیں تو اُسے کھانے کی ناکام آرزو میں اور اس حسرت پر کہ اُسے کیوں نہ کھا لیا، کف افسوس ملتے رہتے ہیں ——— اللہ جانتا ہے۔ یہ کفران نعمت ہے۔ استغفر اللہ! استغفر اللہ!!"

"غم خور!"

"دیوانے!"

"سب بھگوان کے روپ ہیں۔ سب بھگوان کے روپ ہیں" کالی ٹوپی والے نے سر اٹھا کر کہا۔ "ایک سے ایک نہیں ملتا۔ ایک سے ایک نرالا ہے۔ بھگوان کے روپ کا کیا انت ہے"۔

"گستاخی معاف۔ بندہ تو جینے کا قائل ہے۔"

"الحمد للہ! الحمد للہ!"

"بندہ بھی تو جینے کا قائل ہے۔"

"ہاں ہاں جیو۔ تمہیں جینے سے کون روکتا ہے؟" نائٹ کیپ والا چلایا۔ "خوشی سے جیو۔ مگر اس بھلے مانس کو سوچنے سے کیوں روکتے ہو۔ تم جیو۔ اسے سوچنے دو۔"

"ہاں ہاں اُسے سوچنے دو۔"

"ہمیں کیا پڑی ہے کہ سارے جہان کا درد اپنے سر لیں۔"

"ہماری بلا سے۔"

"دیوانے کو کیا کہئے!"

(ہر کوئی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا)

"ہا ہا۔ ہا ہا۔ ہا ہا" سولا ہیٹ والا دیوانہ وار ہنسا۔ "گویا میں دیوانہ ہوں ——— میں پوچھتا ہوں۔ کون ہے جو دیوانہ نہیں! کون ہے؟ تم سب جینے کے دیوانے ہو اور میں سوچنے کا۔ دیوانگی کیا ہے! کون بتا سکتا ہے کہ دیوانگی کیا ہے! خدا کی قسم ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عقل کیا ہے۔ اس رسمی دنیا میں نہ سوچنے والا احمق۔ ڈر ڈر کر، پھونک پھونک کر سوچنے والا عقلمند اور بے دھڑک سوچنے والا دیوانہ ہے۔ خدا کی قسم عجب جھمیلا ہے"۔

"گڈ لارڈ!" گاف ٹوپی والے نے اپنی چھڑی کو ہوا میں گھماتے ہوئے کہا۔ "اس کمبخت نے ہماری زندگی حرام کر رکھی ہے۔"

"ہاں ہاں بالکل حرام کر رکھی ہے!"

"قطعی حرام!"

"اللہ جانتا ہے! اُف!"

"میں کہتا ہوں ذرا سوچو تو" نائٹ کیپ والے نے کہا۔ "اگر یہ چپ چاپ کھڑا رہے تو کیا تم سب گم صم کھڑے اکتا نہ جاؤ۔ کیا اس کے ایک ٹک نے ہماری زندگی دلچسپ نہیں بنا رکھی۔ شاید زندگی اسی جھمیلے کی وجہ سے اتنی دلکش نظر آتی ہو۔ کون جانتا ہے!"

"دلچسپ۔ آخ!"

"ہماری زندگی ———"

"تمہاری زندگی!" سولا ہیٹ والے نے حقارت سے منہ بنا کر کہا۔ "جسے تم زندگی کہتے۔ کیا ہے؟ بارہ بجے جاگنا اور پھر چار بجے جب مشرقی دروازے میں سفید سفید سا دھواں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے، سو جانا۔ دن رات۔ دن رات ایک دوسرے سے دور۔ یہ ملعون ٹوپی اٹھائے کھڑے رہنا۔ اتنا بھی نہیں کہ دو قدم چل سکیں۔ اُن دھندلی دھندلی شکلوں کی طرح چل سکیں جو ساری رات جب ہم سوئے ہوئے ہوتے ہیں، ہمارے ارد گرد ناچتی ہیں۔ خدا کی قسم ہم سے تو بھتنے ہی اچھے ہیں جو ناچتے پھرتے ہیں۔ زندگی۔ ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔ زندگی کے دیوانے۔ فرش میں گڑے ہوئے دیوانے!"

"زندگی کی حقیقت سمجھنے والے صاحب اگر تم اُسے مصیبت سمجھنے پر مصر ہو تو پڑے سمجھو۔ ہمارے لئے تو جینا ایک خوشنما مسکراہٹ

ہے" فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ سنوارتے ہوئے کہا۔

"مسکراہٹ" سولاہیٹ والے نے مسکرا کر کہا۔ "یہ بھی خوب رہی۔ اس مسکراہٹ پر ناز کرتے ہو جو تمہارے ہونٹوں پر کھڑی ہوئی ہے جس طرح یہ فیلٹ تمہارے سر پر پڑی ہوئی ہے تم اسے اتار نہیں سکتے اپنے سوٹ کے علاوہ تمہیں اس مسکراہٹ کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تم اُسے ایک پھوڑے کی طرح اٹھائے پھرتے ہو۔ خدا کی قسم پھوڑے کی طرح ہاہا۔ ہاہا۔ ہاہا۔"

"پھوڑا ہی سہی" فیلٹ کیپ والے نے کہا "تمہاری نظروں میں پھوڑا ہے نا۔ ہر کسی کی مسکراہٹ۔ دوسرے کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی ہے۔ یہ تو معمولی بات ہے۔"

"بھئی واہ کیا پتے کی بات کی ہے۔ مگر حضرت واضح ہو کہ بندہ تو جینے کا قائل ہے" گاف والے نے کہا۔

"علیٰ ہذا القیاس" فیلٹ والا بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے" نائٹ کیپ والا مدھم آواز میں کہنے لگا "انہیں جینے دو۔ اُن کے لئے جینا واقعی ایک مسکراہٹ ہے۔ اس لئے کہ وہ روشنی میں کھڑے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے ارد گرد بلوری سامان بکھرا ہوا ہے۔ روشنی میں بلور۔ بلور رنگ لاتا ہے اور روشنی میں کپڑوں پر رنگدار دھاریاں ابھر آتی ہیں۔ اور مسکراہٹیں خوشنما محسوس ہوتی ہیں۔ یہ رنگ یہ روپ یہ بلور یہ سب روشنی کا دھوکا ہے۔ روشنی کا فریب۔"

"اُس کے نور کو دھوکا سمجھنا۔ توبہ ہے توبہ" سرخ ٹوپی والا کہنے لگا "اُسی کے روپ ہیں۔ یہ اجالا یہ اندھیرا سب اسی کے روپ ہیں۔ بھگوان کے روپ کا کوئی انت نہیں۔"

"کہاں ہے اجالا! کہاں ہے اجالا؟" اوپر سے مدھم آواز سنائی دی جیسے دور اُن دھندلی وسعتوں میں کوئی کراہ رہا ہو۔ "یہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ بوجھل اندھیرا۔ میرا اس اندھیرے میں دم رکتا ہے۔ میں کہاں ہوں۔ میری کالی ٹوپی اور ڈریس سوٹ کیا ہوئے۔ تم سب کہاں ہو؟ اُف یہ گہرا اندھیرا!"

کچھ دیر کے لئے کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ گویا سب ڈر کے مارے گونگے ہو گئے تھے۔

"کون ہے؟"

"کون بولا؟"

"سنا تم نے!"

"چپ۔ وہ کراہ رہا ہے!"

"سنو سنو!"

"آہ کبھی میں بھی روشنی میں تھا" اوپر سے وہی آواز آئی "مگر اب ——— اب میں اس اندھیرے کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں۔ میرا دم رکتا ہے۔"

"مالک۔ مالک!"

"سنا تم نے" نائٹ کیپ والے نے کہا۔

"کون ہے؟" فیلٹ والے نے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ وہ ہے جو کسی زمانے میں ڈریس سوٹ پہنے، کالی ریشمی ہیٹ لگائے اُس جگہ کھڑا تھا جہاں اب تم کھڑے ہو" نائٹ کیپ والے نے طنز بھرے انداز میں کہا۔ "پھر اُس کی وہ مسکراہٹ جس پر تمہیں ناز ہے مدھم پڑ گئی۔ اس کے چہرے کی سرخی اور چمک مدھم پڑ گئی۔ پھر ——— پھر وہ یہاں سے اٹھوا دیا گیا اور اب خدا جانے کہاں پڑا ہے۔ جہاں تم کو بھی ایک روز جانا ہو گا۔"

"مجھے!" فیلٹ ہیٹ والے نے اپنے کالر اور گردن کے درمیان انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، تمہیں!"

گاف والے نے اپنا تھیلا چھاتی سے لگا کر بھینچ لیا۔

کالی ٹوپی والے نے خوف زدہ نگاہوں سے اوپر دیکھا —

"ہے بھگوان!"

شکاری نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے۔ چھاتی پہ صلیب کا نشان بنایا۔

کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

سولاہیٹ والا دیوانہ وار ہنسا۔ "ڈر گئے! خدا کی قسم سب ڈر گئے ——— سوچتے کیا ہو؟ جیو۔ پیٹ بھر کر جیو۔ یہ دودھیا دیواریں۔ یہ بلوری ساز و سامان۔ یہ روشنی کا فوارہ! خوب جیو ——— جو کچھ بھی تم ہو۔ وہ تو تم ہو ہی، بدل نہیں سکتے۔ پھر بھلا سوچنے سے فائدہ! بادام کھا لو، ورنہ دانت گر جائیں گے تو کف افسوس ملو گے۔ آج روشنی میں کھڑے ہو کر کل آنے والے اندھیرے سے ڈرنا حماقت ہے۔ دیوانگی ہے۔ خدا کی قسم دیوانگی!

ہا ہا ہا ہا۔ ڈر گئے!

"چپ چپ" آہنی جنگلے کے پاس کھڑے شکاری نے کہا۔

"کون ہے؟"

"چپ چوکیدار"

"چوکیدار ادھر دیکھ رہا ہے!"

"چوکیدار؟"

"ہاں ہاں۔ وہ ادھر دیکھ رہا ہے۔"

جنگلے کے باہر چوکیدار کی دھندلی شکل نظر آ رہی تھی۔ منہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ دو اندر دھنسی ہوئی آنکھیں جن پر دو بڑی بڑی بھوریں بھویں ابھری ہوئی تھیں۔

"کون چوکیدار! جس چیز کو میں سمجھ ہی نہیں سکتا اس سے کیوں ڈروں" سولا ہیٹ والا بولا "اس کی شکل تو دیکھو۔ جیسے کوئی بھیانک خواب ہو۔ جیسے یہ بھی کسی اندھیرے نے بوجھ تلے دبا رکھا ہو۔

خدا کی قسم مجھے شک پڑتا ہے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ شخص ہم سے بھی زیادہ دکھی ہے۔ وہ دیکھو اس کے سر پر کوئی ٹوپی سے بھی بھاری چیز رکھی ہوئی ہے۔"

اونہوں۔ چیز نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو! گاف کیپ والے نے کہا

"سن لے۔ مجھے قطعی پروا نہیں۔ میں اس بھیانک شکل سے نہیں ڈرتا

بے چارہ بھوت!

نہیں تم بھوت کہتے ہو۔ جو رات کو جس وقت ہم سو رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد پھرتے ہیں۔ دن کے وقت وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آ سکتے؟ خدا کی قسم مجھے یہ شبہ ہے کہ یہ بھوت ہم سے بھی زیادہ معذور ہیں۔ دکھی ہیں۔ ان کو بھی سور ٹوپیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اف یہ ملعون ٹوپی!"

"انہیں کون نہیں جانتا۔ کون نہیں جانتا" فیلٹ والے نے چوکیدار کے جانے کے بعد کہا۔

"سبھی جانتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ جانتے ہیں"

"کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ اس بلوری دروازے کے پرے بھوتوں کی نگری ہے"

"تم نے نہیں پڑھا مہاراج! اندھیر نگری چوپٹ راج۔"

"بھوتوں کی بات نہ کیجئے صاحب۔ لاحول ولا قوۃ" راند سے ہوئے

"پھر تم چوکیدار سے کیوں ڈرتے ہو؟" سولا ہیٹ والے نے کہا۔

"کون ڈرتا ہے۔" گاف کیپ والا چھڑی گھما کر بولا۔

"بے چارہ چوکیدار!" فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بے چارہ۔"

"ہماری خدمت کے لئے یہاں کھڑا رہتا ہے۔"

"نوکر جو ہوا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔"

(سب بے دھڑک بول رہے تھے)

"گڈ نیس" سولا ہیٹ والا حقارت سے چیخ اٹھا "ہمارا ہی خدمتگار اور ہمارے سر پر ہی ڈنڈا لے کر کھڑا رہے! خوب! آپ صاحبان کے کیا کہنے ہیں۔ آپ ہی کی خدمت کے لئے ایک بھوتوں کا جہان بنایا گیا ہے۔ آپ کی آنکھوں کو چکاچوند کرنے کے لئے یہ بلوری سامان بنا ہے۔ خدا کی قسم آپ کے کیا کہنے ہیں۔ اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر سمجھنا۔ اشرف المخلوقات خیال کرنا، اپنی عظمت پر ایمان رکھنا یہی جینا ہے۔ خدا کی قسم جینا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ دھوکا ہے فریب ہے۔ تم واقعی جیتے ہو۔

جیو۔ پیٹ بھر کر جیو۔ گھر کو آگ لگا کر تماشا دیکھو۔ یہی زندگی ہے۔

ہا ہا ہا۔ ہا ہا۔"

"کون ہنستا ہے! کون ہنستا ہے! میرے دکھ پر کون ہنستا ہے!"

اوپر سے آواز آئی۔

"سنو۔ سنو۔"

خدا کی قسم یہ بھوت ہی ہم سے بہتر ہیں۔" سولا ہیٹ والا اپنی ہی دھن میں چیخ رہا تھا "ان کے پاؤں میں حرکت ہے۔ وہ چل پھر سکتے ہیں۔ اور ہم! اس رنگین فرش پر یوں کھڑے ہیں۔ جیسے یہ ستون۔ ہم کیوں چل پھر نہیں سکتے؟ کیوں! خدا کی قسم میں چلنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے بنانے والے کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ یہ اندھیرا کیوں ہے! یہ دیواریں کہاں جا کر ختم ہوتی ہیں! اور یہ کمبخت ملعون ٹوپی . . . .!"

"خبردار حرکت نہ کرنا۔ حرکت گناہ ہے۔" رومی ٹوپی والے نے کہا۔

"شانتی . . . . . شانتی . . . . ." کالی ٹوپی والا گنگنایا۔ "حرکت دھوکا ہے۔ آنکھ کا دھوکا۔ حرکت کے لوبھ میں نہ پڑو۔ تم بھوت بن جاؤ گے

"تمہاری آتما کو شانتی نہیں ملے گی۔ شانتی..... شانتی...... شانتی.....
ہے بھگوان! سب تیرے ہی روپ ہیں۔ تو ہی حرکت ہے، تو ہی شانتی ہے
مگر ہمیں حرکت راس نہیں۔"

"کون کہتا ہے حرکت گناہ ہے گناہ کیا ہے! جو بات بس میں نہ ہو
وہ گناہ ہے۔ گناہ!"

"گناہ اور ثواب سب دل کی تسلیاں ہیں۔ جینے کا سامان ——

خدا کی قسم میں حرکت کروں گا۔ میں اپنے پاؤں پر چلوں گا۔ میں اس سے ملوں گا۔ پوچھوں گا۔ یہ کیا کھیل کھیل رہے ہو! یہ کھلونے کیا ہیں!

کیوں ہیں اور یہ کمبخت ٹوپی جو میرے سر پر چپکی بیٹھی ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں!"

"مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔" اوپر سے کسی کے کراہنے کی آواز۔

"ہاں ہاں، میں بچاؤں گا۔ میں آتا ہوں۔ چاہے حرکت کرنے میں میرا سارا عرصہ ہی کیوں نہ صرف ہو جائے۔"

"کیا کہا! چلنا چاہتا ہے!"

"میرے اللہ!"

"ارے ارے ارے!"

"ہے بھگوان!"

سولا ہیٹ والے کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں قوت کے صرف سے پھول گئی تھیں۔ وہ اپنی تمام قوت سے حرکت کی کوشش کر رہا تھا۔

(سب کی نگاہیں سولا ہیٹ والے پر جمی ہوئی تھیں)

"خدا کی قسم اس کی ٹانگ ہل رہی ہے۔"

"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو!"

"کہاں!"

"وہ پھر ہلی!"

"میرے اللہ اُس کی ٹانگ اُٹھ رہی ہے۔"

"کیا کہا!"

"وہ چل رہا ہے!"

"ہا ہا ہا ہا ہا!" سولا ہیٹ والے نے ایک قدم چل کر کہا۔ "میں چل —— میں چل سکتا ہوں۔ میں چل سکتا ہوں!

خدا کی قسم میں چل سکتا ہوں۔ میں مالک سے ملوں گا۔ میں اُس سے پوچھوں گا۔ یہ اندھیرا کیوں ہے؟ میں اُسے ڈھونڈ نکالوں گا!"

"ہاں ہاں ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"ہاں۔ ہم پوچھیں گے۔ یہ اندھیرا کیوں ہے!"

"اگر مجھے بھی چلنا سکھا دو تو —— فنکاری نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہمیں بھی چلنا سکھا دو۔"

"میں سکھاؤں گا۔ تم سب کو چلنا سکھاؤں گا بالکل آسان ہے۔ خدا کی قسم بالکل آسان۔ اپنے تمام ارادے سے چلنے کا خیال دل میں جما لو۔ اپنی تمام قوت کو حکم دو کہ وہ تمہارے پاؤں میں آ جائے۔ اپنے دل میں یہ ایمان پیدا کرو کہ تم چل سکتے ہو۔ ہاں کوشش کرو کوشش۔ چلو..... چلو.....!"

تمام پتلے اس کے کہے پر عمل کرنے لگے۔

"واللہ کیا خوب!" رومی ٹوپی والے نے پاؤں اٹھا کر کہا۔

"گڈ لارڈ!"

"ارے واہ!"

"بھئی خوب!"

(سب کے پاؤں آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ انہوں نے ایک ایک قدم اٹھایا)

"ہاں ہاں ہم چل سکتے ہیں۔"

"خوب خوب"

(کلاک نے ساڑھے تین بجائے)

"اوہ! ساڑھے دس" سولا ہیٹ والے نے کہا۔ "ٹھہرو" (وہ سب اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر گئے) "اب رات ہو چکی ہے۔ آج نہیں۔ کل ہم سب جائیں گے۔ کل ہم اپنے مالک اور بنانے والے کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ اُس سے پوچھیں گے کہ یہ اندھیرا کیوں ہے! خدا کی قسم کل ضرور جائیں گے"

"ہاں ہاں ہمیں بھی ساتھ لے چلنے گا۔"

"جی ہاں۔ ہم سب کو۔"

"ہاں ہاں۔ یہ اندھیرا کیوں ہے!"

"اور۔ اور یہ بوجھل تھیلا۔ میں اسے اُٹھائے اُٹھائے تھک گیا ہوں۔" گاف والے نے کہا۔

"اور یہ ٹوپی۔"

"اور یہ دائمی مسکراہٹ جو میرے ہونٹوں پر ثبت کی گئی ہے۔

میری ٹانگیں اکڑ گئی ہیں"۔ فیلٹ والے نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"خاموش" سولا ہیٹ والا بولا "اُٹھو۔ اب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ رات ہونے کو ہے۔ کل۔ کل خدائی قسم" اُس نے اپنی جگہ واپس جاتے ہوئے کہا "یہ اندھیرا۔ اور۔ اُف یہ کم بخت ٹوپی" اس نے اپنی گرتی ہوئی ٹوپی کو سنبھالنے کی کوشش کی ۔۔۔

"تڑاخ"۔ ایک دھماکے کی آواز آئی۔ سولا ہیٹ والا پتلا فرش پر گر کر چور چور ہو گیا۔

"کیا ہوا؟"

"آف!"

"ارے!"

"بھگوان!"

(تمام چہرے خوف سے بھیانک ہو رہے تھے)

اگلی رات وہ سب یوں بیدار ہوئے۔ جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگے ہوں۔ نائٹ کیپ والے کو سولا ہیٹ والے کے ٹوٹنے کا علم نہیں تھا۔ وہ وہیں اپنی جگہ کھڑا چیخ رہا تھا۔

"میں کہتا ہوں۔ تم سب چپ کیوں ہو۔ جواب دو۔ کیا تم نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آج مالک کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس سے پوچھیں گے کہ یہ اندھیرا کیوں ہے؟ بھول گئے کیا؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"چلنا نہیں کیا؟"

"اونہوں۔ توبہ ہے"۔

"دیکھا سولا ہیٹ والے نے چلنے کی کوشش کی تھی۔ بے چارہ اپنی جان کھو بیٹھا"۔

"دیوانہ تھا۔ دیوانہ"

"میں نے تو کہا تھا۔ حرکت گناہ ہے"

"ارے! یہ کون؟" فیلٹ والے نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔

"کیا کہا؟"

"کون ہے؟"

"کدھر ہے؟"

"وہ دیکھو" فیلٹ والے نے انگلی سے اشارہ کیا۔ سب کی نگاہیں اُدھر اُٹھ گئیں۔

اُس جگہ جہاں کل سولا ہیٹ والا کھڑا تھا۔ ایک نیا عورت کا پُتلا تھا۔ جس کے پاس ایک بچہ کھڑا تھا۔ بچے کے سر پر تنکوں کی ٹوپی تھی۔ اس نے عورت کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ عورت کے بدن پر زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی لپٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ مگر وہ کالی کالی پُتلیاں دوڑتی ہوئی کونوں میں آ کر دیکھ دیکھ کر مسکراتیں۔ چہرے پر حیا کا کچھ ایسا عالم تھا۔ جیسے وہ ایک ہی وقت میں اپنی نمائش بھی چاہتی ہے اور اپنے کو چھپانا بھی۔

"گڈ لارڈ" شکاری نے کہا۔

"کتنی حسین ہے!" گاف کیپ والے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"یہ ہے کون؟"

"روشنی سے بڑھ چڑھ کر خوبصورت ہے"

"دیوی ہے دیوی!"

"کہاں ہے روشنی؟" اوپر سے آواز آئی "میں خود آؤں گا۔ میں آؤں گا۔ مگر۔ آہ یہ اندھیرا۔ یہ اندھیرا"۔

"سنتے نہیں ہو؟" نائٹ کیپ والے نے کہا۔ "اس کی مدد کرو جواب نہیں دیتے؟ اچھا نہ سہی میں خود آؤں گا۔ میں اپنے پاؤں چلتا آؤں گا"۔

"آخاہ! فیلٹ والا چلّا کر بولا "میں چل سکتا ہوں۔ میں چل سکتا ہوں"

"خوب خوب"

"ٹھہرو۔ میں بھی آتا ہوں"

وہ سب چل کر عورت کے پتلے کے اردگرد آ کھڑے ہوئے۔

"تم کون ہو؟"

"دیوی!"

"کتنی سندر ہے!"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

عورت نے اپنی آنکھیں اور بھی جھکا لیں "میں ناری ہوں"

انہوں نے یوں محسوس کیا جیسے کسی منوّر وادی میں کوئی راہ گیر چلتے چلتے آساوری کی تان مار گیا ہو۔

"آہ۔ ناری"

"کتنی پیاری ہو"

"او۔ ڈارلنگ"

دیوی!

اوہ میں بھی چل سکتا ہوں۔ ہاں ہاں۔ میں آتا ہوں۔ میں آرہا ہوں"۔

نائٹ کیپ والے کی آواز آئی۔ اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اُن کے روبرو آکھڑا ہوا

——— چلو چلو۔ ہم سب جائیں گے۔ چلو۔ ہم اُس سے پوچھیں گے۔ یہ اندھیرا کیوں ہے! تم نے وعدہ کیا تھا۔ چلو"

"ہاں ہاں۔ تم جاؤ۔ میں اور ناری یہاں ٹھہریں گے"۔ فیلٹ والے نے ناری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ٹھیک ہے۔ تم جا کر پوچھ آؤ"۔

"ہاں ہاں۔ آخر ہم سب کو جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں ناری!

"بالکل!

بھائی میں تو جینا چاہتا ہوں تم جاؤ۔ مجھے جینے دو۔ کیوں ناری!"

گاف کیپ والا بولا۔

"ناری۔ ناری۔ ناری کون ہے؟" نائٹ کیپ والے نے پوچھا۔ پھر اُس کی نگاہ عورت کے پتلے پر جا پڑی "ارے میرے اللہ! تم کون ہو؟" وہ بھاگ کر آگے بڑھا "اوہ! میں سمجھا۔ اب میں سمجھا۔ تم زندگی کا بھید ہو" وہ عورت کے سامنے جھک گیا

"ہاں ہاں زندگی کا اُجالا!

"سبحان اللہ سبحان اللہ" رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا سنوارتے ہوئے کہنے لگا۔

"سب بھگوان ہی کے روپ ہیں۔ یہ بالک یہ ناری یہ جیون یہ اُجالا" کالی ٹوپی والے نے کہا۔

عورت نے سر اٹھایا اور ہنس پڑی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے دور کوئی نقرئی گھنٹیاں بجا رہا ہو۔

کہاں ہے اجالا! کہاں ہے اُجالا؟ اُف یہاں کتنا اندھیرا ہے" اوپر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔

"کہاں ہے اندھیرا! کہاں ہے اندھیرا؟" نائٹ کیپ والا بولا۔

"ہاں ہاں۔ اندھیرا کہاں ہے۔ یہ روشنی یہ بلوری ساز و سامان یہ سندر ناری۔ زندگی کتنی دلکش ہے"۔

"سب اُجالا ہی اُجالا ہے۔ بھگوان تو اُجالا ہی اُجالا ہے تیرے روپ کا کوئی انت نہیں!" کالی ٹوپی والے نے ناری کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جانتے ہو! خدا نے کہا، اُجالا ہو جائے۔ دفعتاً سب اُجالا ہی اجالا تھا۔ مقدس کتاب میں یہی لکھا ہے"۔

فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، اندھیرا کہاں ہے! اندھیرا دل میں ہو تو ہو۔ یہاں تو اُجالا ہی اُجالا ہے"۔

اُف یہ اندھیرا۔ اُف یہ اندھیرا ———"

عورت نے مسکرا کر بچے کو چوم لیا اور وہ سب اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے!

ممتاز مفتی

سنگِ آستاں

سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے
جوانی کو،
ہے نغمہ جس میں خوابیدہ انہیں تاروں کی حرکت سے
ہیں بے آواز گا ہستی کو مجسم شکل کی صورت۔
انہیں تاروں کو خوابوں سے جگانے دے مجھے، اے رات کے ساقی!
دکھانے دے مجھے جلوہ ستاروں کے الجھنے کا،
اسی منظر کو لے آؤں گا میں پھر سے نگاہوں میں
جو ہے باقی،
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی دیوی کے آنچل میں۔

پکڑ کر ہاتھ میں پنچھی کو اس دھرتی کے جنگل میں
اسی خلوت کے محل میں
ترے دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے۔
اسی نغمے کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں

مجھے معلوم ہیں باتیں،
وہ باتیں جو اچھوتی ہیں، پرانی ہیں،
مگر نادان ہیں جذبے
ارادہ ہے کہ لے کر آج اِن جذبوں کو میں تاریک غاروں میں۔
بنوں گا ہم سفر تیرا۔

چل آ، رنگیں کہانی کو
شروعِ عشق کی منزل سے لے بھاگیں،
اُسے اِس رات کے پچھلے اندھیرے میں
وہاں پر لے کے پہنچا دیں
جہاں ہے گوہرِ مقصود پوشیدہ نگاہوں سے
سہانی گرم آہوں میں!

میراجی

مرزا غالب کی تاریخ گوئی

تاریخ گوئی کی ابتدا کب ہوئی، یہ صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کی ابتدا کو بہت زمانہ گذرا۔ ادبی حیثیت سے اس کی اہمیت نہ ہو لیکن اس فن کے دلچسپ اور کارآمد ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

تاریخ گوئی ایک عالمگیر فن ہے اور اس کے عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی، فارسی، اردو، یہاں تک کہ انگریزی تک میں یہ صنف رائج ہے اور اصحابِ ذوق اس سے دلچسپی لیتے ہیں۔ انگریزی میں جو تاریخیں نکالی جاتی ہیں وہ بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔

انگریزی حروفِ تہجی میں سے صرف سات حرفوں کے اعداد مقرر ہیں:-

I = ۱ - V = ۵ - X = ۱۰ - L = ۵۰ C = ۱۰۰ , D = ۵۰۰ - M = ۱۰۰۰

یہ حروف اگرچہ تاریخ گوئی کے لئے ناکافی ہیں پھر بھی بعض حضرات نے طبع آزمائیاں کی ہیں اور تعمیہ تخرجہ کر کے تاریخیں نکالی ہیں۔ ہم یہاں پر دو تاریخیں درج کرتے ہیں:-

(۱) مسٹر ہیرمن بکنل Herman Bcknell نے حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کی تاریخ وفات ان کے مشہور مادۂ وفات خاکِ مصلیٰ (۷۹۱ھ) سے اس طرح نکالی ہے:-

THRICE TAKE THOU EROM
MUSALLA'S EARTH
ITS RICHEST GRAIN

یعنی خاکِ مصلیٰ سے اس کا سب سے قیمتی دانہ تین بار نکالو۔ تاریخ اس طرح نکلتی ہے کہ پہلے مصرعے کے الفاظ میں جتنے قابل اعداد حروف ہیں ان کے اعداد میں سے دوسرے مصرعے کے قابلِ اعداد حروف کے عدد تین بار نکال لئے جائیں۔ مصرعہ اول میں ایسے صرف تین حروف ہیں۔ M · L · L جن کے عدد ۱۱۰۰ (گیارہ سو) ہوتے، دوسرے مصرعے میں یہ چار حروف ہیں I · I · C · I جن کے ۱۰۳ (ایک سو تین) ہوتے ان کے تگنے اعداد ۳۰۹ کو ۱۱۰۰ میں نکالے تو ۷۹۱ باقی بچتے ہیں جو سالِ وفاتِ حافظ ہے۔

(۲) ملکہ الزبتھ کے فوت ہونے کی تاریخ ہے:-

MY DAY IS CLOSED IN
IMMORTALITY

یعنی میری زندگی غیر فانی ہو کر ختم ہوتی ہے۔ اس میں ایک صنعت یوں کی گئی ہے کہ تمام الفاظ کے صرف پہلے حروف سے تاریخ نکلتی ہے۔ اس جملہ میں پہلے حروف M · D · C · I · I · I ہیں جن کے ۱۶۰۳ ہوئے اور یہی سال وفات ملکہ الزبتھ ہے۔

تاریخ گوئی کا رواج عربی شاعری میں بھی ہے لیکن فارسی اور اردو میں بہت ہے۔ اردو کے شاعروں میں ناسخ لکھنوی اور مومن کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ یہ دونوں بات بات پر تاریخیں کہتے تھے۔

مشہور ہے کہ جب میر گھسیٹا نام کے ایک شخص مر گئے تو انہوں نے برجستہ یہ ظریفانہ تاریخ کہی ؎

جب میر گھسیٹا مر گئے ہائے ہر ایک نے اپنے منہ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سن کے تاریخ افسوس کہ موت نے گھسیٹا

آغا میر نے سوا لاکھ روپیہ نصیر کا انعام دیا۔ انہوں نے دوسرے کے گھر محفوظ کرا دیا، لوگوں نے جانا انہیں کے گھر ہے، چور نے رات کو

نقب لگائی اور ناکام ہو گیا آپ نے تاریخ کہی

دزد در خانۂ ناسخ بنہ نقب اندر شب نہ زر دید و نہ درہم نہ سیم آمد بیرون

ہر تاریخ ... ہی ... دزد از خانۂ مفلس تہی آمد بیروں

تذکروں میں مرقوم ہے کہ بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔

صحت پائی تو تاریخ کہی غ رفت تپ تو بہ من ۱۲۳۵ھ

غسل صحت کیا تو کہا ع شود صحت ہمایون و مبارک ۱۲۳۵ھ

ایک مرتبہ قتل ہوتے ہوتے بچے کہا کنم شکر خدا ۱۲۳۵ھ

حریفوں نے نظر بند کرا دیا کہا ع ہے افسوس خانہ زنداں گردید

جن کی سفارش سے چھوٹے ان کا شکریہ ادا کیا ع

رہا نیدی مرا از دست گرگے

کسی نے خطوط چرا لئے کہا ع سیاہ ہم چو قلم دروئے حاسد من

چار خط ہو جاتے رہتے فرمایا ع صد حیف ملف چہار نامہ۔

چھت سے سانپ گرا تاریخ کہی ع بسے مارا ز فلک بر من بیفتاد

خواجہ وزیر کی شادی ہوئی تو کہا ع شدہ نوشہ وزیر من امروز [1]

ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا فرمایا ع صبح طالع شد برآمد آفتاب

مومن بھی اس صنف میں کسی طرح کم نہ تھے۔ لیکن ان کی تاریخیں ناسخ کی طرح سیدھی سادی اور روانی میں ہوتی تھیں بلکہ تخرجہ و تعمیہ کے ساتھ ہوتی تھیں چند ملاحظہ ہوں

اپنے والد کے وفات کی تاریخ کہی۔

بہ من الہام گشت سال وفات کہ غلام نبی بحق پیوست

غلام نبی کے اعداد ۱۱۳۳ کے ساتھ حق ۱۰۸ ملائیں سن وفات ۱۲۴۱ھ نکل آتے ہیں۔

اپنی صغیر سن لڑکی کی تاریخ وفات کہی۔

خاک بر فرق دولت دنیا من فشاندم خزانہ بر سر خاک

خزانہ کے اعداد ۶۶۳ سر خاک یعنی خ ۶۰۰ کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ھ ہوتے ہیں۔

زین خاں نامی شخص حج کو گئے پھر رستے سے پھر آئے برجستہ کہا ع

چوں بیدید ہنوز خر باشد ۱۲۵۶ھ

شاہ محمد اسحق صاحب نے دلی سے ہجرت کی تاریخ کہی

گفتم وحید عصر اسحق بر حکم شہنشہ دو عالم

بگذاشتہ دار حرب امسال جا کردہ بہ مکۂ معظم

وحید عصر اسحق کے اعداد مکۂ معظم کے اعداد کے ساتھ ملاؤ پھر دار حرب کے اعداد اس میں سے تفریق کرو تو ۱۲۶۲ھ نکلتے ہیں۔

ایک شخص قلعۂ دہلی سے باہر نکالا گیا تاریخ کہی ع از باغ خلد بیروں شیطان بے حیا شد

"باغ خلد" کے اعداد ۱۶۳۷ سے "شیطان بے حیا" کے اعداد ۴۰۱ نکال لئے جائیں تو ۱۲۳۶ نکلتے ہیں۔

اپنی بچی کی تاریخ ولادت کہی ع

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے کہی تاریخ دختر مومن

دختر مومن کے اعداد ۱۳۴۰ میں سے "نال" کے اعداد ۸۱ نکال لئے جائیں تو ۱۲۵۹ھ ہو جاتا ہے۔

کوٹھے سے گرے تاریخ کہی ع دست و بازو بشکست ۱۲۴۸ھ

شاہ عبدالعزیز رہ کی وفات کی تاریخ کہی ع

دست بے داد اجل سے بے سر و پا ہو گئے فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

الفاظ معطوفہ کے اول و آخر کے حرفوں کو گرا کر بیچ کے حرفوں کے عدد لئے جائیں تو ۱۲۳۹ رہتے ہیں اور یہی مطلوب۔

سادی تاریخیں بھی بہت بہتر کہتے تھے۔

خلیل خاں کے ختنہ کی تاریخ کہی سنۃ خلیل اللہ ۱۲۶۹ھ

اپنی عمر کے مرنے کی تاریخ کہی۔ لہا اجر عظیم

والد کی وفات کی تاریخ کہی۔ قد فاز فوزاً عظیماً

ناسخ و مومن کے علاوہ بھی بعض اردو شعرا کو اس صنف سخن سے کافی دلچسپی تھی، مصحفی متوفی ۱۲۴۰ھ بھی کثرت سے تاریخیں کہا کرتے تھے ان کے قلمی دواوین میں بلی، طوطے، اور بکری کی موت پر بھی تاریخیں موجود ہیں، اس لحاظ

---

[1] بعضوں کو برجستہ تاریخ کہنے میں ملکہ حاصل ہوتا ہے اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۴۰ھ کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا ان کی پانچسو سے زیادہ تصانیف ہیں اور تقریباً سبھوں کے نام تاریخی ہیں، آپ کی تاریخ گوئی کی شہرت سن کر ایک شیعی صاحب تشریف لائے اور امتحاناً کہا میں نے ایک امام باڑہ تعمیر کیا ہے اس کا کوئی تاریخی نام بتائیے مولانا معاملہ سمجھ گئے اور فرمایا "بدر فیض" انھوں نے کہا لیکن اس کی تکمیل پارسال ہی ہو چکی تھی آپ نے فرمایا "دار فیض" نام رکھئے، انہیں اب بھی اطمینان نہ ہوا عرض کی حضرت لیکن اس کی تو تیسرے ہی سال پڑ چکی تھی اعلیٰحضرت نے تبسم فرمایا اور فرمایا تو اسے "در فیض" کر دیجئے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کسی نے آپ کو ایک چشمہ پیش کیا آپ نے برجستہ تاریخ کہی ع چشم ما روشن دل ما شاد ۱۳۴۲ھ (محمد جلال الدین احمد آزاد)

سے میرزا غالب عجیب طبیعت کے واقع ہوئے تھے۔ کہنے کو یوں وہ طویل طویل قصیدے ایک نشست میں کہہ جاتے تھے لیکن تاریخ کہنا انہیں بڑا شاق گذرتا، اس کا ذکر انہوں نے اپنے مکاتیب میں کئی جگہ کیا ہے جس سے ہم آگے بحث کریں گے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ دوسرے مادۂ تاریخ دے دیتے۔ غالب اسے نظم کر دیتے۔ یہ ان کے لئے آسان تھا، مادہ ڈھونڈنے کی زحمت وہ گوارا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی تاریخیں بہت بلند پایہ رکھتی ہیں، میرزا غالب نے سیدھی سادی تاریخیں بھی کہی ہیں جیسے ؎

فتح سید غلام بابا خاں — خود نشان دوام اقبال است
ہم ازیں رو بود کہ غالب گفت — "ظفر نامۂ ابد سال" است

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر — کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب — نہ کیوں ہو مادہ سالِ عیسوی محظوظ

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہوا بزمِ طرب میں رقص ناہید
کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے — تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"

اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ایسی تاریخیں بھی کہی ہیں جن میں تخرجہ یا تعمیہ ہے، لیکن بہت ہی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

نواب میر جعفر علی خاں کے انتقال پر ایک قطعہ موزوں کیا ؎

گردید نہاں مہرِ جہاں تاب دریغ — شد تیرہ جہاں بہ چشمِ احباب دریغ
ایں واقعہ را ز روئے زاری غالب — تاریخ رقم کرد کہ نواب دریغ

"از روئے زاری" یعنی "ز" کے عدد ۷ "نواب دریغ" پر جس کے عدد ۱۲۷۳ ہوتے ہیں بڑھائے جائیں تو ۱۲۸۰ھ حاصل ہوتے ہیں۔

نواب سید غلام بابا خاں کے تولد فرزند پر ایک قطعہ لکھا ؎

میر بابا یافت فرزندے کہ ماہ چاردہ — بر مزار لوحِ گردوں گردہ تمثال او ست
فرخی بینی و یابی بہرہ از ناز و طرب — از سر ناز و طرب فرزند فرخ سال او ست

"فرزند فرخ سال" پر "ناز" کے وزن کے پچاس اور "طرب" کی "ط" کے ۹ بڑھانے سے ۱۲۸۰ھ نکلتے ہیں۔

میر ابراہیم علی خاں کے تولد فرزند پر بھی ایک قطعہ لکھا اس میں عجیب و غریب تخرجہ ہے:۔

غالب حال سنین ہجری — معلوم کن از خجستہ بنیاد
چوں یک صد و بست و چار ماند — ایں ہست شمار عمر دل بند

"خجستہ بنیاد" کے عدد ۱۴۰۹ ہوتے ہیں، ۱۲۸۵ھ کے لئے ایک سو چوبیس بچتے ہیں ان کو غالب نے دعا عمر مولود قرار دیا۔

اب ہم غالب کی کچھ اور تاریخوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کا حال ہم انہیں کی زبان قلم سے سنائیں تو اچھا ہے۔ اس سے ان کی تاریخ گوئی پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔

میرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "فن تاریخ کو دون مرتبۂ شاعری جانتا ہوں، اور تمہاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے، بہر حال میں نے منشی نبی بخش مرحوم کی تاریخ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ منشی قمر الدین خاں صاحب نے پسند کیا، قطعہ یہ ہے ؎

شیخ نبی بخش کہ با حسن خلق — داشت مذاق سخن و فہم تیز
سال وفاتش ز پئے یادگار — با دلِ زار و مژۂ دجلہ ریز
خواستم از غالب آشفتہ سر — گفت مدہ طول و بگو رستخیز ۱۲۷۷

"ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ جامع اعداد نکال لیا کرتے ہیں۔ بلکہ قید معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے جیسا کہ یہ مصرعہ

در سال عرس ہر آنکہ ماند ببند

"انوری کے قصاید کو دیکھو، دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدے کے آغاز میں لکھتے ہیں جس میں اعداد سال مطلوب نکل آتے ہیں اور معنی کچھ نہیں ہوتے، لفظ "رستخیز" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر واقع کے مناسب، اگر تاریخ ولادت یا تاریخ شادی میں یہ لفظ لکھا تو بے شبہ نامستحسن تھا، قصہ مختصر اگر تاریخ کی فکر موجب ادائے حق مودت ہے تو میں حق دوستی ادا کر چکا۔"

نواب سعد الدین خاں شفق کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کو معلوم ہوگا کہ میرن صاحب نے انتقال کیا یہ چھوٹے بھائی تھے مجتہد العصر لکھنؤ کے، ان کا نام سید حسین اور خطاب سید العلماء نقش نگین میر حسین ابن علی، میں نے ان کی رحلت کی ایک تاریخ پائی اس میں پانچ بڑھتے ہیں یعنی ۱۲۸۰ھ ہوتے تھے، تخرجہ نئی روش کا میرے خیال میں آیا، میں تو جانتا ہوں اچھا ہے دیکھوں آپ پسند فرماتے ہیں یا نہیں ؎

حسین ابن علی آبروئے علم و عمل — کہ سید العلما نقش خاتمش بودے
نماند ماندے اگر بودے پنج سال دگر — "غم حسین علی" سال ماتمش بودے"
۱۲۷۸

منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں:

"میرے دوست خصوصاً میر الفتہ جانتے ہیں کہ میں فن تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قطعہ میں ایک وضع خاص سے اظہار سنہ ۱۸۵۷ء کا کر دیا ہے خدا کرے تمہارے پسند آئے . . . .

جناب عالی ایلن برون والا جاہ	ملاذ کشور و لشکر پناہ شہر و سپاہ
یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ	سنین عیسوی اٹھارہ سو اور ستاون
درازی اس کی بہ اندازہ سن قدیم کو نہ	جتنے سین مہینے میں سب ہزار ہو جائیں

مرزا علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں۔

"میاں! اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادۂ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے مادے دیئے ہوئے نظم کرتا ہوں اور جو مادہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر تراجم ہوا کرتا ہے چنانچہ اپنے بھائی کی رحلت کا مادہ تاریخ دیوانہ نکالا، پھر اس میں سے آسیب کے عدد گھٹانے، تمام دوپہر اسی فکر میں رہا۔ یہ نہ سمجھا کہ مادہ ڈھونڈھا تمہارے نکالے ہوئے دو لفظوں کا نہ کا کیا کہ کسی طرح سات (۷) اس پر بڑھاؤں بارے ایک قطعہ درست ہوا مگر تمہاری زبان سے یعنی گویا تم نے کہا ہے۔ پانچ شعر میں تین شعر زائد وہ موضع مدعا لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ اچھا ہے یا برا ہاں غلاق تو البتہ ہے، تامل سے سمجھ میں آتا ہے . . . .

بینی کہ شود ابر بہاری خجل از ما	ورگریہ اگر دعوی ہمچشمی نا کرد
باشد کہ برد کالبد آب و گل از ما	ناچار بگریم شب و روز کزیں سیل
خود کرد برآورد غم جاں گسل از ما	گفتی کہ بگیلار دل از کشمکش غم
چوں شمع دو دو دلبر متصل از ما	یک تند داز شعلۂ سوز غم ہجرش
بنوشت کہ در داغ پسر خستہ دل از ما	غم دیدہ نسیمے پئے تاریخ وفاتش

"ما" کے عدد ۴۱ "دل" کے عدد ۳۴، "ما" میں سے "دل" گیا گویا ۴۱ میں سے ۳۴ گھٹ گئے، باقی رہے ۷ وہ "داغ پسر" یعنی ۱۲۶۷ پر بڑھائے ۱۲۷۴ ہو آئے"

میاں داؤد خاں سیاح کو غالب اپنے ایک مکتوب میں اپنی تاریخ گوئی کا بڑا دلچسپ حال لکھتے ہیں فرماتے ہیں:-

"بھائی تمہاری جان کی اور اپنی ایمان کی قسم کہ میں فن تاریخ گوئی . . . سے بیگانہ محض ہوں، اور دو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی، فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں، اتم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں، حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادۂ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈ لا دیتے موزوں میں کرتا، ورنہ اگر آپ میں نے مادہ کی فکر کی ہے اور یہی حساب جمل منظور رکھا ہے تو ایسے ایسے تعمیے و تخرجے آ گئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہو گئی ہے، کلکتہ میں قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے، ان کے بھتیجے مولوی ولایت حسین خاں نے استدعائے تاریخ کی میں نے لکھ دی چنانچہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

ایں بسوئے من زرہ احترام کرد	مفتی عقل از پئے تاریخ ایں بنا
شد خشمگیں چو کہ نظر در کلام کرد	گفتم بوے بدیہہ خوشا خانۂ خدا
ابہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد	خاشاک رفت و پائے ادب سنگ بجت

واسطے خدا کے غور کرو خوشا خانۂ خدا مادہ ہے اس میں سے خاشاک کے عدد دور کرو ۱۲۹۲ کا تخرجہ پھر بھی دو اور زیادہ رہے۔ پائے ادب توڑا، بھلا یہ کوئی تاریخ ہے مگر حساب کے قاعدے سے باہر کچھ معنی سگالی کے طور پر میرا ایجاد ہے اور وہ لطف رکھتا ہے۔

ایک شخص ۱۲۴۸ میں مرا اس کی تاریخ میں نے لکھی ہے

زسال واقعہ میرزا مسیتا بیگ — مات راست شمار آئمہ امجاد
صحیفہ ہائے سماوی ہمیں اثنا عشر — حدیقہ ہائے بہشتی مشخص از آحاد

آئمہ بارہ یعنی بارہ سو، پھر کتب سماوی چار دہا کے چار یعنی چالیس، بہشت آٹھ چالیس اور آٹھ اڑتالیس، بارہ سو اڑتالیس۔

دوسری تاریخ بارہ سو ستر کی ہے

از بروج سپہر جوئے مات — عشرات از کواکب سیار

برج بارہ، کواکب سیار سات، دہائی کے ستر،

یہ جو لکھتے ہو کہ سید غلام بابا کسی بحر میں نہیں آتا، کیوں نہیں آتا . . . اس بحر میں سماتا ہو کوئی مادہ بہم پہنچاؤ، تاریخ کہ لو، دوست جو مادہ ڈھونڈھ دیتے تھے وہ جنت کو سدھارے میں جیسا اوپر لکھ آیا ہوں معذور اور مجبور ہوں۔"

ماخذ: ۱۔ تاریخ ادبیات ایران از براؤن ۲۔ آب حیات ۳۔ کلیات غالب ۴۔ اردوئے معلیٰ ہمایوں۔

مختار الدین احمد

۱۔ مرزا کی دو اردو تاریخیں ان کے دیوان میں موجود ہیں اور ہم اوپر نقل کر چکے ہیں پھر تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے ایسا کیوں لکھا۔ وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یا تو الحمد لکھا یا اس خط کے بعد دو تاریخیں لکھی ہوں گی (۱۸) تاریخیں ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۶ء کی ہیں۔ ۲۔ فارسی کلیات میں اس قطعہ کے آخر میں ایک شعر اور ہے ۔ یہ بیت دو دو مادی دو چار کتاب ۔ کردہ نشینے از بہشت خلد جاں بخش باد۔ ۳۔ یہ قطعہ تین شعروں کا ہے پہلا اور ... شمار۔ گفتہ آماد گفت نشر مرتبہ ساز ضد ... واحد القہار۔ مرزا مغفور نے اپنے خط میں میرا شعر کیوں چھوڑ دیا سمجھ میں نہیں آتا اس صورت ...

غزل

ہوں دیدہ ور فریب تعین میں آؤں کیا !
پردے پڑے ہوئے ہی نہیں ہیں اٹھاؤں کیا!

بر روئے کار آہ کی تاثیر لاؤں کیا !
دل کی لگی کو، دل کی لگی سے بجھاؤں کیا!

گو مضطرب ہوں، ضبط کی قیمت گھٹاؤں کیا!
دل رو رہا ہے، آنکھ سے آنسو بہاؤں کیا!

نوک زباں پہ آبلۂ شوق لاؤں کیا!
افسانۂ گناہِ محبت سناؤں کیا!

ہے تشنگیٔ ذوقِ نظر بے حد و تمام
تسکین رنگ و بوئے گلستاں سے پاؤں کیا!

ہنس ہنس کے ڈوبنا بھی ہے حُسنِ شناوری
کشتی کو موجِ آبِ رواں سے بچاؤں کیا!

اے سوز بخشِ قلب و جگر، اضطرابِ روح
تجھ سے ہی تیرے درد کا عالم چھپاؤں کیا!

ناکام و نامراد ہی رہنے میں لطف ہے
اب بے کسی دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاؤں کیا!

اپنی تجلیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں وہ
نقش و نگارِ زیست کو میں جگمگاؤں کیا!

اے اختیارِ حسن، تری قوتیں بخیر
بے چارگیٔ عشق کو تجھ سے چھپاؤں کیا!

ہے کارگاہِ زیست بہ ہر رنگ دلفریب
آویزشوں سے دامنِ ہستی بچاؤں کیا!

میرا قصور ہے کہ نہیں ظرفِ کیفِ عشق
بے اعتبار تیری نظر کو بناؤں کیا!

وحدت پرست ہوں، مرا مسجود ایک ہے
ہر آستانِ ناز پہ نظریں جھکاؤں کیا!

گذرے گا کیا نہ کوئی حُدی خواں فضا شناس
تھک کر رہِ امید میں اب بیٹھ جاؤں کیا!

کم ہو چلی ہے گرمیٔ روحِ تمام شوق
پھر سازِ دل پہ نغمۂ جاں سوز گاؤں کیا؟!

میں جانتا ہوں خندۂ گل کا مآلِ کار
اتنی سی دیر کے لئے پھر مسکراؤں کیا!

اعجازؔ وہ بہارِ دل و دیدہ جب نہیں
اُجڑی ہوئی خیال کی دنیا بساؤں کیا!

اعجاز صدیقی

چوکیدار

رات کو جب گاؤں کے سب چھوٹے بڑے چین کی میٹھی نیند سوتے تو رام لال چوکیدار کندھے پر اپنی پرانی لاٹھی رکھ کر جھونپڑی سے باہر نکل آتا اور گاؤں کی اندھیری گلیوں میں پھرا کرتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ چلا اٹھتا جاگ تے رہو نا!" اس کی آواز بڑی ڈراؤنی تھی۔ بچے تو ڈر کر ماں کی چھاتی سے چمٹ جایا کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ کہا کرتے تھے۔ ہر رات یہ کمبخت خواہ مخواہ چیختا ہے۔ نہ چور نہ چور کا سایہ مگر یہ نیند ضرور خراب کرتا ہے۔ لوگوں نے اُسے سمجھایا بھی کہ رات بھر پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں مگر رام لال کو بغیر گاؤں کا بار بار چکر لگائے چین ہی نہ آتا تھا۔

گاؤں کے کنارے مٹی اور پھوس کی جھونپڑی تھی۔ یہی رام لال چوکیدار کا گھر تھا۔ گھر میں آٹھ سال کی ایک یتیم پوتی تھی اور دوسرا کوئی نہیں۔ وہ بیس سال سے چوکیداری کرتا تھا۔ پانچ روپے ملتے تھے۔ یہی اس کی آمدنی تھی۔ اسی میں وہ خوش تھا۔ پوتی سے اس کو بہت محبت تھی۔ لیکن جب گشت کا وقت آتا تو اس کو جھونپڑی میں چھوڑ کر نکل جاتا۔ لڑکی اکیلی ڈرتی۔ مگر اُس نے اس کا کبھی خیال نہیں کیا۔ اُس کا جب بیٹا مرا تھا، بہو جب مری تھی، اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ جب اُس کی جیون ساتھی سدا کے لئے اُس سے الگ ہوئی تب بھی وہ گاؤں میں گھومتا رہا۔ بھولا۔ موسلا دھار پانی برستے میں وہ چھاتا لے کر نکلتا تھا۔ جب بھی لوگوں نے اسے سمجھایا کہ رات بھر پھرنے کی کیا ضرورت ہے، ایک دو بار پھر کر دیکھ لو۔ تو رام لال نے بڑی سادگی سے یہی ایک جواب دیا۔

"ہم کو مشاہرہ اسی کا ملتا ہے۔"

اس کا جواب کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ بیس سال سے آندھی، طوفان جاڑا گرمی اور برسات میں وہ گاؤں کا چکر لگایا کرتا تھا۔ بھیگتا، ٹھٹھرتا مگر جب تک بیمار نہ ہو جاتا پہرہ دینے سے جی نہ چراتا۔

آس پاس کے چوروں کو رام لال کے نام سے نفرت تھی۔ سب کے سب اس کے دشمن تھے۔ دو تین مرتبہ دو چار نے مل کر اس پر حملہ بھی کیا۔ لیکن رام لال خود طاقتور تھا۔ کچھ دیر تک ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ پھر لوگوں کو مدد کے لئے بلایا اور چور اس کو مار بھی نہ سکے۔ سب اس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ لیکن اس گاؤں کی طرف مُنہ کبھی نہ کرتے۔

گاؤں کے زمیندار رام نرائن بابو کے بڑے بیٹے رام چندر بابو ڈپٹی مجسٹریٹ ہوئے۔ رام لال کو بڑی خوشی ہوئی کہ اس کے زمیندار کے بیٹے ڈپٹی ہو گئے۔ اب اس کی حالت یہ تھی کہ وہ سر اُٹھا کر چلتا تھا۔ جب تھانے میں حاضری دینے جاتا تو دوسرے چوکیداروں سے خود کو بڑا سمجھتا۔ کیونکہ اس کے زمیندار کے بیٹے ڈپٹی تھے اور دوسروں کے نہیں، وہ فخریہ لوگوں سے کہا کرتا۔ "ڈپٹی صاحب تو میری گود کے کھلائے ہوئے ہیں۔ اب میں دفعدار ضرور ہو جاؤں گا۔" دوسرے چوکیدار اس کی باتوں کو سنتے اور ایک سانس بھر کر رہ جاتے۔ سب کو یقین تھا کہ رام لال ضرور دفعدار ہو جائے گا۔

ڈپٹی صاحب درگا پوجا کی چھٹیوں میں گھر آئے۔ رام لال نے اپنی وردی نکالی اور پہن کر سیدھا ڈیوڑھی پر پہنچا۔ ڈپٹی صاحب گھر میں تھے۔ رام لال باہر بیٹھا رہا۔ اس کی خوشی کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب آئیں گے۔ میں اُن کو اس طرح سلام کروں گا۔ وہ مسکرا کر جواب دیں گے اور پوچھیں گے "تو کیسے ہے؟" میں کہوں گا "سرکار کی کرپا ہے" ڈپٹی صاحب ہنس دیں گے رام لال اس خیال ہی سے خوش ہو گیا۔ جیسے اس کو بہت بڑی دولت مل گئی بڑے کی مہربانی کے ساتھ ایک ہنسی ہی غریب کے لئے بہت بڑی دولت ہے۔ رام لال انہی خیالوں میں بیٹھا رہا اور گھنٹوں گذر گئے۔ پٹواری صاحب نے کہا۔

"ارے وہ ابھی تھکے آئے ہیں۔ سو گئے ہوں گے!"

رام لال بولا:۔

"جب وہ سو کر اٹھیں گے تب ہی میں بھی جاؤں گا۔ آگیا ہوں تو بغیر حاضری دیئے کیسے جاؤں؟"

پٹواری جی اپنے کاموں میں لگ گئے اور رام لال اپنے خیال میں مست بیٹھا رہا۔ صبح کے وقت آیا تھا۔ شام ہونے کو آئی تو ڈپٹی صاحب گھر سے باہر آئے۔ رام لال نے جھک کر سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک معمولی چوکیدار کے سلام کا جواب کیسے دیتے وہ سمجھے کہ شاید کچھ انعام مانگنے آیا ہے۔ رام لال کھڑا ہی رہا کہ شاید اب وہ کچھ بولیں گے۔ لیکن ڈپٹی صاحب نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں اور اپنے چند رشتہ داروں کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ رام لال اس امید میں بیٹھا رہا کہ اب ان کی بات ختم ہوگی اور ڈپٹی صاحب میری طرف دیکھیں گے اور باتیں کریں گے۔ ڈپٹی صاحب دوسروں سے باتیں کر رہے تھے۔ لیکن رام لال خوشی میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب اُسی سے باتیں کر رہے ہیں۔

جب اُن کے رشتہ دار چلے گئے تو ڈپٹی صاحب اُٹھے اور باہر آئے۔ رام لال نے پھر جھک کر سلام کیا۔ اب ڈپٹی صاحب کھڑے ہو گئے اور رام لال اُن کے چہرے کو دیکھنے لگا کہ ہونٹ اب ہلے کہ اب ہلے۔

ڈپٹی صاحب نے بڑے سوکھے طور سے کہا:۔

"کیا مانگتا ہے؟"

رام لال کا دل بڑھ گیا اور خوش ہو کر بولا:۔

"حضور حاضری دینے آئے تھے۔"

ڈپٹی صاحب بولے:۔

"دیکھ لیا تم زندہ ہے۔ جاؤ اب۔"

رام لال سر جھکائے واپس چلا آیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے دل میں چھری بھونک دی۔ اس کو وہ وقت یاد آگیا۔ جب رام چندر بابو اُس سے کہا کرتے تھے۔ "رام لال، طوطے کا بچہ لاؤ" اور کہتے تھے۔ "جب ہم ڈپٹی ہو جائیں گے تو تم کو اپنا چپڑاسی بنائیں گے۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُس کے دل میں اس کے سوا اور کوئی آرزو نہ تھی کہ ڈپٹی صاحب اس سے مسکرا کر ایک جملہ کہہ دیں۔ لیکن وہ سمجھا کہ اس میں بھی میری ہی کوئی خطا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے شکایت کر دی ہے کہ رام لال گشت نہیں کرتا اسی وجہ سے ڈپٹی صاحب خفا ہو گئے

رات ہوئی سب لوگ سو گئے۔ رام لال اپنے گھر سے لاٹھی لے کر نکلا اور گشت لگانے چلا گیا۔ اس کی اکلوتی پوتی کی طبیعت خراب تھی۔ رام لال دن بھر غائب رہا تھا اور وہ بھوک سے روتی رہی تھی۔ مگر رام لال کو اس کی بیماری کا خیال نہ ہوا۔ گھر سے نکل پڑا۔ گاؤں میں پہنچنے پر ایک بار کڑک کر اُس نے زور سے آواز دی "جاگ کے سونا" اور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور جا کر پھر آواز دی اور آگے بڑھ گیا۔ اسی طرح آواز دیتا گاؤں کا گشت لگا کر گھر واپس آیا۔

ایک گھنٹہ بعد پھر نکل کھڑا ہوا۔ اور سارے گاؤں کا چکر کاٹ کر واپس آیا اور اسی طرح رات بھر چکر لگاتا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب ڈپٹی صاحب ضرور خوش ہو جائیں گے اگر کسی نے شکایت کر دی ہوگی تو اُن کا غصہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح کے دل کو خوش کرنے والے خیالوں میں مگن ہو کر سو رہا۔

صبح ہوئی۔ اُٹھا، منہ ہاتھ دھو کر بیٹھا ہی تھا کہ زمیندار کا پیادہ آیا اور بولا:۔

"تمہیں ڈپٹی صاحب بلاتے ہیں۔"

رام لال خوش ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کو بڑی خوشی ہوئی کہ آخر ڈپٹی صاحب نے بلایا۔ رات کو پہرہ دیا ہے اس سے وہ خوش ہو گئے ضرور کسی نے شکایت کی تھی۔ اسی لئے ناراض تھے۔ رام لال جھونپڑی کے اندر گیا اور اپنی پھٹی ہوئی پگڑی سر پر لپیٹ لی۔ ہاتھ میں لاٹھی لے کر پیادے کے ساتھ چل پڑا۔

زمیندار کے بنگلے پر آیا تو ڈپٹی صاحب برآمدے کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رام لال نے باری باری سب کو سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب نے گرج کر کہا:۔

"تم بوڑھا ہو گیا مگر بالکل گدھا ہے۔ رات بھر کاہے کو چلاتا پھرتا ہے؟ کوئی ڈاکو والا تھوڑا ہی بیٹھا ہے۔"

رام لال بولا:۔

"سرکار ہم تو روز پہرہ دیتے ہیں۔"

ڈپٹی صاحب نے ڈانٹ کر کہا:۔

"ہاں پہرہ دیتا ہے۔ پاگل کہیں کا۔ رات کو سونے نہیں دیتا۔ خبردار جو آج سے آواز دی۔ گھر سویا کیوں نہیں رہتا؟"

رام لال سر جھکائے گھر چلا گیا۔ اُس کا دل بہت کڑھا ہوا تھا

گر پھر بھی اپنے کاموں میں لگا رہا۔ غریب کو کام سے کب چھٹی ہوتی ہے اس رات سے رام لال نے گاؤں میں گھومنا بند کر دیا۔ کسی نے اس کی آواز نہ سنی۔

ہونے والی بات ہو کر رہی۔ دو چار دن کے اندر ہی ڈپٹی صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی۔ صبح کو رام لال اٹھا تو اس کو معلوم ہوا۔ جانے کس کی فکر میں تھا کہ زمیندار کا پیادہ آیا اور بولا:

"ڈپٹی صاحب بلاتے ہیں"

رام لال اس کے ساتھ چلا گیا۔ ڈر رہا تھا اور غریب ڈرتے کیسے نہیں جب پہرہ دیتا تھا تو بات سننی پڑتی تھی اور اب ڈپٹی صاحب کو تھوڑا ہی یاد ہوگا کہ انہی نے پہرہ دینے کو منع کیا تھا۔ اسی خیال میں الجھا ہوا رام لال بنگلے پر پہنچا۔ ڈپٹی صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ دیکھتے ہی غریب پر جھپٹ پڑے اور جتنی گالیاں دے سکتے تھے دیں۔ دو چار تھپڑ بھی جو بڑھے رام لال کی قسمت میں لکھے تھے مل گئے۔

تھانیدار آیا۔ چوری کی رپورٹ لکھائی گئی اور وہ چلا گیا۔ ڈپٹی صاحب رام لال کی جتنی فکر کا تیں سکتے تھے ختم کر دیں۔ نتیجہ اور تو کچھ نہ نکلا، البتہ رام لال کی نوکری جاتی رہی۔ اور اس کے بعد چوری روز کی بات ہوئی۔

یہ کہانی بہت پرانی ہے۔ اب نہ رام لال ہے نہ ڈپٹی صاحب مگر اس کہانی کو لوگ اب بھی دہرایا کرتے ہیں ٭

سہیل عظیم آبادی

شعر

اے امیرؔ اوّل تو وہ نا آشنا ملتا نہیں
مل گیا جس کو کہیں، اس کا پتا ملتا نہیں

امیرؔ مینائی

اندھیری رات کے سناٹے میں

رات اندھیری ہے اور پُر اسرار
نبضِ فطرت کی سُست ہے رفتار
ساکت و بے صدا ہے سازِ نمود
ظلمتوں میں نہاں ہے رازِ نمود
تیرگی میں وہ جھنڈ پیڑوں کے
دُھندلے دھندلے خموش سائے سے
عالمِ ہُو فضا میں چار طرف
ایک چُپ سی ہوا میں چار طرف
بہ رہی ہے ندی، مگر خاموش
منتظر آب ہے سیاہی پوش
خامُشی ہے کہ گائے جاتی ہے
اپنا بربط بجائے جاتی ہے
راہیں چپ چاپ آہیں بھرتی ہیں
دن کی کلفت کا شکوہ کرتی ہیں
اس خموشی میں ایک ٹیلے پر
دیکھتا ہوں میں یہ عجب منظر
آہ ایسی خموش خلوت میں
سونی راتوں کی گہری ظلمت میں
دل میں بے چین یاد کس کی ہے
جو مجھے گھر سے کھینچ لاتی ہے
کون ہے وہ ندیمِ تنہائی
رُوح رہتی ہے منتظر جس کی!

تاجور سامری



دوڑ دوڑ جا کر
سیر ڈیلین روچ لاؤ
سیرولین 'روچ'
کھانسی اور پھیپھڑے کیلئے دنیا کی بہترین دوائی



طاقت اور تندرستی
کے لئے
بچوں کو
ڈونگرے کا
بال امرت
پلانا چاہئیے
اس کے استعمال سے بچوں کی کھانسی بخار رفع ہوتے ہیں

تغزل

ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ہے کامیاب — ذرّے بھی بے مثال، ستارے بھی لاجواب

اس طرح اُٹھ رہا ہے ترا گوشۂ نقاب — جلوے بھی کامیاب نگاہیں بھی کامیاب

ماتھا، نشاطِ حُسن سے کھلتا ہوا کنول — عارض فروغِ مے سے مہکتے ہوئے گلاب

میں نے پڑھا جو شعر تو وہ مسکرا دیئے — اتنی ذرا سی بات میں جاتا رہا عتاب

قصداً تجلیوں کو دیا حُسن نے فروغ — دانستہ چشمِ شوق پہ ڈالے گئے حجاب

یہ بے تکلفی، یہ نوازش، یہ ربط ضبط — گستاخ کر نہ دیں، یہ کرم ہائے بے حساب

ذوقِ نمود ہی سے عبارت ہے زندگی — موجوں پہ تیرتے ہیں اُبھرتے ہوئے حباب

میری نگاہِ شوق کی سرمستیاں نہ پوچھ! — ان کو بھی آج خوب پلا دی گئی شراب

اب زندگی کا لطف بہ عنوانِ درد ہے
ماہرؔ بھی ہے حریمِ محبت میں باریاب

ماہر القادری

کھوئے ہوئے لمحے

برسات کی رت اور وہ امڈا ہوا بادل
وہ رات اندھیری، وہ برستا ہوا کاجل
وہ آپ کا ڈرنا، وہ مری چھیڑ مسلسل

وہ حسن کے اڑتے ہوئے خاموش شرارے
اے کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے

ہر سمت وہ ارمان کے بہتے ہوئے دھارے
اے کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے

پھر ہو نئے سر سے وہی آغاز محبت
پھر تار رگ جاں سے چھڑے ساز محبت
پھر راز محبت نہ رہے راز محبت

وہ آپ کا پہلو، وہ چمکتی ہوئی راتیں
وہ زلف کی خوشبو، وہ مہکتی ہوئی راتیں
وہ حسن کی مستی، وہ بہکتی ہوئی راتیں

ہم آپ چلیں پھر وہیں جمنا کے کنارے
پھر کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے

وہ چرخ پہ ہنستے ہوئے مخمور ستارے
اے کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے

پھر بہکی ہوئی ہوش کی بستی نظر آئے
چھائی ہوئی ہر چیز پہ مستی نظر آئے
پھر برق سر طور برستی نظر آئے

وہ برق تبسم کی گراتے ہوئے آنا
ساقی کی طرح ہوش اڑاتے ہوئے آنا
شرماتے ہوئے جسم چراتے ہوئے آنا

پھر آپ ہوں بیٹھے ہوئے شاعر کے دوارے
پھر کاش پلٹ آئیں وہ کھوئے ہوئے لمحے

علی احمد

دروازہ کھلنے پر

بعض اوقات بغیر جانے بوجھے ہم مختلف لوگوں کی زندگی کے ایسے ایسے واقعات اور تصویریں دیکھ لیتے ہیں کہ ان کی یاد ہمارے دل سے کبھی نہیں جاتی۔ کبھی کسی شاہراہ پر کھڑے کبھی کسی بازار میں گھومتے گھامتے کبھی ریل کے ڈبہ میں اور کبھی سینما میں ہمیں دوسروں کی زندگی کے ایسے حالات اور واقعات معلوم ہوجاتے ہیں کہ اگر ہم خود ان کا پتہ لگانے کی کتنی بھی کوشش کرتے، ہمیں کبھی کامیابی نہ ہوتی۔ ان میں سے بعض واقعات نہایت دردناک ہوتے ہیں بعض افسوسناک اور رنجیدہ اور بعض ایسے کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ کئی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کی ابتدا ہمارے سامنے ہوتی ہے لیکن ان کا خاتمہ کہیں اور جاکر ہوتا ہے۔ ہماری نظروں سے دور۔ اور ہمیں اس کی حسرت ہی رہ جاتی ہے کہ کاش ان کا انجام بھی ہمیں معلوم ہوجاتا۔ بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کا ہم صرف آخری حصہ دیکھتے ہیں اور ہمیں خواہش ہوتی ہے کہ اگر ان کے ابتدائی حصے بھی معلوم ہوجاتے تو کیا اچھا ہوتا۔ اگرچہ یہ واقعات اور حالات ایک کہانی کی طرح مکمل نہیں ہوتے لیکن ان میں کچھ ایسا لطف ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے مزے لے لے کر بیان کئے جاتے ہیں۔

مثلاً اسی ایک واقعہ کو لیجئے۔ ایک رات میں دہلی سے کانپور جارہا تھا۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں میرے علاوہ تین مسافر اور تھے۔ ان میں سے ایک بارعب اور خوبصورت آدمی تھا۔ جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے کپڑے نہایت عمدہ اور تازہ ترین فیشن کے مطابق تھے۔ داڑھی مونچھیں صاف، ٹیڑھی مانگ، آنکھ پر عینک، کلائی پر گھڑی، الغرض تہذیب جدید کا مکمل نمونہ تھا۔ باقی دو مسافر میاں بیوی تھے۔ میاں عمر میں بیوی سے کافی بڑا تھا، معلوم ایسا ہوتا تھا کہ ان دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہے۔ اس لئے کہ عورت اداس اور غمگین تھی اور مرد غصہ میں تھا چند منٹ تک ڈبہ میں بالکل خاموشی رہی اور اس کے بعد دفعتاً اس مرد نے اس بارعب اور خوبصورت شخص سے باتیں شروع کردیں۔ غالباً وہ ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اس کی بیوی نے ان دونوں کی باتوں میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور نہ اپنی ناراضگی اور خفگی چھپانے کی کوئی کوشش کی بلکہ وہ باہر اندھیرے میں دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی اور وہ دونوں اتر گئے۔ ہم دونوں اس جوڑے کو دیکھتے رہے۔ اور جب وہ نظروں سے غائب ہوگیا تو میں اٹھ کر اپنے ہم سفر کے سامنے جا بیٹھا۔ "اور نہ معلوم کیوں میں نے کہا" دونوں ناراض معلوم ہوتے ہیں مجھے چاہئے تھا کہ ان کو سمجھاتا،،

"ٹھیک ہے،، اس نے آہ بھر کر کہا،، مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا مگر بعض حالات میں یہ ناممکن ہوتا ہے"۔

"یعنی آپ کا خیال ہے کہ وہ اپنے نیک و بد کو خود اچھی طرح سمجھتے ہیں"

"نہیں" اس نے جواب دیا" بات یہ ہے کہ شادی شدہ جوڑے کو مشورہ دینا یا نصیحت کرنا بے سود ہی ہے۔ بالخصوص اس وقت جب دونوں کے دماغ خراب ہوں۔ اگرچہ بعض اوقات صحیح دماغ والے بھی اچھے ارادے کے باوجود سخت غلطیاں کرجاتے ہیں۔ یہ آدمی اپنی بیوی کی کڑی نگرانی کرتا ہے۔ اسے تنہا کہیں نہیں جانے دیتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے اسے تنہا چھوڑ دیا تو نہ معلوم وہ کیا حرکت کر بیٹھے۔ یعنی کوئی نامعقول حرکت۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اور آخر میں اس کا انجام یہ ہوگا کہ جس حرکت سے وہ اس کو روکنے کی کوشش کرتا ہے وہی حرکت وہ یقیناً کر بیٹھیگی۔ میرے ذہن میں یہ بات آہی نہیں سکتی کہ عورت کو غلام کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ خصوصاً آج کل کے زمانہ میں۔ اپنی بیوی کو پوری آزادی دے دیجئے کچھ بھی نہیں ہوگا"

"آزادی!" میں نے کہا" بعض حالات میں یہ آزادی خطرناک ہوتی ہے۔ اور کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ کس وقت صورت حال کیسی ہے؟"

"ہمیں اس میں کوئی مشکل نہیں" اس نے جواب دیا" بچپن ہی سے لڑکیوں کی سیرت کا پتہ لگ جاتا ہے۔ اور اگر ان کی عادتیں ٹھیک نہ ہوں تو ان پر شدید اور کڑی نگرانی کرنے سے ان کو سیدھے راستے پر نہیں لگایا جاسکتا۔

میں یہ نہیں بتاتا کہ ایک بیوقوف اور نوجوان لڑکی کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دینا چاہیئے۔ نہیں ہرگز نہیں لیکن اس کو فقط ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے آقا اور مالک کی نہیں۔ اتحاد اور اعتماد دونوں طرف ضروری ہیں ورنہ عجیب حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب میری شادی ہوئی تو میری اور میری بیوی کی عمر میں کوئی دس سال کا فرق تھا یعنی وہ مجھ سے دس سال چھوٹی تھی۔ خیر یہ کوئی بات نہیں لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ ہماری طبیعتوں میں بڑا اختلاف نکلا۔ میں خاموش زندگی کو پسند کرتا ہوں تاکہ شاعری اور فلسفہ میں اپنا وقت صرف کر سکوں۔ تفریحات میں وقت گذارنا بھی مجھے بھی ناپسند ہے۔ اس کے برعکس میری بیوی پڑھنے لکھنے سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ اسے تفریحات اور دعوتیں بہت پسند ہیں۔ طبیعتوں کا یہ اختلاف فوراً ہی ظاہر ہو گیا۔ میں نے اس مسئلہ پر غور کرکے فیصلہ کیا کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کو اس بات پر مجبور کروں کہ وہ بھی شاعری اور فلسفہ میں دلچسپی لے اور وہ مجھے تفریحات اور دعوتوں میں کھینچنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تاکہ ہم مجبوراً اپنی طبیعتوں کو بدل کر خواہ مخواہ اپنی زندگی کو جہنم بنا لیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی میں طبیعتوں کا اتفاق ضروری ہے۔ اور ایک نعمت ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو میں نہیں سمجھتا کہ لوگ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ حالاں کہ ان کو مسرت صرف اسی صورت سے حاصل ہو سکتی ہے کہ دونوں کا جو جی چاہے کریں تاکہ جب وہ آپس میں ملیں تو خوش و خرم ہوکر اور خوش و خرم ہی رہ سکیں۔ الغرض میں نے اجازت دے دی کہ میری بیوی جو چاہے کرے اور ادھر میں جس طرح چاہوں وقت گذاروں یقیناً بعض اوقات میرا دل چاہتا تھا کہ میری بیوی میرے پاس گھر پر رہے اور میری شاعری کی تعریف کرے اور مجھے داد دے اور بعض اوقات میری بیوی کا دل چاہتا ہوگا کہ میں اس کے ساتھ کسی دعوت رقص یا تفریح میں جاؤں لیکن ہم نے کبھی ان خواہشات کا اظہار نہیں کیا۔

ایک دن اس کی کسی کی سہیلی کے یہاں رقص تھا۔ اس رقص میں یہ خصوصیت تھی کہ ہر ایک کو نقاب اوڑھ کر آنا تھا اور نقاب بھی ایسا کہ کوئی پہچان نہ سکے کہ یہ کون ہے۔ میری بیوی بھی اس میں مدعو تھی۔ وہ وہاں جانے کے لئے حد سے زیادہ بے تاب تھی۔ بے تابی اس لئے تھی کہ اس کے چند عزیز اور دوست بھی اس رقص میں شامل ہونے والے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں بھی چلوں اور اس نے اشارہ بھی کیا لیکن میں نے یوں ظاہر کیا گویا اس اشارے کو میں سمجھا ہی نہیں کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ رقص میں شامل ہوکر خواہ مخواہ کی کوفت ہوگی۔

بہرحال میری بیوی اس رقص میں گئی۔ اس نے آسمانی رنگ کا گون پہنا تھا۔ جس کے چاروں طرف سنہری حاشیہ تھا۔ نقاب خاکی رنگ کا تھا اور ہاتھ میں ایک پنکھا تھا۔ جس میں سبز جھالر لگی تھی۔ جب وہ جانے لگی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی آجائیگی اور یہ کہ میں اس کا انتظار ڈرائنگ روم میں کروں۔

جب وہ چلی گئی تو نہ جانے کیوں میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے سگرٹ جلایا، کتاب کھولی اور پڑھنے بیٹھ گیا۔ لیکن آج پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ پڑھنے میں میرا بالکل جی نہ لگا۔ میرا دل نہ معلوم کہاں کہاں گھومنے لگا۔ میں نے کتاب ہاتھ سے رکھدی اور سوچنے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ میری بیوی اس وقت رقص میں کیا کر رہی ہوگی اور کیا اس کے عزیز اور دوست اسے مل گئے ہوں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ وہ وہاں نہ آئے ہوں۔ اگر وہ وہاں نہیں آئے تو یہ ٹھیک نہیں اس لئے کہ اس قسم کے رقص میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ نقاب کے باوجود میری بیوی کا حسن اور جوانی نہیں چھپ سکتی تھی، ممکن ہے اسے ایسے لوگ تنگ کریں جن کا پیشہ ہی یہی ہے۔ ممکن ہے اس وقت وہ کسی نامعقول شخص کے ساتھ رقص کر رہی ہو۔ کیا مجھے اسے تنہا جانے دینا چاہیئے تھا میں نے سگرٹ پھینک دیا اور بغیر کسی خاص خیال کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ ——— میرے پاس بھی ایک رقص کا لباس ہے اور اس کے ساتھ نقاب بھی۔ میں نے سوچا ابھی میری بیوی کو گئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے کیوں نہ میں یہ لباس پہن کر رقص میں جا پہنچوں۔ میں نے ملازم کو بلاکر اس سے ٹیکسی لانے کو کہا۔

جب میں پہنچا تو رقص زور شور سے جاری تھا۔ میری قسمت ملاحظہ فرمایئے کہ جس عورت کو میں نے سب سے پہلے دیکھا وہ میری بیوی ہی تھی آسمانی رنگ کا سبز حاشیے والا گون خاکی رنگ کا نقاب اور سبز جھالر والا پنکھا میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ میں ہجوم کو چیر کر اس کی طرف بڑھا۔ جب قریب پہنچا تو میں نے محسوس کیا وہ مجھے آسانی سے نہیں پہچان سکتی اس نے مجھے اس لباس میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور اسے غالباً یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ میرے پاس ایسا لباس ہے۔ لیکن اس پر بھی جب میں اس کے قریب جا پہنچا تو اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ کسی اجنبی کو اس بات کی اجازت دیتی کہ وہ اس سے گفتگو کرے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے

رویے سے اس کی ہمت افزائی بھی کرے؟ یہ خوفناک شبہ کچھ اس طرح پیدا ہوا کہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کا تجربہ کیا جائے گا۔ بغیر کچھ اور سوچے میں نے ذرا آواز بدل کر کہا "میرا خیال ہے آپ میرے انتظار میں ہیں۔ کہئے کہ میں ہوں"

"ہاں میں ہوں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ کوئی دلچسپ ناچ ہو" اس نے بھی آواز بدل کر جواب دیا۔ "اس لئے کہ تنہا کھڑا رہنا..... اس میں کوئی دلچسپی نہیں"

ایک لمحہ کے لئے رقص کی ساری رونق کو میں بھول گیا۔ نہ میں کچھ دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور کہا "کیا میں آپ کے ساتھ رقص کرنے کی عزت حاصل کر سکتا ہوں؟"

"ضرور" اس نے جواب دیا اور فوراً میری بغل میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنے لگی۔ اس کا انداز اتنا بیباک تھا کہ مجھے سخت تعجب ہوا۔ جب رقص کا ایک دور ختم ہوا تو اس نے کچھ پینے کی خواہش ظاہر کی اور خود ہی مجھے ریفریشمنٹ روم میں لے گئی۔ پینے پلانے کے بعد اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہم ٹہلنے لگے۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ مکان کے کونے کونے سے واقف ہے۔ یہ بات بھی میرے لئے باعث تعجب تھی کیوں کہ شاید وہ پہلے یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا آپ اس سے پہلے بھی یہاں آ چکی ہیں؟"

"پہلے بھی یہاں آ چکی ہوں؟" اس نے جواب دیا "ہاں آ چکی ہوں اور جب دل چاہتا ہے آ جاتی ہوں"۔

"کیا آپ اپنے شوہر کو بھی یہاں آنے کے متعلق بتاتی ہیں؟"

"شوہر؟ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میری شادی ہو چکی ہے"

"مجھے یقین ہے کہ آپ جیسی حسین اور خوبصورت لڑکی بغیر شوہر کے نہیں رہ سکتی" میں نے جواب دیا۔

"خوب۔ لیکن شوہر اور محبوب میں فرق ہی کیا ہے۔ عورتوں کو شادی کی ضرورت ہی کیا ہے جب وہ محبت کر کے روزی کما سکتی ہیں؟"

اس نے یہ کہکر میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور مسکرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ کیا یہ وہی عورت تھی جسے میں ہر روز دیکھتا تھا۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مگر ہو کیسے نہیں سکتا؟ وہ اسی قسم کی باتیں کر رہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے ایسی گفتگو کرنے کا بہت تجربہ ہے۔ اس کی باتوں سے کسی قسم کی شرم و حیا کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس نے مجھے یہ

مجھے بتایا تھا کہ وہ پہلی بار یہاں جا رہی تھی۔ توبہ۔ کیسا سفید جھوٹ تھا! میں نے اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا کہ میں نے اسے یہاں تنہا کیوں آنے دیا۔ مگر پھر سوچا کہ یہ بھی اچھا ہوا۔ مجھے کیسے معلوم ہوتا کہ وہ اتنی گر چکی ہے۔ میرے احباب کو یہ بات یقیناً معلوم ہوگی اور وہ میری بے خبری اور حماقت پر ہنستے ہوں گے اور میرا مذاق اڑاتے ہوں گے۔ آج کل کے دوست ایسا ہی کرتے ہیں، یہی دوستی کا معیار ہے۔ بہرحال میرے لئے یہ صدمۂ عظیم تھا.... لیکن اس پر بھی یقین تھا کہ میری بیوی ایسی نہیں۔ وہ ان باتوں سے زیادہ اور کسی حرکت کی جرأت نہیں کر سکتی۔ کیا وہ کر سکتی ہے؟

اس وقت اس کا ہاتھ میرے بازو پر تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میں کچھ ہچکچایا پھر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبا دیا۔ مجھے انتہائی تکلیف ہوئی جب وہ مسکرائی اور میرا ہاتھ بھی بڑے ناز سے دبا یا گیا۔

"آپ بیدردی ہیں" اس نے کہا "میں تو یہ محسوس کر رہی تھی کہ آپ بالکل سرد مہر اور عشق و محبت سے ناآشنا ہیں۔ میں ابھی ابھی آپ کے دل میں زندگی کی روح پھونکوں گی۔" اور یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی اس حرکت اور ان الفاظ سے مجھے سخت رنج ہوا۔ مجھ میں بولنے کی سکت تک باقی نہ رہی۔ میرا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ بیٹھ جاؤں اور ایک بچے کی طرح چلاؤں اور روؤں۔ اس وقت مجھے غصہ نہیں تھا بلکہ افسوس تھا۔ جب بالکل توقع ہی اٹھ جائے اس وقت آدمی کو غصہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اور اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ امید کی کوئی صورت نہیں مگر ایک جواری کی طرح مجھے آخری پانسہ پھینکنا چاہئے تھا۔ میں اسے آخری موقع دینے کے لئے ذرا اور آگے بڑھا۔

"آپ سے مل کر اتنی خوشی ہوئی ہے" میں نے کہا "کہ میں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ مگر یہاں تو بہت سے لوگ ہیں، آئیے یہاں سے چلیں۔ کیا آپ میرے غریب خانہ تک چل سکتی ہیں"۔

"غریب خانہ تک" اس نے پھر مجھ سے لپٹ کر کہا "ضرور۔ انکار کرنا میری فطرت کے خلاف ہے"

میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور ایک نوجوان عاشق کی طرح اسے باہر لے آیا۔ اس نے الگ ہونے کی ذرا بھی کوشش نہ کی ہاں اتنا کہا کہ آپ بہت بے صبر ہیں۔ اور بے صبر واقعی میں تھا بھی۔ ہر لمحہ میرے لئے درد و کرب کا ایک گھنٹہ تھا اور میں چاہتا تھا کہ یہ تماشہ کسی طرح جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ لیکن میں اسے اسی وقت وہاں نہیں ختم کر سکتا تھا۔ بھلا اتنے

جیسے مجمع میں یہ ذلت کون برداشت کرسکتا تھا! ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

جب ہم مکان کے قریب پہنچے تو اس نے مجھ سے پوچھا "آپ کہاں رہتے ہیں۔ ابھی مکان کتنی دور ہے؟"

"بس ہم پہنچ گئے" میں نے جواب دیا اور ٹیکسی ٹھہر گئی۔ میں نے اس کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالا اور ہم نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ ڈرائنگ روم میں تاریکی تھی لیکن میں نے فوراً بجلی کا بٹن دبا دیا اور روشنی ہو گئی۔ پھر میں اس کی طرف مڑا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں نے کوئی پروا نہیں کی اور سختی سے کہا "اچھا اب ہم اپنے نقاب الگ کرتے ہیں"

میں نے اپنا جملہ ابھی ختم نہیں کیا تھا کہ اس نے اپنا نقاب اتار کر دور پھینک دیا۔

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرا سر چکرانے لگا اور میں کرسی پر گر گیا۔ اس لئے کہ جو عورت میرے سامنے تھی وہ بالکل اجنبی تھی۔ اور اسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس قسم کی عورتوں میں سے تھی جنہیں "بازاری" کہا جاتا ہے مگر یقین کیجئے کہ میں گھٹنے ٹیک کر اس کے پاؤں چومنے کو تیار تھا۔ میں نے اطمینان کی ایک سانس لی۔ میں اس کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ چند منٹ تک تو میں اسے دیکھتا رہا۔ اور احمقوں کی طرح ہنستا رہا۔ میرے اس رویہ سے وہ اور مغرور ہو گئی اور سمجھی کہ میں اس کے حسن سے مسحور ہو گیا ہوں۔

جب میرے ہوش و حواس بجا ہوئے تو پہلا خیال جو مجھے آیا وہ یہ تھا کہ اب اس سے کس طرح پیچھا چھڑانا چاہیے۔ مگر بغیر اسے ذلیل کئے یہ کیسے ممکن تھا۔ میں کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا کہ پیشتر اس کے کہ میں کوئی بہانہ بناتا میرے مکان کے سامنے ایک موٹر آکر رکی۔ میں نے سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنی اور کپڑوں کی سرسراہٹ۔ میری بیوی جیسا کہ اس نے وعدہ کیا تھا جلد ہی آگئی تھی اور سیدھی ڈرائنگ روم میں آرہی تھی۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر اس نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا اور......

یہاں پہنچ کر میرا ہم سفر رک گیا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر کھڑی تھی لیکن اس وقت ہمیں یہ نہیں معلوم تھا۔

"اوہو!" اس نے کہا "مجھے تو یہاں اترنا ہے" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور جلدی سے چلتی گاڑی سے اتر گیا۔

اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا اور نہ غالباً اسے کبھی دیکھوں گا۔ البتہ مجھے اب تک یہ جاننے کی حسرت ہے اور عمر بھر رہے گی کہ جب دروازہ کھلا تو کیا ہوا۔

سید نصیر احمد

شعر

رشکِ دشمن بہانہ تھا، سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

مومن

کنارِ راوی

اک کیف سرمدی سا عالم پہ چھا رہا تھا
دنیا کا ذرہ ذرہ مستی میں آ رہا تھا!
ہر چیز چاندنی سے زرپوش ہو رہی تھی
گردوں سے ماہِ تاباں سونا لٹا رہا تھا۔
دو موسموں میں باہم تھا اتصال گویا
اک وقت آ رہا تھا، اک وقت جا رہا تھا!
راوی کے پُل کے نیچے تھیں نغمہ بار لہریں
لہروں کا راگ دل کو بے خود بنا رہا تھا۔
موجوں سے ہلکے ہلکے گرداب پڑ رہے تھے
منظر یہ میرے دل میں طوفاں اُٹھا رہا تھا
اُس رات کی نہ پوچھو اس رات کا نظارہ
احساس بن کے میرے دل میں سما رہا تھا

پل بھر میں دل کی لیکن حالت ہوئی دگرگوں
اس منظرِ حسیں سے دل دور جا رہا تھا
اک انقلاب آیا ہر شے کی دلکشی میں
جو دلنشیں تھا منظر اب دل کو کھا رہا تھا
اب منظرِ حسیں پر جمتی نہ تھیں نگاہیں
کوئی دلِ حزیں کو پھر یاد آ رہا تھا!

جگن ناتھ آزاد

نمودِ سحر

یہ نسیمِ صبحدم یہ صبحِ صادق کا سماں
ذرّے ذرّے سے عیاں ہے ازنیرنگِ جہاں
وجد میں اشجار ہیں اور جھومتی ہیں ڈالیاں
غنچہ و گُل سے عیاں قدرت کی ہیں گلکاریاں
گوہرِ شبنم سے ہے معمور گویا کوہسار
ہے بھرا دُرِّ عدن سے دامنِ ابرِ بہار
ماہ رُویوں کا وہ جمگھٹ اک طرف تالاب پر
دیکھتے ہی اوس پڑ جائے رُخِ مہتاب پر
عندلیبانِ چمن مستِ ترنم ہو گئیں
ساری کلیاں باغ کی محوِ تبسم ہو گئیں

مظفر حسین شمیم

دنیائے ادب

تازہ ترین سالناموں کے اہم مضامین

(اس دفعہ تازہ سالناموں کے بعض اہم مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان سالناموں کے مضامین کی خوبی اور کثرت کے پیش نظر یہ انتخاب محدود ہے)

عالمگیر۔ خاص نمبر ۱۹۸۹ء

روزمرہ اور محاورہ

اس قابل قدر مضمون میں مولوی انیس احمد صاحب ربانی پوری نے اردو زبان میں روزمرہ اور محاورات کے ارتقا پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہماری زبان میں سلاست کے آغاز اور روزمرہ کی ترویج کے تاریخی پہلو کا جائزہ لیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے زبان میں سادگی، سلاست اور روزمرہ کو داخل کیا اور اس روش کی حوصلہ افزائی کی، ڈاکٹر گلکرسٹ تھا جس نے ۱۷۹۵ء میں اردو کی ایک لغت اور گرامر مرتب کی، اور انگریزوں کی تعلیم کی غرض سے بہت سے ایسے خطوط نما رسالے دستوری لیٹرز لکھے جن کی زبان بہت صاف سلیس اور بامحاورہ ہے۔ مولوی صاحب کا خیال ہے کہ چونکہ گلکرسٹ کی نگرانی میں جو کتابیں تیار کی گئیں، مثلاً چہار درویش، آرائش محفل، خرد افروز، منتخبات ہندی وغیرہ، ان کی زبان میں سلاست کا خاص خیال رکھا گیا تھا، اس لئے جو تصنیفات بھی اس دور کے بعد معرض وجود میں آئیں وہ ان پہلی کتابوں کے انداز بیان سے ضرور متاثر ہوئیں اور بہت ممکن ہے کہ سرسید، غالب، آزاد اور نذیر احمد کے طرز تحریر پر گلکرسٹ کی سلاست ہی اثرانداز ہوئی ہو۔

دوسری جانب اُن کی نگاہ میر انشا اور رنگین کے دریائے لطافت سے گذرتی ہوئی اور ناسخ و مصحفی کے دور کا جائزہ لیتی ہوئی خان آرزو، مظہر جان جاناں بلکہ ولی دکنی تک پہنچی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ مرزا جان طپش نے سنہ ۱۲۱۱ ہجری میں یعنی تقریباً اسی زمانے میں جب گلکرسٹ اپنا فرہنگ ترتیب کر رہے تھے، شمس البیان نامی کتاب تالیف کی جس میں صدہا محاورات مع امثال اشعار دیے گئے ہیں اور استناد دور مصحفی تک کے شعراء کے کلام سے کیا گیا ہے۔ غدر دہلی کے بعد مرزا نیاز علی بیگ نکہت نے محاورات کا ایک جامع لغت تیار کیا جس میں ہر محاورے کے ثبوت میں متعدد اشعار پیش کئے گئے تھے۔ چوتھے دور کے شعراء مثلاً داغ، امیر، جلال، بحر، سحر، ظہیر، انور، راسخ، اشک اور جان صاحب نے اپنے اشعار میں محاورات کا استعمال بڑی فیاضی سے کیا۔ بلکہ داغ اور جان صاحب تو اپنے روزمرہ کے باعث ایک خاص امتیاز کے مالک ٹھہرے۔

اس دور کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اہل ذوق کو لغت کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اردو کے روزمرہ اور محاورات کو نہایت محنت سے مدوّن کیا۔ اس باب میں بھی اوّلیت کا سہرا دانشورانِ فرنگ کے سر ہے چنانچہ فیلن، شیکسپیئر اور پلاٹ کی شہرۂ آفاق ڈکشنریاں اسی عہد کی یادگار ہیں۔ مولوی صاحب کے اس مضمون سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ شمس العلماء مولوی سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ مدت دراز تک اپنے رفیق لالہ چرنجی لال کے ساتھ ڈاکٹر فیلن کے دفتر میں بطور منشی کام کرتے رہے۔ مذکورہ بالا ڈکشنریوں کے علاوہ اس دور میں جو لغت کی کتابیں مرتب ہوئیں ان میں سے سرمایۂ زبان اردو

مرتبہ جلال لکھنوی، جو الفاظ و محاورات کا ایک بے مثال ذخیرہ ہے۔ امیر اللغات نامکمل صورت میں، ارمغان آردو، فرہنگ آصفیہ، محاورات ہندوستانی از لالہ چرنجی لال اور مولوی سبحان بخش کی محاورات ہند نامی کتاب قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے کی آخری کڑی نوراللغات ہے جسے نورالحسن صاحب نیر نے چار جلدوں میں طبع کیا ہے (یہاں صاحب مضمون نے جامع اللغات کا تذکرہ نہیں کیا)

آگے چل کر مولوی صاحب نے روزمرہ اور محاورہ کا فرق ظاہر کیا ہے اور اس فرق کو مختلف اساتذہ اور اہل الرائے اصحاب کے بیانات اور تشریحوں سے واضح کیا ہے۔ مثلاً مرزا بیگ عاشق اپنی تالیف بہار ہند کے دیباچے میں اس فرق کو یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

"روزمرہ سے مراد وہ خالص گفتگو لی جاتی ہے جو ہر طرح کے تصنع بانعلق اور مبالغے سے خالی ہو، جیسے مندرجہ ذیل شعر

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

محاورہ ان الفاظ مقررہ کو کہتے ہیں جو خواہ قواعد صرف و نحو کے مطابق ہو یا مخالف۔ اہل اصول نے جس طرح چاہا ان کو وضع کر لیا ہو جیسے دہ بات کا دھنی ہے۔ اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ بھاری پتھر چوم کے چھوڑ دیا وغیرہ"

مولانا شبلی نے شعرالعجم جلد دوم میں حافظ شیرازی کے روزمرہ کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ہندوستان میں بہ لحاظ روزمرہ ان کی ٹکر کا اگر کوئی شاعر ہوا ہے تو وہ صرف داغ ہے۔ روزمرہ اور محاورے کے فرق کو مولانا یوں بیان کرتے ہیں:

نحو نا جو الفاظ اور ترکیبیں ہمیشہ استعمال میں آتی ہیں اور جن سے روزمرہ پیدا ہوتا ہے، وہی ہوتی ہیں جو فصیح سلیس، نرم اور رواں ہوں اگر ان میں کسی قدر گرانی ہوتی ہے تو وہ روزمرہ کے استعمال سے خارج سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ رات دن سنتے سنتے وہ الفاظ کانوں کو مانوس ہو جاتے ہیں۔ یہی حال محاورہ کا ہے۔ محاورہ اس وقت بنتا ہے جب ایک گروہ کسی جملے کو کسی خاص معنی میں استعمال کرتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ جملہ خود فصیح، سلیس اور رواں ہو ورنہ وہ محاورات کے زمرے سے خارج ہو جائے گا۔"

مولانا حالی کی رائے اس باب میں شاید بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہے فرماتے ہیں:۔

"محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ بات چیت اہل زبان کے روزمرہ کے موافق ہو یا مخالف (لیکن) ہر محاورے کے لئے روزمرہ کا صحیح ہونا لازم ہے۔ ورنہ محاورہ غلط مانا جائے گا۔ محاورہ سے یہ مراد ہے کہ اس کا مصدر مجازی معنوں میں لیا جائے۔ مثلاً کپڑا کھونٹی سے اتارنا۔ کوٹھے سے پلنگ اتارنا ان جملوں میں اتارنا اپنے اصلی معنوں میں استعمال ہوا ہے مجازی میں نہیں، اس لئے بلحاظ روزمرہ صحیح ہے۔ مگر اس کو محاورہ نہ کہیں گے۔ محاورہ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب مصدر کے مجازی معنی لئے جائیں۔ مثلاً کوئی نقشہ اتارنا، کسی کا بہنچا اتارنا کسی کو دل سے اتارنا۔ ان جملوں میں اتارنا کے مجازی معنی لئے گئے ہیں۔ اس لئے ان کا شمار محاورات میں کیا جائے گا۔"

شعرا میں روزمرہ لکھنے کا آغاز میر تقی سے ہوا اور داغ میں کمال کو پہنچا۔ داغ کے بعد جلیل اور ریاض خیرآبادی کا روزمرہ بھی قابل داد ہے۔ روزمرہ لکھنا کوئی آسان بات نہیں اس لئے بعض شعرا نے اپنے روزمرہ پر فخر بھی کیا ہے مثلاً میر انیس سے

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی یعنی مرتع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی

اور بہادر شاہ ظفر تو معشوق کی گالیوں میں بھی روزمرہ کا مزا پاتے تھے۔ لکھتے ہیں:۔

گالیوں کا ہم پہ چلتا خوب چھترا صاف ہے کیا زباں ہے آپ کی کیا روزمرہ صاف ہے

سید انشا نے بھی دریائے لطافت میں اس قبیل کے روزمرہ کی چند مثالیں دی ہیں۔

"براتی بیگم۔ موتی بیگم سے کہتی ہے۔ ارمی اوموئڈی کٹی باندی! تو اتنا جھوٹ کیوں بولتی ہے! اللہ کرے تیری بوٹی بوٹی اوپر والیاں لے جائیں۔ آؤ جائے تو خیلا خندی۔ ستیاناس گئی۔ میں نے کب تیرے میاں کی جورو کا گلہ کیا تھا۔ کٹنے والی کو علی کی سنوار۔ تیرے دیدے گھٹنے کے آگے آئے! بیٹھے بٹھائے اشغلا اٹھایا ہے۔ اوہوری آفت کی پرکالہ۔ ہوائی دیدہ"

یہاں مولوی صاحب نے روزمرہ لکھنے کی مشکلات کا ذکر کیا ہے اور اساتذہ کے کلام سے روزمرہ کے استعمال اور اس کی صحت اور نادرستی کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ روزمرہ کے استعمال میں اچھے اچھے ماہرین ٹھوکریں کھا جاتے ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی

کہ باکمال ادیب تھے۔ روزمرہ میں ماہر نہیں تھے اور بقول سید سلیمان ندوی انہوں نے الہلال کلکتہ میں روزمرہ و محاورہ لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہے۔ خواہ [illegible] زبان [illegible] داغ سے بھی بعض اوقات روزمرہ میں غلطی کر جاتے تھے۔ مثنوی فریاد داغ میں ایک شعر کا مصرعہ ہے

آنکھوں آنکھوں میں رات کٹتی ہے

یہاں آنکھوں کی تکرار جائز نہیں۔ آنکھوں کا لفظ ایک ہی [illegible] چاہئے تھا جیسے سودا ؎

سودا تیری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

محاورے میں جہاں الفاظ کی تکرار ہوتی ہے وہ موقعہ معانی کے لحاظ سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے مثلاً آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہونے یا بقول جلیل ؎

کام لیتا ہے نگاہوں سے ہمارا ساقی
آنکھوں آنکھوں میں کئی جام پلا دیتا ہے

روزمرہ کی مثال اس کے برعکس بھی دیکھئے جہاں تکرار چاہئے تھی اور نہیں کی گئی۔ ایک مشہور استاد کا شعر ہے ؎

میں ہوں نامراد ایسا کہ بلک کے یاس روتی
کہیں پا کے آسرا کچھ جو امیدوار ہوتا

یہاں لفظ بلک کی تکرار کی جاتی تو روزمرہ کے عین مطابق تھا۔ اب نہیں۔ آزاد نے آب حیات میں ذوق سے ایک پرلطف واقعہ منسوب کیا ہے کہ ایک دن بیت الخلا سے نکلے اور حافظ ویران سے کہنے لگے کہ

"سنئے ایک مصرعہ استاد مرحوم کے کسی شاگرد کا ۳۲ سال سے مجھے کھٹکتا تھا کہ اس میں کسی ایک لفظ کی کمی ہے۔ بارے خدا کا شکر ہے کہ آج اس کی اصلاح ہو گئی۔ حافظ ویران نے کہا وہ مصرعہ کیا تھا۔ ذوق مرحوم نے اس طرح پڑھا۔ کھاتی ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ۔ ویران نے کہا پھر آپ نے کیا اصلاح دی۔ ذوق نے اصلاح شدہ گرہ کو مصرعہ اولیٰ سمیت اس طرح پڑھا۔

بل بے گرہ زلف مسلسل کے پیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ"

صاحب مضمون نے ان کے علاوہ اساتذہ کے کلام میں سے روزمرہ کے صحیح اور غلط استعمال کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ ان میں سے اکثر بہت دلچسپ اور لطیف ہیں اور اس بارے میں جن صاحب الرائے بزرگوں سے استناد کیا گیا ہے ان میں ناسخ اور مولانا محمد حسین آزاد جیسے مسلم الثبوت اہل زبان شامل ہیں۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے اردو نثر میں روزمرہ کے رواج کا ایک اجمالی سا خاکہ پیش کیا ہے اور سید انشا کے ٹھیٹھ ہندی قصے داستان کیستکی اور دریائے لطافت کے ان حصوں سے چل کر جو مختلف پیشہ وروں کی گفتگو اور میر غفر غینی اور بی نورن کے مکالمے پر مشتمل ہیں، اردو کے دور جدید کے نثر نگاروں پر بھی ایک نگاہ ڈالی ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے جو نمونے دیئے ہیں۔ وہ مرزا رسوا، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا راشد الخیری کی نثر سے ماخوذ ہیں اور ظاہر ہے کہ مولوی صاحب اردو روزمرہ کے لئے ان سے بہتر ماخذ تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ جی چاہتا ہے کہ ان میں سے چند سے آپ کے ذوق کی تواضع کروں مگر مضمون کی طوالت کا خوف دامن گیر ہے بہرحال ایک آدھ چیز دیکھئے

"خانم کی رجبیوں میں خورشید کا جواب نہ تھا۔ پری کی صورت۔ رنگ سپید شہاب ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ آنکھوں میں موتی کوٹ کوٹ کے بھرے تھے۔ ہاتھ پاؤں سڈول نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ بھرے بھرے بازو گول کلائیاں۔ جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنے معلوم ہو کہ اسی کے لئے مناسب تھا۔ اداؤں میں وہ دلفریبی۔ وہ بھولا پن جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے۔"

(امراؤ جان ادا از مرزا رسوا)

"نصیبہ! اچھے! خدا کے لئے ذرا مجھ کو اس کی صورت دکھا دو۔ میں نے سنا ہے کہ وہ سر سے ننگا ہے۔ پاؤں میں جوتی نہیں۔ کنکروں میں چبھتے ہوں گے۔ کون سے وہ موئے سپاہی تھے۔ میرے بچے کے پکڑنے والے! گھورا ہو تو الٰہی دیدے پھوٹیں! ہاتھ لگایا ہو تو خدا کرے پور پورے کٹ کٹ کر جھڑے۔ صدقے کیا تھا وہ سپاہی اور قربان کیا تھا وہ کوتوال۔ میرا بچہ اور چوری کرنے کے قابل!"

(توبۃ النصوح ڈپٹی نذیر احمد)

مولوی صاحب نے ایک لطیف نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ روزمرہ کا اصلی راز تکرار لفظی اور حذف الفاظ میں مضمر ہے اور ان کی رائے میں بہ نسبت دور قدیم کے جدید دور میں حذف الفاظ کا رواج ترقی پذیر ہے۔ ہمارے

خیال میں مولوی صاحب کی یہ رائے اگرچہ درست ہے مگر روزمرہ کی تمام اصناف پر حاوی نہیں۔ اس امر کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اساتذہ کے دیوان اور انشاپردازوں کے کارنامے موجود ہیں۔ اہلِ ذوق خود دیکھ سکتے ہیں۔

آخر میں مولوی صاحب نے محاورات باندھنے کے سلیقے پر چند سطور لکھی ہیں اور چند لطیف نکات واضح کئے ہیں۔ مثلاً ایک نکتہ یہ ہے کہ ایک زبان کے محاورے کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا خلافِ فصاحت ہے۔ اس سلسلے میں آزاد کی زبانی ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ

"ایک روز رستے میں عبداللہ خاں اوج سے میری ملاقات ہوئی میں نے استاد ذوق کا یہ شعر پڑھا ؎

مقابل اس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

اوج نے شعر کی معمولی تعریف کی اور چلے گئے۔ چند روز کے بعد رستے میں مڈبھیڑ ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد یہ شعر پڑھا ؎

یاں جو برگِ گل خورشید کا کھڑکا ہو جائے
دھول دستارِ فلک پہ لگے تڑکا ہو جائے

شعر پڑھنے کے بعد کہا کہ دیکھئے محاورہ اس طرح باندھا جاتا ہے۔ اوج یہ بتانا چاہتے تھے کہ گو سحر اور تڑکا ہم معنی الفاظ ہیں۔ مگر محاورے میں صرف "تڑکا ہونا" ہی استعمال کیا جاتا ہے۔"

مولوی صاحب نے محاورہ کے غلط استعمال کی بھی چند مثالیں دی ہیں۔ مثلاً "دست و گریباں" ہونے کے معنے مخالف ہونے اور برسرِ پیکار ہونے کے ہیں۔ مگر مولانا آزاد نے اسے بالکل مختلف طور پر استعمال کیا ہے، جو غالباً غلط ہے۔ وہ آبحیات میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔"

مولانا بظاہر تشبیہ کے زور میں ایسے بہہ گئے کہ انہیں محاورے کے مجازی معنے کا خیال نہ رہا۔

مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن جامع ہے۔ ہمیں صرف اس قدر افسوس ہے کہ مولوی صاحب نے شعرا میں سے نظیر کا بالکل ذکر نہیں کیا جس کا کلام سراسر روزمرہ ہے۔ مگر شاید اس غریب کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ لوگ اسے اس میدان میں بھی نظرانداز کر دیں جس کا وہ مرد ہے مولوی صاحب نے نظیر کی طرح اکبر پر بھی توجہ نہیں فرمائی اور نثر نگاروں میں انہوں نے نہ صرف موجودہ دور کے نوجوانوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا بلکہ خواجہ حسن نظامی جیسے ادیب کو بھی نظرانداز کر دیا جو بامحاورہ اور سلیس زبان لکھنے میں خود صاحبِ طرز ہیں۔

سالنامہ "ساقی" جنوری ۴۰ء

لالٹین

سعادت حسن صاحب منٹو کا یہ دل آویز مطالعہ افسانے سے زیادہ ایک لطیف نفسیاتی تجزیے کی حیثیت رکھتا ہے، جسے ان کے دلچسپ اور نرالے اندازِ بیان نے بے حد دلکش بنا دیا ہے۔ قصے کا پلاٹ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وزیر ایک آزاد پہاڑی لڑکی ہے۔ ہر طرح سے آزاد، قصے کا ہیرو پنجاب کے میدانوں سے اس کے پہاڑی وطن میں موسمِ گرما بسر کرنے جاتا ہے۔ ساتھ کچھ احباب بھی ہیں۔ عام فہم و فراست کے لوگ، جو ان تیز اور نازک احساسات کی داد نہیں دے سکتے جن سے ہیرو کے دل و دماغ میں ایک زلزلہ سا پیدا ہو رہا ہے۔ وہ اس آزاد رو لڑکی کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ جس کے قہقہوں میں بھی ایک آہ پنہاں تھی، جس کی کامرانیوں میں بھی ایک تلاش جاری تھی۔ لیجئے پلاٹ ختم ہوا۔ باقی جو کچھ ہے وہی اس افسانے کی روح ہے۔ صاحبِ افسانہ نے قلم اٹھانے سے پہلے اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکا ہے، اور وہاں سے جو کچھ ان کے ہاتھ لگا ہے۔ اس سے انہوں نے اس مطالعے کے نقوش ابھارے ہیں۔ دیکھئے:۔

"میں زندگی زندگی پکارتا ہوں مگر مجھ میں زندگی کہاں! اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنی عمر کی پٹاری کھول کر اس کی ساری چیزیں باہر نکالتا ہوں اور جھاڑ پونچھ کر بڑے قرینے سے ایک قطار میں رکھتا ہوں اور اس آدمی کی طرح جس کے گھر میں بہت تھوڑا سامان ہو، ان کی نمائش کرتا ہوں ...... میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے' دنیا میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی زندگی چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اور

میری زندگی کے ریگستان پر تو ایک بار بارش ہو چکی ہے۔۔
..... جب میں وہ خشک ریگ دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ میرا افق ہمیشہ قدرت کو بھی غمناک کرے گا ــــ آہ! خرابۂ فکر
کا انجام! وہ شخص ہے انجام کار اپنے ازلی افکار کے پیچھے ہیں
جو نہ سے یہ سطور لکھ رہا ہے اور دوسری طرف بیتے ہوئے لمحات
بہت سی سطریں لکھنے کی تمنا اپنے دل میں رکھتے ہیں تو پیشتر
مفہوم ومطالب ہیں لیکن بیشتر جانتے ہیں کہ قوت میں میری
آنکھوں کی زردی اور تیرگی کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار سرخ
کی سرخی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ وہ آب و آتش کے اس باہمی
ملاپ کو دیکھ کر متعجب ہوتا تھا؟

آپ نے دیکھا! جذبات کی شدت نے الفاظ کے لباس کو تار تار کر کے رکھ دیا ہے۔ آنسوؤں کی زردی بظاہر ایک انوکھی بلکہ بے جوڑ ترکیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خدا لگتی کہیے اس نے اپنے تصور سے کس قدر انصاف کیا ہے۔ اسی طرح عمر کی بیماری کہولت ـ زندگی کے ریگستان پر ایک بار بارش کا ہو جانا . . . . اور خرابۂ فکر کا انجام یہ اور زندہ نگارش کے کیسے تابناک پارے ہیں۔ افسانے کے ہیرو کو وزیر سے جو دلچسپی ہے، اس کی نوعیت اس کے دوستوں کی سمجھ میں نہیں آتی، وہ اسے ایک خطرناک پہاڑی لونڈیا سمجھتے ہیں اور شاید ان کا یہ خیال درست ہو لیکن

میں انہیں کیسے یقین دلاتا کہ میں اگر وزیر سے دلچسپی لیتا ہوں تو
اس کا باعث یہ ہے کہ میرا ماضی اور حال تاریک ہے۔ مجھے اس
سے محبت نہیں تھی اسی لئے میں اس سے زیادہ وابستہ تھا، وزیر
سے میری دلچسپی اس محبت کا رد عمل تھی جو میرے دل میں اس
عورت کے لئے موجود ہے جو ابھی تک میری زندگی میں نہیں آئی
میری زندگی کی انگوٹھی میں وزیر ایک جھوٹا نگینہ تھی لیکن یہ نگینہ مجھے
عزیز تھا اس لئے کہ اس کی تراش خراش کا ناپ بالکل اس اصلی نگینہ
کے مطابق تھا جس کی تلاش میں میں ہمیشہ ناکام رہا ہوں۔
وزیر سے میری وابستگی بے غرض نہیں تھی اس لئے کہ میں غرض مند
تھا۔ وہ شخص جو اپنے غم افزا ماحول کو کسی کے وجود سے رونق
بخشنا چاہتا ہو اس سے زیادہ خود غرض اور کون ہو سکتا ہے!
ــــ اس لحاظ سے میں وزیر کا ممنون بھی تھا اور خدا گواہ ہے کہ
میں جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار میرا دل اس کا
شکریہ ادا کرتا ہے۔

شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا ــــ اپنے ماضی حال اور
مستقبل کے گھپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے
رہنا اور بس ــــ مگر شوت میں اس تاریکی کے اندر
روشنی کی ایک شعاع تھی۔ وزیر کی لالٹین!

اور اگرچہ وزیر بجائے خود افسانہ گو کے روحانی ظلمت کدے میں ایک شمع لرزاں تھی، لیکن اس روشنی نے ایک ظاہری لباس بھی اختیار کر لیا تھا، اور وہ وزیر کی لالٹین تھی جسے جلا کر وہ شائیں شائیں کرتی ہوئی رات کے اندھیرے میں نکل جاتی تھی۔ اور اس کی روشنی میں وہ بزعم خود اس ہستی کی دیکھ بھال کرتی تھی جسے دشمن گزند پہنچانے پر تلے ہوئے تھے۔

وزیر کو واقعی میری بہت فکر تھی بعض اوقات وہ مجھے بالکل بچہ سمجھ کر
میری حفاظت کی تدبیریں سوچا کرتی، جیسے وہ خود محفوظ و مامون
ہے اور میں بہت سی بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں نے اسے
کبھی نہ ٹوکا تھا اس لئے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس شغل
سے باز رکھوں جس سے وہ لطف اٹھاتی ہے، اس کی اور میری
حالت بعینہ ایک جیسی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی منزل کی
طرف جانے والے مسافر تھے۔ جو ایک لق و دق صحرا میں ایک
دوسرے سے مل گئے تھے۔ اسے میری ضرورت تھی اور
مجھے اس کی۔ تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ سکے۔ میرا اور اس کا
صرف یہ رشتہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا . . . . .
میں اور اکرام ہر شب مقررہ وقت پر ٹہلنے کو نکلتے۔ بشیر جو ہی مکان
کے پاس پہنچ کر سٹی بجاتا۔ پھر اکرام صاحب کے بنگلے سے کچھ
دور کھڑے ہو کر نعرہ بلند کرتا۔ وزیر لالٹین روشن کرتی اور اس کی
روشنی کو ہوا میں لہرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ بشیر اور
اکرام صاحب باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتے اور میں لالٹین
کی روشنی میں اس روشنی کے ذرّے ڈھونڈتا رہتا جس سے
میری زندگی منور ہو سکتی تھی۔ وزیر جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی نہ جانے
کیا سوچتی رہتی؟

نفسیات کے اس نادر خاکے میں صاحب افسانہ نے کچھ ایسے رنگ بھی بھرے ہیں جن سے اُس گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے جو انہیں مادرِ فطرت سے ہے۔ دیکھئے:

نجیبا سے کے یہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور بشیر ٹہلتے ٹہلتے کرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتے ..... رات کی خنک اور نیم مرطوب ہواؤں میں اس چہل قدمی کا بہت لطف آتا تھا سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں اور ڈھلوانوں پر مکئی کے کھیت رات کے دھندلکے میں خاکستری رنگ کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے اور جب ہوا کے جھونکے مکئی کے پودوں میں لرزش پیدا کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے بہت سی پریاں ان قالینوں پر اتر آئی ہیں اور ہولے ہولے ناچ رہی ہیں۔"

تشبیہ کی ندرت اور زندگی قابلِ غور ہے منٹو صاحب نے اس چھوٹے سے افسانے میں اس قسم کی متعدد تشبیہیں پیش کی ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اپنے اچھوتے پن اور تازگی کے لحاظ سے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

ریڈیو ڈراما

یہ جامع اور دلچسپ مضمون سید بادشاہ حسن صاحب نے لکھا ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ بادشاہ حسن صاحب کا اندازِ بیان عموماً بہت صاف اور سلجھا ہوا ہوتا ہے مگر اس مضمون میں انہوں نے اس بارے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے ڈراما کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا ہے اور اصنافِ ادب میں ڈراما کی مقبولیت کا راز بیان کیا ہے۔ وہ ایک مغربی نقاد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ڈراما قومی شعور کی گہرائیوں کے بالکل قریب ہے وہ مختلف مذاق اور مختلف ماحول کے افراد کو یکساں متاثر کرتا ہے۔ وہ تھیٹر سے ملحق ہے جو انسانیت کے سارے طبقوں کی یکجائی کا مرکز ہے وہ اپنے اغراض و مقاصد میں بہت زیادہ سماجی ہے، اور وہ جذبات کو اکسانے کا موثر آلہ ہے ..

..... دراصل ڈراما کی یہی ہمہ گیری اس کی ہر دلعزیزی کا باعث ہوئی۔"

ڈراما کے نشوونما کا جو تعلق اسٹیج کی ترقی سے ہے وہ شاید ہمارے ہاں تو کچھ زیادہ معنی نہیں رکھتا، کیونکہ یہاں سٹیج کی تعمیر نے ابھی فن کی ابتدائی منازل بھی طے نہیں کی تھیں کہ متحرک تصاویر اور ان کے بعد بولنے والے فلموں نے خود سٹیج ہی کو مٹا دیا لیکن مغرب میں سٹیج کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کے ارتقا کی تاریخ گویا خود ڈرامے کے نشوونما کی کہانی ہے۔ جوں جوں اسٹیج کی وسعت، آرائش اور اُن میکانکی ترکیبوں میں اضافہ ہوتا گیا، جو اسٹیج سے مختلف کام لینے میں بروئے کار لائی جاتی ہیں، توں توں ڈراما نگار ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے فن میں نئی نئی خوبیاں پیدا کرتے گئے۔ یہ عمل نہایت سرعت سے جاری تھا کہ سینما ایجاد ہوا اور پھر کچھ عرصے کے بعد بولتے فلم کا سیلاب آ گیا۔ اس انقلاب کے ساتھ ڈرامائی اصولوں بھی مناسب تبدیلیاں ہوئیں سٹیج کی تنگی جب متحرک تصاویر کی وسعت سے بدلی تو یہ تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔ اسی طرح جب خاموش فلمیں بولنے لگ پڑیں تو خاموش اداکاری کی ٹکنیک یکسر معدوم ہو گئی اور وہ فنِ لطیف جو جسمانی حرکات اور چہرے کے تغیرات کے ذریعے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا اور جسے خاموش فلم نے کمال کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا، ترقی تمدن کی داستان میں ایک ورقِ پارینہ ہو کر رہ گیا۔ ادھر بولتے فلموں کے ساتھ ہی ساتھ ریڈیو ڈرامے کا آغاز ہوا جسے آپ صرف سن سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اس حدبندی سے جہاں ڈرامے کے مجموعی اثر میں ایک گونہ کمی واقع ہوئی، وہاں چند ایسے نئے لطف بھی حاصل ہوئے جن سے ہم پہلے قطعاً ناآشنا تھے۔ تفصیل ان کی اپنے موقع پر آئے گی۔

آگے چل کر صاحبِ مضمون نے اسٹیج اور ریڈیو ڈرامے کے لوازم کے باہمی فرق کو ظاہر کیا ہے اس لئے کہ اسے ظاہر کئے بغیر ریڈیو ڈراما لکھنے اور پیش کرنے کے اصول واضح نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں تضاد منظر اور اس کے اثرات سے مرتب ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اسٹیج ڈراما میں سب سے پہلی چیز اسٹیج کی وسعت آرائش اور ترتیب ہے۔ ظاہر ہے کہ سارے مناظر نقلی پیش کرنے پڑتے ہیں لیکن پھر بھی نقل کو اصل کرنے کی کوشش بے حد و حساب کرنی ہوتی ہے۔ مصور، بڑھئی، درزی اور روشنی کا مہتمم سب سر جوڑ کر ماحول کی نقاشی میں منہمک ہوتے ہیں اور ہر فن کار اپنی سی پوری کوشش کئے جاتا ہے اور کوئی چیز اٹھا نہیں رکھتا۔ آپ جانتے ہیں کہ ان سب کی مشترکہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ تماشائیوں کو خوش کریں۔ دھوکا تو وہ دے نہیں سکتے۔

اس لیے کہ سامنے تماشائی بے چینی لیے ہوئے تھیٹر آتے [illegible] سٹیج [illegible] سے نکلتے ہیں ..... یقین جانئے کہ ایک بھی تماشائی جنگل کا سین دیکھ کر یہ نہیں سوچتا کہ واقعی اسٹیج پر جنگل [illegible] آئے بلکہ اس کے منہ سے بے ساختہ حرف ہی [illegible] کہ جنگل کا کیا اچھا پردہ ہے ..... ریڈیو ڈرامہ [illegible] اس کے برعکس [illegible] سننے والے تماشائی کا تخیل کام کرنے لگتا ہے۔ اگر اس [illegible] الفاظ سنے [illegible] جنگل دیکھ [illegible] کا جنگل [illegible] [illegible] اور کان وہ اسی قسم کے طرز کا متوقع [illegible] اسے [illegible] ہوتا ہے تو ایک [illegible] اور [illegible] کرنے والی [illegible] انسانی [illegible] جنگل کا سین [illegible] [illegible] جاتے [illegible] کے تصور بھی [illegible] عجیب چیز ہوتی ہے — سٹوڈیوں میں بیٹھے بیٹھے جنگل کے پردے نکالتے ہیں"

ہر شخص کا پرواز تخیل اور تیشہ وہ جدا جدا ہوتا ہے اس لئے اسٹیج پر لگا ہوا پردہ سارے تماشائیوں کو بیک وقت خوش نہیں کر سکتا — اس کے برخلاف ریڈیو ڈرامہ کے منظر کو لیجئے۔ آپ کہیں گے کہ ریڈیو ڈرامہ میں مناظر ہی نہیں ہوتے۔ میں عرض کروں گا کہ بے شک پردہ نہیں ہوتا لیکن ایک ماحول بہر حال ہوتا ہی ہے۔ فرض کیجئے دو افراد ڈرامہ جنگل میں گفتگو کر رہے ہیں۔ پیش کنندہ کوئی مادی چیز پیش نہیں کر سکتا بلکہ سننے والوں کے انفرادی تخیل ہی کو اس بات کا موقعہ دیتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات کی بنیاد پر تخیل ہی تخیل میں منظر مکمل کر لیں۔ اسٹیج پر تماشائی کے تخیل اور پردے میں تصادم ہوتا ہے۔ لیکن ریڈیو ڈرامہ میں تخیل کو آزاد چھوڑ دینے کی وجہ سے تصادم نہیں ہوتا ...... اس سلسلے میں دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ اسٹیج پر مناظر کی حد ہے۔ بہت سے مناظر ایسے ہیں جو قطعاً پیش نہیں کئے جا سکتے، ریڈیو ڈرامہ میں مصنف آزاد ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا منظر نہیں جو سننے والوں کے تخیل میں سما نہ سکے خواہ وہ سمندر کا طوفان ہو خواہ ریگستان کی آندھی۔ ڈرامہ کی جائے وقوع بھی اسی طرح ہمالیہ کی چوٹی بھی ہو سکتی ہے اور کوئلہ کی کان بھی۔"

دوسرا بڑا فرق جو ایک طرف اسٹیج اور اسکرین اور دوسری جانب ریڈیو کے ڈراموں کے درمیان پایا جاتا ہے اور جس میں ڈرامہ نگار کے نقطہ نظر سے ریڈیو کی جیت ہوتی ہے، یہ ہے کہ اسٹیج اور فلم دونوں کے ڈراموں میں اکثر اوقات اداکار کی شخصیت اس کے کردار کی خصوصیتوں پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ڈرامہ نگار کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ریڈیو میں اداکار کی شخصیت بالکل معدوم ہوتی ہے۔ اس لئے ڈرامہ نگار اپنے مکالمے کا پورا زور سننے والے کے تخیل پر ڈال سکتا ہے۔ اور اکثر اوقات اس کوشش میں کامیاب ہوتا ہے۔ بادشاہ حسن صاحب نے اس نکتے کی یوں وضاحت کی ہے:۔

"کتنے ڈرامے آپ نے دیکھے ہوں گے جن میں اداکار کی صلاحیت یا شخصیت نے بے چارے ڈرامانگار کو ہی پس پشت ڈال دیا۔ ظاہری آرائش و زیبائش سے لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں یا اداکاری کے ایسے گرویدہ ہو جاتے ہیں کہ اصل ڈرامہ کو فراموش کر کے صرف اس کی یاد محفوظ کر لیتے ہیں حسین اداکارہ سب ہی تماشائیوں کی آنکھوں میں کھبی جاتی ہے اور بھلائے سے نہیں بھولتی۔ خواہ اس کے الفاظ کسی کو یاد رہیں یا نہ رہیں۔ بہر حال اس کی صورت کا نقش سب کے دلوں پر ضرور بیٹھ جاتا ہے بعض دفعہ تو یہ خصوصیت ڈرامانگار کو ایک آفت میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ اس طرح کہ لوگ ظاہری حسن میں محو ہو کر مکالمہ اور اس کے کردار کو فراموش کر جاتے ہیں یا سرے سے محسوس ہی نہیں کرتے — ریڈیو ڈرامہ میں ان دونوں مشکلات سے سابقہ نہیں پڑتا نہ اداکار کا حسین چہرہ سننے والے کے سامنے ہوتا ہے اور نہ وہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہوتا ہے۔ اسی طرح اداکار کے حرکات و سکنات سے بھی ریڈیو ڈرامے کا کوئی واسطہ نہیں۔ نہ زیادہ اداکاری کا اندیشہ ہے اور نہ کم کا۔ لے دے کر صرف لہجہ، تلفظ اور طرز ادا ہی پر ریڈیو ڈرامے کا دارومدار ہے بلاشبہ یہ باتیں اسٹیج کے اداکار کے لئے بھی درکار ہوتی ہیں لیکن اتنی اہمیت انہیں وہاں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت ڈرامانگار کی شخصیت اور ڈرامہ کا اصل مفہوم اور اس کا اصلی جوہر جوں کا توں جس طرح ریڈیو ڈرامہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اسٹیج پر نہیں کیا جا سکتا۔"

اس کے بعد اسٹیج ڈراما میں منظر بدلنے کی دقتوں اور ان کے مقابل ریڈیو ڈرامے میں اس قسم کی آسانیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی مثالیں دی گئی ہیں۔ یہ دقتیں درحقیقت صرف اسٹیج تک محدود ہیں، اسکرین پر ان کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن صاحب مضمون نے اس بات کا تذکرہ غالباً اس لئے نہیں کیا کہ وہ اپنے سامنے صرف سٹیج اور ریڈیو کو رکھ رہے ہیں اور انہیں کا مقابلہ انہیں منظور ہے۔ آگے چل کر وہ ریڈیو ڈرامے کے بنیادی اصول بیان کرتے ہیں اور ریڈیو میں جو حیثیت اناؤنسر (معلن) کو حاصل ہے اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں لمبے ڈراموں یا خالص اسٹیج کے ڈراموں میں معلن کی واقعی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ مناظر کے باہمی رشتوں کو ملا سکے اور طویل ڈراموں کے غیر ضروری مناظر کا محض اعلان کر کے ڈراموں کے اختصار میں مدد دے سکے۔ لیکن بقول ان کے اس اعلان میں کوئی فنی خوبی نہیں بلکہ شکسپیئر کے زمانے کی اسٹیج کی حالت ہے۔ اس کے برخلاف خالص ریڈیو ڈرامے میں معلن کی دخل اندازی کو بہت کم موقعہ دیا جاتا ہے۔ اور ڈرامہ نگار مکالمے ہی میں ڈرامے کی بیرونی ضروریات پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بادشاہ حسن صاحب نے اس کوشش کی چند دلچسپ مثالیں دی ہیں:-

"مقامی اشارے مکالمہ میں کچھ اس طرح ملیں گے۔ "بندۂ خدا! ابھی کوئی خوابگاہ میں۔ بہنے کا وقت ہے۔ کب سے یونہی سو رہے تھے یا یوں ہی پلنگ پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے"۔ موسم کے اشارے اس طرح ہوں گے۔ "افوہ! مارے گرمی کے برا حال ہوا جا رہا ہے اور آپ ہیں کہ کمرے میں بند پڑے ہیں، میرے یار! دریچہ تو کم از کم کھلا رکھا ہوتا یا پنکھا ہی چلایا ہوتا"۔ وقت کا ذکر کچھ اس طرح ہوگا۔ "یہ مغرب رویہ دریچہ کھلا رکھتے تو غروب آفتاب کا رنگین سماں پیش نظر ہوتا"۔ لباس کے متعلق اشارے اس طرح ہوں گے۔ "چلو یار یہیں بھی چکو کپڑے، اوہو! آج تو خاص اہتمام ہو رہا ہے! اچھا میں سمجھا ان کی بھی دعوت ہوگی۔ واقعی اس شیروانی کا انتخاب خوب کیا تم نے انگریز نارنجی رنگ ——— کیا یہ ان کا دل پسند رنگ ہے! اسیاہ نہیں سرخ ترکی ٹوپی اچھی رہے گی"۔ اسی قسم کے اشارے کرداروں کی شخصیت کے متعلق بھی ملیں گے مثلاً عمر کی نسبت "ارے بھئی ہم کو کون پوچھتا ہے، دس برس کی شادی شدہ زندگی نے جوانی کے رہے سہے آثار بھی مٹا دئیے۔ دیکھو پینتیس برس ہی میں سفید بال نکل آئے"۔"

اسی طرح بوڑھے بچے اور جوان کا فرق آوازوں سے اور کرداروں کے باہمی رشتوں کا فرق اُن کے طرز خطاب سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن ان تمام قسم کے اشاروں کا استعمال نہایت احتیاط سے کرنا چاہئے، اور اس باب میں اعتدال کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ ڈرامہ نگار کی توجہ اشاروں کی طرف زیادہ ہوگئی تو مکالمہ کی چستی میں بھی یقیناً فرق آ جائے گا۔ یہاں سے صاحب مضمون آواز کے اثرات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ریڈیو میں کام آنے والی مختلف آوازوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں عقبی آوازوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ گارڈن لی کی اس رائے کو پیش کرتے ہیں کہ سننے والوں کا ایک طبقہ عقبی آوازوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ وہ مکالمے کے پس منظر کو بالکل خاموش اور ساکت رکھنا چاہتا ہے اس کے نزدیک ریڈیو کی عقبی زمین "اگر خاموش ہو تو وہ ایک سیاہ مخمل کی عقبی زمین کے موافق ہے جس پر مکالمہ کے الفاظ روپہلی تاروں کے گندھے ہوئے ستاروں کی طرح دمکتے ہیں"۔ لیکن غالباً ایسے تخیل پرست نسبتاً کم ہیں۔ سننے والوں میں بیشتر تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو عقبی آوازوں سے اپنے تخیل کی تکمیل میں مدد لیتے ہیں بہرحال ان آوازوں کا استعمال بہت کچھ تجربے اور حسن مذاق پر منحصر ہے اور اس لحاظ سے ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ صاحب مضمون نے اُن طریقوں کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے جن سے ریڈیو میں کام آنے والی مختلف آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک ماہر نے سگرٹ کی ڈبیا پر لپٹے ہوئے کاغذ کے مسلنے سے مائکروفون پر ایسی آواز پیدا کی جو الاؤ میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز سے بہت مشابہ تھی۔

یہاں پہنچ کر صاحب مضمون نے آواز کے اتار چڑھاؤ اور ایک ماہر اداکار کی اس قدرت کا ذکر کیا ہے جو اُسے مختلف جذبات کے اظہار کے لئے آواز کے مختلف رنگ پیدا کرنے پر حاصل ہوتی ہے۔ ریڈیو کے اداکار کے لئے اس فن میں مشق بہم پہنچانا ایسا ہی ضروری ہے جیسے اسٹیج اور اسکرین کے کسی اداکار کے لئے اپنے چہرے کے نقوش اور جسم کی حرکات کے ذریعے کردار کی سچی ترجمانی میں کامیابی حاصل کرنا۔ مائکروفون پر وہی آرٹسٹ کامیاب ہو سکتا ہے جو اپنے لہجے کو مکالمے کے ہر رنگ کے ساتھ اسی طرح بدلتا جائے جس طرح ایک کامل موسیقار اپنے گلے کو راگنی کے مختلف سروں کی تشریح میں اوپر تلے کرتا ہے۔

آخر میں بادشاہ حسین صاحب نے ایک مختصر پیراگراف ریڈیو میں تلفظ کی اہمیت کے متعلق لکھا ہے۔ انہوں نے انگلستان کی ایک مقتدر مجلس کا ذکر کیا ہے جو بی بی سی کی طرف سے لسانیات کی تحقیقات کرتی ہے اور جو الفاظ کے صحیح تلفظ کے متعلق بیان جاری کرتی رہتی ہے۔ انہیں یہ خیال اس وقت کے لئے معقول رکھنی چاہئے تھی جب ہمارے ملک کے ریڈیو اسٹیشن اس بارے میں کچھ دلچسپی لینے کے لئے آمادہ ہو جاتے۔ ورنہ یہاں تو ابھی یہ عالم ہے کہ لسانیات اور تلفظ کی تحقیقات تو ایک طرف، زبان و قواعد کی بدیہی غلطیوں پر بھی بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ ہماری ناچیز رائے میں ریڈیو کو اپنی ادبی اور اشاعتی حیثیت سے تلفظ صحیح زبان کی ترویج میں مدد دینی چاہئے اور اگر ابھی یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم غلطیوں کی اشاعت سے تو ہاتھ روکنا بے حد ضروری ہے۔ انگریزی زبان میں تلفظ کے مختلف مکتب ہیں۔ زبان کے عکس ہیں۔ اور ان مکتبوں کے مختلف حامی ہیں جو اپنی اپنی جگہ اپنے پسندیدہ تلفظ کے حق میں دلیلیں رکھتے ہیں ان کی ہم آہنگی کے لئے مجلسیں بنیں لسانیات کے ماہر جمع ہوں اور اتفاق رائے سے کسی نتیجے پر پہنچیں یا بالفرض نہ ہی پہنچیں یہ باتیں انہیں زیب دیتی ہیں۔ ہمارے ہاں کا مسئلہ بالکل جدا ہے۔ اردو زبان میں تلفظ کی ذرا سی غلطی اکثر اوقات معنی ہی بدل دیتی ہے۔ اور اس قسم کی غلطیاں عام لوگ ہر نفقرے میں کرتے ہیں۔ اب مصیبت یہ ہے کہ اکثر وہ لوگ بھی جو مائکروفون پر آتے ہیں۔ اس بارے میں احتیاط نہیں کرتے اور وہ ان غلطیوں کے مزید نشر و اشاعت کا موجب بنتے ہیں۔ ریڈیو کو اس قسم کی لغزشوں کا سختی سے سد باب کرنا چاہئے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب ہماری زبان میں ایسے نقائص و عیوب کا رواج اس کی خوبیوں اور نزاکتوں کا ستیاناس کر کے رکھ دے گا۔

ہمایوں۔ سالگرہ نمبر جنوری ۱۹۴۰ء

کشمیر، اس کی تاریخ اور اس کے مسائل۔

میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں کا یہ مضمون کشمیر کے متعلق ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا کا حکم رکھتا ہے۔ یوں تو ہمایوں کے صفحات اکثر اس خطۂ جنت کے ذکر سے گل بداماں رہے ہیں لیکن زیرِ نظر مضمون اپنی جامعیت اور دلچسپی کے لحاظ سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور میاں صاحب کے سادہ مگر دلکش اندازِ تحریر کا ایک نہایت اچھا نمونہ ہے۔

مضمون کے آغاز میں کشمیر کے طبعی اور جغرافیائی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے کے مطالعے سے کشمیر کی وسعت اور قدرتی تقسیم، اس کے کوہ و دریا، وادیوں اور جھیلوں، اس کے مختلف موسموں، اس کی پیداوار اور صنعتوں، قوموں اور باشندوں، اور مشہور مناظر و مقامات کے متعلق قابلِ قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں بعض بہت دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ کشمیری کشیدہ کاری کے پیچ و خم وادیٔ کشمیر میں جہلم کے بل کھاتے ہوئے راہ گذار کا چربہ ہیں اور کشمیر میں چھ قسم کے موسم بہار ہوتے ہیں اور یہاں کی موسمی تبدیلیاں بھی بہت مشہور ہیں جبھی تو ضرب المثل ہے کہ "کشمیر بی نگہما پوستین"۔ اس سلسلے کی چند اور باتیں صاحبِ مضمون کی زبانی سنئے:۔

"کشمیری پنڈت اپنی ذہانت کے لئے مشہور ہیں۔ ہندوؤں میں موتی لال، جواہر لال اور مسلمانوں میں ڈاکٹر اقبال اور کئی اشخاص کشمیری نسل سے ہیں۔ مشہور پہلوان غلام، کلو، امام بخش وغیرہ بھی کشمیری ہیں ..... کچھ کشمیری سے پنجاب میں آیا، کشمیر کا ہتو، مزدور سارے شمالی ہندوستان میں محنت مزدوری کرتا پایا جاتا ہے ...... یہی شال کے لئے کشمیر مہابھارت کے زمانے سے مشہور تھا۔ مغلیہ زمانے میں، جب اس صنعت کو بہت فروغ حاصل ہوا، ایسی نفیس قسم کی شال بنتی تھی کہ ڈیڑھ گز کا ٹکڑا لپیٹ کر ایک انگوٹھی میں سے نکل سکتا تھا..... پتھر کے کام کے نمونے قدیم مندروں میں اور لکڑی کے کام کے نمونے مسلمان بادشاہوں کی مسجدوں میں نظر آتے ہیں۔ اس کے لئے مارتنڈ کے ستون دیکھو اور اس کے لئے جامع مسجد کے ۳۷۲ ستون جن میں اکثر چالیس چالیس فٹ اونچے ہیں ..... کشمیری عموماً بہت توہم پرست واقع ہوئے ہیں، ہندوؤں کے توہمات عموماً چشموں سے وابستہ ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے ان کے پیروں کے مقبروں سے۔ خاص کشمیر کی وادی کے تقریباً ۹۵ فی صدی رہنے والے مسلمان ہیں۔ یہ وادی اکثر مانجھیوں کی "یا پیر دستگیر" سے گونجتی ہے ..... کشمیر میں بہت سی زبانیں ہیں۔ تقریباً چودہ لاکھ کشمیری بولتے ہیں، چھ لاکھ پہاڑی، ساڑھے پانچ لاکھ ڈوگری، ۳ لاکھ پنجابی، ۳ لاکھ گوجری، سوا لاکھ بلتی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے لئے مشترک ملکی زبان اردو ہے ..... کشمیری زبان کے متعلق

کہا جاتا ہے کہ چھ سو سال ہوئے یہ ایک مکمل تحریری زبان تھی کشمیر کا سب سے بڑا بادشاہ بڈشاہ یعنی زین العابدین خود کشمیری زبان میں شعر لکھتا تھا۔ ہندی کی طرح کشمیری شاعری میں بھی عشقیہ اشعار میں عورت سے مرد کی طرف خطاب ہوتا ہے۔ کشمیری شاعری پر بعد میں فارسی شاعری کا اور تصوف کا بہت اثر پڑا۔ یاس و حسرت کا عنصر اس میں بہت ہے اور نظم میں قافیوں کی کثرت ہوتی ہے بڈشاہ کے بعد فارسی کا رواج بڑھتا گیا، یہاں تک کہ بعض کشمیری فارسی شعرا مثلاً غنی کشمیری نے اہل ایران تک کو اپنا قائل کر لیا ..... کشمیری زبان کے اس وقت کوئی اپنے حروف تہجی نہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بان حروف دوسری زبانوں سے تعداد میں زیادہ ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس میں ۲۷ حروف علت ہیں کسی کشمیری کو بولتے دیکھو تو اُسکے منہ میں کئی قسم کی شکلیں بنتا معلوم ہوتا ہے۔ کشمیری زبان شیریں ہے اس میں ضرب الامثال اور کہاوتیں بہت ہیں۔ کشمیری زبان کے متعلق بہت سے نظریے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سنسکرت سے نکلی ہے فارسی کے الفاظ کی بھی اس میں بہتات ہے ...... دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کشمیری درد زبان کی ایک شاخ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سرحد کی داردی زبان اس کا ماخذ ہے ایک اور نظریہ ہے کہ کشمیری سریانی اور عبرانی سے تیار ہوئی ہے۔ ایک یہودی قوم ترکستان سے یہاں آکر بسی اُن کی زبان عبرانی تھی جو بگڑ کر کشمیری ہو گئی:

اس کے بعد آفات ارضی و سماوی کا ذکر ہے جو زلزلوں طغیانیوں اور برفباریوں کی صورت میں زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر خود ہمارے زمانے تک اس جنت ارضی پر نازل ہوتی رہیں۔ قحط اور وبائیں ان کے علاوہ ہیں جو باشندوں کی توہم پرستی اور جہالت کا سہارا لے کر اس سرزمین میں خوب پھولتی پھلتی ہیں۔ اس سلسلے میں باشندوں کی توہم پرستی کی چند دلچسپ مثالیں دی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ

ویری ناگ سے دس میل پر ایک چشمے کی بعض مچھلیاں یک چشم ہیں اور برف کے قریب ایک غار ملتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ایک مشہور بیراگی اور فلسفی اپنے بارہ سو چیلوں سمیت اُس میں گیا اور پھر نہ لوٹا۔ کھکام سے ۵ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں ایک گول چٹان کا ٹکڑا ہے اس کا وزن ایک من کے قریب ہے اُسے گیارہ مولوی مل کر اپنی سب سے چھوٹی انگلی سے گیارہ گیارہ پکارتے ہوئے اوپر کو اٹھا لیتے ہیں۔ چودھویں صدی ہجری میں اسلام کیا ایسے ہی معجزوں کا نام ہے؟"

جغرافیائی اور تمدنی معلومات کے اس سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے بعد صاحب مضمون کشمیر اور اس کے باشندوں کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کشمیر کی وجہ تسمیہ کی تحقیقات میں اُن تمام نیم مذہبی اور اعتقادی روایات کا جائزہ لیتے ہیں جن سے کشمیر کے جنم کی داستان وابستہ ہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علم الارض کی رُو سے بھی یہ ثابت ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ میں کشمیر کی وادی ایک جھیل تھی۔ چنانچہ اس وادی کی بلندیوں پر اس جھیل کی نباتاتی پیداوار کے پتھرائے ہوئے اجزا اب تک ملتے ہیں۔

تاریخ کشمیر لکھنے کی پہلی کوشش کا سراغ ہمیں سنہ ۱۱۴۸ء میں ملتا ہے جب راجہ ہرشہ کے وزیرزادے کلہن نے سنسکرت نظم میں راج ترنگنی (رود شاہاں) کے شاعرانہ نام سے کشمیر کی ایک مبسوط تاریخ لکھی۔ اس کے وہ حصے جو قدیم تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، مورخانہ صحت سے عاری ہیں، راج ترنگنی کے دو انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا آرل سٹائن نے سنہ ۱۹۰۰ء میں کیا اور دوسرا رنجیت سیتا رام پنڈت نے سنہ ۱۹۳۵ء میں لیکن اس کا سب سے پہلا ترجمہ سلطان زین العابدین (سنہ ۱۴۲۰ء تا سنہ ۱۴۷۰ء) نے فارسی میں کرایا جس کی تکمیل بعد میں اکبر کے حکم سے ملا عبد القادر بدایونی نے سنہ ۱۵۹۴ء میں کی۔ کلہن نے اپنی تاریخ میں جو پہلا سنہ بیان کیا ہے وہ سنہ ۱۱۸۴ ق م ہے۔ اس تاریخ کی مدد سے ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بارھویں صدی تک کے حالات کا ایک خاصہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے زمانے کے متعلق موٹی موٹی مسلمہ باتیں یہ ہیں کہ اشوک نے کشمیر کو فتح کر کے یہاں بدھ مت پھیلایا اور غالباً اسی کے ہاتھوں پرانے سری نگر کی بنیاد موجودہ شہر سے چار میل کے فاصلے پر پڑی اشوک کے بعد کنشک کے عہد میں بدھ مت کو یہاں پھر فروغ حاصل ہوا لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ اُس پر ہندویت غالب آتی گئی۔ شنکرا چاریہ کا موجودہ مندر جو کشمیر میں خالص ہندویت کی نشاۃ الثانیہ کا ایک سنگ میل ہے۔ للتادتیہ کے عہد میں سنہ [illegible]ء کے قریب تعمیر ہوا اور بعد میں سلطان زین العابدین نے اس پر چھت ڈلوائی، سنہ ۶۳۱ء میں مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے کشمیر کی سیر کی۔ وہ یہاں کے پھولوں اور میووں اور یہاں کے باشندوں کے حسن، بزدلی اور دغابازی کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل کے زمانہ

تاریخ میں جو ہندو بادشاہ گذرے ہیں ان میں سے للتادتیہ ۶۹۷ء تا ۷۳۱ء اور آونتی ورمن ۸۵۵ء تا ۸۸۳ء بہت مشہور اور نیک نام ہیں۔ مقدم الذکر ایک فاتح اور موخر الذکر ایک منتظم تھا۔ محمود غزنوی نے ۱۰۱۵ء اور ۱۰۲۱ء میں کشمیر پر دو ناکام حملے کئے۔ ۱۰۳۳ء میں مشہور مورخ البیرونی یہاں آیا اور اس نے اس ملک کی نسبت بعض دلچسپ اور مفید معلومات چھوڑی ہیں۔ وہ یہاں کے علم و فضل کا ذکر کرتا ہے اور سری نگر کو اس لحاظ سے بنارس کا ہم پلہ سمجھتا ہے۔

کشمیر میں مسلمانوں کا دور تقریباً پانچ صدیوں تک رہا۔ قطب الدین ۱۳۷۳ء تا ۱۳۹۸ء کے عہد حکومت میں مشہور اسلامی مبلغ شاہ ہمدان ایران سے آیا اور اس کی تبلیغ و تعلیم سے کشمیر میں اسلام نے بہت ترقی کی۔ کشمیر کی تاریخ میں سکندر بت شکن ۱۳۹۳ء تا ۱۴۱۶ء کے علاوہ اور کسی بادشاہ نے غیر مسلموں پر سختی نہیں کی۔ اس کے جانشین سلطان زین العابدین نے ۱۴۲۰ء سے ۱۴۷۰ء ان سختیوں کا نہایت فراخ دلی سے ازالہ کر دیا۔ ہرگوپال کول اپنی تاریخ گلدستۂ تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "سلطان زین العابدین نے یہ حکم دے دیا کہ ہندوؤں کو جو یہ شکایت ہے کہ سلطان سکندر کے عہد میں اُس کے نومسلم وزیر سہا بھٹہ کے ایما سے بعض ہندو بہ جبر مسلمان بنائے گئے تھے اس کا ازالہ اس طرح کیا جائے کہ جو شخص بھی دوبارہ ہندو ہونا چاہے وہ بخوشی ہو سکتا ہے اس طرح بعض کشمیری پنڈت دوبارہ ہندو ہو گئے۔ یہ پہلی شدھی تھی جو ایک انصاف پسند مسلمان حکمران کے عہد میں عمل میں آئی"۔ اس بادشاہ کے عہد میں کشمیری صنعتوں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ شال سازی اور ریشم سازی میں ترقی کے علاوہ اس کے حکم سے سمرقند سے پیپر ماشی، قالین بافی اور کاغذ سازی کی صنعتیں لا کر پہلی بار کشمیر میں رائج کی گئیں۔

اکبر کے عہد میں کشمیر سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا۔ ہری پربت کا قلعہ جو ملک سے قحط اور بے کاری دور کرنے کے لئے سوا کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا، اور نسیم باغ اکبری عہد کی یادگاریں ہیں۔ جہانگیر نے تو گویا کشمیر کو ہندوستان کا گرمائی دارالسلطنت بنا دیا۔ ویری ناگ کا باغ، شالامار، اچھابل، نانس بل کے کنارے کی بارہ دری اور نورجہاں کی پتھر مسجد اور متعدد سرائیں اسی دور میں تعمیر ہوئیں۔ چنار اور سفیدے کے حسین درخت بھی اسی عہد میں ترکستان سے یہاں لائے گئے۔ شاہجہاں کے عہد میں انگور اور گلاب کی کاشت کو ترقی دی گئی اور پری محل، باغ فیض بخش، چشمہ شاہی، اور آصف جاہ کا تعمیر کردہ نشاط باغ عہد شاہجہانی سے منسوب ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں جامع مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی۔ اس زمانے میں برنیر کشمیر آیا اور اپنا دل یہیں چھوڑ گیا۔ وہ کشمیری صنعت اور مغلوں کی رعیت پرور پالیسی کا بہت مداح ہے۔ وہ یہاں کے گلزاروں، اور ان باغوں کی جن میں نہریں بہتی تھیں بہت تعریف کرتا ہے۔ اس نے ایک مشاعرے کا حال بھی لکھا ہے جس کا موضوع کشمیر کے قدرتی مناظر تھے، اور جس میں ہندی اور کشمیری شعرا نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ کشمیری عورتوں کے حسن و جمال کا بھی بہت مداح ہے۔

۱۷۵۲ء میں کشمیر کو احمد شاہ ابدالی نے تسخیر کر کے یہاں افغانی حکومت کی بنیاد رکھی لیکن پچاس ساٹھ سال ہی میں اہل کشمیر افغان فرمانرواؤں کی زیادتیوں سے ایسے تنگ آ گئے کہ انہوں نے ۱۸۱۹ء میں سکھوں کو کشمیر فتح کرنے کی دعوت دی۔ مگر یہ تبدیلی انہیں بہت مہنگی پڑی کیونکہ سکھوں نے افغانوں سے بھی زیادہ بدعنوانیاں کیں چنانچہ مذکور ہے کہ اگر کوئی سکھ کسی غیر سکھ کو ہلاک کر دیتا تو اسے صرف ۲۰ روپے تک جرمانے کی سزا ہوتی۔ جس میں سے مقتول کے وارثوں کو ہندو ہونے کی صورت میں چار روپے اور مسلمان ہونے کی صورت میں ۲ روپے خون بہا دیا جاتا۔

۱۸۴۶ء میں موجودہ ڈوگرا حکومت کا دور شروع ہوا جب مہاراجہ گلاب سنگھ والیٔ جموں نے پچھتر لاکھ روپے کا نذرانہ دے کر کشمیر انگریزوں سے خرید لیا۔

۱۹۱۰ء میں پہلے پہل کشمیر کی رعایا میں زندگی کی ایک خفیف سی جنبش ہوئی۔ جب حکومت ہند نے ریاست میں بیرونی اقتدار کے خلاف بے چینی کو محسوس کیا اور ریاست کو مشورہ دیا کہ نظم و نسق میں ملکی عنصر زیادہ کیا جائے۔ اسی زمانے میں مسز بیسنٹ کی کوششوں سے سری نگر میں ایک کالج قائم ہوا۔ موجودہ حکمران مہاراجہ ہری سنگھ کے عہد میں "پشتینی باشندۂ ریاست" کے معنی مقرر ہو کر ان کے حقوق کی نگہداشت پر کچھ توجہ کی گئی لیکن راجپوت امرا اور فوجی عناصر ریاست کے نظام پر بدستور غالب رہے۔ ۱۹۲۹ء میں سر ایلبین بینرجی وزیر اعظم نے رعایا کی بے بسی اور حکومت کی بے پروائی سے متاثر ہو کر استعفیٰ دے دیا اور ایک تاریخی بیان جاری کیا جس میں کشمیری کسان اور صناع کی ابتر حالت اور اقتصادی بدحالی کا موجب نظامِ حکومت اور رائے عامہ کی عدم ترجمانی کو قرار دیا۔ اس بیان کا اثر یہ ہوا کہ ۱۹۳۲ء میں اکثریت کی اشک شوئی کے لئے ملازمتیں دینے

...وجود بنایا گیا۔ مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ہندوستان کی تحریک ... نافرمانی کشمیر کے سیاسی حالات پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی اور ۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر نے جنم لیا۔ جو اگرچہ پہلے پہل ایک خالص اسلامی تحریک تھی لیکن بعد میں اس نے قومی رنگ اختیار کر لیا۔ ہزاروں لوگ جیل خانے چلے گئے۔ اور ملک بھر میں ایک آگ سی لگ گئی۔ آخر گلینسی کمیشن مقرر ہوا جس نے کچھ حقوق رعایا کو دلوائے اور ملک میں دستوری اصلاحات کے نفاذ کی سفارش کی۔ ان سفارشات پر عمل کرنے میں حکومت کی طرف سے تساہل ہوا تو ایجی ٹیشن زیادہ ہو گیا۔ اور شیر کشمیر محمد عبداللہ کی سیادت میں تحریک پھر زور شور سے جاری ہو گئی۔ ۱۹۳۴ء میں پرجا سبھا کے انتخابات ہوئے جن میں عوام کی پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کو باضابطہ طور پر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سری نگر میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑ گئی جو مسلمانوں کے مخصوص مفاد کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں اگر ایک نگاہ رعایا کی شکایات اور مطالبات پر ڈال لی جائے اور دوسری طرف حکومت کا زاویۂ نگاہ بھی معلوم کر لیا جائے تو کشمیر کی موجودہ سیاسی کشمکش کا ایک سرسری اندازہ ہو جائے گا۔ قوم پرستوں کا کہنا ہے کہ والیٔ ریاست کا ذاتی خرچ بہت زیادہ ہے۔ اصلاحات برائے نام ہیں۔ کیونکہ وزارت اسمبلی کے روبرو ذمہ دار نہیں ہے تعلیم کے اعداد و شمار اگرچہ روبہ ترقی ہیں، لیکن ناخواندگی میں کوئی کمی دکھائی نہیں دیتی۔ صناعوں کا حال خراب ہے۔ کسانوں کی حالت مالیے کی زیادتی کے باعث ناگفتہ بہ ہے۔ چنانچہ ان کو قوتِ لایموت بھی میسر نہیں۔ ایک صاحب نادر مرزا کا بیان ہے کہ میں نے علاقہ چمن بارہ تحصیل اننت ناگ میں ایک زمیندار کو ماہ ساون ۱۹۳۲ء میں دیکھا کہ اس نے اپنی آٹھ برس کی لڑکی اور چھ برس کے لڑکے کی ٹانگیں رسی سے باندھ رکھی تھیں کہ کہیں اس کے کھیت میں سے جو مالیہ کے لئے رکھا تھا بھٹے توڑ کر نہ کھالیں۔ قوم پرست مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک میں ذمہ وارانہ حکومت کو رائج کیا جائے وزرا اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہوں۔ مہاراجہ کے مخصوص اختیارات کو چھوڑ کر باقی اختیارات عوام کے نمایندوں کو دیئے جائیں۔ انتخاب اور اقلیتوں کے تحفظ کا طریقہ کانگرسی اصولوں پر نافذ کیا جائے اور عوام کو ان کے بنیادی شہری حقوق فوراً دے دیئے جائیں۔

ان مطالبات کے جواب میں حکومت نے ستمبر ۱۹۳۹ء میں ایک بیان جاری کیا جس میں اُن برکات کو شمار کیا ہے جو موجودہ حکمران کے دور میں رعایا پر نازل ہوئیں۔ مثلاً ۱۹۳۳ء میں زمینداروں کو مالکانہ حقوق دیئے گئے اور نذرانہ بھی معاف کر دیا گیا۔ انتقال اراضی کا قانون نافذ کیا گیا۔ بیگار ایک بڑی حد تک موقوف کر دی گئی۔ امداد باہمی کی انجمنیں اور پنچایتیں بنائی گئیں۔ ۲۴ دیہات میں ریڈیو کے سٹ مہیا کئے گئے۔ ریشم سازی اور قالین بافی کی صنعتوں کو سرکاری امداد حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۹ء سے ایک سالانہ صنعتی نمائش بھی منعقد ہوتی ہے۔ جس سے صنعت کی ترقی مقصود ہے۔ ملازمتیں عام طور پر ملکیوں کے لئے مخصوص کی گئیں۔ پریس کو آزادی ملی۔ چنانچہ اس وقت ریاست میں ۳۰ اخبارات ہیں جن میں ایک اردو روزانہ اخبار ہے۔ اسمبلی کے ۷۵ ارکان ہیں جن میں ۴۰ منتخب شدہ ہیں۔ تعلیم کی طرف ریاست کی خاص توجہ ہے۔ چنانچہ ملک میں اب ۱۵۰۰ تعلیمی ادارے ہیں۔ جن میں ۲ کالج، ۲۲ ہائی اسکول اور ایک ہزار کے قریب پرائمری مدارس ہیں۔ اگرچہ اس پر بھی خواندہ مردوں کی تعداد ۸، ۵ فیصدی اور عورتوں کی صرف ۵، فیصدی ہے۔ (اس کے مقابل خواندگی کی نسبت ٹراونکور میں ۹۸، ۲۳ ہے) دیہاتوں میں ۱۲۵ لائبریریاں کھول دی گئی ہیں اور بالغوں کی تعلیم کے بھی دو ہزار مرکز کام کر رہے ہیں۔ ریاست کا سالانہ تعلیمی خرچ ۲۲ لاکھ تک پہنچ گیا ہے جو کل آمدنی کا تقریباً ۹ فیصدی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ واردھا اسکیم کے طرز پر نئی تعلیم کا ٹریننگ اسکول اور اس کے ساتھ ایک بنیادی اسکول جاری کر دیا گیا ہے، اور کشمیر ہی وہ ریاست ہے جس میں نئی تعلیم کا تجربہ سب سے پہلے کیا جا رہا ہے۔

مذکورہ بالا تقابل سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کشمیر کے مسائل کم و بیش ہندوستان کے مسائل ہیں۔ ہندوستان کی تحریک آزادی نے کشمیر کے حالات پر کافی اثر کیا۔ اور از بسکہ کشمیر اپنی سیاسی پستی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا اس لئے گذشتہ بیس برس میں جو ذہنی انقلاب وہاں آیا ہے، وہ پستی کے اس گہرے پس منظر پر بہت نمایاں ہے۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں کہ وہ پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں کشمیر گئے اور اب پانچویں بار ۱۹۳۹ء میں۔ انہیں اب بھی کشمیریوں کی مادی حالت میں چنداں فرق محسوس نہیں ہوتا لیکن ایک بات انہوں نے شدت سے محسوس کی اور وہ یہ کہ کشمیری عوام کی ذہنیت پہلے کی بہ نسبت بہت بلند ہو گئی ہے۔ اب وہ آپ سے خوفزدہ نہیں ہوتے بلکہ انسانوں کی طرح بات کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خودداری کی جھلک اور اُن کے چہروں پر خود اعتمادی کی رونق نظر آتی ہے۔ اور یہ اُسی ذہنی انقلاب کا کرشمہ ہے جو ایک مرد مجاہد اور اس کے رفقاء کی شبانہ روز کوششوں اور مسلسل قربانیوں سے ظہور میں آیا۔ آخر میں میاں صاحب نے

شمیر میں معاشرتی اصلاح اور استیصالِ جہالت کی سخت ضرورت کا ذکر کیا ہے اس بارے میں باشندوں کو خود ہی مدافعت کرنی پڑے گی۔ بیماری اور جہالت کا دور کرنا بڑی حد تک تمدنی اداروں کا کام ہے۔ عیسائی مشنوں نے اس میدان میں خوب حصہ لیا ہے لیکن اہلِ خطہ نے ان کی مثال سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ حال ہی میں ایک یورپین خاتون مسز فولنڈ نے جو امداد دہی کے نام سے معروف ہیں۔ مزدوروں کی بہتری کے لئے ایک سکیم جاری کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا مقصد ہے کہ مزدوروں کی انجمنیں ان کی مصنوعات فروخت کریں اور انہیں مزدوری کے علاوہ منافع سے بھی حصہ دیں۔ جس سے نہ صرف مزدوروں کی مالی حالت کی بہتری بلکہ اُن میں خود اعتمادی اور خودداری پیدا کرنا بھی مقصود ہے۔ مناسب ہے کہ حکومت نے امداد دہی کی اس سکیم کو مدد دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

واقعات اور حقائق کے اس مختصر بیان کا خاتمہ، صاحب مضمون نے ایک لطیف کشمیری نظم پر کیا ہے جو حب الوطنی کے جذبات کی ترجمان ہے۔ ہم اس نظم کے چند اشعار اور اُن کا ترجمہ آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے ذیل میں درج کئے دیتے ہیں۔ "شاعر کاشمیری اپنے وطن کی جنت ارضی کو انسانی ہاتھوں سے پامال دیکھ کر انسانی ہاتھوں ہی سے پھر اسے حقیقی جنت میں تبدیل کیا چاہتے ہیں۔"

دوہا باغوانو بہارک شان پیدا کر — چمن گل کھتہ کرن بلبل تھی سامان پیدا کر
اے باغباں آ اور اک نئی بہار کی شان پیدا کر دے۔ ایسے سامان پیدا کر کہ پھول کھل جائیں اور بلبلیں چہکنے لگیں
چمن ویران سعان شبنم ژتہ جامہ پریشان گل — گلن تے بلبلن اندر دوبارہ جان پیدا کر
چمن ویران ہے شبنم رو رہی ہے پھول کپڑے پھاڑ کر پریشان ہو رہے ہیں۔ تو پھولوں اور بلبلوں میں دوبارہ جان پیدا کر دے
کری کُس بلبلا آزاد پنجرس منز ژہ نالان چھک — ژہ پنے دستہ نین مشکلن آسان پیدا کر
تجھے کون اے بلبل آزاد کرے گا اگر تو پنجرے میں نالاں ہے۔ تُو اپنے ہی ہاتھ سے اپنی مشکلیں آسان کر
چھ باغس جانور بولان مگر آواز چھک بیو بیو — ہندس آلوس یارب اثر یکسان پیدا کر
باغ میں پرندے بولتے ہیں مگر اُن کی آوازیں الگ الگ ہیں۔ اے خدا اُن کی آوازوں میں یکسانیت پیدا کر دے
اگر دزہ ناوہ من ستی گلن ہنز تراو زیر و بم — خیال کرد لو گرگرایہ کر طوفان پیدا کر
اگر تجھے پھولوں کی ہستی جگانی ہے تو زیر و بم اور ساز تار چھوڑ دے۔ اور زلزلہ اور زرد کی ہوا اور بجلی کی کڑک اور طوفان پیدا کر دے

صلاح الدین احمد

ادبِ لطیف سالنامہ ۱۹۵۸ء

مجھ کو آپ سے شکوہ ہے

(مجھے کچھ شکایتیں ہیں، پتہ نہیں کس سے، میں آج کچھ لکھ رہا ہوں معلوم نہیں کیا، کیوں۔؟) (سلام)

پہلے جب دل رکھ ہی لیا تھا آپ نے پھر دل کیوں توڑا!
پہلے جب کچھ آس دلائی، آپ نے پھر منہ کیوں موڑا؟
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے!
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے۔

میں نے آپ کو خط بھیجا تھا — آپ نے بھی زحمت کی تھی
میں نے بھی اپنا سمجھا تھا — آپ نے بھی الفت کی تھی
آپ کا رنگیں خط آیا تھا — میں نے بھی جرأت کی تھی
آپ نے میرا دل رکھا تھا — میں نے بھی حسرت کی تھی
اب جب میرا دل مضطر ہے یہ مدہوشی کیا معنی؟
اب میرے ہر خط کے بدلے یہ خاموشی کیا معنی!
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے۔
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے۔

جوان کی رومانی راتوں میں — رنگین نظمیں کہتا تھا۔
یعنی اپنی ہی باتوں میں — کچھ کھویا سا رہتا تھا۔
ہاں یاد آیا، آپ کو میں نے اپنا "نغمہ" بھیجا تھا
آپ نے کچھ دن بعد اسی کو اپنی دھن میں گایا تھا
جب بھی دیکھو، کھوئے کھوئے پژمردہ سے رہتے ہو
آپ نے پوچھا تھا، "پھر کیسے ایسی نظمیں کہتے ہو!"
کچھ دن پہلے آپ مرے نغمات سے کھیلا کرتے تھے
بھولے سے اک شاعر کے جذبات سے کھیلا کرتے تھے۔
اب جب میں نے دُکھ میں رنگیں نظمیں کہنا چھوڑ دیا۔
بیکس کا دل رکھنا کیسا، آپ نے بھی دل توڑ دیا۔
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے

...ہی اک دولت والا ہوں   آپ نے شاید سمجھا تھا
میں بھی نازوں کا پالا ہوں   آپ کو شاید دھوکا تھا
اچھی صحبت ہے، شاعر ہوں اور فسانے لکھتا ہوں
تیس برس کا ایک جواں ہوں شوخ طبیعت رکھتا ہوں۔
آپ نے یہ سب سمجھا مجھ کو اور مجھے مانوس کیا۔
اب جب میری حالت دیکھی دل توڑا مایوس کیا۔
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے۔

دولت، ثروت، عزت سے تو الفت کو کچھ کام نہیں
لذت کی افسردہ راتیں شادی کے ایام نہیں
آپ کو دولت سے الفت ہے   میں اس سے آگاہ نہیں
آپ کو عزت سے نفرت ہے   خیر مجھے پرواہ نہیں۔
آپ یونہی سرگرم خوشی ہوں اور طبیعت شاد رہے
اچھا اب خاموش ہوں، چپ ہوں، لیکن اتنا یاد رہے
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے

سلام مچھلی شہری

اس نظم سے ہندوستان کے نوجوانوں کی زندگی کے ایک ایسے پہلو پر روشنی پڑتی ہے جس کی تلخی اگر جلد ہی بڑے بوڑھوں اور ہمدردانِ ملک کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی تو اس کا نتیجہ ہندوستان ہی کے حق میں برا ہوگا۔ تہذیب و تمدن کی اُلجھنوں کے بارِگراں کے وزن سے ہمیشہ جنسی طور پر ایک بے اطمینانی پیدا ہو جایا کرتی ہے لیکن ہندوستان ایسے ملک میں جہاں مغربی اثرات کے باعث جوانی کو بھڑکانے کے سامان تو مہیا کئے جا رہے ہیں لیکن سماج میں اُس کی تسکین کے طریقوں کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی، یہ بے اطمینانی اور اُلجھن اور بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے لیکن اس کا احساس کسے ہے؟ صرف ان جانانِ وطن کو جن کی زندگی میں ایسے رومان آتے ہیں جو موجودہ حالات کے ماتحت ہمت کو پست ہی بنا سکتے ہیں۔ یہ حقیقت بہت ہی افسوسناک ہے۔ سماج کے اس پہلو کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں دے رہا اور اس سلسلے میں جو بھی قدم اٹھایا گیا ہے وہ جوانوں کی زبردستی اور بڑے بوڑھوں کی مجبوری ہی کی وجہ سے اٹھایا گیا ہے۔ اس وقت ہمارے بڑے بوڑھے لڑکوں کو نئی تعلیم دلا کر انہیں ... آزاد اور بہتر زندگی ... کو پیدا کر رہے ہیں لیکن ان کے لئے صحیح حالات نہیں پیدا کر رہے اور اس پر ستم یہ ہے کہ وہ لڑکیوں کو سطحی مغربی تعلیم کے بجوبیں چلنے پر تو اکسا رہے ہیں لیکن حالات کے لحاظ سے ان کی مذہبی تربیت کی طرف بہت کم توجہ دے رہے ہیں۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ جناب رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں جیل خانے اور شفاخانے کی رونق بڑھاتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں سدھار کے لئے باقاعدہ جہاد کی ضرورت ہے لیکن اُس جہاد کے لئے دلائل کے لحاظ سے یہ نظم ایک اچھی مثال ہے۔

میراجی

نقد و نظر

ارمغان جذب یہ مجموعہ جناب جناب رائے سید راؤ جذب کی رباعیات کا دوسرا حصہ ہے جسے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے جناب ماہر القادری کے دیباچے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ان رباعیات کا موضوع اخلاق و نصیحت ہے۔ ان میں سنسکرت کی قدیم ناصحانہ شاعری اور سعدی کے اسلوب کی جھلک قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ اور اس لئے یہ کتاب سکولوں کے طلبا کے لئے رباعیات کا ایک اچھا مجموعہ بن سکتی ہے۔ قیمت بارہ آنے ۱۲ ر

پستالوزی آج سے سو سال پیشتر کے یورپ میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے مغرب کی ذہنی ترقی کے سلسلے میں ایسا نمایاں کام کیا جو ہر ملک کے افراد کے لئے قابل رشک و تقلید ہے۔ اس زمانے میں یورپ کو جن مسائل حیات کا سامنا تھا، پستالوزی نے اُن تمام پر روشنی ڈالی لیکن اس کے خیالات صرف پہلے مسائل کا حل ہی نہ تھے بلکہ چند اور مسائل کے سمجھانے کا باعث بھی ہوئے جن کے بارے میں اُس وقت کے ماہرین تعلیم و تمدن نے غور و تفکر شروع کیا۔ تعلیم و تمدن کے متعلق پستالوزی نے جو بنیادی اصول پیش کئے تھے اُن کو گذشتہ سو سال کے فکر کے بعد تسلیم کیا جارہا ہے اور یوں موجودہ زمانے کے اصول و قوانین تہذیب و تعلیم بھی گویا اُسی شخصیت کے اثر کا کرشمہ ہیں۔

جناب ڈاکٹر عبدالحمید زبیری بی اے (جامعہ) ایم اے پی ایچ ڈی نے دو سو سولہ صفے کی اس کتاب میں اس مغربی مفکر کی شخصیت، سوانح حیات اور فلسفۂ تمدن، فلسفۂ مذہب اور فلسفۂ تعلیم کے متعلق اُس کے خیالات کا قابل قدر جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق اس وقت ہندوستان کا ماحول بھی انہی خصوصیات کا حامل ہے جن میں پستالوزی کی شخصیت پیدا ہوئی۔ اسی لئے اُس کے خیالات اور حالات کا مطالعہ ہمارے لئے بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا انداز بیان واضح اور صاف ہے۔ اور اُنہوں نے یہ کتاب تالیف کر کے ہندوستان کی تعلیمی اور تمدنی ترقی کے سلسلے میں ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ ہمارے معلمین کو خصوصاً اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے لکھائی چھپائی بہت خوب۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

خمسۂ کیفی یہ کتاب ملک کے مشہور ادیب جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے تین مضامین اور دو نظموں کا مجموعہ ہے۔ دو مضمون براہِ راست زبان اُردو سے متعلق ہیں۔ (۱) اُردو ہماری زبان اور (۲) اُردو لسانیات۔ ایک مضمون ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات پر ہے۔ اور دو نظموں کے عنوان ہماری زبان اور ترقی اُردو۔ شگفتگی، سلاست، معلومات اور علمی گہرائی، یہ تمام خصوصیات علاوہ کیفی کی تحریر کی خصوصیات ہیں اور ان مقالوں میں سے ہر ایک ان کا حامل نظر آتا ہے۔ ادبی دنیا کے پڑھنے والے بھی اس مجموعے کو حاصل کر کے خوش ہوں گے کہ اُنہوں نے جن مضامین کو ادبی دنیا یا اور رسائل میں علیحدہ علیحدہ پڑھا تھا۔ وہ اب پائیدار صورت میں یک جا مل سکتے ہیں۔ قیمت چار آنے حجم ۷۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

دو ڈاکٹر اسی صفحات کی یہ مختصر کتاب سندباد جہازی یعنی جناب چراغ حسن حسرت کاشمیری کے دو سیرتی انگاروں پر مشتمل ہے جسے اُردو اکیڈیمی پنجاب لاہور نے شائع کیا ہے اور جو اُن سے ۸ ر میں مل سکتی ہے۔

حسرت (سندباد جہازی) کی طنز نگاری اُردو خواں طبقے میں جس قدر مقبول ہے اس کا اظہار غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ مضامین اُن کی مزاح نگاری کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ دیباچے میں جناب کرشن چندر ایم اے لکھتے ہیں۔ "مغرب میں سوانح نگاری ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ لیکن اردو ادب نے اس سلسلے میں ابتدائی مدارج بھی نہیں طے کئے۔ ہمارے ہاں .... سوانح نگار جس شخص کے حالات لکھنے بیٹھتا ہے یا تو اُسے تمام غلطیوں اور

...سے پاک اور مبرا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اُس کی تمام ...یوں پر یکسر سیاہی پھیر دیتا ہے۔۔۔۔ مغرب کے موجودہ دور کے سوانح نگاروں کی سیرت نگاری اور کردار نگاری کا کمال یہ ہے کہ ان کے لکھے ہوئے سوانح حیات میں ایک بڑا سیاست دان، سپاہی، ادیب یا فلسفی ایک انسان نظر آتا ہے۔ خوبیوں اور برائیوں کا مجموعہ۔۔۔۔۔۔

اگر آپ حسرت صاحب کی سوانح نگاری کو اس اصول پر پرکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پنجاب کے ان دو لیڈروں (ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر محمد عالم) کے سوانحی حالات لکھنے میں اُن کا مقصد۔۔۔ صرف اتنا ہے کہ صحیح قسم کی سوانح نگاری کو فروغ حاصل ہو۔۔۔۔ یہ دو مضامین دو انسانوں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ ان میں زندگی کی لہر ہے۔ کشمکش اور اضطرار رفیق سیاسی رموز مزاح کے لطیف پیرائے میں کچھ اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ انہیں بار بار پڑھنے میں ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔"

ہمیں جناب کرشن چندر سے پورا اتفاق ہے۔

البتہ ایک افسوس ہے کہ اتنی اچھی کتاب میں کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

سائنس کے کرشمے اس کتاب کو جناب میر حسن ایم اے نے مرتب کیا ہے اور اس کا دیباچہ اُردو کے مشہور نقاد جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لکھا ہے۔

ایک سو بارہ صفحے کے اس مجموعے میں مختلف حضرات کے مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱ ہوا – ۲ پانی – ۳ – بجلی – ۴ – ہوا بازی ۵ – ٹیلی وژن ۶ – کیمیائی جنگ اور – ۷ – ریڈیو

ان مضامین سے پہلے جناب مرتب نے ایک وضاحتی مضمون "سائنس کیا ہے" کے عنوان سے لکھا ہے۔

یہ مجموعہ بھی طلباء کے لئے ایک اچھی چیز ہے۔

ملنے کا پتہ :۔ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

قیمتی باتیں جناب فیض لدھیانوی نے بچوں کے پند و نصائح کا یہ دلکش منظوم مجموعہ مثنوی کے طور پر مرتب کیا ہے اس کی زبان عام فہم اور سلیس اور بچوں کے لئے ازبس موزوں ہے۔ پند و نصائح کو منظوم صورت میں پیش کر کے بچوں کو خشک باتوں کی طرف آسانی سے توجہ دلائی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں یہ مجموعہ سکولوں کے لئے بھی ایک مفید چیز ہو سکتا ہے قیمت ۲ ؍ ملنے کا پتہ ماسٹر فیض لدھیانوی۔ اسلامیہ ہائی سکول شیراں والا دروازہ۔ لاہور

مطالعۂ حافظ شاید آپ نے بڑی بوڑھیوں کی نسبت یہ سنا ہوگا کہ وہ نوجوانوں کو دیوان حافظ کے مطالعہ سے روکتی ہیں اور دلیل یہ کہ اس کے پڑھنے سے یا تو انسان ولی بن جاتا ہے یا مجنون۔ اب آپ جناب محمد احتشام الدین حقی دہلوی کے نتائج تحقیق کو بھی دیکھئے جو انہوں نے "مطالعۂ حافظ ——— اور اُس سے کیا مستنبط ہوتا ہے" کے عنوان سے اُردو خواں طبقے کے سامنے پیش کئے ہیں۔ جناب حقی دہلوی اس کام کے لئے موزوں بھی تھے کہ انہوں نے اس سے پیشتر دیوان حافظ کی چھ سو غزلوں کا ہم قافیہ اور ہم آہنگ منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمے کے دوران میں اُن پر حافظ کے اصلی مفہوم و معانی کے اسرار منکشف ہوئے ہیں۔ اور چونکہ اُنہیں خود اس قدر گہرائی کے ساتھ دیوان کے مطالعہ کا موقعہ ملا ہے اس لئے اُنہوں نے اس مطالعے کے نتائج کو اب کتابی صورت میں اوروں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

فارسی کے مشہور شعراء میں سے خیام ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام اور شخصیت میں مغربیوں کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور اُنہوں نے اُس کے متعلق جو کچھ تحقیق کی وہ ہم مغرب زدوں تک پہنچی۔ ہم نے اپنے طور پر اُس تک پہنچنے کی اُس وقت کوشش کی جب مغرب والوں نے ہمیں سمجھایا کہ تمہارے ہی برّاعظم میں ایک قابل قدر شاعر خیام بھی ہے لیکن حافظ کے متعلق انگریزی نقاد ذرا پیچھے رہے۔ اس لئے اس کے متعلق مغربی ماخذ کی تشنگی کی وجہ سے ہمیں خود حافظ کے متعلق کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ جس کا ایک ثبوت اس ریویو کے پہلے فقرے سے ظاہر ہے کہ بڑی بوڑھیوں میں کس قسم کے توہم پرستانہ خیالات بار پا گئے حالانکہ ہمارے خیال میں کلام حافظ ایک انسان کو صحیح طور پر ہوش مند بنا سکتا ہے۔

کلام حافظ کے سمجھنے میں بڑی دقت اس وجہ سے بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی زبان "بادہ و ساغر" کی زبان ہے۔ اور اصل مفہوم کا علیحدہ کرنا مشکل ہے کیونکہ کہیں تو بادہ و ساغر محض "بادہ و ساغر" ہی ہوتے ہیں۔ اور کہیں "مشاہدۂ حق کی گفتگو کا پردہ"۔ "مطالعۂ حافظ" کے مصنف نے الجھن کو دور کرنے کی ایک اچھی کوشش کی ہے۔ نیز کلام حافظ ہی سے سوانح حافظ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بڑا سائز حجم ۱۶۰ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔

ملنے کا پتہ :۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی

مسولینی کی آپ بیتی مترجمہ سید بادشاہ حسین حیدرآبادی۔ ناشر ادارہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن۔

حجم ۲۵۵ صفحے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ لکھائی چھپائی صاف اور اچھی۔

اگرچہ اردو میں ابھی طبعزاد سوانح نگاری کا میدان شہسواروں کے لئے بیشتر خالی پڑا ہے لیکن گذشتہ چند سالوں میں مغربی سوانح عمریوں کے ترجمے جس کثرت سے ہماری زبان میں آ رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ مغربی سیاسیات کی دلچسپی سوانح نگاری میں بھی لوگوں کے اشتیاق کو اس قدر بیدار بنا دے گی کہ جب ترجموں کا دور گذر جائے گا تو ہمارے مصنفین طبعزاد سوانح نگاری کی طرف بھی اس اشتیاق کے تقاضے سے مجبور ہو کر متوجہ ہوں گے۔ چونکہ مغربی سیاسیات کی دلچسپی ہی سوانح نگاری کی طرف توجہ کا باعث ہوئی ہے اس لئے زیادہ تر سیاسی مشاہیر کی سوانح عمریاں ہی ترجمہ کی جا رہی ہیں۔ اس سے پیشتر کمال اتاترک، ابن سعود، رضا شاہ پہلوی، ہٹلر وغیرہ وغیرہ حضرات کے حالات اردو پبلک کے سامنے آ چکے ہیں۔ اور اب سید بادشاہ حسین صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے مسولینی کی آپ بیتی کا ترجمہ کر کے ملک کی ایک مانگ کو پورا کیا ہے۔ اگرچہ مسولینی فاشیت کا علمبردار ہے اور ہٹلر نازیت کا، اور ہندوستان کو اشتراکی جمہوریت سے زیادہ دلچسپی ہے لیکن یہ دلچسپی بہت حد تک سطحی بھی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مغرب کی تمام سیاسی تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ اردو پبلک اس سے پہلے ہٹلر کی آپ بیتی کے ذریعے سے نازیت کا مطالعہ کر چکی ہے اور اب وہ مسولینی کی آپ بیتی کے ذریعے فاشیت کا مطالعہ کر کے دوسرے فائدوں کے علاوہ اس کا فیصلہ بھی کر سکتی ہے کہ کیا علامہ اقبال فاشیت کے حامی تھے یا نہیں۔

مغربی تصانیف کے اردو تراجم | جناب میر حسن ایم اے۔ نے اس اہم موضوع کی طرف توجہ کی ہے۔ اردو ادب کے ابتدائی دور ہی سے مغربی تصانیف کے تراجم ہمارے ادب کا ایک نمایاں حصہ بن گئے تھے۔ لیکن شروع شروع میں صرف چند درسی کتابیں اور عام پسند ناول ہی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ رفتہ رفتہ مغربی ادب کے ہر شعبے کی طرف اردو کے مترجمین نے رجوع کرنا شروع کیا۔ اور رسائل کی قبولیت اور مقبولیت کے ساتھ تو مغرب کے ادب کی بہت سی اچھی چیزیں اردو میں منتقل ہونے لگیں۔ موجودہ کتاب کے مؤلف نے ایسی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا چھپلتا سا جائزہ لیا ہے۔ اور تراجم کی اس کارگذاری کے مختلف دور بتائے ہیں مثلاً ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۲ء تک قدیم ترین تراجم کا دور۔ اس کے بعد دوسرا دور ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۷ء تک۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۵ء تک کے ترجمے۔ اور زمانۂ حال یعنی ۱۹۱۵ء کے بعد کے تراجم۔

اگرچہ قدیم دور میں مؤلف کی تحقیق کافی حد تک اچھی ہے اور انہوں نے فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی، سررشتۂ علوم و فنون و سلسلۂ آصفیہ حیدرآباد، انجمن ترقی اردو، دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، ہندوستانی اکیڈیمی اور اردو اکیڈیمی کی کارگذاریوں کے ساتھ ساتھ ہر دور کی انفرادی کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن انفرادی کوششوں کے باب میں ان کی تحقیق مکمل نہیں رہی۔ خصوصاً عہد حاضر میں ان کی نظر صرف حیدرآبادی حضرات کے دائرے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نیز انہوں نے رسائل کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ ورنہ انہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ تراجم کے سلسلہ میں وسط ہند اور خصوصاً پنجاب نے حیدرآباد کی بہ نسبت کچھ کم کام نہیں کیا۔ امید ہے کہ وہ آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

حجم ۲۵۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے عمر، ملنے کا پتہ:۔ دفتر ادارۂ ادبیات اردو۔ رفعت منزل۔ خیریت آباد (حیدرآباد دکن)

یادِ چکبست | ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں یوم چکبست منانے کے لئے اردو زبان کے شعراء اور نقاد جمع ہوئے۔ یہ کتاب اسی اجتماع کی یادگار ہے۔ تقریباً پونے دو سو صفحات میں چکبست کی شخصیت اور شاعری کے متعلق مختلف مضامین کے علاوہ اس میں مذکورہ بالا یوم چکبست کے مشاعرے کی تمام غزلیات بھی آخر میں دی گئی ہیں۔ مضامین میں تنوع ہے اور ان سے جہاں چکبست پر روشنی پڑتی ہے وہیں مضمون نگاروں کے مختلف انداز بیان کا بھی اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چند عنوان دیکھئے:۔ ۱۔ چکبست ایک شاعر کی حیثیت سے ۲۔ چکبست کی شاعری۔ ۳۔ پنڈت برج نرائن چکبست۔ ۴۔ چکبست کی انفرادیت۔ ۵۔ چکبست بہ حیثیت مصلح وطن پرست۔ ۶۔ چکبست کے کلام پر ایک سرسری نظر، چکبست پیامبر دور جدید۔ ۸۔ ادب اردو اور چکبست۔ ان مضامین کے لکھنے والوں میں ذیل کے ادیب اور نقاد شامل ہیں:۔

ڈاکٹر عبدالحق۔ نیاز فتحپوری۔ مرزا جعفر علی خاں اثر۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ ڈاکٹر تاراچند۔ سید سجاد حیدر یلدرم۔ حکیم آشفتہ لکھنوی۔

دیانرائن نگم۔ سید احتشام حسین رضوی۔

شروع میں جناب برج کرشن ٹوبہ دجج عدالت خفیفہ لکھنؤ اور آنریری سکریٹری چک لبست میموریل فنڈ کے قلم سے عرض حال ہے۔ اور اس کے بعد رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے قلم سے ایک مختصر تعارف۔ ڈاکٹر موصوف ہی اس انجمن کے صدر تھے۔

یہ مجموعہ چک لبست کے قدردانوں کو خصوصاً اور اُردو ادب کے طلباء کو عموماً حاصل کرنا چاہئے۔

کتابت اور طباعت کے حسن کے لئے انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد کا نام ایک ضمانت ہے۔ کتاب مجلد ہے اور اس پر ایک گردپوش لپٹا ہوا ہے۔ حجم ۱۷۱ صفحات۔ ملنے کا پتہ۔ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد۔

میراجی

فرانس کی رنگین زندگی
کا دلچسپ مرقع

فطرت انسانی کا
دلچسپ انگیز تجربہ

محبت کی دلآویز انگیز
داستانیں

امید و بیم کی
کشمکش

جذبات و احساسات کا
ارتعاش

یہ سب مناظر

سحر فرانس

فرانس

افسانہ نگار گائی دموپساں کے بائیس ۲۲ دل کش

کا مجموعہ ہے

کا

ن ماہیں مہتاب
شاعر کی حیثیت
۴- چکبست
۶- چکبست
۸- ادب
کے ادیب

پروفیسر مسعود
لکھنوی -

اوٹین کریم اور سنو

فلم اور سٹیج کے درخشاں ستاروں کے رنگ و روپ کو پائدار بنانے کے لیۓ بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے اعصاب اور پٹھوں کی صفائی پرورش کے لئے خوراک اور زندگی بخش طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اوٹین کریم اس بلند معیار کی تمام حاجتوں کو پورا کرتی ہے۔ یہ مسام سے فالتو مواد کو خارج کرتی ہے ان کے بند ہو جانے کو روکتی ہے اور اس طرح جلد کو ہوا سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقع دیتی ہے اس سے جلد کی دونوں طرف کے سوراخوں کی پرورش ہوتی ہے جلد کے نیچے خون کے جو ننھے ننھے ذرے موجود ہوتے ہیں اس سے وہ تازہ ہو جاتے ہیں اور خون کی گردش صحت کے صحیح اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور رنگ و روپ میں جوانی کی تازگی لوٹ آتی ہے۔



دنیائے فلم کی خوبصورت اور خوش ادا ستارا اوٹین کریم کا استعمال کرتی اور اس کی سفارش کرتی ہے۔
آپ بھی اوٹین کریم کا استعمال کرنے سے اسی طرح اس کے مداح بن جائیں گے۔



Oatine CREAM *for nightly massage*
SNOW *for daily protection*

ہر روز سوتے وقت اوٹین کریم کی مالش سے چہرے اور گردن کے اعصاب زور حاصل کرتے ہیں۔ یہ کریم جلد کو ڈھیلا ہونے یا اس پر جھریاں پڑنے سے بچاتی ہے اور بہت آسانی سے قدرتی طور پر نیند کے دوران میں آپ کے حسن میں ایک نئی زندگی لاتی ہے۔

دن کے وقت اوٹین سنو کے استعمال سے ایک ٹھنڈک پہنچتی ہے اور حسن کو دن بھر دھوپ، ہوا، گرد اور پسینے سے محفوظ رکھتی ہے

خوبصورتی کو بڑھانے اور قایم رکھنے کے لئے صرف ان دو چیزوں کی ہی ضرورت ہے،

(اس شمارے کے تمام مضامین نظم و نثر کے جملہ حقوق محفوظ ہیں)

ڈاک کے ڈاکو ... بہت سے خریداروں کی طرف سے شکائتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا ... حالانکہ پرچہ دفتر سے باقاعدہ بھیجا جاتا ہے ... ادبی دنیا ہر ماہ کی ... تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے ... ڈاک کے دروازے پر ... مینیجر

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — نمبر ۵

تصاویر۔ اسادلوں کے جھولے پر ۲۔ ایپلی مین برنٹی ۳۔ شارلوٹ برنٹی ۴۔ این برونٹی

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک او روی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

... پرنٹر پبلشر نے ... لاہور سے شائع کیا۔

دنیائے کاروبار

میسور کے دیہاتیوں میں بیداری

"دیہات سدھار کے کام کی یہ قابلِ تعریف صورتِ حال دراصل محکمۂ پنچایت کا شعبہ جاتی افسروں کی راہنمائی میں دلی اتفاق کے ساتھ کام کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں قابلِ ذکر یہ امر ہے کہ سرکار کی دیہات سدھار کے کام میں امداد اور بڑی بڑی کوششیں جو مختلف قریوں میں باقاعدہ کام کاج پر مبنی ہیں۔ اس وقت دیہاتیوں کو گرویدہ اور متاثر کر رہی ہیں جس کے ثبوت میں لوگوں سے دن بدن متواتر درخواستیں آ رہی ہیں کہ ان کے قریوں کو بھی منتخب شدہ دیہات میں شمار کر لیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ دیہاتیوں میں دیہات سدھار کے پروگرام میں یقین اور اپنے اپنے قریوں کو ماڈل ویلج بنانے کی خواہش بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا یہ امید کرنا بے جا نہ ہوگا کہ قریہ کی زندگی کے لئے دیہات سدھار کے کام کو عام طور پر ایک نہایت ضروری چیز قرار دے دی جائے گی۔"

یہ ہیں وہ خیالات جو ڈپٹی کمشنر صاحب کڈور نے انتخاب شدہ قریوں کے کام کی ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کی ششماہی افتتاحی رپورٹ میں ظاہر کئے ہیں۔

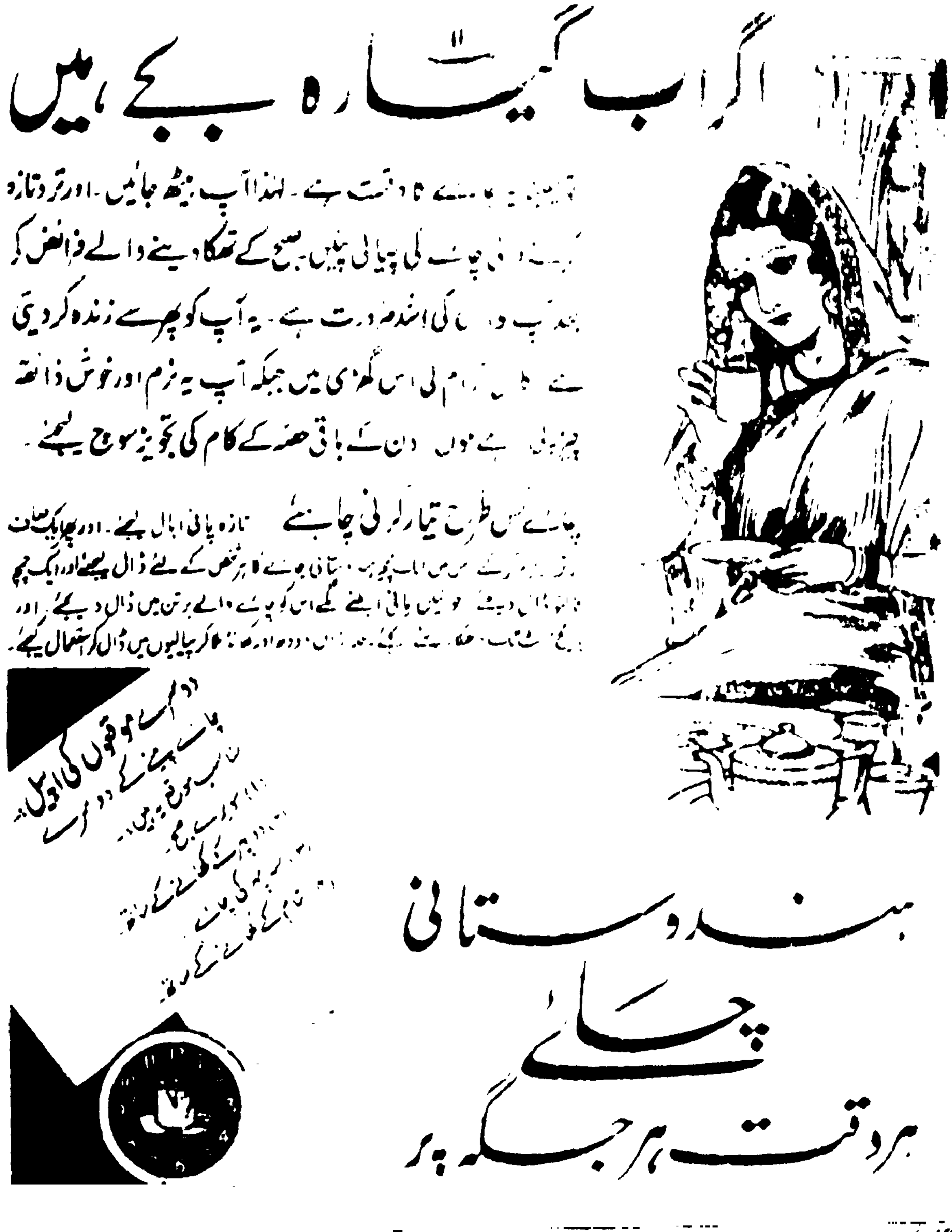
ترقی کے جوش و خروش کا عام ہونا۔ اور ایک کامیاب اور کامل زندگی بسر کرنے کا تقاضا محسوس کرنا دراصل قریوں کے کام و کاج سے زیادہ اہم ہے۔ ترقی کی یہ رفتار دیکھ کر خود گورنمنٹ کے مختلف شعبوں کے افسر جو ان قریوں میں زندگی کی نئی روح پھونک رہے ہیں متعجب ہیں۔ مثال کے طور پر لیجئے ہاسن میں ایک قریہ شعبۂ صنعت و تجارت کی جانب سے اس لئے انتخاب کیا کہ اس کو کام کاج کے ترقی یافتہ و آسان طریقوں سے روشناس کرایا جائے اور ہینڈ لوم HAND LOOM کے کام کرنے والوں کو کچھ مہلت ملے۔ اسی جگہ ایک سوت کی ڈپو قائم کی گئی جس کا باعث ہینڈ لوم جولاہوں کو مقامی ساہوکاروں کے پنجوں سے نجات دلائی گئی ہے۔ جہاں غریبوں کو سوت مہنگی قیمت پر دے کر تیار شدہ مال سستا خرید کرتے تھے۔ عمدہ قسم کے سوت کا استعمال اور مروج نمونوں کے روشناس کرانے سے جولاہوں کی مزدوری میں ماہانہ چار روپے سے لے کر آٹھ روپیہ تک کا اضافہ ہوا ہے بعض جولاہے تو اعلیٰ ساز و سامان جن کی قیمت چار سو روپیہ تک ہوتی ہے۔ خرید کئے ہیں۔

اسی قسم کے نمائشی مرکز دوسرے دیہات میں بھی ایجاد ہونے والے ہیں۔ ایک گاؤں میں دس مسلم پردہ نشین عورتیں اور ۴ مرد ٹریننگ پر ہیں۔ غرض ہینڈ لوم ویونگ اور دوسری صنعتیں ترقی پذیر ہیں۔ بہت سارے گاؤں بوریا بافی کا کام کر رہے ہیں۔ بوریا بافی کا ماہر لوگوں کو اس کی صنعت سکھاتا ہے۔ ناریل کے کاشتکاروں کو اب رسی بنانے کا کام سودمند نظر آ رہا ہے۔

دیہات کو پاک و صاف اور خوش حال بنانے کے کام کا زور یقیناً سرکاری افسروں سے ہی ہونا چاہئے۔

کڈور میں اس خیال سے کہ دیہات سدھار کا کام محض رسمی بن کر نہ رہ جائے مختلف ڈیپارٹمنٹ کے افسروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں سال کے شروع ہی سے لے کر ایک خاص بنائے ہوئے پروگرام پر کام کرنے کی تجویز قرار پائی ہے ڈیپارٹمنٹ کے افسروں پر یہ بات واضح کر دی گئی۔ بنائے ہوئے نیم سالہ پروگرام کے مطابق کام مدتِ معینہ میں ختم ہو جانا چاہئے۔ اور اگر متوقع ترقی نہ ہو تو اس ناکامیابی کے صحیح اسباب کا امتحان کیا جائے میٹنگ میں کام کے متعلق یہ نظریہ اور بحث و مباحثہ بہت سودمند ثابت ہوا ہے جس کا باعث دیہی پنچایتوں پر کام کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اپنی گزشتہ غفلت سے بیداری۔ اور اب ترقی کرنے کا احساس پایا جا رہا ہے۔ نیز ۱۴۵ گاؤں میں خاکروبوں کو ملازمت دی گئی ہے۔ سرگینوں کا کھلنا بھی دیہات سدھار کا ایک قابلِ امتناع ہے۔ ... گاؤں میں اس قسم کے کھلے ہیں۔ ایک گاؤں میں نارنگی کے درخت نشوونما پا رہے ہیں۔ غرض دیہات سدھار کا ہر کام خاص قواعد پر مبنی ہے۔ ایک گاؤں جو اپنے سینٹری وارڈ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا تھا۔ ان سے روشنی اور صفائی کے لئے چندہ فراہم کیا ہے۔

یہ صرف شعبۂ زراعت کے کام کاج کا نتیجہ ہے جس کا سبب آج کل کسانوں کے نئے ساز و سامان۔ بیج اور کھاد کے استعمال کرنے کی قدر دانی ہے ◆


اگر اب گیارہ بجے ہیں
وقت ہے۔ لہذا آپ بیٹھ جائیں۔ اور تر و تازہ
چائے کی پیالی پئیں۔ صبح کے تھکا دینے والے فرائض کے
کی اشد ضرورت ہے۔ یہ آپ کو پھر سے زندہ کر دیتی
ہے اس گھڑی میں جبکہ آپ یہ نرم اور خوش ذائقہ
دن کے باقی حصہ کے کام کی تجویز سوچ لیجئے۔
چائے اس طرح تیار کرنی چاہئے تازہ پانی ابال لیجئے۔ اور پھر ایک صاف
ہر شخص کے لئے ڈال لیجئے اور ایک چمچ
پانی ابلنے لگے اس کو چائے والے برتن میں ڈال دیجئے۔ اور
کر پیالیوں میں ڈال کر استعمال کیجئے۔
موقعوں کی اول
ہندوستانی
چائے
ہر وقت ہر جگہ پر



بادلوں کے جھولے پر
ایک چینی شاہکار



ایمیلی جین برونٹی



شارلٹ برونٹی



این برونٹی

بزم ادب

(۱)

موجودہ اشاعت کے دو افسانے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں "شیشم کے پتے" اور "مذاق"۔ پہلا افسانہ حسن نذیر صاحب ایم اے نے لکھا ہے۔ یہ صاحب ہماری بزم میں پہلی مرتبہ شریک ہو رہے ہیں۔ مگر آثار بتائے دیتے ہیں کہ وہ بہت جلد اس کے صدر نشینوں میں جگہ پالیں گے۔ زیرِ نظر افسانہ ایک گہرا اور نیز نفسیاتی مطالعہ ہے۔ جس کے رنگ سے اگرچہ مغربیت عیاں ہے لیکن تار و پود سراسر مشرقی ہے۔ اردو افسانہ تکنیک کی دشوار منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہا ہے اور ہمارے ہاں اب ایسی چیزیں بھی آ رہی ہیں جنہیں ہم ان کی جدید ترین فن کاری کے لحاظ سے بین الاقوامی ادبیات کی سبھا میں بلا تامل پیش کر سکتے ہیں۔ "شیشم کے پتے" درحقیقت ایک لمحۂ فکریہ ہے جو گھڑی کی ایک ٹِک اور دوسری ٹِک کے درمیان بجلی کی سی سرعت کے ساتھ تحت الشعور پر چھا جاتا ہے۔ آرٹسٹ نے اس لمحے کو پھیلا کر شعور کا لباس پہنایا ہے اور سوچنے والی کے خیالات میں ہمیں بھی شریک کر لیا ہے۔

"مذاق" ایک سنجیدہ مطالعہ ہے جو اختر انصاری صاحب کی باریک بینی کا مرہونِ ہے۔ اختر صاحب احتسابِ نفس کا غیر معمولی ملکہ رکھتے ہیں اور اس کی مدد سے وہ اپنے کردار کو ایک جیتی جاگتی ہستی بنا دیتے ہیں۔ ان کا روزمرہ نہایت سلجھا ہوا اور اندازِ بیان بالکل فطری ہوتا ہے اس لئے ان کی کہانیوں میں ایک ایسی دلکشی ہوتی ہے جو بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔ موجودہ افسانے کا ہیرو ایک نوجوان وکیل ہے۔ جو ہنسی میں محبت کا جانگسل آزار مول لے لیتا ہے اور اگرچہ وہ پہلے ایک بار ناکام محبت کی تلخیوں سے آشنا رہ چکا ہے اور افسانہ نگاری کے معمولات کے مطابق یہ اس کی پہلی اور آخری محبت ہونی چاہئے تھی۔ مگر نہیں حقیقت نگار افسانہ نویس اسے اس جادۂ دشوار پر پھر سے قدم قدم چلاتا ہے اور ہر گام کی رنگینیاں اور ہر جنبش کی نیرنگیاں ہمارے سامنے بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ٹریجڈی ہونے کے باوجود اس کی فضا پر ایک دل افزا اور نشاط انگیز کیف آغاز سے انجام تک برابر چھایا رہتا ہے۔

اختر انصاری صاحب کے چند بہت اچھے افسانوں کا مجموعہ "اندھی دنیا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ آئندہ ماہ ناظرین کو اس سے تفصیلاً متعارف کرائیں۔

میراجی نے دنیا کی شاعری پر تنقیدی مضامین کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس میں چند ماہ سے التوا ہو گیا تھا۔ اب انہوں نے اسے پھر سے جاری کر دیا ہے۔ "انگلستان کی تین شاعر بہنیں" اس کی تازہ ترین اور نہایت دلچسپ کڑی ہے۔ ایملی برونٹی اور اس کی دو بہنیں انیسویں صدی کی دنیائے شعر و رومان میں ایک خاص حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کی شاعری اور افسانہ نگاری ان کی رومانی زندگی کے دو رُخ تھے اور انہوں نے نہ صرف اپنے آرٹ بلکہ اپنی شخصیت سے اپنے عہد کی ادبیات پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ ایملی برونٹی کا ناول "وودرنگ ہائٹس" ایک کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جن اصحاب نے اسے حال ہی میں پردۂ فلم پر دیکھا ہے۔ وہ اس مقالے میں ایک مزید دلچسپی پائیں گے۔

صلاح الدین احمد

---

(۲)

اس شمارے میں بہت سے لوگ احمد حسین امجد کی نظم "زندگی" کو دیکھ کر دل میں کہیں گے کہ یہ شاعری نہیں ہے۔ لیکن انہی لوگوں کو اس نظم کی طرف خصوصاً توجہ دلانا ہے۔ شاعری احساسات اور خیالات کے مؤثر اظہار کا نام ہے جو کسی موسیقانہ (یا غیر نثری) ذریعے سے کیا جائے۔ اس میں موضوع کے عشقیہ ہونے کی تخصیص نہیں، نہ دل پسند ہونے کی قید ہے۔ پسند ایک انسانی تصور ہے، اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ عشقیہ احساس ہی تک تخیلِ شعری محدود نہیں۔ ہماری قدیم شاعری کی محبوب ترین صنف غزل ہے اور اسی میں (اس کی ہیئت کی وسعت کے باعث) نظم سے پہلے ہر قسم کے موضوع بیان کیے جاتے رہے تصوّف اور اخلاق یا اور اسی قسم کے کسی اور خشک (؟) موضوع کی طرف اگر کوئی شاعر توجہ کرتا تو غزل کے بعد اکثر رباعی ہی اس کا ذریعۂ اظہار ہوتی تھی لیکن نظم کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے ساتھ موضوعات

بہت [illegible] ہو گئے [illegible] موضوع کی کمیت نظم میں [illegible] کے دو نمایاں پہلو [illegible] کو شاعر [illegible] [illegible] کا [illegible] [illegible] کے علاوہ نظم کے ذریعے [illegible]

[illegible] میں [illegible] کی [illegible] کر [illegible] میں دو چار ہونا پڑتا ہے۔

تنہا [illegible] بعد [illegible] ہے دل کے جام میں [illegible] دیتا ہے [illegible] ایسے مصرعے [illegible] بیان سے ذہن میں جذباتی [illegible] کے تصور پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ کے مصرعے [illegible] کا تصور [illegible] ہے کا خیال اور دوستوں کی سرد مہری اور رشتہ داروں کا سلوک اس پہلے تصور کو دھندلا کر یک لخت ذہن کو زندگی کے تلخ مسائل تک لے آتے ہیں اور پھر دوسرے جذباتی مصرعے از سر نو ایک متضاد کیفیت کی تخلیق کرتے ہیں۔ یوں قاری کے ذہن میں شاعر کی ذہنی کشمکش سے ملتی جلتی ایک کشمکش پیدا ہوتی ہے اور وہ اس ہم آہنگی کی وجہ سے شاعر کے دل کی چوٹ کو اسی کے انداز نظر کے ساتھ محسوس کر سکتا ہے اور اگرچہ اس ماحول میں جو اس نظم کی تحریک کا باعث ہوا "دلکشی قائم کسی شے کی رہ سکتی نہیں" لیکن اس نظم میں ایک تلخ دلکشی ضرور ہے۔

موجودہ فضا اور راہ و رسم منزل سے تنگ آ کر ہی مخمور جالندھری فسانہ و فسانے کے عنوان سے للکارتا ہے۔ لیکن اسے پھولوں کی سرخی بھی خون انسانی کے چھینٹے دکھائی دیتی ہے۔ مادی لحاظ سے یہ غلط نظری ہے۔ اس کے مقابل میں صدمہ کے الفاظ میں جس سادگی سے بات کی بات میں موجودہ حال پر تبصرہ کیا گیا ہے وہ زیادہ تلخ اور موثر ہے۔ اور ماحول کا صحیح احساس دلاتا ہے۔

لیکن احمد ندیم قاسمی ست بد ماحول سے تنگ آ کر ہی اپنی پہلی رومانیت کو پسِ پشت ڈال کر میدانِ جنگ میں جا پہنچا ہے۔ اگرچہ اس کا رومانی رجحان جس انداز سے گولیوں کو "سبک بوندیاں" بنا لیتا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اس نظم کا سپاہی مورچے میں کھڑا ہے۔ میدانِ جنگ کی تمام تباہ کاریاں اس کے سامنے ہیں لیکن وہ ایک طرح سے ان سے علیحدہ ہے [illegible] مورچے کی پناہ میں ہے یہ حفاظت اسے کافی حد تک محسوس نہیں ہوتی اور [illegible] تصور اسے رکھتا ہے کہ اس کا مرکز نظر اس مورچے کی حفاظت سے باہر ہے۔ باہر کا ماحول زندگی کا قاتل ہے اور وہ اپنے مرکزِ خیال کے تصور کو اپنے میں جذب کر لینا چاہتا ہے۔ مثنوی کی بحر نے اس نظم میں ایک بیانیہ [illegible] پیدا کر دیا ہے۔ نیز مورچے میں بیٹھے ہوئے سپاہی کی میدانِ جنگ کے ماحول سے آزادی قابلِ غور ہے۔

آزاد نظم کی مقبولیت کا ایک اور ثبوت اس بار ضیا فتح آبادی نے دیا ہے۔ اس کی "جبیں" آزاد نظم کی بیشتر خصوصیات کی حامل ہے۔ تصورات کی گہرائی اور کثرت اور بیان کی سادگی نے آزاد نظم کا تاثر اس نظم میں کافی حد تک پیدا کر دیا ہے۔ سعید احمد اعجاز کے تصور میں وہی حرکت ہے اور وہی نفاست جس کا اس نے آپ کو عادی بنا رکھا ہے۔

عبدالعزیز فطرت کی غزل میں ایک جھومنے والی کیفیت ہے۔ خصوصاً اس شعر کی موسیقی غور کے لائق ہے۔

بوئے گل تر بن کر بادِ سحری آئی
بادِ سحری آئی، پیغامِ جنوں لائی

میراجی

آئینۂ عالم

لینن افسانوں کے دُھندلکے میں

دنیا میں بہیرو پرستی نے جہاں بعض دفعہ انسان کو مفید کاموں پر مائل کیا ہے وہاں کئی بار غلط رستوں پر بھی ڈالا ہے۔ مغرب کی موجودہ آمریتوں میں اس کا ثبوت آج بھی مل سکتا ہے لیکن ذیل کے مضمون میں زیادہ تر ایسے دلائل مل سکیں گے جن کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مشرق ہی ایک ایسا خطہ ہے جہاں توہم پرستی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

سویٹ روس میں لینن کے نام اور کام کو آج ایک ایسا درجہ دیا جا رہا ہے جو ہمارے ہاں الف لیلہ اور جن و پری کی داستانوں کا ہے۔ لینن کے متعلق بے شمار ایسی حکایات کا جال تیار کیا گیا ہے جن میں اُسے محیر العقول کارناموں کا ہیرو دکھایا گیا ہے۔ ان کہانیوں کا بنیادی مواد روس کی پرانی داستانوں سے تیار کیا گیا ہے جو سویٹ حکومت سے بہت پہلے سے موجود تھا۔ اُسی پرانے مواد اور کہانیوں کے ڈھانچوں کو لے کر اُنہیں اپنے حسبِ مطلب ڈھالا گیا ہے اور اُن میں اپنے خاطر خواہ کردار پیدا کر لیے گئے ہیں۔

انقلاب کی وجہ سے وہاں کے کارکنوں کو اس بات کی ضرورت لاحق ہوئی کہ وہ تہذیب و تمدن کے اُن پہلوؤں کی تنظیم بھی چند مہینوں یا سالوں میں کر دکھائیں جن کی قدرتی نشو و نما میں صدیاں گذر جاتی ہیں۔ اور یوں پرانے تصورات کی بجائے نئے خیالات کو لوگوں کی زندگی کا جزو بنا دیں۔ اور اس سلسلہ پروپیگنڈا کو ایک ایسی مشین کی طرح چلایا گیا جو پرانے نظام کو ملیا میٹ کرنے کے ساتھ ساتھ نئے اصولوں کو زبردستی رائے عامہ پر طاری و ساری کر دے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی جب لوگوں پر سویٹ خیالات کا اثر بڑھانے میں دیکھا کہ قصے کہانیوں کے ذریعے سے یہ کام نسبتاً آسانی سے پورا ہو سکتا ہے۔ تو روسی کارکنوں نے ایک حیرت ناک باقاعدگی کے ساتھ اپنی تمام تر توجہ اس شعبۂ کار کی طرف کر دی۔

مرکزی روسی جمہوریتوں میں انقلاب سے پہلے بھی باشندوں کا کچھ حصہ لکھنے پڑھنے کے قابل تھا۔ ان علاقوں میں جو فسانہ طرازی کی گئی ہے اُس میں لینن کو صرف حیوانات کی مدد سے مذہب اور زار روس سے مقابلہ کرتے دکھایا گیا ہے جنوں اور چڑیلوں کو ان قصوں سے الگ رکھا گیا ہے۔ مثلاً

"جب حیوانات کو معلوم ہوا کہ لینن اور سٹالن کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور کسی کو اُس مقام کا علم نہیں جہاں اُنہیں چھپا کر قید رکھا گیا ہے تو چڑیوں نے ارادہ کیا کہ وہ جا کر اُس جگہ کا پتہ چلائیں گی۔ چنانچہ اُنہوں نے ہر قید خانے کے گرد و پیش اور اندر باہر اُڑ کر کھوج لگانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اُس کوٹھڑی تک جا پہنچیں۔ جہاں لینن اور سٹالن کو زنجیروں میں باندھ کر قید کیا گیا تھا۔ چڑیوں نے ایک دم قید خانے کے تمام چوہوں کی تنظیم کی اور اُن کے ذریعے سے قیدیوں کی زنجیروں کو کتر کر کاٹنے کا انتظام کیا۔ چوہوں نے اُود بلاؤں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جیل کی موٹی دیواروں میں لینن اور سٹالن کی کوٹھڑی سے لے کر باہر تک ایک سرنگ بنا دیں۔ اور جیل سے نکل کر اُن دونوں کو ایک بہت بڑا زبردست عقاب ملا جو اُنہیں اُڑا کر پہاڑوں کی آزاد سرزمین کی طرف لے گیا۔"

سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک روس میں جو خانہ جنگی ہوتی رہی اس کے متعلق بھی بہت سی کہانیاں بنائی گئی ہیں۔ ذیل کی کہانی جس کا تعلق زار روس اور لینن سے ہے بہت مقبول ہے۔

"زار روس کے دربار میں ایک روز اُس کا ایک سپہ سالار باریابی کے لئے حاضر ہوا اور دست بستہ عرض کی کہ حضور کی سلطنت سے باہر ایک ایسا آدمی رہتا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت چالاک اور ہشیار انسان ہے نہ تو وہ کہیں ملازم ہے اور نہ اُسے کسی نے کوئی خطاب دیا ہے۔ اُس کا نام لینن ہے اور وہ یہ ڈینگ مارتا پھرتا ہے کہ وہ حضور معظم کے خلاف جنگ کر سکتا ہے۔ اُسے ایک خفیہ لفظ معلوم ہے۔ اور اگر اُنہیں وہ جہاں پناہ کے سپاہیوں کو وہ لفظ سکھا دے۔ تو تمام سپاہی فوج شاہی کو چھوڑ کر اُس سے جا ملیں گے۔ اور وہ خود بھی یہ کہتا ہے کہ وہ اسی ایک لفظ کے ذریعے سے آپ کی حکومت کو ملیا میٹ کر کے ہم سب کو خاک میں ملا سکتا ہے۔

"زار روس یہ سن کر ڈر گیا اور بولا۔ ایک دم اس آدمی کو جسے نہ کوئی خطاب دیا گیا ہے اور جو نہ کہیں ملازم ہے۔ ہماری طرف سے یہ پیغام بھیجو کہ وہ ہرگز ہرگز اس خطرناک لفظ کو ہمارے یا ہمارے سپہ سالاروں کے خلاف استعمال نہ کرے اور اگر اُس کی تسلی یوں ہو سکتی ہو تو میں اپنی آدھی سلطنت اُسے دینے کے لئے تیار ہوں۔

زار کے وزیروں نے جلد سے جلد یہ پیغام لینن تک پہنچایا۔ اور اس کے جواب میں لینن نے کہلا بھیجا کہ زار! معلوم ہوتا ہے کہ اب تو اپنی سلطنت میں مجھے

بھی حصہ دینے کو تیار ہے۔ بلکہ جب تک تو میری شرائط قبول نہ کرے یہ ممکن نہیں ہے [illegible] اپنے ماتحت ملے۔ اُن کے [illegible] مجھے [illegible] بھی تو اپنے پاس رکھ [illegible] اُن کا مال [illegible] اُن کے بڑے بڑے محل [illegible] اور کارخانوں سے [illegible] ان کے علاوہ باقی تمام لوگ میرے ماتحت [illegible] اور ان کے ساتھ مجھے [illegible] اور تھوڑی سی قدر بھی [illegible]

"زار کے [illegible] تھا۔ وہ بولا [illegible] لینن کو [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible] حقیقت [illegible] سپاہیوں کی مجھے [illegible] جب تک روپیہ ہمارے پاس ہے ہم ہر وقت دوسرے ملکوں سے ہزاروں کرائے کے سپاہی منگوا سکتے ہیں اور انہیں سپاہی بنا سکتے ہیں۔

"جب لینن زار کے سپاہیوں، کسانوں اور مزدوروں سے ملا تو اس نے ان سے کہا۔ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور جو کچھ بھی ہم پائیں گے آپس میں برابر بانٹ لیں گے۔ سپاہیوں اور مزدوروں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ لیکن کسانوں کے خیال میں لینن زار سے دھوکا کھا گیا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ لینن کو چاہیے تھا امیروں کا مال خزانہ اُن کے پاس نہ رہنے دیتا۔ اگر وہی مال خزانہ ہم لوگوں میں بانٹ دیا جاتا تو ہمارے کھیت اور ہم بہت خوش حال ہو جاتے۔

"لیکن لینن یہ سن کر ہنس دیا۔ اور بولا اپنے کھیتوں پر محنت سے کام کرو تو خوشحالی ہی خوشحالی ہے۔ اُن لوگوں سے اگر میں تمام سونا جواہرات بھی لے لیتا تو وہ ہم لوگوں میں بٹ کر کچھ بھی نہ رہتا کیونکہ وہ بہت کم لوگ ہیں۔ اور ہم تعداد میں بہت زیادہ ہیں لیکن اگر میں اپنا پُراسرار لفظ منہ سے نکال دوں گا تو یہ لوگ اپنی دولت کے باوجود باہر کے لوگوں کو کرائے کا ٹٹو بھی نہ بنا سکیں گے اور پھر سمجھ لینا کہ ان کی تباہی یقینی ہے۔

"اس کے کچھ عرصہ بعد ہی لینن کو زار سے اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ اے لینن تو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ تو تمام کام کرنے والے آدمیوں کو میرے پاس سے لے گیا ہے۔ سپاہیوں کے بغیر میرے تمام افسر نکمے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اُن کو تو صرف کھانے پینے سے کام ہے اور روز بروز کاہل ہوتے جا رہے ہیں اور کارخانوں کے مالک تو جلد ہی مشینوں کا ستیاناس کر دیں گے۔ انہیں کتابوں سے ہی مشینری کا علم حاصل ہے لیکن عملی طور پر وہ کلوں کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے اور بیرونِ ملک کے غریب غربا ہمارے سپاہی بننے کو تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ تیرے اُس پُراسرار لفظ کو سننے کی راہ تک رہے ہیں۔ اب میرے پاس صرف ایک راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ میں تیرے خلاف جنگ کا اعلان کر دوں تاکہ میں تمام لوگوں کو پھر اپنی طرف لے آؤں۔"

ایسی کہانیوں سے پہلے بہت سے کسان ایسے تھے جنہوں نے انقلاب کے باوجود لینن کا نام تک نہ سنا تھا۔ ان کے ذریعے سے اُنہیں پہلی بار اس کی شخصیت کا علم ہوا۔ اشتراکی معلم ان کسانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ایسی کہانیاں سناتے تھے اور ان کہانیوں کو اُن کی ذہانت کے بالکل مطابق بنا لیتے تھے۔

"منیا اور پامیر کے علاقوں میں ایسا پروپیگنڈا بہت مشکل تھا کیونکہ وہاں تو زار کے زمانے میں بھی زار سے زیادہ طاقتور تیمور اور سکندر اعظم کو سمجھا جاتا تھا۔ نہ وہاں کوئی پڑھنے لکھنے کے قابل تھا کہ کتابوں سے ان کہانیوں کو پڑھ لیتا۔ وہاں کے بھاٹ تیموری اور سکندری داستانوں کو سنایا کرتے تھے اور انہیں بھاٹوں کے ذریعے سے یہ نئی کہانیاں بھی اُن لوگوں تک پہنچائی جانے لگیں۔ پہلے وہ جنوں اور پریوں کی کہانیاں سنتے تھے۔ اس لئے ان کہانیوں کو اُن کے لئے اُسی پرانے رنگ میں ڈھالا گیا۔ اسی قسم کی ایک کہانی دیکھئے۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے اور ابھی اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے کہ ہم لوگ امیروں کے ظلم سے نالاں تھے۔ اور اُن سے تنگ آکر سورج اور ستاروں سے اپنی فریادیں کر رہے تھے۔ لیکن جب لینن نمودار ہوا تو کھلے میدانوں نے ستاروں سے سرگوشی میں کہا، یہی وہ انسان ہے جو ہمیں مکتی دلائے گا اور دنیا کو اپنے ہاتھوں سے ایک نئی صورت دے دے گا۔

"امیروں کو جب اس کا پتہ چلا کہ اُن سے ہمارا انتقام لینے والا آ موجود ہوا ہے تو انہوں نے لینن کو مار ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس زمانے میں ایک شیطانی جادوگر تھا۔ امیروں نے اس قتل کے لئے اُس کی مدد چاہی۔ اور اُسے کہنے لگے تو نے ہمیں امیر بننے میں مدد دی تھی۔ اور دوسروں کو دبا کر ہم امیر بنے اور تو بھی امیر بن گیا۔ اب تو ہی لینن کو مارنے میں ہماری مدد کر اگر تو نے یہ کام کر دیا تو ہم تیرے لئے ایک سونے کا محل بنا دیں گے۔ جس میں جواہرات سے نقش و نگار بنے ہوں گے۔ اور اس کے علاوہ ہم چالیس حسین و جمیل دوشیزائیں بھی تیری خدمت میں پیش کریں گے۔

"لیکن اُس جادوگر نے ایک سو سونے کے محل اور سولہ ہزار حسین د

جمیل دوشیزائیں اس کام کے لئے طلب کیں۔ امیر لوگ اس پر بھی راضی ہو
گئے اور اس کے علاوہ اُن سب نے ایک ایک انگوٹھی بھی اُسے دی ان
میں سے ایک انگوٹھی ایسی تھی کہ اُسے پہننے والا دوسروں کو دکھائی نہ دے
سکتا تھا۔ جادوگر نے وہ انگوٹھی پہن لی اور ایک بگولے کی صورت اختیار کر
لی اور لینن کو اپنے زور سے اٹھا کر پہاڑ سے دے مارا۔ لیکن لینن نے پہاڑ
کو اس زور سے لتاڑا کہ چٹانیں گونج اُٹھیں۔ اور آسمان پر بجلی چمکنے لگی۔
"چونکہ جادوگر نظر نہ آسکتا تھا اس لئے اس بات کا خطرہ تھا کہ اس
کشمکش میں لینن تھک جائے گا لیکن اس کے باوجود لینن کے ماتھے سے پسینے
کا ایک قطرہ جادوگر کے ہاتھ پر جا پڑا۔ پسینے کے اس قطرے میں اتنی گرمی تھی
کہ اس نے جادوگر کے ہاتھ کو ہڈی تک جلا ڈالا اور وہ درد کے مارے اپنے
ہاتھوں کو بھینچ بھینچ کر مسلنے لگا۔ اس طرح انگوٹھی اُس کی انگلی سے نکل کر گر پڑی
اس دوران میں پہاڑوں نے بڑے بڑے پتھر جادوگر پر پھینکنے شروع کر
دیئے اور لینن نے اُس کی پیٹی اور تلوار اُس سے چھین لی اور اس پیٹی میں
سے اُسے وہ طلسم حاصل ہوا جس سے بنی نوع انسان کو دکھ سے رہائی دلائی
جائے۔ لیکن جادوگر ابھی مرا نہ تھا۔ اُسے جنوں نے بچا لیا تھا۔ اس نے
اب کی بار ایک بہت ہی خوبصورت عورت کا روپ دھارا اور لینن کے دل
میں دو تیر لگا دیئے۔ اس کے بعد وہ سانپ ظاہر ہوا جس کا زہر دنیا کے ہر زہر
کا علاج ہے اور جو ہر صدی میں انسان کے علاج کے لئے ظاہر ہوا کرتا ہے۔
اس سانپ نے لینن کا علاج کیا اور اُسے مرنے سے بچا لیا۔ اور وہ جادوگر
اس کے بعد گندھک کا دھواں بن کر رہ گیا"۔

سویٹ حکومت نے ایسی کہانیوں ایسی تمام حکایتوں اور دوسرے
انقلابی فسانوں اور گیتوں کو اکٹھا کرنے کے لئے ایک خاص کمیٹی مقرر کی ہے
تاکہ یہ تمام چیزیں زمانے کے ساتھ معدوم نہ ہونے پائیں۔ اور روس کا
مشہور شاعر اور ناول نگار میکسم گورکی اس کمیٹی کا صدر ہے۔

بسنت سہائے

غزل

وہ باتیں تری، وہ فسانے ترے — شگفتہ شگفتہ بہانے ترے
حکایات کی مجھ کو خو پڑ گئی — بڑے لطف زا تھے فسانے ترے
بس اک جرمِ سجدہ مری کائنات — جبینیں تری آستانے ترے
فقط زخمِ نظارہ حصہ مرا — بہاریں تری آشیانے ترے
کسی نے نہ اسرار سمجھے ترے — کسی نے نہ احوال جانے ترے
ضمیرِ صدف میں کرن کا مقام — انوکھے انوکھے ٹھکانے ترے
یہ دیر و حرم کے تعین کا خبط — یہ حیرت گری کے بہانے ترے
بہار و خزاں کم نگاہوں کا وہم — برے یا بھلے سب زمانے ترے
فقیروں کا جمگھٹ گھڑی دو گھڑی — شرابیں تری بادہ خانے ترے

عدم بھی ہے تیرا حکایت کدہ
کہاں تک گئے ہیں فسانے ترے

عدم

سپاہی — مورچے میں

دھڑکتا ہے دل [illegible] جاتا ہے دل — خدا جانے کیوں لوٹ جاتا ہے دل
برستی ہیں آنکھیں ترستے ہیں لب — لرزتے ہیں کیوں دست و پا بے سبب
مرا جسم کیوں کپکپاتا ہے آج — اور دل میں کیوں سرسراتا ہے آج
مری روح تو [illegible] تھرا گئی — یہ کس کی مجھے آج یاد آگئی؟

گرجتا ہے ہر لحظہ میدانِ جنگ — نرالے ہیں دشمن پہ حملوں کے ڈھنگ
بڑھیں گولیاں سنسناتی ہوئی — بہت تیز سیٹی بجاتی ہوئی
وہ اک توپ کا گولہ آکر پھٹا — وہ اک نوجواں چیخ کر مرگیا
فضاؤں سے گرتے ہیں بم پے بہ پے — دھواں بن کے وہ مورچے اُڑ گئے
رگڑتا ہے اک توپچی ایڑیاں — لہو منہ میں، اور لب پہ ہے "میری ماں"
سنا ہے کہ یہ چاندنی رات ہے — مگر چاند پر موت کا ہات ہے!
یہ عالم ہے، بیٹھی مرے دل کے پاس — خموشی کھڑی ہے حزیں اور اداس
وہ آنکھوں سے دریا بہاتی ہوئی — وہ زلفوں میں چہرہ چھپاتی ہوئی
پریشاں نگاہیں، ہراساں سے دل — حسیں جسم بے رنگ اور مضمحل
یہ محزوں جوانی، یہ غمگیں شباب — یہ ویران آنکھوں میں ماضی کے خواب

ادھر مورچے میں دبک جا کے تو — نہیں جانتی تند گولوں کی خو
خدا کے لئے سر اُٹھا کر نہ دیکھ — مری سمت گردن بڑھا کر نہ دیکھ
دہانے وہ توپوں کے پھر کُھل گئے — وہ نظارے پھر خاک سے ڈھل گئے
سمٹ جا مری روح میں میری جاں — مری روح ہے عالمِ بے کراں

یہاں گولیاں ہیں سبک بوندیاں
یہ ہے عشق کا معبدِ جاوداں!

احمد ندیم قاسمی

انگلستان کی تین شاعر بہنیں

اہل مشرق اور خصوصاً ہندوستانی ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ عورت کے بھید کو کوئی نہیں پاسکتا، اور شاعر کی ہستی بھی دنیا کی نظروں میں نفسیات جدید کی دریافت تک پُراسرار ہی رہی۔ ان خیالات کے ہوتے ہوئے اگر کسی شاعرہ کے متعلق کچھ کہنا ہو تو یہ خدشہ لاحق ہو سکتا ہے کہ آگہی کے دام کے باوجود کہیں عالم تحیر کا ملا منعقد نہ ہو جائے۔ دنیا کی بڑی شاعر عورتوں میں سے یونان میں سیفو اور ہندوستان میں میرا بائی کی زندگی پر بھی اسی طرح کا ایک روایتی دھندلکا چھایا ہوا ہے۔ اور انگلستان کی شاعرہ ایملی برونٹی بھی انہی کے پہلو بہ پہلو کھڑی ہے، اس بات کے ہوتے ہوئے کہ اس کا زمانہ آج سے صرف سو سال پہلے کا ہے۔

لیکن پہلے ایک وضاحت کر دی جائے۔ عنوان میں تین بہنوں کا ذکر ہے اور مضمون میں صرف منجھلی بہن ایملی برونٹی کی شاعری کا بیان ہوگا۔ اس دوہری تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان تین عورتوں کی زندگی کے فسانے ایک دوسرے کے حالات میں اس قدر گھلے ملے ہوئے ہیں کہ انہیں الگ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور اگرچہ نظم کی صنف میں تینوں نے حصہ لیا ہے بلکہ ان کے بھائی نے بھی نظمیں لکھی ہیں لیکن شاعری کا اصلی جوہر صرف ایملی میں تھا۔ بڑی بہن شارلوٹ کا صحیح درجہ ایک ناول نویس کا ہے اور چھوٹی بہن این بھی اسی صنف سے تعلق رکھتی ہے، رہا بھائی تو اس کی شخصیت اس خاندانی فسانے میں ایک متضاد کیفیت رکھتی ہے یا اگر استعارہ ذرا سخت نہ ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ ان تین ذہین بہنوں کا یہ بھائی باوجود اپنے گھر والوں کی اُمیدوں کے اپنے آپ کو ابن نوح ہی ثابت کر سکا۔

انگریزی ادب کے گلزار میں برونٹی خاندان کی کہانی باغ کا ایک ایسا گوشہ ہے جس میں رنگ رنگ کے اچھوتے پھول کھلے ہوں۔ ایسے پھول جن کی زیب و زینت صرف اُن کے ذاتی ماحول اور ذہانت کا ممنون ہو لیکن ایملی کی شاعرانہ حیثیت ایک ایسا پھول ہے جسے پورے باغ میں خواہ کوئی ممتاز درجہ نہ ملا پھر بھی وہ اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر ایک ناقابل انکار دلکشی رکھتا ہے۔ مختلف نقادوں اور دوسرے مصنفوں کی آرا کو اگر قابل اعتبار سمجھا جائے تو بہت سے ہیں جو اس مسئلے کے متعلق متفق الرائے ہیں۔

ایملی کے شاعرانہ جوہر کو سب سے پہلے اُس کی بڑی بہن شارلوٹ نے تسلیم کیا۔ ستمبر ۱۸۴۵ء میں وہ لکھتی ہے: "مجھے اس کلام کی تعجب انگیز خوبیوں کا گہرا احساس ہے اور یہ احساس مجھے اُسی وقت سے ہے جب پہلی بار مسودہ اتفاقیہ میرے ہاتھوں میں آیا۔ یہ نظمیں چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن ان میں اخلاص ہے۔ انہوں نے میرے دل پر بالکل اسی طرح اثر کیا جیسے سنکھ کی آواز کانوں تک پہنچ کر انسان کو ایک دم متوجہ کر لیتی ہے۔۔۔۔ مجھے کسی ایسی عورت کا علم نہیں ہے جس نے ایسا کلام لکھا ہو۔ جچی ہوئی شستگی، صفائی، تکمیل ۔۔۔ چھوتا پُرزور تاثر ۔۔۔ یہ اس کلام کی خصوصیات ہیں"

اور بعد کے لکھنے والے بھی کم و بیش اسی رائے کے حامی ہیں۔ آرتھر بینسن لکھتے ہیں "یہ ماننا پڑے گا کہ دلچسپی کا مرکز ایملی ہی کا کلام ہے اور اگر اس میں وہ شاعرانہ جوہر نہ ہوتا جو اس سے صاف طور پر عیاں ہے، تو باقی تینوں کی شاعری کو آج کوئی بھی نہ جانتا" مشہور شاعر جان ڈرنک واٹر لکھتا ہے: "شارلوٹ اور این کے متعلق سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ وہ شاعر ہی نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری میں صرف ایک سوانحاتی دلچسپی ہی ہو سکتی ہے۔ اُن کے کلام سے اُن عورتوں کی سیرت کا اخلاص نمایاں ہے جنہوں نے ادب کی ایک اور صنف میں پائیدار کام کیا۔ ایملی کی نظموں میں بھی اُس کی سیرت کا صاف نقش موجود ہے اور اُس کی سیرت باقی تینوں کی نسبت زیادہ نادر اور اثر انگیز تھی۔"

البتہ آرتھر بینسن کی رائے میں ایملی کے کلام میں فنی خوبیاں بھی موجود ہیں لیکن جان ڈرنک واٹر کو اس سے اختلاف ہے۔

برونٹی خاندان کی ان تین بہنوں کے مداحوں کو دو دلچسپ گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جنہیں اُن کی مصنفانہ حیثیت میں دلچسپی ہے اور دوسرے وہ جو اُن کی ذات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ دوسرے حضرات پہلے گروہ کے لئے بعض اوقات ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے برونٹی خاندان کی شخصیتوں کے اردگرد ایک فریب انگیز دھندلکا پیدا کر دیا ہے۔ کسی شاعر کے سوانح حیات اُس کے کلام کے مطالعے میں ایک حد تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں

[illegible] حد تک [illegible] اس کی ذہنی نشوونما پر روشنی ڈالیں۔ ذاتی حالات میں غیرمعمولی دلچسپی [illegible] پرست بن کر رفتہ رفتہ اُس کے کلام کی [illegible] ہو جاتی ہیں [illegible] جاتے؟

[illegible] شارلوٹ [illegible] بہت [illegible] تھا [illegible] کلام سے [illegible] اگرچہ بعض [illegible] نقادوں نے [illegible] لیکن [illegible] عدم ہوتا کیونکہ اس کی زندگی بہت سیدھی سادی تھی۔ [illegible] نہیں بلکہ [illegible] کم ایسا کوئی [illegible] کے لئے دلچسپی [illegible] کا سبب [illegible] لیکن [illegible] کہیں ایک طرف [illegible] اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ برونٹی خاندان کے [illegible] انگلستان کے ادب میں محض تاریخی حیثیت ہی نہیں رکھتے بلکہ تینوں بہنیں خود بھی ایک ایسے افسانے کے کردار ہیں جن کے مطالعے سے قاری کے ذہن پر ایک ملال انگیز کیفیت چھا جاتی ہے۔ اُن کی سیرت میں [illegible] ایک ایسی [illegible] ہے، ایک ترشی ترشائی نفاست [illegible] ہے جو اکثر ادبی شاہکاروں میں نظر آتی ہے کہ بڑے ناول کے کرداروں نے حقیقتاً کوئی زندگی ہی نہیں گزاری ہوتی اور اس لئے وہ کبھی مر بھی نہیں سکتے۔ اُسی قسم کی ایک لافانی خصوصیت ان بہنوں کی سیرت میں بھی پائی جاتی ہے اور یہ لافانی خصوصیت ایملی میں زیادہ ہے کیونکہ اُس کا جوہر ذہنی باقی بہنوں سے برتر تھا اور اس کی وجہ آسودہ تجربات کا وہ [illegible] تھا جو عمدہ ادب کا لازمہ ہوتا ہے۔

بچپن ہی سے ایملی کو ایک شدید احساس تنہائی کسی مہلک مرض کے جراثیم کی طرح لاحق تھا۔ ابتدائی کلام میں وہ ایک جگہ لکھتی ہے:

میں اکیلی ہوں، اکیلی،
میرے انجام کو پوچھے گا نہ کوئی،
کوئی بھی آنکھ بہائے گی نہ آنسو،
میں اکیلی ہوں، اکیلی!

اس زمانے کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مناسب موقع مہیا ہو گیا تو ان اشعار کے لکھنے والی ادب کے افق پر ایک روشن ستارہ بن سکے گی اور چند ہی سالوں میں یہ اُمید پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن پہلے اس کی زندگی کا خاکہ پیش نظر کر لینا چاہیے۔

شارلوٹ اور اس کے بھائی برین ویل نے اپنے دوستوں کے نام جو خطوط لکھے اُن سے اُن کی سیرت اور ذاتی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ چھوٹی بہن این کے متعلق اُس کے محبوب شاگردوں اور اُن لوگوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے جن کے ہاں وہ ملازم رہی لیکن ایمیلی نے کسی کو دوست نہ بنایا، وہ لوگوں کی واقفیت سے کتراتی رہی اور اُس کی یہ کم آمیزی اور بھی نمایاں محسوس ہوتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے خاندان میں بھی، اگرچہ اُسے اپنے بھائی سے کسی قدر تعلق خاطر تھا، وہ این کے سوا باقی افراد سے زیادہ خلا ملا نہ رکھتی تھی لیکن این نے کوئی ایسی تحریر نہ چھوڑی جس سے ایمیلی کی ذہنی خلوت کا کچھ علم ہو سکے۔ اس سلسلے میں صرف اس کا کلام اور ایک یادگار ناول ہی باقی ہے جس سے اُس کی نفسی کیفیتوں کا اظہار ہو سکے۔ یا اُس کے سوانح حیات میں سے صرف چند سیدھی سادی باتیں ہی محفوظ ہیں۔

شارلوٹ کی دوست ایلن نسی ایک جگہ ایمیلی کا حلیہ بیان کرتی ہے جبکہ وہ ابھی پندرہ سال کی تھی — "نازک، شائستہ جسم، بالوں میں ایک فطری حُسن تھا، اور اُن کی تزئین وہ بہت سیدھے سادے انداز میں کئے ہوئے تھی، چہرے کا رنگ زرد پھیکا، روشن، دردمند آنکھیں جن کا رنگ کبھی سیاہی مائل بھورا محسوس ہوتا تھا اور کبھی سیاہی مائل نیلا، لیکن وہ کبھی کسی سے آنکھ ملا کر بات نہ کرتی تھی کیونکہ اُس کی طبیعت کم آمیز اور محتاط تھی۔"

بعض جذباتی مصنفوں نے ایمیلی کو خوبصورت بیان کیا ہے۔ لیکن اگر ہم اُس کے بھائی کی تیار کی ہوئی تصویر سے اُس کے حسن کا اندازہ لگانا مناسب نہ سمجھیں کیونکہ وہ کوئی اچھا مصور نہ تھا، پھر بھی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایمیلی نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ اُس میں کوئی نسوانی دلکشی بھی نہ تھی کیونکہ اگر ایسی کوئی بات بھی اُس میں ہوتی تو اس کا کوئی نہ کوئی ہمعصر ضرور اس کا ذکر کرتا۔ پہلی نظر میں تو اُسے کسی قدر بے ڈھب صورت کا بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ برونٹی خاندان کی ناک حسن کے لحاظ سے کبھی بھی قابل توجہ نہیں کہی جا سکتی۔

شارلوٹ کی صورت ہی کو لیجئے۔ اس کے نقش بے قاعدہ سے ہیں، اُس کی ناک برونٹی خاندان کی غیر نسائی خصوصیت لئے ہوتے ہے۔ اس کے بال بھورے ہیں اور اُس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں ہی چہرے کی باقی خامیوں کو چھپا کر اُس کی صورت میں ایک دلکشی پیدا کر دیتی ہیں۔ اُسے خود بھی اپنی بدصورتی کا یقین تھا۔ لیکن اُس کی دلکشی کا اعتراف اس کے بہت سے دوستوں نے بھی کیا ہے اور اس سے بھی ثابت ہے کہ تمام عمر میں چار مردوں نے اُسے اپنی رفیقۂ حیات بنانا چاہا۔

پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ برونٹی خاندان کے افسانے میں زیب داستان کے لئے بھی بہت سی رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ لیکن اس رنگ آمیزی کو نظر انداز کرنے کے بعد بھی اس کہانی کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آتا اور اس کی وجہ اس کہانی کے کرداروں کی انفرادی گہرائیاں ہیں۔

ایمیلی کے باپ کا نام پیٹرک برونٹی تھا اس کے مزاج میں کافی حد تک سنک موجود تھی۔ بے لاگ قسم کی خشک طبیعت جسے اپنے بچوں سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ پیٹرک برونٹی ۱۷ مارچ ۱۷۷۷ء کے روز آئرلینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کے اپنے ماں باپ کسان تھے جب تک آئرلینڈ میں رہا پہلے بافندگی اور بعد میں معلمی کا کام کرتا رہا۔ بعد ازاں کیمبرج یونیورسٹی سے اس نے پادری بننے کے لئے دینیات کا امتحان پاس کر لیا اور مختلف مقامات پر کیوریٹ کی خدمت انجام دینے کے بعد ۱۸۰۵ء میں یارک شائر کے علاقے میں ایک گرجا کی امامت شروع کر دی۔ ۱۸۱۲ء میں اس نے ایک کارنش عورت سے شادی کر لی جس کا نام میریا برین ویل تھا۔ یہاں ان کے ہاں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کے نام علی الترتیب میریا اور الزبتھ رکھے گئے۔ اس کے بعد پیٹرک برونٹی تھارنٹن کے مقام پر جا پہنچا یہاں چار بچے اور پیدا ہوئے پہلے شارلوت پھر ایک لڑکا پیٹرک برین ویل برونٹی اور پھر ایمیلی اور این۔ چھوٹی لڑکی ابھی تین ماہ کی تھی کہ برونٹی خاندان نے تھارنٹن کو چھوڑ کر ہاورتھ کے مقام پر اقامت اختیار کر لی۔ ہاورتھ علاقہ یارک شائر میں ایک دور دراز علیحدہ سا سنسان گاؤں ہے، جو ایک بنجر سرزمین کے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں کے محنت کش باشندے تہذیب و تمدن کی لطافت سے دور اور اکھڑ گنوار قسم کے ہیں۔ اس گاؤں کے ماحول نے برونٹی خاندان کی ذہنی نشو و نما پر ایک خاص اثر کیا اور وحشیانہ، بیراگی انداز والی ایمیلی تو گویا اس جگہ ہی کا ایک حصہ تھی۔ چنانچہ جب کبھی اسے آئندہ زندگی میں اپنے اس گھر سے دور جا کر رہنا پڑا تو وہ کسی ایسی ڈال کی طرح مرجھا کر رہ جانے لگی جسے پیڑ سے علیحدہ کر دیا جائے۔

ہاورتھ کا نام انگلستان میں ہمیشہ کے لئے برونٹی خاندان کے رومانی افسانے سے منسلک ہو چکا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد ۱۸۲۱ء میں پیٹرک برونٹی کی بیوی اپنے بچوں کو زندگی کے حوادث کے سپرد کر کے مر گئی۔ بیوی کے مر جانے پر پیٹرک نے اپنی سالی الزبتھ برین ویل کو اپنے ہاں رہنے کے لئے بلا لیا تاکہ وہ بچوں کی نگہبانی کر سکے۔ اور وہ تمام عمر ان بچوں کی پرورش اور نگہداشت آخری دم تک نہایت دلسوزی سے کرتی رہی۔ پہلی چار لڑکیاں قریب کے کسی اور گاؤں کے سکول میں پڑھتی تھیں اور ان کا رہنا سہنا بھی وہیں تھا۔ اس سکول کے انتظامات کچھ ایسے اچھے نہ تھے کیونکہ یہاں معمولی لوگوں کے بچے پڑھتے تھے۔ ایک بار وبائی بخار کی وجہ سے یہاں بہت سی لڑکیاں مر گئیں اور اسی زمانے میں یہاں کے انتظام میں اور بے ترتیبی پھیل گئی۔ [illegible] اچھی طرح نہ ملتی رہی اور اس لئے میریا اور الزبتھ میں دق کی علامتیں نمودار ہو گئیں جس کی وجہ سے انہیں سکول چھوڑ کر گھر لوٹنا پڑا۔ شارلوت اور ایمیلی تعلیم سے کسی حد تک فارغ ہونے کے بعد آئیں۔ لیکن میریا اور الزبتھ اس دوران میں مر چکی تھیں۔ شارلوت ایمیلی اور این اپنی خالہ کی نگرانی میں مطالعے اور گھر کے کام کاج میں وقت گذارنے لگیں۔ ان کے دلوں میں اس بچپن کے زمانے ہی سے ادبی امتیاز حاصل کرنے کی امنگیں تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے دلی شوق سے جو چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھتی رہیں وہ سب آج تک ہاورتھ کے برونٹی میوزیم میں محفوظ ہیں۔ ان میں کہانیاں نظمیں اور مضمون سبھی کچھ ملتے ہیں لیکن یہ سب بہت ہی باریک خط میں لکھے ہوئے مسودے ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون سی چیز کس نے لکھی تھی۔

شارلوت سولہ سال کی تھی کہ نیو بیری میں مس مارگیریٹ وُولر کے سکول میں داخل ہو گئی لیکن ایک سال کے بعد ہی گھر پر اپنی بہنوں کی تعلیم میں مدد کے لئے لوٹ آئی۔ اس سکول میں اس کی دو ہمجماعتیں دوست بنیں۔ ایک میری ٹیلر اور دوسری ایلن نسی۔ تمام عمر شارلوت نے ان دونوں سے خط و کتابت جاری رکھی اور ایلن کے نام جو خطوط لکھے گئے زیادہ تر انہی سے اس کی زندگی کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ آئندہ تین سال ہاورتھ میں رہنے کے بعد وہ پھر مس وُولر کے سکول میں استانی کی حیثیت سے گئی اور ایمیلی کو تعلیم کی تکمیل کے لئے ساتھ لیتی گئی لیکن ایمیلی وہاں جا کر اداس رہنے لگی۔ اس کے دل کو ہاورتھ کے ماحول سے کچھ ایسی فطری مناسبت تھی کہ وہ اس سے الگ اور دور رہ کر گویا آرام کا سانس ہی نہ لے سکتی تھی۔ چنانچہ ابھی اسے وہاں تین مہینے ہی گذرے تھے کہ مجبوراً گھر لوٹنا پڑا۔ اور اس کی بجائے سب سے چھوٹی بہن این وہاں چلی گئی۔ لیکن شارلوت کو اپنے گھر سے محبت بھی تھی اور نفرت بھی۔ وہ اس اداس مقام سے دور بھی رہنا چاہتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی خواہشمند تھی کہ سب بہنیں یکجا رہیں۔ ہاورتھ میں رہنے سے وہ اپنی امنگوں اور تجویزوں کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی تھی اور اس سے دور رہ کر اسے مکمل یکسوئی حاصل نہ ہوتی تھی اس کا خیال گھر کے محبوب افراد کی طرف بٹا رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۳۸ء میں شارلوت پھر ہاورتھ میں آ گئی۔ اس آمد کے کچھ عرصہ بعد ہی اسے اپنی سہیلی ایلن نسی کے بھائی ہنری نسی کی طرف سے شادی کی درخواست پیش کی گئی۔ لیکن شادی کے علاوہ اور بہت سی باتیں اس کے ذہن سے زیادہ قریب تھیں۔ اس درخواست کے کچھ عرصہ بعد ایک اور صاحب نے بھی خواستگاری کی لیکن شارلوت نے دونوں بار انکار کر دیا اور یارک شائر کے علاقے ہی میں ایک کے بعد ایک دو مختلف گھرانوں میں استانی کی خدمت اختیار کر لی۔ یوں چند روز کی اقتصادی خود مختاری نے اس کے دل میں امنگ پیدا کر دی کہ وہ اپنی اس آزادی کو اور بڑھائے اور اپنا ایک علیحدہ سکول قائم کر کے اس میں پروفیسر کی حیثیت میں کام کرے۔ اس کے لئے اسے ضروری معل

ہوا کہ وہ انگلستان سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بن کر [illegible]

[illegible]

ایک علیحدہ [illegible] رہتی تھی [illegible] برین ویل اب [illegible]

[illegible] کو سمجھا [illegible] کرتے تھے

برین ویل [illegible] اگرچہ [illegible] اس کے [illegible] بہنوں کی [illegible] اس سے برگشتہ ہو چکی تھیں [illegible] کے دل میں اس کے لئے اب بھی جگہ تھی [illegible] باپ کی نگرانی میں حاصل کی تھی اور [illegible] کا معیار موجود نہ [illegible] لیکن اس کی شخصیت میں [illegible] ایک فطری دلکشی بھی تھی لیکن [illegible] لوگوں کی صحبت اختیار کر لی اور مقامی سرائے میں شراب [illegible] شروع کر دیا۔ شارلوٹ کے الفاظ میں وہ گھر کے [illegible] پر ایک [illegible] تھا اور گھر کی خوشی کے راستے میں ایک روڑا۔ اگرچہ شروع شروع میں [illegible]

کام لینے کی کوشش کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ عملی زندگی کو کامیاب بنانے کے ناقابل تھا اور مختلف کاموں میں محض وقت ہی ضائع کرتا رہا۔ کچھ عرصہ وہ اپنی چھوٹی بہن این کے ساتھ اسی خاندان میں اتالیق بھی رہا جہاں وہ اُستانی کی خدمت انجام دے رہی تھی لیکن وہاں آپ کے دل میں اپنی مالکن سے عشق کا جذبہ جاگ اٹھا مالکن کے لیے یہ بات کوئی رغبت دلانے والی نہ تھی آپ کی طبیعت میں ایک [illegible] تو تھی ہی چنانچہ جلد ہی اپنے حسن کی بنا پر وہاں سے جدا کر دیئے گئے اور گھر آن کر آپ نے بزعم خویش افیون اور شراب کے نشے میں اپنی ناکام محبت کو [illegible] غم غلط کرنا شروع کر دیا۔

جان [illegible] والر کی رائے میں برین ویل میں شاعری کا اچھا خاصا [illegible] موجود تھا بجائے تسلیم کرنے سے اخلاق کے اصولوں پر کسی طرح کی آنچ نہیں آتی اور اس بات کا ثبوت اُس کی زندگی کے چند واقعات سے بھی ملتا ہے۔ [illegible] میں اس کے خاندان نے اپنے ذرائع کی کمی کے باوجود ان اُمنگوں کی تعبیر کو دیکھنے کے لئے جوں توں کر کے اُسے لندن کی رائل اکیڈیمی میں مصوری کی تحصیل کے لئے بھیجا لیکن برین ویل وہاں ایک ماہ تک داد عشرت دے کر گھر لوٹ آیا۔ کچھ عرصہ وہ لیڈس میں بھی مصوری کا مطالعہ کرتا رہا لیکن اُسے کوئی مستقل کام نہ ملا اس لئے وہ مختلف جگہوں پر مختلف کام کرتا ہوا آخر اس خاندان میں جا پہنچا جہاں اس کی چھوٹی بہن ملازم تھی۔ لیکن یہ قصہ اوپر بیان ہو چکا۔ اس کا انجام [illegible] میں لکھا تھا اور یہاں سے نکل کر وہ ہاورتھ میں آ پہنچا۔ جہاں بغیر [illegible] زندگی بسر کئے ہوئے آخر وہ اپنے گھر والوں کی امیدوں کو [illegible] راہی عدم ہوا۔

سب سے بڑھ کر وہ اپنے باپ کی امیدوں کا مرکز تھا۔ اور ابتدائی سالوں میں اس نے [illegible] کی طرف توجہ بھی کی۔ لیکن کسی قسم کی ترقی حاصل نہ کر سکا۔ بعض نادان نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی بہنوں کی ادبی تخلیقات میں بھی اس کا حصہ تھا۔ لیکن یہ یکسر غلط ہے۔ اس کی بہنوں کی امیدیں جلد ہی اس کے چلن کی وجہ سے ختم ہو چکی تھیں۔ خود شارلوٹ ایک جگہ لکھتی ہے کہ اُن کے بھائی کو معلوم ہی نہ تھا کہ بہنیں ناول نگاری میں مصروف ہیں۔ وہ تو خصوصاً زندگی کے آخری سالوں میں شراب میں ہی دھت رہتا تھا۔

[illegible] میں برین ویل کو اپنی بہنوں کی کارگذاری کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ضرور تھا لیکن وہ اس کی اہمیت اور صحیح نوعیت سے ناواقف تھا۔

انہی سالوں میں لڑکیوں کے لئے ادب کے میدان میں ایک راستہ نکل آیا۔ ایک روز کسی چیز کی تلاش میں شارلوٹ نے اتفاقیہ ایملی کی میز کے دراز میں نظموں کا ایک مسودہ دیکھا اور مطالعے پر وہ اُن کے جوہر سے بہت متاثر ہوئی اور اُن کی اشاعت [illegible]

تھا اشاعت پر کسی طرح راضی نہ ہوتی لیکن شارلوت کے عزم نے فتح پائی خصوصاً
جب این نے بھی چند نظمیں پیش کر دیں تو تجویز یہ قرار پائی کہ تینوں بہنیں اپنے کلام کا
ایک مجموعہ شائع کریں۔ البتہ یہ فیصلہ ہوا کہ اسے فرضی مردانہ ناموں سے شائع کیا جائے۔
اس مجموعے کی اشاعت پر اُن کے پچاس پاؤنڈ صرف ہوئے۔ کیونکہ ناشر
نے اسی شرط پر مسودہ لیا۔ لیکن صرف دو جلدیں فروخت ہوئیں۔ ریویو بھی بہت کم
ہوئے اور صرف ایک نقاد نے اتنا تسلیم کیا کہ ایمیلی والی نظموں میں ایک اچھوتی
انفرادیت موجود ہے۔

لیکن ان اولوالعزم عورتوں نے اس ناکامی سے ہمت نہ ہاری۔ تینوں نے
ایک ایک ناول تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ ناولوں کے مسودے لندنی ناشروں کے
ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک سرگرم سفر ہوئے۔ انہی ناولوں میں
ایمیلی کا وہ مشہور عالم ناول "ؤدرنگ ہائیٹس" ہے جو انگریزی ناول نگاری کی تاریخ
میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ایمیلی کے ناول ؤدرنگ ہائیٹس کے متعلق مشہور شاعر روزیٹی کہتا
ہے کہ اس کا ماحول دوزخ میں بسایا گیا ہے۔ ہم اسی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس
داستان میں جذبات کی کیسی کچھ کشمکش ہوگی۔ اور محبت کے سیدھے سادے
احساس کو ایک پیچیدہ صورت دے کر کس طرح ایک ایسی نفسی کیفیت پیش کی ہوگی
کہ پڑھنے والے کے دل پر ایک طول ہیبت چھا جاتی ہے۔ ایمیلی دنیوی لحاظ
سے کوئی تجربہ کار عورت نہ تھی لیکن اُس میں ایک اندرونی شدید زندگی ضرور تھی
اور اُس نے اپنی اس فطرت سے جس میں گھر بار اور آزادی کے لئے ایک تند و تیز
جذبہ تھا۔ ایسے احساسات کی تصویر اپنے ناول میں کھینچی جن کے سامنے دوسرے
تمام جذبات ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس ناول میں اُس نے اپنی روح کے سانچہ "عورت" کی روح
کو نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس کتاب کا بنیادی نظریہ وہی پرانا خیال ہے کہ محبت
"عورت" کی تمام ہستی ہے۔ چنانچہ ناول میں ایک جگہ ہیروئن کہتی ہے۔

"میں ہی ہیتھ کلف (ہیرو) ہوں، وہ ہر وقت، ہمیشہ میرے ذہن میں
بسا ہوا ہے، اُس کا ہونا کسی خوشی کی علامت نہیں ہے، بالکل ایسے جیسے میرا
ہونا میرے لئے کوئی خوشی نہیں، میں صرف "ہوں" اور یونہی وہ بھی مجھ میں صرف "ہے"۔
اپنے ناول ؤدرنگ ہائیٹس میں اُس نے جو کردار تخلیق کئے ہیں اُن کے
دلوں میں بچپن کی ایک ضد ہے۔ اُن کی محبت اور نفرت ایک طفلانہ غیر معقولیت
لئے ہوئے ہے، وہ ظلم پر اُتر آتے ہیں تو بچوں ہی کی طرح آگا پیچھا نہیں دیکھتے
ہو رہیر تو گویا اُس تنہائی اور اُداسی اور اُس غیر جنسی لیکن ہیجان انگیز محبت کی
تڑپ اور تشنگی کا ایک مجسمہ ہے جس کا اظہار اُس کے شاعرانہ کلام میں ہر جگہ

گونج رہا ہے اور اُس کی قرینا ہر نظم پر چھایا ہوا ہے۔
بہت جگہوں کے چکر لگنے کے بعد آخر کار ایک ادارے نے شارلوت
کے ناول کو پسند کیا۔ لیکن اُن کی رائے میں یہ ناول بہت چھوٹا تھا اور اس زمانے
کے رجحان کے لحاظ سے یہ بات درست نہ تھی۔ انہوں نے لمبے ناول کی فرمائش کی
شارلوت اس کے لئے بھی تیار ہو چکی تھی۔ لمبا ناول بھی آن پہنچا اور شائع ہونے پر
بہت مقبول ہوا۔ اسی دوران میں ایمیلی اور این کے ناول بھی شائع ہوئے۔ اور ایمیلی
کے ناول کے موضوع کی اجنبیت کے باوجود ان دونوں نے بھی قبولیت حاصل کی
بہت سے لوگوں نے یہ خیال کیا کہ یہ تینوں ناول ایک ہی قلم سے نکلے ہیں اور اس
غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے شارلوت اور این نے لندن کا سفر بھی کیا۔ اسی زمانے
میں اُن کے بھائی کا انتقال ہوا۔

برین ویل کی موت کے کچھ عرصہ ہی بعد سے ایمیلی بھی گھلنا شروع ہو گئی۔
کھانسی کی کیفیت روز بروز بدتر ہونے لگی اور دق کے اثرات ایک بار پھر اس
خاندان میں نمایاں ہونے لگے لیکن ایمیلی نے دوا دارو سے مطلق انکار کر دیا اور
کسی بیمار ہرنی کی طرح وہ ہر طرح کے میل جول سے کھنچ کر اپنے کمرے کی خلوت
میں گوشہ نشین ہو گئی اور علاج کی مدد سے انکار کرتے ہوئے برین ویل کی موت
کے تین ماہ بعد مر گئی۔ موت کو اُس نے خوش دلی سے لبیک کہا کیونکہ زندگی
میں بھی تو اُسے کوئی خوشی نظر نہ آئی تھی اور وہ بھائی جس سے اسے تھوڑی بہت
دلبستگی تھی بھی، وہ بھی اب یہاں سے جا چکا تھا۔ وہ آزادی کی طالب تھی، اس
دارالمحن سے آزادی ہی اس کا مطمح نظر تھا۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۸ء کو اس کا انتقال ہوا۔
گویا تیس سال کی عمر میں انگلستان کی یہ نحیف و نزار طال انگیز شاعرہ مر گئی
زندگی میں اُس کی شخصیت گھر والوں کے لئے ایک معما ہی رہی اور موت کے بعد
وہ دنیائے ادب میں ایک پر اسرار سی ہستی بن گئی۔ اور اُس کی نفسی زندگی اور
خیالات کے متعلق ہمیں جو بھی علم حاصل ہو سکتا ہے وہ اس کے ایک ناول اور
کچھ نظموں ہی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان مختصر ادبی تخلیقات
کے باوجود بھی ہم اُس کی کم آمیز، خاموش اور محتاط طبیعت اور اُس کے کلام کی خوبیوں
کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ایمیل کے بعد ہی این بھی بیمار ہو گئی۔ شارلوت اسے سکاربرو کے ساحلی
مقام پر اس خیال سے لے گئی کہ سمندر کی ہوا سے شاید کچھ افاقہ ہو سکے۔ لیکن وہ
بھی وہاں پہنچ کر ۲۸ مئی ۱۸۴۹ء کو مر گئی۔ گویا آٹھ ماہ کی قلیل مدت کے اندر اندر شارلوٹ
اکیلی رہ گئی۔ صرف اس کا بوڑھا باپ اس کا ساتھی رہ گیا، جس کی نظر اب بڑھاپے
کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھی۔

[illegible]

یہ برونٹی خاندان [illegible] افسانہ لیکن اس کی دلچسپی اور اس کی اثر انگیزی کے [illegible] بیان کافی نہیں ہے۔ اس خاندان کی سوانح نگاری [illegible] مشکل سے [illegible] انداز میں اس داستان کو بیان کیا ہے وہ اپنی دلچسپی میں کسی ناول سے کم نہیں ہے۔ لیکن ان تین بہنوں کی ادبی تخلیقات [illegible] کو تسلیم کرنے کے لئے کسی بات کے [illegible] ان کی [illegible] نہیں [illegible]۔

برونٹی خاندان کا افسانہ موت کا افسانہ ہے۔ ایمیلی کے علاوہ شارلوٹ پر بھی موت کے اس مستقل احساس نے ایک گہرا اثر لیا اور بچپن ہی سے اُس کے دل میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے ایک مادرانہ شفقت کا جذبہ پیدا کر دیا شارلوٹ کے لئے اپنے آپ کو دنیا کے مطابق بنا لینا آسان تھا لیکن ایمیلی کے لئے مشکل کیونکہ اُس کی فطرت میں اُس قسم کی عام ہمدردی اور اُنس التفات کی کمی تھی جس سے زندگی کی دلچسپی کے اضافے میں مدد ملتی ہے۔ اگرچہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے ایمیلی کا رویہ مہربانی آمیز تھا۔ پھر بھی وہ ان سے میل جول کی کوئی کوشش کبھی نہ کرتی تھی۔

ایلن نسی لکھتی ہے کہ بچپن میں ایمیلی اور این میں بہت ہم آہنگی تھی۔ ہمیشہ وہ اکٹھی رہتیں اور آپس میں بولتی چالتیں۔ اس کا ثبوت وہ نظمیں بھی ہیں جو انہوں نے مل کر لکھی تھیں۔ شارلوٹ سے وہ کبھی گھل کر نہ رہ سکتی تھی کیونکہ وہ اس قسم کی بڑی بہن تھی جس سے ایمیلی سی خود سر لڑکی حساس اور کم آمیز ذہانت ہم آہنگ ہو کر اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتی۔ شارلوٹ کا ذہنی رجحان عملی، اعتقادی اور خاموش طریق پر درد مندانہ تھا لیکن وہ گھر کی ہر بات میں برتری اور تفوق حاصل کرنے کی عادی تھی ایمیلی اور اُس میں بہت سی باتیں متضاد تھیں۔

برونٹی خاندان کے بچوں کو بچپن ہی سے گھریلو آزادی مل گئی تھی جو بھی جس کے جی میں آئے کرے جیسی کتابیں جس کا جی چاہے پڑھے اور اپنے ملازموں سے گاؤں کے قصے کہانی اور گپ شپ سُنے۔ ایسے حالات تخیل اور ذہانت کے ساتھ مل کر ادب اور آرٹ کی تکمیل بھی کر سکتے ہیں اور بچوں کو دنیوی لحاظ سے بگاڑ بھی سکتے ہیں۔

بچوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب انہیں ذہنی اور جسمانی لحاظ سے ہر قسم کی آزادی مل جاتی ہے اور دنیا کے تجربات کو وہ اپنے طور پر حاصل کرنے لگتے ہیں تو وہ اپنے لئے ایک خیالی دنیا کھڑی کر لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ دنیا حقیقی دنیا کی تنہائیوں سے [illegible] حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں بھی روزمرہ زندگی ہی کی طرح ایک ہنگامہ [illegible] وقت گھما [illegible] اور عیش بنا رہتا ہے۔

برونٹی خاندان کے بچوں نے بھی اپنے لئے ایک ایسی دنیا بنالی اور بچپن کے سب سے بڑھ کر خوشی مت بھرے لمحے انہوں نے اسی دنیا میں گزارے جس میں وہ خواب دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ بہت سے لوگوں کے لئے یہ طفلانہ جہانِ تخیل طفلی ہی تک رہتا ہے اور بلوغ کے ساتھ ہی دھندلا کر ایک دوری اختیار کر لیتا ہے کیونکہ ایک تو ان کی یہ قوتِ تخیل کافی حد تک ناکارہ ہو جاتی ہے اور دوسرے ان کی روزمرہ زندگی کے جھمیلے اپنی دلچسپی اکثرت کی وجہ سے خوابوں کے لئے وقت نہیں رہنے دیتے۔ لیکن ایک شاعر کے ذہن میں یہ دنیا کبھی نہیں مٹتی اس کی پروازِ تخیل جاری رہتی ہے اور بلوغ کے بعد بھی روز بروز ایک بڑھتی ہوئی وسعت اختیار کرتی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے لئے تخیل کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہوتی ہے۔ اور اسی میں اُسے سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے یہ دنیا گویا اس کی ہستی کا ایک حصہ بن جاتی ہے ایمیلی کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اُس کے لئے ہاورتھ گاؤں ایسے سنسان مقام اور اُس کے گرد و پیش کے مناظر اور قریب کے بنجر پتھریلے علاقے میں ہی ایک اہمیت تھی، ایک حسن تھا اور یہ حسن اُس کے لئے محبت کی شدت لئے ہوئے تھا۔ اور یہ ایک بات خصوصاً اُسی کی فطرت کا لازمہ تھی یعنی دنیوی تجربے کے محدود ہونے کے باعث وہ بڑی ہو کر بھی ایک بچہ ہی تھی۔ بڑے ہو کر بھی اُس کے دل میں اپنے ماحول سے بچپن کی مبہم اور جذبات انگیز اُمنگیں پیدا ہوتی تھیں۔ چنانچہ اُس کی شاعری میں بھی دو باتیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔

پہلی اُسے تنہائی کا ایک ایسا احساس تھا جو بعض اوقات شدید ہو کر ہیبت ناک صورت اختیار کر لیتا تھا۔ دنیا اسے خالی اور تاریک دکھائی دیتی تھی۔ لیکن یہی احساس بعض دفعہ اُسے بہجت افروز نظر آتا تھا اور وہ اپنے آپ کو قدرت کی بنیادی طاقتوں سے ہم آہنگ پاتی تھی۔

دوسرے اُس کے دل میں ایک ہر شے کو جذب کر لینے والی محبت کی آرزو تھی۔ اس محبت کا خاصہ ملکیت کا جذبہ تھا، حصول کی خواہش۔ لیکن اس میں

جسم کو کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ محبت بیک وقت جذبات انگیز بھی تھی اور اس میں جنس کا دخل بھی نہ تھا۔

لیکن ایمیلی اپنے ان طفلانہ تصورات میں صرف خواب ہی نہ دیکھتی تھی۔ وہ سوچتی بھی تھی اور اس لحاظ سے بھی اس کا ذہن اچھوتی اور پُر زور خصوصیات کا حامل تھا۔ اسے اپنے گرد و پیش کے مناظرِ قدرت میں ایک اہمیت اور ایک حسن کا احساس ہوتا تھا لیکن اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی زندگی میں، اُن کی محبت میں اُن کی مسرتوں میں اور ان کے غموں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پالتو جانوروں سے اسے دلچسپی تھی۔ لیکن بچوں سے وہ الگ رہتی تھی۔ انسانوں کی اُسے پروا نہ تھی۔ اُسے اُن کے ذہنوں کی حرکات پر غور کرنا نہ بھاتا تھا۔ اُسے یہ تجسس نہ تھا کہ لوگ کیا سوچتے اور کیا چاہتے ہیں اور اپنے ذہن کی حرکات کو وہ جبلّی طور پر دوسروں پر ظاہر ہونے سے بچاتی رہتی تھی۔ وہ محفل میں خلوت کی بہ نسبت زیادہ تنہا تھی۔ کیونکہ خلوت کو وہ انجمن سمجھتی تھی اور اپنے مختصر خیال ہی وہ اُسے بسا لیتی تھی۔ صرف گاؤں کے پاس کے بنجر علاقے ہی میں وہ اپنے خارجی ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ پاتی تھی۔

اس قسم کی کشمکش سے عموماً فطرت باغیانہ خصوصیات کو پرورش کر لیتی ہے۔ داخلی اور خارجی زندگی کا ایسا تضاد انسان کو ماحول سے بغاوت پر مجبور کر دیتا ہے لیکن ایمیلی میں ایسی کوئی بغاوت نہ تھی، اُس نے زندگی کے حقائق کو خاموشی کے ساتھ ایک فلسفیانہ انداز میں قبول کر لیا تھا۔

شارلوٹ لکھتی ہے کہ میری بہن کی طبیعت قدرتاً عزلت پسند نہ تھی۔ حالات نے اُس کی تنہا پسندی کو پرورش کر کے نشوونما دی۔ گرجا جانے یا سیر کو نکلنے کے علاوہ وہ کبھی گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہ رکھتی تھی۔

لیکن وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے اُس کی طبیعت کو ایسا بنا دیا تھا؟ اس غیر معمولی سنجیدگی کو پیدا کرنے والے موت کے خیالات تھے۔ ابھی وہ تین سال سے کچھ ہی بڑی تھی کہ اس نے ماں کی موت کو دیکھا۔ اس نقصان سے اس پر ایک اور اثر بھی ہوا یعنی وہ زیادہ تر اپنے سخت مزاج باپ کے اثر کے نیچے آ گئی۔ ماں کا نرم اثر اس پر نہ رہا اور اس لئے اس اثر نے اس کی طبیعت میں سے اُس قدرتی لچک کو دور کر دیا جو بچپن اور نسائیت کا خاصہ ہوتی ہے۔ سات سال کی تھی کہ دونوں بڑی بہنیں میریا اور الزبتھ بھی بہت تھوڑے وقفے سے مر گئیں وہ قبرستان جس میں خاندان کے یہ تینوں فرد سپردِ خاک کئے گئے۔ اُن کے گھر کے بالکل ساتھ ہی تھا۔ گھر کے ساتھ باغ تھا اور باغ سے نکل کر ایک چھوٹے سے لکڑی کے دروازے سے ہوتے ہوئے قبرستان میں پہنچا جا سکتا تھا۔

بسا اوقات ایمیلی کے ننھے ننھے پاؤں ان قبروں سے ٹکرائے ہوں گے۔ لیکن اس باغ میں ایک اور دروازہ بھی تھا۔ باغ کے ایک طرف ایک سرسبز گلی سی تھی جس میں سے نکل کر انسان یک دم کھلے پھیلے ہوئے پتھریلے بنجر علاقے کی طرف پہنچ سکتا تھا۔ اس کھلے علاقے میں ایک یکسانیت تھی۔ جب ایمیلی زندگی اور اس دنیا سے بیزار ہو کر اس طرف سیر کو نکل جاتی تو یہ کھلی اور پھیلی ہوئی یکسانیت جس کے مختلف گوشوں کھدروں کے حسن کا صرف اُسی کے دل کو احساس اور علم تھا، ایک تسکین کا تحفہ لئے موجود ہوتی اور اس منظر پر آسمان ہمیشہ اپنا شامیانہ تانے رہتا۔ یہاں قدرت اپنے اصلی رنگوں میں اُس کے لئے چشم براہ تھی۔ یہیں اسے ہر قسم کے بندھنوں سے آزادی نصیب ہوتی تھی۔ یہاں پہنچ کر ایمیلی ایک اچھوتی اور نئی ہستی کا بھیس دھار لیتی۔ اُس کی کم آمیزی اور جھجک دُور ہو جاتی۔ یہاں وہ اپنے بھائی کے ساتھ بچپن کی شوخیوں میں حصہ لیتی۔ پانی میں بڑے بڑے مینڈکوں کو تنگ کرکے اِدھر اُدھر بھگاتی اور پھر گر دراز منصوبے، حاکم اور محکوم، ظالم اور مظلوم کے مسئلے پر خیال آرائی کرنے لگتی لیکن اس ماحول میں کوئی تنوع نہ تھا اور اس ماحول کا یہ اثر ہوا کہ موضوعات اور تصورات کی ایسی ہی یکسانی اُس کی نظموں میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

اُس کی ذات اِس ماحول کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ وہ اس ماحول کی پیداوار تھی۔ یہاں تک کہ ان مناظر سے دور رہ کر وہ زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ دو بار وہ گھر سے دور گئی۔ پہلی بار اُس کی صحت پر اس کا اتنا برا اثر ہوا کہ اُسے جلد لوٹنا پڑا۔ گھر پر بھی وہ اکیلی ہی تھی۔ اس کی کوئی سہیلی نہ تھی۔ اور خواہ اس سے رومان پسندوں کو ناامیدی ہی کیوں نہ ہو، اُس کا کوئی نوجوان مرد دوست بھی نہ تھا۔ اس کے ذہن کی تمام توجہ کا مرکز اس کا گھر اور اس کا ماحول تھا۔ گھر میں اس کے بھائی بہن بھی اپنے کاموں اور مشغلوں میں مصروف رہتے تھے اور وہ تنہا گھر بار کا کام کاج کرتی مطالعہ کرتی یا لکھتی لکھاتی رہتی۔ لکھنے لکھانے کے لئے وہ بسا اوقات اس باغ میں جا بیٹھتی جہاں سے قبرستان اور پتھریلے بنجر علاقے کے مناظر اُسے نظر آتے رہتے۔

عورت کی نفسی ذہنیت کی نشوونما اور اُس کے محبوب خیالی کے متعلق لکھتے ہوئے ایک مغربی ماہرِ نفسیات نے لکھا ہے کہ اکثر لوگوں نے اہتمام اور التزام کے ساتھ اپنی ایک خیالی دنیا بنا رکھی ہوتی ہے جس میں اس دنیا سے دور کوئی تنہا جزیرہ ہوتا ہے یا کسی آبادی سے الگ سرزمین میں کوئی اکیلا محل جس میں وہ اُس وقت جا کر تنہا یا اپنے پسندیدہ کرداروں کے ساتھ اطمینان اور چین کی من مانی زندگی گذارتے ہیں جب انہیں یہ حقیقی دنیا اور اس کی زندگی بے مزہ

اور مشکل نظر آتی ہے۔ اس خیالی دنیا میں خواہشات کی تکمیل میں آسانی ہوتی ہے اور اس لئے یہ نئی جہان ایک ایسی دلکشی سے بھر جاتا ہے کہ انسان ذرا ذرا سے جانے پہچانے [illegible] سے گریز کر [illegible] اور [illegible] ان کے تصورات سے دل بستگی بڑھتی جاتی ہے [illegible] مشکل ہوتا جاتا ہے [illegible] خیالی دنیا تخلیق [illegible] ہوتا ہے۔

بہر حال ایک سادہ انسان میں چاہت اور چاہے جانے کا جذبہ [illegible] نہیں [illegible] کو [illegible] آسانی سے [illegible] ہو سکتا [illegible] ذہن انسانی محبت کا [illegible] حقیقت [illegible] کو پورا کرنے اور [illegible] اس کا [illegible] خیالی محبوب پیدا [illegible] سکیں [illegible] خیالی محبوب [illegible] صورت کے سلسلے میں [illegible] کے لئے ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی طاقت اور دلکشی [illegible] قابل دید ہوتی ہے کہ یہ ذہن کی نفسی کیفیتوں کا ایک اہم جزو [illegible] کا ایک حصہ ہوتا ہے اس لئے اس کا بندھن کسی صورت ٹوٹ نہیں سکتا اور [illegible] خیالی دنیا اسی محبوب ہستی کے رہنے اور اُس سے [illegible] جاتی ہے۔

ایمیلی نے اپنے نفسِ غیر شعوری سے اپنے ذہن کے اس خیالی عمل کو اپنے ناول میں کمال زور و تاثر اور وضاحت سے ظاہر کیا ہے۔ نیز اُس کی نظموں میں بھی ایک ایسی ہی پکار، ایک ایسے ہی خیالی محبوب کی پیاس کا اظہار اور اس سے ملنے ملانے کی باتیں موجود ہیں۔ ذیل کی نظم میں جو تڑپ ہے وہ اسے راز حیا کی بے قراری سے ہم آہنگ کرتی نظر آتی ہے۔

تشفی

میں آؤں گی، میں آؤں گی جب تو دُکھیا ہو، بے چین
نوراُجالا لے آؤں گی جیسے چندا والی رین
جیتیں جب خوشیوں کے حضرت تجھ کو تج کر کھو جائیں
اور ہنسی کی لہریں تیرے رُخ سے غائب ہو جائیں۔
شامیں آئیں غم کی دن خوشیوں کے سارے سو جائیں۔
میں آؤں گی، میں آؤں گی جیسے چندا والی رین
نوراُجالا لے آؤں گی جب تو دُکھیا ہو، بے چین،

میں آؤں گی جب تیرے جیون میں پت جھڑ آ جائے،
ہنسی ہنسی سوکھے، ہر اِک پھول کلی مُرجھا جائے،
روح تری سونے مندر جیسی صورت جب پا جائے،
میں آؤں گی جیسے دیوی آئے۔ ۔۔۔ سکھ اور چین،
نوراُجالا لے آؤں گی جیسے چندا والی رین۔

دیکھو، یہی لمحہ ہے پیارے! دیکھو! یہی لمحہ ہے، جان!
تو غم گیں ہے، دُکھ سے تیرا ننھا جیون ہے ہلکان۔
تیری روح سے اُمڈے ہیں احساس انوکھے، اِک طوفان!
لے میں آئی، لے میں آئی، کیوں دُکھیا ہے؟ کیوں بے چین؟
نوراُجالا لے آئی میں میرے چندا! تیری رین!

ہر شاعر ایک طرح سے دہری زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن کم و بیش اُن دونوں زندگیوں میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے لیکن ایمیلی برونٹی کی عملی اور تخیلی زندگی میں جو اختلاف ہم دیکھتے ہیں اس قدر گہرا فرق کسی شاعر کی زندگی میں بھی کم ہی ہوتا ہے۔ اس کی دہری زندگی کی لہریں بالکل مخالف رو میں بہتی تھیں اور ان دونوں کے احساساتی رنگوں میں گویا زمین اور آسمان کا فرق تھا۔

ایمیلی کی ڈرامائی یا دوسری چند نظموں کو چھوڑ کر اگر صرف ذاتی نظموں کو دیکھا جائے تو ان کے لہجے میں صرف ایک موضوع کارفرما نظر آتا ہے۔ موت۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی ایک یادداشت کی تحریر کے مطابق اپنے آپ کو صحت مند اور خوش و خرم اور مطمئن ظاہر کرتی ہے۔ اُس کی عملی زندگی گھر کے کام کاج اور گھریلو دلبستگیوں پر مشتمل تھی اور اس میں وہ مطمئن تھی۔ لیکن اس کی تخیلی زندگی میں ہر وقت موت کے خیالات کا ایک اضطراب چھایا ہوا تھا اور صرف یہی ایک ایسا اختلاف نہ تھا جو اُس کی فطرت کا جزو بن چکا تھا بلکہ اور متضاد باتیں بھی ایسی تھیں جو اس اختلاف سے کہیں عجیب تر تھیں۔

گوئٹے کے الفاظ میں وہ کہہ سکتی تھی کہ میں اپنے لئے تو خوش ہوں، مگر دوسروں کے لئے میں خوش نہیں ہوں۔ روزمرّہ کے گھریلو کام کاج میں اس کے لئے خوشی تھی۔ علم کی جستجو میں اس کے لئے خوشی تھی۔ موسم بہار کے صاف آسمان میں اُس کے لئے خوشی تھی۔ لیکن یہ باتیں اس کی تحریکِ شعری کی معاون نہ ہوتی تھیں اس کے تخیل میں اگر گریز پیدا ہوتی تھی تو صرف انسانی دکھ درد اور موت ہی سے ہوتی تھی۔ مگر اُس کے دل میں کوئی ایسا جذبۂ ترحم موجود نہ تھا جیسا کہ انسانیت پرست لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے۔ اس کے جگر میں سارے جہان کا درد نہ تھا۔

اس کے دل پر اگر کوئی جذبہ یکسر چھایا ہوا تھا تو وہ گھر کی محبت تھی، اس گھر کی محبت جس میں اس نے اپنا بچپن گذارا تھا۔ اس کی فطرت ایک محدود لیکن شدید فطرت تھی جس پر بچپن کے تجربات ایک ایسا گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں جس کے سامنے بعد کے تمام تجربات ایک پرکاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے دل میں بچپن کے سب سے پیارے، مسرت سے لبریز سالوں کی یاد ہمیشہ تازہ رہی لیکن یہ یاد ایک ایسی مسرت تھی جس کی نوعیت درد سے ملتی جلتی ہو۔ درد اور مسرت کا یہ گہرا تعلق انسانی تجربے میں ازلی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مسئلے کو نفسیاتِ جدید کے ماہرین نے بہت حد تک سلجھایا ہے لیکن اس وضاحت کا یہ موقع نہیں۔ البتہ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ موت کے موضوع سے اس قدر وابستگی کے باوجود ایمیلی کو موت بنفسہٖ مرغوب نہ تھی۔ یہ کہنا اس لئے ضروری ہے کہ اُس کی نظموں میں بعض دفعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ موت کو بلاوا دینا ایک بزدلانہ پکار ہے جو ایک کمزور قوتِ ارادی کا فعل ہے۔ ایسے ارادے اور ذہنیت کا فعل جسے اس کی اُمید ہی نہیں رہتی کہ وہ اپنی روح کے تصور کو تازہ دم بنا سکے گی۔ اُس تصور کو تازہ دم بنا سکے گی۔ جس میں کبھی تازگی، شادابی، شگفتگی اور زندگی جلوہ گر تھی۔ اُس کی جان تھی، اُس کی روح و رواں تھی۔ اور اس کا ثبوت اُس کی اپنی زندگی بلکہ اس کا آخری وقت ہے جس کے متعلق اُس کی بہن شارلوٹ کہتی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اُسے ایک پُرمسرت زندگی سے زبردستی علیحدہ کیا جا رہا ہے۔

ایمیلی کی فطرت میں سب سے بڑا تضاد یہ ہے کہ وہ گرہستی طبیعت کے باوجود اپنے دل کی گہرائی میں ایک صوفی تھی، ایک بیراگن تھی۔ وہ میرابائی کی طرح یہ نہیں کہتی کہ کھان پان موہے نہ بھاوے۔ وہ گھر کی ہر بات میں دلچسپی لیتی ہے لیکن وہ تصور میں احساسِ مذہبی کرتی ہے۔ اُس کے لئے وجد و حال کی کیفیت جانی پہچانی بات ہے۔ یہاں یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ تصوف، بیراگ یا وجد و حال کی کیفیت ایک فلسفہ نہیں بلکہ ایک تجربہ ہے۔ یہ تجربہ انسانی زندگی میں نادر ضرور ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر شخص گیان کا دیا جلا کر تصور کے اس تجربے کے ذریعے سے روح الابد سے ہم آہنگ نہیں ہوا کرتا۔ ایمیلی اپنے نفس کی خیالی دنیا میں جس محبوب سے ملنے کی مشتاق تھی وہ یہی روح الابد تھی۔ یہ سب نظریہ اگرچہ تصور کا کرشمہ ہے لیکن اس کی حقیقت کو اس سائنٹیفک زمانے میں بھی آسانی سے نہیں جھٹلایا جا سکتا۔

اگر ہم غور کریں تو یہ ہماری زندگی بھی کوئی مسئلہ یا فلسفہ نہیں بلکہ ایک تصور ہی ہے۔ یہ زندگی کا تصور کوئی غیر مرئی چیز نہیں ہے جیسا کہ ساده صورت غذا کی ضرورت سے کبھی کبھار دیکھ لیتے ہیں بلکہ یہ ایک معین تصور ہے جسے ہر طبیعت اپنے لئے از سرِ نو تخلیق کرتی ہے۔ شاعرانہ طبائع اس بات کو آسانی سے سمجھ سکتی ہیں۔ بیرونی دنیا اگر ہمارے شعور میں شامل نہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس کی ہستی ہی ناپید ہے اور ہر تصور کی تخلیق اسی بنیاد پر ہوتی ہے۔ شاعر فطرت کا آئینہ ہے وہ اپنی طبعی خصوصیات میں فطرت کے عکس کو دیکھتا ہے۔ اور اُسی عکس یا تصور کا وہ پجاری ہوتا ہے۔ ایمیلی برونٹی نے اپنی طبیعت کے آئینے میں اپنے بنجر ماحول اور اپنی زندگی کے اُن واقعات کا عکس دیکھا جس میں موت کے ذکر و بیان کو بہت زیادہ دخل تھا اور یوں اُس نے اپنے تخیل کے اظہار سے اپنی فطرت کو ازلی فطرت سے ہم آہنگ بنایا۔

یہاں میں چاہتا ہوں کہ ایک صوفی یا بیراگی کی ذہنی کیفیات کے متعلق بھی کچھ لکھوں تاکہ زیادہ واضح طور پر ایمیلی کی نفسی ذہنیت کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکے کہ اُس میں کہاں تک بیراگی لوازم موجود تھے۔

صوفی یا بیراگی ایک ایسی سرزمین میں بستا ہے جو اس دنیا سے الگ ہوتی ہے، وہ سرزمین تمام تر آسمان کی صاف اور منزہ فضا میں بھی نہیں ہوتی اور تمام تر اس دنیا کی آلودگی میں بھی نہیں ہوتی اور اس جگہ رہتے ہوئے وہ اس جہان کی زبان و بیان اور تصورات اور استعاروں کو مفہوم کی ایک روحانی نفاست کا لباس پہنا کر اُن کیفیات کا اظہار کرتا ہے جن کے بیان کے لئے اسے حقیقتاً اس دنیا کی زبان میں الفاظ ہی میسر نہیں آتے اور یہی وجہ ہے کہ زبان اور مفہوم کے ماخذ میں جو اختلاف ہے وہ ہمیں اُس کے دلی معانی تک پہنچنے میں ایک روک نظر آتا ہے۔

صوفی یا بیراگی ایک ایسے ابدی اصول کا تصور باندھتا ہے جس کی بنا پر انسانی روح ایک سمجھوتے کی آرزو کرتی ہے اور اپنے سے علاوہ کسی اور شے میں مدغم ہو جانا چاہتی ہے۔

تصوف یا بیراگ اصل میں ایک فن ہے جس کی مدد سے ہم اپنی اندرونی قوتوں اور کیفیتوں کے نظام کو باقاعدہ بنا سکتے ہیں اور اس تعین اور باقاعدگی سے ہم کائنات کو جزوی اعتبار کی بجائے کلی طور پر اپنی ذہنی گرفت میں لا سکتے ہیں۔ اس بلند درجے تک پہنچنے کے لئے بعض دفعہ بیراگی کو مختلف ذرائع سے اپنی ذہنی زندگی میں ایک سادگی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ یہ ذرائع فاقہ کشی، عزلت نشینی منشیات کا استعمال اور اسی طرح کے اور ذرائع بے خودی ہیں جن کے وسیلے سے ایک بہجت افروز کیفیت ذہن پر چھا جاتی ہے۔ صوفی یا بیراگی کو انتہائی درد یا انتہائی مسرت اُس منزل تک پہنچاتی ہے جس کا تعلق نہ کلیتہً جسم سے ہے نہ روح

سے لیکن معروف ... کسی خاص کیفیت کو سمجھنے ہی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ذہنی ریاضت بھی ہے کیونکہ صوفی ... کی وحدت کا احساس ہوتا ہے ... تو اُس کے ... ہو جاتی ہے، ایک طمانیت، ... [illegible] ... [illegible] سکتے۔

[illegible]

اسیلی کی ... [illegible] ... اُس کے ... [illegible] ... امراض ... کے مستقل ... اور ... ازل ہی سے رہا ہے ... کا ثبوت میں ہمیشہ ... کو حاصل کیا ہے اور ... اُن کے تجربات سے ... حوالے بنائے ہیں۔

شعرا میں اس کی ایک بہت اچھی مثال جرمنی کے ویولنے شاعر ... کی شخصیت ہے۔ وہ ایک حساس، نرم اور جذباتی طبیعت کا مالک تھا اور اس لئے اُسے ذاتی حفاظت کی ایک شدید ضرورت کا احساس تھا، چنانچہ اُس کی فطرت ہی مذہبی قسم کی تھی۔ اپنی ایک نظم میں وہ لکھتا ہے:

جنگل کے سایوں کے نیچے جہاں دوپہر کا عظیم الشان سورج اپنی درخشاں
کرنوں کا جال پتوں اور ٹہنیوں پر ڈالے ہوئے ہے،
میں چپ چاپ اکیلا بیٹھا ہوں،
دُنیا کے توہین آمیز رویے نے مجھے رنجیدہ کر دیا ہے۔
میں آوارہ گردی کرتا ہوا جنگل میں آنکلا ہوں،
اُے قدرت! تیرے شاعر بہت زود رنج ہوتے ہیں۔
وہ بہت جلد آنسو بہانا اور نوحہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔
یہ برکت والے شاعر اُن بچوں کی طرح ہیں۔
جنہیں ممتا کی ماری ماں سینے سے چمٹا لیتی ہے۔
اگر یہ تمام شاعر جو بد دماغ ہیں اور مالکانہ خود اعتمادی سے لبریز ہیں،
تھوڑے عرصے کے لئے چپ چاپ خاموشی سے بھی راستے پر چلتے
جائیں تو جلد ہی بھٹک جائیں گے۔
... کشمکش کرتے ہوئے چلتے ہیں لیکن تو انہیں چھوڑتی بھی نہیں
اے ... قدرت!
اگر ان پر مہربانی کی نظر رکھی جائے تو یہ خوش اور نیک رہتے ہیں۔
اور بہت خوشی سے ہر ایک حکم بجا لاتے ہیں۔
اے ماں! تو ہی جس طرح چاہتی ہے نرمی کے ساتھ ان کی رہنمائی
کرتی ہے"

ایمیلی برونٹی بھی اسی قسم کے احساسات رکھتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُس کے دل میں ایک درد اٹھتا ہے

"..... کیا یاد آیا"

کہاں گئے تھے تم سارے، اور کہاں گیا تھا تو!
میں نے نیناں دیکھے، جیسے تیرے چمکتے نین!
لیکن اُس ماتھے پر بل کھاتے، کالے گیسو!
اُس کی ترچھی نظر میں گاتی دکھ کے پپیہے بین۔

اک سپنے جیسے سکھ سے یہ دل اور سو کھے نین
ایسے بھرے جیسے بھیدوں سے سُونی، اندھیری رَین۔
کانپتے کانپتے، تھر تھر کرتے میں نے کان لگائے،
تاکہ اس کا نام میرے کانوں میں پل بھر آئے
وہ آواز نہ تھی لیکن ہر اک بیتی بات
اک دم کہہ کر کوئی جیسے آ کر جائے رات۔
وہ منظر تھا یا تھی وہ بیتے لمحوں کی باس،
گرم آنسو آنکھوں میں آئے اور رہے آئے پاس۔

اور پھر درد کے احساس کے بعد وہ بہجت کے حصول میں اپنی مجبوری کو محسوس کرتی ہے اور اُس کے دل میں اس دنیا کی حقیقت کو چھوڑنے کے

خلاف ایک جذبہ بیدار ہوتا ہے، وہ اس دنیا سے الگ نہیں ہونا چاہتی خواہ اُسے مسرّت اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لئے ہی یہ کام کرنا پڑے۔

مجبورِ زیست

گہری، کالی رات کی گود میں کھوئی ہے میری ہستی
وحشی اور بے مہر ہوا میں جوشیلی، اندھی تیزی
میری ہر قوّت کو اک ظالم جادو نے جکڑا ہے
آہ! نہیں جا سکتی میں تو، آہ! نہیں میں جا سکتی!
اُونچے اُونچے بودوں جیسے پیڑ جھکے ہیں ستے ہیں
ہر بوجھل ڈالی مجھ پر گر جائے گی ان دیکھے میں
طوفاں آنے والا ہے، آیا۔ آیا، لو، اب آیا،
لیکن میں کیسے جاؤں؟ افسوس! نہیں میں جا سکتی!
کالے کالے بادل جھرمٹ بن کر ہر سو چھائے ہیں،
گھر بیچ کر ندی نالے اور یار ستوں پر آئے ہیں،
لیکن ان سب کے ڈر سے کیسے چھوڑوں گی میں دھرتی!
میں نہیں جاؤں، میں نہیں جاؤں، آہ! نہیں میں جا سکتی

اور پھر وہ اپنے کو تسلی دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ روحانی مسرّت کے لئے ایک ذہنی دنیا کی طرف وہ اب مسافر کی مانند جا رہی ہے۔

دور بہت ہی دور ہے بستی راحت کی

دُور، بہت ہی دُور ہے بستی راحت کی،
سو میلوں کا پھیلا جال۔
اونچے اونچے پربت رستہ روکے ہیں،
لمبے، سونے صحرا چپکے سوتے ہیں،

تھکا ہوا، پژمردہ راہی چلتا ہے،
آنکھیں دھندلی ہیں اور دل میں اندھیرا ہے۔
کوئی نہیں ہے آس، نہ ساتھی ہے غم کا،
رُکتے رُکتے، گرتے، سنبھلتے بڑھتا ہے۔
گاہ نظر جاتی ہے نیلے منڈل پر،
گاہ پہنچتی ہے رستے کے جنگل پر،
اکثر جی کہتا ہے بیٹھے، سستائے،
اور جیون کا دُکھیا بوجھ بدل ڈالے۔

کیوں بے چینی؟ کیوں بے ہوشی؟ ہوش ذرا!
دیکھ ذرا، پچھلا رستہ خاموش پڑا۔
پچھلا رستہ، جو تو چل کر آیا ہے،
بڑھتا جا، منزل آئی، کیوں رُکتا ہے!
ناامیدی پر قبضہ پا ہمت سے،
یاس کی سرگوشی گم کر دے، قوت سے۔
تو پہنچے گا، پہنچے گا تو منزل پر،
چلتا جا، محنت کا قابو رکھ دل پر۔

عموماً ایمیلی ایسے کم آمیز اور حساس انسان اپنے آپ کو انسانیت اور دنیوی ماحول سے ہم آہنگ نہیں بنا سکتے خواہ لوگ اُن سے کیسی ہی ہمدردی سے کیوں نہ پیش آئیں۔ اگر ایک اس قسم کا انسان جو گہرے احساسات سے عاری ہو اپنے آپ میں اپنی ہستی کو سمیٹ کر گرد و پیش سے علٰحدہ کر لے تو وہ اپنی شخصیت کو اجنبی، المناک اور قابلِ رحم حد تک خود کام بنا لے گا۔ لیکن اگر اسی قسم کا کوئی اور انسان جو فن کارانہ رجحانات رکھتا ہو اور گہرے احساسات کا اہل ہو اپنی ہستی کو اپنے آپ میں سمیٹ کر دنیا سے علٰحدہ کرے تو وہ اپنی اندرونی وابستگی اور اُنس کے احساس کی حاجت روائی کے لئے اس جہان سے جدا ہو کر اپنا ایک الگ جہان آباد کرے گا۔ جہاں اُس کے نازک تصورات کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ جہاں کوئی ہمسایہ نہ ہوگا اور کوئی پاسبان نہ ہوگا جہاں دوسری کسی ہستی کے ارادے اُس کے احساسات اور تصورات کے قدرتی بہاؤ میں حارج نہ ہو سکیں گے۔ وہ ماضی کے کسی ایسے زمانے میں اپنا گھر بنائے گا جو اس کے لئے رغبت رکھتا ہو، وہ کتابوں میں کھو جائے گا، وہ کسی فن کی باریکیوں میں گم ہو جائے گا، اور ان سب سے بڑھ کر وہ مظاہرِ قدرت کے ایسے حسن میں اپنے آپ کو گھلا ملا دے گا۔ جو انسانی دسترس کے مصنوعی اثرات سے دور ہو، جہاں تک تہذیب و تمدن کا ہاتھ نہ پہنچا ہو اور دوسرے فن کاروں کی بہ نسبت ایسے انسانوں میں شعراء کی تعداد شاید سب سے زیادہ ہے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا الگ اسی لئے رہتے ہیں کہ انہیں یہاں کی ہوا راس نہیں آتی۔ حالی کو نیچرل شاعر کہا جاتا ہے لیکن وہ نیچرل شاعر کیونکر بنا؟ — اُس نے دیکھا کہ اس دنیا میں جس ماحول میں اس کی ہستی کا اظہار ہوا ہے اُسے کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو تکلف سے بری اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو۔ چنانچہ اس کی طبیعت حالات سے برگشتہ ہو گئی اور وہ نیچرل شاعری کا بانی بن گیا۔ ادب میں بھی اُسے جذبات کا بے ساختہ بہاؤ معدوم نظر آتا تھا۔ اردو

سے موجود ہے۔ [illegible] ذہنی شاعرہ بھی حالات ہی سے بدظن ہو کر اپنی ایک علیحدہ دنیا بسا کر بیٹھ رہتی ہیں [illegible] ہے اور زمانے کی [illegible] [illegible] شعرا کی خیالی دنیا ہو کر [illegible] صرف اقبال [illegible] [illegible] ہے۔

[illegible] ہو سکتا ہے۔

ایڈیل [illegible] ایک بہت اچھی مثال ہے۔

اور اب ایک اور نظم۔

دونوں نظموں میں ایڈیل [illegible] تصور کے گزر جانے اور لوٹ کر نہ آسکنے کا [illegible] نظموں کا لہجہ یاد آتا ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ [illegible] تھا۔ اور ایڈیل کا ماضی اُس کا [illegible] کہ اُس کی فطرت میں [illegible] طرح کی چھپی ہوئی نفسی کیفیتیں [illegible] جیسی [illegible] ہیں۔

رائگاں

اے خواب! بتا اب تو ہے کہاں! دن بیتے، سال بھی بیت گئے۔
جب دیکھا آخری بار تجھے تیری [illegible] سے تھا عیاں
[illegible] ہی دھند [illegible] ہے
اور [illegible] بن [illegible] ہے

افسوس ہے حالت پر [illegible] تیری نورانی صورت سے
میں اتنی [illegible] نہ جان سکی یاد [illegible] ہوگی [illegible] سے
سورج کی کرن، اندھا [illegible] اور موسم پیارا [illegible] کا
راتوں کی سکوں [illegible] اور صاف چمکنا [illegible]
ان سب کا ساتھ تجھی سے تھا

اے خواب مقدّر! اب مجھ کو دُکھ یاد تو ہے، شکوہ بھول گیا۔
گم گشتہ تصور! اب مجھ کو احساس ہے تلخ حقیقت کا
احساس ہے اتنی اذیت کا
افسوس نہ اب تو آئے گا

اور اس نظم کا لہجہ بھی لمبنے ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں لمبنے اور ایڈیل میں موت کے ذکر کا تواتر یکساں طور پر نمایاں ہے وہیں یہ بات بھی ملتی جلتی ہے کہ کبھی کبھی دونوں کو ایک ہلکی سی جھلک اُمید کی دکھائی دے جاتی ہے یا وہ آپ ہی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ذرا سے اجالے میں تسکین کا تصور پیدا کریں۔

بدلتی ہوئی بات

ماہ بہ ماہ، سال بہ سال
ساز کی لَے میں اک ملال ——— ہی رہا!
آج وہ گیت نکلا ہے
چھٹی ہوئی ہے جس کی لَے ——— دیکھنا!

سارے ستارے چھپ گئے
ماہ تمام بھی چھپ ——— مٹ گیا!
صبح کی دھند میں مٹے
کُہر میں کھو گئی فضا ——— سب فضا!

تھکے تھے وہ تو رات کے
رات گئی، سب چلے گئے ——— کیا ہوا؟
اے مری روح ناتواں!
آگیا دن کا اب سماں ——— غم نہ کھا!

بوڑھا بیراگی

دولت کی مری نظروں میں ذرا بھی قدر نہیں، کچھ قدر نہیں،
اور عشق و محبت کی باتوں پر قہقہہ ایک لگاتا ہوں۔
شہرت کی ہوس اک سپنا تھا، اک بے معنی سا خواب حسیں،
جو طفلی کے پردے میں چھپا روپوش ہوا بچپن کا جنوں۔

گر آج مرے ہونٹوں پہ کوئی آتی ہے دعا تو اتنی ہے
اور اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بھی تمنا مجھ کو نہیں۔
اس دل کی مجھ کو ضرورت ہے رہنے دے۔ یونہی اس دل کو
اس کی ہی مدد سے دیکھوں گا میں آزادی کا روئے حسیں!

جیسے جیسے جیون کے دن انجام سے ملتے جاتے ہیں۔
پہلے سے زیادہ کثرت سے یہ لفظ زباں پر آتے ہیں۔
"اک ایسی ہمت میری روح کے ہر پردے پر چھا جائے
جو موت و حیات کے رستوں پر اک دُھن میں مجھ کو چلا جائے!"

شام اور شامِ حیات

جنگ کے ختم ہوتے ہنگامے
شام چُپ چاپ چلی آئی ہے
نورِ شفاف کو پہلو میں لئے
سر پہ اک گنبدِ مینائی ہے

گھاس پتھر پہ پڑے ہیں ہر سو
سینکڑوں جسم جو مردہ ہیں تمام
کچھ سسکتے ہیں کہ بہتا ہے لہو
اُن کا انجام ہے دن کا انجام۔

ذیل کی نظم سے اس بات کا پورا اظہار ہو رہا ہے کہ ایمیل موت کے خیالات کی گرانباری کے باوجود اس کوشش میں رہتی تھی کہ زندگی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے اور یوں اُس کے ذہن کی الجھنیں دور ہو جائیں، مٹ جائیں لیکن ماحول کا اثر اُس پر چھایا ہوا تھا اور موت کا ایک دن معین ہونے کے باوجود اسے نیند رات بھر نہ آتی تھی۔

فقدانِ حیات

نیند لاتی ہی نہیں کوئی مسرت دل کی
یاد مرتی نہیں، ہر وقت بنے جاتی ہے۔
وقف ہے روح مری درد و الم ہی کے لئے
آہ پر آہ وہ ہر لمحہ کئے جاتی ہے

نیند لاتی ہی نہیں کوئی بھی راحت دل میں
ہر گھڑی موت کے سایوں نے مجھے گھیرا ہے
آتے ہیں خواب میں، کھو جاتے ہیں بیداری میں
ایسے سایوں کا مری سیج پہ ہی ڈیرا ہے۔

نیند لاتی نہیں اُمید کا جلوہ کوئی
ایسے سائے ہی مرے پاس چلے آتے ہیں۔
اُن کے غمناک تصور سے مری آنکھوں میں
پہلے دکھ درد کے رنگ اور بڑھے جاتے ہیں

نیند دیتی ہی نہیں کوئی بھی طاقت دل کو
کوئی طاقت مری ہمت کو بڑھاتی ہی نہیں
ایک طوفانی سمندر میں ہے میری کشتی۔
پہلے سے بڑھ کے ہے موجوں کی ہر اک چین جبیں

نیند لاتی ہی نہیں کوئی تمنا میں نئی
دل مرا ایک تمنا ہی سے گھبرایا ہے
ایک ہی دل کی تمنا ہے کہ موت آ جائے۔
بھولے سے بات کہ جس نے مجھے اُلجھایا ہے

میراجی

شعر

جب ملنے کا خیال کروں ہوں زلف و رخ دکھلاتے ہو
برسوں مجھ کو یوں ہی گزرے صبح و شام بتاتے ہو

میر تقی

دو آزاد نظمیں

طوفان

اُٹھا طوفاں ——
گرجتے بادلوں نے آسماں پر کر لیا قبضہ
چمکتی بجلیوں میں چھپ گیا جلوہ ستاروں کا
نظر آتا نہیں مہتاب کا تابندہ چہرہ بھی
قریب و دور ہر جانب
اندھیرا ہی اندھیرا ہے

بہت تاریک ہے ماحول گردابِ حوادث کا
ہوائیں چیختی ہیں اور موجیں تلملاتی ہیں
سکوں دھوکا ہے ہستی اک مسلسل کشمکش کا ہیجانی ہے

بہی جاتی ہے کشتی خود بخود موجوں کے دامن میں
کہاں ہے ناخدا اس کا!
کبھی پانی کی چادر میں یہ چھپ جاتی ہے نظروں سے
کبھی یہ پھر ابھر آتی ہے سطحِ آب پر گویا
اثر اس پر نہیں ہوتا ہے طوفانی تھپیڑوں کا،
بہی جاتی ہے کشتی خود بخود موجوں کے دامن میں۔

کہیں ساحل بھی ہے یا رب!
لئے جاتی ہیں کشتی کو بہا کر کس طرف موجیں
شبِ تاریک میں ظالم اندھیرے میں؟
کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب خورشید مشرق سے طلوع ہوگا
نویدِ دورِ نو لے کر؟
کٹیں گے بند مجبوری!

ضیا فتح آبادی

آرزوئیں!

کاش میں ہوتا ترے اندامِ سیمیں کے لئے
اک معطر ریشمیں ملبوس (جس پر تو کیا کرتی ہے ناز)
مسکراتا میں اپنے طالعِ بیدار پر
دیکھتا میں جب تجھے آغوش میں!

کاش میں ہوتا تری مہکی ہوئی زلفوں کا تار!
جب سحر کے وقت صحنِ باغ میں،
چھیڑتی آکر مجھے موجِ نسیم،
جھومتا فرطِ طرب میں اور چھو لیتا ترے رخسار کو!

کاش میں ہوتا کفِ نازک پہ تیرے جامِ مے!
جب لگاتی تو مجھے ہونٹوں سے پینے کے لئے،
چومتا تیرے رسیلے ہونٹ ہر چسکی کے ساتھ!

کاش میں تالاب کے پانی میں ہوتا اک کنول!
تو اترتی نیلگوں لہروں کے اندر غسل کرنے کے لئے،
اور میں ——
چپکے چپکے دیکھ لیتا —— پتیوں کی آڑ سے
تیرے جسمِ مرمریں کی دلرُبا عریانیاں!!

سعید احمد اعجاز

دو پابند نظمیں

فتنہ و فساد

خرابۂ غم و حسرت ہے رزمگاہِ حیات
فساد و فتنہ سے ڈھلی ہوئی ہی راہِ حیات
تباہ کاریٔ سازش ہے ذرّے ذرّے میں
ستم طرازیٔ شورش ہے گوشے گوشے میں
جبیں پہ گردشِ ایام کی تباہی ہے
شگفتہ چہروں پہ تکفیر کی سیاہی ہے
فجور و فسق سے لبریز ہے فضا ساری
ہوائے تند میں ہے سیلِ ابتلا جاری
قدم قدم پہ ہیں درپیش سو نشیب و فراز
وہ شرک ہے نہیں گنجائشِ وضو و نماز!
گلوں کے رنگ میں چھینٹے ہیں خونِ انساں کے
سکون میں بھی تھپیڑے ہیں موجِ طوفاں کے
بھرے ہوئے ہیں ہلاکت کا روپ تصویریں
نظر میں تیرِ اجل ہے نفس میں شمشیریں
وجودِ ہستیٔ مغرور ہے یزید مزاج
کہ شہریار ضعیفوں سے لے رہے ہیں خراج
جہاں میں اتنی کمی ہے خدا شناسوں کی
کہ تشنگی نہیں بجھتی لہو کے پیاسوں کی

مخمور جالندھری

صبوحی

ترا نام لے لے کے جیتا رہا ہوں
ترا نام لے لے کے جیتا رہوں گا
دل و جاں ہی دے دے کے جیتا رہا ہوں
دل و جاں ہی دے دے کے جیتا رہوں گا
اسی دام میں پھنس کے جیتا رہا ہوں
اسی دام میں پھنس کے جیتا رہوں گا
مجھے نوکِ خارِ محبت کی سوگند
محبت میں ہنس ہنس کے جیتا رہوں گا
تصوّر ترا مونسِ دل رہا ہے
تصوّر ترا مونسِ دل رہے گا
یہ دل نورِ لیلیٰ کا محمل رہا ہے
یہی نورِ لیلیٰ کا محمل رہے گا
ترا ذکر دن رات کرتا رہا ہوں
ترا ذکر دن رات کرتا رہوں گا
زباں سے یہی بات کرتا رہا ہوں
زباں سے یہی بات کرتا رہوں گا

امین حزیں

مذاق

یہ سب کچھ [illegible] کتنی قیامت خیز اور کتنا خوفناک!

میں ایک شام کیفے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس زمانے میں میرے پاس [illegible] کی ایسی ہی صورت تھی [illegible] ۱۹۴۷ء [illegible] سے [illegible] سے خالی [illegible] پیشتر [illegible]

[illegible] تمام [illegible] کوئی نہیں [illegible] چائے کا [illegible] کوئی [illegible] کتاب [illegible] وقت [illegible] کر رہا تھا۔

[illegible] ایک [illegible] کیفے میں داخل ہوا [illegible] قدم [illegible] ہاتھوں کو [illegible] کی طرح فضا میں لہراتا ہوا [illegible] وہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور [illegible] بے تکلف [illegible]

اس نے مجھے دیکھتے ہی ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

آپ [illegible] سب معمول [illegible] یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا اور پیالہ بنانے لگا۔

ہاں تمہیں کوئی کام نہیں ہے! جب دیکھو کیفے میں۔ جب دیکھو کیفے میں۔

آخر کیا [illegible]

کام! میں نے کہا "مجھ جیسے نوجوان وکیل کے پاس بھی کوئی کام ہو سکتا ہے!

اور جب تم جیسے نوجوان وکیل کا باپ ڈسٹرکٹ جج ہو تو صبح سے شام تک چائے پینے کے سوا اور کیا کام رہ جاتا ہے! کیوں؟

[illegible] لگا

[illegible] یہ ہے [illegible] کہ میں ان [illegible] تعطیلوں [illegible] اور لکھنؤ آئے ہیں [illegible] لکھنؤ منتقل ہو جاؤں گا اور وہیں پریکٹس شروع کروں گا۔ دو چار مہینے یہاں اور ہوں۔

تو اس سے کیا ہوتا ہے!

اس سے یہ ہوتا ہے کہ بس اب [illegible] کام کروں گا۔ جب [illegible] سے بازی ہے تو یہاں کام کرنے سے فائدہ!

نسبتاً خوب! ابھی نقص ہے ــــــ غرضکہ مئی تک آپ بالکل خالی ہیں اور دن بھر کیفے میں بیٹھے رہا کریں گے!"

کیفے میں بیٹھوں یا ہوٹل میں، بہر حال مئی تک بالکل خالی ہوں۔"

مزے ہیں بھائی تمہارے۔ کئے جاؤ عیش ــــــ ایک ہم ہیں۔ کولھو کے بیل کی طرح ہر وقت جتے رہتے ہیں۔ ایک چھوڑ دو دو ٹیوشنیں ہیں۔ سارے دن بھاگے بھاگے پھرتے ہیں"۔

دو ٹیوشنیں کس طرح ہیں!

ایک تو وہی پرانی رام نگر والی ٹیوشن ہے اور اب اسکول میں ایک لڑکے کو پڑھانے جاتا ہوں"۔

اچھا! اُس لڑکی کو ابھی تک پڑھا رہے ہو؟

"ہاں کیوں نہیں، وہ تو ہماری مستقل ٹیوشن ہے"۔

بڑے خوش قسمت ہو یار!"

خوش قسمت!

"ہاں اور کیا۔ ایک لڑکی کو پڑھانے سے زیادہ دلچسپ مشغلہ اور کیا ہو سکتا ہے!"

"رہنے دے یار ــــــ" اس کے ہونٹوں پر طنز کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"کیوں؟ کیا میں غلط کہتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"میاں تم اس چکر میں نہیں پڑے ہو سمجھے! ساری دلچسپی دھری رہ جاتی ہے۔ جب آدمی کو دو دو گھنٹے کتے کی طرح بھونکنا پڑتا ہے ــــــ یہ رومان نہیں ہے بھائی صاحب! اس کا نام مزدوری ہے! مزدوری!"

"ایک آدھ ٹیوشن مجھے بھی دلوا دو نا" میں نے اس کی تلخ گفتگو کو رد کرنے کے لئے کہا۔

"تو بہت کی آپ نے ٹیوشن!

معاوضہ کچھ نہیں لوں گا اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر پڑھا دیا کروں گا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔

اس گفتگو کے تین چار دن بعد کا ذکر ہے کہ صدیق مجھ سے کوٹھی پر ملنے آیا۔ میں شام کے کھانے سے فارغ ہو کر چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس وقت یونیورسٹی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی طلبہ کے سیاسی معاملات زیر بحث تھے۔

"آؤ صدیق بیٹھو۔ تمہارے ہی مذاق کی گفتگو ہو رہی ہے" میں نے اس سے کہا

"تمہی میں بیٹھوں گا نہیں۔ معاف کرنا۔ مجھے فوراً ہوسٹل پہنچنا ہے۔ ورنہ کھانا نہیں ملے گا تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی"

"وہ کیا؟"

"ذرا ایک منٹ کے لئے ادھر آجاؤ۔ صرف ایک منٹ کے لئے" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر جانے کے لئے مڑا۔

میں اپنے مہمانوں سے اجازت لے کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

باہر پہنچ کر پہلے تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ پھر بولا "ارے بھئی! وہ — تم ٹیوشن کرنا چاہتے تھے نا — اس کا انتظام ہو گیا ہے"

پہلے تو میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھا لیکن پھر فوراً ہی وہ کیفے والی گفتگو یاد آگئی اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"ہنسی کی بات نہیں ہے" اس نے کہا "میں معاملہ طے کر آیا ہوں"

"معاملہ طے کر آیا ہوں" میں نے ہنستے ہوئے اس کے الفاظ کو دہرایا۔

"واقعی مذاق کی بات نہیں ہے — دیکھو اب پیچھے نہ ہٹنا ورنہ مجھے بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی — منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا"

"اوہو!" میں مصنوعی انداز میں اچھل پڑا۔ "اچھا تو کہاں معاملہ طے کر کے آئے ہو؟"

وہ میرے اس فقرے پر قدرے مسکرایا اور پھر بولا، "وہ حسین ہے نا! حسین الدین! تم تو جانتے ہو اس کو! وہی جو تین سال سے بی اے میں فیل ہو رہا ہے — جس کے ساتھ تم اس دن سینما جا رہے تھے!"

"ہاں ہاں وہی۔ اس کی بہن اس سال ہائی اسکول کا امتحان دے رہی ہے وہ انگریزی میں ذرا کمزور ہے۔ اس کو انگریزی پڑھانی ہوگی"

"مگر ......"

"مگر وگر کچھ نہیں۔ اب تو تمہیں پڑھانا ہی ہوگا قصہ یہ ہے کہ اس روز تم سے کیفے میں باتیں ہوئی تھیں نا! اتفاق سے اسی دن رات کو حسین سے ملاقات ہوئی کہنے لگا میری بہن ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھ رہی ہے۔ اس کو تین چار مہینے قبل اس لئے بلایا تھا کہ یہاں تیاری اچھی ہو جائے گی لیکن ایک مہینہ ہونے کو آیا، ابھی تک کوئی مناسب ٹیوٹر ہی نہیں ملا ہے۔ بڑی پریشانی ہے۔ میں کسی یونیورسٹی اسٹوڈنٹ سے پڑھوانا نہیں چاہتا اور اسکول کے ٹیچر چالیس پچاس سے کم پر راضی نہیں ہوتے اس نے یہ کہا تو مجھے فوراً تمہاری بات یاد آگئی۔ میں نے کہا، میرے ایک دوست ہیں۔ وکیل! مئی میں وہ یہاں سے جا رہے ہیں اور اس وقت تک بالکل خالی ہیں۔ میں ان سے کہوں گا۔ وہ پڑھا دیں گے۔ کہنے لگا، لیں گے کیا؟ میں نے کہا، کچھ بھی نہیں۔ یوں ہی پڑھا دیں گے۔ میرے دوست ہیں اور آسودہ حال ہیں۔ انہیں لینے دینے سے کیا واسطہ! ...."

"کیا کہنے ہیں میری آسودہ حالی کے" میں بیچ میں بول اٹھا "اتنا تو کما نہیں سکتا کہ سگرٹوں کا خرچ نکل آئے"

صدیق نے میری بات کو جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ اپنی داستان سرائی میں مصروف تھا "پھر میں نے حسین کو تمہارے متعلق تفصیل کے ساتھ بتایا۔ وہ تم سے واقف ہے۔ میرے ساتھ تمہیں دو ایک دفعہ دیکھ چکا ہے۔ اب اس دن سے میرے کمرے کے برابر پھیرے کر رہا ہے۔ مگر مجھے فرصت ہی نہیں ہوئی۔ یہاں آنے کی۔ تم رہتے بھی تو ہو اللہ میاں کے پچھواڑے ...."

"ابھی وکیل صاحب!" کمرے میں سے آواز آئی۔ میں بھول گیا تھا کہ چند ملاقاتی اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔

"اچھا تو بات پکی ہے نا" صدیق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رخصت ہوتے ہوئے کہا

"بھئی میں سوچوں گا"

"لاحول ولا قوۃ! اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ اور اب سوچنے کی گنجائش ہی کہاں ہے" "میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں"

"مگر بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا"

"ہاں ہاں بابا تم مذاق کر رہے تھے۔ مانا تم مذاق کر رہے تھے۔ مگر اب یہ مذاق نہیں رہا۔ اب تو ......"

"اور میرے پاس وقت ہی کہاں ہے؟"

"جی ہاں" اس نے جی کو کھینچ کر کہا "آپ کے پاس بھلا وقت کہاں ہے۔ دن دن بھر کیفے میں میں ہی تو بیٹھا رہتا ہوں!"

میں انفعال آمیز ہنسی ہنسنے لگا۔ پھر میں نے کہا "لیکن صدیق! یہ روز روز پڑھانے جانا تو بہت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ میں اس مصیبت کو کیسے بھگتوں گا!"

"روز نہ جا سکو تو نہ سہی ایک دن بیچ کر کے چلے جایا کرنا۔ ہفتے میں تین چار دن پڑھا دینا کافی ہوگا"

"یہ ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

[illegible] کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ [illegible] اس کے سامنے [illegible] کی تو شکایت ہے —— [illegible] یہ کہہ کر وہ اپنی سائیکل پر سوار ہو گیا۔

[illegible] ہیں نے چار نگاہ
[illegible] جواب دیا
[illegible] صداق
[illegible] سامانی

میں نے عشرت کو انگریزی پڑھانی شروع کر دی۔

اب تک میں نے صرف [illegible] [illegible] [illegible] ایسی والہانہ [illegible] مجھے [illegible] انگریزی [illegible] [illegible] ہوتی ہے

پہلے [illegible] [illegible] آسمان کی فضا میں [illegible] رہا تھا۔

صدیق [illegible] بوجھ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] رہتی کہ جیسے مجھے کسی کا انتظار ہے۔ [illegible] کوئی خوبصورت [illegible] چیز [illegible] دو گھنٹے [illegible] عشرت کو پڑھانے میں صرف کر [illegible] معلوم ہوتے۔

ایک دن میں حسب معمول اس کو انگریزی کی کتاب پڑھا رہا تھا۔ اکبر اعظم کا بیان تھا۔ لکھنے والے نے اکبر کی عظمت پر روشنی ڈالی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی [illegible] عظمت کو بھی نہیں بھولا تھا۔ میں اس کے بھاری بھرکم جملوں کی تشریح کر رہا تھا۔ لفظوں کے معنی بھی بتاتا جاتا تھا اور عبارت کا مفہوم بھی۔ ایسے موقعوں پر یعنی جب میں لمبی لمبی تشریحی تقریریں کیا کرتا، عشرت کتاب کو سمیٹے [illegible] رکھ کر اپنی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیا کرتی۔ جب تک میں بولتا رہتا وہ نظروں ہی نظروں میں ڈال کر سنتی اور سر کی خفیف جنبش سے گویا یہ کہتی جاتی: میں سمجھتی ہوں —— میں آپ سے متفق ہوں! لیکن آج میں اس میں کچھ تبدیلی پا رہا تھا۔ آج اس کی نظریں کچھ جھکی جھکی سی تھیں۔ اس کی نگاہ میں وہ چند روز پہلے والا بانکپن نہیں تھا۔ چہرے پر ایک حیا آلود منفعلانہ کیفیت چھائی ہوئی تھی۔

میں یہ رنگ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ "سبحان اللہ! یہ کیا!" میں نے اپنے دل میں کہا، "یہ یکایک عشرت کو کیا ہو گیا! کہیں ایسا تو نہیں کہ میری آنکھوں نے اپنی خاموش زبان میں اس سے کچھ کہہ دیا ہو یا کوئی خوفناک راز اس تک پہنچا دیا ہو! یقیناً ایسا ہی سبب ہے۔ خدا سمجھے ان آنکھوں کو! یہ ہمیشہ اور ہر جگہ مجھ کو آفت میں مبتلا کر دیا کرتی ہیں۔ لیکن آخر وہ کیا بات ہے جو انہوں نے عشرت سے کہہ دی [illegible] اس وقت مومن کا یہ شعر خود بخود لوح ذہن پر ابھر آیا:

[illegible] نے دنیا نئی بنا ڈالی
اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

اور اب مجھے معلوم ہوا کہ عشرت کو پڑھانے میں جو لطف مجھے حاصل ہو رہا تھا اس کا سبب صرف یہی نہیں تھا کہ پڑھانا بذات خود ایک دلچسپ مشغلہ ہے بلکہ یہ بھی کہ میں عشرت جیسی غیرت ماہ دوشیزہ کو پڑھا رہا تھا۔ [illegible] لگ چکی تھی۔

عشرت کی یہ محجوب نگاہی ایک مستقل عادت ہو گئی۔ اب ہمیشہ اس کی آنکھیں جھکی جھکی رہتیں۔ میں پڑھاتا یا پڑھائی کے سلسلے میں کوئی دوسری بات کرتا تو وہ نظریں نیچی کئے سنا کرتی۔ جب وہ نظروں میں نظریں ڈال کر میرے سامنے بیٹھی تھی اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہتی تھی، تو مجھے اس کی آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گرمیوں کے موسم میں صبح کے وقت آسمان کی ٹھنڈی اور صاف شفاف فضا۔ اب اگر [illegible] کبھی اپنی نظریں اوپر اٹھاتی اور لمحہ بھر کے لئے مجھے دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ فضائے آسمانی میں ابر ہجوم کر رہی ہے اور گھٹائیں [illegible] اس وقت آنکھوں کے سامنے ایک بجلی سی کوند جاتی اور میں

برق زدہ سا ہو کر رہ جاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے عشرت کا دوپٹہ سر سے ڈھلک جاتا اور اس کے چمکتے ہوئے سیاہ بال بے نقاب ہو جاتے۔ اُس وقت میری نظریں بے اختیار اس کے چہرے سے ہٹ کر بالوں پر جم جاتیں، اور جم کر رہ جاتیں۔ میں بالوں کی چمک اور آرائش دیکھ کر اس درجہ متاثر ہوتا کہ میری گفتگو کی روانی میں فرق آ جاتا، اور زبان لڑکھڑانے لگتی۔ عشرت اپنے سر کو دوبارہ ڈھانپنے میں عمداً دیر کرتی جب میں اپنے آپ کو سنبھال لیتا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان کو قابو میں لے آتا تو وہ ایک دلفریب ادا سے مسکراتی، نشست کی جانب سے جاتی اور دوپٹے کا دامن دوبارہ سر پر ڈال لیتی۔

ایک دن عشرت کچھ پڑھ کام کر رہی تھی اور میں بیٹھا خاموشی کے ساتھ سگریٹ پی رہا تھا۔ یکایک میں نے اپنے قدموں پر ایک چوڑی کا ٹکڑا پڑا ہوا دیکھا۔ اسے دیکھ کر مجھے چند ماہ پیشتر کا ایک معمولی سا واقعہ یاد آ گیا۔ میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ دہلی کی ایک تنگ و تاریک لیکن رومان میں لپٹی ہوئی گلی میں سے گذر رہا تھا۔ زمین پر دو تین چوڑیوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے دکھائی دئیے۔ میں نے جھٹ ان کو موتیوں کی طرح چن لیا اور جھاڑ پونچھ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس پر وہ دونوں دوست مجھ پر خوب ہنسے لیکن میں ایسی چیز کو جس کا تعلق نسائیت اور دوشیزگی سے ہو زمین پر پڑا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ یہاں بھی جب میں نے چوڑی کا ایک ٹکڑا فرش پر پڑا ہوا دیکھا تو جھک کر اسے اٹھا لیا اور اپنے سامنے میز پر رکھ لیا۔ پھر قدرتاً میرا دھیان عشرت کے ہاتھوں کی جانب منتقل ہوا۔ اس کا اس وقت داہنا ہاتھ جس میں وہ پنسل تھامے ہوئی تھی کھلا ہوا تھا۔ میری نظر فوراً اس پر پڑی۔ ساتھ ساتھ عشرت نے بھی میری طرف دیکھا۔ اس میں شربتی رنگ کی دو لہرئے دار چوڑیاں تھیں۔ دوسرا ہاتھ میز کے نیچے تھا اور میں اس کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن تھوڑے سے توقف کے بعد عشرت نے اس ہاتھ کو بھی دوپٹے سے باہر نکالا اور کاپی پکڑنے کے بہانے سے میز پر رکھ لیا۔ اس ہاتھ میں صرف ایک چوڑی تھی۔

اس دن جب میں رخصت ہونے لگا تو میں نے میز پر سے اپنے فاؤنٹن پن اور سگرٹ کیس کے ساتھ اس چوڑی کے ٹکڑے کو بھی اٹھا لیا، اور عشرت کے سامنے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یہ ایک شوخی تھی۔ مگر آہ، ایسی شوخی جس میں محبت کی ہزاروں مجبوریاں اور لاچاریاں چھپی ہوئی تھیں۔

اگلے دن وہاں پہنچا تو اپنی شوخی کو بالکل بھول چکا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پڑھاتے پڑھاتے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کانچ کی کوئی چیز پاؤں کے نیچے دب کر ٹوٹ گئی۔ جھک کر جو دیکھا تو ایک ٹوٹی ہوئی چوڑی قدموں میں پڑی ہوئی نظر آئی۔ نگاہیں دیوانہ وار عشرت کے ہاتھوں کی طرف لپکیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں صرف ایک ایک چوڑی تھی۔

اُس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوئی، یہ میں نہیں بیان کر سکتا کسی طرح نہیں بتا سکتا۔ اگر عمر بھر جذبات کی ترجمانی کا فن سیکھتا رہوں تب بھی نہیں بتا سکوں گا۔

ایک دن پڑھانے کے دوران میں میں نے سگرٹ سلگایا، اور ایک لمبا سا کش لے کر سارا دھواں عشرت کی طرف پھینک دیا۔ اگر اس کو میری یہ حرکت پسند نہ آتی تو وہ اپنی پیشانی پر ایک ہلکی سی شکن ڈال کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ دھوئیں سے قدرے پریشان ضرور ہوئی، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک نہایت خفیف مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے پھوٹ کر سارے چہرے پر دوڑ گئی۔

اس کے بعد میں اکثر یہ شرارت کیا کرتا اور اُس کو سگرٹ کے دھوئیں میں نہلا دیا کرتا۔ معلوم نہیں اس سے میرا کیا مقصد ہوتا تھا۔ شاید میں اس طرح اُس کو اپنے سے قریب تر محسوس کرتا تھا، گویا سگرٹ کا دھواں میرے بازو تھے جو اس کے گرد حلقہ کر لیتے تھے اور اُس کے حسین چہرے کو اپنی آغوش میں لے لیا کرتے تھے۔ یا غالباً میں یہ سمجھتا تھا کہ میرے سگرٹ کا دھواں میری سلگتی ہوئی روح کا پیغام بن کر اُس تک جائے گا، اور میری لب ناآشنا محبت کا افسانہ اس سے کہے گا۔ بہرحال مقصد سے قطع نظر، جب کبھی میں ایسا کرتا، وہ بے انتہا حسین معلوم ہوتی، گویا ایک سبک روح پری ہے جو بادلوں میں اُڑی چلی جا رہی ہے!

مارچ کا آغاز تھا۔ مچھروں کی بھنبھناہٹ گرمی کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ ایک مچھر عشرت کے رخسار پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں بھلا یہ کیونکر دیکھ سکتا تھا کہ کسی جاندار کا جسم عشرت کے جسم سے مس کرے، اور وہ بھی خون چوسنے کی خاطر! میں نے کہا "تمہارے چہرے پر مچھر بیٹھا ہے۔" رخسار کا لفظ میں استعمال نہ کر سکتا تھا۔ عشرت نے ہاتھ کی ایک جنبش سے اُسے اڑا دیا۔ اسی طرح ایک دن ایک مچھر اس کے کھلے ہوئے بازو پر آن بیٹھا۔ میرے ہاتھ میں پنسل تھی۔ میں پنسل کو اُس کے قریب لے گیا اور وہ اڑ گیا۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ عشرت میرے لکھے ہوئے اردو جملوں کا انگریزی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ داہنے ہاتھ سے تو ظاہر ہے کہ وہ لکھ رہی تھی اور بائیں ہاتھ سے کاپی کو تھامے ہوئے تھی۔ یہ ہاتھ چونکہ ایک جگہ رکھا ہوا تھا اور جنبش نہیں کر رہا تھا۔ اس لئے اس کی پشت پر ایک مچھر آ کر بیٹھ گیا اور اپنا ڈنک چبھو کر خوا

چھوٹ گئی عشرت نے جھٹ سے [illegible] کو اٹھا لیا۔ وہ جب کاپی ڈالے نیچی نظروں سے مجھے دیکھی۔ اُس کو کچھ سمجھانے کے لئے میری مدد کی ضرورت تھی یا شاید مجھے خدمت کا موقع دے رہی تھی۔ [illegible] بڑی مشکل میں تھا تو اس سے کچھ ملاقات بھی کرتی رہتی تھی [illegible] اُس کو لڑکی [illegible] پڑھا لیا کرتا تھا [illegible] وقت حسین [illegible] ہو گئی [illegible] ہوتا تھا لیکن [illegible] کچھ وقت [illegible] نہیں [illegible] کوشش [illegible] نہیں کر سکتا۔

[illegible] نہیں [illegible] اور [illegible] سے [illegible] بیان میں نہیں۔ لئے نہیں [illegible] تھی [illegible] اور شب [illegible] کی [illegible] بھی [illegible] سال [illegible] آپ [illegible] چاکر [illegible] دن میں نے [illegible] عشرت کو [illegible] کا کام اپنے ذمے لیا تھا اس دن مجھے کیا معلوم تھا کہ [illegible] میری زندگی کا ایک نیا دور ثابت ہوں گے اور میرے دل کی [illegible] اور [illegible] کے خوف سے معمور کر دیں گے پھر مجھے چار سال سے [illegible] یاد آتے [illegible] جب میں نے ایک ماہ پیکر دوشیزہ سے محبت کی اور [illegible] کی [illegible] عشق اور [illegible] اُس پر نثار کرنے کے بعد بھی ناکام [illegible] اُس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ اور آئندہ میرے دل کے ٹوٹے ہوئے [illegible] میں کبھی اتنی صلاحیت نہ ہوگی کہ اُس پر محبت کا گیت گایا جا سکے۔ مگر [illegible] مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ قبل از وقت بجھائی ہوئی شمع بہت جلد اور بہت تیزی کے ساتھ آگ پکڑتی ہے اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ شدت کے ساتھ جلتی ہے۔ محبت کی چوٹ کھایا ہوا دل مزید زخموں اور نئی نئی جراحتوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور انہیں زخموں اور جراحتوں کو وہ زندگی کا درمان سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ زخمی ہوتا ہے۔ اور زخم مندمل نہیں ہونے پاتا کہ پھر زخمی ہوتا ہے۔ پھر زخمی ہوتا ہے پھر زخمی ہوتا ہے زندگی ایک رستا ہوا ناسور بن کر رہ جاتی ہے۔

اس طرح میں دن دن بھر اور رات رات بھر عشق کے فلسفے پر اور اپنی رہین محبت زندگی پر غور کیا کرتا۔ اور پھر جب عشرت کو پڑھانے جاتا تو سارا فلسفہ دانی اور خیال آرائی بھول کر اُس کو دیکھنے میں محو ہو جاتا۔ کتاب پڑھتے وقت تو میرا ذہن بہت معروف ہوتا تھا۔ لیکن جب زبانی سبق ختم ہو جاتا اور وہ کچھ لکھنے لکھانے کا کام کرنے لگتی تو مجھے فرصت کے ساتھ اس کو دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ میں اپنی نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیتا اور بے دردی کے ساتھ مسلسل اس کو دیکھے جاتا۔ وہ اپنی جھکی ہوئی نظروں کے باوجود میرے دیکھنے کو محسوس کر لیتی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک انتہائی نازک مسکراہٹ پھیلنے لگتی اور چہرے کے شہابی رنگ میں سرخی کی ایک اور جھلک پیدا ہو جاتی گویا ایک گلاب کا پھول ہے جو سورج کی تیز کرنوں کو برداشت نہیں کر سکتا اور کملا رہا ہے۔ میں پھر بھی اُسے دیکھے جاتا۔ اُس کا متناسب چہرہ، سبیح گردن، اور صندلی باہیں دیکھ کر یہ شدید خواہش ——— چڑھے ہوئے دریا کے طوفان کی طرح شدید خواہش! ——— میرے دل میں پیدا ہوتی کہ کتاب، کاپی اور پنسل اس سے چھین لوں، اور اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس سے کہوں، عشرت! میری دولت! میری زندگی! مجھے تم سے محبت ہے! لیکن ظاہر ہے کہ میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی خواہش کو دبانا پڑتا۔ اور اُس کے دبانے میں ایک غیر معمولی ——— فوق الانسانی ——— قوت سے کام لینا پڑتا۔ پھر میں اپنے دل میں سوچتا کہ کیا واقعی میری محبت محتاجِ اظہار ہے؟ کیا وہ ظاہر نہیں ہو چکی؟ اور کیا عشرت نے محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا؟ بیشک میری زبان پر کوئی لفظ نہ آیا، اور عشرت نے بھی اپنی زبان سے کچھ نہ کہا، لیکن کیا واقعی ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک دوسرے سے کچھ نہ کہنے کے باوجود ہم نے پیار اور محبت کی باتیں کی ہیں، عشق کی منزلوں کو دوش بدوش طے کیا ہے، ایک دوسرے کو پہچانا ہے، سمجھا ہے؟ کیا کوئی دوسرا مرد ہے جو میری طرح عشرت کے قلب و روح کی گہرائیوں کو سمجھتا ہو جو اُس سے اس قدر اور اتنا واقف ہو جتنا میں ہوں؟ پھر میں تصور کی آنکھوں سے عشرت کو ایک خوفناک دیو، اُس کے ہونے والے شوہر کی آغوش میں دیکھتا، اور میری حالت اُس شخص کی سی ہو جاتی جو خواب میں ایک ہیبت ناک منظر دیکھ کر چیخنا چاہتا ہو، اور نہ چیخ سکتا ہو۔ اتنے میں عشرت اپنی کاپی میری طرف بڑھا دیتی یا کوئی سوال کر بیٹھتی اور میں اس ڈراونے خواب سے بیدار ہو جاتا۔

وقتاً فوقتاً صدیق سے بھی ملاقات ہوتی رہتی۔ کبھی وہ باتوں باتوں میں پوچھ بیٹھتا "کہو بھئی! پڑھائی ہو رہی ہے؟"

"ہاں! ہو تو رہی ہے"، میں جواب میں کہتا۔

"کیسا کام ہو رہا ہے! پاس ہو جائے گی؟"

"ہاں انگریزی میں تو ہو جائے گی اور مضمونوں کی نہیں کہتا۔ . . .

نہیں ——— میرے خیال سے نکل ہی جائے گی۔ امتحان میں بڑی ذہین لڑکی ہے"، میں بے تعلقی کے انداز سے کہتا۔

ایک دن یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ صدیق یکایک بولا "آپ کو تو اُس سے اچھی خاصی محبت ہو گئی ہو گی؟"

میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میں نے تیزی سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس

کے ہونٹوں پہ ایک شرارت آمیز مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شوخی کی چمک۔!

تجت کرکے میں اُس سے کیا لے لوں گا؟" میں نے بے پروائی سے کہا

وہ ہنس پڑا اور بات ختم ہو گئی۔ مجھے یہ خیال کرکے خوشی ہوئی کہ میں نے اپنے دل کو بہت کامیابی کے ساتھ چھپایا اور چہرے سے کسی کیفیت یا جذبے کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

صدیق نے یہ بات محض شرارتاً کہی تھی، ورنہ وہ حقیقت سے بالکل بے خبر تھا۔ مگر اُس نے لاعلمی میں میری دل کے نازک ترین تار پہ انگلی رکھ دی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں اُس سے کھل جاتا۔ اور کہتا "کم بخت! خدا تجھے غارت کرے تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے کس آفت میں مبتلا کر دیا! مذاق ہی مذاق میں دل کا خون ہو گیا!" لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس باب میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا اور خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ وہ بے شک میرا بے تکلف دوست تھا لیکن حسن سے بھی اُس کے روابط گہرے تھے؛ اور یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ میں اُس سے عشرت کے متعلق اپنے جذبات کا ذکر کرتا۔

محبت انسان کو زندگی کا ایک بہت بڑا فریب ہے۔ یہ فریب کتنا ہی حسین اور کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، ہے بہرحال فریب! میں بھی اس فریب میں مبتلا تھا جانتا تھا کہ عشرت کبھی میری نہیں ہو سکتی پھر بھی اُس کی محبت میں سرشار رہتا۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب میں اُس کو انگریزی کا ایک آخری سبق پڑھا کر اُس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں گا، پھر بھی ایک پُر دوران مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن زمانہ حقیقت کو تو نہیں ٹھکرا سکتا! چنانچہ وہ دن بھی آ ہی گیا ——— وہ دن جب میں عشرت کو آخری سبق پڑھانے کے لئے گیا۔

کورس تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ میں اُس کو کتاب سے بعض اہم اور مشکل مقامات سمجھاتا رہا۔ کوئی غیر معمولی بات ظہور پذیر نہ ہوئی۔ سوائے اس کے کہ دل جدائی کے خیال سے کانپ اُٹھتا تھا، اور عشرت کی آنکھیں پہلے سے زیادہ مجھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جب چلنے کا وقت قریب آیا تو ایک فوری جذبے کے ماتحت میں نے عشرت سے کہا، ذرا اپنی کاپی دو تو میں تمہارے لئے چند جملے لکھ دوں۔ اس نے کاپی دے دی اور حسب ذیل جملے بے اختیار میرے قلم سے ٹپک پڑے۔

"زندگی اور ناکامی ایک ہی بات کے دو نام ہیں۔
تدبیر کی چلتی نہیں تقدیر کے آگے۔
بعض دفعہ دل کی باتیں صورت سے بھی ظاہر ہو جاتی ہیں"۔

میرا خیال ہے کہ جس وقت میں یہ جملے لکھ رہا تھا، اُس وقت یقیناً میرے ذہن کا پرتو میرے چہرے پر پڑ رہا ہوگا۔ گویا میں ان جملوں کو صرف عشرت کی کاپی پر ہی نہیں بلکہ اپنے چہرے پر بھی تحریر کر رہا تھا۔ میں اس لئے کہتا ہوں کہ لکھنے کے دوران جب میری نظر عشرت پر پڑی تو میں نے اُس کے چہرے پر حسن کی ایک نئی بہار دیکھی۔ اُس وقت اس کی حالت بالکل اُس دوشیزہ کی سی تھی جس سے پہلی بار محبت کا اظہار کیا جا رہا ہو۔ رخسار حیا کی سرخیوں سے گلستاں بنے ہوئے تھے، ہونٹوں پر مسرت رقص کر رہی تھی، اور آنکھوں میں جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی۔

لکھ چکا تو کاپی عشرت کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے جملوں کو پڑھا اور اتنی تیزی کے ساتھ کہ اُس کی نظر صفحے پر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پڑھ کر اُس کے چہرے کی کیفیات متغیر ہو گئیں۔ رخسار دہکتے ہوئے انگارے بن گئے۔ ہونٹوں پر ایک موج برق نمایاں ہوئی اور وہیں ساکت ہو کر رہ گئی۔ آنکھیں یک لخت چمکیں اور جھک گئیں۔ گویا ایک بتکدے کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اب صورت حال میری برداشت سے باہر ہے، اور وہ غیر معمولی اور فوق الانسانی قوت ضبط جس سے میں اب تک کام لیتا رہا ہوں جواب دے رہی ہے۔ اس لئے میں کرسی سے اٹھا اور عشرت پر نظر ڈالے بغیر خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

یہ آخری سبق تھا جو میں نے عشرت کو پڑھایا!

امتحان سے لے کر نتیجہ برآمد ہونے تک کا زمانہ ایک طویل وہ کرب تھا۔ جس کی تفصیل نہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں، نہ کر سکتا ہوں۔

مئی میں نتیجہ شائع ہوا۔ عشرت پاس ہو گئی۔ وہ ابھی وطن واپس نہیں گئی تھی اور نتیجے کے انتظار میں یونیورسٹی ہی میں ٹھیری ہوئی تھی۔ جس دن نتیجہ ظاہر ہوا اُسی دن دوپہر کو میں مبارکباد دینے اس کے مکان پر گیا۔ مئی کے مہینے کی ایسی دوپہر جیسی کچھ گرما اور شعلہ بار ہو سکتی ہے ویسی وہ دوپہر تھی لیکن جسم کو جلانے والی آگ اس آگ کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ جو میرے دل کو آتشکدہ بنائے ہوئے تھی اور روح کو پھونکے ڈالتی تھی۔

مکان پر پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع کرائی حسین دوڑا ہوا باہر آیا۔ وہ معمول سے زیادہ خوش تھا اور اپنی ممنونیت کے اظہار میں مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس کمرے میں داخل ہوا جس میں میں اپنی جوانی دفن کر چکا تھا۔ عشرت گوناگوں جذبات کا مجسمہ بنی ہوئی دروازے

کے قریب کھڑی تھی۔

حسین نے [illegible] بچے ہیں کہنے لگی مبارک ہو! پاس ہو گئیں تم

"یہ آپ کی [illegible] کا [illegible] ہے" اس نے جواب دیا۔

پھر میں نے [illegible] حقیقت یہ ہے کہ [illegible] نے بہت ہی زیادہ محنت کی تھی۔ "یہ واقعی ہماری [illegible] ہیں"

"ابھی نہیں محنت اس سے [illegible] کی [illegible] سے پاس ہوئی"

"یہ زیادتی ہے۔" [illegible] میں نے کہا "آپ ان کی مدد [illegible] کام لے رہی ہیں [illegible] محنت کی تھی [illegible] جناب آپ ان لوگوں کو انعام [illegible] سکتے ہیں!"

"انعام و اکرام کچھ نہیں ملے گا" غلط بات ہے حسین نے کہا۔

"جس وقت آپ نے سنا [illegible] تو کیا انعام ملنا چاہیئے نہیں؟"

غرض اس [illegible] رہا تھا لیکن میں [illegible] اور قہقہوں کے شور میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔ میری حالت اس شخص کی سی تھی جو [illegible] گھر کو [illegible] کر شعلوں کے [illegible] منظر سے لطف اٹھائے یا خود اپنی [illegible] تباہ کر کے [illegible] مصنوعی زندہ دلی کا اظہار کرے۔

اس ملاقات سے فارغ ہو کر میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا تو میری حالت عجیب تھی یہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں کہیں سے زخمی ہو کر آیا ہوں [illegible] کی چوٹ روح کی گہرائیوں تک محسوس ہو رہی تھی

یہی وہ چوٹ تھی جو آج تیس سال گذرنے کے بعد بھی تازہ ہے جو شاید عمر بھر تازہ رہے گی

اور یہ سب ایک مذاق تھا۔ اف! خدا کی پناہ!!

اختر انصاری دہلوی

غزل

مدت سے غمِ دل تھا تسکیں کا تمنائی
ساقی کی نگاہوں نے کی حوصلہ افزائی

کس دیدہ دلیری سے خورشید نے اپنائی
اک آئینہ سیما کی شانِ سحر آرائی

ہیں غنچۂ بے مایہ میں لالۂ صحرائی
اور اُن کی نگاہوں کو ذوقِ چمن آرائی

بوئے گلِ تر بن کر بادِ سحری آئی
بادِ سحری آئی، پیغامِ جنوں لائی

پاکیزہ سرشت الفت ہے پھول کی ہم قسمت
گریہ گہر افشانی۔ خندہ چمن آرائی

تم خندۂ بے پروا۔ ہیں گریۂ مجبوری
محرومِ نظر دنیا، خاموش تماشائی

میرے غمِ پنہاں کے دریا کو میسر ہے
ہر موج کی بے تابی ہر بحر کی گہرائی

یہ برقِ تبسم کی تاثیر نہ ہو فطرت
بے نور ہے بینائی، خاموش ہے گویائی

عبدالعزیز فطرت

صدمہ

ہمنشیں! سیلِ مصائب کی گرانباری نہ پوچھ
ایک شاعر سے زمانے کی رواداری نہ پوچھ!

میری قسمت کو ہے نسبت گردشِ ایام سے
زندگی میری ہے ناواقف سکوں کے نام سے

فکرِ کاروبار میں رہتے ہیں گم قلب و دماغ
دل شکن افکار میں رہتے ہیں گم قلب و دماغ

گاہ بھر دیتا ہے دل کے جام میں زہرِ ملال
مارواڑی کا تصور اور بنیئے کا خیال

گاہ یاد آ کر اٹھا دیتا ہے اک وحشی سی ہوک
دوستوں کی سرد مہری، رشتہ داروں کا سلوک

شاعری اور آہ ایسے جاں گسل حالات میں
آ نہیں سکتی جوانی کی مہک نغمات میں

جب کوئی نغمہ مچلتا ہے دلِ بیدار میں
کھولتی ہے آنکھ رنگینی کوئی افکار میں

فکر کے سانچے میں اس کو ڈھالنے لگتا ہوں جب
شعریت کی پستیوں سے پالنے لگتا ہوں جب

آہ! صدمہ اک نہ اک آ کر حیاتِ زار کا
توڑ دیتا ہے تسلسل دل نشیں افکار کا

روحِ پژمردہ سمٹ جاتی ہے، پھٹ جاتا ہے دل
آ کے اک وجد آفریں مرکز پہ ہٹ جاتا ہے دل

فکرِ نازک اک ذرا سی ٹھیس سہہ سکتی نہیں
دلکشی قائم کسی نغمے کی رہ سکتی نہیں

باقی صدیقی

مانگے کی کتابیں

[illegible] ہیں

[illegible] ہندوستان [illegible] لکھے

میں [illegible] بہت جب

[illegible]

[illegible] ایک لونی ہوئی

[illegible]

لکھے [illegible] شروع

کردیں [illegible] اور

یہ کہتے ہی [illegible] انہوں نے [illegible] نکال کر

ایک [illegible]

[illegible] اور دوسرے سرگوشیانہ انداز میں ایک

اہم سوال [illegible]

میرے خیال میں ایک [illegible] کے دینے کہا۔

[illegible] تمام ہندوستان [illegible] کم ایک لاکھ ممبر ہوں۔

مبارک صورت ایک [illegible] کم از کم ایک [illegible]

کی کتابیں [illegible] کا انتظام ہوسکتا ہے اور

ادب [illegible] کرسکتا ہے

زبیدہ نے خوش ہوکر کہا۔ واہ کیا اچھی تدبیر ہے نہ جانے پہلے کسی کو کیوں نہ سوجھی۔ اچھا تو اس کو شروع کس طرح کیا جائے!

میں نے کہا ہاں شروع کرنے کی بات ذرا مشکل ہے۔ اس لیگ کا صدر کون ہو قواعد وضوابط کیا ہوں گے۔ کارروائی کس زبان میں ہوگی۔ چندہ اور چندے کا حساب رکھنے کے لئے اس دنیا میں ایک ایماندار آدمی بھی ڈھونڈنا ہوگا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مولانا یہ کیا قصہ چھیڑ دیا آپ نے!

مولانا نے مجھے چپ کرانے کے لئے کہا۔ عزیزمن۔ تم تو ہر چیز کو سادہ [illegible] کی طرح دیکھنے کے عادی ہو یہ سب باتیں دوستوں کی ہمدردی اور [illegible] حل کی جاسکتی ہیں۔ پاپیگنڈے کے لئے پمفلٹ چھاپنے چاہئیں جن میں اس بات کی وضاحت کی جائے کہ مانگے کی کتابیں پڑھنے کے کیا کیا نقصانات ہیں۔ [illegible] میں تو اس بات کو بہت بری طرح محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ کیوں اپنے ادب کی عملی سرپرستی قبول نہیں کرتا۔ اگر ہم لوگ ہمت کرکے اس کام کو ہاتھ میں لے لیں تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ ان ایک لاکھ ممبروں کی بدولت ہمارے ادب کی کایا پلٹ سکتی ہے۔

گویا کلب کہئے! یہ آج کل کا فیشن ہے جو [illegible] زناف کے بندروں سے شروع ہو کر [illegible] تک جا پہنچی۔ اور اب آپ اسے ادب پر آزمانا چاہتے ہیں!“ میں نے ذرا تیز ہوکر کہا۔ بھلا کہیں اس پمفلٹ بازی سے ہمارے پڑھے لکھے طبقے کی عادت کو بدلا جاسکتا ہے یہ آپ کی لیگ ایک قسم کی کاغذی جماعت بن کر رہ جائے گی۔ آپ کسی کو عہدنامے پر عمل کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔ [illegible] آپ بھی کیسی رومانی باتیں کرتے ہیں“

زبیدہ ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے آپ کسی کو کتابیں خریدنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔ یہ محض ایک خیالی اور رومانوی سی تجویز ہے۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تمہاری یہ ضدی بچوں کی طرح باتیں کرنے کی عادت ابھی تک نہیں گئی . . . . .

. . . .

اب میں بذات خود اس لیگ کے قیام کے متعلق غور کرتا ہوں۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ میں نے کیوں مولانا کی مخالفت کی۔ لیگ اگر خارجی حالات کی وجہ سے ایک اجتہادی جماعت نہ بن سکے تو کم از کم ایک سماجی جماعت ضرور بن سکتی ہے۔ ٹمپرنس لیگ کی طرح انسداد شراب خوری کی طرح مانگے کی کتابیں پڑھنے والوں کا بھی انسداد کیا جاسکتا ہے یا کم از کم اُن کے بہتر جذبات کو اس بری عادت کے خلاف ابھارا جاسکتا ہے پمفلٹ لکھے جائیں۔ جلسے کئے جائیں۔ جلوس

نکالے جائیں۔ ذرا خیال کیجئے کہ شہر کے سب ادیب مل کر بازاروں سے ایک جلوس کی شکل میں گزر رہے ہیں۔ ہم سب نے کاغذ کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں۔ گتوں پر موٹے موٹے حروف میں خوبصورت اور اصلاحی مقولے درج ہیں۔

"مانگے کی کتابیں پڑھنا حرام ہے"

"ایک اونٹ کو سوئی کے ناکے میں سے گذارا جا سکتا ہے لیکن مانگے کی کتابیں پڑھنے والے کو جنت کے دروازے سے نہیں گذارا جا سکتا"

"جو مانگے کی کتابیں پڑھتا ہے وہ ملک سے غداری کرتا ہے"

اور مولانا اپنی پہننے والی لمبی کاغذی ٹوپی کو آگے بڑھا کر کہتے ہیں "اللہ جو شوق دے ـــــ!"

ہم سب مل کر کہتے ہیں "تو کتابیں پڑھا کرو"

مولانا پھر کہتے ہیں "تم کیا چاہتے ہو؟"

ہم جواب دیتے ہیں "مانگے کی کتابوں [illegible] غلطی ہوتی [illegible] کہنا چاہئے تھا۔ کتابوں کی فروخت [illegible]

خرید کر پڑھنے والا زندہ باد

مانگے کی کتاب پڑھنے والا

مردہ باد!" ہم سب مل کر پکارتے ہیں اور اس طرح سے شور و غوغا ہوا یہ جلوس بازاروں سے گزر جاتا ہے۔ اقتصادی حالات سے قطع نظر ایک نفسیاتی نکتہ بھی ہے کہ جو لطف مانگے کی کتابیں پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے وہ انہیں خرید کر پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کتاب خرید کر آدمی لیتے ہی بس سوچنے لگ جاتا ہے کہ [illegible] جو تین روپے خرچ کر کے یہ کتاب حاصل کی ہے، اچھی بھی ہے یا نہیں۔ پڑھتے وقت بھی یہی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ روپے ضائع ہو رہے ہیں۔ روپے ضائع کئے [illegible] کتاب کے محاسن پر نگاہ کم جاتی ہے۔ لیکن اگر کہیں ایک فقرہ بھی کمزور آ گیا تو بس جی جل ہی جاتا ہے۔ حرامزادہ ادیب بنا پھرتا ہے..... لکھنے کی تمیز نہیں..... کیا واہیات کتاب ہے..... اس پبلشر کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر یوں ہی تین روپے لٹا دیئے..... بس ایک تاجرانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے خلاف اگر مانگے کی کتاب ہو تو آدمی سدا خوش رہتا ہے۔ دل میں ٹھنڈک اور آنکھوں میں طراوت آتی ہے۔ آدمی کتاب کے محاسن و عواقب کو صحیح طور پر پرکھ سکتا ہے۔ اس کے نقائص کو مصنف کی بشری اور فطری کمزوری یا خارجی حالات کی مجبوری کہہ کر اسے دل ہی دل میں معاف کر دیتا ہے۔ اس کی خوبیوں کو سراہتا ہے۔ اسے بار بار پڑھتا ہے اور اسے لوٹا دینے سے ہچکچاتا ہے۔ ہائے کتنی اچھی کتاب ہے اور پھر اسی لالچ میں اکثر اسے گم کر دیتا ہے اور پھر اس کا دوست تنگ آ کر ایک اور جلد خرید لیتا ہے۔ کیونکہ اسے کتاب کی ضرورت ہے۔ اگر ضرورت نہ ہوتی تو خریدتا کیوں۔ غرضیکہ مانگے کی کتاب پڑھنے سے ایک خریدار اور بڑھ گیا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اگر ہندوستان میں ہر شخص مانگے کی کتاب پڑھے تو ہر ایک کتاب کی اشاعت کروڑوں تک جا پہنچے۔ بجائے اس کے کہ لوگ مانگے کی کتابوں کے خلاف جہاد کریں یہ بہتر ہوگا کہ ایک ایسی لیگ بنائی جائے جو ہر ہندوستانی کے ہاتھ میں ایک مانگے کی کتاب پہنچانے کا انتظام کرے۔ دیکھئے پھر ادب ترقی کرتا ہے یا نہیں۔ اور لوگوں میں صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ میں خود ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دنیا کے بہترین ادیبوں کی کتابیں مانگ تانگ کر پڑھی ہیں اور جب بھی میں خود کوئی کتاب خریدتا ہوں تو مجھ سے مانگ کر پڑھنے والے دوست اسے مجھ سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لطف کتاب میں نہیں بلکہ اسے مانگنے میں ہے۔ محبوب میں نہیں بلکہ تمنائے محبوب میں۔

اقتصادی حالات کے پیش نظر مولانا کا شکوہ صحیح ہے اور ہندوستان کے ادیبوں کی غریبی اور مظلومی بھی ایک امر مسلم ہے لیکن اس کا علاج یہ ایک لاکھ ممبروں والی لیگ نہیں کر سکتی۔ خارجی حالات یہ ہیں کہ ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بلحاظ آبادی دس فی صدی سے زیادہ نہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ برائے نام پڑھے لکھے ہیں جو نہ ہماری کوثر میں دھلی ہوئی زبان کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ساہتیہ پرشد کی ادبی موشگافیوں کو۔ جو لوگ باقی رہ گئے ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو محض اوکاڑہ منڈی اور بمبئی [illegible] کی روئی کے بھاؤ معلوم کرنے کے لئے اخبار خریدتے ہیں۔ اگر کوئی رسالہ ہاتھ لگ جائے تو پہلے اس میں شری کرشن مہاراج کی مورت تلاش کرتے ہیں اور اگر نہ ملے تو رسالہ پھیر دیتے ہیں۔ پھر جمنو منو حلوائی ہیں جو اپنے گاہکوں کے لئے روز ایک آنہ دے کر اخبار خریدتے ہیں۔ پھر اس اخبار کی جو حالت ہوتی ہے خدا کی پناہ۔ ایک ایک ورق الگ کیا جاتا ہے۔ کالم در کالم الگ الگ پھاڑ لئے جاتے ہیں۔ ایک گاہک لوہے کی تین ٹانگوں والی کرسی پر بیٹھا غٹا غٹ لسی پی رہا ہے اور جناب شاد [illegible] کا سنسنی خیز افسانہ پڑھ رہا ہے۔ دوسرا گاہک سڑک کے کنارے چارپائی پر آسن جمائے جلیبیاں کھا رہا ہے اور ساتھ ساتھ شہزادہ صاحب کے لکھے ہوئے سیاسی چٹکلے پڑھتا جاتا ہے۔ اتنے میں تیسرا گاہک آ کر اخبار پر جھپٹا مار کر کہتا ہے "لائیں، [illegible] لینڈ کا کیا ہوا؟" غرض کہ شام ہونے تک اخبار سینکڑوں ہاتھوں میں سے گذر جاتا ہے۔ پھر دکان بند کرتے وقت حلوائی اسی اخبار میں باسی پکوڑیاں لپیٹ کر کسی مجھ ایسے غریب ادیب کو دے دیتا ہے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را

پھر وہ لوگ ہیں جنہوں نے پنشن حاصل کر لی ہے یا ٹھیکیداری سے فراغت پائی ہے اور جمع پونجی سے ایک مکان یا کوٹھی بنا لی ہے اور اب عافیت کا سدھارنے

کی فکر میں [illegible] کوئی نہ تھا کوئی [illegible] کوئی کسی فرم کا منیجر یا
ملک کا [illegible] بیٹھے ہیں اور اپنے [illegible]
[illegible] کیا [illegible]
[illegible] ہندوستان میں سب سے کثیر الاشاعت
[illegible] ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] صاحب بیٹھے ہیں [illegible]
[illegible]
[illegible] صاحب
[illegible] دیکھتے [illegible] بالواسطہ
کرتے ہیں [illegible] کبھی
[illegible] ان کے [illegible]
[illegible] بھی کہہ سکتا ہے
[illegible] ہندوستانیوں
[illegible] یہاں [illegible] نہیں دی جاتیں۔
بلکہ زندگی [illegible] کی داستان ہے جو ایک
[illegible] مدت
[illegible] بہت
[illegible] کے
بعد بھی [illegible] دیوان [illegible]
[illegible] زندگی [illegible] کاشت کرے
[illegible] کھیتوں [illegible]
کرایہ پر دیتا ہے۔ ہندوستان [illegible] ملک [illegible]
کروڑ ہے اور رقبہ بہت کم۔ اس زمین پر [illegible]
کی طرح پلتے ہیں، جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ [illegible] سے زیادہ نہیں
یہاں ہر چیز منگے کی ہے۔ لوگ کتابیں مانگ کر پڑھتے ہیں۔ کسان ساہوکاروں
سے کاشت کے لئے بیج مانگتے ہیں۔ یہاں نہ صرف ناول کرائے پر دئے جاتے ہیں۔

بلکہ بیویاں بھی۔ یہاں زندگیاں گروی رکھی جاتی ہیں اور چاندی کی چند ٹکیوں کے عوض بیویاں مستعار لی جاتی ہیں۔ ان لوگوں میں پاکیزگی اور رفاقت اور ذلت رچی ہوئی ہے۔ منگے کی کتابوں کے خلاف جہاد کرتے ہو لیکن کون ہے جو ان منگے کی بیویوں کے خلاف جہاد کرے گا! جو خود بک چکا ہو وہ کیا خریدے گا؟

منگے چیزوں کے سلسلے میں مجھے ایک بات یاد آگئی۔ ایک دفعہ مجھے ضلع [illegible] کے ایک دیہات میں گھومنے کا اتفاق ہوا۔ میرے ساتھ میرا ایک جاٹ دوست تھا۔ اس کی عمر چالیس برس کی ہوگی لیکن اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ جب میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہمارے علاقے میں عورتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ کیونکہ کچھ عرصہ ہوا، خاص کر سکھوں کے زمانے میں لڑکیاں پیدا ہوتے ہی [illegible] تھا۔ اس لئے عورتوں کی تعداد کم ہو گئی ہے اور اسی لئے وہ بھی تک [illegible] تھا لیکن اس کے بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اکثر اس سے اس کی بیوی مانگ لیا کرتا تھا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ عدالتوں میں ایسے مقدمات بارہا آتے ہیں جن میں ایک بدصورت ادھیڑ عمر کی عورت کے حاصل کرنے کے لئے چار پانچ قتل ہو گئے ہوں۔ اور ایسے بھی بہت سے مقدمات ہوئے ہیں جن سے پتہ چلا ہے کہ جب کوئی غریب کسان جاگیردار یا ساہوکار کا سود در سود ادا نہ کر سکا تو اس نے تنگ آکر اپنی بیوی گرو رکھ دی۔ ہندوستان ہر لحاظ سے ایک غریب ملک ہے۔ اس لئے یہاں منگے تلنگے بغیر جینا دو بھر ہو جاتا ہے اب جب میں ان سب باتوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں کیسا [illegible] ہوں کہ اس ہندوستان جنت نشان میں جہاں منگے کی بیویاں بھی ہوتی ہیں محض منگے کی کتابیں پڑھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

کرشن چندر

محبت کا گیت

اُبلتی آگ کے شعلے خراماں ہیں،
فضائے لامکانی ہیں،
مگر انسان اُن کو دیکھ سکتے ہیں۔
اِسی دنیائے فانی میں۔

ترے دل میں کئی مبہم ارادے ہیں،
اور اُن پر احتیاط و وہم کے سنگیں لبادے ہیں!
مگر میں اپنے جذبِ دل کی قوت سے
اِک احساسِ حسیں کی نرم راحت سے
اُنہیں معدوم کر دوں گا۔
میں اُن کو آرزوؤں کے گلستاں میں
بہارِ نو سے بھر دوں گا۔
جنونِ عشق ساماں ہیں
تجھے لے جاؤں گا اِس کائناتی دور سے باہر،
وہیں پائے گا تسکینِ ابد میرا دلِ مضطر!

یہ حد بندی پسند آتی نہیں مجھ کو،
گرفتاری ذرا بھاتی نہیں مجھ کو،
میں تجھ کو بہجتِ بے باک کا نغمہ سناؤں گا،
تجھے اک اَور ہی منظر دکھاؤں گا،

جو بے حد مختلف ہے دہر کی اِس نغمہ خوانی سے،
جو بے حد پُر سکوں ہے وقت کی اَن مِٹ رَوانی سے،
کہیں دلکش ہے ہستی کی پرانی سی کہانی سے،
کہیں شیریں ہے خونِ نوجوانی سے!
میں اُن انمول لمحوں کو
ترے قدموں کی محرابِ حسیں پر لا کے رکھ دوں گا،
میں اُن مدہوش نغموں کو،
مسلسل خواب سے بیدار کر دوں گا۔

میراجی

شیشم کے پتے

[illegible] بیٹھے [illegible] شیشم [illegible] سب [illegible]

[illegible] دیکھ [illegible] یوں [illegible]

[illegible] آیا [illegible]

”[illegible] ایک [illegible] دوا [illegible] ہی ہیں [illegible] ہی جا سکتی [illegible] سے دوا [illegible] کی طرف [illegible] نجمہ [illegible] ہاتھوں [illegible] ان کی لمبی لمبی انگلیاں کانپنے لگیں [illegible] پیالی [illegible] زرد ہو گئے تھے [illegible] پیالی سے [illegible] آنکھیں [illegible] گھورنے لگیں۔ ان آنکھوں کے گرد [illegible] حلقے [illegible] ایک ہی [illegible] اختیار کر رہی ہے

میز پر رکھی [illegible]

ہوا تیز چلنے لگی [illegible] پتوں کی [illegible] سوچا [illegible] ہم انسانوں کی زندگی [illegible] لیکن شیشم میں بہت کم [illegible] سال [illegible] سالوں کو شیشم کے [illegible] پتے [illegible] سال ایک نئی زندگی پاتے رہے لیکن [illegible] زندگی [illegible] ایسا ہو سکتا تو [illegible] ہمیشہ کے لیے نہ بچھڑتی۔ وہ [illegible] کتنے [illegible] زندگی [illegible] کی طرح مکمل اور بے عیب تھی [illegible] اور ایک روز [illegible] پر بھی [illegible] گڑیا [illegible] محلہ بھر کی لڑکیاں جمع تھیں۔ [illegible] میں [illegible] نجمہ [illegible] میری [illegible] کا [illegible] ٹوٹا ہے۔ نجمہ نے کہا [illegible] تو نہیں [illegible] بھائی [illegible] تھے [illegible] آگے بڑھ کر گڑیا کے کپڑوں کی پٹاری کو ٹٹولا اور [illegible] کر پٹاری الٹ دی۔ نجمہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پٹاری کا الٹنا تھا کہ [illegible] کے ٹکڑے سب کے سامنے آ رہے۔ [illegible] بہت ناراض ہوئے۔ پھر ایک چھڑی سے ننھی نجمہ کو خوب [illegible] اور کہنے لگے "اب اگر کبھی تو نے جھوٹ بولا تو گردن میں رسّی ڈال کر شیشم سے لٹکا دوں گا اور تو چیخ چیخ کر مر جائے گی"۔ نتیجہ اس کی سب سہیلیوں کے کہا کہ اپنے اپنے گھر چلی جائیں۔ آج گڑیا کا بیاہ نہیں ہوگا۔ نجمہ نے جھوٹ بولا ہے اس کو سزا ملے گی۔ محلہ بھر کی لڑکیاں تھوڑی ہی دیر میں رخصت ہوئیں۔ نجمہ سسکیاں لیتی رہی۔ امی نے [illegible] کیا تسلی دی مگر نجمہ روئے جاتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے ابا نے پھر دہرایا "اب اگر تو نے کبھی جھوٹ بولا تو گردن میں رسّی ڈال کر شیشم سے لٹکا دوں گا"۔ اس رات بے چاری نجمہ نے نہ کچھ کھایا نہ پیا بھوکی ہی سو رہی۔ آنکھ لگتے ہی اس نے خواب میں دیکھا کہ شیشم کی ہر ٹہنی کے ساتھ ایک ایک ننھی سی گڑیا لٹک رہی ہے۔ شیشم کے بے شمار پتے ان گڑیوں کے گرد تڑپ تڑپ کر ناچ رہے ہیں۔ سب گڑیاں چیخ رہی ہیں رو رو کر گردن سے رسّی نکالنا چاہتی ہیں مگر نہیں نکلتی۔ محلے بھر کی تمام سہیلیوں کی گڑیاں مر گئیں۔ نجمہ کی گڑیا اصغر بھائی کا نام لے لے کر پکارتی رہی مگر اظہر بھائی اس وقت گیند بلا کھیل رہے تھے وہ نہ آئے اور پھر نجمہ کی گڑیا بھی آپ ہی آپ روتے روتے چپ ہو گئی۔ نجمہ گھبرا کر چیختی ہوئی خواب سے چونک اٹھی۔

"امی امی میری گڑیا مر گئی" امی نے کہا "کہیں گڑیا بھی مرتی ہے! یہ دیکھ تیرے پاس تو پڑی ہے"۔ کچھ دیر بعد ابا نے پوچھا "بیٹی تو کیوں ڈر گئی؟" نجمہ نے کہا "شیشم کا درخت میری گڑیا کو کھا رہا تھا"۔ ابا نے ہنس کر کہا "بھولی بیٹی!"

اس کے چند ہفتے بعد وہ منحوس دن آیا جب امی چپ چاپ سو رہی تھی۔ سب لوگ اس کو جگاتے تھے وہ نہیں جاگتی تھی۔ امی ناراض تھی۔ سب لوگ رونے لگے۔ نجمہ بھی رونے کی پھر [illegible] آپ ہی آپ امی کے بستر کے پاس گئی اور کہنے لگی "امی جاگ اٹھو۔ ہم سب [illegible] رہے ہیں"۔ مگر امی نے کچھ جواب نہ دیا۔ پاس ہی سے ایک بڑھیا بسورتی ہوئی چیخ اٹھی "[illegible] وہ سوتی نہیں مر گئی ہے۔ وہ اب کیوں جاگنے لگی؟"

نجمہ نے کہا "کہیں امی بھی مرا کرتی ہیں وہ میرے سامنے تو بیٹھی ہیں"۔ یہ بات سن کر آہوں اور سسکیوں میں ایک کہرام مچ گیا۔ نجمہ سہم گئی۔ اس نے جانا امی سچ مچ ناراض ہو گئی ہیں۔ وہ اب نہیں بولیں گی۔ سب لوگ انہیں بلاتے ہیں وہ نہیں

ہوتیں اور ان کو روتا دیکھ کر نجمہ بھی بے اختیار رونے لگی اور پھر سب کو چھوڑ کر اسی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی، وہ اکیلی آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے اپنے آنسوؤں کے قطروں میں سے شیشم کی برہنہ ٹہنیوں کو دیکھ دیکھ کر دیر تک روتی رہی۔ تھوڑے سے پتے درخت پر باقی تھے۔ زرد، خشک اور مرجھائے ہوئے ایک زرد پتا ٹوٹ کر ہوا میں لڑکھڑاتا اس کی طرف اڑتا ہوا آیا اور اس کے سنہری بالوں میں اٹک گیا۔ اس نے جھنجھلا کر اس پتے کو نوچ کر الگ کر دیا۔ پھر اس نے شیشم کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور بولی "اللہ کرے تو مر ہی جائے۔ تو نے ہی میری گڑیا کھائی تھی" کچھ دیر وہ خاموش کھڑی آنسو بہاتی رہی شیشم کے زرد پتے ہوا میں پھڑپھڑاتے رہے۔ پھر وہ آپ ہی آپ چیخ اٹھی۔ "ای ای تم کو شیشم نے تو کچھ نہیں کیا!" اتنے میں اظہر بھائی بھی روتے ہوئے قریب آ گئے انہوں نے نجمہ کو دلاسا دینا چاہا لیکن دونوں ایک دوسرے کو روتا دیکھ کر اور زیادہ رونے لگے ....

دو سال ہوئے اظہر بھائی نے کہا تھا "خزاں کا موسم ہمارے کنبے کے لئے بہت منحوس ہے" نجمہ نے پوچھا "وہ کیسے" کہنے لگے "امی، ابا جان اور بڑی آپا خزاں ہی کے موسم میں تو فوت ہوئے تھے" نجمہ نے کہا "یہ شیشم کا درخت بھی تو بہت بڑی نحوست ہے" اظہر نے پوچھا "وہ کیونکر" نجمہ نے کہا "یوں کہ جب اس درخت کے پتے کم ہو جاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی رنج دہ واقعہ ہو ہی جاتا ہے"

اظہر بولے "وہی بات ہوئی نا، خزاں کا موسم بڑا نحس ہے"

"تو پھر اس درخت کو کٹوا ہی کیوں نہ دیں"

"اس درخت کا بھلا کیا قصور ہے! آخر موسم بھی تو خزاں کا ہے! پچھلے سال اسی درخت کے نیچے پڑوسی کے لڑکے کی برات بھی بیٹھی تھی۔ آخر اس وقت نحوست کہاں تھی اس کی!"

کھڑکی کے اس پار ایک خوبصورت نوجوان کا چہرہ تیرتا ہوا، اڑتا ہوا ایک متحرک تصویر کی طرح گذر گیا۔ سامنے کے مکان میں چند مہینوں سے ایک اجنبی کنبہ آ بسا تھا۔ اسی گھر کا جوان لڑکا کبھی کبھار آتے جاتے آنکھ اٹھا کر کھڑکی پر نگاہ ڈال لیتا تھا نجمہ حیا کے مارے ہمیشہ اوٹ میں ہو جاتی۔ اب اس نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے اپنا ایک ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے نجمہ کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک لمحہ کے سکوت کے بعد کہا "نجمہ! تم کتنی حسین ہو!"

وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔ کچھ دیر تک وہ اس کے بالوں سے کھیلتا رہا۔ نجمہ خاموش اس کا منہ تکتی رہی۔ اس نے شیشم کا ایک خشک پتہ ٹٹول کر اس کے ملائم بالوں میں سے نکالا اور بولا "نجمہ تمہارے بالوں میں شیشم کا ایک پتہ الجھ رہا ہے"۔

وہ کچھ جواب نہ دے سکی اور اس کی آن میں وہ ہاتھ، وہ چہرہ اور وہ آنکھیں نظروں سے غائب ہو گئیں ......

تھپ! تھپ! تھپ!!

اظہر بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے ارد گرد ڈالی پھر وہ سیدھے آگے بڑھے اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا عکس دیکھتے دیکھتے کسی وہم میں کھو گئے۔ شیشے میں سے عکس بولا "کیوں! اظہر بھائی کس بات کی سوچ ہے"

اظہر نے کہا "میں ایک بہت بڑی الجھن میں گرفتار ہوں ان دنوں"۔

عکس نے کہا "مجھے بھی تو معلوم ہو"

اظہر بولا "میں ابا میاں کا قرض اتارنے میں کچھ ایسا محو ہوا کہ اور تمام باتیں بھول بیٹھا۔ مجھ پر ایک بہت بڑا قرض باقی ہے"۔

عکس نے کہا "جہاں تک میں جانتا ہوں اب تم ابا میاں کے قرض سے سبکدوش ہو چکے ہو۔ اب یہ الجھن کیسی ہے؟"

"مجھے نجمہ کی فکر ہے"

"فکر کی کیا بات ہے۔ اب تو وہ تندرست ہو چکی ہے۔ ہاں پہلے کی طرح اب اسے دن رات سینے پرونے میں نہ لگے رہنے دینا بڑی مشکل سے جان بچی ہے اس کی"

"میں نجمہ کے بیاہ کی فکر میں ہوں تم نہیں جانتے"

"اچھا یہ بات ہے! تو کیا سوچا ہے تم نے؟"

"یہی تو مجھے الجھن ہے"

"تو میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں اگر تم اس پر عمل کر سکو"

اظہر بھائی نے بے تابی سے پوچھا "وہ کیا تجویز ہے جو تم بتانا چاہتے ہو"

عکس نے کہا "یہ جو سامنے کے مکان میں ڈپٹی صاحب آ کر چند مہینوں سے بسے ہیں شاید تمہیں علم نہیں ہمارے ابا کے بہت پرانے دوست ہیں"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ میری بھی راہ و رسم ہے ان سے کیا بات ہے ان سے متعلق؟"

"یہی کہ ان کے ہاں سلسلہ جنبانی کر دیکھو"

"نجمہ کے رشتے کے لئے؟"

"ہاں"

"یہ نہ ہوگا، کوئی معقول بات کرو، مجھ سے یہ نہ ہوگا"

"خیر نہ سہی، اگر تم ہی نجمہ سے تو مشورہ کر دیکھو"

[illegible] نے آنکھیں کھول کر [illegible] پھیر لیا۔ آنکھوں سے [illegible] ایک [illegible] تصویر کی طرح [illegible] کھڑکی کے [illegible] ہوگئے [illegible] [illegible] "

[illegible]

[illegible]

[illegible] جلد اچھی ہو جاؤ گی [illegible]

[illegible]

[illegible] سکے "

اُس نے [illegible] کوئی جواب نہیں [illegible] [illegible] ہوکر آسمان کی طرف [illegible] دیکھنے لگا۔

[illegible] کے پتے [illegible] اُس کی زندگی کے دن بھی اُسی رفتار کے ساتھ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی میں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتی۔ رات کی تنہائی میں اس طرف تاروں بھرا آسمان اور اس طرف ایک برہنہ درخت جس کی خشک شاخوں پر زرد پتے ایک مسلسل رقص میں معروف تھے۔ نجمہ سوچتی اُس کے گذرے ہوئے دنوں کی [illegible] رہی ہیں [illegible] کی طرف جھانک رہی ہیں۔

زرد پتے ایک ایک کر کے ٹوٹتے اور فضا میں رقص کرتے ہوئے زمین پر آنے لگے۔ درخت اپنی برہنہ شاخیں اٹھائے آسمان کی طرف گویا دست دعا پھیلائے تھا۔ اُس نے سوچا شاید شیشم بھی اُس کی طرح زندگی کی کٹھن مشکلوں سے تنگ آ کر آسمان کی طرف پرواز کرنا چاہتا ہے۔

پتوں کی سرسراہٹ اور بھی دھیمی ہوگئی۔ نجمہ نے بھائی سے کہا "میں ان پتوں کے ساتھ ختم ہو جاؤں گی"

بھائی نے کہا "تمہیں بھی کیسا وہم ہے۔ تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گی۔ اور میں تمہارا بیاہ رچاؤں گا۔"

شیشم کے پتے اور بھی کم ہوگئے۔ شاخوں میں سے گذرتی ہوئی ہوا ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔ نجمہ نے دیکھا اور اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس وقت درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر صرف ایک پتہ معلق تھا اور شاید اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کی خاطر سرکش ہواؤں سے آمادہ پیکار تھا۔ نجمہ نے کہا "بھائی جان وہ دیکھئے، درخت پر صرف ایک پتہ باقی ہے۔ میری زندگی اسی سے وابستہ ہے۔ جس وقت یہ ہوا سے گر جائے گا میری روح بھی پرواز کر جائے گی۔"

مجبور بھائی نے اپنے چہرے سے نمی دھو ڈالی۔

شام ہو چکی تھی۔ چاندنی چھٹک رہی تھی۔ کھڑکی میں سے سامنے شیشم کے درخت کے عین اوپر چاند اس طرح نظر آ رہا تھا گویا وہ مریضہ کو آخری نظر دیکھنے کے لئے کھڑکی کی طرف لپک رہا ہے اور شیشم کی حزاں زدہ شاخوں میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ درخت کی چوٹی پر آخری پتے نے اپنی پوری قوت سے مدافعت کی اور شاخ کے ساتھ ہی تڑپ تڑپ کر ناچتا رہا۔ نجمہ کے جسم و روح لرز اُٹھے۔ ایک لمحے کے بعد وہ خاموش، ساکت اور بے حس و حرکت ہوگئی۔ بھائی نے جھک کر دیکھا نجمہ کی زرد پیشانی پر ایک زرد پتہ چپکا ہوا تھا۔ اُس نے کہا "نجمی بہن، تو سو رہی ہے؟" لیکن اسے کچھ جواب نہ ملا۔ اُس کی نظر کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ درخت کی زندگی کا آخری نشان غائب تھا۔ اُس نے جھک کر بہن کی پیشانی کو چوما اور اُس کے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی۔ "آہ ...... نجمہ"

اطہر نے سنا، دور کسی سمت سے شادی کے باجوں کی آواز کھڑکی میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔

. . . .

نجمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یکایک میز پر رکھی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کرنے لگی۔ نجمہ کے بائیں ہاتھ میں پیالی تھی اور دوا کی سطح پر سے دو سیاہ اجنبی سی آنکھیں اس کی طرف گھور رہی تھیں۔ صحن میں شیشم پر بے شمار پتے ایک عجیب سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ ماما بولی "بی بی دوا پی لو۔ اگر کڑوی ہے تو کیا ہوا بچوں کی طرح آنسو نہ بہاؤ۔"

کھڑکی کے اس پار ایک حسین نوجوان کا چہرہ تیرتا ہوا اُڑتا ہوا متحرک تصویر کی طرح نجمہ کی نگاہوں کے سامنے سے گذر گیا۔

حسن نذیر۔ ایم۔ اے

بغاوت

غرض کیا ہے مجھے پھولوں کے رنگا رنگ شعلوں سے
مجھے اب جیتے جی دل کی مسرت مل نہیں سکتی

وہ غنچے جو چٹکتے ہیں سحر کو گلستانوں میں
مرے دل کی کلی کو ان کی قسمت مل نہیں سکتی

وہ نغمے تیرتے ہیں جو دماغ و دل کے سوتوں میں
انہیں نغموں سے اب خوں کو حرارت مل نہیں سکتی

وہ رنگین تتلیاں جو ناچتی ہیں مرغزاروں میں
مرے غم کو بھی ان کی بشاشت مل نہیں سکتی

وہ دل آویز چہرے جو نگاہوں سے گزرتے ہیں
حقیقت ہے کہ ان سے میری محبت مل نہیں سکتی

تو پھر کیوں ان مناظر میں لطافت کو اپنی الجھاؤں
اگر سچ ہے کہ اس انجمن میں راحت مل نہیں سکتی

جہاں کے حسن رنگیں سے بغاوت کرنے والا ہوں!

(۲)

تخیل کی حرارت سے جنت کے اشاروں سے
نکلنے والی گونجوں سے تھرکتے تاروں سے

بھٹکنے والی نکہت سے، مچلنے والے شعلوں سے
فسوں پرور ہواؤں سے نشیمن در بہاروں سے

فرشتوں سے جو نادانی کی مشعل لے کے چلتے ہیں
نہیں واقف جو خود داستان خرد کے رازداروں سے

سکوں آمیز خوابوں سے تبسم ریز جلووں سے
سکوت شام میں آتش بداماں ابر پاروں سے

تبسم سے کہ اس کی گود میں بہتی ہے سرشاری
جوانی سے کہ اس کی ابتدا ہے لالہ زاروں سے

کتابوں سے جو دل کو زندگی کا درس دیتی ہیں
محبت سے کہ اس کی ابتدا ہے بے قراروں سے

میں ان راحت کے عنوانوں سے نفرت کرنے والا ہوں۔

(۳)

محبت "اف! نہ لو تم نام بھی اس کا مرے آگے
مجھے نفرت ہے اس سے یہ مجھے پہروں رلاتی ہے

محبت ہاں محبت دل کے احساسات سے باغی
یہی تو زندگی کو ہر قدم پر آزماتی ہے

محبت، آہ بن بن کر نکلتی ہے نگاہوں سے
محبت درد کی صورت میں شب کو مسکراتی ہے

محبت چوٹ کھاتی ہے محبت وار کرتی ہے
محبت نوجوانی میں گلوں کی بے ثباتی ہے

محبت توڑ دیتی ہے دلوں کے آبگینوں کو
محبت اپنے ہاتھوں سے جوانی کو مٹاتی ہے

محبت سے نہ دیکھو تم کسی معصوم کی جانب
کہ یہ دو دلوں کی حسرتوں سے لطف اٹھاتی ہے

مجھے دیکھو کہ میں بھی تو محبت کرنے والا ہوں!

یوسف ظفر

دربار اودھ کا یوروپین نائی

اختتام سلطنت مغلیہ [illegible]

[illegible]

پنجاب سے [illegible] راجپوتانے [illegible] اور [illegible] بڑھے چلے آ رہے ہیں [illegible] ایک [illegible]

[illegible] شجاع الدولہ [illegible] نکلے سپاہی نے [illegible] کا خطاب [illegible] اودھ [illegible] ۱۸۱۹ء میں [illegible] غازی الدین حیدر [illegible] ۱۸۱۴ء سے ۱۸۱۹ء [illegible] تخت نشینی کے پانچ سال بعد شاہ اودھ [illegible] غازی الدین حیدر نے ۱۸۲۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا تو ان کا فرزند نصیر الدین حیدر تخت اودھ پر متمکن ہوا۔

اودھ کی بادشاہت اور شاہ نصیر الدین حیدر ذرا نصیر الدین حیدر کا سراپا ملاحظہ ہو جنرل جی سی منڈی (G. C. Mundy) [illegible] کو ۱۹ دسمبر ۱۸۲۷ء کو دربار اودھ میں باریابی کا شرف حاصل ہوا [illegible] اس وقت کے کمانڈر ان چیف لارڈ کمبرمیر Lord Combermere کا اے ڈی سی تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"بادشاہ کوئی ۲۶ سالہ نوجوان ہے اور صورت شکل سے ولی [illegible] نہیں [illegible] تقریباً ۵ فٹ ۹ انچ کا قد ہوگا۔ رنگ کالا نہیں [illegible] بھی نہیں [illegible] بادشاہ کی دماغی قابلیت اور اس کے مشاغل [illegible] شان نہیں۔ البتہ وزیر غضب کا زیرک و [illegible] ہے مگر دنیا میں کوئی نہیں جو اس سے نفرت نہ کرتا ہو۔ ایک [illegible] اور [illegible] اپنا دست راست سمجھتے ہیں اور اس پر [illegible]"

[illegible] کا پہلا سال ہے۔ سنین مابعد کا مرقع آپ کو مشہور تصنیف ایک مشرقی بادشاہ کی پرائیویٹ زندگی میں ملے گا جو سب سے پہلے ۱۸۵۵ء میں پھر ۱۸۵۸ء میں لندن میں شائع ہوئی۔ خدا جانے مصنف کون ہے؟ کہتے ہیں کہ [illegible] کا بھیدی ہے۔ [illegible] لندن کی رائے میں "کتاب کیا ہے الف لیلے [illegible] کا ایک ورق ہے" اکثر کا خیال ہے کہ ولیم نائٹن William [illegible] اس کا اصل مصنف ہے۔ بہرکیف کوئی بھی ہو ۱۸۵۵ء کی اشاعت میں [illegible] مصنف کا بھی نام نہیں۔

بادشاہ پر یوروپین اثرات ۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۲ پر نصیر الدین حیدر کے پانچ یوروپین [illegible] دربار کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ان میں بادشاہ کا استاد۔ دوسرا [illegible] کتب خانہ۔ تیسرا جرمن مصور دمطبق۔ چوتھا کپتان باڈی گارڈ اور پانچواں حجام تھا۔

نصیر الدین حیدر کی تصویر پر نظر کیجئے۔ نہ مشرقی بادشاہوں کے ایسی زلفیں ہیں [illegible] سلاطین کی نورانی ڈاڑھی ہے نہ سپاہیانہ رعب و داب پیدا کرنے [illegible] مونچھیں ہیں۔ بال خشخشی کٹے ہوئے، خط صاف، مونچھیں اس قدر مہین کتری ہوئی گویا مسیں بھیگ رہی ہیں۔ لباس شاہانہ سے تو مجبور ہیں۔ مگر اس میں بھی جدید طرز کی تراش خراش موجود ہے۔ لیکن پرائیویٹ زندگی میں انگریزی کپڑے بے تکلف پہنتے ہیں۔ بدقسمتی سے کوئی تصویر لکھنؤ کے عجائب خانہ میں ایسی دستیاب نہیں ہوتی جس میں بادشاہ انگریزی لباس میں ہو مگر تذکرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اس زمانہ کی یوروپین چھجے دار ٹوپی پہننے میں بھی کوئی عار نہ تھا۔

۱؎ ۱۷۹۷ء تا ۱۸۱۴ء ۲؎ Lord Hastings

۳؎ The Private Life of an Eastern King. London 1855

ان پانچ یورپین مصاحبین یا ارکانِ سلطنت اس وجہ سے کہ ان لوگوں کے اقتدار کے سامنے کسی کی نہ چلتی تھی، کا اثر بادشاہ کی زندگی پر اس قدر پڑا تھا کہ انہوں نے اپنی معاشرت ہی بدل دی تھی۔ دوپہر کو خاصہ میز کرسی پر انگریزی طریقہ سے چھری کانٹوں کے ساتھ نوش فرمایا جاتا۔ اور شراب بھی فرانس کی بہترین شرابوں میں سے پسند کی جاتی عمارات کی تعمیر میں یورپین طرز کو ہندوستانی وضع پر ترجیح دی جاتی۔ شاہی محلات کا فرنیچر بھی نیم مغربی اسلوب کا تھا۔ کچھ انہیں پانچ افراد پر اکتفا نہیں تھی بلکہ ان کے علاوہ داروغہ مطبخ بھی یورپین بلکہ نائی کا بھائی تھا۔

اچھا اب اول الذکر چار کو بھلا دیجئے اور صرف "نائی" کے وقائع حیات پر اپنی نظر کی جولانیوں کے راستہ کو مسدود کر دیجئے۔

نائی کی ابتدائی زندگی۔ نائی کا نام ڈی رزٹ De Russet تھا وہ کلکتہ میں ایک جہاز پر نوکر ہو کر آیا تھا۔ لندن میں وہ ایک حجام کی دوکان پر کام کرتا تھا اور کچھ سیکھا بھی تھا۔ لہٰذا کلکتہ پہنچ کر اُس نے خط تراشی شروع کی۔ اور بہت جلد نام و نمود حاصل کر لیا۔ جب پیسے ٹکے گئے اور فکر فردا نہ رہی تو حوصلے بڑھنے لگے۔ پہلے بڑے بڑے دریاؤں کے ذریعہ سے یورپین تجار تجارت کیا کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے جہازوں اور کشتیوں میں لاد لاد کر سامان تجارت لے جایا کرتے تھے۔ رزٹ بھی ان تجار کے ساتھ ہو لیتا اور شہروں شہروں کی سیر کرتا پھرتا۔ اسی طرح پھرتا پھراتا وہ لکھنؤ میں وارد ہوا اور ریذیڈنٹ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ غالباً مسٹر ہربٹ میڈاک[1] (Thomas Herbert Maddock) اس وقت ریذیڈنٹ تھا۔ رزٹ نے ریذیڈنٹ کے کچھ اس خوبصورتی سے بال تراشے کہ اُس کا چہرہ نکھر آیا اور وہ نائی سے اس قدر خوش ہوا کہ آخر کار بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا۔ بادشاہ اس نعمت غیر مترقبہ کو پا کر باغ باغ ہو گیا اور اس روز سے پھر نائی کو وہ عروج ہوا کہ اللہ غنی۔

دربارِ اودھ میں رسائی۔ قسمت نے یاوری کی بخت نے ساتھ دیا۔ پھر کیا تھا سب کچھ قدموں سے لگا ہوا تھا۔ خسروانہ عنایات، شاہانہ مدارات، دن رات کرم کی بارش، چند دنوں میں رزٹ مالا مال ہو گیا۔ سرفراز خاں کے خطاب کے ساتھ شاہی آبدار خانہ کی داروغگی مرحمت ہوئی۔ اب تو رزٹ کی آمدنی کے متعدد دروازے کھل گئے۔ کوئی شراب شاہی میز پر اُس وقت تک نہ چنی جاتی جب تک اس انگریز حجام کی مہر اس پر ثبت نہ ہوتی اور کوئی شراب اس وقت تک بادشاہ کے حضور میں نہ پیش کی جاتی جب تک یہ نمک حلال دو چار گھونٹ اس کے پہلے نوشِ جان کر لیتا۔ یورپ سے جتنی شراب آتی وہ رزٹ ہی منگاتا اور اس کی قیمتوں میں دونا چوگنا نفع کماتا۔

عروج۔ رزٹ نے بادشاہ کا اس قدر اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ بادشاہ اپنے رازِ دل کو سوائے اُس کے وزیر اعظم تک سے نہ بیان کرتا اور شاہی مزاج میں اُس کو اس قدر دخل حاصل ہو گیا تھا کہ جس بات پر بادشاہ نہیں کہہ دیتا۔ رزٹ "ہاں" کہلا دیتا تھا۔ ڈی رزٹ کے لئے آدابِ دربار کی پابندی بھی اُٹھ گئی تھی۔ اور وہ بے تکلف دسترخوان پر بادشاہ کے ساتھ خاصہ تناول کرتا۔ اور تمام رنگ رلیوں میں شریک رہتا۔ اس کی شہرت ہندوستان کے عرض و طول میں پھیل چکی تھی اور وہ عوام کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ کلکتہ ریویو کی تیسری جلد میں اودھ کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں رزٹ کو سفلہ و کمینہ سے خطاب کیا گیا ہے لیکن اُس کو اس کی مطلق پروا نہ تھی کیونکہ وہ زرپاشی سے دنیا کا منہ بند کر سکتا تھا۔ اس زمانہ کے چند اخبارات میں "آگرہ اخبار" اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ لیکن اُس کے خاموش کرنے کے لئے رزٹ نے ریذیڈنٹ کے دفتر کے ایک یورپین کلرک کو اس کام کے لئے مامور کیا کہ وہ آگرہ اخبار کے مضامین کا جواب کلکتہ کے اخبار[2] میں دیا کرے۔

کتاب "ایک مشرقی بادشاہ کی پرائیویٹ زندگی" کے دوسرے باب میں رزٹ کا بھی تذکرہ آتا ہے۔ اس باب میں بادشاہ کے مشاغل پر بحث کی گئی ہے۔ شاہی دسترخوان ٹھیک ۹ بجے شب کو بچھ جاتا تھا۔ بادشاہ وسیع ہال میں جس میں کھانا چنا ہوتا تھا اس شان سے داخل ہوتا تھا کہ وہ اپنے اس حجام رفیق کے کاندھے سے سہارا دیئے ہوتا تھا۔ بادشاہ بہ نسبت نائی کے زیادہ طویل القامت تھا اور چہرہ سے بھی زیادہ رعب دار معلوم ہوتا تھا لیکن حجام نہایت بدقطع تھا اور اس کے بشرہ سے چھچھوراپن ٹپکتا تھا۔ دونوں ایک ہی طرح کا لباس پہنے ہوئے ہوتے تھے اور محض لباس سے محمود و ایاز میں تمیز کرنا ناممکن تھا۔ دسترخوان کی نگرانی ایک فرانسیسی کے سپرد تھی اور باورچی بھی کلکتہ کلب کا ایک ہوشیار یورپین تھا لیکن سوائے نائی کے کسی یورپین کی مجال نہ تھی کہ وہ دسترخوان پر بیٹھ سکے۔

ارکانِ سلطنت بادشاہ کی اس سفلہ نوازی سے عاجز آ گئے تھے اور وہ اس گھات میں تھے کہ موقع پا کر اس نائی سے دربار کو پاک و صاف کریں۔ مگر

[1] Later Sir Thomas Herbert Maddock C.B.M.P. یہ شخص ایک مصنف گزرا ہے ۱۸۵۲-۵۷ء تک ممبر پارلیمنٹ بھی رہا اور ۱۵ جنوری ۱۸۷۰ء میں اسی سال کی عمر میں فوت ہوا۔

[2] کلکتہ کے اخبار سے غالباً جام جہاں نما کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں ولیم بروٹ کا اسعد کلام بھی شائع ہوا ہے۔

اُن کی کوئی چال نہ چلتی تھی اور ہر قدم پر سوائے ندامت کے کچھ حاصل نہ ہوتا دوسرے یورپینوں میں [illegible] کے خلاف رقابت کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور وہ اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے [illegible] پر عمل سے [illegible] ساتھ [illegible]

[illegible] کا انجام [illegible]

[illegible] بچا لیا [illegible]

[illegible] ہیں [illegible]

یہ الفاظ تھے جو بادشاہ نے [illegible] سنتے ہی [illegible] ہوگیا اور پردہ شب میں [illegible] فرار ہوگیا [illegible] بادشاہ کو اس کے فرار ہونے کی خبر پہنچ گئی [illegible] اس کے بھائی کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔ [illegible] کا لڑکا اور بھائی [illegible] شاید تلوار کے گھاٹ بھی اتار دیئے جاتے مگر [illegible] ریذیڈنٹ [illegible] بادشاہ نے اُن کی جان بخش کر دی۔

کہتے ہیں کہ [illegible] کم از کم بیس لاکھ روپیہ کے جواہرات لے گیا تھا جن کو اس نے لندن میں فروخت کر کے تجارت شروع کی اور آخر عمر تک [illegible] کی زندگی بسر کرتا رہا۔ [illegible] تک اس کے زندہ ہونے کا ثبوت لندن ڈائرکٹری سے ملتا ہے۔ اس کے بھائی اور بیٹے کا افسانہ طویل ہے۔ لیکن انتزاع سلطنت تک پھر اس خاندان کے کسی فرد کا نام اودھ کی تاریخ میں نہیں آتا۔

سید شہنشاہ حسین

شعر

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

مجازؔ



زندگی

میں کچھ ہونے سے پہلے کیا تھا ننھا سا ذرہ، مضغہ، قطرہ تو نے اس کو فطرت بخشی صورت بخشی، سیرت بخشی
ننھا ذرہ ہو گیا قطرہ قطرہ پھیل کے ہو گیا دریا جودت بخشی، جدت بخشی صبر و رضا کی دولت بخشی
مضغے نے پیٹ سے پاؤں نکالا بن کر آیا گھر کا اجالا دل، اور دل میں بصیرت بخشی کثرت میں بھی وحدت بخشی
چاند کا ٹکڑا بھولا بھالا نور آنکھوں کا گھر کا اجالا پھرتا ہے اب امجد بن کر
جسم سے نکلی روح کی صورت ہے یہ کیسی صورت کی مورت اپنے وقت کا سرمد بن کر
غیبی فرشتہ بن کر آیا اس میں نہیں اک چیز بھی میری سب کچھ ہے یہ امانت تیری
لاکھوں پردوں سے چھن کر آیا جان ہے کیا شے اور دل کیا ہے ردِ امانت مشکل کیا ہے
ذوق و بصارت لے کر آیا لمس و سماعت لے کر آیا اب کچھ لے لے جب کچھ لے لے
سوچنے کی قوت بھی ہے اس میں عقل و فراست بھی ہے اس میں لے لے میرا سب کچھ لے لے
لطف ہے اس کی بول وہاں میں کچھ کہتا ہے اپنی زباں میں میرا مجھ میں کچھ بھی نہیں ہے
جو میرا ہے سب ہے تیرا

اس نے خزانہ پایا کہاں سے؟ اتنی دولت لایا کہاں سے؟ تیرا تجھ کو دے دیتے ہیں
کس دریا کا یہ گوہر ہے؟ کس باطن کا یہ مظہر ہے؟ ہرج ہی کیا ہوتا ہے میرا

بڑھنے لگا پھر ننھا پودا سر میں آیا عقل کا سودا
نادانی سے آئی جوانی آ گئی فطرت میں جولانی

احمد حسین امجد

کفّارہ

گاؤں کا [illegible] گاؤں [illegible] [illegible] کر سکتی

[illegible] پوچھ [illegible] پنڈت جی [illegible]

وقت گھر [illegible] گاؤں [illegible]

[illegible] آگ [illegible]

[illegible] سوکھ کر چیٹنے لگے [illegible] ان لکھوں [illegible] بھاگی جاتی تھی

[illegible] گرا [illegible] آنکھ کی پیٹ [illegible] کی طرف دیکھنے [illegible] جیسے [illegible] ہو گیا ہو۔

اس میدان کے کنارے [illegible] غفور [illegible] کا گھر [illegible] اس کی مٹی کی دیوار گر گئی [illegible] سڑک سے [illegible] خاندانی شرم اور آبرو اپنے تئیں راہگیروں کے رحم و کرم کے حوالے کر کے آپ [illegible] بے فکر ہو گئی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک پیڑ کے سائے میں کھڑے ہو کر پنڈت جی نے پکارا۔ "ارے او غفورا گھر میں ہے کیا؟"

اُس کی دس ایک سال کی لڑکی نے دروازے کے پاس آکر کہا ——
"کیوں! باپو کو تو بخار آگیا ہے۔"

"بخار! بلا حرامزادے کو! پاکھنڈی! اٹھ کہیں کا!"

شور و غل سُن کر غفور میاں گھر سے نکل کر بخار میں کانپتا ہوا باہر آ کھڑا ہوا۔ ٹوٹی ہوئی دیوار سے لگا ہوا ایک پرانا ببول کا پیڑ ہے۔ اس کی شاخ سے ایک بیل بندھا ہوا ہے۔ پنڈت جی نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہ کیا ہو رہا ہے؟ ذرا سنو تو سہی یہ ہندوؤں کا گاؤں ہے۔ زمیندار صاحب برہمن ہیں۔ اس کا بھی کچھ ہوش ہے؟"

اُن کا چہرہ مارے غصّے اور دھوپ کے سُرخ ہو رہا تھا۔ چنانچہ ایسے مُنہ سے گرم اور تیکھی بات ہی نکلے گی۔ مگر چونکہ سبب غفور کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے وہ چُپ چاپ صرف ان کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

پنڈت جی نے کہا —— صبح جاتے وقت دیکھ گیا تھا کہ بندھا ہے۔ دوپہر کو لوٹتے وقت دیکھ رہا ہوں کہ جوں کا توں بندھا ہوا ہے۔ گئو ہتیا ہونے پر مالک صاحب تمہیں زندہ گاڑ دیں گے۔ وہ ایسے ویسے برہمن نہیں ہیں۔"

"کیا کروں پنڈت جی مہاراج! بڑی لاچاری میں پڑ گیا ہوں۔ کئی روز سے بخار میں پڑا ہوں۔ رسّا پکڑ کر تھوڑا بہت چرا لاتا۔ سو ہوتا نہیں۔ چکر کھا کر گر پڑتا ہوں۔"

"تو کھول دے آپ ہی چر آئے گا۔"

"کہاں چھوڑ آؤں پنڈت جی! لوگوں کے دھان ابھی جھاڑے نہیں گئے ہیں۔ کھلیان میں ہی پڑے ہیں۔ پوال بھی ابھی تک جوں کا توں پڑا ہے۔ سارا میدان تو سارا سوکھ کر صفا چٹ ہو رہا ہے۔ کہیں بھی مٹھی بھر گھاس نہیں۔ کسی کے دھان میں منہ مار دے۔ کسی کا پوال خراب کر ڈالے۔ کیا ٹھکانا ہے —— چھوڑوں تو کیسے چھوڑوں مہاراج!"

پنڈت جی نے ذرا نرم ہو کر کہا: "نہیں چھوڑتا تو کہیں چھاؤں میں باندھ کر دو مٹھے پوال ہی کے ڈال دے۔ چبایا کرے گا تب تک! تیری لڑکی نے بھات نہیں پکایا؟ کچھ پانی دے دے تھوڑا سا —— پی لے گا۔"

غفور نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بے کسی کے انداز سے پنڈت جی کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے مُنہ سے ایک لمبا سانس نکل گیا۔

پنڈت جی بولے —— "وہ بھی نہیں ہے کیا؟ پوال سب کیا کر دیا! حصّے میں جو کچھ ملا تھا۔ وہ بیچ کھو چکے کر پیٹ میں ساگیا! بیل کے لئے بھی تھوڑا سا نہیں رکھا؟ قصائی کہیں کا!"

اس بے رحمانہ الزام سے غفور کی گویا زبان ہی بند ہو گئی۔ لمحہ بھر بعد اُس نے آہستہ سے کہا —— "جو کچھ حصّے میں ملا تھا وہ مالک صاحب نے پچھلے بقایا میں رکھوا لیا۔ رو دھو کر، ہاتھ پیر جوڑ کر کہا۔ بابو صاحب! حاکم ہیں آپ۔ آپ کا راج چھوڑ کر بھاگ تھوڑے ہی سکتا ہوں۔ مجھے تھوڑا سا پوال دے دیجئے۔ چھپّر

چھاتا ہے۔ ایک کوٹھری ہے۔ باپ بیٹی کا رہنا ہے۔ وہ بھی خیر اس سال تاڑ کے پتوں سے گذارہ کرلوں گا لیکن میرا ہیش بھوکوں مرجائے گا۔"

پنڈت جی نے ہنس کر کہا۔ اُف او! اور آپ نے شوق سے اس کا نام رکھ چھوڑا ہے ہیش! ہنسی آتی ہے!"

مگر یہ طعنہ غفور کے کانوں میں نہیں پہنچا۔ وہ کہنے لگا۔ "لیکن حاکم کی مہربانی نہیں ہوئی۔ دو مہینے کے کھانے کے لائق دھان ہم کو دے دیئے۔ لیکن پوال سب سرکار میں لے لیا۔ اس غریب کو ایک تنکا تک نہیں ملا!——"

یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ مگر پنڈت جی کو اس پر ترس نہیں آیا۔ بولے۔ "اچھا آدمی ہے تُو تو! پہلے سے لے رکھا ہے۔ دے گا نہیں؟ زمیندار کیا تجھے اپنے گھر سے کھلائے گا! ارے! تم لوگ تو رام راج میں بستے ہو—— آخر قوم تو نیچ ہی ٹھہری۔ اسی لئے بدگوئی کرتا پھرتا ہے"

غفور نے شرمندہ ہو کر کہا—— "بدگوئی کیوں کرنے لگا مہاراج! اُن کی بدگوئی ہم لوگ نہیں کرتے لیکن دوں کہاں سے۔ بتلائیے! چار بیگھہ کھیت حصے میں جوتتا ہوں۔ مگر لگاتار دو سال سے خشک سالی ہو رہی ہے۔ کھیت کا دھان کھیت ہی میں سوکھ گیا—— باپ بیٹی کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ گھر کی طرف دیکھئے۔ مینہ برستا ہے تو بیٹا کو لے کر ایک کونے میں بیٹھ کر رات گذارنی پڑتی ہے۔ پیر پسار کر سونے کی بھی جگہ نہیں۔ ہیش کی طرف دیکھئے۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں—— دے دیجئے مہاراج! تھوڑا سا پوال ادھار دے دیجئے۔ دو چار دن اسے پیٹ بھر کر کھلا دوں——

کہتے کہتے ہی وہ دھپ سے برہمن کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔

پنڈت جی تیر کی طرح دو قدم پیچھے ہٹ کر بول اٹھے—— ارے مُو چھوئے گا کیا؟

"نہیں مہاراج! چھوؤں گا کیوں؟ چھوؤں گا نہیں۔ اس سال دے دیجئے مہاراج! تھوڑا سا پوال دے دیجئے۔ آپ کے ہاں چار چار ٹالیں لگی ہوئی ہیں۔ اُس روز میں دیکھ آیا ہوں —— تھوڑا سا دے دیں گے تو آپ کو کچھ پتہ بھی نہ لگے گا۔ بڑا سیدھا جانور ہے منہ سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ صرف ٹکر ٹکر دیکھتا رہتا ہے اور آنکھوں سے آنسو ٹپکاتا رہتا ہے۔"

پنڈت جی نے کہا—— اُدھار تو لے لے گا مگر ادا کس طرح کرے گا! ذرا یہ تو بتا؟"

غفور کو کچھ امید بندھی بے تابانہ کہا—— "جیسے بن سکیگا چکا دوں گا مہاراج جی! آپ کو دھوکا نہیں دوں گا!"

پنڈت جی نے مُنہ سے ایک طرح کی آواز نکال کر غفور کے مضطرب لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ "دھوکا نہیں دوں گا! جیسے بن سکیگا چکا دوں گا! چل چل ہٹ، راستہ چھوڑ، گھر جانا ہے، بہت دیر ہوگئی ہے"۔

اتنا کہہ کر مسکراتے ہوئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک ڈر کے مارے پیچھے ہٹتے ہوئے غصے میں آکر کہنے لگے۔ "ارے مرا سینگ ہلا کر مارنے آرہا ہے! سینگ مارے گا کیا۔؟"

غفور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پنڈت جی کے ہاتھ میں پھل، مولی اور بھیگے ہوئے چاولوں کی پوٹلی تھی۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غفور نے کہا—— "خوشبو مل گئی ہے نا اسے۔ اسی لئے کچھ کھانے کو مانگتا ہے"۔

"کھانے کو مانگتا ہے! ٹھیک ہے! جیسا خود گنوار کسان ہے۔ ویسا ہی بیل ہے! پوال تو نصیب ہوتا نہیں۔ کیلے اور چاول کھانے کو چاہئیں! ہٹا ہٹا، راستے سے ایک طرف ہٹا کر باندھ کیسے سینگ ہیں —— کسی دن کسی کی جان ہی نہ لے لے"۔

یہ کہتے ہوئے پنڈت جی ایک طرف سے بچ کر نکل گئے۔

غفور اُن کی طرف سے نگاہ ہٹا کر کچھ دیر تک ہیش کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اس کی گمبھیر سیاہ آنکھیں درد اور بھوک کے احساس سے لبریز تھیں اُس نے کہا—— "تجھے دیا نہیں مٹھی بھر؟ اُن لوگوں کے پاس بہت ہے۔ پھر بھی دیتے نہیں کسی کو! نہ دیں——"

کہتے کہتے اس کا گلا رُندھ گیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ ہیش کے پاس آ کھڑا ہوا اور چُپ چاپ اُس کے گلے پر، ماتھے پر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا ہوا چپکے سے کہنے لگا۔ "ہیش! تو میرا بیٹا ہے۔ تو ہم لوگوں کو آٹھ سال تک کھلاتا پلاتا رہا ہے۔ اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ تجھے میں پیٹ بھر کر کھلا بھی نہیں سکتا!—— لیکن تو تو جانتا ہے کہ میں تجھے کتنا پیار کرتا ہوں"۔

ہیش نے اس کے جواب میں صرف گردن بڑھا کر آرام سے آنکھیں میچ لیں۔ غفور اپنے آنسو ہیش کی پیٹھ پر پونچھتا ہوا اسی طرح گادگیر لہجے میں کہنے لگا۔ "زمیندار نے تیرے منہ کا نوالا چھین لیا ہے —— مسان کے پاس جو چرنے کے لئے جگہ تھی۔ اُسے بھی پیسے کے لالچ سے ٹھیکہ پر دے دیا۔ ایسی خشک سالی میں تجھے کس طرح جلائے رکھوں بتا! چھوڑتا ہوں تو تو دوسروں کی ٹال پر منہ مارے گا۔ لوگوں کے کیلے کے پیڑ توڑ توڑ کر کھا جائے گا—— تیرے لئے اب میں کیا کروں! بدن میں تیرے اب طاقت بھی نہیں۔ گاؤں کا اب کوئی بھی تجھے چاہتا نہیں۔ لوگ کہتے ہیں اب تجھے بیچ ڈالنا چاہیے!——"

دل ہی دل میں ان الفاظ کو ادا کرتے ہی اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ انہیں ہاتھ سے پونچھ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر ٹوٹے ہوئے گھر کے چھپر سے تھوڑا سا پیال نکالا … اور اسے مہیش کے آگے رکھ کر ہولے سے کہنے لگا … "جلدی سے تھوڑا بہت کھا لے —— دیر ہو گئی تو پھر ——"

"بابو!"

"کیوں بیٹا؟"

"آؤ بھات کھا لو۔"

یہ کہتی ہوئی ایک ننھی سی لڑکی کوٹھڑی سے نکل کر دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ [illegible] دیکھنے کے بعد اُس نے کہا … "تو ابال کھلا رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی بات ہے … بھوسا تو گھر میں تھا ہی نہیں … سب اپنے آپ جھڑ جھڑ کے گر رہا تھا۔"

"ہم ہوا … بابو! تم کھینچ کے نکال رہے تھے۔"

"نہیں بیٹا! ٹھیک کھینچ کے نہیں نکالا۔"

"لیکن دیوار جو گر پڑے گی بابو! ——"

غفور چپ رہا۔ صرف ایک کوٹھڑی کے سوا سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور اس طرح کرنے سے کئی مہینے میں وہ بھی نہیں ٹک سکتی۔ یہ بات اس سے زیادہ اور کسے معلوم ہے۔ اور یوں اور کتنے دن کٹ سکتے ہیں؟

لڑکی نے کہا: "ہاتھ پیر دھو کر بھات کھا جاؤ بابو! میں پروس چکی ہوں۔"

غفور بولا: "ماڑ تو دے جا بیٹا! مہیش کو پلا پلو کر فارغ ہو کر کھانے بیٹھوں گا۔"

"ماڑ تو آج نہیں نکلا بابو! ہنڈیا میں ہی رہ گیا۔"

"نہیں ہے؟" کہہ کر غفور چپ ہو رہا۔ ایسی مصیبت کے دنوں میں کوئی ذرا سی چیز بھی بگاڑی نہیں جا سکتی۔ اس بات کو دس سال کی بچی بھی سمجھ گئی ہے۔ ہاتھ پیر دھو کر وہ کوٹھڑی کے اندر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک پیتل کی تھالی میں باپ کے لئے دال بھات پروس کر بیٹی اپنے لئے ایک مٹی کی تھالی میں دال بھات لئے بیٹھی ہے۔ دیکھ کر غفور نے آہستہ سے کہا: "امینہ! مجھے تو آج پھر جاڑا محسوس ہو رہا ہے بیٹا! بخار میں کھانا کیا ٹھیک ہو گا؟"

امینہ نے پریشان چہرے سے کہا: "مگر اس وقت تو تم نے کہا تھا کہ بڑی بھوک لگ رہی ہے؟"

"اُس وقت! اُس وقت شاید بخار نہیں تھا بیٹی!"

"تو اٹھا کے رکھ دوں، شام کو کھا لوگے؟"

غفور نے سر ہلا کر کہا: "مگر ٹھنڈا بھات کھانے سے تو طبیعت اور بھی خراب ہو جائے گی۔"

غفور نے معلوم نہیں کیا کیا سوچ بچار کر اچانک اس سوال کو حل کر ڈالا۔ بولا —— "ایک کام کیوں نہیں کرتی بیٹی! یہ مہیش کو کھلا دو۔ رات کو پھر مٹھی بھر نہیں بنا سکو گی؟"

جواب میں امینہ منہ اٹھا کر کچھ دیر چپ چاپ باپ کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد سر جھکا کر آہستہ سے بولی ——

"ہاں بنا لوں گی بابو!"

غفور کا چہرہ سرخ ہو اٹھا۔ باپ اور بیٹی میں جو تھوڑا سا بناوٹ کا ناٹک ہو گیا، اسے ان دو جانداروں کے سوا اور بھی ایک شخص نے غیب سے دیکھ لیا۔

(۲)

پانچ سات دن بعد، ایک روز بیمار غفور اپنے آنگن میں بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے سے فکر ہویدا تھی۔ اُس کا مہیش کل سے اب تک لوٹا ہی نہیں۔ وہ خود کمزور ہے۔ اس لئے امینہ صبح سے اُسے چاروں طرف ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ دن چھپنے سے پہلے اُس نے آ کر کہا۔ "سنتے ہو بابو! مانک بابو نے اپنے مہیش کو تھانے بھجوا دیا ہے۔"

غفور بولا: "چل پگلی!"

"ہاں بابو! سچ۔ اُن کے نوکر نے مجھ سے کہا کہ اپنے باپ سے جا کر کہہ دے دریاپور کے کانجی ہوس میں ڈھونڈے جا کر۔"

"کیا کیا تھا اُس نے؟"

"اُن کے باغیچے میں گھس کر اُس نے پیڑ پودے توڑ ڈالے ہیں۔"

غفور سن ہو کر بیٹھا رہا۔ مہیش کے متعلق کتنی ہی بُری بُری باتیں اُس کے ذہن میں آئی تھیں لیکن یہ بات تو کبھی اُس کے وہم و گمان تک میں نہیں گذری۔ وہ جیسا معصوم ہے ویسا ہی غریب ہے۔ چنانچہ اُسے اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ کوئی پڑوسی اُسے ایسی سخت سزا دے سکتا ہے۔ خاص کر مانک گھوش سے جس کی گئو بھگتی اور برہمنوں میں عقیدت کا دور دور تک شہرہ ہے۔ ایسی توقع کسی تھی ہی نہیں۔

لڑکی نے کہا —— "دن تو چھپا چاہتا ہے بابو! مہیش کو لانے نہیں جاؤ گے؟"

غفور نے جواب دیا: "نہیں۔"

لیکن اس نے تو کہا ہے کہ اگر تین دن کے اندر اندر اُسے نہ چھڑایا گیا تو اُس کو مویشی میں بیچ ڈالیں گے۔

غفور بولا۔ "بیچ ڈالنے دو۔"

گئو ہتیا کیا چیز ہے۔ اینہ اس بات سے واقف نہ تھی۔ مگر ہیش کے بارے میں اس کا ذکر آتے ہی اُس کا باپ کس قدر بے چین ہو اٹھتا ہے، یہ وہ بہت دفعہ دیکھ چکی تھی۔ لیکن آج وہ اور کوئی بات کہے بغیر چپکے سے اٹھ کر چلا گیا۔

راستے کے اندھیرے میں چھپ کر غفور بنسی کی دکان پر جا کر بولا ——"چچا! آج ایک روپیہ دینا پڑے گا۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی پیتل کی تھالی بنسی کے بیٹھنے کی چوکی کے نیچے رکھ دی۔ اس چیز کے وزن وغیرہ سے بنسی واقف تھا۔ گذشتہ دو سال کے عرصے میں اُس نے اسے پانچ چھ بار گروی رکھ کر ایک ایک روپیہ دیا ہے۔ اس لئے آج بھی اُس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اگلے دن ہیش پھر اپنے تھان پر بندھا نظر آیا۔ وہی ببول کا پیڑ، وہی رسّی، وہی کھونٹی، وہی خالی ناند، وہی بھوک سے مضطرب سیاہ آنکھوں آنکھوں کی پُر اشتیاق نگاہ۔ ایک بوڑھا سا مسلمان اُسے بے حد تیز نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ قریب ہی ایک کنارے دونوں گھٹنے ملائے، غفور چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اچھی طرح دیکھ بھال کر اُس بڈھے نے چادر کے کنارے سے ایک دس روپے کا نوٹ کھولا، اس کی تہہ کھول کر، بار بار اُسے ٹھیک کرتا ہوا غفور کے پاس جا کر بولا —— اب مول تول کر کے اسے تڑواؤں گا نہیں۔ یہ لو۔ پورے دس کے دس روپے دیتا ہوں —— لو!

غفور نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ لے لیا اور اسی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جو دو آدمی اُس بڈھے کے ساتھ آئے تھے۔ اُن کے گیہا کو ہاتھ لگتے ہی غفور ایک دم اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور تیز لہجے میں بول اٹھا —— گیہا کو ہاتھ مت لگانا —— کہے دیتا ہوں —— خبردار! اچھا نہ ہوگا۔"

وہ چونک پڑے۔ بڈھے نے متحیر ہو کر کہا۔ "کیوں؟"

غفور نے اُسی طرح غصے میں جواب دیا ——"کیوں کیا؟ میری چیز ہے میں نہیں بیچتا۔ میری مرضی!"

اتنا کہہ کر اُس نے نوٹ ایک طرف پھینک دیا۔

"اُن لوگوں نے کہا۔ کل راستے میں بیعانہ جو لے آئے تھے؟"

"یہ لو۔ اپنا بیعانہ واپس لے لو۔"

اتنا کہہ کر اُس نے انٹی میں سے دو روپے نکال کر جھن سے پھینک دیئے۔ ایک جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوگا، اس خیال سے بوڑھے نے ہنس کر آہستگی سے کہا۔ "دباؤ ڈال کر اور دو روپے زیادہ لینا چاہتے ہو، یہی تو! دے دو جی، مٹھائی کے لئے اس کی لڑکی کے ہاتھ پر دھر دو دو روپے۔ بس، یہی تو!"

"نہیں"

"مگر اس سے زیادہ کوئی ایک ادھیلا بھی نہیں دے گا۔ معلوم ہے؟"

غفور نے زور سے سر ہلا کر کہا۔ "نہیں۔"

بڈھے نے ناراض ہو کر کہا ——"تو کیا؟ چمڑے ہی کی قیمت تو ملے گی۔ نہیں تو مال اس میں کیا ہے؟"

"توبہ! توبہ!" غفور کی زبان سے اچانک ایک بھدی اور تلخ بات نکل گئی اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنی کوٹھڑی میں جا کر چلّا چلّا کر دھمکی دینے لگا کہ اگر وہ جلدی سے گاؤں کے باہر چلے گئے تو انہیں زمیندار کے آدمیوں کو بلوا کر، جوتے لگوا کر نکلوا دیا جائے گا۔

شور و غل سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ مگر اسی اثنا میں زمیندار کے ہاں سے اس کا بلاوا آ گیا۔ بات مالک صاحب تک پہنچ گئی تھی۔

کچہری میں اُس وقت بھلے بُرے، اعلیٰ ادنیٰ سبھی قسم کے آدمی موجود تھے۔ شوشنکر بابو نے آنکھیں دکھا کر کہا۔ غفور! تجھ کو کیا سزا دی جائے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کس کی زمینداری میں رہتا ہے۔ جانتا ہے؟

غفور نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جانتا ہوں۔ ہم لوگ کھانے کے بغیر مر رہے ہیں حضور! نہیں تو آج آپ جو بھی کچھ جرمانہ کہتے، میں نہیں نہ کرتا!"

سبھی متحیر ہو گئے۔ اس شخص کو وہ ضدی اور بدمزاج ہی سمجھتے آ رہے تھے۔ غفور نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔ ایسا کام اب کبھی نہ کروں گا مالک صاحب!

اتنا کہہ کر اس نے خود ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑے اور آنگن میں ایک طرف سے دوسری طرف تک ناک رگڑ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

شوشنکر بابو نے رحم ناک لہجے میں کہا۔ "اچھا۔ جا جا۔ ہو گیا۔ جا۔ اب کبھی ایسی بے عقلی نہ کرنا!"

حالات سن کر سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس امر کے متعلق کسی کو ذرا بھی شک و شبہ نہ رہ گیا کہ ایسا گناہِ عظیم ہوتے ہوتے رُک گیا۔ وہ صرف مالک کے پُن کے پرتاپ سے اور اس کے دبدبے کی بدولت۔ پنڈت جی بھی موجود تھے۔ انہوں نے گئو کے لفظ کی شاستر کے مطابق تشریح کی اور اس بات کو ظاہر کر کے لوگوں کے گیان نیتر کھول دیئے کہ ایسی دھرم کے گیان سے بے بہرہ ملیچھ قوم کو گاؤں کے آس پاس کہیں بھی نہیں بسنے دینا چاہیئے۔

غفور نے کسی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ اُس نے اس بے عزتی اور ذلت کو سراسر واجب و مناسب سمجھ کر بسر و چشم قبول کر لیا اور وہ خوش خوش گھر لوٹ گیا

اس نے ایک بار نہ سنے کے بعد پیچ الٹ کر دیتی [illegible]
سینگوں یا بالائی پیر [illegible]

۳

[illegible] آتے ہیں [illegible]

[illegible] وقت [illegible] بہتی [illegible]

[illegible] آسمان [illegible] نہیں سکے گی

البتہ ان دنوں میں [illegible] وقت [illegible] ان کی عادت نہیں [illegible] دن [illegible] سبب اس کو [illegible] اس نے آواز دی [illegible]

لڑکی کوٹھری میں سے [illegible] چپ چاپ [illegible] کے سہارے کھڑی ہو گئی

جب کوئی جواب نہ ملا تو غفور رکھی آواز سے بولا [illegible] کہا نہیں ہوا؟ کیوں۔ کیوں نہیں ہوا بتا"

چاول نہیں ہیں بابو

چاول نہیں ہیں؟ صبح کیوں نہیں کہا مجھ سے؟

رات کو تو کہا تھا"

غفور نے منہ بنا کر اس کے لب و لہجہ کی نقل کرتے ہوئے کہا — رات کو تو کہا تھا! رات کو کہنے سے کسی کو یاد رہتی ہے؟

سخت لہجہ کے سبب اس کا غصہ دونا بھڑک اٹھا۔ وہ اپنے چہرے کو اور بھی زیادہ بگاڑ کر کہنے لگا — تو چاول رہیں گے کہاں سے۔ بیمار باپ کھائے یا نہ کھائے۔ دھینگڑی لڑکی کو چار چار پانچ پانچ دفعہ کھانے کو ضرور چاہیں۔ آج سے میں چاول تالے میں بند کر کے رکھوں گا۔ لا ایک لوٹا پانی دے۔ مارے پیاس کے جان نکلی جاتی ہے۔ کہہ دے — پانی بھی نہیں ہے!

ابھی اسی طرح سر جھکائے کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد جب غفور سمجھ گیا کہ گھر میں پینے کا پانی تک بھی نہیں ہے تب وہ ضبط نہ کر سکا۔ جھٹ اس کے پاس پہنچا۔ اور زور سے اس کے گال پر ایک طمانچہ جڑ دیا اور بولا کل موہی! حرامزادی لڑکی! دن بھر تو کیا کیا کرتی ہے؟ اتنے لوگ مرتے ہیں تو کیوں نہیں مرتی؟

لڑکی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ مٹی کا گھڑا اٹھا کر اسی کڑاکے کی دھوپ میں، آنسو پونچھتی ہوئی چپ چاپ چل دی۔ مگر اس کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی غفور کے سینے میں سول سا چبھنے لگا۔ بے ماں کی اس لڑکی کو اس نے کس طرح پال پوس کر بڑا کیا ہے، وہ وہی جانتا ہے۔

وہ سوچنے لگا۔ اس کی اس محبت بھری، فرض شناس اور حلیم طبیعت لڑکی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کھیت کا جو تھوڑا سا اناج تھا اس کے ختم ہو جانے کے بعد سے دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ کسی دن ایک وقت کھا کر رہ جاتے ہیں تو کسی دن وہ بھی نہیں نصیب ہوتا۔ دن میں چار چار پانچ پانچ دفعہ کھانے کی بات [illegible] ناممکن ہی جھوٹ بھی ہے اور گھر میں پانی کے نہ ہونے کا سبب بھی اس سے پوشیدہ نہیں تھا۔ گاؤں میں جو دو تین تالاب ہیں۔ وہ بالکل سوکھ گئے ہیں۔ شیو چرن بابو کے مکان کے پچھواڑے کے تالاب میں جو تھوڑا بہت پانی ہے بھی، وہ سب کو ملتا نہیں اور دو تالابوں میں ایک آدھ جگہ گڑھا کھود کر جو تھوڑا بہت پانی اس میں جمع ہوتا ہے اس کے لئے چھینا جھپٹی مچ جاتی ہے اور وہاں بھیڑ بھی تھوڑی نہیں رہتی۔ چونکہ ہم مسلمان ہیں۔ وہ ان کے پاس بھی نہیں جا سکتی۔ گھنٹوں دور کھڑی رہنے کے بعد، بہت منتیں کرنے پر کوئی ترس کھا کر اس کے برتن میں ڈال دے تو دو گھڑے آئے۔ اس بات کو وہ جانتا تھا۔ ممکن ہے آج پانی نہ رہا ہو۔ یا چھینا جھپٹی میں کسی کو لڑکی پر ترس کھانے کا موقع ہی نہ ملا ہو — ایسی ہی کوئی بات ہو گئی ہوگی یہ خیال کرکے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس اثنا میں زمیندار کا پیادہ جمِ دوت کی طرح آنگن میں آ کھڑا ہوا اور بولا غفور! گھر میں ہے کیا؟

غفور نے تیز لہجے میں جواب دیا — ہوں۔ کیوں کیا ہے؟

بابو صاحب بلا رہے ہیں۔ چل۔"

غفور نے جواب دیا۔ ابھی میں نے کھایا پیا نہیں۔ پیچھے جاؤں گا۔

اتنی ہمت پیادے کے لئے ناقابلِ برداشت ہوا تھی۔ اس نے ایک بھدے لفظ سے غفور کو مخاطب کر کے کہا — بابو کا حکم ہے۔ جوتے مارتے مارتے گھسیٹ لے جانے کا۔

غفور دوسری بار اپنے آپ کو بھول گیا۔ اس نے بھی ایک کڑا لفظ زبان سے

نکالتے ہوئے کہا ـــــ شہنشاہ جارج کے راج میں کوئی کسی کا غلام نہیں ہے لگان دے کر رہتا ہوں، مفت نہیں۔ میں نہیں جاتا۔"

مگر دنیا میں اتنے چھوٹے کے لئے اتنے بڑے کی دہائی دینا محض لاحاصل ہی نہیں بلکہ الٹا مصیبت کا باعث ہے۔ یہی خیر ہوئی کہ اتنی باریک آواز اتنے بڑے کانوں تک پہنچی نہیں ـــــ ورنہ ان کے منہ کی روٹی اور آنکھوں کی نیند ہی جاتی رہتی۔

اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے تفصیل وار بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن گھنٹہ بھر بعد جب وہ زمیندار کے صدر سے لوٹ کر چپ چاپ لیٹ رہا تو اس کا منہ اور آنکھیں سب سوج رہی تھیں۔ اس کی سزا کا سب سے بڑا سبب ہے مہیش۔ اس کے گھر سے نکلنے کے فوراً بعد ہی وہ پگہا تڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور زمیندار کے صحن میں پہنچ کر اس نے پھولوں کے سب پودے روند ڈالے۔ اخیر میں پکڑنے کی کوشش کی گئی تو وہ بابو صاحب کی چھوٹی لڑکی کو پٹک کر بھاگ گیا۔ یہ واقعہ پہلی ہی مرتبہ پیش آیا ہو، یہ بات نہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے۔ مگر غریب کے سبب اُسے معاف کر دیا جاتا تھا۔

لیکن رعیت ہو کر اس کا یہ کہہ دینا کہ وہ لگان دے کر رہتا ہے، وہ کسی کا غلام نہیں۔ زمیندار صاحب سے کسی بھی طرح برداشت نہ ہو سکا۔ وہاں اس نے پٹنے اور بے عزت و ذلیل ہونے کے خلاف ذرا بھی صدائے احتجاج بلند نہیں کی سب کچھ منہ بند کر کے سہہ لیا اور گھر لوٹ کر بھی وہ اسی طرح منہ بند کر کے پڑ رہا۔ بھوک پیاس کی بات اُسے یاد نہیں رہی۔ مگر آنگن سے جوں ہی اس کے کان میں اُس کی بیٹی کے رونے کی آواز پہنچی وہ جھٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور لپکا۔ باہر جا کر دیکھتا کیا ہے کہ امینہ زمین پر پڑی ہے اُس کے پھوٹے ہوئے گھڑے سے پانی نکل رہا ہے۔ اور مہیش مٹی پر مُنہ لگائے گویا ریگستان کی طرح پانی سوکھ سوکھ کر پی رہا ہے۔ پلک بھی نہ جھپکنے پائی تھی کہ غفور کے ہوش و حواس سب جاتے رہے۔ مرمت کے لئے کل اُس نے اپنے ہل کا سرا کھول کر رکھا تھا۔ اسی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس نے مہیش کے جھکے ہوئے سر پر زور سے دے مارا۔

ایک بار، صرف ایک بار مہیش نے مُنہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد اس کا بھوکا پیاسا کمزور جسم زمین پر لڑھک پڑا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے کن پٹیوں کی طرف ڈھلک گئے اور کان سے تھوڑا سا خون بھی بہہ نکلا۔ دو تین بار سارا جسم تھر تھر کانپ اٹھا۔ پھر آگے اور پیچھے کے پیر جہاں تک تن سکتے تھے تان کر مہیش نے آخری سانس چھوڑ دیا!

امینہ رو اٹھی ـــــ "کیا کیا بابو! مہیش تو اپنا مر گیا!"

غفور ٹس سے مس بھی نہ ہوا۔ نہ کوئی جواب دیا۔ صرف ٹکٹکی باندھے سامنے پڑے ہوئے مہیش کی نہ جھپکنے والی گمبھیر، سیاہ آنکھوں کی طرف دیکھتا ہوا پتھر کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

دو گھنٹہ کے اندر، خبر پا کر دوسرے گاؤں کے موچی آن موجود ہوئے اور مہیش کو بانس سے باندھ کر جنگل کی طرف لے چلے۔ ان کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے چُھرے دیکھ کر غفور کانپ اُٹھا۔ جھٹ سے اُس نے آنکھیں میچ لیں۔ اُس کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا!

محلّے کے لوگ کہنے لگے۔ "پنڈت جی سے "فتوے" لینے کے لئے زمیندار صاحب نے آدمی بھیجا ہے۔ پرائشچت کے (کفّارہ) کے اخراجات کے لئے روپیہ بہم پہنچانے میں اب تیرا گھر بار تک بک جائے گا!"

غفور نے ان سب باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گھٹنوں پر مُنہ رکھ کر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ بہت رات گئے غفور نے بیٹی کو جگا کر کہا "امینہ! چل۔ ہم لوگ چلیں یہاں سے ـــــ" وہ برآمدے میں سو رہی تھی۔ آنکھیں کھولتی ہوئی اٹھ کے بیٹھ گئی بولی۔ "کہاں بابو؟"

غفور نے کہا۔ "پھول باڑی کی جُوٹ مل میں کام کرنے!"

لڑکی حیرت میں پڑ گئی اور باپ کے منہ کو تکنے لگی۔ اس سے پہلے بڑے سے بڑے دُکھ میں بھی اُس کا باپ جُوٹ مل میں کام کرنے کو راضی نہیں ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا کرتا تھا۔ وہاں دین نہیں رہتا۔ لڑکیوں کی عزت آبرو نہیں رہتی۔ وغیرہ وغیرہ۔

غفور نے کہا ـــــ "اب دیر مت کر بیٹا! چل۔ بہت دور جانا ہے۔"

امینہ پانی پینے کا لوٹا اور باپ کے کھانا کھانے کی پیتل کی تھالی ساتھ لے رہی تھی۔ مگر غفور نے منع کر دیا۔ "یہ سب رہنے دے بیٹا! ان سے اپنے مہیش کا پرائشچت ہوگا۔"

نیم تاریک گہری رات میں غفور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گاؤں میں اس کا کوئی اپنا بیگانہ نہیں تھا۔ چنانچہ کسی سے کچھ کہنے سننے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ صحن پار کر کے جوں ہی وہ راستے کے کنارے اُس ببول کے پیڑ کے نیچے پہنچا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور زار زار رونے لگا۔ تاروں سے جڑے ہوئے کالے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر وہ کہنے لگا۔ "یا اللہ! میرا مہیش پیاسا مر گیا۔ اس کے چرنے کھانے تک کو کسی نے زمین نہیں چھوڑی۔ مجھے جس قدر چاہو سزا دے لو۔ مگر جس نے تمہاری دی ہوئی گھاس اور پیاس بجھانے کا پانی اُسے پینے نہیں دیا۔ اس کا قصور تم کبھی معاف نہ کرنا!"

رام سروپ کوشل

غزل

تعجب کیا جو اس کی قدر پہچانی نہیں جاتی
جنوں کی رفعتوں تک عقلِ انسانی نہیں جاتی

یہ ہے خود بخود بچپن میں جوانی میں بڑھاپے میں
بدلتی ہے مگر انساں کی نادانی نہیں جاتی

ہنسی پھولوں کی اور شبنم کا رونا دیکھ کر یک جا
چمن میں دیدۂ نرگس کی حیرانی نہیں جاتی

قیامت ہے بہشت جاوداں میں بھی نہیں تسکیں
یہاں بھی دل سے یادِ عالمِ فانی نہیں جاتی

نہایت دلکشا ہے تیرے جلووں کی فراوانی
مگر اس سے نظر کی تنگ دامانی نہیں جاتی

بنے شبنم کے قطرے ہو رہی پھولوں کی رنگینی
جہاں میں رائگاں کوئی بھی قربانی نہیں جاتی

محبت کی بری حضرت واعظ نے کی اک دن
اب ان کی کوئی سچی بات بھی مانی نہیں جاتی

اسد جب تک جہاں میں ربطِ حسن و عشق باقی ہے
سخن سنجی نہیں مٹتی غزل خوانی نہیں جاتی

اسد ملتانی

غزل

دل دل ہی رہے گا ہدفِ تیر ہو نہیں سکتا
خوں ہو کے بھی منظورِ نظر ہو نہیں سکتا

جو ظلم کیا تو نے کیا بے جگری سے
ایسا تو کسی کا بھی جگر ہو نہیں سکتا

تھک تھک کے تری راہ میں یوں بیٹھ گیا ہوں
گویا کہ بس اب مجھ سے سفر ہو نہیں سکتا

اظہارِ محبت مرے آنسو ہی کریں گے
اظہار بہ اندازِ دگر ہو نہیں سکتا

ہر بوند لہو کی کبھی بنتی نہیں آنسو
جیسے کہ ہر اک قطرہ گہر ہو نہیں سکتا

یہ عہدِ جوانی بھی ہے کچھ ایسا زمانہ
بے بادۂ سرجوش بسر ہو نہیں سکتا

لے جائے گا یہ دل مجھے اس بزم میں آخر
جس میں کہ صبا کا بھی گذر ہو نہیں سکتا

جب تک تری رحمت کا ہے کشفی کو سہارا
سچ یہ ہے گناہوں سے حذر ہو نہیں سکتا

کشفی ملتانی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

نیا ادب اور کلیم (سہ ماہی مختصر مارچ)

نئے ادب میں غزل کی جگہ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق نے

اس مضمون میں اردو غزل کے ماضی، حال و مستقبل پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اور اگرچہ یہ نگاہ کہیں کہیں غلط انداز بھی ہو گئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اُن کے افکار خیال انگیز ہیں۔ فراق صاحب جو کچھ درحقیقت کہنا چاہتے ہیں یعنی یہ کہ ہمارے آئندہ ادب میں غزل کا انداز کیا ہوگا۔ اسے کہنے کے لئے انہوں نے مضمون کا دو تہائی حصہ اس بحث میں صرف کر دیا ہے کہ موجودہ غزل نے کن کن تبدیلیوں میں سے گذر کر موجودہ صورت اختیار کی۔ کیا اچھا ہوتا اگر صاحب مضمون ہر دور یا ہر اسکول کا علیحدہ علیحدہ ذکر کر کے اُس کے ممتاز شعراء کی غزلیات کے نمونے بھی ساتھ ساتھ پیش کرتے اور پھر ان کا مقابلہ نئے ادب کی تخلیقات سے کر کے مطالب کو آئینہ کر دیتے۔ ہمیں افسوس ہے کہ فراق صاحب نے ایسا نہیں کیا اور نہ اُن کا مضمون عام ناظرین کے لئے بہت زیادہ پُر مطلب اور دلچسپ ہو جاتا۔

وہ مضمون کا آغاز اپنے بچپن کے تاثرات سے کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ آج سے تیس سال پہلے (کم از کم لکھنؤ کے اطراف میں) اس قسم کے اشعار کا چرچا تھا ؎

نہیں بچتا دلِ پُر داغ اُس کی زلفِ پیچاں سے
یہ وہ ناگن ہے جو طاؤس کو اُڑا اُڑا کے ڈستی ہے

یا ؎ جب تلک تھے تم کشیدہ دل تھا شکووں سے بھرا
تم گلے سے لگ گئے سارا گلہ جاتا رہا

اگرچہ حالی دوران کے انداز میں لکھنے والے چند اور شعراء بھی غزلیں کہہ رہے تھے لیکن "نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ چونچلوں کے سامنے اصلی حسن کی کب چلتی ہے۔ حالانکہ امیر اور داغ ہی کے زمانے میں اگر ایک طرف سارے ملک میں جہاں جہاں ہندوستانی بولی جاتی ہے ہزاروں جوان اور بوڑھے وہی چوماچاٹی والی شاعری کر رہے تھے۔ اور وہ بھی بالکل جھوٹی اور بناوٹی تو دوسری طرف حالی، شیفتہ، شاد عظیم آبادی، آسی غازی پوری اور کچھ اور لوگ بھی کم سے کم شاعری میں سچ تو بولتے تھے اور جہاں تک پریم اور سندرتا کا تعلق ہے اور کبھی بار جہاں تک زندگی کے دوسرے معاملوں اور پہلوؤں کا سمبندھ ہے کچھ آپ بیتی اور کچھ جگ بیتی اپنی غزلوں میں ضرور کہتے تھے لیکن کنوئیں میں بھنگ پڑی تھی۔ ہماری مجموعی ادبی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا کیا ذکر، پریم اور بھوگ بلاس سنجوگ۔ بیوگ کسی پہلو کی طرف نہ کان لگاتی تھی نہ آنکھ اٹھاتی تھی۔ اس زمانے میں غزل نام ہی پڑ گیا تھا جھوٹی اور بناوٹی باتوں کا۔ سچی بات کتنی ہی سجاؤ بھری رنگین اور رسیلی ہو لوگوں کے دل کو لگتی ہی نہیں اور سچی غزل غزل سمجھی ہی نہیں جاتی تھی۔"

اس اقتباس سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ صاحب مضمون کا غزل کے ناسخ اسکول کے متعلق کیا نظریہ ہے۔ وہاں یہ دلچسپ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ فراق ایسے شعراء بھی جن کی بلندیٔ فکر غزل کی وسعتوں میں فارسی اور عربی کی بلاغت کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، آج کل کے مخصوص حالات میں جب نثر لکھنے بیٹھتے ہیں تو کس تکلف سے تعلق کی جگہ "سمبندھ"، عیش و نشاط کی جگہ بھوگ بلاس، اور وصال و فراق کی جگہ سنجوگ بیوگ کے نامانوس الفاظ استعمال کرنے لگ جاتے ہیں۔ کچھ روز یہی عالم رہا تو ہمیں تعجب نہ ہوگا اگر فراق صاحب اپنے موجودہ تخلص کو بیوگ کے وزن پر درشید سے بدل لیں۔ خیر آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ دلّی اسکول کے شاعروں میں شاہ حاتم اور مظہر جانجاناں سے لے کر داغ کے زمانے تک کے شعراء اپنی غزلوں میں عشقیہ زندگی

کی سچی تصویریں کھینچتے تھے کہیں کہیں ناسخ، آتش اور مصحفی کی غزلوں میں جرأت اور
ناسخ نقطہ [illegible] پہنچ گئی۔ اس کے بعد
ناسخ و آتش کا زمانہ آیا۔ آتش [illegible]
اور ان کے شاگرد [illegible] سے شاعری
میں جرأت [illegible]
[illegible]
[illegible]
گالی گلوچ اور [illegible]
[illegible]
ناسخ اور امانت [illegible]
کے [illegible] اقبال [illegible]
بھی [illegible]

عجیب [illegible]
میں [illegible]

ناسخ [illegible] فکر و نزاکت خیال کے لحاظ سے
ممتاز ہو سکتے تھے۔ اور انہوں نے غزل کو آرٹ کے درجے تک پہنچایا [illegible]
بات ہے کہ اپنے زمانے کی مقتضیات کے لحاظ سے انہوں نے شاعری میں بھی
مشرقی [illegible] طالب کے نئے
نئے اسلوب پیدا کئے۔

جناب [illegible] نے انیسویں صدی کے خاتمے تک جن صاحب طرز شعراء
کا اثر غزل پر تسلیم کیا ہے، ان میں میر، درد، سودا، نظیر، غالب، ذوق، مومن
اور جرأت اور ان کے بعد ایک حد تک انشا، مصحفی، آتش، ناسخ، امیر مینائی
اور داغ اور پھر ریاض قابل ذکر ہیں ان کا کہنا ہے کہ ان شعراء نے
[illegible] ایک [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible] ایک [illegible]
پیدا کیا اور [illegible]
اس [illegible] ایک [illegible]
ہے کہ [illegible]
کہا [illegible] اور اس کے [illegible]
[illegible] شعروں [illegible] ہے بلکہ اردو کا ایک مستقل غزل گو ہے۔

آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ ۱۹۰۰ء کے قریب امیر اور داغ کا رنگ پھیکا
پڑ گیا۔ داغ کے بعد دہلی سکول تو ختم ہی ہو گیا۔ سبحان اللہ! لکھنؤ میں امیر اور جلال
نے [illegible] سنجیدہ [illegible] انداز ابھی تو آپ اسے گالی گلوچ کہہ رہے تھے پیدا
کر دیا تھا۔ [illegible] ان کے شاگردوں [illegible] رشید، پیارے صاحب، عزیز، ثاقب، نوبت رائے
نظر [illegible] نے خوب جلا دی۔ اگرچہ ان کی شاعری ایک بیمار آدمی کی ٹھنڈی سانسوں
[illegible] ڈھال بلکہ زیادہ تر تو چارپائی پر پڑے پڑے کروٹیں بدلنے کی یاد
دلاتی ہے۔

[illegible] سب سے بہتر نمائندہ عزیز لکھنوی ہے اور سب سے تیز
[illegible] یہ لکھنؤ کی نہیں عظیم آبادی ہے۔ مگر اس کی شاعری نے لکھنؤ کی راکھ
سے [illegible] کر فرسودہ دیوانوں میں آگ لگ گئی۔ یگانہ میں ایک بانکپن
اور [illegible] ہے لیکن اسی باعث وہ سماجی زندگی کا ترجمان نہیں بن سکا۔ فانی کی شاعری
کا [illegible] اگرچہ اس عام مقبولیت سے پیدا ہے جو مٹتے ہوئے لکھنؤ سکول کی امتیازی
کیفیت بھی [illegible] اس کے رخ پر بھی بیماری کی زردی عیاں ہو جاتی ہے۔ جگر
مراد آبادی کے متعلق صاحب مضمون کا خیال ہے کہ ان کی شاعری میں ردک تھام کی کمی
ہے اور اس کی بھٹک اور [illegible] اچھی نہیں لگتی۔ نیز ان کے انداز فکر میں ایک
[illegible] ہے [illegible] نہیں اور اس لئے اپنے والہانہ انداز کے باوجود جگر کے اشعار
میں لغزش [illegible] نہیں ہے۔ اصغر کی شاعری لطافت بے کثافت کی مصداق ہے
اس لئے بلندی فکر کے باوجود ایک جلوہ بے نمود سے زیادہ نہیں۔ البتہ حسرت
موہانی کا کلام صحت و تغزل کا ایک نہایت کمال نمونہ ہے۔ اگرچہ فکر کی بلندی اور فلسفیانہ
انداز خیال سے عاری ہے۔

اقبال کی نسبت صاحب مضمون کی رائے ہے کہ ان کی غزلیں ہماری نئی زندگی
[illegible] کا مفہوم [illegible] بہت وسیع ہے جس میں سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی تغیرات
کے تمام عناصر پائے جاتے ہیں کے بہت سے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر حاوی ہیں اور
اگرچہ ان میں متناقض باتیں پائی جاتی ہیں لیکن ان کے اشعار میں زندگی کا جوش، حرکت اور سیرابی
پوری طرح سے منعکس [illegible] ہے۔ یہی بات جوش میں پائی جاتی ہے۔ لیکن انہیں اقبال
کی سی موسیقی اور رعنائی میسر نہیں اور ان کا کلام اس بلندی اور گہرائی سے بھی محروم
ہے جو اقبال کا [illegible] رہے۔ البتہ جوش کی غزلیں اپنی کیف انگیز مردانگی اور صحت ور
روحانیت کے باعث ممتاز ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مولانا محمد علی جوہر اور آنند
نرائن ملا اور آخر میں خود اپنے غزلیہ کلام کی مثال دی ہے جو ایک نئے کلچر اور زندگی
ایک نئی حرکت سے متاثر ہے اور یہاں اردو غزل کا افسانہ دوشیں ختم ہو جاتا ہے
اور مضمون کا مدعا شروع ہوتا ہے۔

جناب فراق آنے والے زمانے کے ساتھ ایک نئی زندگی اور ایک نئے ادب کا تصور کرتے اور اس میں غزل کا مقام تلاش کرتے ہیں۔ وہ بجا فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہماری زبان میں موضوعی نظم کا وجود بھی شروع ہی سے ہے اور میر، سودا، نظیر، میر حسن، انیس اور دبیر کے کارنامے ہمارے سامنے موجود ہیں لیکن بحیثیت مجموعی جو چیز ادب پر چھائی رہی ہے وہ غزل ہی ہے ہاں چند سال سے نظم زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ اور غزل کو اگر ستادمی پسند کرتے ہیں تو نظم کو ایک ہزار۔" ہمیں صاحب مضمون کے اس اندازے سے اختلاف ہے۔ آگے چل کر کہتے ہیں اور بالکل بجا کہتے ہیں کہ نظم کی شاندار ترقی غزل پر اثر انداز ہو رہی ہے بعینہ اس طرح جیسے

"نظیر اکبر آبادی اور اقبال کی نظموں کا اثر خود اُن کی غزلوں پر ہے۔ ان غزلوں میں ایک نیا لس بل ہے۔ ایک نئی تازگی۔ ایک نیا نکھار ..... چونکہ میں زیادہ تر خود ایسی غزلوں سے پر بھاوت ہوتا تھا اور متاثر ہوتا تھا ..... جن میں معنویت ہو اور انسانی کردار و نفسیات اور کائنات کے اصولوں پر گہری نظر ڈالی گئی ہو اس لئے میرے دل میں اکثر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ جو لوگ غزل میں اتنی گہرائی کی پروا نہیں کرتے کیا انہیں ایسی غزلیں نہیں مل سکتیں۔ مجھے ساغر نظامی کی وہ غزل یاد آئی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

وہ کلیاں ابھی تک حسین و جواں ہیں

جہاں میں نے اپنی جوانی لٹا دی

یہ غزل بتا رہی ہے کہ غزل کو سوفی صدی آدمیوں پر اثر ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ محض جھوٹی اور بناوٹی ہو یا اس میں گری ہوئی اور رد ہوئی باتیں ہوں۔ ساغر کی یہ غزل ان گیتوں کی طرح ہے جو ہر ملک میں اور ہر ادب میں پوری قوم کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ کیا اس غزل میں ہماری موجودہ زندگی کی اسپرٹ لہریں نہیں مار رہی ہے۔ کیا قوم کی جوانی اس غزل بھر میں اٹھلاتی ہوئی نظر نہیں آ رہی ہے اور کیا اس غزل کی چہل پہل اور دھوم دھام اس سے بالکل الگ نہیں ہے جو امیر اور داغ، انشا اور جرأت کی شاعری میں ہم کو ملتی ہے۔"

اس سلسلے میں ایک لطیف نکتہ فراق صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر ہماری سہل غزلیں کسان اور کاریگر کسی کو لے سے گاتے ہوئے سنا کریں تو یہ ان کی زبانوں پر چڑھ جائیں گی اور ان سے نہ صرف ان کے ذوقِ موسیقی کی تسکین ہوگی بلکہ یہ اُن کی زندگی میں زور اور اکساؤ اور ابھار پیدا کریں گی۔ صاحب مضمون کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ ہمارے نیم مذہبی قصے اور منظوم داستانیں ہمیں دوسرے زمانے اور دوسرے لوگوں کی گئی باتیں سناتی ہیں جنہیں بھول جانا ہی اچھا ہے تاکہ ہم اپنے قریب کی جگ بیتی اور آپ بیتی سے عشق اور جوانی اور زندگی اور کائنات کے تاثرات سے اپنی زندگی پر تھوڑی دیر ہی کے لئے رونق اور آس کا ایک ہلکا سا سایہ ڈال لیں۔

یہاں پہنچ کر صاحب مضمون ایک قابلِ ذکر نکتہ پیدا کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اقبال، حسرت، یاس، فانی، اصغر اور جگر کا کام ۱۹۱۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۵ء میں ختم ہو گیا۔ اس دور کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات واقعیت، اصلیت، بلند معیاری، گہرائی اور معنویت ہیں اور حسن و عشق کے معاملات اور حقائق اس دور کی غزلوں میں ایک گہرے فلسفیانہ رنگ میں پیش کئے گئے ہیں لکھتے ہیں۔

"لوگ غزل کو عشقیہ شاعری سمجھ کر اکثر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ عشق تو آدم کے وقت سے آج تک ایک ہی چیز ہے ایک ہی تجربہ ہے ایک ہی بات ہے ..... اور دو میں عشقیہ شاعری میر، غالب، مومن، جرأت اور داغ کے ساتھ ختم ہو گئی ..... اس غلطی میں حالی اور آزاد بھی پڑ گئے ..... حسن کو سمجھنا او حسن سے ہم آہنگی، حسن کا نیا احترام، حسن سے نئی ہمدردی، ایک نئی بے صبری اور بے صبری، اور ایک نیا صبر ایک نئی داخلی معاملہ بندی جو ہمیں اس دور میں ملتی ہے۔ وہ میر، غالب، مومن، جرأت، اور داغ کے یہاں نہیں ملتی یا اس کھل اور رچ کنایہ اور رچے ہوئے انداز میں نہیں ملتی دورِ حاضر کی غزل سے ناامیدی، بے دلی اور رائس پھوئیت کے وہ آثار بھی دور ہو گئے جو پونے دو سو برس تک غزل پر حاوی تھے اور نہ وہ سطحی یعنی جذباتی نشاط اس دور کی غزل میں ہیں (سے)۔ جو سعدا اور ان کے ہم مزاج اور ہم مذاق شاعروں کے یہاں موجود ہے ..... آج اگر غم کے جذبات اور احساسات ہیں بھی تو وہ اس آزمائش اور ان مشکلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کا احساس متفکرانہ غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس طرح ان غزلوں کا جذبۂ نشاط بھی زیادہ گہرا اور متفکرانہ ہے بہرحال غزل کی یہ داخلیت ایک نئی چیز ہے تصوف بھی بہت بدلی ہوئی شکل میں اس دور کی غزلوں میں دکھائی اور سنائی دیتی رہتا ہے۔ واقعیت بھی پرانی غزلوں کی واقعیت کے مقابلے میں اپنی پیچیدگی اور سادگی دونوں لحاظوں سے بدلی ہوئی ہے اس دور کی غزلوں کے لغت اور انتخابِ الفاظ میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ زمینوں کی ایجاد اور رنگینیت میں یہ دور پچھلے تمام دوروں سے بہت بڑھا چڑھا ہوا ہے۔ تجربہ اور تشکیک بھی جس رنگ اور انداز

[illegible] دور میں [illegible] وہ ایک بڑی چیز ہے اور نئی چیز
ہے اردو غزل [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسی کو [illegible]

[illegible]

وہ [illegible]
[illegible]

زندگی کی [illegible]

[illegible]
[illegible]

یہ اشعار ہیں اقبال کے جنہیں [illegible] بال جبریل کے سرورق پر لکھا ہے"

زیرِ نظر مضمون کے مندرجہ بالا دو اقتباسات سے اس کی روح آشکار ہو جاتی ہے۔ فراق کا حسنِ بیان ان میں اپنی پوری آب و تاب سے موجود ہے اور انہوں نے غیر معمولی سلیقے سے اپنے مطالب کی وضاحت کی ہے۔ کاش کہ ان کا یہ اندازِ مضمون کے دوسرے حصوں میں بھی قائم رہ سکتا۔

یہاں سے آگے چل کر وہ یہ دعوے کرتے ہیں کہ رومانیت کا دور ۱۹۲۵ء میں ختم ہو گیا۔ اور روایت کے دور اور کلاسیکی دور نے سوا سو برس کے بعد نئی صورت میں جنم لیا۔ اس جنم کی سب سے بڑی علامت ملک کی سیاست میں اشتراکی خیالات کی نمود تھی اور صاحبِ مضمون اس نمود کو اردو ادب اور اس کی صنفِ غزل میں ایک دورِ رس انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن پھر ایک شاعر کے انہیں ابھی تک اس انقلاب کا کوئی نقیب نظر نہیں آیا۔ یہ شاعر بقول آنند نرائن ملا جن کے [illegible] رومانیت اور روایت کی درمیانی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن [illegible] فراق [illegible] حسرت موہانی اور ان کا ہم عمر گروہ یا ہم اور آپ کسی تیس پینتیس سال [illegible] ایسے شخص کو کہیں جانتے جسے آنے والا بڑا غزل گو تسلیم کیا جائے؟

اور پھر سوال کرتے ہیں۔

تو کیا ہماری نئی زندگی اور نظم اور نثر کے ہمارے نئے ادب کے سرد [illegible] اور [illegible] نے غزل کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیا؟ ہماری [illegible] ابھی رات کے پردوں میں چھپی ہوئی ہے اور ہماری نئی صبح [illegible] سات رنگ [illegible] کرنوں کے ساتھ ایک نئی غزل [illegible] کرن کا [illegible] ہوگا!

[illegible] قیامت کے
[illegible] ڈوب کر اب پھوٹنے کو ہے کرن کوئی؟

اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔

[illegible] لیکن یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ نئی زندگی اور نئے ادب میں غزل کا [illegible] مرور ہو گیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا اور کچھ زمانے [illegible] نئی [illegible] اور نئے پہلوؤں کے ساتھ اور نئے انداز کے ساتھ یہ دور پھر سامنے آئے گا۔

ان کا کہنا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے غزل گو جس ماحول سے متاثر ہوئے تھے وہ اب بدل چکا ہے۔ ہمارا ملک اپنی تکمیل کو پہنچ رہا ہے اور اس کے مستقبل میں معمولی اور رسمی غزل گوئی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نئے زمانے کی غزل گوئی میں میر اور غالب سے بھی کام نہیں چلے گا۔ نہ آتش اور داغ سے کام نکلے گا اور نہ حسرت اور فانی سے [illegible] نے [illegible] چھوڑا زمانے میں! فراق صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس وقت تک [illegible] رہے گا جب تک کہ کوئی شعلہ نوا ہمارے پارینہ تلخ غزل کو اپنے سوزِ سخن سے آگ نہیں لگاتا اور یہ ان کا اپنا قول ہے کہ وہ شعلہ نوا ابھی پیدا نہیں ہوا۔ نئی غزل کا معیار تو اسی وقت معلوم ہوگا جب اس معیار کی غزلیں ہمارے سامنے آئیں گی۔ اس وقت تک بقول صاحبِ مضمون ہمیں غزل کے موجودہ امکانات کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ زندگی اور دنیا کے بے شمار راز ایسے ہیں جنہیں دنیا کا ادب ختم نہیں کر سکا ہے۔ پھر غزل کا دامن کیوں تنگ رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

انقلاب کے بعد ہماری نئی زندگی جس تہذیب کو قائم کرے گی اس سے انسان کو ایک نیا مزاج ملے گا۔ انسان کی آنا میں ایک نئی تھرتھراہٹ

اور نیا شہزادہ پیدا ہوگا اور ہماری غزلوں میں اس کی تھرتھراہٹ اور شہزادہ کا ثبوت ملے گا ...... نئے زمانے کا غزل گو نئی دنیا اور نئے ہندوستان میں رہ کر پرانے مشہور غزل گو شاعروں کے کلام سے مطلقاً طور پر متاثر ہوتا ہوا آگے بڑھے گا۔ اور حسن، عشق، زندگی اور کائنات کی کہانی دل سے چھیڑے گا جو اب تک کی غزلوں کے نغمے نغمنا میں گونجتے ہوئے سکوتِ ابدی میں تھرتھرا رہے ہیں۔"

مگر غزل کے اس مہدی کا ظہور آخر کب ہوگا؟ صاحبِ مضمون اس بارے میں ہمیں فقط اس قدر تسلی دیتے ہیں کہ دیر ہے اندھیر نہیں۔ ادب میں ہر صنف کی رفتار یکساں نہیں رہتی کبھی کوچ ہے تو کبھی مقام۔ آج کل کارواں منزل میں ہے۔ تب تک آپ نئے ادب کی نئے پکارتے رہیئے۔

فراق صاحب کا یہ قابلِ قدر مضمون ہمیں کچھ قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ پرانی بساط سمٹنے سے پہلے نئی آرائش کا کچھ سامان ہو جاتا تو ہم لوگ دیدہ و دل فرشِ راہ کئے ان نو بہارانِ ناز کے منتظر رہتے جن سے نئی شاعری کی فضائیں رونق پائیں گی مگر افسوس ہمارے جیتے جی اس کی امید نہیں۔

اسے[1] وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا۔

ساقی (مارچ)

بھورہ۔ کچھ عرصے سے اردو میں حیوانات کے متعلق اچھے اچھے افسانے شائع ہو رہے ہیں اور ہمارے افسانوی ادب میں جدید راہیں کھل رہی ہیں۔ ناظرین ادبی دنیا اس قسم کا ایک بہت اچھا افسانہ تماکو گذشتہ سالنامے میں دیکھ چکے ہیں جسے شاہد احمد صاحب مدیر ساقی نے انگریزی سے اردو میں کیا تھا۔ گذشتہ جولائی کے دنیائے ادب میں ہم نے اسی قسم کی ایک اور دلآویز کہانی کا تذکرہ کیا تھا جو سید رفیق حسین صاحب نے بیرو کے نام سے لکھی تھی۔ سید رفیق حسین نے جانوروں کی زندگی کو اپنا مستقل موضوع بنالیا ہے اور وہ اس انداز میں زبان کی ایک بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

زیرِ نظر افسانہ سراج الدین احمد صاحب دہلوی کا نتیجۂ فکر ہے اور کہانیوں کی اس مخصوص قسم میں ایک نہایت کامیاب اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔ زبان و بیان کی خوبیوں نے افسانے کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ پلاٹ سادہ لیکن بے حد دلچسپ اور خیال انگیز ہے۔ پڑھنے والا اپنے آپ کو اس بے زبان مخلوق کے نہایت قریب پاتا ہے۔ جسے اس نے آج تک اپنے غور و فکر کا ایک لمحہ بھی عنایت نہیں کیا تھا۔ وہ کہانی پڑھتے پڑھتے جابجا شدتِ تاثر سے تڑپ اٹھتا ہے اور اپنے کلیجے میں درد کی ایک عجیب و غریب کسک محسوس کرتا ہے۔ ایسی جس سے آج تک اس کا پہلو ناآشنا تھا۔

بھورہ چمپا کی بھینس کا کٹڑہ ہے جو غربت کے نازوں میں پلا اور اپنی مختصر زندگی کے دکھ اٹھا اٹھا کر اس بہیمیت کی نذر ہو گیا جسے دولت مندی اور حکومت جنم دیتی ہے۔ انسان اس زندگی اور اس کی گوناگوں کیفیتوں۔ اس کے احساسات کو صرف اپنی نوع کے لئے مخصوص سمجھتا ہے۔ اور نوعِ حیوانات کو ہر قسم کے جذبات و احساسات سے عاری۔ افسانۂ زیرِ نظر میں اس سنگ دلانہ نظریے کی نہایت معقول اور موثر تردید کی گئی ہے۔ بھورے کی پیدائش کا بیان نہایت دلچسپ اور زبان کی لطافتوں سے معمور ہے۔ بوڑھی چمپا اور اس کی ہمسائیوں نے اس نومولود کا استقبال جس انداز سے کیا وہ دیکھنے کے قابل ہے۔۔

> "انارکلی، ہردئی، اور دوسری پڑوسنیں چمپا کی خوشی میں شریک ہو گئیں۔ گویا چمپا کی نہیں انہی کی بھینس بیائی تھی۔ "ناری بہنا میں تو پوچھوں ہوں کہ کٹڑہ ڈالا کہ کٹڑی؟" رتھو نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔
>
> "کٹا۔ ابھی تو۔" چمپا نے جواب دیا اور انارو سے کہا آری گھر گئی اٹھا کے دیکھے۔ ہے، انا کٹڑہ ہے کٹڑی؟
>
> "بھورا ہے بھورا" انارو نے نومولود کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہے تیرا ناس جائے۔" انارو بولی "کٹڑہ ڈالا ہے کمبخت نے کٹڑہ۔" اس اعلان نے چمپا کی خوشی میں کمی کر دی۔ کیونکہ کٹیا کی قیمت بہ نسبت کٹڑہ کے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مگر رتھو پر اس ریمارک کا کوئی اثر نہ ہوا۔
>
> "اری چمپا او بہری ہٹ" انارو نے بڑھیا کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اری سنے نہ ہے۔ اری بڑکا برتن لادے پیوسی نکال دوں۔ ہم تو باٹ دیکھ رہے تھے کہ تیری بھینس بیائے پرے تو ہم پیوسی کھائیں۔"
>
> "مجھے بھی دیکھو" ہردئی نے چیخ کر کہا۔
>
> "ہے گھر گئی۔ مجھے نہ دے گی تنک سی" رتھو نے پکار کر کہا۔
>
> اتنے میں گاؤں کے بنئے کا بیٹا موتی بڑی سی لٹکنی لئے داخل ہوا۔
>
> "ہے بڑی اماں بہری!! بالو نے کہا ہے بھورت نہ بگاڑیو سب سے پہلے ہمیں پیوسی دیجو۔"
>
> بڑھیا کا بشاش چہرہ بنئے کے خیال سے اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

بھینس کے دودھ کی حیات افروز اور جاں بخش دھاروں کا اثر بھورے پر کم ہوا اور ستر جو بنئے پر زیادہ۔ بھورے کو دودھ ہی کتنا ملتا تھا گنتی کی دھاریں، اگر وہ کٹیا ہوتا تو شاید امیدِ فردا پر بڑھیا اس کو اپنی ماں کے تھنوں سے چند روح افزا دھاریں اور پی لینے

[1] غالب کی مدح سے معذرت کے ساتھ!

دنی کا بھورے کو سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ [illegible] اسے اطہر پیدا
کیا تھا [illegible] رستہ کو [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
پڑا رہا اس کی زندگی کا [illegible]
اور بھوک کی حالت میں [illegible]
کے [illegible] سے رم رم کر اور چلے [illegible]
والی [illegible] کے مقابلے میں [illegible] زندگی کا [illegible]

آپ نے دیکھا صاحب [illegible] نے ایک [illegible] روز مرہ نظر آنے والے معمولی کو کیسی چابک دستی سے کہ بات ایک آرٹسٹ کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ وہ بظاہر نہایت معمولی اور بے رنگ چیزوں میں اپنے فن کے اعجاز سے ایک نئی روح، ایک جدید معانی اور ایک تازہ زندگی داخل کر دیتا ہے اور وہی مردہ موضوع جس کی طرف ہماری توجہ کبھی مائل نہیں ہوئی تھی اب ایک حقیقتِ عظمیٰ بن کر ہمارے رگ و پے میں سما جاتا ہے اور ہمیں زندگی کے نئے معنوں سے آشنا کر دیتا ہے۔ ہمارے خوابیدہ احساسات از سرِ نو بیدار ہو جاتے ہیں۔ غفلت کے موٹے موٹے پردے ہماری آنکھوں کے سامنے سے ایک ایک کر کے ہٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ [illegible] زندگی [illegible] آنکھوں سے دیکھنے لگ جاتے ہیں اور [illegible] کا احساس ہمارا [illegible] بن جاتا ہے۔

اب [illegible] زندگی کا [illegible] دور شروع ہوتا ہے۔ وزارت کے ایک [illegible] کی موقعی [illegible] پارٹی جیت گئی ہے لیکن حکومت [illegible] ضروری [illegible] رکھا اور [illegible] کی وساطت سے منی لال [illegible] ایک [illegible]

[illegible] اور [illegible] ایک
[illegible] سال کی عمر کے [illegible]
[illegible] ابھی تک [illegible]
[illegible] منی لال [illegible]
[illegible] جہاں بڑھیا [illegible] بھینس کا [illegible]
[illegible] بوڑھیوں میں افلاس زدہ قصبہ
[illegible] جن میں پولیس کے
[illegible] اور بڑھیا میں [illegible] دیکھ کر
[illegible] منی لال نے [illegible]
[illegible] بھینس عمر سات ماہ
[illegible] قیمت پانچ
[illegible] منی لال [illegible] فروخت کیا۔
[illegible] بڑھیا کا نشان انگوٹھا لیا۔ [illegible] سے تیس روپے
[illegible] بڑھیا کو دے [illegible] کھول [illegible]
[illegible]

[illegible] ادھر بڑھیا پچھاڑ کھا کر گری۔ مگر اس کی کون [illegible] بھینس [illegible] دکھ کے ساتھ ساتھ ہوئی گرمی وں نے بھینس کی رہ کشائی کی [illegible] اور گاؤں والے سے [illegible] واپس سے آئے۔

[illegible] کہ ستی سی بھینس [illegible] ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی
بڑھیا کے دل پر بھینس کے [illegible] کا اور [illegible] کے بڑھتے ہوئے سود کی زرقی
کا جسم میں بھینس [illegible] گئی تھی کچھ [illegible] کہ دل کی حرکت بند

ہو جانے سے مسلسل نصف صدی کی صعوبتوں کا خاتمہ ہوا بہت جلد
اُس کی واڈلی بھی جس کو اُس نے مثل اولاد کے پالا تھا بڑھیا سے ایک
اور ہی دنیا میں جا لی۔ ایسی دنیا میں جہاں نہ جور و استبداد کی منسٹری
تھی، نہ ظالم پولیس کی دھونس اور نہ بر جو بنیے جیسے خون آشام دیکھیرین
درندے؟

منی لال بھورے کو پکڑ کر رسی سے مارتے پیٹتے تھانے لے گئے اور وہاں سے دوسرے دن سات اور بڑے کنڑوں کے ساتھ ان کا چالان جنگل کی طرف کر دیا گیا، جہاں وزیر صاحب بہادر اگلے دن شیر کا شکار کھیلنے والے تھے۔ ان کے کوچ کا نظارہ بہت دلچسپ ہے ایک جھلک دیکھئے۔

"آخر یہ کنڑے بھی بھینس کے پوت تھے بہت جلد تھک گئے اور گلے بغل بھاگنے اور کچھ ادھو چہلو کا سبزہ بھی اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ مگر تھیا اور فیتاداوس بائیں فرشتوں کی طرح تعینات تھے۔ بڑھ کر بتھ ٹپے پر ایسا لٹھ دیتے کہ منہ پھر جاتا۔ یوں بھی اچھے خاصے چلتے چلاتوں کی خوامخواہ پٹائی ہوتی جا رہی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ تیز گام نہ تھے ...... کنڑوں کو مار مار کر انہوں نے سچ مچ کمال اڑا دی۔ سب سے زیادہ مار اس غریب بھورے پر پڑی کیونکہ ان میں سب سے یہی چھوٹا تھا اور بہت چھوٹا اس لئے اس کا قدم بھی چھوٹا تھا۔ اور سب سے پیچھے چلنے کے لئے رہ رہ جاتا تھا۔ فضائیں سے کوسے کی بڈی پر لکڑی پڑ پی!"

غرض اس انداز میں چلے جا رہے تھے۔ رات کو ایک گاؤں میں مقام ہوا۔ مگر کھانے کے نام سے ایک تنکا نہ ملا۔ دوسرے دن پھر کوچ ہوا پہلے سے بڑھ کر بدسلوکی شام تک پر وہی بیتی۔ دوسرے کنڑوں کی کہانی سے ہمیں واسطہ نہیں۔ بے چارے ایک ایک کر کے خیبر کا لقمہ بنے۔ بھورے کو بڑے صاحب کے مچان کے نیچے باندھا گیا تھا مگر وہ دو دن لیٹ ہو گئے اور بھورے کی زندگی بھی بقدر اس میعاد کے بڑھ گئی۔

"جب یہ لوگ مچان پر بیٹھ گئے تو ایک قلی بھورے کو کھینچتا اور دوسرا ہول پر نشیں اڑاتا لایا...... تنہا رہ جانے پر بھورے نے بھاگنا چاہا اور گرا جو ہے تو تھوتھنی اس زور سے پتھر پر لگی کہ منہ میں دانت ہوتے تو قطعی ٹوٹ گئے ہوتے۔ اس کو معلوم ہی نہ تھا کہ گردن کے علاوہ پیر بھی باندھ دیا جاتا ہے۔ تنہائی سے گھبرا کر اس نے وحشت سے ادھر ادھر دیکھا۔ انچوا سا طبیعت نیا ہوا منہ دنگا یا گھپ مٹھی سے رستا ہل کھا کر وہ بھی بجھڑ کا ہو گیا۔ بھورے کو پہلی بار قید تنہائی ہوئی تھی ...... جس طرف بجلہ چلے گئے تھے اس طرف یہ بھی جانا چاہتا تھا اسی طرف منہ اٹھا کر اور کان تھوتھنی کی طرف بڑھا کر رہنکنا شروع کیا اور جواب کا منتظر بھی رہا۔ اتنے میں بڑے صاحب جو انجینئر صاحب کے ساتھ دم بخود بیٹھے تھے کھانسی کو ضبط نہ کر سکے۔ بس پھر کیا تھا کنڑے نے مچان پر آدمیوں کو دیکھ لیا۔ اس کی وحشت دور ہو گئی اور رہنکنا بند کر دیا۔ انجینئر صاحب کو نجیب صاحب پر نہیں بلکہ کنڑے کی خاموشی پر بہت غصہ آیا۔ انہوں نے سیٹی دی۔ چپڑاسی کے آنے پر ان کو حکم دیا کہ کنڑے کا کان چاقو سے پھاڑ دو اور اس میں مرچ بھر دو۔ یہ گفت رہنکتا نہیں۔ حکم پورا کیا گیا۔ ترکیب لاجواب تھی۔ بھورا پوری طرح ڈکرایا اور مسلسل ڈکراتا رہا۔ شیر نے دور پہاڑ پر سے بھورے کی آواز سنی اور لپکا۔"

اب ہمیں شیر کے آنے اور بڑے صاحب کے گھبرا کر فارغ ہو جانے سے غرض نہیں۔ اگرچہ بیان بجائے خود بہت دلچسپ ہے۔ شیر انسان کی آہٹ پا کر واپس چلا گیا۔ صاحب بہادر بنگلے کو چلے گئے جہاں سردی سے حفاظت کے لئے دھڑا دھڑ آگ جل رہی تھی۔ بھورے کو وہیں بندھا رہنے دیا گیا کہ شیر مارے۔ مگر شیر کہاں! دوسرے دن صبح کو

"بھورے زندہ تھے مگر مردوں سے بدتر۔ ہاتھ پیر اس درجہ اکڑ گئے تھے کہ چاروں نے اٹھانے کی بہتیری کوشش کی اور خود کنڑے نے بھی، مگر ہاتھ پیروں میں سکت ہی باقی نہ تھی۔ رات بھر کی بھوک شدید سردی، ڈر، خوف اور کان کی تکلیف سے بھورا آدھا رہ گیا۔ چاروں کا مشورہ یہی ہوا کہ چونکہ گذشتہ شب شیر ادھر سے نہیں نکلا اس لئے آج رات ضرور آئے گا اور بھورے کو یہاں ہی بندھا رہنے دو۔ آج ضرور مارے گا۔ ایک چمار کو رحم آیا اس نے کنڑے کو اور اس کی سات پشتوں کو گالیاں دیں اور اس کے حق میں دعائے خیر کی کہ آج رات شیر فٹ کھا جائے اور نصف سے روٹی کے بیچ توڑ کر اس کے آگے ڈال دیے۔ رات کو زور کرنے کی وجہ سے بھورے کا اگلا پیر بہت سوج گیا تھا اور اس شدت کا درد تھا کہ اس کی جان نکلی جاتی تھی۔ اپنی ماں کی آغوش اور پوپل کے امن کو یاد کر کے وہ کس بری طرح رو رہا تھا۔ مگر تم ظاہر ہے نہیں اس کی آنا رو رہی تھی۔"

دوسرے کنڑے، سے گئے بھورا شیر کے انتظار میں ابھی زندہ تھا کہ ناگاہ بڑے صاحب شکار سے واپس ہوئے۔ اب کسے جلدی پڑی تھی کہ بھورے کی خبر لیتا۔

"دوپہر کی دھوپ سے اس نیم جان کی جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک کروٹ پڑے پڑے پتھر اس کے جسم میں گڑ گئے تھے۔ وہ اس مریض کی طرح اٹھا جو مرنے

سے چند گھنٹے قبل [illegible] آنکھوں
کے سامنے [illegible] بھی [illegible]
[illegible]
[illegible]
نے پہلی [illegible] گر پڑا ....
آفتاب انسانی [illegible]
میں [illegible] کر اپنے [illegible] رہے تھے ....
اندھیرا [illegible] تاریکی [illegible] ہیبت ناک تاریکی [illegible]
تاریکی [illegible]
کا سانس [illegible]
سنگ ریزوں کا گنگناتے ہوئے [illegible] میں ترنم پیدا کر رہا تھا کے
سیاہ سناٹے میں [illegible] پیدا کر رہا [illegible] اس خوفناک ماحول
میں [illegible] اب بھی زندہ تھا۔ مگر اس کے ہوش و حواس زائل
ہو چکے تھے۔ شیر اس کے پاس [illegible] شیر کو اپنی
طرف متوجہ کیا [illegible] دیکھا کہ [illegible] بھوکا پیاسا [illegible]
[illegible] کی [illegible] بے بسی اور بے کسی کی حالت
میں دم توڑ رہا ہے۔ وہ [illegible] کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ ایک کرا
[illegible] ہوئی [illegible] ہوئے [illegible] خود بخود پھیل گئے۔ گردن کھنچ
گئی۔ منہ میں کف بھر گئے۔ ضعیف سی ڈکرانے کی آواز نکلی جسم
کے بال کھنچ [illegible] اور پھر [illegible] کی جان نکل
گئی۔ شیر [illegible] کی لاش کے پاس بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا"

انجام! کس قدر حسرت ناک انجام۔ زبان کی نزاکتوں سے صاحب افسانہ کی حیرت انگیز آگاہی، ان کے بیان کی غیر معمولی لطافت افسانہ کی سب سے ممتاز خصوصیات ہیں۔ انسان کی مجبوریاں شیریں اور اس سے محض ایک درجہ کم رکھنے والی مخلوق کی حیرت انگیز قربانیاں شاید ایسی خوبی سے بہت کم بیان کی گئی ہیں مگر اس بلند پایہ افسانہ میں ہمیں کہیں کہیں ایک کمزوری بھی کھٹکی اور وہ صاحب افسانہ کا فلسفیانہ اور واعظانہ انداز تفکر ہے جس کا اظہار کہانی میں دو تین جگہ بے ضرورت کیا گیا ہے مثلاً ایک اس جگہ جہاں جانوروں کے دودھ پر انسان کے ناجائز تصرف کا ذکر ہے۔ اور پھر آخر میں جہاں شیر ایک فلاسفر کی طرح انسان کے افعال اور کردار کا جائزہ لیتا ہے یہ اور اس قسم کا ایک آدھ اور ٹکڑا اگر اس افسانے سے خارج کر دیا جائے تو افسانے کی تکنیک سے ایک بڑی خامی دور ہو جائے گی۔ افسانہ کا کام صرف حقیقت کو پیش کرنا ہے۔ اس سے نتائج اخذ کرنا نہیں۔ یہ نقص ایک ایسے افسانے کو اس کی بلند فنی سطح سے گرا کر اخلاقی پروپیگنڈے کی پستیوں تک لے آتا ہے اور ہمارے نزدیک یہ ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ صلاح الدین احمد صاحب اپنے آئندہ افسانوں میں زیادہ احتیاط سے کام لیں گے۔

صلاح الدین احمد

نقد و نظر

آہنگ ملک کے نوجوان شاعر جناب اسرار الحق مجاز کا پہلا مجموعہ کلام ہے
جسے ترقی پسند مصنفین کے سلسلے میں حلقۂ ادب لکھنؤ نے
شائع کیا ہے۔ یہ ۲۲×۲۹/۱۶ کی تقطیع پر ۱۰۴ صفحے کی ایک مختصر سی جاذب نظر کتاب
ہے۔ جس کے شروع میں "زیب داستان" کے عنوان سے جناب سجاد ظہیر
نے ایک مختصر تعارف لکھا ہے۔ جس میں اُنہوں نے انقلابی شاعری اور ترقی
پسند ادب کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ اور آخر میں چند سطروں میں مجاز کو
ایک انقلابی شاعر کہا ہے۔ لیکن "انقلابی" کے مفہوم کی جو وضاحت اُنھوں نے
کی ہے اُس کے لحاظ سے میرے خیال میں مجاز انقلابی شاعر نہیں ہے کیونکہ
کم اُس کا یہ مجموعہ کلام تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسی جذبۂ جنسی کے کرشموں کا اظہار
اپنے کلام میں کرتا ہے جس کی طرف آج ہمارے ہر اچھے شاعر کی توجہ ہوتی رہی ہے۔
(اور مجاز ایک اچھا شاعر ہے)

تمام مجموعے میں صرف چھ یا سات نظمیں ایسی ہیں جنھیں اس مفہوم
کے لحاظ سے انقلابی کہا جا سکتا ہے جس کا تعین جناب سجاد ظہیر نے کیا ہے۔
سب سے پہلے تو انتساب ہی اس اشارے کا حامل نظر آتا ہے کہ مجاز
کی شاعری عشقیہ جذبات کی مرہونِ منت ہوگی کیونکہ اس کے تین مختصر لفظ یہ ہیں
"کسی کے نام" اس کے بعد تعارف (زیب داستاں) ہے اور پھر مجاز کا ایک اپنا
شعر ——

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

لیکن اس مجموعے کے مطالعے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ شاعر نے شمشیر
کو نظر انداز کر کے ساز اور جام کی طرف توجہ کی ہے اور یوں اگرچہ اپنی نظروں میں
"بڑا کام" نہیں کیا لیکن میری نظروں میں اُس کا یہ کام بھی بڑا ہی ہے کیونکہ اُس
کی طبیعت کا بنیادی اور پیدائشی رجحان ساز اور جام ہی کی طرف ہے
بلکہ ساز اور جام کی شکل میں "رونقِ محفل" کی جنسی حیثیت اُس کی ذہانت کا مرجع
ہیں اور میرے خیال میں یہ منظوم تعارف پہلے منثور تعارف سے کہیں زیادہ صحیح
ہے۔
تعارف کے عنوان سے مجاز نے سب سے پہلے اُنھیں شعر درج کئے

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ الفت کا طلبگار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
اہلِ دنیا کے لئے ننگ سہی
رونقِ انجمنِ یاراں ہوں میں

اور آخری دو شعر ہیں۔

محفلِ دہر پہ طاری ہے جمود
اور وارفتۂ رفتار ہوں میں
اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

ممکن ہے کہ ان آخری شعروں سے جناب سجاد ظہیر کو دھوکا ہوا ہو کہ مجاز کی
شاعری انقلابی شاعری ہے لیکن شاید انہوں نے ان اشعار کو اُس کے کلام
پر پوری طرح منطبق کر کے نہیں دیکھا۔ مجاز کی شاعری میں (اُس وقت بھی جب
کہ وہ غزلیہ باتیں ہی کہہ رہا ہوتا ہے) ایک ایسی تڑپ اور جولانی کا ایک ایسا چڑھاؤ
ہے کہ اُس پر ایک ہنگامے کا دھوکا ہوتا ہے اور یہ ہنگامہ محفلِ دہر کی حرکت کو اپنی
تیز تر حرکت سے ایک جمود ہی بنا کر رکھ دیتا ہے۔ لیکن یہ حرکت یا ہنگامہ کسی
پراگندے کا ہنگامہ نہیں، یہ مجاز کی انفرادیت کا ہنگامہ ہے۔
دوسری نظم کے دو عنوان ہیں۔ "نذرِ دل" اور "اُن کے نام"۔ یہ نظم بھی اعلیٰ
عشقیہ جذبات کی ترجمان ہے۔ ایک شعر ہے۔

دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمہارے راز کو
اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں

اور اس سے بعد کی نظم میں جس کا عنوان ہے "کس سے محبت ہے؟"
—— مجاز اس راز کو افسانہ بنانے پر بھی تیار نظر آتا ہے لیکن پہلی نظم سے جو خیال پیدا
ہوتا ہے کہ مجاز کی مرکزِ نظر کوئی خاص ہستی ہے اُسے اس نظم سے تقویت ملتی ہے۔
شاید اُس کے سامنے عورت کا ایک آدرشی نقشہ ہے جس کے رنگ اُس کی آسودہ
ذہانت سے اُبھرے ہیں۔ اس نظم کی عورت دنیا کی عام عورتوں سے بہت مختلف
ہے کیونکہ اُس کے ؎

لبِ رنگیں پہ ہلکا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اُس کا تبسم اُس کا گہنا ہے!

نہیں آلودۂ ظلمت سحر وا مانیاں اُس کی

اور اس کے بعد آخری بند میں تو اس آدرشی عورت کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے —

کوئی اُس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے لبِ شیریں سے ... پا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے جنوں کا ... پا ہی نہیں سکتا
معلق ہیں ہوائے شعلہ میں جولانیاں اُس کی

حقیقت میں یہ اس نسائی آدرشی عورت کی رومانیت سے تعلق نہیں ہے۔ شاعر کے تصوّر میں صرف اس کی ایسی خوبیوں کا اجتماع ایک نفسی کیفیت کی صورت میں موجود ہوتا ہے جن کی حیثیت محسوس نہیں ہوتی اور کیف تخیلی ... ہوتی ہے۔ اس سے شاعر اگر ... ایک خیالی عورت ہے اور ... ہو تو ... شاعر کے ذہن میں خواہ ... تو ایک آدرشی ... ہوتی ہے ... رفتہ رفتہ وہ عورت ایک خیالی درجہ حاصل کر لیتی ہے اور فانی کی صورت میں تو یہ نفسی عمل بہت بعد ... وضاحت پذیر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ... اور ایک ... بھی اسی قسم کی داخلی نظمیں ہیں۔ ان کے بعد شاعر خارجی ... بیان ... ہے۔ "اصنامِ نمائش" مجاز کی ایک قابلِ ذکر نظم ہے۔ اس کا قصہ ... کا ایک عام منظر ہے۔ آج کل کے نمائشی زمانے میں نمائش کس نے نہیں دیکھی لیکن ایسی نظم کم لوگوں نے لکھی ہوگی جس منظر سے اس نظم کی تحریک شاعر کو ہوئی ہے اُس کی تخصیص کچھ نمائش ہی کے ساتھ نہیں ہے۔ ایسے ذہانت کو تحریک دینے والے مناظر آج کل کی مغربی انداز کی زندگی میں ہر جگہ نظر آ سکتے ہیں لیکن ہر شخص میں تحریک لینے والی ذہانت کا فقدان ہے۔ مجاز کے ... اور شاعرانہ پختگی کی دلیل بھی اس نظم میں موجود ہے۔ نظم شروع ہوتی ہے۔

وہ کچھ دوشیزگانِ نازپرور   کھڑی ہیں اک بساطی کی دکاں پر
سنہرا کام رنگیں ساریوں پر   ... آسماں پر ماہ و اختر
وہ خوشبو آ رہی ہے پیرہن سے   فضا ہے دور تک جس سے معطر

اور ان اشعار کی پاکیزگی قابلِ توجہ ہے۔ اگرچہ ان کی تشبیہیں بھی کچھ کم نہیں!

وہ محرابیں سی سینوں پر نمایاں   فضائے نور میں کیوپڈ کے شہپر
نفس کی آمد و شد سے تلاطم   شبِ مہتاب میں جیسے سمندر

اور ذیل کے اشعار سے شک گزرتا ہے کہ یہ دوشیزگانِ نازپرور شاید کسی کالج کی طالبات ہیں —

کوئی آئینہ دارِ حسنِ فارس   کسی میں حسنِ یونانی کے جوہر
کسی میں عکسِ معصومِ کلیسا   کسی میں پرتوِ اصنامِ آذر
یہ شیریں ہے وہ خوشابہ شاید   نہیں یاں فرقِ فرہاد و سکندر

اور پھر نظر کا یہی گہرا مطالعہ

وہ جنبش سی ہوئی کچھ آنچلوں کو   وہ لہریں سی اُٹھیں کچھ ساریوں پر

اور آخر میں

خرامِ ناز سے نغمے جگاتی!   وہ چل دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی   کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر

اور

ادھر ہم نے بھی آہِ سرد کھینچی   ہنسی پھر آ گئی اپنے کئے پر

یہ ہنسی شاید اس لئے آئی کہ بجنوری مرحوم کے الفاظ میں "مجھے کیا پتہ ہے اب کہاں ... مجھے کیا خبر تھی کس کی جاں" تک نوبت نہ پہنچے۔

اس کے بعد کی نظم "نورا" ایک مثنوی ہے لیکن اس مثنوی میں جدید نظموں کی جھلک ہر جگہ موجود ہے۔ یہ مثنوی ایک نرس کی چارہ گری سے متعلق ہے لیکن یہ چارہ گری محض جذباتی ہے۔ اس میں کوئی ایسی تلخی شامل نہیں جس کا احساس تجربہ کار حضرات کو نرسوں کے سلسلے میں ضرور ہوا ہوگا۔ آخری شعر جس میں ہسپتال سے اخراج کے بعد کا بیان ہے اور جسے شاعر کے نقطۂ نظر سے غلط سا اخراج بھی کہا جا سکتا ہے، بہت شوخ ہے

یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار ہو کر

اس کے بعد کی نظم "اربابِ نشاط" ہے۔ اس میں ایک ایسی محفل کا بیان ہے جہاں نسائی پیکروں کا ہجوم جذبات کے لئے وجہِ تسکین و اضطراب ہو رہا تھا۔ اس نظم میں بھی مجاز کی شادابیٔ کلام موجود ہے جس کے ثبوت میں صرف دو ایک مصرعے درج کرتا ہوں۔

چست پیراہن، نمایاں جسمِ سیمیں کی تراشش
گیسوئے شبرنگ پیچ و خم میں افسانے لئے
آنچلوں کی سرسراہٹ زمزمے گاتی ہوئی

اس کے بعد "ان کا جشنِ سالگرہ"، "دلّی سے واپسی" اور "طفلی کے خواب" بھی اچھی نظمیں ہیں لیکن "انقلابی" نہیں۔ آخری نظم میں بچے کی نفسیات کا اچھا مشاہدہ ہے۔ اس نظم کے آخری شعروں سے شاید کسی کو دھوکا ہو کہ وہ انقلابی اور روسی رنگ لئے ہوئے ہیں لیکن وہ دھوکا ہی ہوگا۔ نظم میں کہا جا رہا ہے کہ "طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں" اور

اِک لشکرِ عظیم ہو معروفِ کارزار!
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں
چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغِ آبدار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں
قدموں پہ جن کے تاج ہیں اقلیم و دہر کے
اُن چند کشتگانِ غمِ دل میں ہم بھی ہوں!

ان اشعار میں بچپن کی اُن مہماتی رجحان والی امنگوں کا عکس ہے۔ جن کی بنا پر نفسیاتِ جدید کے ماہرین نے اذیت پرستی کو ملکیت ہی کی طرح بنیادی جذبہ قرار دیا ہے۔

"رات اور ریل" ایک بہت اچھی نظم ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ تہذیبِ مغرب اور سائنس کے لوازم بھی اب ہمارے شاعروں کو اسی زور و تاثر کے ساتھ تحریکِ شعری دینے لگ پڑے ہیں جیسے کبھی "گل و بلبل" ہجر کا یا کرتے تھے۔ یہ نظم لمبی ہے لیکن مجاز کے فن کا اظہار کرنے کے لئے چند اشعار درج کئے بغیر مجھ سے نہ رہا جائے گا۔ نظم شروع ہوتی ہے

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
نازسے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اِک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی
پٹڑیوں پر دور تک سیماب جھلکاتی ہوئی
منتشر کر کے فضا میں جابجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اِک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش کر
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
جستجو میں منزلِ مقصود کی مستانہ وار
اپنا سر دُھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجائے تو اُس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
الغرض اُڑتی چلی جاتی ہے بےخوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

یہ صرف اس نظم کا انتخاب ہے لیکن اس سے بھی مجاز کے تشبیہ و استعارہ کی خوبیوں کا اندازہ آپ کو ہو سکتا ہے۔ اس کے بعض کی نظموں کے واضح بیان کی اس جگہ گنجائش نہیں۔ البتہ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان چیزوں کے علاوہ جن کا بیان ہو چکا۔ "مسافر، آوارہ، ننھی پجارن، پردہ اور عصمت اور ربطِ شکستہ" مجاز کے عام رنگ کی نظمیں ہیں۔ "نذرِ علی گڑھ، نذرِ خالدہ اور مزارِ رہنما" عقیدت کا اظہار کرتی ہیں۔ اور "ایک جلا وطن کی واپسی، اندھیری رات کا مسافر، ایک سفید پوش، انگریز، انقلاب، سرمایہ داری، ہمارا جھنڈا اور غدار" —— یہ سات چیزیں انقلابی ہیں۔ آخر میں چھ غزلیں بھی "شوقِ گریزاں اور شکستِ ساز" کے عنوان سے دے رکھی ہیں۔ مختلف جگہوں پر تمام کتاب میں پھیلے ہوئے اشعار بھی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے اور میرے خیال میں اُردو شاعری کے ہر دلدادہ کو یہ شگفتہ مجموعہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔

ملنے کا پتہ:- حلقۂ ادب لکھنؤ

اقبال نامہ

عام کتابی سائز۔ ڈیڑھ سو صفحے حجم۔ سادہ جلد اور سادہ گرد پوش۔ قیمت ایک روپیہ۔ مرتب چراغ حسن حسرت۔

ناشرین:- ہونہار بک ڈپو۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

علامہ اقبال کی وفات کے بعد بہت سے رسائل و جرائد نے اُن کی یاد میں اپنے اپنے خاص نمبر نکالے تھے اور اس سلسلے میں جناب سندباد جہازی کے ہفت نامے "شیرازہ" نے بھی زمانے کے ساتھ ایک قدم اُٹھایا۔ اس کی قبولیت کا عالم مجھے یاد ہے کہ جلد ہی دفتر میں اس کی کوئی کاپی باقی نہ رہی تھی۔ اب اسی نمبر کے مضامین کو ہونہار بک ڈپو نے جناب سندباد جہازی کے دیباچے کے ساتھ جناب چراغ حسن حسرت سے مرتب کرا کے شائع کیا ہے۔ اس خاص نمبر کے مضامین کے علاوہ بھی "شیرازہ" میں وقتاً فوقتاً جو چیزیں علامہ مرحوم کی ذاتِ گرامی کے متعلق شائع ہوتی رہی ہیں اُنہیں بھی اس مجموعے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ خاص پہلو اس کتاب کا یہ ہے کہ اس میں اُن کی شخصیت کے سوانحی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے علامہ کے وفادار ملازم علی بخش کی زبان سے جو مضمون شامل کیا گیا ہے وہ خصوصاً قابلِ غور ہے۔ اس مضمون میں نہ صرف اس شاعرِ اعظم کے متعلق اُن کے ملازم کے تجربے اور یادداشت کی باتیں محفوظ ہو گئی ہیں بلکہ اس کا اندازِ بیان بھی اپنی دلچسپی کے اعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

بعض مضمون اس مجموعے میں شائع کرنے کے قابل نہ تھے لیکن اُنہیں بھی غالباً اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ اُن کے لکھنے والوں نے سنی سنائی باتوں کی بجائے اپنے مشاہدات درج کئے ہیں۔

آخر میں چار نظمیں اور قطعاتِ تاریخ بھی درج ہیں۔ یہ قطعات جناب حفیظ ہوشیارپوری کے قلم سے ہیں جن میں سے ایک کی خوبی اُسے یہاں درج کرنے پر مجھے مجبور کر رہی ہے۔

آنکہ بگفتا "در بالِ جبریل"
من ہم بگفتم با چشمِ گریاں
گ = ۲۰

اقبال از تقدیرِ الٰہی
ہر شے مسافر ہر چیز راہی
۱۳۵۷ھ = ۲+۱۳۳۷

لہ ایک ہی تلوار کی دو دھاریں ——!

عہدِ حاضر کے بڑے لوگ حصہ دوم، سوم اور چہارم

ادبیہ مولا گنج نے مندرجہ بالا نام سے کتابوں کا ایک مفید سلسلہ شائع کیا ہے اس سلسلے کی پہلی جلد کا ذکر انہی صفحات میں چند ماہ پہلے قارئین ادبی دنیا کی نگاہوں سے گزرا ہوگا۔ اب ہمیں اس سلسلے کی دوسری تیسری اور چوتھی جلدیں موصول ہوئی ہیں اس سلسلے کے افادی پہلو پر ہم پیشتر لکھ چکے ہیں۔ اس لیے یہاں صرف ان کے مواد کے متعلق ہی لکھتے ہیں۔

دوسری جلد میں چین اور ایران کے مشاہیر کو لیا گیا ہے۔ مؤلف کتاب جناب محمود مرزا دہلوی نے ان ممالک سے مارشل چیانگ کائی شیک اور رضا شاہ پہلوی کو چنا ہے۔ یہ دونوں قابل قدر ہستیاں اپنے ملکوں کی تعمیرِ نو میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جناب مؤلف نے صرف ان کے کارناموں ہی کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ چیانگ کائی شیک کے تذکرہ میں چین اور جاپان کی موجودہ کشمکش پر پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس کشمکش سے یورپ کی موجودہ مسلم سیاست کا جو تعلق ہے اس پر نہایت جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح رضا شاہ پہلوی کے حالات میں ایران قدیم اور ایران جدید کا موازنہ کیا ہے۔ اور پہلوی عہد کی برکتوں اور رضا شاہ پہلوی کی ذاتی کمزوریوں پر ناقدانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔

تیسری جلد میں عراق و عرب کے مشاہیر کا جائزہ ہے۔ ان ممالک سے امیر فیصل اور سلطان ابن سعود کو لیا گیا ہے۔ عراق و عرب کی ان دونوں مشہور شخصیتوں کے متعلق بہت سے حضرات جانبداری سے آلودہ ہوئے بغیر نہیں لکھ سکتے لیکن مقام مسرت ہے کہ جناب مؤلف نے دیانتداری اور انصاف کو اپنی سوانح نگاری میں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

چوتھی جلد مصر و مراکش کے مشاہیر کے تذکرے پر مشتمل ہے یعنی اس میں سعد زغلول پاشا اور غازی عبدالکریم کا بیان ہے۔ یہ دونوں افراد وہ اولوالعزم اصحاب تھے۔ جنہوں نے مغرب کی بہت بڑی طاقتوں کا مقابلہ کیا سعد زغلول مصر کے مہاتما گاندھی تھے اور غازی عبدالکریم شمالی افریقہ کے شاندار مرد مجاہد۔ ان کے سوانح آزادی کی جستجو میں مشعلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔

ہر جلد کی قیمت آٹھ آنے ہے۔ اور حجم سوا اور سوا سو صفحات کے درمیان۔ ہر جلد پر خوشنما گرد پوش ہے اور کتابت اور طباعت بھی جاذبِ نظر لیکن ان سب سے بڑھ کر مؤلف کا اندازِ نظر اور طرزِ بیان قابلِ توجہ ہے۔ (م)

افسانے

- ...ات - ...علی عابد
- خواب کے سائے - حجاب امتیاز علی
- ...اور دیگر افسانے
- ...وش ...ن - ...
- دل اور کانٹا ...
- ...ی ... - منشی پریم چند
- [illegible]
- ...روات
- ...ب ... نیال
- ...اس نیال
- ...ن ...کی ... - ...
- [illegible]
- [illegible]
- ...ی اور دیگر افسانے
- [illegible]
- [illegible]
- ...از ...ت
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- ...ند ... - ...
- ... - ...
- ...
- عورت اور دیگر افسانے - ...
- شعلے - ...
- آگ ... - ...
- ...کی پھول
- ...وواما - ...
- مضامین فراق - ... فراق ...
- الہامی افسانے - ...
- ...مات ...مین - ...
- ...وتوں کے افسانے - کوثر چاندپوری
- ...کے خطوط - مرزا ادیب
- ...ات ... - ...
- ...کا ... - نیم ...
- ...ت ... - ...
- ...کی دنیا - ...
- ...کی ...یں - ...
- ...ب ...ت
- ...بت
- ...لز
- ...
- ...
- ...
- ...کی ...ات - ...
- ...ن ...
- ...ن ...ت
- ...
- ...یا ...یاں - ...
- ...
- ...یاں ...
- ...مات - ...
- ...ش اور دیگر افسانے - ...
- ...کا نام محبت
- ...ث ...کی موت
- ...کی انجمن
- ...کے آنسو - ...
- انگریزوں کی ...
- محاصرہ دہلی
- بہادر شاہ کا مقدمہ
- گرفتار شدہ خطوط
- غالب کا روزنامچہ
- دہلی کی جانکنی
- روسی افسانے - سعادت حسن
- ...اور دیگر افسانے - مجنوں گورکھپوری
- سو... سنگار - ...

ناول

- ...ات - منشی پریم چند
- میدان عمل
- ...
- ...حصہ اول و دوم - منشی پریم چند
- ...دہ مجاز - ...
- ...عا - منشی پریم چند
- بازار حسن - حصہ اول و دوم - منشی پریم چند
- ...گان ...
- گوشہ عافیت
- ...ن - ...
- ...یب ...
- ...کی ...
- ...ب ...
- ...ب ...
- ...سامری
- ...توقت - ...
- شہاب کی سرگذشت - ...
- ...داوط - ...
- زندگی - ...
- آزادی ...
- ...و - ...
- ...یں
- ...
- ...کی - ...
- شہزوری
- کوہ ...
- ...پیاور
- ...زہ ...
- ...ث - ...
- ...الغفون - ...
- اسرائیل کا چاند - ...
- ...یا محاصرہ غرناطہ - ...
- ...ی کوہسار - رتن ناتھ سرشار
- خدائی فوجدار - رتن ناتھ سرشار
- داستان - چیری ...
- قلوپطرہ - ...
- دختر فرعون - ترجمہ ...حسین (دو جلد)
- الو... - ...
- بدنصیب - وکٹر ہیوگو
- سراج الدولہ - اکسیر سیالکوٹی
- قسمت کا شکار - ترجمہ رامپوری ...
- لعل مقدس
- دعا کا ...
- ...
- تلاش ...
- ...یادگی
- ...
- ...کشار
- ...تی ...
- ...مات ... - ترجمہ ... رامپوری
- آزادی
- ...ی ...
- ...ین ملکہ - ...
- ...و ...
- ...ح اندلس
- ...و ...
- جویائے حق
- ...بغداد
- ایام عرب کال
- ...کا ذاکو
- آفتاب دمشق - راشد الخیری
- اندلس کی شہزادی
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی (حصہ اول و دوم)
- تیغ کمال
- ...شہوار
- سراب مغرب
- محبوبہ خداوند
- نوجوان اور بہتر کی داستان غم ...
- عذرا - ...
- عذرا کی واپسی
- یاسمین - مرزا محمد سعید
- خواب ہستی
- خون کی پیاس - سالک
- قصر ساحل
- خودکشی کی انجمن

مصر کی رقاصہ

پطرس ایم اے

نفس کی فریب کاریوں کی ازلی داستان

روح اور جسم کے تصادم کی لرزہ خیز داستان

قیمت - ایک روپیہ (...)

آمنہ

[illegible]

قیمت - ...

قلوپطرہ!

قلوپطرہ ملکہ مصر ... کی ... کا مجموعہ ... کی عشرت کا ...

حسن و عشق کی ... داستان ... منسوب نہیں۔

... اس کا عشق ... کی ...

قلوپطرہ

... کی داستان ... اس ناول ... پڑھیں

... صفحات - ... کاغذ - مجلد قیمت ...

ہاشمی بک ڈپو - 164 - انارکلی - لاہور -

سیاسیات

...ی کہانی - جواہر لال نہرو - دو جلد
...ی سیاسیات
...ی کا انسداد
...ی آزادی
...یات کی پہلی کتاب
...خ فلسفۂ سیاسیات
...ستان کا نیا دستور حکومت
...خ دستور حکومت ہند
...ل مارکس
...شلزم
...یرلزم
...بیداری
...وی
...م السیاسیات - قاضی تلمذ حسین
...ست - افلاطون
...م السیاسیات

فلسفہ

...یات ترغیب - ... الدین
...نیٹشے - مظہر الدین
...فلسفۂ جذبات - عبدالماجد
...مکالمات برکلے
...مبادی فلسفہ - اول ... دوم
...روح الاجتماع - محمد یونس
...ابن رشد - ریاض الحسن
...فلسفۂ جمال - ریاض الحسن
...فلسفۂ نفس - محمد صادق
...نفسیات فاسدہ - ولی الرحمن

معاشیات

علم المعیشت - الیاس برنی
کسان - مختار سنگھ
ہندوستان کی پولیٹیکل اکانومی
معاشیات - ڈاکٹر ذاکر حسین
مبادی معاشیات - آغا اشرف
ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ
دیہی قرضہ
ہمارے افلاس کے اسباب

نظم

شعلۂ طور - جگر مرادآبادی
جنون حکمت - جوش ملیح آبادی
شعلۂ شبنم " "
نقش ونگار " "
حرف وحکایات " "
فکر ونشاط " "
باقیات فانی - فانی بدایونی
عرفانیات فانی " "
سرود زندگی - صفدر گونڈوی
کلیات اکبر - اکبر الٰہ آبادی (تین جلد)
ارمغان حجاز - سر محمد اقبالؒ - مجلد
بانگ درا "
بال جبریل "
شاہنامہ اسلام - حفیظ جالندھری - اول مجلد
دوم مجلد - سوم مجلد
سوز وساز - حفیظ جالندھری
نغمہ زار "
دیوان غالب - غالب
دیوان غالب (دہلی سے چھپا ہوا) - غالب
کلیات نظم حالی (اول، دوم)
دیوان حالی
مسدس حالی
دیوان مومن
دیوان ذوق
کلیات داغ
گلزار داغ
مراثی انیس (چار جلد)
روح انیس
کلیات ولی دکنی
دیوان مجروح
انتخاب کلام میر
کلیات سودا (دو جلد)
ریاض رضوان - ریاض خیرآبادی
دیوان رسوا
کلیات ظفر (چار جلد)
کلیات وحیات اسمٰعیل میرٹھی
کلیات آتش
کلیات مومن
دیوان رند
نغمۂ حرم - اختر شیرانی
نغمۂ نور - بہزاد لکھنوی
نغمۂ روح - اختر انصاری
چراغاں - احسان بن دانش
نوائے کارگر

ادب وتنقید

تاریخ ادب اردو - رام بابو سکسینہ
تاریخ نثر اردو - احسن مارہروی
مختصر تاریخ ادب اردو - اعجاز حسین
دریائے لطافت - میر انشا
تاریخ ادبیات ایران - جلد اول ... دوم
تذکرۂ شعرائے دکن - دو جلد
مقالات شعر وشاعری - حالی
ذکر میر - محمد تقی میر
سودا - پروفیسر چاند صاحب
تنقیدات عبدالحق - مولانا عبدالحق
آب حیات - محمد حسین آزاد
گل رعنا - سید عبدالحی صاحب
شعر الہند - اول ... دوم
شعر العجم - شبلی نعمانی مکمل پانچ جلد
سخنوران ایران
اقبال اور اس کا پیغام - ڈاکٹر تصدق حسین
سیرت اقبال - پروفیسر طاہر فاروقی
مقالات اقبال
اقبال - مرتبہ مولانا عبدالحق
جدید اردو شاعری - عبدالقادر سروری
اردو میں ڈرامہ نگاری - بادشاہ حسین
غالب نامہ - محمد اکرام
ہندی شاعری - اعظم کریوی
مرثیۂ انیس
مقالات حالی - اول ... دوم
تہذیب الاخلاق اول ... دوم
سوم ... چہارم
افادات مہدی - مہدی حسن
دلی کا ایک یادگار مشاعرہ - مرزا فرحت اللہ
مضامین چکبست - چکبست لکھنوی
مضامین رشید - رشید احمد صدیقی
موازنۂ انیس ودبیر - شبلی
حیات جاوید - حالی
حکایات رومی - جلد اول مجلد
پطرس کے مضامین - پطرس
تذکرۂ شعرائے پنجاب - باقر
نقوش سلیمانی - سلیمان ندوی
خطبات گارساں دتاسی - مجلد
محاسن کلام غالب
عبدالرحمٰن بجنوری
خیام - شبلی
مضامین فراق - ناصر فراق دہلوی
مومن - یوسف بخاری
سیف ادب - طارق

تاریخ وسوانح عمری

سیرت النبی - شبلی نعمانی جلد اول 5/-
" " دوم 3/8/- سوم 3/8/-
" " چہارم 5/- پنجم 4/-
ششم 5/-
الفاروق - شبلی نعمانی
المامون "
گہوارۂ تمدن - نیاز فتحپوری
ارض القرآن - سلیمان ندوی اول ... دوم
سیرت الصحابیات - سعید انصاری
سیر انصار - سعید انصاری - اول ... دوم
خلفائے راشدین - معین الدین
مہاجرین - معین الدین اول
" دوم
تیمور - عنایت اللہ دہلوی مجلد
چنگیز خاں " "
تاریخ مغلیہ - ریاست علی - اول ... دوم
دربار اکبری - محمد حسین آزاد
اخبار اندلس - خلیل احمد تین جلد
رحمۃ للعالمین - قاضی منصور احمد - اول
دوم ... سوم
تاریخ المشاہیر - قاضی منصور احمد
محبوب خدا - چوہدری افضل حق
پیغمبر صحرا - خالد لطیف گابا
مرائے ہنود - سعید احمد مجلد
ریاست - افلاطون
تاریخ اخلاق یورپ - اول ... دوم
تمدن قدیمہ
تاریخ تمدن - بکل - دو جلد
تاریخ یونان قدیم - ہاشمی فرید آبادی
مشاہیر یونان وروما - دو جلد
جاپان - دیوان چمن لال
حقیقت جاپان - بدر السلام
انقلاب فرانس - باری
کمپنی کی حکومت - باری
انقلاب روس - کرشن پرشاد
سٹالن - ڈکٹیٹر روس کے حالات
چیمبرلین - وزیر اعظم برطانیہ کے حالات
روزویلٹ - صدر امریکہ کے حالات
میری جدوجہد - ہر ہٹلر
مسولینی - اٹلی کے ڈکٹیٹر کے حالات
سلطان محمد تغلق - مہدی حسن
نپولین بوناپارٹ
مضامین محمد علی - اول ... دوم
دنیا کی کہانی - محمد مجیب

ہاشمی بک ڈپو - 164 - انارکلی - لاہور

بچوں کیلئے

محکمہ تعلیم کی منظور شدہ کتب

لوئر پرائمری و لوئر مڈل

- کہانیوں کی پہلی - سیٹ صفحہ پر شکل .. ۵
- .. دوسری .. ۵
- .. تیسری .. ۱۰/
- انوار سہیلی کے منول موتی .. ۱۰/
- حیوانات وحشی .. ۱۰/
- شہزادہ مہربان .. ۱۲/
- ساماسیتا .. ۱۲/
- جادو کا ڈنڈا .. ۱۲/
- مہاراجہ رنجیت سنگھ .. ۱۲/
- راجہ اشوک .. ۵
- فیروز الدین تغلق .. ۲
- مصری داستان .. ۳

برائے لوئر مڈل و اپر کلاسز

- ممتاز سیلونی .. ۹
- رامائن کی کہانی .. ۸
- سو نخمری مرزا غالب .. ۱۴/
- ڈاپ کہانیاں .. ۱۲
- کرشمہ جات .. ۸/
- شہریت .. ۸/
- داستان وطن .. ۷/
- ارجن .. ۲
- ہمارا شہنشاہ .. ۶
- سلطنت برطانیہ .. ۱۴/
- انسان اور اس کے فرائض .. ۱۴/
- سیلاب خون .. ۹/
- لوہے کا بادشاہ .. ۲/
- پرندے اور ان کی زندگی .. ۱۴/
- دانایان فرنگ .. ۸/
- ایجادات .. ۱۳/
- عمر عیار اول (۱۰/) دوم .. ۱۰/
- جادو کا برج .. ۲/
- بچے گیت .. ۱۲/
- حیات النبی .. ۱۲/

عورتوں کیلئے

- [illegible] .. ۹/
- [illegible] .. ۳/
- [illegible] .. ۱۲/
- [illegible] .. ۵/
- فتنہ [illegible] .. ۳/
- [illegible] .. ۳/
- [illegible] .. ۱۰/
- [illegible] .. ۸/
- [illegible] .. ۹/
- [illegible] .. ۴
- [illegible] .. ۴/
- آداب [illegible] .. ۵

عورتوں کے لئے

- [illegible] .. ۸/
- خانہ داری .. ۱۴/
- رفیق عروس .. ۹/
- [illegible] .. ۵/
- روشنک بیگم .. ۱۵/
- [illegible] .. ۱۴/
- زہرہ [illegible] .. ۱۴/
- بنات النعش .. ۱۰/
- جانِ عمر .. ۱۲/
- زندگی .. ۱۴/
- مراۃ العروس .. ۱۳/
- گلدستہ محاورات .. ۱۲/
- گلزار محاورات .. ۸/
- الہامی فسانے .. ۱۲/
- موتی .. ۱۲/
- عصمتی دستر خوان .. ۱۲
- نگین کشیدہ کاری .. ۱۴/
- مشرقی و مغربی کھانے .. ۱۲/
- موتیوں کا کام .. ۱۲
- کراس سٹیچ .. ۱۲

اسلامی ناول

- آفتاب عالم .. ۱۲/
- ایران کی حسینہ .. ۱۲/
- انقلاب سمرنا .. ۱۲/
- انقلاب مصر .. ۱۲/
- جانباز عرب .. ۱۲/
- پہلی صلیبی جنگ .. ۱۲/
- ترکی ہیرو .. ۱۲/
- ترکی فرشتے .. ۱۲/
- جنگ بلقان .. ۱۴/
- حور بغداد .. ۹/
- سلطان سبکتگین .. ۱۲/
- شہزادی عباسہ .. ۱۲/
- شیر اسلام .. ۹/
- طارق .. ۱۴/
- صلیبی جہاد .. ۱۲/
- عرب کا چاند .. ۱۲/
- [illegible] .. ۱۲/
- [illegible] .. ۱۲/
- مشرق کی حور .. ۱۲/
- مصر کا چاند .. ۱۲/
- معشوق طلب .. ۱۲/
- جنگ ایران .. ۱۴/
- فتح [illegible] .. ۱۴/
- حور عرب .. ۱۴/
- آستانہ کی حور .. ۱۲
- معبد و کلیسا .. ۱۲
- فتح بیت المقدس .. ۱۸/
- فتح [illegible] - دو جلد مکمل .. ۱۶
- جنگ صلیب .. ۱۲
- آرمینیا کا چاند .. ۱۲
- مشرق کی حور .. ۱۲
- عرب کا چاند .. ۱۸/
- آفتاب عالم - چہار حصے مکمل .. ۶
- ایران کی حسینہ .. ۱۸/
- قصر دریا - دو جلد مکمل .. ۱۶

ڈکشنریاں

- کریم اللغات .. ۹/
- لغات کشوری .. ۳
- لغات فیروزی .. ۱۴/
- فیروز اللغات - دو جلد .. آٹھ روپے
- جدید لغات اردو .. ۳
- مفید اللغات اردو .. ۱۲
- مبادی اللغات .. ۱۴/
- رائل انگریزی اردو ڈکشنری .. ۳
- فیلنس .. ۱۲
- شونڈلس .. ۱۲/
- سٹینڈرڈ .. ۱۶

صنفی اور نوعی کتب

- شب زفاف .. ۱۲
- عورت کی فطرت .. ۸/
- مرد کی خصلت .. ۸/
- ہدایت نامہ خاوند .. ۸/
- ہدایت نامہ بیوی .. ۱۲/
- ساغر محبت .. ۲۸/
- ابتدائے عشق .. ۱۲/
- دلہن کی پہلی رات .. ۸/
- شہنشاہی کوک شاستر .. ۱۲/
- معالجات امراض نسواں .. ۱۲

صنعت و حرفت

- اسرار تجارت .. ۱۲/
- کارخانہ عالم .. ۱۲/
- مکمل فوٹوگرافی .. ۱۲/
- عملی صابن سازی .. ۱۴/
- ہیئر آئیل .. ۱۴/
- خوانِ نعمت .. ۱۲/
- آچار - مربے - چٹنیاں .. ۱۲/
- بسکٹ فیکٹری .. ۶/

ہاشمی بک ڈپو - 164 - انار کلی - لاہور

ڈاک کے ڈاکو [illegible]

فہرست مضامین اُدبی دنیا لاہور

بابت ماہ جون ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — تصاویر:- (۱) ایک مطالعہ (۲) ایک اور مطالعہ — نمبر ۶

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا [illegible] لاہور سے شائع ہوا

دُنیائے کاروبار

گرمی کو شکست

قابل نوش اشیاء میں چائے ایک ایسی چیز ہے جو ہر موسم میں پی جا سکتی ہے اور نوشیدنی میں اپنا مقابلہ نہیں رکھتی۔ چائے نوشی کے ہر موسم میں کیا کیا فوائد ہیں یہ اکثر ثابت کئے جا چکے ہیں۔ جن لوگوں نے چائے کے فوائد نہایت آزردہ حالات میں بھی معلوم کئے ہیں اُن سے درج کردہ تجربوں کے ضخیم دفتر میں ایک تازہ سرگزشت بیان کرنے کی ضرورت ہے جو جنوبی افریقہ کے خطوط سرطان میں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر جیک ہائینس جاپان گورنمنٹ کے ایک ملازم ہیں۔ اُنہوں نے دریلئے اسٹریکلینیڈ کا چشمہ جس کی راہ آج تک کسی نے دریافت نہیں کی ہے پہنچنے کی سعی کی تھی۔ ان کے زبانی ایک نئے تجربہ کا حال معلوم ہوا ہے جس سے چائے کی فضیلت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سفر کے حالات اس خط میں صحت کے لئے اس قدر مضر ہیں کہ بہتیرے یورشی بیمار ہو گئے۔ مسٹر ہائینس اور اُن کے ساتھیوں کی اس وقت یہ صلاح ٹھیری کہ اگر زندہ واپس پہنچنا مقصود ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے وہ یہ کہ دریا کا راستہ اختیار کریں جو چھ سو میل بہا کر ساحل تک پہنچاتا ہے۔ مریضوں کو اٹھانے کی ضرورت ہونے کی وجہ سے گولے بارود اور کھانے پینے کی چیزیں چھوڑ جانی پڑیں۔ پھر کئی دن جو کشتیاں بنانے میں گذرے اس عرصہ میں وہ لوگ صرف چائے اور سیکرین کی گولیوں پر بسر کرتے رہے چھ سو میل کا سفر اُنہوں نے پندرہ دن میں طے کیا۔ مگر اس دوران میں اُنہیں بھنوروں اور تیز رفتار دھاروں کے سپرد ہو کر دریا کی روانی کے ساتھ بہہ جانے کی خوفناک آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس مصیبت میں اُن کا صرف چائے ہی ایک ہمدرد سہارا تھا۔

انگلستان سے بھی ایک اسی عام فہم امر کی تصدیق کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے کہ گرمی کی تاثیر کو کاٹنے کے لئے اور پیاس بجھانے کے لئے چائے بہترین شے ہے۔ مسٹر ہیرلڈ ہیٹنگ وہلی شیفیلڈ انڈیپینڈنٹ میں کوئلے کی کانوں کے مسئلوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ٹھنڈی چائے کے خرچ کا مقدار کانوں کے ٹمپریچر اور زیر زمین کام کرتے وقت رطوبت کی کمی پر منحصر ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں لنکا شائر میں کوئلے کی کانیں سب سے زیادہ گرم ہوتی ہیں۔ یہاں ٹمپریچر کم و بیش ۹۰ ڈگری ہوتا ہے اور جنوبی ویلس میں شیفیلڈ کے علاوہ یارک شائر میں سب سے ٹھنڈی کانیں واقع ہیں جن کا ٹمپریچر ۵۵ ڈگری ہوا کرتا ہے لہٰذا لنکا شائر میں ہر سرنگ ساز ۹۔۱۱ پائنٹ چائے روزانہ پیتا ہے اور یارک شائر میں صرف ۹-۴ پائنٹ روزانہ چائے پی جاتی ہے۔ ٹھنڈی چائے کی اتنی زیادہ مقدار بھی کانوں میں زمین کے اندر کام کرنے والے کے جسم کی رطوبت کو دور کرنے کے لئے کافی نہیں ان مزدوروں کو ساڑھے پانچ گھنٹے تک اونچے ٹمپریچر میں کام کرنا پڑتا ہے۔

مسٹر ہیٹنگ کے مضمون کو پڑھ کر ہنری کالنس کا خیال آتا ہے۔ یہ کیپ ٹاؤن میں ۴۶ سال سے آہنگر کا کام کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ سب سے گرم کام انہیں کانسے پر ہوتا ہے انہیں ایک سو چھ ڈگری گرمی میں کام کرنا پڑتا ہے اس ٹمپریچر کے مقابلہ میں گرم سے گرم دن کی ہوا بھی ٹھنڈی معلوم ہوگی۔ ہنری کالنس کے متعلق بیان ہے کہ اُن کے پاس ٹھنڈے رہنے کے لئے ایک عجیب و غریب نسخہ ہے وہ گرم پانی سے غسل کرتے ہیں۔ اور پیاس بجھانے کے لئے خوب گرم چائے پیا کرتے ہیں۔

کتب خانہ ادبی دنیا

ہم نے ادبی دنیا اور علم و ادب کی خدمت کے ذرائع کو وسعت دینے کے لئے کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب تک سوزِ ناتمام، گیت مالا اور سحر فرانس شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے کا تازہ کام "نظارے" کی اشاعت ہے "نظارے" ملک کے مشہور اور قابل قدر افسانہ نگار جناب کرشن چندر ایم اے کے دلفریب افسانوں کا مجموعہ ہے جن کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مصنف موصوف کی سحرکاری کا ایک زمانہ قائل ہو چکا ہے لیکن جو لوگ ان کی خوبیوں کو ادبی تنقید کی عینک سے دیکھنا چاہتے ہوں۔ اُن کے لئے اس مجموعے میں صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دنیا کا ایک فصل مقدمہ بھی شامل ہے۔

مینیجر

ایک ضروری تصحیح

ادبی دنیا کے شمارہ بابت مئی ۱۹۴۰ء میں اورینٹل انشورنس کمپنی کے اشتہار میں برانچ سیکرٹری لالہ گوپال داس سونی ایف سی آئی (انڈیا) بگ، ایف۔ آر۔ ای۔ ایس (لندن) کا نام رہ گیا تھا۔ قارئین کرام نوٹ فرمالیں

بزم ادب

ــہ دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔

ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت رنج واندوہ سے سنی جائے گی کہ میاں بشیر احمد بار ایٹ لا، ایڈیٹر ہمایوں کے نوجوان اور ہونہار صاحبزادے میاں اصغر بشیر آکسفورڈ میں کشتی چلاتے ہوئے ڈوب گئے۔ اور ان کی نعش بھی دستیاب نہ ہوئی۔

اصغر بشیر ۲۱ سال کا جوانِ رعنا تھا اور اپنے خاندان کا چشم وچراغ۔ میاں بشیر احمد نے ہرچند چاہا کہ وہ فی الحال اپنی تعلیم ملتوی کر کے ہندوستان واپس آجائے۔ یورپ میں جنگ کے شعلے جوں جوں بھڑکتے تھے۔ دور افتادہ ماں باپ کے دل یہاں بے قرار ہو ہو اُٹھتے تھے مگر مرحوم کے ذوقِ علم نے گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کئے بغیر وطن لوٹ آئے۔ میاں صاحب نے کئی بحری تار دیئے مگر اُس جوان مرگ نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں مجھے دو چار مہینے اور ٹھیر جانے دیجئے۔ آہ کسے خبر تھی کہ آکسفورڈ کے نیچے بہنے والی پہاڑی ندی اُسے ماں کی گود سے چھڑا کر اپنے آغوش میں لینے کو مضطرب تھی۔ اور وہ اپنے عزم میں کامیاب ہوئی۔

ہمیں اس حادثہ جانکاہ میں میاں صاحب، ان کی بیگم صاحبہ، محترمہ بیگم شاہ نواز اور مرحوم کے اعزہ واحباب سے دلی ہمدردی ہے اور ہماری دعا ہے کہ خدائے پاک مرحوم کی روح کو فردوس نعیم کی سرزمیں عطا کرے اور اُس کے غم نصیب والدین اور بہن بھائیوں کے مجروح دلوں کو تسکین بخشے۔

اسی ماہ معزز معاصر مصور بمبئی کے نامور مدیر سعادت حسن منٹو کی والدہ ماجدہ سفرِ آخرت اختیار کر کے منٹو صاحب کو اپنے سایۂ عاطفت اور مہرادری سے محروم کر گئیں۔ ماں انسان کے لئے دنیا کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اگرچہ اس سرمایہ کی قدر بسا اوقات لٹنے کے بعد ہوتی ہے۔ وہ لوگ درحقیقت بڑے خوش قسمت ہیں جنہیں روز و شب ماں کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں۔ کاش کہ وہ ان کی قدر پہچانیں۔ ہم سعادت حسن صاحب کے اس نقصانِ عظیم پر اُن سے اپنی گہری اور پُرخلوص ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

اس شمارہ کے مضامین میں عبدالسلام صاحب خورشید کا مضمون حشر سے پہلے اُردو ڈراما نگاری ایک دلچسپ اور مفید سلسلے کا آغاز کرتا ہے۔ خورشید صاحب کے دو اور مضامین حشر اور اُردو ڈراما نگاری اور حشر کے بعد اُردو ڈراما نگاری ادبی دنیا کے آئندہ شماروں میں چھپ کر اس سلسلے کی تکمیل کریں گے۔ یہ مضامین اگرچہ اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں۔ لیکن جب یہ سلسلہ پورا ہو جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ صاحب مضمون نے اُردو ڈرامہ نگاری کا نہایت خوش اسلوبی سے جائزہ لیا ہے۔ اور ایک عام ناظر کو جسے ضخیم کتابیں پڑھنے کی فرصت نہیں۔ ادب کی اس اہم صنف سے صرف چند مضامین کے ذریعے اچھی طرح متعارف کر دیا ہے۔

اُردو ادبیات میں انشائے لطیف (ادب لطیف نہیں) کو ابھی وہ درجہ نہیں ملا جو اس کا حق ہے۔ انگریزی زبان میں ESSAY اور خصوصاً LIGHT ESSAY ادب کی ایک نہایت مقبول صنف ہے۔ ہمارے ہاں مضامین اور مقالات لکھنے کا رواج عام ہے۔ سرسید اسکول کے بعض تابعین نے ESSAY بھی لکھے، لیکن (LIGHT ESSAY) انشائے لطیف کو بہت کم لوگوں نے چھیڑا ہے۔ اب چند سالوں سے اس طرف توجہ ہو رہی ہے اور مقامِ مسرت ہے کہ ہمارے حلقے کے چند ادیبوں نے بھی اس طرف قدم بڑھایا ہے۔ آپ ادبی دنیا کے گذشتہ دو نمبروں میں ممتاز مفتی کی کہی اور اَن کہی اور کرشن چندر کی مانگے کی کتابیں دیکھ چکے ہیں۔ اس دفعہ خیالی پلاؤ ملاحظہ فرمایئے۔ انور اعجاز صاحب کی اس کوشش کو ایک بڑی حد تک کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ان کی آئندہ تخلیقات موجودہ سے بھی اچھی ہوں گی۔

چکر ایک دلچسپ اور لطیف طنزیہ کھیل ہے جسے شیر محمد صاحب اختر نے بڑی خوبی سے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس میں ہابیل اور قابیل کے کردار گویا انسانی فطرت کے دو پہلو ہیں، خیالی اور عملی تخیل نے فنونِ لطیفہ اور عمل نے سائنس کو فروغ دیا مشرق اور مغرب نے اپنے اپنے کام پورے کئے۔ مصنف مغربی نژاد ہونے کے باعث عمل کی طرف زیادہ راغب ہے اور اُس نے عمل کے بقا اور ہابیل کی موت سے تخیل کی بےبس مقداری کو ثابت کیا ہے۔ اگرچہ گناہ و ثواب کے متعلق اس کا نظریہ مشرقی ہی معلوم ہوتا ہے اختر صاحب نے ترجمے میں اصل کی خوبیاں زائل نہیں ہونے دیں۔ ہمارے ہاں کے ادبی تراجم میں یہ ایک صحت مند اضافہ ہے۔

صلاح الدین احمد

۲۰

[illegible] نے عنوان ہے [illegible] خیال کی [illegible] کی [illegible] عظمت [illegible] محبت [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] اچھی نظم ہے لیکن [illegible] کیفیت [illegible] ہے وہ اس میں نہیں [illegible] کاش [illegible] ہم ہوتے اور [illegible] رہا تھے اور اس کی کیفیت [illegible] لطف اندوز [illegible]

[illegible] کی غزل میں بھی اسی قسم کی [illegible] کیفیت چھائی ہوئی ہے ۔ فطرت ابھی بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں [illegible] کوئی بے خواب سب معلوم نہیں کیوں [illegible] اور [illegible] جو عالم الفت کا کس [illegible] اک عالم گرداب ہے معلوم نہیں کیوں [illegible] اور اس شعر میں کیا خوب [illegible] تخیل آئی ہے ۔ دنیا کوئی مسجد نہیں لے گنبد گرداں ، تو صورت محراب ہے معلوم نہیں کیوں [illegible] ... مسجد ، گنبد ، محراب ، کیا تصور ہے کیا تخیل ہے !

مخمور عثمانی اور ساغر جمیلی دونوں ماضی کے نوحہ خواں ہیں لیکن ساغر ایک خاص شام کی یاد میں ڈوبا ہوا ہے اور مخمور اُن لمحوں کی حسرت کا ترجمان ہے جو صرف اس کے تصور ہی میں سہانے خواب بن کر آتے رہے اور اُن کی تعبیر حقیقت کبھی میسر نہ ہوئی ممکن ہے کہ حسرت کے یہ افراد گو ان نظموں کی الم پرستی گوارا نہ ہو لیکن انہیں [illegible] کا کہا یاد رکھنا چاہیئے کہ کیوں نم آلودہ ہوں اہلِ نظر کی آنکھیں ۔ چھوڑ کر دامن دریا کو کہاں جائے گداز

[illegible] کی غزل کے متعلق بھی اس کا اپنا ہی ایک شعر پیش کیا جا سکتا ہے ؎

[illegible] فطرت کی عطا ، بخشے جاتے ہیں مگر نغمے باندازہ ساز

[illegible] میں تغزل کا صحیح رجحان ہے اور اس کے ساتھ ہی جس بلندی [illegible] کرتا ہے اس سے اُس کے کلام کا درجہ اور بھی اونچا ہو جاتا ہے

قیوم نظر نے اس دفعہ اپنی روش سے ہٹ کر غزل گوئی کی ہے ۔ معلوم نہیں اُس کی غزل میں ہندی الفاظ کی وجہ سے ہندی تصورات آ گئے ہیں یا ہندی تصورات اور روایات کی وجہ سے اُس نے ہندی الفاظ کا انتخاب کیا ہے ۔ بہرحال خوب دادِ تغزل دی ہے ۔ اور جس طرح "رت بیت چکی ہے برکھا کی اور پریت کے [illegible] بیٹھے ہیں ، روتے ہیں ، رونے والوں کی آنکھوں میں [illegible] اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ "اب ختم ہوئی ہے نظر کی غزل سننے والے [illegible] سمجھتے ہیں کیا شعر ہیں پڑھنے والوں کے ذہنوں میں تغزل رہتا ہے"

علی احمد [illegible] شگفتہ تصدق نے "محبت کی پہلی رات" میں جو رومان پیدا کیا ہے اُس کی سادگی ہی میں ایک ناقابل مدافعت دلکشی ہے ۔ جس میں الفاظ کی نفاست نے اپنا ایک علیحدہ لطف پیدا کر دیا ہے : "اُفق کا گھاٹ" "متوالا چاند" "تاروں کی شہنائی" ـــ کے تصورات میں ایک عجیب کیفیت ہے ۔ محاکاتی لحاظ سے یہ مصرعے کیا خوب ہیں ـــ "تم آنچل کو اُڑاتی سر پہ جلدی جلدی آئی تھیں" "تم آئیں اور آ کر چھپ گئیں پھر میرے دامن میں" اور پھر آخر میں "مچل کر میں بڑھا دامن تمہارا تھام لینے کو ، شرابی جیسے اُٹھے گرتی مینا تھام لینے کو" ـــ

[illegible] کی نظم کا موضوع سکوت ہے لیکن عنوان "چپ چاپ" اور یہ عنوان اُس فضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے جو اس نظم کے مطالعے سے قائم ہو جاتی ہے ۔ لکھا تو اور بھی جا سکتا تھا لیکن اس نظم کے تاثر نے ساکت و خاموش کر دیا ہے ۔

میراجی

آئینۂ عالم

جاپان میں مزدوروں کی حالت

جاپان میں مزدوروں کے حالات کا صحیح علم کم لوگوں کو ہے۔ جاپانی سسٹم کے مخالف کہتے ہیں کہ وہاں مزدوری بہت کم دی جاتی ہے، کام کا وقت بہت زیادہ ہے، مزدوروں کی تنظیم میں خامیاں ہیں، اور اسی طرح کے اور بہت سے الزامات عاید کرتے ہیں، اور جاپانی کہتے ہیں کہ اُن کی سماج ہم آہنگ ہے اُس میں اس بات کی ضرورت ہی نہیں پیدا ہو سکتی کہ مغرب کی طرح کوئی طریقہ مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کا قائم کیا جائے، وہ کہتے ہیں کہ جاپانی مزدوروں کا مالک اپنے کارندوں کو اُسی نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے باپ اپنی اولاد کو دیکھتا ہے اور اسی لئے مخالفانہ مقاصد کی اُلجھن کبھی پیدا ہی نہیں ہوتی۔

لیکن یہ حامی اور مخالف دونوں انتہائی رائیں رکھتے ہیں۔ ان کے انداز نظر میں اعتدال نہیں ہے، اور اگر یہ لوگ جاپانی مزدوروں کو عجیب چیز سمجھنے کی بجائے دوسرے ملکوں کی سماجی تاریخ پر ذرا بھی غور کریں تو اپنی انتہا پرستی کو چھوڑ دیں۔

جاپان ایک ایسا ملک ہے جس میں صنعتی رجحانات کی نشو و نما کو ابھی بہت کم عرصہ ہوا ہے اور اس لئے اُس کے معاملات پر غور کرتے ہوئے اُن ممالک کی مثال ذہن میں نہیں لانی چاہئے جو بہت عرصے سے ترقی کر چکے ہیں۔ جاپان کی آبادی کا بہت کم حصہ بڑے کارخانوں میں مصروف کار ہے۔ آدھے کے قریب باشندے تو زراعت یا ماہی گیری کا کام کرتے ہیں اور صنعت و حرفت کے فروغ کی مثالیں بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ بڑے کارخانوں میں جو لوگ کام کرتے ہیں اُن کی اکثریت دیہات سے آتی ہے۔ اور وہ لوگ چند سال تک کارخانوں میں کام کرنے کے بعد گھر کو لوٹ جاتے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جو مستقلاً صنعت و حرفت کے کاروبار میں مصروف ہیں ابھی دس سال پیشتر زراعت پیشہ ہی ہوا کرتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر جاپانی کارخانوں کا ایک عام مزدور ابھی صحیح معنوں میں مزدور ہی نہیں ہے۔

کپڑے کے کارخانوں میں تین چوتھائی کاریگر وہ نوجوان عورتیں ہیں جو اپنے دیہاتی گھروں کو چھوڑ کر روزی کمانے کے لئے آتی ہیں۔ انہیں کارخانوں میں ملوں کے دلال ملازم رکھتے ہیں۔ یہ دلال دیہات میں رہتے ہیں اور وہیں سے اپنے کارخانوں کے لئے بھرتی کا کام کئے جاتے ہیں یہ دلال عورتوں کے والدین سے شرائط کر لیتے ہیں۔ یہ شرائط ایک معین عرصے پر حاوی ہوتی ہیں۔ شادی کی عمر کو پہنچنے پر یہ کام کرنے والی لڑکیاں اپنے گھروں کو لوٹ جاتی ہیں۔ ان لڑکیوں کی آمدنی اُن کے غریب اور نادار گھرانوں کی مدد کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ملازمت کے دوران میں ان لڑکیوں کے کھانے اور رہنے کا انتظام بھی کارخانہ ہی کرتا ہے۔

بڑے کارخانوں میں سے اکثر اور چھوٹے کارخانوں میں سے بعض میں کھانے اور رہنے کا انتظام ان لڑکیوں کے دیہاتی گھروں کی نسبت بہتر ہوتا ہے اور اُن کی یہ کام کاج کی زندگی بھی اُس گھریلو زندگی سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کارخانوں میں ملازم ہونے کی مشتاق ہوتی ہیں اور اگرچہ بعض کارخانوں کے متعلق شک کیا جا سکتا ہے کہ وہاں کا انتظام ناقص ہے لیکن وہ انتظام بھی اُن لڑکیوں کے دیہاتی گھروں سے بہتر ہی ہوتا ہے۔ مل کی ان کام کرنے والیوں کو اُن کی آمدنی کا کافی حصہ بونس اور جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے اور اسی طرح بڑے کارخانوں میں مرد کاریگروں کو بھی اُن کے روزینے کے علاوہ اضافے کے طور پر بونس دیا جاتا ہے اور اگر وہ شادی شدہ ہوں تو ان کے مالکوں کی طرف سے انہیں کم کرائے پر مکان بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ مالک کے گھر میں کوئی خاص بات ہو یا کسی بچے کی پیدائش ہو تو تمام کام کرنے والوں کو تحفے کے طور پر ایک مقررہ رقم دی جاتی ہے اور یوں مالک اور مزدور کا تعلق ایک طرح سے باپ اور اولاد کا تعلق بن جاتا ہے۔

مزدوری کے دام انفرادی طور پر فیصلہ کئے جاتے ہیں اور کوئی مالک اگر کسی کاریگر کو برخاست کرنا چاہے تو وہ مزدوری کے علاوہ معاوضہ دیئے بغیر اُسے اپنے کارخانے سے نہیں نکال سکتا۔ انفرادی کارگزاری پر بونس دینے

نتیجہ یہ ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے جاپان میں صنعتی ترقی ہو چکا ہے اور یہاں کا [illegible] صنعتوں پر کارخانوں میں زیادہ فروغ ہو چکا ہے۔ جہاں دکت کے لحاظ سے مزدوری دینے کا [illegible] ہے اور یورپ کے بعض بڑے کارخانوں میں مزدور جاپانی عام مزدوری سے دگنی کما لیتے ہیں۔

جاپان میں مزدوری سے متعلق کوئی ایسا اہم مسئلہ ہے [illegible] گو [illegible] قوموں کے [illegible] مختلف [illegible] [illegible] ایسے ہی کام کو [illegible] [illegible] دونوں کی حیثیت بھی [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔

کام کا وقت مغرب کے کارخانوں کی نسبت زیادہ ہے [illegible] [illegible] جہاں [illegible] زیادہ کام کرنے والے ہوں، عورتوں اور سولہ سال سے کم عمر کے لڑکوں کے کام کا وقت گیارہ گھنٹے ہے۔ اس میں ایک گھنٹے کی [illegible] چھٹی بھی شامل ہے۔ بعض دوسرے کاموں میں بھی [illegible] [illegible] گھنٹے کی پابندی ہے۔ [illegible] سے یہ پابندی ان تمام پیشے کے [illegible] پر بھی عاید کر دی گئی ہے جو بجلی کا استعمال کرتے ہیں۔ کام کے وقت کی زیادتی ہماری نگاہوں میں [illegible] بات نہیں ہو سکتی جتنی یہ بات کہ جاپان میں ہفتہ وار آرام کے لئے ایک روز کی کوئی رخصت نہیں دی جاتی۔ عورتوں اور نابالغوں کو قانون کے مطابق مہینے میں دو [illegible] کی رخصت دی جاتی ہے اور زیادہ تر [illegible] کے کارخانوں میں [illegible] کے سوا اور کسی قسم کی رخصت نہیں دی [illegible]

[illegible] کارخانوں میں کام کا وقت واقعی بہت زیادہ ہے جو فیکٹری ایکٹ کے ماتحت نہیں ہیں [illegible] [illegible] گھنٹے تو ایک عام بات ہے۔ لیکن یہ وقت کی زیادتی کام سے ایک نسبت [illegible] ہے یہ قدرتی بات ہے کہ جن کارخانوں میں وقت زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے وہاں کے کام کرنے والے اُس تندہی اور شدت سے اپنے فرائض کو پورا نہیں کرتے جیسے کہ منظم کارخانوں کے مزدور۔ لیکن ان غیر منظم کارخانوں کے حالات بھی [illegible] معدوم ہوتے ہیں اور ماہرین اور ذمہ وار حضرات اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ یوں قومی لحاظ سے جاپانی جسم پر برے اثرات کا زبردست خطرہ ہے۔

بعض ماہرین کہتے ہیں کہ جاپان کے مزدوروں کے معاوضے کا مقابلہ [illegible] دوسرے ممالک سے نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہاں اوسط آدمی کا معیارِ حیات ملکی لحاظ سے [illegible] اور سستا ہے اور اس لئے وہاں ایک آدمی اتنی رقم میں آسانی زندگی گذار سکتا ہے جو ہمیں بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ کیونکہ مغرب میں تو ایک مزدور

گو بہت سی ناقابل قسم کی ضروریات کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں کہ ایک جاپانی کا موجودہ معیارِ حیات کیا ہے۔ اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ معیار گھٹ رہا ہے یا بڑھ رہا ہے۔ کیونکہ ان مقامات پر جو جاپان کے بڑے شہروں سے قریب نہیں۔ گذشتہ سالوں میں معیارِ حیات پہلے کی بہ نسبت بڑھ چکا ہے۔ اور صنعتی ترقیات کی ترقی کے ساتھ یہ معیار ہر جگہ بڑھتا ہی جائے گا۔

جاپان کا اقتصادی نظام، وہاں کا صنعتی تعلقات کا نظام اور وہاں کے سیاسی اثرات ۔۔ یہ تمام باتیں وہاں کسی قسم کی زبردست مزدورانہ تنظیم کے منافی ہیں اور اگرچہ ابھی وہاں مزدورانہ تحریک ابھی اپنی نشوونما کی ابتدائی منزل میں ہے [illegible] کے مزدور، خواہ وہ تجارتی اور مزدورانہ انجمنوں سے متعلق ہوں یا نہ ہوں، ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ وہ کارخانہ داروں پر کسی قسم کا دباؤ ہڑتالوں کے ذریعے سے ڈال سکیں۔ البتہ وہاں کے سرمایہ داروں کو رائے عامہ کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے اور یہ نکتہ اُن کے حق میں اکثر کام کر جاتا ہے۔

مزدوروں کی انجمنوں میں سے اکثر سرمایہ دارانہ سسٹم کی قائل ہیں۔ اور اپنی عام سماجی پالیسی میں قدامت پسند ہیں لیکن بعض ایسی انجمنیں بھی ہیں جنہوں نے مارکس کی اسکیم کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد کے پہلے دس سالوں کے شروع شروع میں مارکس کی تعلیم نے مزدوروں اور طلباء پر بہت اثر کیا اور یہ اثر اس قدر بڑھنے لگا کہ حکام کو خرابی کا خطرہ لاحق ہوا اور انہوں نے ۱۹۲۸ء میں ایسی تمام انجمنوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے چند سال بعد پھر وہی خیالات لوگوں کے دلوں میں بار پانے لگے اور اگرچہ مزدوروں اور طلباء میں بھی ان خیالات کی ہوا بھی تھی پھر بھی انہیں کبھی کسی قسم کی سیاسی اہمیت حاصل نہیں تھی۔

لیکن ۱۹۳۳ء سے ہر قسم کی انقلابی اور اشتراکی انجمنوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا ہے اور ان انجمنوں کے صدہا حامیوں کو گرفتار کر کے اُن کے خیالات سے انحراف کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس بات کا اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ اب بھی وہاں کسی نہ کسی دبی ہوئی صورت میں انقلابی خیالات موجود ہیں یا مکمل طور پر انہیں لوگوں کے دلوں سے خارج کر دیا گیا ہے۔ آئے دن کسی نہ کسی سیاسی قسم کی گرفتاری کی جو خبریں جاپانی اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں اُن سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اشتراکی خیالات ابھی جاپانیوں کے دلوں سے یکسر محو نہیں ہوئے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہاں کسی قسم کا انقلاب ممکن نہیں۔ جاپان اپنے ہی اعتقادات پر کاربند رہے گا۔ اور وہاں کے مزدوروں کے دلوں میں بھی اگر کسی قسم کی تبدیلیٔ حالات کی تمنا ہے تو وہ اس تمنا کی تکمیل اشتراکی خیالات کی بجائے اپنے اندرونی انقلاب ذہنیت سے چاہتے ہیں۔

چینی خواتین — زندہ باد!

چین میں آج سو چاؤ کی ایک عورت کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ اس عورت نے اپنے خاوند کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ حالات یوں تھے کہ اس کے خاوند نے کئی بار چینیوں کے خلاف جاپانیوں کی مخبری کی اور اسی طرح کی ایک اطلاع کی بنا پر جاپانیوں نے ایک ہوائی حملہ کیا اور بارود اور اسلحہ کی بہت سی گاڑیاں تباہ کر دیں۔ اس غدارِ وطن کی بیوی نے پہلے تو اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا تو ایک روز اسے اس غداری سے باز رکھتے ہوئے وہ تنگ آکر زور سے چلا اٹھی "غدار! غدار!" اور ہمسایوں نے اس کی پکار سن لی۔

جب اس کے خاوند کو گولی مار دی گئی تو ہمسایوں نے اس عورت سے پوچھا کہ تمھیں اپنے کئے پر پشیمانی تو نہیں؟ —— اور اس نے جواب دیا، نہیں! میں نے ایک خاوند کو کھو کر اپنے ملک کے بہت سے آدمیوں کو بچا لیا ہے، اس لئے میرا دل مطمئن ہے۔

چین وہ ملک ہے جہاں صدیوں سے عورت مرد کے مقابلے میں سماجی حقوق کے لحاظ سے ایک صفر کی حیثیت رکھتی تھی۔ کنفیوشس کی تعلیم ہی یہ تھی کہ عورت کی انفرادی زندگی کچھ بھی درجہ نہیں رکھتی وہ اپنے خاندان کی تابع ہے۔ لیکن اب زمانے اور وقتی ضروریات کے ساتھ ساتھ کنفیوشس کا معیارِ اخلاق بدل رہا ہے۔ سو چاؤ کی اس عورت نے اپنے خاندان سے غداری کی اور اپنے خاوند کی جان کی پروا نہ کی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے کنفیوشس ہی کی تعلیم کو ایک اور طریق پر پورا کر دکھایا۔ اسے خاوند کی موت پر افسوس نہ ہوا، اس کے دل میں کسی طرح کا ذاتی رنج و غم پیدا نہ ہو سکا، اس نے اپنے ملک کے لئے یہ فعل کیا۔ اور یوں اپنی انفرادی حیثیت کو ایک نئی صورت میں اجتماع کے لئے مٹا دیا۔

چینی عورتوں میں کردار کی بعض اعلیٰ خصوصیات موجود ہیں اور اُن کی سیرت میں ایک ایسا سکون ہے جو اُسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ انسان کو اپنے جذبات اور احساسات کی بالکل پروا نہ ہو۔ مغربی عورتوں کی بہ نسبت چین کی عورتوں کا دائرہ عمل بہت تنگ رہا ہے لیکن جاپان کے جاگیردارانہ نظام میں عورتوں کی جو کیفیت تھی اس کے مقابلے میں وہ بہت آزاد رہی ہیں۔ چین میں اگر عورتوں پر دباؤ تھا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہاں عورتوں کو جنسی لحاظ سے کوئی کم درجہ دیا جاتا تھا۔ بلکہ چین میں تو کنفیوشس کی تعلیم نے زندگی کے ہر پہلو پر دباؤ ڈال رکھا تھا کیونکہ اس کے لحاظ سے انفرادی زندگی خاندان اور حکومت کی تابع ہونی چاہئے۔ بیٹوں کی وہاں اس لئے قدر تھی کہ وہ نسل کو قائم رکھتے ہیں اور بیٹیاں ایک معمولی قسم کی چیز سمجھی جاتی تھیں اور ان پرانے نظریوں میں جو انقلاب پیدا ہوا وہ ملک کے صنعتی انقلاب کی وجہ سے تھا۔ صنعتی ترقی کے ساتھ کارخانوں کی بہتات ہوئی اور ان کارخانوں نے عورتوں کی زندگی میں ایک وسعت پیدا کر دی اور انہیں خاندانی غلامی سے رہا کر کے ایک نئی قسم کی غلامی دی۔ ۱۹۲۶ء میں جب قومی فوجیں شمال کی طرف جانے لگیں تو اچانک ایک بمب کی طرح عورتوں کی آزادی کی ایک تحریک سی پھوٹ پڑی۔ ان دیہاتی لوگوں میں بھی جو اپنا پیٹ پالنے کے لئے اپنی بیٹیوں کو بیچ دیا کرتے تھے اور جن کی بیویاں خاوند کی موت کے بعد تمام عمر علیحدگی کی زندگی گذارتی تھیں، انہی لوگوں میں ایسی عورتیں اور لڑکیاں پیدا ہو گئیں جنہوں نے مغرب کی پیروی میں اپنے بال کٹوا دیئے اور وردیاں پہن کر قومی فوجوں کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈے کے لئے گھروں سے نکل پڑیں اور انہوں نے اس نظریے کی تبلیغ شروع کر دی کہ مرد و عورت دونوں یکساں ہیں۔ ان عورتوں نے ملک میں ایک بیداری پیدا کر دی، عورتوں کی انجمنیں بنائیں اور بعض نے اپنے خاوندوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے طلاق کا یہ سیدھا اور نہایت آسان طریقہ اختیار کر لیا کہ اخبار میں اپنی آزادی اور علیحدگی کا اعلان کر دیں۔ اس تحریکِ آزادیٔ نسواں سے بہت سی قابل ہستیاں چین میں نمودار ہوئیں۔ سونگ خاندان کی دو بہنوں کو تو ایک زمانہ جانتا ہے جن میں سے ایک بہن مشہور چینی رہنما ڈاکٹر سن یت سین کی بیوہ ہے اور دوسری بہن مشہورِ عالم چینی جرنیل چیانگ کائی شیک کی بیوی ہے۔ پہلی بہن سے زیادہ محبوبِ خلائق عورت اس وقت چین بھر میں اور کوئی نہیں کیونکہ اس نے اپنی زندگی ہی خدمتِ ملک کے لئے وقف کر دی ہے اور اپنے خاوند کے بنائے ہوئے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں جان و مال اور صحت کسی بات کا خیال نہیں کیا اور میڈم چیانگ کائی شیک کی قابلیت اسی سے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر طاقتور عورت اس وقت دنیا کے کسی ملک میں نہیں۔

لیکن چین کی جنگِ آزادی میں عورتوں نے جو نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں اس کی دلیل کے لئے ان خاص عورتوں کی مثال کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ مزدور عورتیں، کسانوں کی عورتیں، تاجروں اور کاروباری افراد کی عورتیں —— سبھی نے اپنے ملک کو بچانے کے لئے وہ وہ کام کئے ہیں کہ بے اختیار تحسین و ستائش کا کلمہ منہ سے نکل جاتا ہے۔ وہ عورتیں جو اس جنگ سے پیشتر ہنکاؤ اور شنگھائی میں صرف معمولی کام مہیا کر کے روزی کماتی تھیں انہوں نے بھی ملکی اور قومی مفاد کے لئے انجمنیں بنائی ہیں۔ شنگھائی کی انجمن کی لیڈر ایک ایسی عورت

ہے جو جنگ سے پیشتر بستہ مفلسوں کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان اسباب نشاط نے بہت سے ہوٹلوں، بازاروں اور ناچ گھروں کے مالکوں کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی عمارتوں کو جنگجوؤں کے لئے وقف کر دیں یا ہسپتال بنا دیں اور ان ہسپتالوں میں پھر نے اور نیچے والیاں فوراً بھرتی کرائی اور زخمی سپاہیوں کی خدمت میں مصروف ہوتی ہیں۔ جنگ زدہ گانے والیوں نے پرانے قومی گیتوں کو بدل کر چین کے رزمیہ کارناموں کا ذکر ان گیتوں میں ملا لیا ہے۔

چینی عورتوں نے میدان جنگ میں بھی جو خدمات [illegible] کی ہیں ذیل کے واقعے سے واضح ہوتی ہے:۔

سپاہیوں کا ایک پورا دستہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ افسروں کے احکام کی پروا نہ کرتے ہوئے اور اپنی بندوقیں پھینک کر یا بوجھ اتار کر وہ عجیب طریق پر چلتے ہوئے وہ بھاگے۔ ان کے راستے میں ایک گاؤں پڑتا تھا۔ ان کی فرار کی خبر مس کیشنگ شائی کی مردو عورتوں کی ایک انجمن کی لڑکیاں جن کی سیڈ ایک معلم ان مولان شیخ تھی اس گاؤں میں جا پہنچیں تاکہ ان بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو کسی طرح روکا جائے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے جاتے ہی اس گاؤں کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور وہاں زخمیوں کی امداد کا ایک مرکز قائم کر دیا اور سب کے لئے چائے کا انتظام بھی کر لیا۔ اس کے بعد جب سپاہی اس گاؤں تک پہنچے تو انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ مرہم پٹی اور چائے نوشی کے دوران میں وہ اُن سے میدان جنگ کے متعلق باتیں کرنے لگیں اور انہیں یوں ہی بتلانے لگیں کہ کس طرح چینی افواج کامیابی سے دشمن کا مقابلہ کر رہی ہیں اور پھر پوچھا کہ تم لوگ کہاں سے آرہے ہو اور اب کدھر کا رُخ ہے؟ جب انہوں نے جواب دیا کہ ہم میدان سے گریز کرتے ہوئے آرہے ہیں تو لڑکیوں نے بہت حیرانی ظاہر کی اور اُن کی بات ماننے سے انکار کیا اور پوچھا کہ اگر تم لوگ اور پیچھے ہٹتے گئے تو ان ہمارے سپاہیوں کا کیا حال ہوگا جو نہایت تندہی سے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں؟ ـــــ ان لڑکیوں نے اُن بھگوڑے سپاہیوں کو بُرا بھلا نہ کہا انہوں نے صرف میدان والے سپاہیوں کی حالت پر اظہار افسوس ہی کیا۔ سپاہی چند گھنٹوں تک تو گاؤں ہی میں رہے اور آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے اور پھر چپکے سے گاؤں سے نکل کر باہر اکٹھے ہوئے اور میدان جنگ کی طرف چلے گئے۔

بسنت سہائے

غزل

پھر بہار آئی نظامِ سنبلستاں دیکھئے
پردۂ ہر گل میں پھر چاکِ گریباں دیکھئے

فصلِ گل ہے ابرِ باراں ہے ہوا ہے عطر بار
آسیئے اور میری بربادی کے ساماں دیکھئے

خون ہر اک نوکِ مژگاں پر چھلک کر آگیا
میرے اشکوں میں مری حسرت کا عنواں دیکھئے

مطربوں کے جانفزا نغموں سے جی اُکتا گیا
اب کسی دن چھیڑ کر سازِ رگِ جاں دیکھئے

جو لبِ راوی پہ دیکھا تھا کبھی آنکھوں نے خواب
دل یہ کہتا ہے وہی خوابِ پریشاں دیکھئے

وسعتِ صحرا ہر اک ذرے کے دل کو ہے نصیب
ڈوبئے گا ایک قطرے میں تو طوفاں دیکھئے

دیدۂ ظاہر سے حالِ دل پڑھا جاتا نہیں
چشمِ باطن سے مرا شوقِ فراواں دیکھئے

آج اختؔر پھر جنوں دیتا ہے پیغامِ جنوں
ٹکڑے ٹکڑے آج پھر جیب و گریباں دیکھئے

اختؔر ہوشیارپوری

حشر سے پہلے اُردو ڈرامانگاری

شاہانِ اسلام میں سب سے پہلے فرخ سیر نے ایک شخص نواز نامی کو حکم دیا کہ وہ کالیداس کے شہرہ آفاق ڈرامے شکنتلا کا اردو کا جامہ پہنائے۔ ترجمہ تو ہوگیا لیکن بالکل نایاب ہے۔ آخر واجد علی شاہ کے زمانے میں امانت نے "اندرسبھا" لکھی۔ یہ ایک ڈرامہ ہے جو تمام کا تمام نظم میں لکھا گیا ہے۔ اس کے متعلق ادبی حلقوں میں بہت اختلافات ہیں۔ اور اس کی تصنیف کے متعلق کئی نظریات ہیں۔ جن میں سے ہم دو کا بیان کرتے ہیں۔

(۱) واجد علی شاہ کے حضور میں ایک فرانسیسی آیا۔ مختلف سامان تعیش کے بارے میں اُس نے اوپیرا کا ذکر کیا۔ چنانچہ واجد علی شاہ نے امانت کو حکم دیا کہ وہ ایک اوپیرا تیار کرے۔ امانت نے "اندرسبھا" تیار کیا۔ بادشاہ نے اسے قیصرباغ میں سٹیج کیا۔ خود اندر کا پارٹ لیا اور درباریوں کو دوسرے پارٹ دیئے گئے۔ اس نظریئے کو نور الٰہی محمد عمر صاحبان مصنفین ناٹک ساگر اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی تائید حاصل ہے۔

(۲) دوسرے نظریئے کے مطابق واجد علی شاہ یا شاہی خاندان کے کسی اور رکن نے "اندرسبھا" میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ واجد علی شاہ نے کنہیا جی کی دل نواز زندگی کو دیکھ کر ایک طبعزاد ڈراما تیار کروایا جس میں خود "کنہیا پیا" بنتے اور منکوحات گوپیاں بنتیں۔ لوگوں نے شاہی ڈراموں کی دیکھا دیکھی "اندرسبھا" جیسے ڈرامے کرنے شروع کر دیئے۔ مولانا شرر مرحوم اس نظریئے کے حامی تھے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ واجد علی شاہ کے ایما پر "اندرسبھا" نہیں لکھی گئی۔ اور نہ "اندرسبھا" کبھی شاہی ڈرامہ بنا۔ نیز یہ کہنا کہ واجد علی شاہ نے کنہیا جی کی زندگی کو دیکھ کر خود ایک ڈرامہ لکھا۔ اور اس میں حصہ لیا یہ بھی غلطی سے خالی نہیں۔

یہ کہنا کہ واجد علی شاہ کے حضور میں ایک فرانسیسی آیا۔ سراسر مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ واجد علی شاہ کے زمانہ میں فرانسیسی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ اور ہندوستان کی بساطِ حکمت عملی پر اُن کے تمام مہرے پٹ چکے تھے اور واجد علی شاہ کے مقربین میں کسی فرانسیسی کا ہونا سراسر ناممکنات سے ہے۔

اب مسئلہ بحث یہ ہے کہ اندرسبھا کس کی خواہش پر لکھی گئی۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ امانت کی دربار تک رسائی نہ تھی۔ کیونکہ اگر ہم امانت اور واجد علی شاہ کی زندگیوں کا مطالعہ کریں۔ تو اس کا کافی ثبوت مل جاتا ہے۔ امانت ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوا اور واجد علی شاہ ۱۲۴۳ھ میں۔

۱۲۵۰ھ میں امانت کی طاقتِ گفتار میں فرق آگیا۔ تقریباً دس سال اسی طرح گزرے۔ صحت ہوگئی۔ لیکن زبان میں لکنت باقی رہی۔ اُن کی طبیعت گوشہ پسند اور تنہائی کی عادی تھی۔ اس لئے گھر سے بہت کم باہر نکلے۔ ملاحظہ ہو شرح اندرسبھا "دنع کے خیال سے کہیں جاتا تھا نہ آتا تھا۔ زبان کی وابستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی عبادت نے کہا کہ بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسے کے طور پر طبعزاد قلم کیا چاہیئے۔ کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہو اور خلق میں شہرت ہوئے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امانت کی صحت تک واجد علی شاہ سترہ اٹھارہ برس کے ہو چکے تھے۔ گو تخت نشین نہ ہوئے تھے لیکن موسیقی اور شاعری میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک امانت واجد علی شاہ کے حضور میں نہیں گیا تھا کیونکہ جب زبان کی وابستگی اور لکنت احباب کے ہاں جانے کے مانع تھی تو دربارِ شاہی میں اس حالت میں وہ کیسے جا سکتا تھا۔ صحت کے چھ سات سال بعد ایک دوست حاجی عابد علی عبادت کی فرمائش پر اندرسبھا لکھی جانی شروع ہوئی۔ اور ۱۲۷۰ء میں تیار ہوئی۔ چنانچہ حاجی مرزا عابد علی عبادت نے جن کی فرمائش پر اندرسبھا تیار ہوئی، یہ تاریخ نکالی۔

کہی خوب تاریخ تُو نے عبادت   مرقع امانت کی اندرسبھا ہے

جب اندرسبھا تیار ہوئی۔ تو کئی لوگوں نے اس میں پارٹ لینا چاہا۔ جس پر جھگڑا بھی پڑ گیا۔ لیکن بعد میں فیصلہ ہوگیا۔

حضرات نور الٰہی محمد عمر نے سٹیج اور پردوں کو فرانسیسی سنگیت راپیرا کا اثر ظاہر کیا ہے۔ حالانکہ سٹیج کو سنسکرت ڈراما نے صدیوں پہلے سے متعارف کر رکھا تھا اور پردوں کے متعلق یہ عرض ہی کافی ہے کہ ان پردوں سے مراد منظر نہیں ہے بلکہ وہ پردے جو سفید یا کسی ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے تھے۔ اور جن کی ضرورت صرف اس لئے محسوس ہوتی تھی کہ سٹیج پر اداکار بن ٹھن کر تیار ہو جائیں اور پھر پردہ اُٹھا دیا جائے۔ پردوں سے اُس وقت پس منظر کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ واجد علی شاہ "رہس" میں کنہیا جی کا پارٹ

[illegible] اگر واجد علی شاہ کی اس تصنیف کا مطالعہ کیا جائے جس کا نام [illegible] رکھتے تھے۔ ملاحظہ [illegible] مضمون مؤثر ہے تو اس میں اس بات کا [illegible] پلاٹ خاکہ [illegible] تھے اور بعد میں کتھیا کی ہدایت [illegible] بہت ہو گئے۔ [illegible] واجد علی شاہ [illegible] صاحب بھی نہ تھا۔ [illegible] بات کا پتہ نہیں [illegible] واجد علی شاہ سے [illegible] شاہی سرپرستی حاصل [illegible] فرانسیسی [illegible] نے واجد علی شاہ سے نسبت [illegible] کا ذکر کیا۔

اندر سبھا کا خلاصہ یہ ہے کہ راجہ اندر دربار لگائے بیٹھا ہے۔ پکھراج پری، نیلم پری اور لال پری یکے بعد دیگرے گاتی اور رقص کرتی ہیں۔ سبز پری کے آنے تک [illegible] سبز پری اپنے باغ سے اڑ کر میدان کی طرف [illegible] ایک [illegible] نوجوان شہزادہ [illegible] سویا ہوا [illegible] گلفام [illegible] واپس آکر سبز پری نے کالے دیو [illegible] وہ گلفام کو [illegible] وہ خواب سے چونک کر اپنے [illegible] اسی وقت لیا اور اسے [illegible] سبز پری اسے تمام کہانی سناتی ہے اور حرف [illegible] گلفام اندر کے دربار کی سیر کی خواہش کرتا ہے۔ پری [illegible] شہزادہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہاں آدمی زاد کا جانا ناممکن ہے۔ شہزادہ گلفام اسے طعنہ دیتا ہے کہ تو کسی دیو کی خدمت میں وہاں جاتی ہے اس لئے مجھ کو سبھا میں نہیں لے جاتی ہے۔ وہ اس پر بہت سیخ پا ہوتی ہے اور دیو کو گالیاں دیتی ہے۔ شہزادہ کہتا ہے کہ اگر اسے اندر پوری میں نہ لے جایا گیا۔ تو وہ خودکشی کرے گا۔ پری اسے لے جا کر ایک درخت کی آڑ میں چھپا دیتی ہے اور پھر اندر کی سبھا میں رقص کرتی ہے۔ لال دیو گلفام کو دیکھ کر راجہ سے مخبری کرتا ہے۔ راجہ پری زاد اور آدمی زاد کی محبت کو نہایت قابل اعتراض قرار دیتے ہوئے گلفام کو ایک اندھے کوئیں میں قید کر دیتا ہے اور سبز پری کے بال و پر نوچ کر اسے جلاوطن کر دیتا ہے۔

سبز پری ایک جوگن بن کر گلفام کی تلاش میں صحرا نوردی کرتی ہے۔ ایک دن کالا دیو اس کا ایک گیت سن لیتا ہے اور اسے اندر کی سبھا میں لے جاتا ہے۔ اندر اس کے گانے کو پسند کر کے اسے منہ مانگی مراد دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ وہ گلفام کو مانگتی ہے۔ گلفام اسے مل جاتا ہے۔ دونوں کی ملاقات ہوتی ہے پریاں مبارکبادی گاتی ہیں اور پردہ گر جاتا ہے۔" ..

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ "امانت" نے اس ڈرامے کا پلاٹ کہاں کہاں سے لیا۔

میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے کئی واقعات "اندر سبھا" کے واقعات سے ملتے ہیں۔ ذیل میں "سحر البیان" کا خلاصہ بھی دیا جاتا ہے۔ تاکہ دونوں قصص کا موازنہ کیا جا سکے۔

"ایک بادشاہ کی نرینہ اولاد نہ ہوتی تھی۔ نجومیوں سے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ لڑکا پیدا تو ہو گا۔ لیکن عمر کے بارھویں سال اسے ایک خطرہ کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ لڑکا پیدا ہوا نام بے نظیر رکھا گیا۔ اس کی عمر کے بارھویں سال اسے بہت احتیاط سے مکان میں مستور رکھا گیا۔ ایک چاندنی رات میں وہ اپنے محل کے بام پر سویا ہوا تھا کہ ایک پری نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اس پر عاشق ہو گئی اور اسے وہاں سے اٹھا لے گئی۔ پرستان جا کر شاہزادہ کو ایک کل کا گھوڑا دیا۔ ایک دفعہ سیر کرتے ہوئے شاہزادہ بدر منیر کے باغ میں پہنچ گیا۔ بدر منیر کو اس سے محبت ہو گئی۔ [illegible] آمد و رفت جاری رہی۔ ایک دیو نے پری کو تمام قصہ سنا دیا۔ پری کو سخت غصہ آیا۔ اس نے بے نظیر کو کنوئیں میں قید کر دیا۔ بدر منیر کی سہیلی نجم النساء جوگن کا بھیس بدل کر نکلتی ہے جنوں کے بادشاہ کے لڑکے فیروز بخت کو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اسے بادشاہ کے پاس لے جاتا ہے۔ بادشاہ اس کے گیت سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ موقع پا کر نجم النساء فیروز بخت سے بے نظیر کا ذکر کرتی ہے۔ فیروز بخت کی مدد سے بے نظیر مل جاتا ہے۔ بے نظیر بدر منیر سے جا ملتا ہے اور نجم النساء اور فیروز بخت مل جاتے ہیں۔"

ان ہر دو قصص میں مندرجہ ذیل واقعات مشترک ہیں۔

(۱) چاندنی رات میں گلفام کی خواب گاہ، اس کا حسن اور سبز پری کا اس پر عاشق ہونا بالکل "سحر البیان" والی چاندنی رات، بے نظیر کی خواب گاہ، اس کے حسن اور پری کے اس پر عاشق ہو جانے سے ملتا ہے۔

(۲) گلفام سبز پری کے پاس پہنچ کر اسے حیرت سے پوچھتا ہے کہ میں کہاں ہوں کس فضا میں ہوں۔ اور کیسے آیا ہوں۔ بے نظیر بھی پری سے یہی سوال کرتا ہے۔

(۳) کوہ قاف کے کنوئیں میں دونوں شہزادوں کا قید ہونا اندر سبھا اور سحر البیان دونوں میں مشترک ہے۔

(۴) جوگن کا بھیس اور گانے کا ذکر دونوں قصوں میں ایک ہے۔

(۵) دونوں کا خاتمہ بھی ایک ہی سا ہوتا ہے۔

نہ صرف واقعات ہی مشترک ہیں۔ بلکہ خیالات اور جذبات بھی ایک ہیں

نیز مندرجہ ذیل اشعار "بدرِ منیر" سے اندر کے مختلف مقامات پر اندر سبھا میں درج ہیں

کرم مجھ پہ رکھیو سدا میری جان   تمہیں دل چھوڑے جاتی ہوں اپنا نشان

چاندنی کے سماں کے متعلق حسن کے دو اشعار نقل کئے گئے ہیں ؎

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا   وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

وہ نکلا فلک اور مہ کا ظہور   لگا شام سے صبح تک وقت نور

جوگن کے حسن کے متعلق بھی ایک شعر نقل کیا گیا ہے ؎

کرے حُسن کو کس طرح کوئی ماند   چھُپے ہے کہیں خاک ڈالے سے چاند

اور جب جوگن کو زبردستی لے جاتے ہیں تو وہاں بھی حسن کا ایک شعر درج ہے ؎

زمین سے اُڑا آسماں کے تئیں   وہ کتنا کہا کی نہیں رے نہیں

اس تمام بحث سے مقصود یہ ہے کہ اُردو ڈراما کا آغاز مثنوی سے ہوا۔ نہ کہ بقول کسے اوپیرا کی تقلید سے۔

اب اندر سبھا کے متعلق ایک اور اہم قابل بیان ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اندر سبھا میں راجہ اندر کے پردہ میں واجد علی شاہ کے دربار کا منظر پیش کیا گیا ہے اس لئے ممکن ہے کہ یہ ڈراما واجد علی شاہ کے حکم پر لکھا گیا ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ڈراما نگار فسانہ نویس یا شاعر خواہ کسی دوسرے زمانے کو ظاہر کرتے ہوئے کوئی ڈراما یا افسانہ یا نظم لکھے۔ ضروری ہے کہ وہ عمداً یا بے ارادہ اپنے ماحول اور فضا کا ذکر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حبادت کی طرف سے "اندر سبھا" کے لکھنے کی فرمائش ہوئی تو امانت کو واجد علی شاہ کے دربار کا خیال آگیا۔ مثنوی "بدرِ منیر" میں میر حسن کے زمانہ کے طریق بود و باش اور معاشرت کا نمونہ پیش کیا گیا ہے اور میر حسن نے تمام کرداروں کو اپنی سوسائٹی کے رنگ میں رنگا ہے۔

"اندر سبھا" کا درجہ اس حیثیت سے کہ یہ اُردو کا سب سے پہلا ڈراما ہے بہت بلند ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی رائے میں "اندر سبھا مغرب کے اکثر ڈراموں سے بہتر ہے۔"

اندر سبھا میں امانت کی چند دلفریب غزلیں بھی ہیں جن کی شوکتِ الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موجودہ زمانہ میں لکھی گئی ہیں۔ امانت کے تخیل کی بلند پروازی نے اندر سبھا کا معیار بہت بلند کر دیا ہے۔ نیز اس میں استعارات اور تشبیہات کی پختگی بھی قابلِ ذکر ہے۔

"اندر سبھا" کی تعریف میں ایک صاحب لالہ کنور سین ایم اے بیرسٹر ایٹ لا نے فرمایا ہے کہ اس کی نثر بلا تصنع، سلیس، با محاورہ اور قافیہ بندی سے آزاد ہے" حالانکہ اس ڈراما میں نثر کا نام و نشان بھی نہیں۔ سوائے ان مقامات کے جب امانت منظر کے ظاہر کرنے کے لئے ایک یا دو سطریں نثر میں لکھتا ہے۔

اب اندر سبھا کے ایک چھوٹے سے دلچسپ منظر کو دیکھئے۔

سبز پری کے پاس جب کالا دیو گلفام کو لے آتا ہے تو گلفام سبز پری سے پوچھتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور جب حالات سے واقف ہوتا ہے تو سبز پری سے کہتا ہے۔

گلفام:- میوا تجھ سی زمانہ میں نہ ہوگی زنہار   آپ بدنام ہوئی مجھ سے چھڑایا گھر بار
بھیج کر دیو مجھے کھینچ بلایا تُو نے   آدمی زاد کو پھندے میں پھنسایا تُو نے

سبز پری:- زندگی کا ہے مزہ ایسی ملاقاتوں میں   جو نچلے مجھ سے بگھارو نہ ذرا باتوں میں
دیکھ پچھتائے گا میرا جو بُرا دل ہوگا   وصل تجھ کو نہ پری کا کبھی حاصل ہوگا

گلفام:- گھر کے چھٹنے کا ہے غم آہ و فغاں کرتا ہوں   وصل کا وعدہ میں اس شرط سے ہاں کرتا ہوں

اندر سبھا کے اکھاڑے کا ذکر کرتے ہوئے

ساتھ اپنے مجھے لے چل وہی جلسہ دکھلا   راجہ اندر کے اکھاڑے کا تماشہ دکھلا

سبز پری:- ایسی باتوں کا زباں پر نہیں لانا اچھا   جان آفت میں نہیں مفت پھنسانا اچھا
آفت آجائے گی تجھ پہ ارے اک آن کے بیچ   آدمی زاد کا کیا کام پرستان کے بیچ!
کوئی راجہ کو خبر جا کے لگا دیوے گا   پھونک دے گا وہ مجھے، تجھ کو جلا دیوے گا

اس پر گلفام اُسے بھڑکاتا ہے۔

گلفام:- تو کسی دیو کی خدمت میں وہاں جاتی ہے   اس لئے مجھ کو سبھا میں نہیں لے جاتی ہے

سبز پری:- بات ہرگز یہ زباں سے نہ نکالو صاحب   ہوش میں آؤ، ذرا منہ کو سنبھالو صاحب
میں پری ہو کے اور ایسے پہ فدا جان کروں   اپنی چوٹی سے موئے دیو کو قربان کروں

گلفام:- واں نہ لے جانے کی تو جی سے گنہ جاؤں گا   میں ابھی اپنا گلا کاٹ کے مرجاؤں گا

سبز پری:- [illegible]   چل لالہ تجھے اندر کا دکھا لاؤں میں

گلفام:- کوئی اُن ملنے کی تدبیر بتا دے مجھ کو   پر کسی دیو کے تو نوچ کے لا دے مجھ کو

سبز پری:- تھام لو پائے تخت کا اب ہاتھ سے تم   چھوٹ جانا نہ کہیں راہ میں پر ساتھ سے تم
کسی آفت میں یکایک اگر آنا جانی!   یاد رکھنا کہ مجھے بھول نہ جانا جانی

مداری لال نامی ایک کائستھ نے بھی اندر سبھا لکھی۔ لیکن چنداں مقبول نہ ہوئی۔

لکھنؤ میں جو ہنگامہ ہوا تو وہاں سے اندر سبھا چل کر بمبئی پہنچی۔ جہاں یہ میلوں تہواروں پر دکھائی جانے لگی اور اتنی مقبول ہوئی کہ ہر ایسی جگہ پر اسے کھیلا جانے لگا۔ جہاں کوئی پبلک مقام ہوتا۔ اکثر ایسے ڈرامے ہوتے۔ جو ہندوؤں کے تاریخی واقعات سے متعلق تھے۔ اُن سے عوام کو دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ وہ ہندی زبان کو سمجھنے سے نا آشنا تھے۔ اُدھر پارسی نوجوانوں کو خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اپنے قومی کارناموں کو سٹیج کریں۔ یوں تفریح بھی ہو جائیگی اور ساتھ ہی تبلیغی کام بھی ہوتا رہیگا۔ چنانچہ چند پارسی نوجوانوں نے "رستم اور سہراب" کو سٹیج کیا۔ یہ کھیل بہت مقبول ہوا۔ گو ابتدا۔

اسے نہایت ہی حسن سلوک سے تیار کیا گیا تھا پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے پہلے ڈراموں کو دیکھا ہوا تھا۔ اس سے دلچسپی لیتے گئے اور انہوں نے تنقید و تعریض کے علاوہ مفید مشورے بھی دیئے۔

جب پارسیوں نے یہ دیکھا کہ لا بہ دہی کاتب لکھنے سے بھی ڈراما بہت اچھی بنے تو اُنہوں نے دلی، بمبئی اور کلکتے میں تھیٹریکل کمپنیاں کھولی ہیں۔ سب سے پہلی کمپنی سیٹھ پیسٹن جی فرام جی نے اوریجنل تھیٹریکل کمپنی کے نام سے قائم کی۔ اس کمپنی نے بیسے بُت ایڈ خورشید جی بالی والا، کاؤس جی کھٹاؤ، سہراب جی اور جہانگیر جی تھے اس کمپنی کے قیام کا متصل ہی تھا۔ اس سے اس کے ڈراموں میں ایک خاص سم کی زبان اُس کا استعمال کی گئی۔ جو گجراتی، پوربی، ہندی اور بنگالی وغیرہ کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ ڈراموں میں زیادہ تر نظم ہی استعمال ہوئی۔ اس کمپنی کے اولین ڈراما نگار منشی محمد میاں رونق تھے۔ مصنفین نامک ساگر نے انہیں بنارسی لکھا ہے۔ سید احسن لکھنوی کی رائے میں وہ دکنی تھے۔ آپ نہایت خوش الحان اور ذہین تھے آپ کے تخیلات بہت بلند تھے۔ آپ کی شاعری بھی تخیل کے اعتبار سے پاکیزہ اور گراں قدر تھی۔ آپ کے ڈراموں میں مغربی تخیل موجود تھا۔ یا تو آپ خود انگریزی جانتے تھے یا کسی اور کی معرفت مغربی ڈرامہ نگاروں کے تراجم مل گئے ہوں گے۔ آپ کے دو مشہور ڈرامے "گل بصنوبر" اور "عاشق کا خون" ہیں۔

آپ کے بعد منشی میاں ظریف نے اس کمپنی کے لئے متعدد ڈرامے لکھے۔ چند ڈراموں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ تیغِ عصمت، گل بکاولی، چترا بکاولی، مہ منیر، حاتم طائی، شیریں فرہاد، نیرنگِ عشق، عشرت سبھا، اندر سبھا فرخ سبھا وغیرہ۔ آپ فہیم و شمیم بلند و بالا وجیہہ آدمی تھے۔ مسٹر فرد زجی بری کے خاص منشی تھے اور غالباً ایک ورنیکلر سکول کے مدرس بھی رہے تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لیکن نظم و نثر میں خامیاں بھی بہت تھیں۔ فن کے اعتبار سے بھی آپ کے ڈراموں کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ احسن لکھنوی کے قول کے مطابق "میاں ظریف اصول سے اس درجہ ناواقف تھے کہ جو کچھ کہتے وہ خود بھی نہ سمجھتے"۔ بہر حال آپ نے زبانِ اُردو کو بہت تقویت دی اور اسے بہت مقبول بنایا۔ آپ کے ڈراما نیرنگِ عشق میں سے ایک منظر کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

زن :- اجی سنتے ہو یا نہیں ؟

گورو :- ہاں سنتا تو ہوں۔ کہو کیا کہنا ہے ؟

زن :- ہائے ہائے اب کیا کریں، کہاں تک بھوک کے مریں۔ اوپاس اوپاس کرکے بدحواس ہو گئی۔ مارے بھوک کے پران جلتے ہیں۔ جل پی پی کے سوتی ہوں تو اُجڑی نیند بھی نہیں آتی۔ افسوس تم رام نام جپا کرتے ہو نیکی پرمرتے ہو۔ مگر یہ زمانہ کچھ اور ہے۔ نرالا طور ہے۔ مکر و فریب کا دور ہے یہ سب نیکیاں گناہی ہیں یہاں دو۔ دیلئے بدی کے خواص بنو۔ گیہوں یا جوار لاؤ۔ جس سے جان بچے۔

گورو :- واہ واہ تم نے سچ کہی۔ اپنا اوپاس کرنا اور تپسی کرنا گیا آتش بھوک میں تپنا ہے اور جوگ سوگ ہر دم کا سُپنا ہے۔ بہتر تو یوں ہے کہ دام نام جپنا بیاپا ال اپنا۔ سن تو اب ایک فریب نادر کرتا ہوں۔ دو تھالیاں لے لے۔ ایک کے پیچھے کالا رنگ لگا دے اور ایک آئینہ بھی دے۔ میں جا کر ضرور سے پیدا کر لیتا ہوں۔

نیرنگِ عشق سے انہوں نے ہر ڈراما میں مزاحیہ سین دوسرے مناظر کے ساتھ ساتھ داخل کرنے شروع کر دیئے۔ مندرجہ بالا منظر کا لکھنے والا اصلی ڈرامہ وہ ہمیشہ نظم میں لکھا کرتے تھے۔ ۱۸۸۰ء تک جتنے ڈرامے لکھے گئے وہ تمام نظم میں تھے۔ سوائے اُن حصوں کے جو کامک ہوتے تھے۔

بالی والا وکٹوریہ ناٹک کمپنی کے واحد مالک تھے اور آپ کو ایک کامیڈین ہونے کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل تھی۔ ۱۸۸۱ء میں لارڈ لٹن کے دربار دہلی میں اس کمپنی نے بہت روپیہ کمایا۔ پھر لندن گئے۔ لیکن وہاں بہت نقصان ہوا۔ اس کمپنی کی مشہور ایکٹریس مس مہتاب، مس خورشید اور مس میری فینٹن تھیں ایکٹروں میں رستم جی نمایاں تھے۔

اس کمپنی کے ڈرامے منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی لکھتے تھے۔ آپ پہلے کلکتہ کے ڈاک خانہ میں ملازم تھے۔ مضمون لکھنے کا شوق تھا۔ پنجاب کے نامور مرحوم رسالہ "مخزن" میں آپ کے متعدد مضامین چھپتے رہے ہیں۔ نہایت خلیق اور شریف الطبع تھے آپ راسخ دہلوی کے شاگرد تھے اور اُن کے شاگردوں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ آپ پہلے شخص تھے جنہوں نے ڈراموں میں نثر کو بھی داخل کیا ہے۔ ہندی گانوں کے بجائے اُردو گانے رائج کئے۔ اُن کے ڈراموں میں مزاحیہ عنصر زیادہ تھا۔ اور آپ مزاحیہ عنصر کو نمایاں کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ وکٹوریہ کمپنی کے مالک بالی والا نہایت ہر دلعزیز طربیہ اداکار تھے اور عوام محض اُن کی طربیہ اداکاری سے محظوظ ہونے کے لئے تھیٹر کو کھچا کھچ بھر دیتے تھے۔ آپ کچھ انگریزی بھی جانتے تھے۔ اسی لئے آپ نے لٹن کے مشہور ناول لیلے اینڈ سونگ کے پلاٹ کو اخذ کر کے لیل و نہار کے نام سے ایک ڈراما لکھا۔ یہاں اُن کے ایک مشہور ڈرامے گوپی چند سے ایک منظر دیا جاتا ہے۔

"(باب اوّل سین دسواں۔ دیوان خانہ۔ رانی مینا وتی کو منانے ہوئے گوپی چند کا آنا)

گوپی چند۔ اگر یوں نہ ہو۔ تو میری رانی نے تجھے کچھ بدسخن سنایا ہوگا۔

میناوت۔ نہیں گوپی چند نہیں تیری رانی ایسی بے ادب نہیں جو میرا دل دکھلائے
میں نے کسی کو کبھی نہیں ستایا۔ پھر کوئی مجھے کیسے بیزار کرے۔

گوپی چند۔ شاید کسی نوکر نے تیری نافرمانی کی ہوگی۔

میناوت۔ سب نوکر بڑی ہوشیاری سے میرا ہر ایک فرمان بجالاتے ہیں۔ میں نوکروں
کی بھی ستائی ہوئی نہیں ہوں۔

گوپی چند۔ میری رعیت میں سے کسی نے تجھ پر نظر اُٹھائی یا دربار کے کسی امیر
نے تیرے روبرو بے ادبی کی ہے۔

میناوت۔ بے گناہ رعیت کو میں بے ادبی کا داغ لگانے سندوگی اور نمک حلال
درباریوں کے نام بھی خطا کی چھینٹ ڈالنا مناسب نہیں۔

گوپی چند۔ ماتا پیاری پھر کس نے تجھے آزردہ کیا۔ کیا وہ تقصیر وار میں تیرا نابکار بیٹا ہوں
بتا دے کہ میں معافی چاہوں۔

میناوت۔ بیٹا کیوں ضد کرتا ہے میں نے ایک بار کہا کہ میں غمگین نہیں ہوں اور
اگر ایک بارگی غم نے مجھ پر چنگل بھی مارا ہو تو بھی مجھ کو سزاوار نہیں کہ اپنے
رنج کے مرض سے تجھے میں ہلاک کر دوں۔

گوپی چند۔ نیک مادر۔ یہ کیسے سخن کیا ہیں تیرے دُکھ سکھ کا ساتھی نہیں ہوں؟
تجھ پر گرتی ہوئی آفت کی بجلی مجھے اپنے سر پر روک نہ لینا چاہیئے ہماتا
تو ہرگز اپنی رنجیدگی کا سبب نہ چھپا۔ تجھے میری جان کی قسم۔ جلد بتا۔

میناوت۔ افسوس کہ تیری قسم سے دل کا بھید تجھے کہنا ہی پڑا۔ سن گوپی چند۔ مجھے
یہ رنج ہے کہ اس چند روزہ دنیا میں تو نے ابھی تک کوئی کامل مرشد نہیں
کیا جو تجھے راہ نجات کی بتا دے اور اس مکار دنیا کے دام فریب سے
بچائے اس لئے بیٹا کوئی گرو کر تاکہ سُکھ دونوں میں ہے۔

گوپی چند۔ مگر اس جھوٹی دنیا میں سچا گرو کون ہے میں کسی گرو کو نہیں پہچانتا۔ میرا
گرو وہی کرتار سرجن ہار ہے۔

میناوت۔ سچ ہے بیٹا سب گرو کا گرو تو وہی کرتار سرجن ہار ہے پر اس کرتار کو پانے
پہچاننے کو دنیا کا کوئی کامل مرشد کرنا ضروری ہے جیسا کہ راجہ تک پہنچنے
کو درباری سے ملنا ضروری ہے۔

گوپی چند۔ گانا بھوپالی غزل

فضل ہے خدا کا مجھ پہ تیری مہربانی ہے
وقتِ شادمانی ہے بخت یار جانی ہے
گلشنِ جہاں پھر کیوں نہ پیوں جامِ عشرت[1]
موسم بہار آیا عالمِ جوانی ہے
عیش غنیمت جس کو غم سے دی زمانے نے فرصت
عالمِ فنا میں اپنی تھوڑی زندگانی ہے!
جتنے ہیں جہاں میں گرو میں کسی سے کم نہیں
مرشدوں کی باتیں ساری حرفِ لن ترانی ہیں

میناوت۔ گوپی چند تکبر سے باز آ۔ تیری بات نے ثابت کر دیا ہے کہ سچے راستے سے
تو بالکل بے خبر ہے اگر تو باہر ہوتا تو یہ غرور تیرے منہ سے ظاہر نہ ہوتا۔
بیٹا ابھی تو نادان بے شعور ہے۔ اس لئے کسی گرو کا اپدیش لینا تجھے
ضرور ہے۔

گوپی چند۔ ماتیشری۔ تیرا کہنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا میں راج پاٹ چھوڑ دنیا سے
منہ موڑ دوں۔

میناوت ۔ خدا سے دل لگا رکھ آپ کو مشغول دنیا میں
جس طرح کانٹوں میں رہ کر پھول دنیا میں
نہ اپنا فرض اے بیٹا تو ہرگز بھول دنیا میں
خدا کی بندگی کا رکھ سدا معمول دنیا میں
یہ دنیا نقش فانی ہے یا کہ کھیل پانی میں
رہو اس طرح دنیا میں کہ جیسے تیل پانی میں!

گوپی چند۔ سوچ کے اس بات کو خدمت میں پھر آؤں گا میں
ہو سکا مجھ سے تو آنکھوں سے بجا لاؤں گا میں

میناوت ـــ جا میرے لختِ جگر تجھ کو خدا توفیق دے
راہِ حق پہ چلنے کی مولا تجھے توفیق دے

الفریڈ کمپنی۔ اس تھیٹر کو کاؤس جی نے قائم کیا تھا اور سب سے پہلے ڈرامہ نگار منشی کریم الدین تھے۔ منشی کریم الدین نے ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ احسن لکھنوی کے ایک دوست نے ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے، سانولا رنگ، میانہ قد، لاغر اندام، ڈھیلا پیدار پاجامہ، دودامن گوٹ کا انگرکھا، دلی کے سادے چمڑے کا جوتا۔ ایک رومال گز بھر لمبا کاندھے پر پڑا رہتا تھا۔ چہرہ پر پوری داڑھی اور نہایت شوخ مزاج زندہ دل ظریف تھے۔ آپ دیہی ڈراما نگار تھے اور ڈراموں میں دینا اللہ کے خیال کی جھلک تھی۔ خاندان ہامان، خداداد، چترا بکاؤلی آپ کے کارنامے ہیں۔

منشی مراد علی مرآد۔ آپ مولینا احسن لکھنوی کے ہم عصر تھے پہلے الفریڈ کمپنی میں تھے۔ پھر سہراب جی کی نیو الفریڈ کمپنی کے لئے ڈرامے لکھنے لگ گئے۔

---

[1] تعجب ہے کہ جناب طالب عروض اور قافیے کے ابتدائی اصولوں سے بھی واقف نہیں تھے یا یہ اُردو ڈراموں کے مسخ شدہ نسخوں کا کمال ہے جو جاہل کاتبوں کی زبانی بے دو پبلشروں تک پہنچتے تھے۔ (ادارہ)

نیز آپ بادشاہ سے منسلک ہوئے [illegible] کے لئے لکھے
تھے [illegible]

سید مہدی حسن احسن لکھنوی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

تہمینہ:۔ [illegible]
خطاب سے میں جانتی ہوں یا [illegible] اپنے باپ کی روح سے
غافل ہوتا ہوں [illegible] میرے باپ کا جیسی [illegible] روح تو بے سبب ہے
پلید ہے۔ خونریز [illegible]
[illegible] عام کی [illegible] سنا رہی ہے
اپنی مسرت کا [illegible] معلوم تھا [illegible] اس لئے چھوڑ دیا۔ آپ کے نام میں

روح:۔ مرنے پر [illegible] آرام [illegible] آئی ہے [illegible]
پہلے جہانگیر یہ تیرے باپ کی روح ہے آرام اور [illegible] عذاب میں
گرفتار ہوں۔ اگر میرے اعمال بد کا کفارہ [illegible] کو اس عذاب الیم
سے چھٹکارا ہو۔

جہانگیر:۔ ہم تو آپ کو آرام سے کچھ عرصہ میں سلا گئے تھے۔ یہ زمانہ تو زمین دبا
گئے تھے اس خاک کو سونپے ہوئے جسم میں کیونکر جان آئی ہے
آپ کے بعد جہاں میں مجھے راحت نہ ملی۔ ہوں دم بھر کو ترپنے کی اجازت نہ ملی

بیتاب۔ پنڈت نرائن پرشاد بیتاب الفرڈ تھیٹریکل کمپنی کے لئے ڈرامے لکھا کرتے تھے۔ جن میں سے "قتل نظیر" خاص طور پر مقبول ہوا۔ بمبئی سے "شیکسپیر" نامی ایک رسالہ بھی شائع کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ رسالہ کامیاب نہ ہو سکا۔ آپ کو اُردو کے علاوہ ہندی اور سنسکرت پر بھی کافی عبور تھا۔ نیز بعد ڈرامہ نگاری کے فکر سخن بھی کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ سردار محمد طالب تلمیذ غالب اور منشی نظیر حسین سخا سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

[illegible] کے علاوہ کئی اور حضرات نے بھی قدیم رنگ میں اُردو ڈرامے لکھے جن میں مندرجہ ذیل حضرات خاص طور پر مشہور ہیں۔

حافظ محمد عبداللہ۔ میرزا نظیر بیگ اکبرآبادی۔ غلام علی دیوانہ۔ محشر انبالوی۔ منشی رحمت علی۔ دوارکا پرشاد افق لکھنوی۔ آغا شاعر قزلباش مرحوم وغیرہ۔

قدیم ڈرامہ نگاری کی خصوصیات:۔ اب ہم قدیم اُردو ڈرامہ نگاری کی خصوصیات کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ قدیم اردو ڈراموں میں کئی مشترکہ خصوصیات ملتی ہیں۔ مثلاً قوالوں کی طرح ڈرامہ شروع ہوتا ہے تو گانوں سے ختم ہوتا ہے۔ تو تب بھی گانا ہوتا ہے۔ بادشاہ سلامت ہوں تو وہ بھی گا رہے ہوتے ہیں۔ کوئی ان پڑھ شخص ہو تو اُس کی زبان سے بھی اشعار ادا کرانے ضروری سمجھے جاتے ہیں حتیٰ کہ دم نزع بھی گانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ مثلاً "لیلیٰ مجنوں" میں لیلیٰ اپنے سینے میں خنجر [illegible] کر جاتی ہے۔ چارپائی پر لیٹی ہے تو نہایت زور شور سے گانا شروع کر دیتی ہے اور گاتی گاتی مر جاتی ہے۔

جہاں گانا محسوس نظر آتا ہے۔ وہاں منظوم گفتگو ہوتی ہے۔ مثلاً "بیتاب" نے "دو رنگی دنیا" میں مندرجہ ذیل منظوم مکالمہ لکھا۔

انور:۔ عجب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔
گوہر:۔ بنیلے نسیم سحر چل رہی ہے۔
منوہر:۔ شفق سے ہوئی کیسی خوش رنگ بدلی۔
گوہر:۔ کسی ماہ وش نے ہے پوشاک بدلی۔

(بحوالہ اُردو ڈرامہ نگاری مصنفہ بادشاہ حسین حیدرآبادی)

اسی قسم کی اور مثالیں آپ کو "زہریلا عشق"، "گوپی چند" اور "خون ناحق" کے اقتباسات سے ملیں گی۔ جو ہم نے اس مقالے میں درج کئے ہیں۔

پہلے گانے، پھر منظوم مکالمے ہوتے اور جو عبارت باقی رہ جاتی اُنہیں مقفیٰ اور مسجع کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مثالیں بھی آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

ڈراموں کی کہانیاں اکثر عشق و محبت کے واقعات پر مبنی ہوتیں۔ اور مزاح کا عنصر نہایت سوقیانہ ہوتا تھا۔ سیرت نگاری میں کسی قسم کے غور و فکر کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی تھی۔ اُدھر زبان کی خامیاں اتنی ہوتیں کہ الاماں۔ بات یہ تھی کہ معمولی طور پر پڑھے لکھے لوگ تھیٹریکل کمپنیوں میں "منشی" بن جاتے۔ ان لوگوں کی اصلاح کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ انہیں تنخواہ بھی واجبی ہی ملتی تھی۔ اس لئے یہ محنت کرنے سے احتراز ہی کرتے تھے۔

حشر پہلے قدیم روش پر چلا۔ لیکن جلد ہی اُس نے اس روش سے ہٹ کر اُردو ڈرامہ نگاری میں ایک نئے دور کی طرح ڈالی۔ اس کا ذکر ہم آئندہ مقالے میں کریں گے۔

عبدالسلام خورشید

غزل

ماتھے پر ٹیکا صندل کا اب دل کے کارن رہتا ہے
مندر میں مسجد بستی ہے، مسجد میں برہمن رہتا ہے

ذرّے میں سُورج، اور سُورج میں ذرّہ روشن رہتا ہے
اب من میں ساجن رہتے ہیں اور ساجن میں من رہتا ہے

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پریت کے مارے بیٹھے ہیں،
روتے ہیں، رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے

اک آہ نشانی جینے کی باقی تھی، مگر جب وہ بھی نہیں
کیوں دُکھ کی مالا جپنے کو یہ تنکا سا تن رہتا ہے

اے مجھ پر ہنسنے اور کسی کو دیکھنے والو! یہ تو کہو
یوں کب تک جان پہ بنتی ہے، یوں کب تک جوبن رہتا ہے؟

دل توڑ کے جانے والے سُن دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اک پریم کا بندھن رہتا ہے

قیوم نظر

تخیل

نشیبِ دریا پہ لمبی لمبی سی گھاس تھی۔ شب کی تیرگی میں
کیا سوال اُس سے میں نے "ڈوبی ہوئی عجب کیفِ بے خودی میں
"تو اس پُر اسرار شب میں کیوں نے بدست، اکیلی یہاں کھڑی ہے؟
"کسی کی رہ تک رہی ہے؟ ——— وہ ایسا کون جادوگر اجنبی ہے،
جو کھینچ لایا ہے اس اندھیرے میں بھی تجھے اتنی دُور گھر سے؟"
وہ میری سمت ایک لمحے تک دیکھتی رہی شک بھری نظر سے۔
پھر ایک ہلکی سی آہ بھر کر کہا کہ ندی پہ آئی تھی میں
تنے ہوئے اوٹ اپنے دامن کی یہ دیا ساتھ لائی تھی میں
خیال تھا گر کنارِ دریا پہ اتفاقاً اُسے ملوں گی:
چراغ کی روشنی میں جی بھر کے اس کے چہرے کو دیکھ لوں گی۔
اگر وہ نغمے کا حکم دے گا، وہ گیت چھیڑوں گی بانسری پر
جو چند لمحوں میں ایک جادو سا بن کے چھا جائے اُس کے جی پر
مگر نجانے کہ منتظر کیوں ہے میری چشمِ پُر آب اب تک
سرودِ عشق آفریں بھی ہے قلب نے میں مصروفِ خواب اب تک
تھکے ہوئے انجم اونگھنے لگ گئے ہیں، اور رات ڈھل رہی ہے
مگر صد افسوس اس پہ، اب تک یہ شمع بیکار جل رہی ہے
پھر اُس کے دل میں نہ جانے کیا بات آئی، خاموش ہو گئی وہ،
وہیں کھڑی، چند لمحوں تک سر جھکائے، کچھ سوچتی رہی وہ۔
سنبھال کر آخر آنچل اک سمت کھوئی کھوئی سی چل پڑی وہ
خموش، سنسان گھاس کچھ اونگھتی تھی، بس اُس میں کھو گئی وہ۔

تخت سنگھ

چکّر

افراد

(۱) آدم (۲) حوّا ——— (۳) قابیل (۴) ہابیل

مقام:- باغِ عدن

پہلا سین

(باغ عدن کا ایک بلند مقام، جہاں سے سمندر نظر آرہا ہے اور اوپر نیلا شفاف آسمان بھی دکھائی دیتا ہے دائیں طرف آدم ایک درخت کے سائے تلے بیٹھا نظر آتا ہے۔ اُس کی نگاہیں آسمان کی طرف ہیں اور وہ پرندوں کے نغمات کی نقل اتارتے ہوئے گنگنا رہا ہے۔ آدم کافی مضبوط اور مطمئن انسان دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد بائیں طرف سے حوا داخل ہوتی ہے، وہ دراز قد ہے اُس کے خدوخال میں سختی اور بے اطمینانی ہے۔ وہ رُکتی ہے اور آدم پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالتی ہے)

حوّا۔ (سختی سے) گرمی کے بعد خزاں اور سردی کے بعد خزاں!

آدم۔ (حیران ہوکر) گرمی کے بعد خزاں اور سردی کے بعد خزاں؟ ——— حوا یہی نظامِ قدرت ہے (آہستہ سے) گرمی خزاں ——— سردی، خزاں! کتنا خوبصورت مضمون ہے۔ اگر ہابیل یہاں ہوتا تو وہ اس مضمون کو شعر میں خوب باندھتا۔

حوّا۔ خوب باندھتا! ——— مگر اس کا فائدہ!

آدم۔ (لطف اندوز ہوتے ہوئے) گرمی کے بعد خزاں! ———

حوّا۔ اور سبز پتے زرد ہو جاتے ہیں۔

آدم۔ مگر خزاں بھی تو پُرلطف ہوتی ہے

حوّا۔ (طنزاً) جی ہاں! پُرلطف!! ——— زرد پتے گر پڑتے ہیں۔ درخت بے برگ، دل اداس۔ اور ہوا بے کیف اور خنک (تیزی سے) یاد ہے گذشتہ سال جب ہم سارا موسم ہوا کی ناموافقت کے باعث باغ میں چل پھر نہ سکے!

آدم۔ ہاں پچھلے سال تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

حوّا۔ ہم وقت کا زیادہ حصہ بے کار پڑے سوتے رہے اور کوئی کام نہ کر سکے۔

آدم۔ بالکل! ——— (خوشی سے) لیکن جب موسم بہار آیا تو ہر طرف زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی (طربیہ) موسم بہار! ——— جدھر دیکھو سبزہ ہی سبزہ! نیلا اور شفاف آسمان، پرندوں کا چہچہانا اور .....

حوّا۔ (قطع کلامی کرتے ہوئے) اور سردی میں پھر یہی پرندے زمین پر مردہ نظر آتے ہیں۔ حیوان سردی سے اکٹھے پڑے ہوتے ہیں اور اسی طرح ——— ہمیں بھی مرنا ہوگا!

آدم۔ ہاں ہمیں بھی ایک دن مرنا ہی ہوگا۔ میں نے اس کے بارے میں کئی بار سوچا ہے ——— حوا! ہم مر جائیں گے۔ مگر نسلِ انسانی جاری رہے گی۔ ہمارے بعد قابیل اور ہابیل زندہ رہیں گے۔ ان کی بیویاں ہوں گی اور پھر ان کے بچے پیدا ہوں گے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس لئے موت سے ہم کیوں خائف ہوں!

حوّا۔ تو آپ کو موت کا ڈر ہی نہیں کیا۔

آدم۔ ہرگز نہیں، پیاری حوّا! ——— مجھے یقین ہے کہ پرندے موت سے نہیں ڈرتے۔ جب ان میں سے ایک جدا ہوتا ہے تو وہ محسوس نہیں کرتے۔

(پس منظر میں پرندوں کے نغمات سنائی دیتے ہیں)

ذرا ان کے دلکش نغمات سنو! ——— جب اُن کا مقررہ وقت آتا ہے وہ موت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہوکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

حوا۔ [illegible]

آدم۔ [illegible]

حوا۔ [illegible]

آدم۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

حوا۔ [illegible]

[illegible]

آدم۔ اس کی ضرورت نہیں!

حوا۔ [illegible] آپ محسوس کریں [illegible]

[illegible] ....

آدم۔ [illegible] کرتی ہے۔

حوا۔ [illegible] اگر آپ [illegible]

آدم۔ مگر قدرت .....

حوا۔ ہاں! اس قدرت کے اسباب کو کام میں لا کر زیادہ آرام حاصل کیا جا سکتا ہے!

آدم۔ تم اگر مطمئن نہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے!

حوا۔ کس کا قصور ہے پھر!

آدم۔ یہ الٹی سمجھ ہے تمہاری ورنہ یہاں کیا نہیں ہے! پھل پھول، باغات، چشمے، پرندوں کے نغمات آرام، سکھ —— اس جنت ارضی میں کس چیز کی کمی ہے!

(وہ پھر لیٹ جاتا ہے)

حوا۔ (گویا آپ ہمیشہ کے لئے اس محدود دماغ پر ہی قناعت کر رہے ہیں!

—— اے سبحان اللہ!!

آدم۔ چھوٹا سا ہے مگر صرف اطمینان ہی اطمینان ہے!

حوا۔ کبھی آپ نے اس پہاڑی کی چوٹی سے سمندر کا نظارہ بھی کیا ہے!

(پہاڑی کی طرف اشارہ کرتی ہے)

آدم۔ (آہ بھر کر) ہاں! کئی بار، کتنا دلکش منظر ہے اور ....

حوا۔ درخت کاٹ کر کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ اس کے پار کیا ہے؟

آدم۔ میں سمندر کو پار کیسے کر سکتا ہوں! —— جو بات ناممکن ہو اس کے بارے میں سوچنا وقت کا ضیاع ہے —— ایک بار مجھے بھی خبط سوار ہوا تھا کہ اگر میں بادلوں کے سمندر میں جا کر تیر سکوں تو باغ عدن کا نظارہ کس قدر دلفریب ہو لیکن پروں کے بغیر اڑنا ناممکن تھا اس خیال نے مجھے دیوانہ بنا دیا —— خدا نے میری رہنمائی کی اور میں نے قسم کھائی ہے کہ اب دیوانگی کے خیالات کو کبھی نزدیک نہ آنے دوں گا۔ توبہ توبہ!!

حوا۔ سمندر کے اس پار ممکن ہے کہ باغ عدن سے خوبصورت جگہ ہو۔

آدم۔ ہو لیکن تم کبھی تو نہیں کہ سمندر میں تیر سکیں۔

حوا۔ سمندر پار کرنے کے اور بھی تو ذرائع ہو سکتے ہیں۔ تیرنا ضروری نہیں ہے

(آدم زور زور سے قہقہے لگاتا ہے)

آدم۔ واہ آج تم کیسی ہنسی کی باتیں کر رہی ہو!

حوا۔ کل آپ نے قابیل کو نہیں سنا؟ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر درخت کاٹ کر اسے کھوکھلا کر لیا جائے تو اس میں بیٹھ کر پانی میں تیرا جا سکتا ہے۔

آدم۔ میں نے سنا اس نے ایک کر دیا تھا قابیل ہمیشہ دور ہی کی لاتا ہے!

حوا۔ وہ کشتی بنا رہا ہے تاکہ اس کے ذریعے سمندر کو پار کر سکے۔

آدم۔ ہاں —— اور یہی کشتی نسل سے ڈوبے گی۔

حوا۔ (غصے سے منہ بھینچتی ہے) آپ بھی عجیب ہیں۔ ہر نئی چیز سے آپ کو وحشت ہوتی ہے لیکن میں —— میں زندگی کے اس چکر سے تنگ آ گئی ہوں۔ وہی باغ، سارا دن بیکار پڑے رہو —— وہی ایک منظر اور بس —— میں باغ عدن سے بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ مجھے تو یہ باغ کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

آدم۔ (منہ کر بیٹھو تب ہے) لیکن کیوں؟

حوا۔ میرے اندر سے کوئی چیز مجھے پکار پکار کر کہہ رہی ہے —— حوا! ایک اور بھی دنیا ہے —— نئی دنیا! اس دنیا سے مختلف، جہاں زیادہ آرام ہے —— پتوں کے لباس کی جگہ اور لباس ملے گا —— نئی دنیا —— بالکل نئی!

آدم۔ (مسکراتے ہوئے سمجھا) میری حوا اس سادہ زندگی سے تنگ آ گئی ہے —— ہاں، لیکن خدارا یہ خیالات قابیل کے دماغ میں نہ بھر دینا

عورت کے دماغ میں ان خیالات کا ہونا زیادہ خطرناک نہیں لیکن نوجوان مرد کو تو یہ خیالات دیوانہ بنا دیں گے اور وہ خطرے میں کود پڑے گا۔

حوا۔ قابیل بیر ے لئے خطرے میں کود سکتا ہے۔

آدم۔ یہی تو خطرناک بات ہے۔ عورت ہی مرد کو ہلاکت و تباہی کے گڑھے میں دھکیلتی ہے۔

حوا۔ آپ ہمیشہ بات کا تاریک پہلو لیتے ہیں۔ کیا عورت مرد کو کامیابی کی طرف نہیں لے جا سکتی؟

آدم۔ (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) ہرگز نہیں! ——— خواہ وہ درخت کے تنے میں بیٹھ کر سمندر کیوں نہ پار کر لے۔

حوا۔ (بات کا رخ بدلتے ہوئے) ابھی آپ نے کہا تھا کہ انسان مر سکتا ہے مگر نسل انسانی باقی رہے گی؟

آدم۔ مجھے یہ خیال خواب میں آیا تھا۔

حوا۔ مگر آپ نے یہ بھی سوچا کہ قابیل اور ہابیل باپ کیسے بن سکتے ہیں جب بیویاں نہ ہوں گی؟

آدم۔ (اس غیر متوقع سوال سے حیران ہو کر) کیا کہا تم نے؟

حوا۔ وہی جو آپ نے سنا!

آدم۔ (چکرا کر) کہ وہ بیوی کے بغیر باپ کیسے بن سکتے ہیں!

حوا۔ جی ہاں ——— آدم کا باپ بھی حوا کے بغیر باپ نہ بن سکا!

آدم۔ ہاں ہاں میں نے ——— میں نے کب کہا ہے کہ ——— لیکن ..... خدا کر سکتا ہے۔

حوا۔ لیکن کیا؟

آدم۔ یہی کہ اگر ——— تم نہ ہوتیں تو شاید خدا اپنی قدرت سے کوئی اور اسباب پیدا کر دیتا۔

حوا۔ اور اسباب؟ کیسے؟

آدم۔ آ ——— یہ ذرا سوچنے والی بات ہے! ——— لیکن کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ———!

(سٹیج پر روشنی کم ہو جاتی ہے کیونکہ بادل کا ایک ٹکڑا تیرتا ہوا سورج کے سامنے آ جاتا ہے)

سورج کے سامنے بادل! ——— اب ان بے ہودہ سوالوں کو رہنے دو (سردی سے کانپتے ہوئے) کیسی سردی ہو رہی ہے! (اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلتا ہے تاکہ جسم میں گرمی پیدا ہو)

حوا۔ اگر نسلِ انسانی کو باقی رہنا ہے تو تمہارے بیٹے ضرور سمندر کو عبور کریں گے۔

آدم۔ (غصے سے) عبور کریں گے! ——— مجھے کیا! (حوا کے نزدیک آ کر تاکہ اپنے استدلال پر زور دے سکیں) یہ پرندے کہاں سے آتے ہیں؟

حوا۔ اڑ کر کہیں سے!

آدم۔ مگر مادہ خرگوش! ——— وہ بھی اڑ سکتے ہیں؟ بلی ——— وہ تیر سکتی ہے؟

حوا۔ واہ، یہ کیسی منطق ہے!

آدم۔ یہ جانور آخر آتے کہاں سے ہیں؟

حوا۔ میں کیا جانوں!

آدم۔ ذرا اپنے حضرت سانپ سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا۔

حوا۔ میں کبھی اس سے سوال نہیں کیا کرتی!

آدم۔ جی ہاں، مگر صرف اس کے مزیدار قصے سنا کرتی ہیں آپ! ——— نئی دنیا، جہاں دودھ اور شہد ملتا ہے۔ وہاں ——— خوشی، آرام، لباس، نئے گھر، غرض کیا کیا عجائبات ہیں۔ تم اس دنیا میں پہنچ کر ایک نئی نویلی، سجی سجائی دلہن بن جاؤ گی! (درا تیز ہو کر) بھلا سنجیدہ سوال سے سانپ چکرا نہ جائے گا ——— وہ مکار، جو دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے! حور راحت سادگی میں ہے وہ تصنع اور آرائش میں میسر نہ ہو گی!!

حوا۔ (طنزاً) جیسی آپ کو اور ہابیل کو حاصل ہے۔

آدم۔ بالکل بالکل!!

حوا۔ عورت اس راحت سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔

آدم۔ سمجھا! ——— عورت کے لئے راحت اس میں ہے کہ وہ ساری دنیا کو حاصل کرے۔ مرد بے چارہ خواہ اس کی خواہشات کو پورا کرتے کرتے جان تک گنوا بیٹھے۔ یہ راحت نہیں خود غرضی اور لالچ ہے ——— اور یہی انجام قابیل کا ہو گا!

حوا۔ مجھے قابیل پر فخر ہے!

آدم۔ اس لئے کہ وہ تمہاری موہوم آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے زندگی کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔

حوا۔ اگر یہ خطرہ ہی ہے تو بھی وقت کے اس طرح بے کار ضائع ہونے

سے بہتہ ہے جیسے ہابیل چقماق کے ٹکڑوں سے زمین پر شکلیں
بناکرتا ہے۔ اس کا نام آپ کے نزدیک تصویر ہے۔ وہ جب اس
سے اکتا جاتا ہے تو بعض الفاظ کو کھینچ تان کر ملاتا ہے یہ کیا ہے؟ شعر!
[illegible] او شاعری! ——— گیا باغ عدن ہی میں زندگی کا منہ بہانے
[illegible] او شعر!

آدم۔ ہابیل بڑا ذہین [illegible] ہے

حوا۔ [illegible]
[illegible]

آدم۔ دونوں بچے [illegible]
پیدا کرو گے۔

حوا۔ نہیں قابیل سے میں اب زیادہ پیار کرتی ہوں!

آدم۔ پیارے بھی ایک ہی [illegible]! ——— [illegible] کی تعریف
میں [illegible] قابیل کرتے تمہاری زبان
سوکھ [illegible] کتنا بہادر ———

حوا۔ بہادر بچے کی حوصلہ افزائی ضروری ہے اگر اس کا دل بڑھے تو ہابیل
کو آپ کی ان آسانی نے نکما بنا دیا ہے!

آدم۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ سردی کے دن [illegible] باتوں کے لئے موزوں
ہوتے ہیں۔ اب تو موسم بہار ہے (آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے)
بادلو! ——— ہٹ جاؤ مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے۔
(بادل ہٹ جاتے ہیں اور [illegible] روشنی زیادہ ہو جاتی ہے
آدم کھڑا ہو کر دھوپ [illegible] ہے۔ ہابیل ناچتا ہوا داخل ہوتا
ہے۔ ایک خوبصورت [illegible] اسی دھن میں مست ———
وہ اونچی جگہ پر دوڑ کر چڑھ جاتا ہے اور سمندر کی طرف اشارہ
کرتا ہے)

ہابیل۔ (خوف زدہ لہجے میں) ابّا! ——— ابّا!! ——— وہ دیکھئے ———
دیکھئے قابیل بھیّا پھر کشتی ———

(آدم اور حوا بھی تیزی سے اونچی جگہ کی طرف لپکتے ہیں)

آدم۔ (دونوں ہاتھوں کو منہ کے پاس رکھ کر تاکہ آواز بلند ہو سکے) اے ———
قاااابی ی ی ل!! اے ...

حوا۔ (روکتے ہوئے) چلائیے مت! اس کا دھیان بٹ جائے گا۔!
(وہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ہاتھ ہلاتی ہے)

شاباش، میرے بچے! ——— شاباش ——— بہادر بنو!!

ہابیل۔ امی! اگر کشتی الٹ گئی تو ———؟

(قابیل کشتی میں سوار ہو رہا ہے کشتی لہروں کے تھپیڑوں
سے ڈانواں ڈول ہو رہی ہے۔ سب دم بخود ہیں)

آدم۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے!

حوا۔ قابیل کا دماغ کتنا تیز ہے کتنی پھرتی سے کشتی چلا رہا ہے
(گویا دل سے بے نیاز ہو کر) میرے لال! ——— میرے بچے! تمہاری
ماں آج [illegible] خوش ہے۔ اسے فخر ہے کہ اس کا بیٹا کتنا بہادر ہے!

ہابیل۔ بھیا پھر کنارے کی طرف آرہے ہیں (آدم سے) ابا! آپ ہی انہیں
روکئے شیطان انہیں بہکاتا ہے۔

آدم۔ بیٹے میں اسے کیا روکوں جب خود تمہاری امی اسے کہتی ہے کہ جاؤ
اور کشتی چلاؤ۔

ہابیل۔ امی خود اسے کہتی ہے! مگر اس کا فائدہ؟

حوا۔ بیٹا تم بھی اپنے بھائی کے ساتھ بہادری کے کاموں میں شریک
رہا کرو۔

ہابیل۔ امی مجھے تو [illegible] ہی سے دلچسپی ہے!

حوا۔ (طنز سے) اور زمین پر تصویریں بنانے سے؟

ہابیل۔ امی! میں ایسی چیزیں بناتا ہوں جن سے مجھے راحت ہوتی ہے
میرا دماغ تخیل کے پروں پر اڑتے ہوئے آسمانوں کی سیر کرتا ہے۔
تخیل کی اس پرواز کی روداد میں لکیروں کے ذریعے زمین پر کھینچتا
ہوں۔ میرے خوابوں میں یہی تصویریں مجھے میرے نغمے سناتی ہیں۔
امی! یہ دنیا کتنی پیاری ہے، میں تو یہاں بہت ہی خوش ہوں!

آدم۔ بیٹا! تم غار میں جاکر آرام کرو ——— ہاں تو سنو، تم آج "عورت کی
کم نظری اور زبان درازی" کے متعلق اشعار لکھنا!

حوا۔ (ٹکٹکی باندھے قابیل کو دیکھ رہی ہے) میرا بہادر بچہ! آؤ، میرے لال!!
(قابیل سینہ پھیلائے داخل ہوتا ہے۔ آدم اور ہابیل کو حقارت
سے دیکھتا ہے۔ سانولا رنگ مضبوط بدن اور چہرے سے اکھڑ
پن کی جھلک ظاہر ہوتی ہے)

قابیل۔ (فخریہ) کیوں ماں! میں نہ کہتا تھا؟

حوا۔ (اس کی تائید کرتے ہوئے) ہمتِ مرداں مددِ خدا!

آدم۔ قابیل! بندر کی سی یہ شرارتیں چھوڑ دو۔

قابیل۔ بندر کی سی شرارتیں! — کیوں؟

آدم۔ ان کا انجام خطرناک ہے۔

قابیل۔ ہوتا رہے، مجھے تو اسی میں لطف آتا ہے!

آدم۔ بیٹا، ملعان سنو! — اگر تم شیر کا شکار کرو تو یہ بہادری ہے۔ اس سے ہمیں دشمن سے نجات مل جائے گی مگر یہ اُچک کر درخت پر جا بیٹھنا اور سمندر میں تیرنا خود موت کے منہ میں جانا ہے، فائدہ معلوم!

ہابیل۔ بھیا! ایک دفعہ تو تم ڈوب ہی چلے تھے!

قابیل۔ بھولے بھگت، وہ تو میں نے جان کر کیا تھا کہ تمہیں اپنی پختہ کاری کا ثبوت دوں۔

حوّا۔ قابیل! بیٹا اب پھر کب کشتی چلاؤ گے؟

قابیل۔ (فخریہ لہجے میں) امیّ! — کل سمندر کے اُس پار جاؤں گا اور سامنے جو جزیرہ سا معلوم ہوتا ہے اس کا پتہ لاؤں گا۔

ہابیل۔ اگر تمہیں راستہ بھول گیا تو واپس کیسے آؤ گے؟

قابیل۔ میں اُسی جزیرے میں رک جاؤں گا جب تک کہ راستہ نہ ڈھونڈھ نکالوں (طنز سے) اور اس وقت تک میرا بھائی ہابیل دوسری کشتی تیار کرے گا اور مجھے لینے آئے گا!

ہابیل۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں! بھلا کون احمق اس باغ کو چھوڑ کر ایک موہوم امید پر سمندر کے تھپیڑوں سے لڑتا پھرے؟

حوّا۔ قابیل! کل تم دونوں بھائی جاؤ۔

قابیل۔ معاف کیجئے! میں اکیلا ہی جاؤں گا۔

حوّا۔ کیوں! بیٹا!

قابیل۔ ابا جان! کشتی کا خیال مجھے آیا، میں نے اُسے بنایا۔ اب کامیابی کا فخر بھی میں ہی حاصل کروں گا۔

آدم۔ بیٹا، ماں کی طرح ہو تم بھی بڑے منکسر المزاج (چلتے ہوئے) اوہ! اس بحث نے تو مجھے تھکا دیا ہے۔ اب مجھے جا کر سونا ہے! (دائیں طرف جاتے ہوئے) ایک گہری نیند اور دل خوش کن خواب!

(جاتے ہیں۔ ہابیل ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھتا ہے اور پتھر نکال کر زمین پر لکیریں کھینچنے میں مصروف ہو جاتا ہے)

قابیل۔ (سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے گویا خواب دیکھ رہا ہے) کل میں اس جزیرے میں جاؤں گا۔ کل — !

حوّا۔ (ہابیل سے) بیٹا! کیا تم بھی بھائی کے ساتھ جاؤ گے؟

ہابیل۔ ماں، مجھے اور بہت سے کام ہیں!

قابیل۔ کام ہیں! تم تو نرے بُدھو ہو، بُدھو! بزدل!!

ہابیل۔ بھیا یہ بات نہیں، مگر.....

قابیل۔ (بات قطع کرتے ہوئے) تمہیں ڈر ہے کہ سمندر میں کہیں طوفان نہ آ جائے اور کشتی کو بہا لے جائے، کیوں!

ہابیل۔ یہ نہیں! تم آخر کس لئے سفر کرنا چاہتے ہو؟ اس لئے کہ تم اور اور چیزوں کو حاصل کر سکو؟ — باغِ عدن میں کس چیز کی کمی ہے؟ لالچ تمہیں لئے جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔

قابیل۔ (طنز سے) ابا جان کی طرح تم بھی کتنے سادہ اور مطمئن ہو اور — مجھے اس سے نفرت ہے (فخریہ لہجے میں) میں جا رہا ہوں، سمندر کے پار، نئی دنیا کو ڈھونڈنے کے لئے! میں نئی دنیا کا مالک بنوں گا — وہاں کے باغات اور خزانے سب میرے ہوں گے اور میں اُن کا مالک اور بادشاہ!

حوّا۔ اور بیٹا تمہاری ماں ایک ملکہ ماں بن کر ان باغات میں داخل ہوگی!

قابیل۔ ہاں ہاں! میری مملکت میں!

حوّا۔ میرا شاہانہ خیر مقدم ہوگا — ایسی خوش نصیب ماں کب بوڑھی ہو سکے گی (قابیل کی پیشانی کا بوسہ لیتی ہے) شب بخیر میرے بیٹے! صبح جب تم نئی دنیا کی تلاش میں جانے لگو تو مجھے مل لینا — اچھا شب بخیر!

(ہابیل بیٹے کی نگاہیں ماں پر نہیں۔ یہ پڑتی ہیں۔ وہ دائیں طرف سے باہر چلی جاتی ہے۔ قابیل اپنے بھائی ہابیل کی طرف رحم کی نگاہوں سے تک رہا ہے۔ ہابیل زمین پر شکلیں بنانے میں مصروف ہے)

ہابیل۔ (اچانک نگاہ اٹھا کر) قابیل بھیا!

قابیل۔ کیا ہے؟

ہابیل۔ بھیا! کل رات میں نے ایک خواب دیکھا۔

قابیل۔ خواب دیکھنے کے سوا تمہیں اور کام ہی کیا ہے؟

ہابیل۔ عجیب و غریب خواب تھا وہ!

(ہابیل کا لب و لہجہ موثر ہے قابیل اس کے نزدیک جا کھڑا ہوتا ہے)

کل میں نے پتھر کا ایک ٹکڑا لے کر اسے گول سا تراش لیا سا جلتا ہیں ایسا ہی کرتا رہا اور اسی خیال میں سو بھی گیا۔

نئی دنیا بنا ڈالے گا!

ہابیل۔ حضرت! اس کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے [illegible] سے کیا ملے گا [illegible] اور [illegible] آپ [illegible]

ہابیل۔ [illegible] آپ کو مبارک!

قابیل۔ [illegible] سمندر کا [illegible] کچھ [illegible]

[illegible]

ہابیل۔ خواب — [illegible] میں دیکھ کر اٹھا! آسمان سے [illegible] اس نے [illegible] ہاتھ میں [illegible] اور [illegible] نے [illegible] بہت [illegible] ہابیل کے سامنے [illegible] آدم [illegible]

قابیل۔ چکّر! — عجیب سا نام ہے!!

ہابیل۔ ہاں بیٹا! اسے کیا کہتا چکّر — پھر اس نے اس چکّر کو گھاس پر لڑھکا دیا اور وہ دور تک چلا گیا [illegible] مجھ سے کہا آسمان کی طرف دیکھ! — میں نے عجیب تماشا دیکھا بڑے بڑے چکّر میں گھوم رہے ہیں۔ آسمان پر پرندوں کی طرح لکڑی کے جانور اڑ رہے تھے۔ ان پر عجیب سی مخلوق بالکل ہماری طرح بیٹھی تھی — بڑی مگن [illegible] — پھر میں نے سمندر کی طرف دیکھا عجیب عجیب کشتیاں [illegible] ہمارے باغ سے بھی بڑی بڑی، چکّروں کے ذریعے تیر رہی تھیں — [illegible] تیز — بجلی کی طرح ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں — اور تیز تیز چلتے ہوئے بڑے بڑے مکانات میں چکّر کے ذریعے زمین کی تہہ سے خزانے نکالے جا رہے تھے! — مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہر طرف چکّر ہی چکّر ہیں اور میں خود ایک چکّر کے ساتھ گھوم رہا ہوں!

قابیل۔ (جوش سے) آہا!

ہابیل۔ بیٹا! پھر خدا نے مجھ سے کہا ابنِ آدم! تُو نے چکّر بنا لیا۔ مگر یہ دودھاری تلوار کا کام دے گا۔ نیک بندے اس سے مفید کام لیں گے لیکن برے لوگ — اُن کا لالچ دنیا کو تباہ کر دے گا! پھر خداوند تعالیٰ نے اس پر کچھ لکھا!

قابیل۔ کیا لکھا!

ہابیل۔ (رازدارانہ لہجے میں) ہم دو معبودوں کی عبادت نہیں کرسکتے — یزداں اور اہرمن کی!

قابیل۔ یزداں اور اہرمن! — یزداں کون!

ہابیل۔ خود خدا۔

قابیل۔ اور اہرمن!

ہابیل۔ اہرمن — لالچ اور خود غرضی!

قابیل۔ تم — تم اب اس چکّر کو کیا کرو گے!

ہابیل۔ توڑ دوں گا —

قابیل۔ مجھے دے دو ہابیل!

ہابیل۔ یہ نہ ہوگا

قابیل۔ کیوں!

ہابیل۔ مجھے کسی پر اعتبار نہیں — اور پھر آپ بڑے خطرناک ارادے رکھتے ہیں۔ یہ میں آپ کو نہیں دوں گا!

قابیل۔ ہابیل! — مجھے دے دو!!

ہابیل۔ نہیں! صرف دکھا سکتا ہوں۔

قابیل۔ دکھا ہی دو۔

(ہابیل اس طرف بڑھتا ہے جہاں چکّر ابھرا ہوا ہے!)

قابیل۔ چکّر! — عجیب سا نام ہے چکّر!!

(ہابیل جھونپڑے سے چکّر لئے داخل ہوتا ہے۔ قابیل بے تابی سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ ہابیل چکّر اسے دے دیتا ہے۔ وہ اسے بڑے انہماک سے پہلی بار گھماتا ہے،

خدا نے اسے گھاس پر کیسے گھمایا تھا!

(ہابیل چکّر کو ایک بار گھماتا ہے۔ قابیل دوزانو ہو جاتا ہے۔ ہابیل چکّر گھاس پر چلاتا ہے۔ قابیل انہماک سے دیکھتا ہے۔ تھوڑی دور جاکر چکّر رکتا ہے اور ایک طرف گر جاتا ہے۔ قابیل حیرت زدہ ہو کر [illegible])

قابیل۔ (گویا خواب دیکھ رہا ہے) بڑی بڑی چیزیں زمین پر چکّر کے ذریعے دوڑ رہی ہیں — بجلی کی طرح تیز! سمندر میں بڑی بڑی کشتیاں تیر رہی ہیں — ہمارے باغ سے بھی بڑی! — ہوا میں کل کے پرندے اُڑ رہے ہیں — چکّر کے سہارے — زمین کی چھاتی چیر کر خزانے نکالے جا رہے ہیں — چکّر کی مدد سے!

۔۔۔ چکر!! ۔۔۔ فضائیں ہر طرف چکر کھوم رہے ہیں ۔۔۔ ہر طرف!!

(وقفہ ۔۔۔ قابیل چکر کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ ہابیل قابیل کو تک رہا ہے۔ اچانک قابیل بڑھ کر چکر کو زمین سے اٹھا لیتا ہے ہابیل بھی بڑھتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں)

ہابیل۔ بھیا! میرا چکر مجھے دے دو

قابیل۔ یہ چکر! ۔۔۔ اس کا مالک عقلمند ہو سکتا ہے نہ کہ بے وقوف!

ہابیل۔ اسے میں نے بنایا ہے! ۔۔۔ یہ میری سوچ بچار کا نتیجہ ہے بھیا!

قابیل۔ خدا نے تمہیں ضرور کہا ہوگا کہ یہ قابیل کو دے دو۔

ہابیل۔ خدا نے مجھے اس سے روکا تھا! تم دنیا میں ۔۔

قابیل۔ چکر میرا ہے!

ہابیل۔ ضد نہ کرو بھیا! یہ خدا کی امانت ہے۔ تم اس کے ذریعے سے فساد پیدا کرو گے۔ مجھے دے دو ابھی ابھی! ۔۔۔ تو سے رہا ہوں۔

قابیل۔ (سختی سے) یہ میرا ہے۔ تم نے مجھے اس کے متعلق باتیں کرتے سن لیا ہوگا اور میرے تخیل کو چرا لیا ہوگا۔

ہابیل۔ جھوٹ بولنے سے فائدہ؟ (سختی سے) مجھے واپس کر دو یہ چکر۔

قابیل۔ بد عب کسی اور پر جمانا! چلو ۔۔۔ بھاگو یہاں سے۔

(ہابیل بڑھتا ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ ہابیل دوبارہ بڑھ آتا ہے اور آخری بار کوشش کرتے ہوئے چکر چھینتا ہے قابیل پوری قوت سے پتھر کا چکر اس کے ماتھے پر دے مارتا ہے ہابیل ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا گر پڑتا اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ قابیل حیرت زدہ ہو کر ہابیل کے مردہ جسم کو غور سے دیکھتا ہے اور پھر اس کی لاش پر جھکتا ہے)

یہ تو مر گیا! ۔۔۔ سردیوں میں پرندے بھی یوں ہی شاخوں سے گر پڑتے ہیں۔!!

(کبھی چکر کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی لاش کی طرف۔ اس کی نگاہیں چکر پر گڑ جاتی ہیں)

(زیر لب) کل ۔۔۔ کل صبح مجھے ۔۔۔

(وہ سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بلندی کی طرف بڑھتا ہے اور وہاں کھڑے ہو کر دور جزیرے کو دیکھتا ہے۔ آسمان رفتہ رفتہ سرخ ہوتا جاتا ہے اور وہ سرخی میں ایک ہیولا دھندلا سا معلوم ہونے لگتا ہے)

(ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) کل مجھے وہاں جانا ہوگا ۔۔۔!

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دوسرا سین

مقام۔ باغ عدن

وقت۔ دوسرے دن صبح۔

منظر۔ وہی ۔۔۔ سٹیج بالکل خالی ہے۔ ہابیل کی لاش اسی حالت میں پڑی ہے جیسے کل شام تھی۔ پس منظر میں پرندوں کے چہچہے سنائی دے رہے ہیں۔ قابیل بائیں طرف سے تیزی اور بے باکی سے داخل ہوتا ہے۔ وہ بلندی کی طرف بڑھتا ہے اور سمندر کو دیکھتا ہے اس وقت وہ بہت پر جوش نظر آ رہا ہے۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ لاش کی طرف جاتا ہے اور اس کے قریب دو زانو ہو جاتا ہے)

قابیل۔ (دبی ہوئی آواز میں) ہابیل! ۔۔۔ ہابیل تم سو رہے ہو؟

(وہ لاش کو ہلاتا ہے۔ لاش ہلنے کے بعد بے حس ہو جاتی ہے)

بے وقوف! تم مجھ سے چکر چھیننا چاہتے تھے میں تم سے طاقتور تھا ۔۔۔ اور دنیا میں طاقت ہی ہمیشہ فتح پاتی ہے (اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے) زندگی میں تم میرے کبھی دوست نہ بن سکے تم بالکل اماں کی طرح تھے۔ وہ مجھے ہمیشہ اماں سے نفرت رہی ۔۔۔ تم ہمیشہ خواب دیکھا کئے اور میں حقیقت! ۔۔۔ لیکن یہ چکر تم نے کیسے بنایا ۔۔۔ ؟ حیرت ہے!

(کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ وہ لاش کو کھینچ کر ایک درخت کے پیچھے کر دیتا ہے اور خود بھی کی طرف بڑھتا ہے۔ حوا داخل ہوتی)

حوا۔ بیٹا! تم ابھی تک یہیں ہو؟ میں سمجھی تم جا چکے ہو گے (ہابیل کو دیکھ کر) ہابیل ابھی تک سو رہا ہے؟

قابیل۔ (واپس آتے ہوئے) جی ہاں!

حوا۔ یہ لڑکا بھی عجیب ہے۔ بہت دیر تک سوتا ہے اور تمہارے ابا جان تو ابھی تک سو رہے ہیں۔

قابیل۔ سو رہے ہیں!

حوا۔ ہاں بیٹا۔

قابیل۔ اماں جب میں اس جزیرے میں آپ کے لیے نیا مکان بنا لوں گا تو
پھر آپ وہیں [illegible] کر سونے دیں!

حوا۔ [illegible] مجھے کسی بات کی تکلیف [illegible]
[illegible] دیکھ کیا رہا ہے بیٹا!
[illegible]

قابیل۔ [illegible]

حوا۔ چکر!

قابیل۔ ہاں [illegible] بیٹھ کر بنایا ہے [illegible]

حوا۔ [illegible]

قابیل۔ مجھے [illegible] دیکھو [illegible]
چکر [illegible] تھوڑی دور جا کر وہ ایک [illegible]
[illegible] ہاں [illegible]
کی کچھ بناؤں گا [illegible] اس چکر
کے اوپر [illegible] دو بیل جوتوں گا —
[illegible] تمام دنیا میں [illegible]
[illegible] ایک دن آئے گا کہ ہوا میں عجیب
جزیرے کل کے پرندے — [illegible] کھٹولے اڑیں گے — سمندر
میں اس لکڑی کی کشتی کی بجائے — بڑے بڑے — جزیرے
تیریں گے اور [illegible] جانتی ہو کیسے؟ — اسی چکر کے ذریعے سے!

(حوا حیرت زدہ ہو کر قابیل کا منہ تک رہی ہے)

حوا۔ بیٹا! یہ سب کچھ کس لئے ہوگا؟

قابیل۔ میں دنیا کا بادشاہ بنوں گا اور یہ سب کچھ میرے آرام و آسائش کے
لئے ہوگا۔

حوا۔ تم نے یہ سب کچھ کیسے جان لیا؟

قابیل۔ خدا مجھے خواب میں آیا تھا ماں! — اُس نے کہا "ابن آدم! میں
نے تجھے چن لیا"

حوا۔ خدا — خواب میں آیا؟

قابیل۔ ہاں اماں۔ اس نے کہا ابن آدم! — میرے منتخب! — جا ایک نئی
دنیا کو ڈھونڈھ نکال یہ چکر تجھے مدد دے گا اور تو فاتح ہوگا —
پھر اماں۔ اس نے مجھے باغِ عدن چھوڑنے کا حکم دیا ... دنیا بڑی
وسیع ہے! اور خزانوں سے مالا مال۔ میں جا کر اُن کو حاصل
کروں گا — اس خشک اور بے کیف زندگی سے تو میں اکتا
گیا ہوں — آرام او آسائش مجھے پکار پکار کر بلا رہے ہیں —
ہاں میں جاؤں گا!

حوا۔ (قابیل کو دیکھتی ہے اور خوشی محسوس کرتی ہے۔ پھر ہابیل پر مایوسانہ نگاہ
ڈالتی ہے) ہابیل — میرے پیارے بچے! تم اپنا سارا وقت
سونے میں ضائع کرتے ہو اور تمہارا ہی بھائی حیرت انگیز کام کر رہا
ہے — کاش تم بھی ایسے ہی ہوتے!

(وہ بڑھ کر ہابیل کو جگانا چاہتی ہے لیکن قابیل اُسے روک
لیتا ہے)

قابیل۔ اماں اسے سونے دیجئے — شاید میرے اس طرح چلے جانے
سے اس کو سمجھ آ جائے اور وہ بھی کچھ کام کرنے لگے۔

حوا۔ اچھا بیٹا!

(آدم داخل ہوتا ہے)

آدم۔ تم آج ہی جانے والے ہو؟

قابیل۔ جی ہاں!

آدم۔ بادل اور ہوا تیز ہو رہے ہیں۔

قابیل۔ میں ہواؤں سے نہیں ڈرتا۔

آدم۔ شاید ہوا تم سے ڈرتی ہو،

حوا۔ سنتے ہو۔ رات خدا نے قابیل کو جلوہ دکھایا!

آدم۔ خدا نے؟

حوا۔ جی ہاں!

آدم۔ کیوں؟

قابیل۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میں دنیا پر حکومت کروں گا — اُس نے
مجھے منتخب کر لیا!

حوا۔ اس چکر کے ذریعے سے۔

(حوا آدم کو چکر دکھاتی ہے)

آدم۔ (اچانک ڈر جاتے ہیں) اسے مجھ سے دور رکھو! — دُور اب
توڑ دو اسے!! — فوراً توڑ دو اسے! اس پر کیا لکھا ہے جانتی
ہو؟ — موت!! تباہی!! جنگ!! خون!! فساد اور —
دوزخ!!!

قابیل۔ (طنزاً) ابا جان آپ خدا سے زیادہ جانتے ہیں گویا؟

آدم۔ بے ہودہ نہ بکو! اسے فوراً توڑ دو ــــ توڑ دو۔ ــــ یہ دنیا میں فساد پیدا کرے گا ــــ فساد خون، جنگ، آگ، اور بربادی ــــ اسے فوراً توڑ دو!!

(آدم اسے چھیننا چاہتا ہے۔ قابیل آدم کو بھی ضرب لگانے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے)

حوّا۔ قابیل!

قابیل۔ (ہاتھ روک لیتا ہے) اُف، یہ میرا باپ ہے!

(آدم خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

حوّا۔ (آدم سے) آپ کیوں خواہ مخواہ قابیل کے منہ آتے ہیں ــــ آخر نادان لڑکا ہے۔

آدم۔ (زیرِ لب) خدا اسے منتخب نہیں کر سکتا!

حوّا۔ کیوں نہیں؟ ــــ یہ دلیر اور شجاع ہے! ــــ ہابیل کو چین لیتا جواب تک محوِ خواب ہے!

آدم۔ محوِ خواب ہے مگر کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا ــــ لیکن جاگنے والا تو خود اپنی تباہی کو مول لینے جا رہا ہے!

حوّا۔ (قابیل سے) خدا حافظ بیٹا! ــــ خدا تمہیں جلد کامیاب واپس لائے!

قابیل۔ خدا حافظ امّاں ــــ اگر خدا نے چاہا تو جلد کامیاب آؤں گا!

(دونوں آدم کی طرف دیکھتے ہیں)

آدم اچھا ــــ اچھا بیٹا جاؤ! ــــ صبح کی سہانی ہوا اور پُرسکون فضا تمہاری محافظ ہو۔ چاند کی چاندنی تمہاری مشعلِ راہ بنے ــــ شام کا سہانا سماں تمہارے لئے امن و امان کا پیام لائے اور رات کی آرام دہ گھڑیاں تمہیں اپنی گود میں سلایا کریں ــــ بیٹا! باپ کی دعائیں تیرے شاملِ حال ہوں ــــ جاؤ! خدا کے حوالے!!

حوّا۔ خدا حافظ!

قابیل۔ خدا حافظ!!

(قابیل حوّا کی طرف ایک لمحے کے لئے دیکھتا ہے اور پھر ہابیل کی طرف اس کی نگاہیں خود بخود اٹھتی ہیں۔ وہ سمندر کی طرف دوڑ جاتا ہے۔ آدم کو اس کے جانے کا افسوس ہے۔ حوّا بلندی پر جا کر اسے ہاتھ سے خدا حافظ کہہ رہی ہے)

حوّا۔ (چلّا کر) خدا حافظ بیٹا ــــ خدا حافظ!

قابیل۔ (دور سے آواز آتی ہے) ــــ خدا حافظ امّی! (حوّا وہیں کھڑی رہتی ہے)

حوّا۔ قابیل ہرن سے زیادہ پھرتیلا ہے! اس کا بدن کتنا سڈول ہے ــــ اس کا دل ــــ اس کا دل شیر سے زیادہ دلیر ہوگا ــــ دلیر بیٹے کی ماں کتنی خوش نصیب ہوتی ہے۔ قابیل! میرے لال! (وہ پھر ہاتھ ہلاتی ہے اور قابیل کو اشاروں سے خدا حافظ کہتی ہے) وہ جا رہا ہے۔ صرف میرے لئے ــــ میرے آرام و آسائش کے لئے، ایک نئی دنیا کو ڈھونڈنے ــــ مجھے فخر ہے کہ میرا بیٹا کس قدر سعادت مند ہے کس قدر فرمانبردار! ! میرا دل آج خوشی سے لبریز ہے!!

(آدم حیرت زدہ ہو کر ہابیل کی لاش کو دیکھ رہا ہے)

آدم۔ ہابیل! ہابیل جاگو! دیکھو تمہارا بھائی چلا گیا (جواب نہ پا کر حوّا کو بھی تشویش ہوتی ہے) ہابیل!

(آدم ہابیل کی لاش کی طرف بڑھتا ہے۔ حوّا حیرانی سے دونوں کو تک رہی ہے)

بیٹا! دن چڑھے تک سونا بری بات ہے! اٹھو ہابیل، جاگو!! (حوّا بھی خود بخود دو قدم آگے بڑھ آتی ہے) دیکھو تو اس کا چہرہ کیسا سفید ہو رہا ہے! (حوّا قریب آ جاتی ہے۔ آدم لاش پر جھکتا ہے اور اُسے ہلانے سے آہستہ آہستہ ہلاتا ہے) بیٹا! ــــ جاگو!! (اس کے ماتھے کو چھوتا ہے) (حوّا سے) کتنا سرد ہے یہ!

حوّا۔ (ہراساں ہو کر) ہابیل، اب تو اٹھو ــــ!

آدم۔ دیکھو اس کے سر سے خون بہا ہے۔ خون! (زخم کو دیکھتا ہے۔) ہابیل! ــــ ہابیل!!

حوّا۔ اس کے چہرے پر خون کا نام نہیں رہا ــــ!

آدم۔ (تحمل سے) ہابیل مر چکا ہے!!!

(آدم کانپ جاتا ہے گویا موت کے خیال سے خوفزدہ ہے۔ حوّا جھک کر لاش کو دیکھتی ہے)

حوّا بیٹا! تم امّاں سے بھی نہ بولو گے ــــ تمہاری ماں سلامت! (بھرا جاتی ہے وہ بے اختیارانہ لاش پر گر جاتی ہے اور آہ و زاری شروع کر دیتی ہے۔ آدم بلندی کی طرف جاتا ہے) ١

آدم۔ (دور کسی چیز کو دیکھتے ہوئے) وہ بھی گیا ــــ اس کی کشتی سمندر کی لہروں میں غائب ہو چکی ہے۔ وہ بھی اب اپنے بھائی کو نہ دیکھ سکے گا!!

وہ گردن موڑ کر اور ہابیل کو دیکھتا ہے اور پھر یکا یک قابیل کو

دیکھتے چلا کر کہتا ہے،

بھیا ... کیسے ہو گیا تھا ... قابیل تم نے جھوٹ

بولا ... تم نے قتل کیا ہابیل کو ... تم ہوا کر سکتے ہو!! جاؤ، جاؤ،

یوں چلا جا، ... ہی کا بات بیٹے گا ... اور جس چیز کی تلاش جب

تم جاتے ہو وہی تمہارے ... سامنے ... ہاں ... ہو گی ... یہ جگہ بہت سے

لئے ایک امانت ثابت ہو گا اور وہ نکل جاتا ہے اور آہستہ آہستہ

ان کو ... بچے ... ہابیل! ... بہت ... تھے!!

... دنیا میں ... کی سب سے پہلی مصیبت!!!

(پردہ گرتا ہے)

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(ڈراما ختم)

شبیر محمد اختر

رباعی

مدت سے مئے عشق پی رہا ہوں میں
اس آگ کے ساغر سے جی رہا ہوں میں
پھاڑے ہیں جنوں میں جیب و دامن اپنے
تنہائی میں بیٹھا انہیں سی رہا ہوں میں

ہما ہرنالوی

ادھورے لباسوں کا نغمہ

یہ نور چمکتا ہے نظروں کے سامنے، اور کھو جاتا ہے۔
اے کاش بنے مجھے کرنوں کے پکڑنے کی قوت حاصل ہوتی
خوشبوئیں لہروں میں بہہ کر آتی ہیں اور چھپ جاتی ہیں،
اک نغمہ سنائی دیتا ہے، خاموشی میں سو جاتا ہے۔
یہ نغمہ اور خوشبوئیں بھی تو میری نظر میں کرنیں ہیں۔
(میرے احساس کے جھرمٹ میں اک بےبس الجھن پیدا ہے)

(یہ کرنیں دھندلی دھندلی ہیں،
یا میری نگاہوں پر ہلکا سا ایک دھندلکا چھایا ہے
بے آس جوانی کی مرجھائی، پھیکی، سوکھی تمنا کا؟)
یہ کرنیں دھندلی دھندلی ہیں،
جیسے ہوں میلے پیراہن،
(میلے، لیکن بدزیب نہیں)
اور یہ دھندلی کرنیں۔
چھپکے، گھونگٹ کی اوٹ لئے،
میری پوجا کو ٹھکرائے،
راتوں کی گہری خاموشی میں غیر کے در پر جاتی ہیں۔
اُس کے لہو کو سیمیں کرکے،
اپنا دامن دودھ سے بھر کے،
میری نگاہوں سے اوجھل اپنے گھر کو لوٹ آتی ہیں۔

میں ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوں، اور اپنے سر کو جھکاتا ہوں،
کچھ سوچ کے طیش میں اُٹھتا ہوں اور پھر رُک کر رہ جاتا ہوں'
یوں دو مردوں کی قسمت میں تفریق نہیں منظور مجھے،
اک جسم کی خلوت کو دیکھے اور اک سادہ پیراہن کو!

اک پیراہن خوشبو والا لہراتا ہے، بل کھاتا ہے،
اور میرے تاریکی میں کھوئے چہرے کو سہلاتا ہے،
اور دل میں جوالا پھوٹتی ہے، یہ دھیان مجھے آجاتا ہے

یہ دنیا تو ہے کشمکشوں کی، لغزش کی، ناکامی کی،
گمراہی اور بے راہ روی نے اپنا جال بچھایا ہے،
آج اُگل دے جو بھی تیرے دُکھیا دل میں سمایا ہے،
پریت کو چھوڑ کے ریت بنا لے اب سے مے آشامی کی،
ایسے کھیلوں ہی میں چین ملے گا تیری ہستی کو،
تو بولے گا اب تو دن بھی میرا ہے اور رات مری۔
دل کی اُلجھن مدھ میں ڈبو دے حاصل کر لے مستی کو،
یوں ہی دکھوں سے مُکتی ہوگی، سوچ سمجھ لے بات مری۔
سنتا ہوں میں شہر کے ایک محلّے میں
نفس کی پوجا کرنے والی اک آوارہ عورت ہے،
اور سستا ہے اُس کا کرایہ، ہاں، سستے ہیں اُس کے دام۔

میراجی

شامِ رخصت

وہ دمِ رخصت تری کافر جوانی، ہائے ہائے! اور اک مجبور دل کی خوں فشانی ہائے ہائے!
عارضِ گلگوں پہ تیرے وہ بہارِ جاوداں اس پہ چشمِ تر کی وہ شبنم فشانی ہائے ہائے!
وہ ترے معصوم رخ سے دعوتِ جوشِ جنوں وہ سکوت آمیز لب کی گل فشانی ہائے ہائے!
دوش پہ بکھرے ہوئے وہ عنبریں گیسو ترے اور وہ تیرے تنفس کی روانی ہائے ہائے!
وہ تری رفتار میں اک ارتعاشِ حشر خیز وہ ترے اعضا میں اک درد و گرانی ہائے ہائے!

کیوں یکایک شام کو تو دے کے پیغامِ فراق
لے گئی میرا سکونِ زندگانی؟ ہائے ہائے!

کون ہوگا جلوہ آرا اب شبِ مہتاب میں! وہ بہاریں حیف! وہ راتیں سہانی! ہائے ہائے!
کون بن کر آئے گا محفل میں جانِ زندگی؟ کون لائے گا نویدِ کامرانی؟ ہائے ہائے!
کس کی نظریں مجھ کو دیں گی دعوتِ کیفِ نظر کون ہوگا وجہِ تسکینِ جوانی ہائے ہائے!
کون دے گا داد میرے آتشیں جذبات کی اور کرے گا التجائے شعر خوانی ہائے ہائے!
یاد ہے تیری محبت کا وہ لطفِ بے پناہ اور اک آشفتہ سر پر مہربانی ہائے ہائے!
وہ نسیمِ صبح کی مانند گلگشتِ چمن! وہ جوابِ خندہ ہائے بوستانی ہائے ہائے!
وہ ترے رنگیں تکلم کی حیات افروزیاں وہ تبسم کی بہارِ جاودانی ہائے ہائے!
وہ گلاب افشاں جبیں پر رونقِ ماہِ تمام! وہ نگاہوں میں شرابِ ارغوانی ہائے ہائے!
وہ ترے نغماتِ تسکینِ سماعت، حیف حیف! وہ مری دیرینہ آشفتہ بیانی ہائے ہائے!
وہ محبت، وہ عنایت، وہ فراغت حسرتا! وہ جوانی، کامرانی، شادمانی ہائے ہائے!
یہ دلِ خوں گشتہ، ہاں یہ مرقدِ ارمان و شوق! رہ گئی عہدِ محبت کی نشانی ہائے ہائے!
کھائے جاتا ہے ابھی تک منظرِ "شامِ فراق" ہے وہی خونابۂ دل کی روانی ہائے ہائے!

وہ جواں ساغر، کہ تھا رامشگرِ سازِ وفا!
اب رگِ جاں پر ہے محوِ نوحہ خوانی ہائے ہائے!

ساغر جلیلی

خیالی پلاؤ

آپ نے کبھی نہ کبھی اگر کسی سے نہیں تو اپنے دل میں تو ضرور کہا ہوگا "میں خیالات سے عاجز آچکا ہوں" مجھے آپ سے ہمدردی ہے کیونکہ خیالات کی عادات واقعی باعث پریشانی بن سکتی ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہیں نوعِ انسانی کو ستانے میں اگر راحتِ قلبی نہیں ملتی تو کم از کم لطف تو ضرور آتا ہوگا بعینہ اسی طور پر جیسے کسی شریر لڑکے کو اس اجنبی لڑکے کی چند یا پر تھپڑ مار کر بھاگ جانے میں آتا ہے جو بچارہ واقف کار اُس کے محلے میں سے گذر رہا ہو۔ اول الذکر صاحبزادے کی تو تفریح ہو گئی اور موخر الذکر حضرت کو غائب پا کر اپنے غم و غصے کا زمین پر ایک شدید ٹھوکر سے صرف ناکس اظہار کرکے آگے بڑھے لیکن ایک خیال زدہ انسان اپنے جذبات کا کیسے اظہار کرے!

ایک صاحب کے دماغ میں کوئی افسانہ عرصے سے چکر لگا رہا ہے۔ مگر چونکہ افسانے میں بہت سی اُلجھنیں اور پیچیدگیاں تھیں، صاحبِ دماغ نے اس کو موقرطاس پر منتقل کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اس کام کو ملتوی کرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ایک دن انہیں یکایک روشنی دکھائی دی۔ انہیں قطعی یقین ہو گیا کہ افسانے کی تمام مشکلات حل ہو گئیں اور اس کی کڑیاں مل گئیں۔ اس وقت ان کی خوشی کا صحیح اندازہ لگانا بہت دشوار تھا۔ وہ سمجھے کہ میدان مار لیا۔ بھاگے بھاگے گئے اور کاغذ قلم دوات لے بیٹھے افسانے کی بنیاد رکھی گئی۔ افسانے کی ابتدا نہایت موزوں اور دلکش عبارت سے کی گئی۔

> کالی کلوٹی اور زمانے کی نظروں میں — پرلے درجے کی بے باک
> لڑکی مالا کے بھی دل تھا جو سہ ہ بار رات کے اس پہر میں جب دنیا غافل
> سوتی ہے اس کو ایک ناقابلِ بیان تڑپ سے بے تاب کر دیتا تھا۔
> وہ ٹھوکر یہ چلتی۔ اور جب اُسے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی
> اور اپنے لئے روشنی کی کرن بھی نظر نہ آتی تو اس کے گرم گرم گالوں پر
> آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلتیں ....

سطروں کی تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ پورے تین صفحے ختم ہو گئے افسانہ نگار نے دم لینے کے لئے لمحہ بھر کو قلم ایک طرف رکھ دیا۔ ایک جماہی لی اور پھر قلم اٹھایا — اور بس! ایک حرف نہ لکھ سکے! حضرتِ خیال نہیں اس لمحے میں ہی جب انہوں نے قلم کو چھوڑا تھا چکمہ دے گئے تھے۔ اب افسانہ نگار صاحب ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر خیالات کو واپس بلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اول تو سب قسم کے خیالات نے ایسی مکمل ہڑتال کی ہے کہ اُن کے قریب تک نہیں پھٹکتے اور اگر اُن میں سے چند آ بھی جاتے ہیں تو وہ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ افسانہ نگار صاحب اُن کو پکڑنے کی قطعی کوشش نہ فرمائیں گے کیونکہ وہ اُن کے افسانے کے لئے بے کار ہیں۔ اسی لئے وہ بھی بے کھٹکے ان کے دماغ میں پریڈ کرتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگار حضرت آنکھیں بند کر لیتے ہیں اس امید پر کہ شاید نہیں سوتا سمجھ کر وہ غیر ضروری پتلے اپنا ناچ بند کر دیں گے۔ مگر یہ پتلے بھی بلا کے ذہین ہیں اس چال میں نہیں آتے اور بدستور اپنا شغل جاری رکھتے ہیں مجبوراً افسانہ نگار کو اپنی آنکھیں کھولنا پڑتی ہیں۔ ایک دفعہ اور اپنے سامنے لکھی ہوئی عبارت کے آخری فقرے کو پڑھا جاتا ہے۔ شاید خیالات کا تانتا پھر بندھ جائے! مگر خیالات اگر ستم ظریف نہیں تو کچھ بھی نہیں! وہ رکھ کر بچارے افسانہ نگار کی زبوں حالی پر مسکراتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی زیادہ دلیر ہوا تو وہ چپکے سے افسانہ نگار کے دماغ میں آکر گدگدی کرنے لگتا ہے۔ مگر جہاں افسانہ نگار نے اسے قابو کرنے کے لئے ذرا سی بھی حرکت کی وہ وہاں سے بھاگا اور اپنے ساتھیوں میں جا ملا افسانہ نگار حضرت سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں۔ مجبوراً کرسی سے اٹھ کر کمرے کی فرش پیمائی شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کہ ایک ہاتھ پیشانی پر ہوتا ہے اور گردن نگوں ان کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ مگر خیالات کو تو صرف ستانے رُلانے اور دل دُکھانے میں ہی مزہ ملتا ہے۔

افسانہ نگار کی آنکھ جو گھڑی پر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساڑھے بارہ بجنے کے بعد بھی دس منٹ گذر گئے۔ مسلسل ناکامیاں بڑے بڑوں کا حوصلہ توڑ دیتی ہیں اور یہ تو بچارے محض ایک افسانہ نویس ٹھہرے! ادھر طاقت جواب دے دیتی ہے، اُدھر محترمہ نیند بصد ناز انہیں اپنے آغوش کی طرف کھینچتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آؤ میں تمہارے تھکے ہوئے جسم اور دماغ کو پیار سے سہلاؤں گی اور تم اپنی تمام کلفتیں بھول جاؤ گے۔ مگر جونہی یہ بتی گل کرکے یا بجلی بند کرکے بستر پر دراز

ہوتے ہیں اور [illegible] معصوم نگاہیں ان کی آنکھوں [illegible] سکتی ہیں ایسے خیالات جن کی [illegible] ایک ایک کر کے دبے پاؤں [illegible] کے دماغ میں [illegible] ہوتے ہیں [illegible] قطرہ صدف کی مانند اس طرح [illegible] مجھ کو [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] صف [illegible] کے منتظر ہیں [illegible] کہیں [illegible] نگاہیں گے [illegible] معصوم ہیں [illegible] انہوں نے اپنے [illegible] [illegible] کی [illegible] فروتنی [illegible] نگاہ [illegible] کی [illegible] [illegible] نہیں [illegible] کہاں جانے رہتی ہیں [illegible] [illegible] لاتی ہیں [illegible] آنکھوں کو [illegible] سے بالکل [illegible] رہتی ہیں [illegible] جاتا ہے!

خیالات کی جفاکاریاں صرف افسانہ نویسوں کو ہی پا شکستہ عشق نہیں بناتیں بلکہ زندگی کے شعبے میں گل کھلاتی ہیں۔ فرض کیجئے آپ کسی علمی یا سیاسی مجلس میں مدعو کیے گئے ہیں آپ وہاں کی ہر کارروائی میں حصہ لیتے ہیں۔ چونکہ ایسی مجالس میں آج کل کوئی خصوصی [illegible] بلکہ کسی اہم مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنا یا پھر اس پر غور کرنا ہے اسی لئے مجلس منعقد کی ہوتی ہے [illegible] یا کیا ہے [illegible] صرف چائے [illegible] بسکٹ پینا اصل مقصد سے [illegible] کام [illegible] ہونا [illegible] کے بجز [illegible] فوٹو لگانا [illegible] ان کے اعمال پر [illegible] کرنا ہی [illegible] سمجھے جاتے ہیں [illegible] ہوسکتا ہے کہ [illegible] گفتگو میں کوئی صاحب آپ پر ہی فقرہ چست کریں اور ہر طرف سے [illegible] کریں۔ ایسے موقع پر اول تو آپ کو کوئی [illegible] جواب سوجھے گا ہی نہیں اور اگر سوجھا بھی تو ایسا جس کو آپ ڈرتے ڈرتے لفظی جامہ پہنائیں گے مگر آپ کی توقعات کے مطابق جہاں لفظ آپ کی زبان سے لڑکھڑاتے ہوئے نکلے مجلس میں ایک اور قہقہہ بلند ہوا اور آپ پسینہ پسینہ۔ خیالات آپ سے چند قدم کے فاصلے پر ہی خوشی سے جھومتے ہوں گے۔ انہیں تو ایسے موقعے سنا دے کہ آپ کو ان کی ضرورت ہو اور وہ عین وقت پر آپ سے دانستہ بے دل لگی کر جائیں۔ طرفہ یہ ہے کہ بعد ازاں آپ کے دماغ میں داخل ہو کر وہ اس بات کا پکا ثبوت دے دیتے ہیں کہ انہوں نے آپ سے کسی وقت دل لگی کی تھی ان کا یہ طریقہ کار تو بالکل ناقابل عفو و برداشت ہے۔ اگر کوئی خیال آپ کی دماغی حدود میں آیا ہی نہ ہو اور اسی بنا پر آپ ایک وقت پر لاجواب ہو جائیں تو خیر یہ تو بات ہی جدا ہے۔ مگر کسی خیال کا یہ رویہ کہ وہ منہ پھٹ آپ کو آکر بتاتے کہ میں تو آپ کے دماغ کی سرحد پر حاضر تھا مگر آپ نے میری خدمات حاصل ہی نہ کیں۔ ایک بے مثل گستاخی ہے۔ مثلاً جب آپ غسل فرمانے لگتے ہیں اور چہرے پر صابن کی جھاگ کے تودے بنانے میں مصروف ہوتے ہیں تو یکا یکی

دو تین خیال اٹکھیلیاں کرتے ہوئے آتے ہیں اور آپ فوراً بول اٹھتے ہیں۔ [illegible] اوہو! محفل میں اس فقرے کا جواب ان الفاظ میں دیا جاسکتا تھا۔ بیچارے ۔۔۔۔ صاحب دوبارہ مجھ پر فقرہ آزمائی کرنے کی جرات نہ کرتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ دانت پیس کر رہ جاتے ہیں اور خیالات خوش دھوم دھڑ سے آتے تھے اُدھر چل دیتے ہیں!

امتحان میں خواہ وہ طلبا کا ہو یا عشاق کا خیالات خاص طور سے اپنی ہٹ دھرمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے طلبا اور عشاق میں بے حد مناسبت ہے۔ تین ماہ سے آپ ایک مضمون کی تیاری میں دن رات ایک کرتے رہے ہیں اور امتحان کے دن تک آپ کو کامل بھروسہ ہے کہ آپ اس مضمون کے تمام نشیب و فراز سے اتنی ہی واقفیت پیدا کر چکے ہیں جتنی کہ وہ تیدی اپنی کوٹھڑی سے پیدا کر لیتا ہے جو مسلسل [illegible] سے اس میں بند رہا ہو! امتحان کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بھی آپ کو یقین ہے کہ آپ پیچیدہ سے پیچیدہ سوال کا نہایت تسلی بخش جواب لکھیں گے۔ مگر ہوتا کیا ہے! آپ پرچے کے دوسرے سوال کے جواب [illegible] آپ [illegible] ایسے مقام پر آکر اٹک جاتے ہیں جو آپ کو پانی [illegible] آپ لاکھ سر ماریں مگر وہ خیال آپ کے بس کا نہیں۔ اس نے پہلے سے ہی آپ کے ساتھ کھیلنے کا تہیہ کر رکھا تھا! آپ کسی قدر طول امتحان کے ہال سے باہر نکلتے ہیں۔ ایک درخت پر اتفاقاً نظر پڑتی ہے اور [illegible] درخت کا خیال سے کوئی تعلق ہو۔ آپ کو وہ جواب جس کے لئے آپ نے ہال میں بیٹھے بیٹھے کئی قیمتی منٹ سوچنے میں ہی ضائع کئے تھے لفظ بلفظ یاد آجاتا ہے۔ آپ خیالات کو جتنا جی چاہے کوسیں، مگر انہوں نے آپ کی پریشانی سے جو لطف اٹھانا تھا اٹھا لیا!

عاشق کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اُسے بارگاہ حسن میں تنہا پہنچ کر اپنا عشق جتانا پڑے۔ عشاق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کے لبوں پر مہر خاموشی ور دل میں یاد کرتے ہیں"۔ دوسرے وہ جو محبوب کے سامنے ماجرائے دل کے بیان کی ہوس رکھتے ہیں اور طرح طرح کے تصورات سے مزے کر گونا گوں فقرے اپنی محبوب کے لیے تراشتے ہیں۔ مگر جب "اُن" کے پاس پہنچتے ہیں تو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے دل شدت سے دھڑکنے لگتا ہے۔ لب جنبش نہیں کرتے۔ قوت گویائی سلب ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سب رعب حُسن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر یہ نظریہ اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ فرسودہ۔ یہ سب حضرتِ خیال کی کارستانیاں ہیں! عاشق نامراد دل ہی دل میں خیالات کو بلاتا ہے، منت سماجت کرتا ہے۔ کہ ایسے موقع پر تو میرے ساتھ یہ برتاؤ نہ کرو۔ مگر سب بے سود۔ عشاق کی اس ابدی

مصیبت کے ذمہ دار یہی ظالم خیالات ہیں جو کسی کے جذبات کی پروا نہیں کرتے!

کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ خیالات بھی نسل انسانی کے خورد سالوں کی طرح ہوتے ہیں بچے ہیں جو ایک دوسرے کو دور سے ہی کوئی دل پسند چیز دکھا کر للچاتے ہیں۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ دیکھو ہمارے پاس کیسی اچھی اور خوبصورت شے ہے جو تمہارے پاس نہیں! اور اس کی بجائے انگوٹھا دکھاتے ہیں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تو محض دل لگی تھی، ہمارا ارادہ اس چیز سے جدا ہونے کا تھوڑے ہی تھا یہی عادت خیالات کی ہے۔ بظاہر تو کہتے ہیں آؤ ساتھ ہم یہاں ہیں۔ ہمیں لے لو! مگر جونہی آپ نے ان کی بات کو باور کر کے ایک قدم ان کی جانب اُٹھایا۔ وہ نہایت صفائی سے غائب ہو جاتے ہیں۔ انہیں آپ کو چھت پر پہنچا کر نیچے سے زینہ کھینچ لینے میں ہی مزا آتا ہے!

مگر دوبارہ غور کرنے پر یہ شبہ غلط معلوم ہوتا ہے احساس کی جگہ ایک اور شبہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ عشوہ طراز مہ جبینوں کی بھی تو یہی عادت ہوتی ہے! انہیں بھی تو نوع انسانی کو ستانے میں لطف آتا ہے! کیسے کیسے دلربایانہ انداز سے وہ آپ کی تمام توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی آپ کو ہر ممکن طریقے سے اپنے قریب آنے سے باز رکھتے ہیں یا کبھی آپ کے منظر عام پر کبھی ہٹ کے منظر عام سے آپ کو اپنے جمالِ جہاں تاب کی ایک جھلک دکھا جاتے ہیں اور پھر آپ کی حسرت دید سے بھری ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ آپ لاکھ آہیں بھریں۔ مدتوں انتظار کریں مگر اُن کو آنا ہے نہ آئیں گے۔

کیا خیالات بھی عشوہ طراز حسین ہیں!

ہیں تو سہی۔ مگر ان میں ایک وصف ہے (شاید یہ وصف وصف نہ ہو) ــــ کہ کبھی نہ کبھی آپ کی پریشان حالی پر ترس کھا کر آ تو جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے نزول کے اوقات نرالے ہیں۔ مثلاً کسی وقت آپ نسان کی امانت سے چند تشبیہیں تراشیں۔

"وہ اتنا مقبول ہو گیا ہے جتنا کہ لاہور کے درزیوں میں سے سراج طلبہ کے حلقے میں!"

"میرے حالِ دل کا مضمون اس ظالم نے مدیرانہ بے نیازی سے نامنظور کر دیا۔"

"فن کا ہر قدم ایک افسانہ ہے!"

وغیرہ وغیرہ۔ اب کسی موقع پر آپ کو ان تشبیہوں کی ضرورت پڑی آپ کاغذ پنسل لئے بیٹھے اس فکر میں ہیں کہ فلاں فقرہ یاد آئے تو اُسے جھٹ لکھ ڈالیں مگر یاد کیسے آئے! آپ کے خیالات نے یہی وقت غمزہ و عشوہ وادا کے لئے موزوں سمجھا ہے۔ "وہ اتنا مقبول ہو گیا جتنا ــــ جتنا کہ اندھوں میں کانا راجہ"! لاحول ولا قوۃ! آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی آپ کی بے بسی پر قہقہے لگا رہا ہے۔ بالآخر آپ مجبوراً کاغذ پنسل پٹک دیتے ہیں۔

مگر آپ کے پیارے پیارے فقرے۔ محبوب تشبیہیں۔ دلنشیں استعارے آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا نہیں ہوئے۔ یہ مفارقت محض عارضی ہے۔ آپ کو ان کے تغافل لئے "تمکین آزما" سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ وہ واپس آئیں گے۔ خیالات انہیں خود آپ کے پاس پہنچائیں گے۔ لیکن کب؟ آپ بے صبری سے پوچھتے ہیں۔ جب آپ کو انفلوانزا ہو گا یا سردرد یا بخار اور آپ زندگی کے ان جابر مہمانوں کی خوشنودی کے لئے چارپائی پر آنکھیں بند کئے خاموش پڑے ہوں گے یا آہستہ آہستہ کراہتے ہوں گے! جب آپ بیت الـــــ

مگر آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اشارہ کس ناگزیر مقام کی طرف ہے! ہاں۔ تو جب آپ مجبوراً اسی مقام پر ڈائری کھیے بغیر بیٹھے ہوئے دنیا و مافیہا سے دنیا کے دقیق ترین مسائل پر غور فرما رہے ہوں گے، یہ آئیں گے اور آپ کو محو پا کر آپ کے دماغی چور دروازے کی راہ سے نہایت اطمینان سے اندر گھس جائیں گے۔ اس وقت آپ کو نہ صرف تمام بھولی ہوئی باتیں یکے بعد دیگرے یاد آ جائیں گی بلکہ کائنات کے عجیب راز ایک ایک کر کے آپ کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہونے لگیں گے کبھی آپ ایک شاعرِ آتش کلام کا جامہ پہن کر فلک پیمائیاں کریں گے اور کبھی ایک سیاسی لیڈر بن کر خاموش مجمعوں میں وہ پتے کی باتیں کہہ جائیں گے جو کسی کے فرشتوں کو بھی نہ معلوم ہوں کبھی آپ ایک سائنسدان بن کر گریز پا شباب کو روکنے کی آخری ترکیب ڈھونڈھ نکالیں گے اور کبھی ایک ماہر نفسیات بن کر دلوں کے سربستہ راز اس آسانی سے بتا دیں گے جیسے کوئی نجومی مستقبل کا پردہ آن واحد میں اٹھا ڈالتا ہے! آپ افسانہ نویس نہیں گے تو افسانوں کے پلاٹ آ آ کر آپ کے قدم چومیں گے مصلح نہیں گے تو دنیا کو اپنے اشاروں کا منتظر پائیں گے۔ مزدور نہیں گے تو کسی خستہ حال جھونپڑی میں بیوی سمیت تین دن فاقہ کشی میں ہی کٹ جائیں گے، اور کوئی پرسانِ حال نہ ہو گا۔ انشاپرداز بنیں گے تو چاروں طرف اپنے ہی نام کا ڈنکا بجتا سنیں گے۔ ایک مایوس دبلے روزگار نوجوان بنیں گے تو سماج کی بے توجہی سے تنگ آ کر اپنی جان عزیز کو کسی دریا کے سپرد کر کے ہی چین لیں گے۔ آپ کیا کچھ نہیں بنیں گے! خیالات آپ کو سب کچھ بنا ڈالیں گے سب کچھ دکھا ڈالیں گے اور سب کچھ آپ سے کروا ڈالیں گے! یہ ایسے موقعوں پر بھی آ دھمکیں گے جب آپ آئینہ سامنے رکھ کر داڑھی مونڈ رہے ہوں۔ جھک کر بوٹ کا تسمہ باندھ رہے ہوں۔ کسی بندک کے پاس بیٹھے اس کی

[illegible] گوش ہو [illegible] میں خیال [illegible]
[illegible] بیٹھ [illegible] خیالات [illegible]
[illegible]

[illegible]

(۱) [illegible]
[illegible] ہوتی ہے [illegible] ہو گئی [illegible]

ب۔ کوئی ایسا آلہ ایجاد کیا جائے [illegible] کا مذبوحہ خیال الفاظ کی صورت میں خود بخود [illegible] جہاں آپ نے انگلی والی ایک [illegible] کا وزن بہت [illegible] سے باہر [illegible] ممکن ہے!

ج۔ آپ کی یادداشت ایسی تیز ہو کر آپ جہاں اور جس وقت چاہیں [illegible] خیالات آپ کے پاس کھنچے چلے آئیں۔ مگر افسوس [illegible] یادداشت [illegible] کی تھی!

د۔ آپ [illegible] کو رجوع فرمائیں۔ اس صورت میں [illegible] مشکلیں [illegible] حل ہو جائیں گی [illegible]!

نوٹ:- خواہ مخواہ کی موہومہ ترکیب ہی سب سے زیادہ موثر ہو سکتی ہے۔ ضرورت مند حضرات تجربہ فرمائیں۔

انور اعجاز قیصر

غزل

جن کی فطرت میں ودیعت ہے مذاقِ تگ و تاز
ہیں پر و بال بھی اُن کے لئے ننگِ پرواز

کیوں نم آلودہ نہ ہوں اہلِ نظر کی آنکھیں
چھوڑ کر دامنِ دریا کو کہاں جائے گداز؟

چشمِ آگاہِ تماشا جنہیں بخشی تُو نے
پردۂ رُخ بھی تراُ اُن کے لئے جلوہ طراز

ایک ہستی نظر آتی ہے تماشا فرما
ہم کو ادراکِ حقیقت ہے نہ احساسِ مجاز

تیری عزت کے لئے رند فنا ہو بھی چکے
شیخ ہے اب بھی تری یاد میں مصروفِ نماز

عام ہے مبداءِ موسیقئ فطرت کی عطا
بخشے جاتے ہیں مگر نغمے باندازۂ ساز

غم نہیں کچھ بھی ہو انجامِ محبت یارب
ہاں محبت کا مگر یاد نہ آئے آغاز!

جلوۂ حُسن پہ موقوف نہیں گرمیٔ دل
اس سے پہلے بھی یہی تھا مری فطرت میں گداز

ہائے میں خود بھی نہیں واقفِ اسرارِ وجود
ہے مری خاک کا ہر ذرّہ جگر گوشۂ راز

حُسن اس درجہ دل آویز کہاں اے تاباںؔ
یہ بھی ہے ایک مرے حسنِ نظر کا اعجاز

ظفر تاباںؔ

ایک تضمین اور ایک ترجمہ

تضمین

محتاج و غنی میں جو تفاوت ہے مٹا دو انسان کو انسان کا ہمدرد بنا دو
اربابِ عزت کو رعونت کی سزا دو اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!

پیدا کرو انوارِ عمل روئے زمیں سے بڑھ کر ہوں چمک میں جو ستاروں کی جبیں سے
تعمیر ہو اک عالمِ پائندہ یہیں سے گرما دو غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو!

ہر لب پہ ہو آزادیٔ کامل کا ترانہ اب ختم ہو زرداروں کی حکومت کا فسانہ
درکار ہے اس قصر کے گرنے کو بہانہ سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو!

یہ عالمِ نو جانبِ لطف اور رواں ہے بے امیدی و مایوسی کی تباہی کا نشاں ہے
افزائشِ سامانِ طرب کا نشاں ہے تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

جگن ناتھ آزاد

بلاوا

چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے،
چمک کر راہ میں جگنو تمہیں رستہ بتائیں گے
ستارے بھی شبِ تاریک کو روشن بنائیں گے
طیورِ شب تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے

تمہارے پاس مور و مار آ سکتے نہیں ہرگز
خیالِ دشمنی کو دل میں لا سکتے نہیں ہرگز
کسی صورت غرض تم کو ستا سکتے نہیں ہرگز
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے

یہ معمولی سی آہٹ پر ٹھہر جانا نہیں اچھا
ذرا سی سرسراہٹ پر ٹھہر جانا نہیں اچھا
ہوا کی سنسناہٹ پر ٹھہر جانا نہیں اچھا
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے

نہ ہو گر چاندنی زینت نہیں ہے رہگزاروں کی
تمہارے واسطے کافی ہیں یہ شمعیں ستاروں کی
تصدق ہر قدم پر ہو گی رنگینی بہاروں کی
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے،

یہ وقتِ شب یہ آہستہ خرامی جوئباروں کی
یہ نغمہ ریز مستانہ صدائیں آبشاروں کی
یہ خاموشی، یہ خوابیدہ جوانی سبزہ زاروں کی
چلی بھی آؤ اے جانِ جہاں خوف و خطر کیا ہے،

(رابرٹ ہیرک)

کوکب شادانی

ماتمِ دلبری

آتشدان میں سوکھی ہوئی سخت لکڑیاں چٹاخ چٹاخ جل رہی تھیں کمرے میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ دو دوست طعامِ شب ختم کر چکے تھے۔ داؤد نے اٹھ کر ہوٹل کے دریچے میں سے جھانکا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اُس کے بدن سے مس کرتا ہوا گذر گیا۔ سڑک لوگوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ اُس نے سگرٹ کا بچا ہوا ٹکڑا کھڑکی کی چوکھٹ پر مسل کر نیچے پھینک دیا اور لمبی سانس لے کر کہا "آہ۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں کس قدر اداسی ہے" یہ کہہ کر وہ مڑا اور آتشدان کے قریب اپنی کرسی پر آ بیٹھا جہاں اُس کا دوست پرویز سر جھکائے سگار پی رہا تھا۔ داؤد نے اُسے مخاطب کر کے کہا "قبل ازیں میں ایسی ہی شام کو اپنے بدن میں اک آگ سی محسوس کیا کرتا تھا مگر اب ——— بجھی ہوئی راکھ تاسف۔ حسرت۔ زندگی کتنی تیز رفتار ہے پرویز!"

پرویز نے جو جسم کا لاغر عمر میں اُس سے بڑا نسبتاً زیادہ خوش دل اور بذلہ سنج تھا۔ سر کو یوں اٹھاتے ہوئے گویا کوئی خواب دیکھ رہا تھا جواب دیا "داؤد میں نے اپنے بڑھاپے کو دنیا میں سب سے کم محسوس کیا ہے۔ میں ہمیشہ مسرور رہا ہوں میں نے اپنے اوقات ہنسی خوشی اور قہقہوں میں بسر کئے ہیں۔ اگر کوئی ہر روز بلاناغہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتا رہے تو وہ کار کنانِ عمر کی تبدیلیاں جو وہ ہر لمحہ کر رہے ہیں محسوس نہیں کر سکتا کیونکہ اُن میں آہستگی اور باقاعدگی ہوتی ہے اور چہرے کے خدوخال دھیرے دھیرے اس طرح بدلتے رہتے ہیں کہ یہ انقلاب ہمیں اَن دیکھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس انقلاب کا احساس ہی تو ہے جو روز بروز ہمارے دل و دماغ پر ایک تکلیف دہ صورت میں اثر پذیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس انقلاب کو اگر صحیح طور پر محسوس کرنا ہو تو چھ مہینے تک آئینے کے نزدیک نہ جاؤ۔ پھر دیکھو۔ مگر عورت! کتنی قابلِ رحم ہستی ہے۔ اس غریب کی مسرت، زندگی، تکبر، طاقت صرف اس کی خوبصورتی میں مضمر ہے اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی عمر صرف دس برس ——— تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ میں آج تک اسی خیال پر ادھار کھائے بیٹھا رہا کہ میں ابھی جوان ہوں گو میری عمر کا یہ چالیسواں برس گذر رہا ہے۔"

"مگر تمہارے سر کے بال تو اکثر و بیشتر سفید ہو چکے ہیں" داؤد نے کہا "اسی مرمریں قبر میں میری جوانی دفن ہے۔ وہ کیونکر دفن ہوئی۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے تم نے مجھے کیوں چھیڑ دیا داؤد؟"

داؤد نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بوڑھوں کی زندگی میں اپنی جوانی کی تلاش مشترکہ بات ہوا کرتی ہے منہ پر آئی بات روکنی نہیں چاہئے۔"

پرویز سگار کو لبوں سے الگ کرتے ہوئے بولا "میں ہمیشہ مسرور و شاداں رہا ہوں۔ مگر آہ اس تنزل کا حال مجھ پر اس قدر اندوہناک صورت میں منکشف ہوا کہ مجھ پر کوئی چھ مہینے تک لطفِ زیست حرام ہو گیا۔ میں نے بھی لوگوں کی طرح زندگی میں کئی بار محبت کی ہے۔ نہیں نہیں ایک بار صرف ایک بار۔ انسان زندگی میں صرف ایک ہی بار صحیح محبت کر سکتا ہے۔

"یہ بمبئی کا واقعہ ہے۔ ایک شام میں اور میرا ایک ہم جماعت دوست دجے گھوش ایک قہوہ خانہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ہمارے قریب کی میز پر ایک نوجوان لڑکی ایک مرد اور ایک ادھیڑ عمر یورپین عورت آ بیٹھے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ لڑکی اُن کی بیٹی تھی اور یہ اندازہ صحیح نکلا۔ آہ یادِ ایام!!! داؤد، بعض حسین و جمیل صورتیں پہلے ہی وار میں فتح حاصل کر لیتی ہیں اور اُن کی لمبی لمبی سرمگیں پلکوں سے نکلی ہوئی کوتاہ نگاہ "قلب کی انتہائی گہرائیوں میں اتر کر چین لیتی ہے۔ اُس نوجوان لڑکی کی آنکھوں میں ایک ایسی دلکشی پنہاں تھی جسے ایک بار دیکھ لینا اور پھر جان و دل سلامت بچا کر لے جانا انسان کے لئے بہت دشوار تھا میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس واقعہ کے تیسرے روز بعد دجے گھوش نے مجھے کالج لائبریری میں آ کر یہ خوشخبری دی کہ وہی لڑکی اپنے باپ کے ساتھ کالج کے دفتر میں ایم اے کی فیس ادا کر رہی ہے اور پھر طرہ یہ کہ وہ اُن سے کالج کے متعلق کچھ اسی باتیں بھی کر آیا ہے۔ میں اور وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترے۔ میرا دل خوشی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ ہم نے انہیں کالج کے برآمدے میں جا لیا۔ اُس لڑکی کا باپ ہم سے دو چار باتیں کرنے کے بعد موٹر میں سوار ہو کر چلا گیا۔ باقی ہم تینوں، میں، گھوش اور وہ لڑکی وہیں گھاس پر ٹہلنے لگے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام ساحرہ سراج الدین ہے۔ اُس کی ماں یورپین ہے اور باپ ہندوستانی مسلمان۔ ہم نے پہلی ہی ملاقات میں بھانپ لیا کہ اُس کا مذاق سلجھا ہوا ہے اور وہ نہایت خوش خلق اور شائستہ مزاج لڑکی ہے ——

[illegible] دنیا ہوں حشر:

[illegible] تھے ساحرہ کی طرح سادی اور خوش خلقی نے ہم سب [illegible] کبھی وہ ہمیں اپنے دل بلا لیتی [illegible] ضرورت پڑ جاتی اور ایک ساعت [illegible] بعض اوقات [illegible] کی بہت بھر لیا [illegible] کا دن [illegible] کتنا [illegible] ساحل سمندر [illegible] ان کی ہم پیالہ بنکر پوشاکوں سے [illegible] رنگا رنگ کے پھولوں [illegible] ہر طرف [illegible] اور [illegible] چھوٹی چھوٹی لکیں آلودگی [illegible] میں نے [illegible] تو مجھے [illegible] محسوس ہوئی [illegible] موسیقی کا دوسرا نام عورت ہے [illegible] رخساروں پہ مجھے اس کے رسیلے لبوں کی [illegible] کے اندر اور اس کی خوش وضع ناک کی [illegible] مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میری زندگی اور میری پیدائش کا مقصد [illegible] ہے [illegible] ساحرہ کی محبت ہے۔ وہ میرے دل و دماغ پر حکومت کرنے لگی۔ مجھے اٹھتے چلتے پھرتے مجھے اُس کا خیال رہنے لگا۔ اس طرح محبت کے ہاتھوں ایک عورت کا غلام بن جانا کتنا عجیب اور پرکیف مشغلہ ہے۔ ہم اسے ایک طرح کی سزا بھی خیال کرتے ہیں مگر ہائے اُس بربادی شادماں پر ہزاروں شاد کامیاں قربان اور لاکھوں مسرتیں فدا۔

اُس کا قدِ رعنا اس کے پتلے پتلے ہونٹ اُس کے ہوا میں لہراتے ہوئے سیاہ گیسو اور چہرے کے بے عیب خد و خال میرے دل کی دھڑکن کو اس قدر تیز کر دیتے کہ مجھے اس کے دھڑکتے دھڑکتے رک جانے کا احتمال ہونے لگتا اُس کا جنون میری رگ رگ میں سرایت کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کی ہر شے میں مجھے وہ خود دکھائی دینے لگی۔ میں کتنی ہی دیر تک صرف اُس کے اُس خاص دلربایانہ انداز کو دیکھنے کی اُمید پر کھڑا رہتا کہ وہ کب اپنے دستانے اتار کر اپنے [illegible] آویزاں اور بازوؤں میں ایک ساحرانہ خم پیدا کرتے

ہوے ہیں [illegible] خدا کی قسم اُس کی سی نظر افروز اور خوشنما ساڑھیاں [illegible] کے پاس نہ تھیں۔ آہ! آخر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے یعنی کچھ عرصے کے بعد اُس کی شادی ہو گئی —— میں نے ایک بیش قیمت تحفہ پیش کیا مگر وہ تحفہ [illegible] کی طرف سے مجھے دیا گیا۔ برسوں میرے پاس موجود رہا [illegible] اور ایک بے نام سی خلش۔ اُس کی شادی کے بعد [illegible] میرے لئے بمبئی میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔

اور میں [illegible] مجھے رنگون لے گیا۔ میرا قلب ملول اور دماغ افسردہ [illegible] اُس کے عرصے [illegible] ذہنی قوتوں کو ایک لمحہ کے لئے آزاد کرنا میرے [illegible] رفتہ رفتہ میری طبیعت میں ایک سکون سا پیدا ہوتا [illegible] دماغ میں صرف ایک محبت بھری یاد باقی رہ گئی دنیا کی ایک [illegible] جس کو واقعات زندگی نے میری راہ میں [illegible]

[illegible] کسی نے اسے کبھی محسوس کیا! ایک [illegible] کے بعد بیک وقت ہی سے گذرا جاتا [illegible] کبھی کسی نے محسوس کیں [illegible] پر نظر ڈالو تو یوں معلوم ہوتا ہے [illegible] سفید بال کہاں سے نمودار ہو گئے۔ ہماری اتنی [illegible] سچ کہتا ہوں مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ چند مہینوں کا ذکر ہے جب میں نے بمبئی کو الوداع کہی تھی۔

پانچ سال ہوئے میں الہ آباد میں تھا۔ وہاں کی آب و ہوا کا اثر تھا یا معلوم نہیں [illegible] میری مونچھوں کے دو چار بال سفید ہو گئے جنہیں دیکھ کر میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا اور میں کسی قسم کی تاخیر کئے بغیر ڈاکٹر سے جا ملا۔ اس نے ایک بہترین دوا کھانے کے لیے اور ایک تیل سا بالوں پر لگانے کے لئے تجویز کیا۔ چنانچہ میں اسی وقت شہر کے مشہور دوا فروش کی دکان پر پہنچا۔ وہاں حسب معمول بہت بھیڑ تھی۔ میں نے اپنا نسخہ دے دیا اور خود ملحقہ ڈیوڑھی میں رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ میرے دل کو اس خیال کی تسکین ہوتی رہی کہ [illegible] قابل ہے اُس نے یقین دلایا ہے کہ اس دوا کے استعمال سے بالوں کو تقویت پہنچے گی اور سفید بال دنوں میں سیاہ ہو جائیں گے سر کی تو خیر ہے مونچھوں میں سفید بال آنے سے تو میں واقعی بڑھا ہو جاؤں گا میرے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں غیر ارادی طور پر جنبش ہوئی اور میں نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر دیکھنا شروع کیا کہ آیا سفید بال اس طرح بھی نظر آتے ہیں یا نہیں۔ اتنے میں ایک موٹی سی گول مول عورت جو دو کرسیاں چھوڑ کر

بیٹھی ہوئی تھی میری ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی اور بیٹھتے ہی بولی "معاف کیجئے گا۔ کیا آپ مسٹر پرویز تو نہیں؟"

"جی ہاں، ۔۔۔ یہ سنتے ہی اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مگر اس کی مسکراہٹ اداسی کی ایک نامعلوم سی جھلک کو چھپا نہ سکی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں شاید!" میں کچھ بوکھلا سا گیا۔ یہ چہرہ بہت آشنا معلوم ہوتا تھا مگر کہاں دیکھا تھا۔ کب؟ کچھ یاد نہ آتا تھا۔

"جی ہاں۔ ن نن نہیں میں نے پہچان لیا ہے مگر آپ کا نام گرامی یاد نہیں آتا۔"

"اُس نے آنکھیں نیچی کر لیں اور کچھ شرما کر کہا "ساحرہ علی حسن"

مجھ پر بجلی گر پڑی۔ ایسا تلخ حادثہ مجھے عمر بھر پیش نہ آیا تھا۔ میرا خون رگوں میں رک گیا۔ میری آنکھوں کے آگے دھواں آ گیا۔ دل سینے میں ڈوبنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے ایک نقاب دھجیاں ہو کر اڑ گیا اور میں محسوس ہوا گویا میں ایک تلخ ترین حقیقت کی خون آشامیوں اور ہلاکتوں سے آشنا ہو رہا ہوں ۔۔۔ آہ کہاں وہ ساحرہ حسن کی تمام دلفریبیوں اور دلکشیوں کا مرقع اور کہاں یہ ساحرہ بھاری بھرکم موٹی سی جادوگرنی۔

"میں نے دیوانوں کی طرح اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا "تم ساحرہ ہو؟" میں اتنا ہی کہہ سکا جیسے میرے لبوں پہ مہر لگ گئی ہو۔ میرا دماغ ابل رہا تھا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں اس معمر عورت سے واقف نہ تھا۔ میں صرف اُس کی خوبصورت جوانی کو جانتا تھا جو مر چکی تھی۔ میرے دو ڈھلکتے ہوئے آنسو اس کے ہاتھ پر ٹپ سے گرے۔ وہ بھی انسانیت کی رو رو گئی۔ الفاظ اس کے منہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکلنے لگے "ہم میں بہت بدل گئی ہوں نا۔ اتنے طویل عرصہ کے بعد آخر ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں میں اب ماں بن گئی ہوں صرف ایک اچھی ماں ۔ الوداع جوانی۔ وہ بسر ہو چکا۔ ختم ہو چکا۔ اُف یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اگر ہم زندگی میں کبھی ملے بھی تو آپ مجھے پہچان نہ سکیں گے۔ آپ بھی تو آخر وہ نہیں رہے۔ آپ کو دیکھ کر میں کتنی دیر یہی سوچتی رہی کہ کہیں مغالطہ نہ ہو۔ سر بھی تو سفید ہو گیا ہے آخر اٹھارہ سال کا عرصہ۔ میری بڑی لڑکی کی عمر اٹھارہ برس کی ہو گئی ہے۔

"کل کتنے بچے ہیں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"چھ۔ چار لڑکیاں دو لڑکے" ۔۔۔ اتنے میں دکان کے ایک ملازم نے دواؤں کے دو چار بندھے ہوئے ڈبے لا کر ساحرہ کو دے دیئے میں نے پوچھا "خیر تو ہے؟"

"میری طبیعت کچھ عرصے سے اچھی نہیں رہتی۔"

"کیا شکایت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک شکایت ہو تو بتاؤں۔ عورتوں کی بیماریاں گنائی نہیں جا سکتیں۔" وہ مسکرائی۔ مجھے اُس کا کالج کا مسکرانا یاد آ گیا۔ اُس کے دانت موتیوں کی طرح چمکا کرتے تھے جو اب پائیوریا کی وجہ سے ماند پڑ گئے تھے۔ جب وہ اٹھی تو میری نظر اس کے بالوں پر پڑی جو کالج کے زمانے میں اس کی کمر تک آیا کرتے تھے۔ مگر اب ان کی بجائے سیاہ و سفید ملے جلے بالوں کا ایک مختصر سا گچھا رہ گیا تھا۔ میں اُسے باہر تک چھوڑنے گیا۔ موٹر میں بچے گل مل کر رہے تھے۔ ایک بسکٹ کھا رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی بچی منہ بسورتے ہوئے موٹر کی نشست پر سے گرنے ہوئے جا لگی۔ تب اٹھا رہی تھی۔ ان چھوٹی چھوٹی جانوں نے اپنی ماں کی طرح مجھے اور زیادہ حیرت میں ڈال دیا۔ ماں کے چہرے کے کچھ نقوش اُن کے چہروں میں نشوونما پا رہے تھے۔ لڑکیاں قد میں ابھی سے لانبی تھیں۔ انہوں نے ماں کی جگہ لے لی تھی۔ مگر وہ خود اب کیا تھی؟ وہ جو کبھی نخوت و ناز کا گہوارہ تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اُسے کل ویسا ہی دیکھا ہے اور آج ایسا دیکھ رہا ہوں۔ اس کے جسم کی خوبصورت بناوٹ، چہرے کی جانفزا رونق، آنکھوں کی دلکشی اور بھرے ہوئے گالوں کی چمک اب ختم ہو چکی تھی۔ میرے سینے میں ایک شدید قلق ایک رنج جاگ اٹھا۔ میرا دل فطرت کے یہ ہلاکت خیز فرائض اور ناپائدار و بے رحمانہ مشغلے دیکھ کر بوجھل ہو گیا۔

"ساحرہ نے سب سے بڑی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا "میری سب سے بڑی لڑکی"

"میں نے لڑکی کی طرف نگاہ پھیری۔ اُس کے نوخیز حسن میں کچھ کچھ وہی دلکشی وہی سحر تھا جو کبھی اُس کی ماں کی ملکیت تھا۔ اگرچہ سحر میں ابھی وہ پختہ نکھار نہ آیا تھا۔ تاہم اُس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ عنقریب اپنی ماں سے بہت کچھ ورثہ میں لے گی۔

"ساحرہ موٹر چلاتی ہوئی میری نظر سے اوجھل ہو گئی اور میں وہیں کھڑا رہا۔ مجھے انسانی زندگی اُس وقت بالکل موٹر کی مانند معلوم ہوئی جو تیز و تند دوڑی جا رہی ہو۔ میں اُس شام کو اپنے کمرے میں تن تنہا آئینے میں اپنا عکس خدا جانے کتنی دیر تک دیکھتا رہا۔ آہ داؤد، اس واقعہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی ہزار کوشش کی لاکھوں جتن کئے مگر میرے بال یکے بعد دیگرے سفید ہوتے چلے گئے اور آج تم دیکھ رہے ہو کہ میں واقعی بوڑھا ہوں۔" پرویز نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "آہ! بڑھاپا" اور سگار کا بچا ہوا ٹکڑا آتشدان میں پھینک دیا جہاں سوکھی ہوئی چٹاخ پٹاخ کرنے والی سخت لکڑیاں بھی وقت کے ہاتھوں جل کر ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔

بابر بٹالوی

غزل

فطرت ابھی بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں
یا رب کوئی بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں

ملتا نہیں بحرِ غمِ الفت کا کنارا
اک عالمِ گرداب ہے معلوم نہیں کیوں

عرصہ ہوا برباد ہوئی عشق کی دنیا
اب بھی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھا ہے مجھے کس نے کہ مری خاک میں اب تک
بجلی کوئی بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں

پیتا تھا کبھی خون بھی میں اشک کے بدلے
اب اشک بھی زہراب ہے معلوم نہیں کیوں

آئینہ ہوں تیرا مجھے معلوم ہے یا رب!
جوہر مرا بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

ہر خواب کی تعبیر نہ کر اے غمِ امید!
تعبیر بھی اک خواب ہے معلوم نہیں کیوں

دنیا کوئی معبد نہیں اے گنبدِ گرداں!
تو صورتِ محراب ہے معلوم نہیں کیوں

یکساں ہیں ہمارے سحر و شامِ تمنا
خورشید جہانتاب ہے معلوم نہیں کیوں[1]

یہ محفلِ بیدار نہیں میکدہ تائب
تو ہے کہ گراں خواب ہے معلوم نہیں کیوں!

مراتب علی تائب

[1] یہ شعر طالب آملی کے اس مطلع پر ہے کہ
زسینہ ہم با گردشِ ایام ندارد روزے کہ سینہ شد سحر و شام ندارد

محبّت کی پہلی رات

اُبھرتا تھا اُفق کے گھاٹ سے جب چاند متوالا
تم آنچل کو اُڑاتی سر پہ جلدی جلدی آئی تھیں
سنبھلتی، لڑکھڑاتی، کسمساتی جھینپتی آئی تھیں
میں پیپل کے تلے بیٹھا ہوا کچھ گنگناتا تھا
تخیّل سے حسیں خوابوں کی اک دنیا بناتا تھا

تم آئیں اور آ کر چھپ گئیں پھر میرے دامن میں
ہو طائر جیسے آسودہ کوئی آ کر نشیمن میں
مرا پہلو تھا، تم تھیں، خامشی تھی اور تنہائی
فضا کی سنسناہٹ، چرخ کے تاروں کی شہنائی

مرے شانے پہ تم سر اپنا رکھ کر سو سی جاتی تھیں
مجھے بھی کھو رہی تھیں اور خود بھی کھوئی جاتی تھیں
بسایا تھا تمہاری زلف کو پھر میں نے پھولوں میں
جھلایا تھا محبت کی حسیں بانہوں کے جھولوں میں
نہ جانے کب تک اس عالم میں ہم تم وقفِ مستی تھے
جوانی کی جواں لہروں میں گم اجزائے ہستی تھے
یکایک لے کے اک انگڑائی تم جانے کو اُٹھ بیٹھیں
مجھے مضطر بنانے میرے تڑپانے کو اُٹھ بیٹھیں
مچل کر میں بڑھا دامن تمہارا تھام لینے کو
شرابی جیسے اُٹھے گرتی مینا تھام لینے کو
مگر آنسو تمہاری آنکھ میں لہرائے جاتے تھے
فسانہ اپنی مجبوری کا کچھ دہرائے جاتے تھے
محبت کی وہ پہلی رات تم کو یاد ہے شہنا

علی احمد

سوتیلی بیٹی

تربوز کا کھیت ان دنوں بہار پر تھی۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے ہرا بھرا کھیت لہرا رہا تھا۔ دھوپ مغرب میں غروب ہو رہی تھی۔ شہتوت اور بکائن کے گھنے درختوں کے زرد مرجھائے ہوئے پتے ٹہنیوں سے جدا ہو کر سامنے ہوا میں اِدھر اُدھر گر رہے تھے۔ غریب بیل جو تمام دن کی ہواؤں میں جوتا گیا تھا تھکا ماندہ چور ہو گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ لڑکھڑاتے ہوئے قدم اُٹھاتے تھے ایک دفعہ وہ چلتے چلتے رک گئے تو نوجوان ہاشم جو اپنی نشست پر بیٹھا اونگھ رہا تھا چونک پڑا اور ان بیلوں کو سخت آواز کے ساتھ انہیں لکڑی سے پیٹنے لگا وہ چل پڑے تو اس نے اپنی چادر شانے پر ایک طرف رکھ دی اور اُٹھ کھڑا ہوا پانی کے مٹکے کے پاس بیٹھے لڑکے کو آواز دی "رحمو! کتنا باقی ہے؟"

شرقی کی طرف ذرا فاصلے سے ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے نے جو کھال سے پانی کا راستہ درست کر رہا تھا سر اُٹھا کر جواب دیا "بس ختم ہوا چاہتا ہے۔"

ہاشم نے اطمینان کا سانس لیا اور بائیں طرف گاؤں کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں ایک نوجوان لڑکی پر جم گئیں۔ وہ سر پہ چھاچھ کا برتن اور روٹیاں اُٹھائے تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی آ رہی تھی۔ رحمو بھی اُسے آتے دیکھ کر کنوئیں پر آ گیا۔ قریب پہنچ کر اس نے پاس پڑے ہوئے پیال پر موٹے کپڑے کی صاف ستھری دھجی ملول کر بچھا دی اور دو پیالوں میں چھاچھ انڈیل کر پاس ہی رکھ دی۔ باپ بیٹا آمنے سامنے بیٹھ کر کھانے میں مشغول ہو گئے۔

"عائشہ! آج دیر سے آئی ہو" ہاشم نے ایک بڑے نوالے کو چھاچھ کے گھونٹ سے حلق کے اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔ عائشہ نے شرمیلے انداز سے نیچے دیکھتے ہوئے جواب دیا "بانو تائی نے ٹھہرا لیا تھا۔ وہ کہتی تھی مجھے ایک دفعہ جوڑا پہن کر دکھاتی جاؤ۔"

یہ سن کر ہاشم کے چہرے پر غصہ کے آثار نمودار ہو گئے۔ اُس کے ماتھے کی جھریاں سمٹ گئیں اور گہری لکیریں دکھائی دینے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک نگاہ عائشہ کے حنا آلود ہاتھوں کی طرف ڈال کر بڑبڑاتے ہوئے کہا "دو دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔"

عائشہ سر جھکائے سمٹی سمٹائی اپنی جگہ بیٹھی تھی یہ سن کر اُس نے دوپٹے کے آنچل سے اپنا منہ چھپا لیا اور اُٹھ کر دوسری طرف چلی گئی۔

"پرسوں بارات آ رہی ہے نا" رحمو نے کھانے سے فارغ ہو کر باپ سے پوچھا اور جواب نہ پا کر خود ہی کہنے لگا "کپڑے تو سب تیار ہو گئے۔ ابھی تک موچی نے میرا جوتا نہیں دیا آج نہ دیا تو کب دے گا۔"

"بیلوں کو کھول کر لے جاؤ" ہاشم نے اپنے مخصوص درشت لہجے میں کہا۔ رحمو چلا گیا تو عائشہ درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور جھک کر پانی سے برتن صاف کیے پھر کنکھیوں سے ہاشم کی طرف جو ذرا فاصلے پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا دیکھ کر کہنے لگی "آج ساگ لے جاؤں۔"

"ہاں" ہاشم نے اُس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ عائشہ جانے لگی تو وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا ٹکٹکی باندھ کر اُس کی طرف دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ جوار کے کھیت کے پیچھے غائب ہو گئی۔

"اف" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور اس کے ابرو سکڑ گئے۔ جیسے وہ گذشتہ زمانے کا تصور کر رہا ہو۔ دوپہر کی دھوپ میں اُس کے سامنے پھیلے ہوئے کھیت موجود تھے مگر اس وقت اس کی نیم وا آنکھوں کے سامنے چار پانچ سال کی ایک لڑکی کا غمناک چہرہ جھلملا رہا تھا۔ عائشہ اس کی بیوی کے پہلے خاوند سے پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ وہ ماں کے ساتھ اس کے گھر آئی تو اُس کے دل میں اس معصوم بچی کی طرف سخت نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ عائشہ اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس خیال سے وہ سخت پیچ و تاب کھاتا تھا کہ ایک غیر شخص کی بیٹی یوں آ کر اُس کے گلے کا ہار بن جائے۔ جوں جوں دن گذرتے گئے اس کی نفرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اس سے بات کرنا بھی اپنی ہتک سمجھتا تھا۔ جب کبھی وہ اُسے دودھ دوہنے کا برتن اُٹھا کر دیتی تو وہ برتن کو اس کے ہاتھوں سے اس طرح جھٹک کر پکڑتا جیسے چھین رہا ہے کئی بار اس نے عائشہ کی ماں کو محض اس لیے زدوکوب کیا کہ وہ کیوں اپنی بیٹی کو ددھیال نہیں بھیج دیتی۔ اس خاموش اور اداس چہرے والی لڑکی کو دیکھ کر اس کا خون کھول اُٹھتا تھا۔ جب وہ آنکھیں نکالتا ہوا دالان میں داخل ہوتا تو اِدھر اُدھر تھرکتی ہوئی لڑکی بھاگ کر ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاتی۔ شاید اُسے مرغی کے بے پر و بال چوزے کی طرح یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ جونہی وہ ماں سے دور ہوا اُدھر چیل نے اُسے اُچک لیا۔ جب دو سا

کے بعد جو ہاشم کے گھر پیدا ہوا تو وہ ہر وقت اپنے سوتیلے بھائی کو گلے سے چمٹائے پھرتی اور اس کے کانوں میں اپنے معصومانہ گیت گنگناتی رہتی۔ اس منظر نے کبھی اُسے متاثر نہ کیا۔ اس کو وہ شام یاد آ گئی جب عائشہ ایک کتے سے خوف کھا کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور اس نے ننھی بچی کو جھنجھوڑ کر ایک طرف پٹک دیا تھا۔

بڈھے ہاشم نے ایک گہرا سانس لیا اور مضطرب نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اُسے خیال آنے لگا کہ ماں کی وفات کے بعد سے آج تک عائشہ نے کس تندہی سے باپ بیٹے کی خدمت کی تھی۔ اُس نے سارے گھر کا کام اپنے سر پہ اُٹھائے رکھا۔ وہ خود ہل کی کھیتی کرتا تھا دو بھینسیں گھر میں رکھی تھیں اور ہاتھ بٹانے والی دوسری عورت بھی کوئی نہ تھی وہ دن رات اپنے دھندے میں مشغول رہتی تھی۔ صبح سویرے اُٹھ کر چکی پیسنا دودھ بلونا۔ مویشیوں کا گوبر سنبھالنا کنوئیں سے پانی لانا۔ روٹی پکا کر کھیت پہ لے جانا۔ وہاں سے بیلوں کے چارے کا گٹھا اُٹھا کر واپس آنا۔ اسی چکر میں دن گذر جاتا تھا۔ جب تک رحمو لڑکپن کے عہد میں رہا عائشہ چرواہے کا کام بھی خود ہی کرتی رہی۔ وہ دوپہر کے وقت ہل چھوڑ دیتا اور روٹی کھا کر کسی سایہ دار درخت کے نیچے سو رہتا۔ عائشہ بیلوں کو دوسرے چارپایوں کے ساتھ ہانکتی ہوئی چراگاہ میں لے جاتی اور وہاں جیٹھ اساڑھ کی چلچلاتی دھوپ میں اُن کی رکھوالی کیا کرتی۔ بیساکھ میں گیہوں کی کٹائی کے موقع پر اسے کبھی دوسرے آدمی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ خود اُس کے ساتھ مل کر فصل کاٹتی تھی۔ ان دنوں اس کی انگلیاں بسا اوقات درانتی سے زخمی ہو جاتیں مگر وہ جسمانی تکلیف کے احساس سے بے پروا تھی۔ اُس نے کبھی عائشہ کو اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے نہیں دیکھا گاؤں کی عورتیں اس چُپ چاپ جفاکش لڑکی کی جانب حیرت کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد رات کو جب چاروں طرف سناٹا چھا جاتا اور لوگ میٹھی نیند میں مست خراٹے لے رہے ہوتے۔ عائشہ مٹی کا دیا جلا کر پاس رکھ لیتی اور آدھی رات گئے تک چرخہ کاتتی رہتی۔ وہ ہر سال گھر کا سُوت تیار کر کے باپ بیٹے کے کپڑے بنواتی اور خود اُن کے پھٹے پرانے کپڑوں کو مرمت کر کے پہنے رکھتی۔ اُن کی روٹیاں مکھن میں گوندھ کر پکاتی اور اپنی خشک روٹی مرچ کے اچار کے ساتھ کھاتی تھی۔ اس نے ایک بار کہا بھی تھا۔

"عائشہ! تم بھی تھوڑا مکھن لے لیا کرو۔"

بڈھے ہاشم کو اب یاد نہ تھا کہ عائشہ نے اس کا کیا جواب دیا تھا۔ مگر یہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ ہل چلانے سے بدرجہا زیادہ محنت برداشت کرتی تھی۔ اُس کی خود فراموشی اور کفایت شعاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اپنے نمبردار کے بعد سارے گاؤں میں سب سے زیادہ آسودہ حال سمجھا جانے لگا۔

عائشہ نے گھی روئی اور دوسری اجناس جو پہلے مفت میں ضائع ہو جاتی تھیں بیچ بیچ کر اس کا سارا قرضہ اتار دیا تھا۔ اب اس کے گھر میں کچھ رقم بھی پس انداز ہو گئی تھی۔ آج کل سب گنوار اس کو چودھری ہاشم کہہ کر بلاتے تھے۔ مگر اُس نے کبھی دبی زبان سے بھی عائشہ کی خدمات کا اعتراف نہ کیا نہ زندگی بھر اُسے محبت کے لہجہ میں مخاطب کیا بلکہ اُلٹا اُس پر احسان جتایا کرتا تھا کہ میں ہی تھا جس نے تم جیسی لاوارث لڑکی کو پرورش کیا۔ اُسے کئی دفعہ اُسے بے وجہ بےگناہ سخت سست کہا اور گالیاں دیں۔

ہاشم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ کیا وہ بھی اُسے اپنا باپ سمجھتی تھی، شاید ہی کوئی لڑکی اپنے سگے باپ کی اتنی خدمت کرتی ہو گی۔ وہ بغیر پوچھے اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا پتہ لگا لیتی تھی۔ صبح سویرے ابھی وہ بستر پر کروٹیں لے رہا ہوتا کہ عائشہ چلم بھر کر اس کے سامنے لا رکھتی جاڑے کی راتوں میں وہ بار بار اُٹھ کر اُس کا لحاف درست کرتی تھی۔ اگر وہ کنوئیں پہ پیاس محسوس کرتا تو عائشہ بھاگی بھاگی گاؤں جا کر اُس کے لئے دودھ لے آتی کبھی برسات کے دن وہ جھنجھلا کر اُسے برا بھلا کہنے لگتا کہ میں تو بھوک سے مر رہا ہوں خبر نہیں وہ گھر میں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ آخر جب وہ آ کر گھی میں تلی ہوئی میٹھی ٹکیاں اُس کے سامنے رکھتی تو اس پر دیر کی حقیقت کھل جاتی۔ ایک دفعہ وہ گاؤں کے فساد میں سخت زخمی ہوا اور دو ماہ تک قصبے کے شفاخانے میں پڑا رہا۔ عائشہ اتنی مدت ہر روز سات میل کا سفر طے کر کے اپنے گاؤں سے اس کے لئے دودھ لے جاتی رہی۔ اس کے کراہنے کی آواز سن کر وہ ساری ساری رات اس پر جھکی رہتی تھی۔ جب وہ درد سے بیتاب ہو کر چلانے لگتا۔ تو وہ اُس کی پائنتی پر سر رکھ کر خاموش بیٹھی آنسو بہایا کرتی تھی۔ جب وہ صحت یاب ہو کر واپس گھر میں آیا تو اپنے مزاج کا چڑچڑا پن عائشہ پر نکالا کرتا اور معمولی معمولی باتوں پر اسے جھڑک دیا کرتا تھا۔

ہاشم کو اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی وہ حقے سے منہ لگا کر جلد جلد کش پہ کش لگانے لگا۔ حتیٰ کہ اس کے سامنے دھوئیں کا بادل سا چھا گیا۔

سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ ہاشم کا مکان گاؤں کے مردوں عورتوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ برات کے رخصت ہونے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ڈھول

[illegible] تھی خاموش ان [illegible] ہوا [illegible] کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی
وطن بنی ہوئی [illegible] سے بوسٹ میں [illegible] بیٹھی تھی۔ براتی گھوڑوں پر سوار
ہوکر مکان کے سامنے [illegible] جمع ہو گئے تو کہاروں نے پالکی لاکر صحن میں
[illegible] جب [illegible] سے [illegible] طرف سے قائم کر [illegible] سے
پاس [illegible] نوجوان [illegible] ہاری [illegible] آئے گلے سے
لگایا [illegible] ہاشم [illegible] پر [illegible] اس سے [illegible]
[illegible] اور [illegible] تسلی سے کچھ [illegible]
[illegible] نے پالکی اٹھائی اور [illegible]
نے [illegible] تاب الدنیا [illegible]

[illegible] اب [illegible] بابا [illegible] بلائے

[illegible] ابھی مجھے تیری موت سے [illegible] جائیں گے

[illegible] اب [illegible] تیری [illegible] یہ [illegible] جا رہی ہے

[illegible] ختم ہو گیا

[illegible] باہر [illegible] سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے
ہاشم دروازے کے پاس کچی دیوار سے ٹیک لگا کر [illegible] لوٹتے ہوئے دیکھ
رہا تھا۔ اس کی نگاہیں پالکی پر [illegible] براتیوں کے درمیان آہستہ آہستہ جھکولے
لیتی ہوئی جا رہی تھی [illegible] دھندلے اور گرد کے غبار میں نظر سے
اوجھل ہوگئی تو [illegible] نقاہت سے مجبور ہوکر اسی جگہ بیٹھ گیا اور چادر کے
سرے سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا [illegible] بے اختیار امنڈے چلے آتے تھے

سید علی عباس جلالپوری

چُپ چاپ

فضا خموش، ہوا سرد، دشت خوابیدہ
نگاہِ شاعرِ غمگیں اُداس، غمدیدہ

یہ سُرخ غنچۂ گُل ہے کہ شمع سوزاں ہے
سحر کے وقت خموشی سے جو فروزاں ہے

یہ جھک کے کان میں غنچے کے کہہ رہا ہے گُل
ذرا بھی آج کرے گا فگارِ دل بلبُل

ہر اک چٹک پہ کلی کی ہوا لرزتی ہے
ہر ایک خندۂ گل پر فضا لرزتی ہے

حسین عارضِ گُل پہ ہے قطرۂ شبنم
گلُوں کی آنکھ کو کرتے ہیں اشکِ کوکب نم

فلک پہ ساکن و مبہوت ابر کے ٹکڑے
ہیں مرغزار میں گلّے سپید بھیڑوں کے

فضائے چرخ میں بادل تھکے سے کھوئے سے
لحافِ برف لئے بیٹھی نیند سوئے سے

خموش و ساکن و مدہوش اس قدر ہے فضا
کلی چٹک کے ذرا دیکھ لے کہ شور ہُوا

عجب سکوں ہے فضا میں ہوا ہے یوں خاموش
وفورِ نکہتِ گُل سے ہے خامشی مدہوش

یہ سبز پتّوں سے ہو کر گذر رہی ہے ہوا
کہ شور ہوتا ہے خاموشیوں کی آہوں کا۔

مسعود شاہد

ایک غزل اور ایک نظم

غزل

نالوں میں مرے اثر نہیں ہے
اب رونا بھی کارگر نہیں ہے

کیا تجھ سے کہوں فسانۂ غم
تو اتنا تو بے خبر نہیں ہے

دل ہے مرا اور ہجوم اندوہ
تسکیں کا یہاں گذر نہیں ہے

آوارۂ دشتِ زندگی ہوں
مجھ کو غمِ رہگذر نہیں ہے

واقف ہے وہ رازِ دو جہاں سے
اپنی جسے کچھ خبر نہیں ہے

دن میرے لئے ہے رات محسنؔ
خوفِ ستمِ سحر نہیں ہے

محمد ایوب محسنؔ

مزدور

(ایک سانیٹ)

جب گرانباریٔ محنت سے میں تھک جاتا ہوں
میرے سینے میں سلگ جاتی ہے احساس کی آگ
خشک ہونٹوں سے بھڑک اٹھتی ہے افلاس کی آگ
جادۂ صبر و قناعت سے بھٹک جاتا ہوں
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ میں زندہ نہیں
موت پر کھولے ہوئے چھائی ہے ارمانوں پر
بوجھ ہے جبر و تشدد کا مرے شانوں پر
گویا پردیسی ہوں اس دیس کا باشندہ نہیں
زندگی کے رُخِ روشن پہ سیہ خال ہوں میں۔
زرِ خالص مری ہمت سے اگلتی ہے زمیں
پھر بھی افکارِ معیشت نے دبا رکھا ہے
کثرتِ کار پہ بھی بھوک سے بے حال ہوں میں
پیٹ بھرنے کو نہیں ملتی مجھے نانِ جویں
ہائے میرے لئے اس دہر میں کیا رکھا ہے!

م۔ ر۔ تبسم قریشی

عورت

صبح نو بجے کا وقت تھا۔ میں اپنے ملاقاتی کمرے میں بیٹھا سگرٹ کا دھواں چھت کی طرف چھوڑ رہا تھا۔ کسی کی یاد تصور پر چھائی ہوئی تھی۔ طبیعت غیر معمولی طور پر مضطرب و بے چین تھی۔ فرقت کی گھڑیاں تو اس کا سوال حصہ بھی پریشان کن نہیں ہوتیں جتنا کہ انتظار کے آخری لمحے۔

گاڑی آنے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف چلوں۔ بازار میں موٹروں اور تانگوں کے شور و شغل اور سبزی فروشوں اور خوانچے والوں کی ہم آہنگ آوازوں سے ہو کچھ بھی وقت بہلے گی اور گاڑی کے وقت اسٹیشن پہ بھی جا پہنچوں گا۔

یہ سوچ کر میں نے ایک انگڑائی لی اور اٹھ کر باہر آیا۔ چند قدم کے فاصلے پر مالی اور مالن بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ مالی نہ جانے کیا شرارت کیا چاہتا تھا کہ مالن نے اس کا ہاتھ جھٹک کر مصنوعی غصے سے کہا "بس۔ مجھے مت چھیڑو"

"کیوں نہیں؟ میں تو چھیڑوں گا" یہ کہتے ہوئے مالی نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑلی اور پھر کہا۔ "ایسی کون سی تو حور پری آگئی کہ تجھے نہ چھیڑوں"؟

مالن نے پہلے تو کلائی چھڑانے کی کوشش کی مگر اس کی مضبوط گرفت سے چھوٹتے نہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا: "تمہارے لئے تو حور پری ہی ہوں"

"اونہہ حور پری! صورت تو دیکھو بندریا کی سی" مالی نے جواب دیا "اور تمہاری صورت.... " مالن بولی۔

وہ آگے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس نے حیا سے سرخ ہو کر گردن جھکالی۔ مالی نے بھی کلائی چھوڑ دی۔ شرماتا ہوا میری طرف آیا اور ہاتھ کی ہتھیلیاں ملتے ہوئے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔ "بابو جی کہاں جاــــ ئے ـ؟"

"میں اسٹیشن کو جاتا ہوں۔ جگو آئے تو اُسے کہنا کہ ٹھیک ساڑھے دس بجے تانگہ لے کر اسٹیشن پہ پہنچ جائے"

"اچھا بابو جی کہہ دوں گا" اس نے جواب دیا اور پھر آہستہ سے پوچھا "آج مالکن آئیں گی کیا؟"

"ہاں مالکن آئے گی" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ مالی بھی سمجھ گیا کہ میں کیوں مسکرا رہا ہوں۔ وہ آنکھیں جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگا اور بولا۔ "پھر آپ بھی تانگے میں چلے جائیے"

"نہیں مجھے راستے میں کام ہے۔ میں تو چلتا ہوں۔ اسے ضرور کہہ دینا۔ بھولنا نہیں"

. . . .

میں کوٹھی کے پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آیا۔ آگے آگے ایک ریوڑ جا رہا تھا۔ بکریاں بکھری ہوئی ساری سڑک پر چل رہی تھیں جس سے تانگوں اور موٹروں کے گذرنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ گڈریا انہیں ایک طرف رکھنے کی بہتیری کوشش کرتا تھا مگر ایک بکرا اچھل کود کر انہیں پھر بکھیر دیتا تھا۔ میں کافی دور تک ریوڑ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اس شریر بکرے کی بکریوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور شوخیوں میں دلچسپی لیتا رہا لیکن کرشن نگر سے نکل کر جوں ہی ہم بڑی سڑک پہ پہنچے ریوڑ تو باہر کی طرف چلا گیا اور میں بازار کی طرف۔

جب میں گورنمنٹ کالج کے قریب پہنچا تو کالج کا گھنٹہ بج رہا تھا۔ پیچھے سے دو لڑکے بغلوں میں کتابیں دبائے جلد جلد قدم اٹھاتے چلے آرہے تھے۔ اور ان میں سے ایک کہہ رہا تھا..... رنگ سانولا سہی۔ مگر اس کے خدوخال ستم ڈھاتے ہیں۔ آنکھیں تو دیکھو.....!

یہ کہتے ہوئے لڑکے تو آگے نکل گئے مگر میرے لئے ایک معمہ چھوڑ گئے کہ ـــــــ انہیں جلد جلد چلنے پر مجبور کرتا ہے کالج کا گھنٹہ اور ستم ڈھاتے ہیں کسی کے خدوخال۔ عجیب ماجرا ہے۔ آخر یہ ہے کون!ـــــ کالج کی کوئی لڑکی سرلا، کملا، روہنی یا موہنی۔ جسے یہ کن آنکھیوں سے دیکھتے ہوں گے اور وہ کھنچی کھنچی دور رہتی ہوگی۔ میرے دل میں بھی آرزو پیدا ہوئی کہ میں بھی دیکھوں کہ وہ آنکھیں کیسی ہیں جنہیں وہ نہ معلوم کس چیز سے تشبیہہ دے رہے تھے اور جو انہیں ان کے مطالعہ میں بھی پریشان کرتی رہتی ہیں۔ آخر مجھے بھی تو کسی کی آنکھوں نے ہی مسحور کیا ہے وہ آنکھیں ان آنکھوں سے اچھی تو نہیں ہو سکتیں۔

میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ سوا نو بجے تھے اور گاڑی کو ساڑھے

دس بجے آیا تھا۔ وہ بڑی بڑی پیاری آنکھیں
میں انہیں آنکھوں کا تصور کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ان آنکھوں میں حسن و کیف
کی دنیا آباد تھی۔ ان آنکھوں سے ... میں نے ... اپنا بنا لیا تھا کہ ان کے سامنے
بھر دنیا سونی تھی۔ اب ... کشش مجھے سٹیشن کی طرف لے جا رہی تھی کہ
... نوجوان ... سارا جہاں ... بن گئے اور
... تھیں اور ... طرف
... ایک ... تھا ... لڑکیاں ...
اور میں ... ایک ... نظر ...
... اس کے دل میں ... جس طرح طوفان کی ... سمندر کے
... اٹھتی ہیں اور ... دیکھتے ہی دیکھتے ... کی ... ہو جاتی ہیں
اسی طرح اس کے دل میں ... جذبات نے کروٹ لی اور ... میں اس کے
... جاری ... تک آ گئے۔ اس نے ایک ... بھری
لی اور گھوڑے کی لگام کو جھٹک کر اسے چابک سے سہلاتے ہوئے کہا "آ دچل۔
تینوں لے جان ... دیاں ..."

یہ اس کے جذبات کا اظہار تھا اور اس کے لئے اس ... اس سے
بہتر الفاظ نہیں تھے۔ یہ نقشہ جہاں موجودہ تمدن پر کڑی تنقید تھا۔ وہاں اس کی معاشرتی
حیثیت کا بھی آئینہ دار تھا۔ بلکہ اگر اس کے نفسیات کا بغور تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ
میں پہلی کی بہ نسبت دوسری بات زیادہ کارفرما تھی۔ کیونکہ وہ کوئی خشک ریفارمر
نہیں تھا جو یہ چاہتا کہ مشرق کی حیا پرور خاتون مغرب کی بے باک دوشیزہ بن کر شکوں
پر نکلے۔ وہ ایک سیدھا سادہ مزدور تھا۔ اس منظر سے اسے اپنی کم مائیگی اور ... کی
کی بے اعتنائی کا غیر شعوری احساس ہوا تھا۔ اس بات کو اس کا حسن پرست دل
بھی گوارا نہ کر سکا اور زندگی کی اس تفاوت راہ کے باعث جنسی لگاؤ ایسا احساس
لطیف بھی طنز بن کر رہ گیا۔

میں یہی سوچتا ہوا موچی دروازے تک پہنچ گیا اور وہاں جہاں ... باغ
کے ... پر بہت سے پرانے کوٹ لٹکے رہتے ہیں۔ یوں ہی ٹھہر گیا۔ شاید اس
لئے کہ وقت ہی تو گذارنا ہے۔ ایک اچٹتی سی نظر کوٹوں پر ڈال کر میں باغ میں دیکھنے
لگا۔ ایک مرغ اور دو تین مرغیاں "چیخ چیخ" کرتے پھر رہے تھے اور پنجوں سے مٹی کرید
کر خوراک کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ مرغ نے ایک بڑے اور پرانے درخت
کی جڑ میں چونچ ماری اور "کٹ کٹ" کر کے مرغیوں کو مدعو کیا۔ مرغیاں دوڑی آئیں
درخت کی جڑ میں دیمک نے بامبی بنا رکھی تھی۔ ... سے چونچ بھر بھر کر کھانے لگیں
اور مرغ سینہ تان کر فخر سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں انہیں دیکھتے دیکھتے ایک مبہم سے انداز میں آگے سرکنے لگا۔ ایک
موٹی اور کھردری سی آواز کان میں پڑی۔ "کیوں بابو جی ٹیشن کدھر ہے؟"
میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو قریب ہی ایک ستائیس اٹھائیس سال
کا مضبوط دیہاتی نوجوان یہ سوال کر رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا
"میرے ساتھ چلے آؤ!"
"دیکھو جی۔ پہلے کسی نے اس طرف بھیج دیا" اس نے شکایت کی۔
"شرارت کی ہوگی"
"اور کیا! پردیسی سمجھ کر کھول کر دیا"
"اچھا۔ اب کہاں جانا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔
"جانا ... وہاں سے پانچ کوس پر گاؤں ہے میں نے سوچا کہ
آیا تو ہوں۔ لاہور بھی دیکھ چلوں۔ اس لئے اتر پڑا۔" وہ رک رک کر باتیں کرتا رہا
اور پھر گردن ہلا کر کہنے لگا "اچھا شہر ہے!"
"اس سے پہلے بھی کہیں آئے گئے ہو؟"
"جی ہاں۔ بار میں گیا تھا۔ وہاں رشتے ناتے کے لوگ ہیں۔ انہیں ملے
بہت دن ہو گئے تھے۔ ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ سو چل ہی آیا"
"تمہاری شادی تو ہو چکی ہو گی؟" میں نے معلوم نہیں کیوں یہ سوال کر دیا۔
"جی نا!" اس نے حسرت کے لہجے میں جواب دیا۔
"تو پھر کراؤ گے؟"
"جی ہاں" اس نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ اس کا چہرہ اس طرح کھل گیا
تھا جس طرح خزاں رسیدہ پودے کو باد بہاری کا جھونکا لگا ہو۔ گویا میرے سوال
سے اسے کچھ امید ہو چلی تھی کہ اس کی شادی کا دن بھی کبھی آ ہی جائے گا۔
"تو اب کہیں اڑوس پڑوس میں سانٹھ گانٹھ لگی ہو گی؟" میں نے تحقیق جاری
رکھی۔ "نہیں بابو جی" اس نے پھر افسردہ سا ہو کر جواب دیا اور دلیل پیش کی۔
"بیگانے پیالے پیاس نہیں بجھتی"
"پیاس نہ بجھے۔ جی تو بہل جاتا ہے" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ
رکھ کر کہا۔
"کیا ہوا بابو جی۔ بیگانہ بیگانہ ہی رہتا ہے۔ اپنی چیز ہو تو جب چاہو
برت لو"
میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔
ہم دونوں پہلو بہ پہلو باتیں کرتے جا رہے تھے اس کی باتوں میں بے
تکلف خلوص تھا گویا اپنے کسی عزیز دوست سے باتیں کرتا جا رہا ہو مجھے لطف

۔۔۔ا تھا۔اس لئے اس کے دل کی تھاہ لینے کے لئے کہا۔ "تم تو یہ سب باتیں جانتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہیں ضرور آنکھ لڑی ہے۔"

"نہیں بابو جی آپ سے سچ کہتا ہوں۔ ہم ایسے آدمی نہیں۔ واہگرو کا دیا سب کچھ ہے۔ تیس چالیس بیگھے گھر کی زمین ہے ۔۔۔ بس ایک اسی بات کی کمی ہے۔"

ہم اسی طرح باتیں کرتے اسٹیشن تک پہنچ گئے۔

مجھے تو پہلے ہی مسافر خانہ سے پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر اندر جانا تھا۔ اس لئے میں ادھر کو چلا لیکن وہ بھی ہمراہ ہو لیا جیسے میرے ساتھ ہی دیا گیا ہو۔ میں نے اُسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر گھمایا اور دوسرے مسافر خانے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "وہاں جاؤ اور اپنا ٹکٹ خریدو۔"

اس نے اپنے میلے اور پیلے دانت دکھلائے اور عقیدت مندانہ انداز میں پرنام کر کے ادھر کو چل دیا۔

. . . .

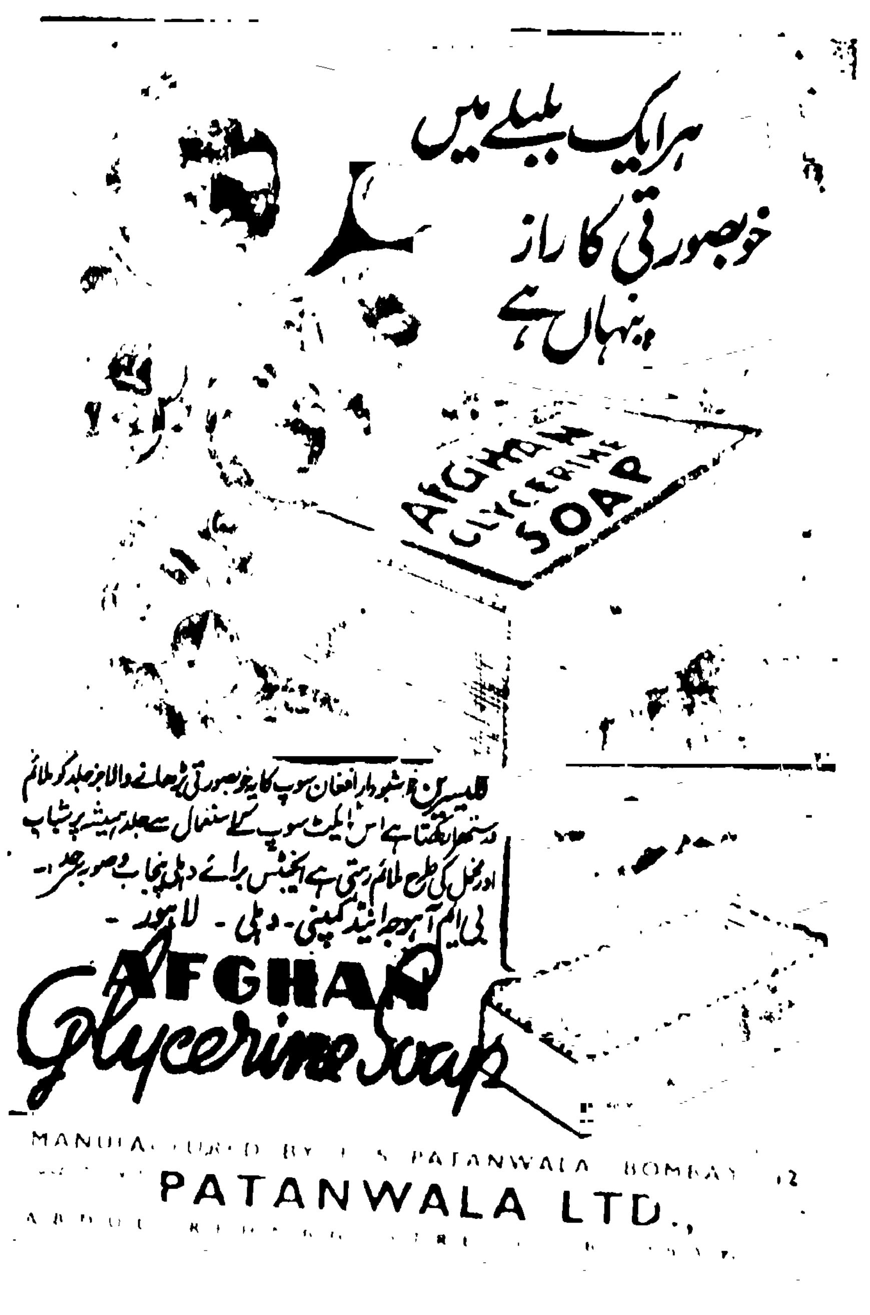
گاڑی آنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ آسمان پر بادل کے ننھے ننھے سفید ٹکڑے تیرتے پھرتے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سردی کا زور کم ہو گیا تھا۔ ٹین کے شیڈ پر جنگلی کبوتروں کا ایک جوڑا مصروف ناز و نیاز تھا اور انجن شنٹ کر رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کی بھیڑ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ میں ادھر اُدھر گھوم رہا تھا اور اپنے خیالات کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک حسینہ اور اس کا خاوند قلی سے سامان اُٹھوائے ہوئے آئے۔ سامان رکھوا کر حسینہ تو ٹرنک پر بیٹھ گئی اور اس کا خاوند ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

حسینہ سے تھوڑے سے ہی فاصلے پر ایک جٹا دھاری لنگوٹ بند سادھو بھبوت رملئے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی گانجے سے سُرخ آنکھیں حسینہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ لوگوں کو اپنے سامان کی فکر تھی۔ جدا ہونے والے احباب سے بہت کچھ کہہ سُن رہا تھا۔ اور گاڑی کا انتظار تھا۔ ایک تارک الدنیا سادھو کو نظارے بازی کا اس سے بہتر اور کونسا موقع مل سکتا تھا۔ وہ حسینہ کی صورت کی طرف دیکھے جاتا تھا اور مسکراتے جاتا تھا۔

میں نے اس کی اس حرکت کو تاڑ لیا اور اپنی شرارت پسند نگاہیں اس کی حریصانہ نگاہوں میں ڈال دیں۔ وہ بے چارہ کھسیانا ہو کر رہ گیا اور شرمندگی مٹانے کے لئے ایک حزنیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولا۔ "بابو جی ناری تو دستو ہی ایسی ہے اس پر تو نارد منی جیسے تپسوی بھی ڈول گئے۔"

وہ اتنا کہہ کر تردید کے خوف سے افق پر دیکھنے لگا لیکن میں اس کی تردید کیسے کرتا جبکہ میں گتھی کو میں بڑی دیر سے سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا اسے اس کے ان الفاظ نے بہت خوبی سے سلجھا دیا تھا۔ میں مسکراتے ہوئے ایک طرف کو چل دیا۔ گاڑی سگنل کے اندر داخل ہو رہی تھی اور میرے دل کی گہرائیوں میں بسنے والی ناری کے خد و خال اُجاگر ہو رہے تھے۔

رہبر بی اے



یاس کا سکون

وہ تذکرے، وہ سہانی کہانیاں تیری
جو خفتہ ہیں مری دنیا کے چاند تاروں کو

مرے عزیز! نہ چھیڑ اب انہیں خدا کے لئے
کہ بکھر رہے ہیں تو بجھنے دے ان شراروں کو

یہ ناز بجھنا بھی دے رہے ہیں اب رہا کیا ہے
یہاں تو نغمۂ دل کی شکست ہو بھی چکی

جس آرزو میں کبھی باقی تھیں امیدیں
وہ آرزو تہِ دامانِ یاس سو بھی چکی

ترے خلوص کے قرباں! ذرا سمجھ تو سہی
یہ زندگی کی کہانی کسے سناتا ہے؟

یہاں تو راکھ بھی باقی نہیں رہی دل کی
تو پھر یہ آگ بتا دے کہاں لگاتا ہے؟

کوئی امید مری جب کبھی نہ بر آئی
تو میرے واسطے اب یاس بھی حرام نہیں

یہ سچ کہ زیست مری نام کی ہے زیست مگر
یہ کہ نہیں ہے کہ میں زیست کا غلام نہیں

برے مزے کی مجھے زندگی ملی ہے اب
نہ اس میں فکرِ تمنا — نہ خوفِ محرومی

مجھے نشیب و فرازِ جہاں سے کیا مطلب!
مری حیات میں ہے موت کی سی معصومی

مرے خیال و نظر کی حدیں اسے نہ ملیں
وہ روح بن کے مری انتہا کو پا نہ سکی

میں جس طرح سے تڑپتا تھا آہ کرتا تھا
وہ اس ادا سے کبھی گیت کوئی گا نہ سکی

یہ سچ کہ سامنے اس کے مری زباں نہ کھلی
مگر سکوت نے سب کچھ اسے بتا ہی دیا

بدل کے آخری آنسو کی شکل میں دل کو
اداس آنکھوں میں لا کر اسے دکھا ہی دیا

مگر عزیزا! — اسے آج تک یہ شکوہ ہے
کہ مجھ سے قیمتِ لطف و کرم ادا نہ ہوئی

اب اس سے کیسے کہوں؟ ذوقِ لذتِ غم سے
مری حیات کو مہلت کبھی ذرا نہ ہوئی

وہ اس یقینِ تباہی کو چھین لے مجھ سے؟
نہیں عزیز مرے! — اب یہ ہو نہیں سکتا

اسی جنوں سے تو پائی ہے میں نے اصلِ حیات
میں زندگی کی حقیقت کو کھو نہیں سکتا

جو خواب میں نے کبھی جاگتے میں دیکھے تھے
نیازِ شوق کے وہ خواب راس آ نہ سکے

مرا نصیب تصور کی حد سے بڑھ نہ سکا
قریب ہو کے بھی وہ میرے پاس آ نہ سکے

مجھے نہ ڈھونڈ کہ سب کوششیں فضول ہیں اب
ملے گی تجھ کو نہ پژمردہ پھول سے خوشبو

بہانہ اشک مری مرگِ روح و دل کے لئے
مرے جہاں میں ہے بے سود شغلِ ہاؤ ہو

اور اب تو بے حسی اس درجہ بڑھ گئی ہے عزیز!
خبر نہیں ہے کہ مرتا ہوں میں کہ جیتا ہوں!

سکونِ یاس کی کیا پوچھتا ہے! رہنے دے!
بس اک شراب سی پیتا ہوں۔ خوب پیتا ہوں!

حیات مجھ پہ ہے اک جبرِ فطرتِ معصوم
میں جانتا ہوں مگر ڈھنگ صبر کرنے کا

کسی کی یاد کو سینے میں دل بنائے ہوئے
بہانہ ڈھونڈتا پھرتا ہوں اپنے مرنے کا

مخمور عثمانی

غزل

تو میرے سامنے ہنس، چشم کو پُر آب نہ کر
قرار دے مجھے مجبورِ اضطراب نہ کر

زبان دے کے تماشائے اضطراب نہ کر
الم نصیب کو غم چھین کر خراب نہ کر

نظر اٹھا کے غریقِ خُمِ شراب نہ کر
خرابِ گردشِ افلاک کو خراب نہ کر

گل و گہر تو تری خاکِ پا سے کمتر ہیں
تو اُن کو شاملِ آرائشِ شباب نہ کر

جو دیکھتے ہیں تری آنکھ کو تو کہتے ہیں
ہمیں تباہ اب اے جانِ انقلاب نہ کر

یہ کہہ رہی ہے تری شانِ مغفرت تجھ کو
گناہگار کو محشر میں لاجواب نہ کر

تو دیکھ رحمتِ عالم پناہ کا عالم
مرے گناہوں کا اے لم یزل حساب نہ کر

سرور و کیف بنا ہر نماز کو واعظ
نہیں یہ تاب تو پھر مے سے اجتناب نہ کر

نبرد گاہ میں آ، دل کو مدرسے سے ہٹا
یہ شیرِ حق ہے اسے کرمکِ کتاب نہ کر

علاجِ تشنگیٔ دل نہیں جمال کے پاس
دیارِ آئینہ میں جستجوئے آب نہ کر

جہاں میں مردِ خود آگاہ کا اصول ہے یہ
تو اپنے خوں میں نہا التجائے آب نہ کر

یہ حسن و عشق میں دائم ٹھنی رہے یا رب
ہمیں شکست نہ دے اُس کو فتحیاب نہ کر

یہی کلیدِ درِ خُلدِ شادمانی ہے
نظیرؔ ترکِ غمِ ابنِ بُوتراب نہ کر

اصغر حسین خاں نظیرؔ

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

جامعہ ۔ دہلی

احساسِ کمتری۔ یہ مضمون ہمارے دوست شبیر محمد انصاری کا لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے وقت کے ایک نہایت اہم نفسیاتی نکتے پر سلیس انداز سے اپنے خیالات کا اظہار پیش کرکے زبان و ادب کی ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

ڈاکٹر ایڈلر نے انقلاب آفریں نظریات پیش کئے ہیں۔ فرائڈ نے اپنے مشہور تجزیۂ نفس کے ذریعے انسانی ذہن اور کردار کی مختلف پیچیدگیوں کو جنسی اثرات کے تابع قرار دیا اور ایڈلر نے ہماری بہت سی کامیابیوں اور ناکامیوں کا منبع ایک عجیب و غریب کیفیت کو مانا ہے جسے وہ احساسِ کمتری کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ مقالۂ زیرِ نظر میں ایڈلر کے اس نظریے کی تشریح اور توضیح کی گئی ہے۔

صاحبِ مضمون نے سب سے پہلے بچے کے جذبات و احساسات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری جذباتی زندگی کی تکمیل طفولیت کے ابتدائی ایام ہی میں ہو جاتی ہے اور بچے کا دماغ اپنے ماحول سے مخالفت یا ہمدردی کے ایسے مختلف تاثرات قبول کر لیتا ہے جو ان مٹ ہوتے ہیں۔ یہ تاثرات نشوونما حاصل کرکے زندگی کی آنے والی منزلوں میں ابھرتے ہیں اور انسان کے کردار اور خصلت کی تعمیر میں حصہ لیتے ہیں۔ ویسے تو کمتری کے احساس کا بچپن کی بے چارگیوں کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن تربیت کی بعض غلطیاں اور ماحول کی ناسازگاریاں اس احساس کو تیز تر اور پائندہ تر کر دیا کرتی ہیں۔

"بہت سے ترقی پسند ادیبوں کا خیال ہے کہ ہمارے موجودہ زمانے کی نصف سے زیادہ برائیاں اس بات کا نتیجہ ہیں کہ مرد اور عورتیں دیسے

ہوتے ہیں جنہیں خوشبختی کا ... حاصل نہیں ہوتی اور ... بھیڑوں کی طرح ہانک دیا جاتا ہے۔ اسی لئے ہر ... میں ... پیدا ہو سکتے ہیں۔

کسی بچے کی جسمانی کمزوری یا نقص اس کے ذہن میں کمتری کا شدید احساس پیدا کر دیتا ہے اور وہ اپنے ہمجولیوں میں کھویا کھویا سا نظر آنے لگتا ہے۔ بعض والدین کی ... اور اس سے پیدا ہونے والی ذلت کا احساس اس کی زندگی تلخ کر دیتا ہے۔ ایسے موقع پر اسے عزتِ نفس اور خودداری کی تعلیم نہ دی جائے تو پھر یہ احساس عمر بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور زندگی کی اکثر ناکامیوں کا موجب بنتا ہے۔

بعض بچوں کو بڑے لاڈ پیار اور احتیاط سے پالا جاتا ہے۔ نتیجتاً نہ صرف وہ اپنی ہر ضرورت کے لئے دوسروں کا سہارا لینے کے عادی ہو جاتے ہیں بلکہ اس اہمیت کو جو انہیں اپنے محدود اور تنگ ماحول میں حاصل ہوتی ہے پھیلا کر سوسائٹی کے وسیع تر ماحول پر عائد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب لازمی طور پر وہ اس غلط کوشش میں ناکام رہتے ہیں تو ان پر اپنی ناقابلیت کا ایک نہایت تلخ انکشاف ہوتا ہے، جو انہیں مدۃ العمر کمتری کے ایک عذاب ناک احساس میں مبتلا رکھتا ہے۔

بدقسمتی سے اگر ڈرے ہوئے بچے کو اپنی زندگی آپ بنانے پر حالات مجبور کر دیں اور اس کے لئے جرأت اور سرگرمیٔ عمل کی ضرورت ہو تو اکثر نوجوان ایسے وقت میں شکستہ دل اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں ایسے حالات کے لئے تیار ہی نہیں کیا گیا۔ جس دنیا کے وہ باشندے تھے وہ دنیا اس کشمکش کی دنیا سے

بالکل الگ تھلگ تھی۔ چونکہ وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ ہتھیار ڈال دیں۔ زمانے کے چیلنج کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ چند ناکام کوششوں کے بعد وہ اپنے آپ کو اس بدترین گروہ کا ایک فرد سمجھنے لگے ہیں جو ہمارے سماجی نظام میں بہت سی مشکلات کا موجب بن چکا ہے۔ سماجی طفیلی، دغاباز، اور راتوں کو نقب لگانے والے، ڈاکو، جواری، منشیات کی ناجائز فروخت کرنے والے وغیرہ وغیرہ سب اسی گروہ کے افراد ہوتے ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں سے بھاگے ہوئے نوجوان مرد اور عورتیں اسی راستے پر چلنا اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں، کیونکہ سماجی زندگی میں تو انہیں اخلاقی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ بحیثیت ایک رکن ہونے کے سوسائٹی ان سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنی بقا کے لئے جرأت اور ہمت سے کام لیں اور یہی جوہر ان میں مفقود ہوتے ہیں۔ شراب خانوں اور بدمعاشی کے اڈوں پر جا کر وہاں کے آنے جانے والوں کا نفسیاتی تجزیہ کیجئے، آپ کو وہاں شریفوں اور نجیبوں کے نور نظر اور چشم و چراغ ملیں گے جنہیں لاڈ نے تباہ و برباد کر دیا۔ جو زندگی کے میدان سے اس لئے بھاگ نکلے کہ وہ مصائب اور مشکلات کا مقابلہ نہ کر سکے اب وہ آرام سے بیٹھے زندگی بسر کر رہے ہیں“

جسمانی نقائص کا احساس، بے جا لاڈ پیار، اور بدسلوکی خواہ وہ والدین کی طرف سے ہو یا اُستاد کی جانب سے بچے کی سیرت پر ایک تباہ کن اثر ڈالتی ہے اور وہ عمر بھر ایک شدید ذہنی عذاب میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کے علاوہ غیر معمولی طور پر ہوشیار بچے جن سے اُن کے ہم جماعت حسد کے باعث قطع تعلق کر لیں یا ایسے بچے جن کی تربیت میں سختی برتی جائے اور جن کی خود اعتمادی جبر اور توہین کی تاب نہ لا کر فنا ہو جائے یا پھر ادنیٰ گھرانوں کے وہ بچے جو اچھی تربیت کے باوجود بڑے ہو کر اپنی سماجی پستی سے واقفیت حاصل کریں، احساس کمتری کے یقینی طور پر شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض نہایت قابل لوگ بھی مجالس اور محفلوں میں کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، اور بعض بڑے آدمی اپنے غریب رشتہ داروں سے گریز کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی نقائص یا سماجی کمتری کا احساس زندگی بھر ایک الم ناک وہم میں مبتلا رکھتا ہے۔ اسی طرح بعض وہ لوگ جو کبھی کوئی خاص قصور یا جرم کر بیٹھے ہوں یا کسی ناقابل بیان راز کو سینے میں دبائے پھرتے ہوں، یا کسی معاشرتی حادثے مثلاً محبت میں ناکامی، دولت کی بربادی، یا وجاہت کی شکست سے دو چار ہو چکے ہوں، اپنے گذشتہ واقعات و حالات سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ اُن کے دل و دماغ ہمیشہ کے لئے فروتری کا احساس قبول کر لیتے ہیں۔ آپ بعض ایسے اشخاص کو بھی جانتے ہوں گے جو ذرا سی بات کو اپنی بہت بڑی توہین سمجھ لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی انانیت ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کر سکتی مگر ان کی ہمت ان کے عزائم کا ساتھ نہیں دیتی۔ نتیجتاً وہ ایک پیچیدہ قسم کے احساس فروتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی زود رنجی ان کے اس ابتلا کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔

بچپن کی غلط تربیت سے جو ناقص احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے بعض اپنے اظہار کی بڑی دلچسپ صورتیں اختیار کرتے ہیں اور یہ صورتیں گویا ہیں احساس کمتری کے مختلف مظاہر ہیں۔ مثلاً کسی خاص مقصد کے بغیر سرگرم اور مضطرب نظر آنا۔ سوسائٹی میں لوگوں سے آنکھیں چرانا۔ کسر نفسی، سریع الحسی، سطحی پن، کم گوئی، بسیار گوئی اور عیب جوئی۔

بے مقصد اور اضطراب آمیز سرگرمی سے ہمیشہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص اس خوف میں مبتلا ہے کہ اُسے کچھ زیادہ کام کرنا چاہئے تھا جو اس سے ہو نہیں سکا یا اس سے کوئی ایسا قصور سرزد ہو چکا ہے جسے وہ سرگرم کار رہ کر بھلانا چاہتا ہے۔ بعض اوقات یہ خوف تحت الشعور میں ہوتا ہے، لیکن اس کے نتائج اور اثرات میں کمی نہیں آتی۔ ایک مسلسل بے چینی اور اضطراب اور بعض دفعہ بے خوابی فرد پر غالب آ جاتی ہے اور وہ احساس کمتری کی ایک شدید صورت کا شکار ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں کو زندگی میں کبھی کوئی تلخ سماجی تجربہ ہوتا ہے اور وہ اپنا ایسا شدید اثر اُن کے ذہن پر چھوڑ جاتا ہے کہ پھر وہ ہر قسم کی سماجی دلچسپیوں اور مجلسی ہنگاموں سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔ وہ پبلک میں ظاہر ہونے سے اس قدر گھبراتے ہیں گویا اُن کا دم نکل جائے گا۔ ایسے لوگ ہجوم والے مقامات حتیٰ کہ بارونق بازاروں میں سے بھی گذرنا پسند نہیں کرتے۔ احساس کمتری کا یہ ایک بڑا دلچسپ اظہار ہے۔

خورده گیری اور عیب جوئی کی عادت بھی فروتری کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اکثر اوقات اپنے عیب چھپانے کے لئے بلکہ ان کے احساس کو دبانے کے لئے دوسروں کے عیب ڈھونڈے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل عادت سی بن جاتی ہے۔ بعض لوگ دنیا کی ہر چیز سے بیزار رہتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے اس احساس کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو سوسائٹی کا ایک مفید حصہ نہیں بنا سکے۔ یہ احساس بھی درحقیقت فروتری کا احساس ہے۔ ایسے نقاد جو ہر چیز کے برے پہلو کو نمایاں کرتے ہیں اور اپنی تنقید میں کوئی تخلیقی عنصر داخل نہیں ہونے دیتے شدید طور پر کمتری کے احساس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ چھوٹے قد کے آدمی

موقعوں پر باتیں کر سکتے ہیں۔ کم ظرف لوگ جب کبھی اپنے سے کسی قابل تر آدمی سے ملتے ہیں تو بڑے اہتمام اور تکلف سے گفتگو کرتے ہیں۔ اکثر کم رو عورتیں لباس نہایت بھڑکیلا اور شاندار پہنتی ہیں۔ جسمانی طور پر کمزور مرد اور عورتیں عموماً بڑی ڈانٹ ڈپٹ سے گفتگو کرتے ہیں۔ کئی لوگ اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں بلکہ بعض تو خود کو یکتا خیال کرتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح جیسے اُن کی مائیں انہیں بچپن میں سب بچوں سے زیادہ خوبصورت اور ذہین سمجھتی رہی تھیں۔ یہ سب احساس کمتری کی کسی نہ کسی صورت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ صحیح دماغ لوگ اپنے آپ اور اپنے سے کم یا زیادہ رتبہ رکھنے والے لوگوں میں چنداں فرق نہیں سمجھتے۔ لیکن وہ لوگ جو دوسروں سے نفرت کرتے ہیں اور اسی بنا پر اپنی یکتائی کا دعویٰ رکھتے ہیں درحقیقت ایک زبردست احساس کمتری کا شکار ہوا کرتے ہیں۔ جرمنی کی یہودی دشمنی ایک قومی پیمانے پر اسی احساس کمتری کا اظہار ہے۔ بیویوں پر ظلم و جبر کرنے والے شوہر، گالیاں دینے والے آقا اور بات بات پر سزا دینے والے باپ اسی گروہ کے افراد ہیں جو اپنی اندرونی کمزوریوں کے احساس کا اظہار جبر و تشدد کے پیرائے میں کرتے ہیں۔

احساس فروتری درحقیقت ایک قسم کا وہم ہے اور واہمے کیونکہ اوہام ہماری شخصیت کا حصہ نہیں ہوتے اس لئے انہیں اپنے سے جدا کر دینا ناممکن نہیں ہے۔ کوشش یہی ہونی چاہئے کہ وہم آپ کے دل و دماغ پر قابو نہ پالے۔ ورنہ نتیجہ عموماً برا ہوتا ہے پہلے پہل جب آدمی وہم سے جنگ آزما ہوتا ہے تو اس کے اعصاب میں ایک تھکن سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جو بڑھتے بڑھتے ضعف اعصاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ دراصل ایک روحانی بیماری ہے۔ عوام اس کا جسمانی علاج کرتے ہیں مقویات کا استعمال صحت افزا مقامات کی سیر آفتابی غسل وغیرہ اس وقت تک مطلق فائدہ نہیں دے سکتے جب تک کہ بنیادی ذہنی خرابیوں کا ازالہ نہ کیا جائے۔

> ایک شخص خواہ وہ جج ہو یا ڈاکٹر، وزیر ہو یا معمولی دہقان، بہرحال اپنے لئے اپنے ذہن میں ایک خاص معیار اپنی زندگی اور حلقہ اثر کے متعلق قائم کرتا ہے اور اس کا برقرار رکھنا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ محسوس کر لیتا ہے کہ اس کی خواب کی دنیا تباہ ہو رہی ہے یا وہ اپنا اثر کم ہوتا دیکھتا ہے تو اس تذلیل اور اپنی شکست کا احساس اس کے اندر ایک جذباتی کشمکش پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ اعصابی کمزوری اور جسمانی طاقت ... ہوتا ہے بعض حالات میں یہ کشمکش اس قدر خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ شخص زندگی کی حقیقت سے خوف زدہ ہو کر دیوانہ ہو جاتا ہے یا خودکشی کر کے ہی مخلصی پا سکتا ہے۔

احساس فروتری کی ایک اور اہم خصوصیت زندگی کا تعطل اور اس تعطل سے پیدا ہونے والے عوارض ہیں۔ نکمے، نشہ باز، دوسروں پر بوجھ بننے والے اور بازافشاں کر کے روپیہ لینے والے لوگ جان بوجھ کر ایسے نہیں بنتے۔ ان کے دل زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور انہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہتا۔ ایسے لوگ جو اپنے قریب ترین ماحول میں بے حد قدر و قیمت رکھتے تھے لیکن جب وہ دنیا کے بازار میں داخل ہوئے تو ان کی قابلیت کے کوئی دام نہ اٹھے۔ یا ایسے لوگ جو ہمیشہ ایک رسوا کن ماحول میں گھرے رہے، زندگی اور اس کی ممکنات سے مایوس ہو کر ایک بے کار سی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی حال بعض ایسے لوگوں کا ہوتا ہے جو کاروبار یا عشق میں ناکامی کو شدید طور پر محسوس کرتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو مایوسی کی آغوش میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ توہم پرست لوگ جو قوتِ بازو کی بجائے سحر، منتر اور ٹوٹکوں کے ذریعے کاربرآری کرنا چاہتے ہیں۔ احساس فروتری کی ایک اور دلچسپ مثال پیش کرتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر صاحب مضمون احساس کمتری کا افادی تجزیہ کرتے ہیں۔ اور اس کا علاج پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ احساس کم و بیش ہر فرد بشر میں پایا جاتا ہے لیکن اصل چیز احساس نہیں بلکہ اس کے متعلق ہمارا رویہ ہے۔ اگر ہم اس پر اپنا تسلط جمالیں تو ہمیں زندگی کی کوئی مشکل آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ اور اگر ہم اسے اپنے آپ پر مسلط کر لیں تو پھر ہمارے جسمانی اور ذہنی قویٰ کا جو حشر ہوگا وہ ناگفتہ بہ ہے۔ انہوں نے مصنف خود، مہاتما گاندھی اور پریذیڈنٹ روزولٹ کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اوّل الذکر بہرے، ثانی الذکر جسمانی طور پر کمزور اور آخر الذکر بھی اوائل عمر میں جسمانی عوارض کا شکار تھے۔ لیکن دورِ حاضر کے ان تینوں مجاہدوں نے فروتری کے احساس پر غلبہ پا کر دنیا کی تاریخ پر اپنی مہریں ثبت کر دیں۔ آدمی کی اصلی خوبی اس کا ذاتی جوہر اور کمال ہے۔ قدرتی نقائص اور جسمانی عیوب کا اس کی شخصیت یا احساسات پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ انسانی برادری کا ایک مفید فرد بننا، دوسروں کے کام آنا اور سماج میں تعاون اور اشتراک سے اپنی جگہ پیدا کرنا کامیاب زندگی کا راز ہے اور احساس فروتری کا سب سے موثر علاج۔ انسان کو اپنے سامنے بلند لیکن قابلِ عمل نصب العین رکھنا چاہئے۔ خوابوں کی دنیا میں رہنے کا خمیازہ اکثر نہایت تلخ بیداری کی صورت میں اٹھانا پڑتا ہے۔ احساس کمتری کو دور کرنے کا ایک نہایت مفید طریقہ محاسبۂ نفس ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے نفس

کا محاسبہ کرنا چاہئے اور احتساب کے بعد نگاہ زندگی کے روشن پہلو پہ رکھنی چاہیئے۔ ہم میں سے ہر ایک میں بہت سی خوبیاں اور صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اگر ہم خوف، حسد، اور فرار کی عادتیں ترک کرکے خود کو سماج کا ایک مفید رکن بنانے کی کوشش کریں تو کمتری کے احساس پر بہت جلد غالب پالیں گے اور پھر ہماری زندگی کا روشن پر زور اور پاکیزہ دور شروع ہو جائے گا۔

جیسا کہ صاحبِ مضمون نے خود اعتراف کیا ہے، ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی حد تک احساسِ کمتری میں مبتلا ہے، نہ صرف افراد بلکہ اقوام بھی اس لعنت میں گرفتار ہیں، فرائڈ اور ایڈلر نے فردی نفسیات کا تجزیہ کیا اور اس احساس کو ہماری بہت سی پستیوں کا ذمہ دار گردانا لیکن حکیمِ مشرق کی نگاہِ دور رس نے قوموں کے عروج و زوال میں بھی اسی احساس کی کارفرمائی دیکھی۔ اقبال کا فلسفۂ خودی احساسِ کمتری کے لئے پیغامِ موت ہے۔ اور اس کا مخاطب نہ صرف فرد بلکہ ایک پوری قوم ہے۔ وہ بار بار ہمیں خود شناسی کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ہر لحظہ ہمیں خودی کو بلند کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اس کا ہر نفس ایک شعلۂ آتشیں ہے جو کمتری کے خس و خاشاک کو پھونک کر رکھ دیتا ہے۔ وہ برملا کہتا ہے ؎

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو۔
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

یہ اور بات ہے کہ ہم گم کردہ راہ لوگوں کی نگاہیں اس وادی میں بھی رہبر کی تلاش میں اٹھتی ہیں تو افقِ مغرب کی طرف ...... اور یہ بجائے خود احساسِ کمتری کی ایک نہایت روشن مثال ہے۔

ادبِ لطیف - افسانہ نمبر

شیر گل - جناب ابو سعید قریشی کے اس چھوٹے سے مطالعے میں ژرف نگاہی اور خوش بیانی کے بہت سے جواہر ریزے بکھرے نظر آتے۔ شیر گل ایک مردِ آزاد ہے جو سرحد پار کی آزاد سرزمین سے غلام آباد ہند میں روزی کمانے آنکلا ہے وہ ایک چھوٹے سے پہاڑی جنگل کا محافظ ہے۔ جنگل میں کشمیری مزدور اور چند پنجابی کاریگر مقیم ہیں اور ان کے اوپر ٹھیکیدار کا پنڈت منشی ہے۔ جو کشمیری الاصل ہونے کے باوجود ان انسان نما بھیڑوں کے گلے پر ایک شکاری کتے کی طرح مسلط ہے۔ پٹھان چوکیدار سے اس کی نہیں بنتی اور ان دونوں میں اکثر نوک جھونک رہتی ہے۔ شیر گل کی فطری آزادی، درشتی، اور وسیع النظری کشمیری مزدوروں کے غلامانہ توکل، اور بزدلانہ مسکنت کے پس منظر پر خوب کھلتی ہے۔ دیکھئے:-

"اور جب میں نے اسے ایک کشمیری گانے کا مطلب سمجھایا جسے وہ اکثر رات کے وقت الاؤ کے گرد بیٹھے ایک ٹوٹے ہوئے کنستر کی تال کے ساتھ گایا کرتے، تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ گانا یہ تھا:

زعفران کے کھیتوں میں بہار آگئی۔ کلیاں چٹکیں اور پھول بن گئیں۔ آہ ہمارا پسینہ انہیں نمی پہنچاتا رہا لیکن عنقریب وہ ٹھیکیدار کے مل پہنچ جائیں گے ——— دیکھ لو صمد و بھائی، انہیں جی بھر کے دیکھ لو، کیونکہ یہ چند دنوں کے مہمان ہیں"

"گانے کے آخر میں ان کی آواز ایک لمبی "ہو" کی شکل اختیار کرلیتی، جیسے کئی ایک گرسنہ بھیڑیے ہم آواز ہو کر آسمان کی طرف منہ اٹھائے چیخ رہے ہوں۔ الاؤ کی روشنی میں ان کے سر جو اخروٹ کھا کھا کر گنجے ہو چکے تھے۔ انڈوں کی طرح چمکا کرتے اس تپے موئی کو وہ دن کے وقت گول گول کٹوروں ایسی ٹوپیوں سے ڈھانپ چھوڑتے، اور عام طور پر انہیں وضو کرتے وقت ہی اتارتے۔ اور وضو کے بعد ان کی پیشانی کے محراب اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتے ——— محراب، ان کے سجدوں کے نشان، عقیدت کی مہریں جن کے متعلق خوش عقیدہ لوگوں کا خیال ہے کہ قیامت کے دن یہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکیں گے ——— بظاہر انہیں اس دنیا کی نسبت اپنی عاقبت کا زیادہ خیال تھا" ——— وہ مریل سے نظر آتے، اور ان کے چہروں سے ان کا "تن بہ تقدیر" ہونا ٹپکا کرتا۔

——— "تن بہ تقدیر" ——— بے عملی کا بہانہ ——— نامردوں کا فلسفہ۔ اگر شیر گل کی قوم اس فلسفے پر عمل کرتی تو وہ اب تک مٹ چکی ہوتی۔ غلام نظر آتی۔ "شبھدا" وہ کہا کرتا "یہ لوگ مرد نہیں مردہ ہے"۔

اور شیر گل جس کی متانت بعض دفعہ اداسی کی حد تک پہنچ جاتی۔ ایک اکھڑ سی حسِ مزاح بھی رکھتا تھا۔

"جب کبھی اُسے موقعہ ملتا، وہ مشہور پنجابی مقولے "کہنا بیٹی کو اور سنانا بہو کو" پر عمل کرتے ہوئے اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کسی رحیم جُو یا نبیر جُو سے مخاطب ہو کے کہتا:"

"او رحیم جو، دیکھو مونچھ مرد کا نشانی ہے جس کا مونچھ نہیں وہ مرد نہیں" اس پر پنڈت جس کی مونچھیں چٹ تھیں لیکن

جو شیر گل کی نیلی آنکھوں سے ٹپکتا تھا۔ جسم کو کوڑ دیتا تھا!
دیکھو نہ پہنو ناروں میں قیمت حاصل نہ کرو۔ خاموشی سے اپنا کام
کئے جاؤ۔ لیکن ایک آہ بھر پہلے تنہ۔ جب ناگ پھٹا دیتا ہے؟"

ہندوستان کے کوہستانی مقامات جہاں اپنی گل پوش وادیوں اور جنت نما سبزہ زاروں کے لحاظ سے معروف ہیں وہاں اپنے حسن انسانی کے لحاظ سے بھی کچھ کم مشہور نہیں لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہی حسن یہاں کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ صدیوں کی غلامی اور غلامی سے پیدا ہونے والی ذلت نے غیرت اور محبت کے احساس کو بھی کچل دیا ہے۔ صاحب فن افسانہ نگار نے قلم کی ایک ہی جنبش سے آزادی اور غلامی کی تصویر کے دو مختلف نمونے سامنے یوں پیش کئے ہیں:

"دو لمبے ہوتے گال اور وہ لال انگاروں کے سے مہر جیسی موتی موتی سیاہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر مندروں کی دیواروں پر سجی ہوئی چھوٹی تصویریں یاد آجاتیں اور جنہیں دیکھ کر پنڈت کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ سی چمک پیدا ہو جاتی اور وہ کہتا ابھی بالک ہے۔ ایک دن [illegible] آتا ہے کہ اُنھیں مرگ نہیں آتا تھا [illegible] پنڈت کی چھاتی کا [illegible] کو دیکھ کر شیر گل کہا کرتا "تم اس حدت کا تشدد دیکھو اور اس کا کرتوت دیکھو ...." اور ایک [illegible] کے ساتھ وہ اپنے گرد کا ایسا گھیرا تنگ کرتا اور وہیں پی جاتا جیسے وہ اپنا [illegible] ہی گیا ہو .. . یہ عورتیں کوئلے سے بھری موٹر میں لاد کر پنڈی یا کسی شہر میں پہنچا دی جاتیں اور رات قریب قریب ایک [illegible] ہو چکی تھی کہ یہ کونڈ والیاں اکثر نوجوان رومان پرست زمیں زادوں کا شکار ہو جاتی تھیں جو اس علاقے میں صرف [illegible] کو منظر کرانے آتے تھے اور اپنے پیچھے گمنام ہیروں کے [illegible] چھوڑ جاتے تھے —— یہ لوگ حرب کی پاکیزگی، ہواؤں کی لطافت، آبشاروں کے [illegible] نغموں کے ترنم اور وادیوں کی وسعت سے آشنا تھے، اور جن کی زندگی کا مقصد صرف ہوائی جذبات کی تسکین تھا ——"

اور اب قبل اس کے کہ تصویر کا دوسرا رخ آپ کے سامنے آئے ذرا منظر نگاری کا انداز دیکھئے:

"جنگل کے اختتام پر ایک بلند چٹان سے ہم وادی کا نظارہ کیا کرتے —— وہاں کے سبز کھیت یوں نظر آتے جیسے کسی ہیبنے کے محل کی سیڑھیاں اور مکئی کی سنہری داڑھیوں والی فصل جیسے پگھلا ہوا سونا اور پھر وہ سفیدے کے درخت اور مٹی کے گھروندے اور جھیل چاندی کی طرح بہتا ہوا سانپ سا لگتا تھا —— سارا منظر گویا خواب کا منظر تھا جیسے کسی چابکدست مصور نے رنگوں کے چھینٹوں سے ایک دیدہ زیب تصویر بنا دی ہو۔"

اور اس منظر کا فائدہ اٹھا کر چابکدست افسانہ نگار ہیرو کے اس [illegible] عمل کیسی خوبصورتی سے دکھاتا ہے:

"شیر گل اس چٹان پر کھڑا اکثر اپنی لمبی بانہہ کو اپنے گرد [illegible] کی جنبش دیتے ہوئے کہتا:

"یہ دنیا کتنی وسیع ہے ..... ساری عمر چلتا رہے پھر بھی ختم نہ ہو!"

کیسا سادہ مگر کتنا پرزور اور کس قدر سچا تصور! انسان کا وہ ابتدائی جذبہ جس نے صبح تاریخ کے دھندلکے میں تسخیر عالم کی عظیم الشان مہم پر روانہ کیا تھا۔

—— اور اب گریز ملاحظہ ہو:

"اور اس چٹان پر بیٹھے اس کا تخیل اُسے ان سبز پوش وادیوں اور دلفریب مناظر سے دور اُس کے دیس کی برہنہ چٹانوں اور [illegible] سے نہیں [illegible] سے پاک فضا میں لے جاتا۔ جہاں محبت ایک مقدس کھیل ہے اور حسن رسوا نہیں —— "بخدا" وہ کہتا "تمہارا وطن [illegible] وہ چشم غزال ہے کہ جس کے غزال بھی اس کے مقابلے میں نہ ٹھہرتے ...... لیکن کیا مجال جو کوئی نظر بد سے دیکھ پائے۔ پھر وہ ان دوشیزاؤں کے قصے سناتا جو اپنی عزت کو بچانے کے لئے بن میں [illegible] جاتی ہیں۔ جو رائفل کندھے پر ڈالے اکیلی بکریاں چراتی ہیں، جن کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا اور جن کے خنجر کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔"

اور آخر وہ سنگ زادہ اس وادی کی مسحور کن اور خواب آور فضا میں زیادہ ٹھہرنے کی تاب نہ لایا اور ایک دن

"جب میں سیر سے کچھ دیر کر لوٹا تو شیر گل اپنے بستر کا سہارا لئے راستے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جا رہا ہے۔"

"کدھر جاؤ گے" میں نے پوچھا۔

"دنیا بہت وسیع ہے" اس نے جواب دیا "مرد کا بچہ کہیں نہ کہیں [illegible] .... شاید پھر کہیں ملے گا۔ دنیا ....!"

یہ ..... گئے وہ صدیں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور آخر لاشا
بھی کتنا بھونکیلا تھا اُس کے آخری الفاظ دیر تک میرے کانوں میں
گونجتے رہے اور اب بھی جب کبھی میں اس جگہ جاتا ہوں جہاں وہ
محو ..... ہوا تھا تو میرے کانوں میں وہی صدا آتی ہے۔ "دنیا
بہت دکھی ہے"۔

مجھے اس کی صدائے بازگشت اب تک وہاں تیرتی ہوئی۔

آپ نے دیکھا فن کار نے ایک ہی تصویر میں فطرت نگاری تاثر پیمائی اور نفسیاتی مطالعے کے کیسے مختلف، گہرے اور خوش آئند رنگ بھرے ہیں۔ جو نہ صرف ایک دوسرے کے برعکس انداز ہیں بلکہ اپنے مقابل کو ابھارتے ہیں۔ شان و بیان کی خوبی نے اس مطالعے کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ تشبیہات کی نزاکت کی ایک دو مثالیں آپ نے ان اقتباسات میں ملاحظہ فرمالیں۔ ایک آدھ اور دیکھئے۔ مزدوروں کا حلیہ بیان کیا جا رہا ہے۔ "ان کے چہروں کی جھریاں ان راہوں کی طرح تھیں جن پر ان کی زندگی کی گاڑی دھنستی چلی گئی تھی"۔ ایسی خوفناک تشبیہ اپنی حقیقت اور شدت کے لحاظ سے ہمارے ادب میں یقیناً بے مثل ہے اور آرٹسٹ کی نزاکتِ احساس کی ایک نہایت روشن نظیر۔ افسوس ہے کہ زبان کی بعض لغزشیں بھی اس نفیس مطالعے میں نظر آئیں۔ مثلاً "پانی کوئی ہفتہ بھر کی جھڑی کے بعد کھلا تھا"۔ "وہ کھسیانہ ہو کر وہاں سے کھسک جاتا"۔ "بہ نسبت" کی بجائے صرف "نسبت" وغیرہ وغیرہ۔ امید ہے کہ فاضل افسانہ نگار اپنی آئندہ تحریروں میں زیادہ احتیاط سے کام لیں گے۔

صلاح الدین احمد

مندرجہ ذیل نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے:۔

(۱) بوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت است — عطاء اللہ سجاد (ہمایوں)

(۲) طلوعِ آفتاب — امین حزیں سیالکوٹی (عالمگیر)

(۳) ایسا کیوں ہوتا ہے — سلام مچھلی شہری (ادبِ لطیف)

بظاہر اردو شعراء کے دو بڑے گروہ اس وقت ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ اپنے کو ترقی پسند سمجھتا ہے اور اس کی اس تقسیم سے باقی تمام شاعر دوسرے گروہ میں آجاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے شاعر ترقی پسند نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے گروہ میں تالاب کو گندا کرنے والی مچھلیاں دوسرے گروہ کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ اس گروہ میں ایسے شعراء کی کثرت ہے جن کے جذبات و خیالات اپنے نہیں جن کے اپنے پاس کوئی خیال ایسا نہ تھا جسے وہ شعر کے ذریعے پیش کرتے اور اس لئے انہوں نے چند تبلیغی باتوں کو جو نثر میں بہتر طریق پر ادا کی جا سکتی تھیں ایک سطحی اور کم و بیش غیر موثر انداز میں ظاہر کرنا شروع کیا ہے۔ لیکن مجھے اس وقت دوسرے گروہ کی کارگزاریوں سے تعلق ہے۔ ان کے کلام میں زندگی محدود ہو کر نہیں رہ گئی۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں فطری تحریکِ شعری کی بنا پر ہی کہتے ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں زندگی کے ایک حقیقت نما بہاؤ کی بے ساختگی ہے۔ عطاء اللہ سجاد سہرا ہے کسی بھکاری لڑکے کی صدا سنتا ہے۔ "عشق دی گلی وچوں کوئی کوئی لنگھدا" اور اس کی ذہانت جاگ اٹھتی ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ ایک زمانے میں وہ بھی اس گلی سے نکلا تھا۔

"میں نے اک بار محبت کی تھی۔
لذت اندوز تھا دل غم کی فراوانی سے۔
زندگی میری عبارت تھی غزل خوانی سے
آہ وہ کیف میں ڈوبے ہوئے دن رات مرے۔
رفعت عرش پہ رہتے تھے خیالات مرے
"سے معلوم کہ میں نے بھی یہ جرأت کی تھی۔
وادیٔ عشق میں پرواز کی ہمت کی تھی"

لیکن اسے احساس ہے کہ "عشق کی راہ میں آتے ہیں بہت سخت مقام" اور اسی لئے اس گلی میں سے گذرنے والے افراد کم ہوتے ہیں۔

"نارسائی مری تقدیر میں تھی۔
ہمسفر چھوڑ گئے ساتھ مرا۔
تھام لیتا ہیں اسے کاش! کوئی ہاتھ مرا"

اور ہاتھ کے تھامنے والے کی ضرورت بھی تھی، کیونکہ

"راہ انجانی، نشیب اور فراز
منزل دور و دراز
تیرگی چار طرف اور بلاؤں کا ہجوم
راہ رو خستہ المناک نواؤں کا ہجوم"

ایسی حالت میں کہ کوئی سہارا نہ ہو یہ کیفیت لازمی تھی کہ

خوفِ ظلم و شدائد سے میں گھبرا ہی گیا۔
تیرے ماتھے پہ عرق آ ہی گیا۔
تھرتھرا پاؤں کی زنجیر بجی
تم نے چھوڑ دیا ساتھ تمناؤں کا۔
تیرا جوشِ سفر ختم ہوا۔
اور اب طاقتِ رفتار کہاں
اب سبک گام مرے شوق کا رہوار کہاں
تم نے بھیجا بھی تو کس وقت محبت کا پیام!

اگرچہ یہ نظم محبت کی ناکامی کا ایک عام نوحہ ہے لیکن اس میں شاعر جس ترتیبِ خیال سے حال کو چھوڑ کر ماضی میں کھو گیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ راستہ چلتے ہوئے شاعر کسی بھکاری لڑکے کی صدا سنتا ہے کہ عشق کی گلی میں سے ہر کوئی نہیں گذرا کرتا۔ ـــــ وہ ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔ گویا سڑک پر ایک تنہا ستون ہو لیکن اس کے ذہن میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا ذہن گویا الٹے پاؤں آہستہ آہستہ اپنے ساتھ ہمیں بھی اس گلی میں لے جاتا ہے۔ جہاں شاید کبھی ہمارا بھی گذر ہوا ہو۔

آخری مصرعے پہ پہنچ کر شاعر کا ذہن نارسائی، تیرگی، بلاؤں کے ہجوم، آلام و شدائد اور لسانی صداؤں سے بیزار ہو گیا اور اس کے آسودہ نفسی پہلو نے پھر ایک کروٹ لی "تم نے بھیجا بھی تو کس وقت محبت کا پیام!" ـــــ یوں قاری کا ذہن جو شاعر کے ساتھ ساتھ اس کے یا اپنے ماضی کی طرف جا کر گذرے ہوئے زمانے کی یاد میں ڈوب گیا تھا یک دم پھر حال میں آن پہنچا۔ حقیقت پرستی کے لحاظ سے یہ پلٹا صحیح نہیں۔ کیونکہ غیر جانبداری سے دیکھا جا سکتا ہے کہ محبت کا پیام فریبِ نفس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یوں فنی لحاظ سے بھی اگر نظم اس مصرعے سے پہلے مصرعے پر ختم ہو جاتی (اور اب طاقتِ رفتار کہاں، اب سبک گام مرے شوق کا رہوار کہاں) تو ایک ایسی لرزتی ہوئی کیفیت پیدا ہو سکتی جو ذہن کو ماضی سے دور لے جا کر تینوں زمانوں کی پابندی سے آزاد کر دیتی اور ان لرزتے ہوئے، ماضی میں کھو جاتے ہوئے سُروں کا اثر زیادہ ہوتا۔

عطاء اللہ سجاد نوحہ کناں تو نہیں لیکن ایک حسرت بھرے انداز سے سوچ رہا تھا کہ محبت کا سورج چھپ گیا۔ لیکن امین حزیں (سیالکوٹی) کا ذہن سورج کی طرف رجوع ہے اُسے ہر روز صبح نکل کر شام کو چھپ جانے والا سورج اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہے۔

اللہ کا فٹ بال فرشتوں نے اچھالا
یا خُم سے نئے نور کا نکلا ہے پیالا
یا اوڑھ کے انوارِ تجلّی کا دوشالا
سر حور نے جنّت کے دریچے سے نکالا

تھا چاند کی کرنوں میں ابھی نور کا دم خم
تاروں میں سے اکثر نہ ہوئے تھے ابھی مدھم
اور پرچمِ سحر نے ابھی کھولا ہی تھا پرچم
سر اپنا سیاہی سے سفیدی نے نکالا

بہیائے افق سے تھیں اُٹھیں نور کی امواج
یہ نور کی امواج تھیں یا نور کی افواج
یلغار کئے آتا تھا پورب کا مہاراج
کرتے ہوئے ظلمت کی صفوں کو تہ و بالا

آتے ہیں جو یہ صبح و مسا ہم کو نظر رنگ
دن رات میں چھڑتی ہے جو یہ شام و سحر جنگ
منظر میں یہ قدرت کے قوانین کی فرہنگ
ہے شرط مگر دل ہو کوئی دیکھنے والا

اقوام کا آغاز بھی [illegible] انجام بھی خوں ہو
ہے ایک جنوں وہ بھی اپنی [illegible]
وہ جذبۂ بے باک ہے یہ حالِ زبوں ہے
[illegible] نے گرایا بھی اُسے جس کو اچھالا

اس نظم میں بعض باتیں قابلِ غور ہیں۔ سورج کو "اللہ کا فٹ بال" [illegible] ایک تجدید ہے۔ اس استعارے کا لطف ہر شخص کو نہ آسکے لیکن اس تشبیہ کا پن ہے اس کی خامی نہیں۔ "سر اپنا سیاہی سے سفیدی نے نکالا"۔ [illegible] "یہ قدرت کے قوانین کی فرہنگ" [illegible] کہا — اپنے زورِ بیان کی دلیل آپ ہے [illegible] نظم میں ایک

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ جولائی ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ نمبر ۷

تصاویر: ۱۔ صبح جوانی ۲۔ شام جوانی۔

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک وردی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا لاہور سے شائع ہوا۔ تصاویر اور ٹائٹل ایلام پریس لاہور میں چھپا۔

دُنیائے کاروبار

اورینٹل انشورنس کی سالانہ رپورٹ

اورینٹل گورنمنٹ سیکورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے مضبوط بیمہ کمپنی ہے۔ گذشتہ مئی میں اس کا پینتیسواں سالانہ جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا جس میں گذشتہ سال کی کارگذاری کی رپورٹ اور حسابات پیش کئے گئے۔ سر پرشوتم داس ٹھاکر داس سی آئی۔ ای جلسے کے صدر تھے۔ اس موقعہ پر صاحب صدر نے ایک فاضلانہ تقریر فرمائی۔

اپنی تقریر کے دوران میں سر پرشوتم داس نے فرمایا کہ سال زیر نظر میں نیا بزنس کچھ کم ہوا ہے تو اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے اہم باعث جنگ کا آغاز ہے۔ جس کے باعث عام بے چینی بڑھ گئی ہے اور لوگ اطمینان سے کسی بات پر غور نہیں کر سکتے۔ دوسرا سبب شاید یہ ہے کہ ملک میں چند ایسے قوانین نافذ ہو گئے ہیں جن کے زیر اثر بعض خاص فرقوں کی آمدنیاں کم ہو گئی ہیں۔ مثلاً ساہوکاروں کی اور اس طبقے سے حاصل ہونے والا بزنس قدرتی طور پر کم ہو گیا ہے۔ ایک اور سبب غالباً یہ ہے کہ نئے ایکٹ کے ماتحت بہت سے ایجنٹ (تقریباً دس فی صدی) اب بے کار ہو گئے ہیں۔

آگے چل کر آپ نے کہا کہ امید افزا بات یہ ہے کہ جنگ کے غیر معمولی اثرات اب آہستہ آہستہ زائل ہو رہے ہیں۔ اور ایسے نئے ایجنٹ بھی بھرتی ہو رہے ہیں جنہیں لائسنس لینے میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔ ایسے حالات میں امید ہے کہ صورت بہتر ہو جائے گی۔ اور بزنس بڑھ جائے گا۔

کمپنی نے ایکٹ کے نافذ ہونے سے پہلے پانچ پانچ سو روپے کی پالیسیاں بھی جاری کر دی تھیں چنانچہ ۱۹۳۷ء میں ایسی چھ ہزار پالیسیاں جاری تھیں اب جدید ایکٹ کے ماتحت یہ بھی بند ہو گئی ہیں۔

کمپنی کا روپیہ با قاعدہ مستند کفالتوں میں لگایا جا رہا ہے اور اوسط آمدنی اس وقت چار روپے چھ آنے فی سینکڑہ ہے۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں کی رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سال زیر نظر میں تقریباً ساٹھ ہزار تجاویز بیمہ کمپنی کے دفتر میں موصول ہوئیں جن میں سے تقریباً چالیس ہزار منظور کی گئیں۔ ان کی مجموعی مالیت پونے آٹھ کروڑ روپے کے قریب تھی اور سالانہ آمدنی بیالیس لاکھ روپے کے قریب۔ اس وقت چار لاکھ سے زائد پالیسیاں جاری ہیں جن کی مجموعی مالیت اسی کروڑ روپے کے قریب ہے۔ اس سال کمپنی نے ڈیڑھ کروڑ روپے کے قریب ایسے مطالبات میں ادا کئے۔ جو پالیسی ہولڈروں کی اموات یا پالیسیوں کی تکمیل کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ اموات کی تعداد پونے تین ہزار کے قریب تھی مرنے والوں میں دو ہزار تین سو ہندو اور دو سو تیرہ مسلمان تھے۔ کمپنی کے اخراجات اور آمدنی کا باہم تناسب ۲۲٫۶ رہا۔ جو نہایت کم ہے اس سال کمپنی نے اپنے حصہ داروں کو ۱۲۵ روپے فی حصہ منافع دیا۔ اور سب ملازمین کو ایک ایک ماہ کی تنخواہ انعام میں دی۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ کمپنی کی پوزیشن بے حد مضبوط اور تسلی بخش ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ قومی کمپنی آئندہ سال اس سے بھی شاندار نتائج دکھائے گی۔

لاہور سیف ڈیپازٹ

آج کل کے ہراس انگیز دنوں میں جان سے زیادہ مال کا خطرہ محسوس کرنے والوں کے لئے لاہور میں ایک دور اندیش کمپنی نے لاہور سیف ڈیپازٹ کے نام سے ایک بہت بڑا اور بے حد مضبوط تہ خانہ بنوایا ہے جہاں پبلک کی قیمتی اشیاء اور کاغذ حفاظت سے رکھے جا سکتے ہیں۔ اس قلعہ نما تہ خانہ کی عمارت نہایت مضبوط ہے جس پر کسی قسم کا بیرونی صدمہ اثر نہیں کر سکتا۔ دروازے نہایت بھاری لوہے کے بنائے گئے ہیں اور اندر ہر قسم کے سیف اور تجوریاں لگی ہیں جو نہایت کم کرایہ پر پبلک کو کرایہ پر دی جاتی ہیں کرایہ دار اپنی مرضی سے دن میں جتنی مرتبہ چاہے تہ خانہ میں جا کر اپنی چیز رکھ سکتا ہے یا لے جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے مفید تہ خانے ہر بڑے شہر میں کھولے جائیں تاکہ لوگ رات کو چین کی نیند سو سکیں۔

لاہور سیف ڈیپازٹ مال روڈ اور میکلوڈ روڈ کے جنکشن پر ادبی دنیا کے دفتر کے پیچھے واقع ہے۔ منیجر صاحب نہایت ہوشیار اور با اخلاق ہیں اور گاہکوں کی ہر قسم کی مدد کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

منیجر


اگر اب گیارہ بجے ہیں
تو یقیناً یہ چائے کا وقت ہے۔ لہٰذا آپ بیٹھ جائیں۔ اور ترو تازہ کرنے والی چائے کی پیالی پئیں۔ صبح کے تھکا دینے والے فرائض کے بعد آپ کو اس کی اشد ضرورت ہے۔ یہ آپ کو پھر سے زندہ کر دیتی ہے۔ کامل آرام کی اس گھڑی میں جبکہ آپ یہ نرم اور خوش ذائقہ چیز پی رہے ہوں دن کے باقی حصہ کے کام کی تجویز سوچ لیجئے۔
چائے کس طرح تیار کرنی چاہئے
دوسرے موقعوں کی اپیل
ہندوستانی
چائے
ہر وقت ہر جگہ پر
K 119



سنِ جوانی



شمبون

بزم ادب

اس دفعہ ہماری بزم میں ایک نوجوان مفکر شریک ہو رہے ہیں۔ نرسیدر ناتھ سیٹھ۔ مفکر میں نے اس لئے کہا کہ ان کی تحریر میں فکر کی پختگی اور سب عناصر پر غالب ہے۔ نرسیدر صاحب نے ایک جامع مضمون ایک ایکٹ کے ڈراموں پر سپرد قلم کیا ہے۔ اور ڈرامے کے جدید نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مضمون اردو میں ایک ایکٹ کے ڈراموں پر غالباً سب سے پہلا مضمون ہے۔ صاحب مضمون نے ایک ایکٹ کے ڈرامے کا ارتقا ایسی خوبی سے بیان کیا ہے کہ کوئی اہم بات نظر سے اوجھل نہیں ہونے دی اور اس کے ساتھ وہ نہایت عمدگی سے ایسی تمام غیر ضروری تفاصیل سے اجتناب کر گئے ہیں جن سے ناظرین کی توجہ موضوع کے مرکز سے ہٹ جاتی۔ نرسیدر صاحب کا یہ سلیقہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے ایک ایکٹ کے ڈرامے کے ارتقا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ اور ادب اور آرٹ میں اس کی اہمیت اور تدریجی ترقی کا جائزہ لیا ہے۔ پھر ذرا تفصیل سے انہوں نے اس صنف کی ٹکنیک بیان فرمائی ہے اور مثالیں دے دے کر اپنے مفہوم کو واضح کیا ہے۔

مضمون کا سب سے مفید حصّہ وہ ہے جہاں انہوں نے اردو میں ایک ایکٹ کے ڈرامے کی ممکنات پر بحث کی ہے۔ اور اس کی مختلف صورتوں کے موجودہ رجحانات واضح کئے ہیں۔ اس ضمن میں آج کل کے ریڈیو ڈراموں کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً ہم سب کی توجہ اور غور کا مستحق ہے۔ ہم اُن کی اس رائے سے پوری طرح متفق نہیں ہیں کہ ہمارے ہاں ایک ایکٹ کے ڈرامے کی سٹیج قائم کرنے کے قوی امکانات ہیں۔ ہماری ناقص رائے میں ابھی ہمارے عوام اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہوئے کہ یہ سٹیج قائم ہو کر زندہ بھی رہ سکے۔ ابھی اس میدان میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ بہر حال ہمیں امید ہے کہ نرسیدر ناتھ صاحب کا یہ قیمتی مضمون نہایت دلچسپی اور توجہ سے پڑھا جائے گا۔

دھرم پرکاش صاحب آنند جو ہندی حلقوں میں پرکاش کے نام سے معروف ہیں، صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند مصنّف ہیں۔ اس شمارے میں آپ ان کا ایک ڈراما نما افسانہ سراب ملاحظہ فرمائیں گے۔ مغرب میں مختصر افسانے نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ بعض ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں جن میں کوئی کردار نہیں ہے۔ یورپین مصنفین افسانوی ادب میں نت نئی راہیں تلاش کرتے رہتے ہیں آنند صاحب کا یہ افسانہ بھی ایک اسی قسم کی کوشش ہے۔ اسے ہم نہ تو افسانہ کہہ سکتے ہیں اور نہ ڈراما۔ بہر حال ہے مزے کی چیز۔ مصنّف نے فن کی کچھ حدود توڑی ضرور ہیں لیکن ان کی یہ بے راہ روی پڑھنے والے کو گراں نہیں گذرتی۔ نفس مضمون کے لحاظ سے یہ ایک بہت اچھا مطالعہ ہے مگر ہماری ناچیز رائے میں جس معیاری ایکٹریس کو انہوں نے پیش کیا ہے وہ ابھی ایک اوسط درجے کے ہندوستانی سٹوڈیو میں ذرا دیر سے آئے گی۔ ممکن ہے کہ آنند صاحب کا تجربہ اس کے خلاف ہو اور جس زاویے سے انہوں نے فلمی زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہاں سے یہی کچھ نظر آتا ہو جس کی عکاسی انہوں نے سراب میں کی ہے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

انتظار کا عالم ایک ایسی اشاراتی کیفیت ہے جس میں اندیشہ ناک اور خوش کن امکانات کا انبوہ عظیم پوشیدہ و پنہاں ہوتا ہے۔ ایک شاعر یا عاشق عموماً اس کیفیت میں خیال کی جن پروازوں سے دوچار ہو سکتا ہے ان کا کچھ شمار ہی نہیں اور ان کی نوعیت تو ہر دم یکسر غیر متوقع رہتی ہے۔ تسلسل خیال اُسے نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ تاجور سامری کی نظم "انتظار" اس لحاظ سے قابل غور ہے۔ اس نظم کے قصّے کا کردار جسے خواہ شاعر سمجھ لیجئے یا کوئی عاشق زار ——— انتظار کا ساغر کھینچ رہا ہے۔ وقت شام اور شام کے ساتھ ہی ملتی ہوئی وہ رات ہے جس کے متعلق شاد عارفی ایک جگہ کہتا ہے کہ "افق کی سُرخ

دیہوں پہ گاؤں [illegible] نکلتے [illegible] شام کے شام سے ——— [illegible] اور [illegible] وقت [illegible] رات ہوتی جا رہی ہے [illegible] ماحول پر سکوت اور شدت سے طاری [illegible] کی بستی میں [illegible] آسمان پر ستاروں نے اپنا [illegible] بچھا دیا ہے ——— یہاں [illegible] تخیل [illegible] ذہن کو [illegible] موجود [illegible] ہے [illegible] ایک سلسلہ [illegible] ذہن کو ماضی [illegible] ماضی [illegible] شاید [illegible] بھی گاؤں کے لوگوں [illegible] کیفیت [illegible] کے دل پر چھائی ہوئی ہے [illegible] گاؤں کے ساتھ ہی [illegible] جاتا تھا [illegible] اور اُس [illegible] سب کی [illegible] تھیں [illegible] اس کے [illegible] نہیں [illegible] ——— یہاں تخیل ماضی سے [illegible] کے بعد ہم حال میں آ پہنچتے ہیں [illegible] ہوا کے تیز جھونکوں نے دیئے گل کر دیئے البتہ ایک دیا باقی ہے۔ شاید یہ شاعر کے دل کی [illegible] دیہاتی مکان کی دہلیز پر اب بھی کسی کی آمد کا منتظر بیٹھا ہے۔

اس نظم میں تخیل نے آسودہ [illegible] کیفیتوں کے ساتھ مل کر جن اُلجھے ہوئے سروں کو چھیڑا ہے وہ اس کی سب سے اچھی زینت ہیں۔

اور چونکہ شعراء عموماً ماضی ہی کے نغمہ خواں ہوتے ہیں اس لئے ماہر القادری بھی یہی گیت سنائی دے رہا ہے کہ

میری راتوں کا اُجالا ہی کیسا
چند تاروں سے شناسائی ہے۔

اثر لکھنوی کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی کہتا ہے کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا ——— اُسے بھی کل کی حقیقت ہی ترجمہ کئے ہوئے ہے جو آج افسانہ نظر آتی ہے۔ یہ افسانہ ایک سراپا کی یاد ہے۔ اس کا تصور ماحول اور دوسری متعلقہ باتیں صرف ذیلی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک تشبیہ دیکھئے۔

آنکھوں میں کاجل پھیلا پھیلا بادل پی کے کنول رس بھنورا
رات گئے کچھ اُڑنے ہی کو تھا پلکوں نے لیکن جال میں پھانسا

آنکھوں کی سیاہی اور سفیدی کو کس خوبی سے جتایا ہے اور جو گدلاپن آنکھوں میں تھا وہی اس تشبیہ میں بھی ہے۔

احمد ندیم قاسمی بھی بانسری کی دُھن سے تحریک لیتا ہے اور ماضی کے چند خوش کن لمحوں کی یاد سے آ جاتی ہے اور اُس کے ذہن میں وہ مناظر جاگ اُٹھتے ہیں کہ محتسب کی روح جن کی تاب نہیں لا سکتی ——— اور اس یاد کی شدت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بانسری والے کو روکنے کے لئے کہتا ہے ——— لیکن شاعر کے ذہن کو گریز کی ضرورت تھی اور وہ اُسے ماضی کی یاد سے حاصل ہو گیا۔

اس شمارے کے یہ تمام شعراء جن کا ذکر اوپر آیا ہے حال سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ اس موجودہ حالت سے رہائی چاہتے ہیں اور اس لئے ماضی کی طرف رجوع ہوتے ہیں کہ ماضی کی بہت سی باتیں انہیں معلوم ہیں۔ اگر انہیں مستقبل کے حالات معلوم ہوتے تو وہ آئندہ زمانے کی طرف بھی پینگ بڑھا سکتے تھے۔ لیکن یہ بات نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دور کے انقلابی شعرا بھی حال سے مطمئن نہیں لیکن وہ ماضی کی بجائے اس زمانے میں گریز کے جویاں ہیں جب دنیا کے تختے پر انسان نہ رہیں گے بلکہ ہر طرف مزدور ہی مزدور نظر آئیں گے۔ وہ زمانہ یقینی نہیں اسی لئے اُن کی شاعری میں احساس و جذبات کی وہ شدت اور حقیقی رنگ موجود نہیں ہوتا جو اُن شعراء کے کلام میں نظر آتا ہے جو ماضی کی طرف گریز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ دونوں گروہ انقلابی ہیں۔ حال سے بھاگنا چاہتے ہیں لیکن ایک اپنی فرار کی بنیاد ماضی کی حقیقت پر رکھتا ہے اور دوسرا گروہ مستقبل کے تخیل پر۔

میراجی

آئینۂ عالم

سائنس، جنگ اور امن عالم

اس مادی زمانے میں سائنس کے علم کا تصور بھی ہمارے ذہنوں میں مادی
ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم میں سے اکثر یہی سمجھتے ہیں کہ سائنس چیزوں کو بنانے کا دوسرا نام
ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ہمیں امن کی باتیں دکھائی دیں تو ہم سائنس کی تعریف
کرتے ہیں اور جب بدامنی اور جنگ و جدال کا دور دورہ ہو تو اسی علم کو گالیاں دینے
لگتے ہیں۔ ریل گاڑیوں اور ہوائی جہاز کی سیر کر کے، سینما میں بیٹھ کر، ریڈیو سن
کر، ہسپتالوں سے شفا حاصل کر کے، اور بجلی کے پنکھوں کی ہوا اور بتی کی روشنی
کا لطف لے کر ہم سائنس کے معترف بن جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم بم اور گیس
کی تباہ کاریوں کا حال سنتے ہیں تو سائنس کے مخالفوں میں ہم سے برتر درجہ کوئی نہیں
رکھتا۔

لیکن سائنس ایک ایسا مداری ہے جس کے تھیلے میں دونوں قسم کی
چیزیں ہیں، اچھی بھی اور بری بھی۔ مداری اپنے تھیلے میں سے پھل پودے اُگا کر
بھی ہمیں دکھا سکتا ہے اور اُسی تھیلے میں سے اُس ناگ کو بھی نکال سکتا ہے
جو اگر چھوٹ جائے تو ہماری زندگی کے خاتمے کا باعث ہو۔

سائنس سے ہمیں اس لئے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں
کوئی خاص فرق اس کے کرشموں سے نہیں پڑتا۔ پہلے جولاہے بہتر سے بہتر کپڑا
بناتے تھے اب مل کی مشینیں یہ کام کرتی ہیں۔ کپڑا ہمیں تب بھی مل سکتا تھا اور
اب بھی مل سکتا ہے۔ فائدہ صرف وقت کی بچت کا ہوا۔ بلکہ وہ بھی ایک طرح کا
نقصان ہی ہے۔ پہلے ہم کپڑا بنانے میں کافی دیر تک مصروف رہتے تھے اور مصروفیت
ہمیں ماحول سے بیزار نہ ہونے دیتی تھی۔ اب مل سے بنا بنایا کپڑا آجاتا ہے اور اس
طرح جو وقت بچتا ہے اُس میں ہمیں کسی اور مشغلے کی تلاش کی کوفت اُٹھانا پڑتی ہے
ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ سائنس نے ہمارے سامنے نئے مقاصد پیش نہیں کیے
ہمارے دلوں میں نئی اُمنگیں نہیں پیدا کیں، ہماری نظروں کے سامنے ایک
ایسی نئی دنیا لا کر نہیں کھڑی کر دی جس کے سمجھنے اور جس کی چھان بین میں ہم دلچسپی

محسوس کر سکیں۔

لیکن اگر ہم ذرا بھی حالات کو سطح سے نیچے جا کر دیکھنے کی کوشش کریں
تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہی کام سائنس کر رہی ہے اور آج سے بہت عرصہ پیشتر
دور بین سائنسدان جانتے تھے کہ یہ علم ہمیں ایک نئی دنیا میں لے جائے گا۔ گذشتہ صدی
کے عالی مرتبت ماہر حیاتیات ٹی ایچ ہکسلے نے ایک جگہ کہا تھا کہ میرے زمانے
میں سائنس نے جو انقلاب خارجی دنیا میں پیدا کیا ہے اس سے کہیں بڑا
انقلاب آئندہ صدی میں اُن علوم سے پیدا ہوگا جن کے عمل کا تعلق براہِ راست
انسان اور اُس کے ذہن سے ہوگا اور یہ شاندار پیش گوئی آج پوری ہوتی دکھائی
دے رہی ہے۔ علمِ حیاتیات کی وجہ سے ہماری زندگی کافی حد تک بدل چکی ہے حیاتیاتی
تحقیق نے ظاہر کر دیا ہے کہ ہم آج تک پورے طور پر زندگی ہی نہیں بسر کرتے رہے
اور جس طرح کم روشن چراغ کے اُجالے کو تیل کے اضافے سے زیادہ روشن کیا
جا سکتا ہے اُسی طرح بعض غدودوں کی تحریک سے ہمارے ذہنوں اور جسموں کے
اُن حصوں میں ایک نئی روح پھونکی جا سکتی ہے جو آج تک بالکل بیکار پڑے رہے
ہیں جن میں اکثر زندگی کی رمق دکھائی ہی نہیں دیتی۔

لیکن یہ غدودوں والا معاملہ ذرا ٹیڑھا اور خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ اچھی بات!
اپریشن سے ڈر معلوم ہوتا ہو تو اسے جانے دیجئے۔ سائنس نے آسان طریقے بھی
دریافت کئے ہیں۔ آپ اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں ایک خاص تبدیلی پیدا
کیجئے۔ بعض چیزیں زیادہ کھائیے، بعض کم کھائیے اور بعض کو منہ تک نہ لگائیے
اور پھر دیکھئے کہ دسترخوان کے یہ معمولی سے قواعد و ضوابط کس قدر حیات افروز ثابت
ہوتے ہیں۔ جب سے سائنس نے جسم کے بعض غدودوں سے کھانے پینے کی
چیزوں کے حیاتین کے تعلق کا تجزیہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج تک ہم
کھانا بھی نہ جانتے تھے۔ یوں کھانے کو ہم اتنا کھا لیتے تھے کہ پیٹ پھٹنے کو آئے،
یوں کھانے کو ہم گندم اور گوشت سے لے کر انگور، دودھ اور سیب تک ہر چیز کھا لیتے

تھے لیکن اس کے باوجود ہماری حالت فاقہ کشوں کی سی تھی۔

ایک مثال لیجئے۔ سائنس نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمارے بعض غدود [illegible] کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ [illegible] طاقت پیدا کرتا ہے اور دوسرا حصہ [illegible] نئی تحریک دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی [illegible] سے مختلف اجزا [illegible] [illegible] ایک [illegible] [illegible] اور [illegible] جیسے [illegible] دھار [illegible] اور [illegible] عشق [illegible] اٹھے۔

[illegible] حیاتیات اور [illegible] نیاتی [illegible] علوم ہیں۔ وہ [illegible] [illegible] میں [illegible] لگتے ہیں۔ لیکن [illegible] کوئی اصول ہمیں نہیں معلوم ہیں۔ ہمیں [illegible] ہونے والی تبدیلی [illegible] اور [illegible] نہیں معلوم ہوسکتی لیکن ایسے علوم [illegible] جن کی کارروائی ہمارے ذہن اور شعور [illegible] عمل کے سلسلے میں [illegible] علوم [illegible] بدل کر رکھ دیں گے، ہماری اہلیتوں کو وسعت دیں گے، ہمارے دائرۂ نظر کو بڑھا دیں گے، اور [illegible] پیش کی دنیا کو [illegible] دیں گے، اور ہمیں وہ طاقت عطا کریں گے جس سے ہم آئندہ از سرِ نو اس جیتی جاگتی دنیا کو بدل سکیں گے۔

اگرچہ بہت سے لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوا ہے لیکن یہ ایک آنے والی حقیقت ہے کہ سائنس عنقریب ہمارے ماحول میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرنے کو ہے جس سے نہ صرف ہمارے حالات بدل جائیں گے بلکہ ہماری ہستی ہی ایک نئی صورت اختیار کریگی۔

لیکن ایسا انقلاب لانے والے وہ علوم آخر ہیں کون سے؟ اگر آپ مذاق نہ سمجھیں تو میں کہوں کہ یہ علوم ہیں معاشیات اور اجتماعی نفسیات۔ یہ علم ادق ہیں اور ایک عام انسان کے لئے لق و دق صحرا کی سی کیفیت رکھتے ہیں۔ لیکن معاشیات اُس علم کا نام ہے جس کے ذریعے سے ہم لوگوں کے اجتماعی چلن کا مطالعہ اور تجزیہ کر سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آغاز سے ہی کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں چند بہت ہی عجیب باتیں رونما ہوئی ہیں۔ آج تک ماہرین کو علم کے کسی شعبے میں ایسے شاذ و نادر کے مطالعے کا موقع نہیں میسر آیا۔ یہ عجیب باتیں سماجی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی اجتماعی ہنگامے ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد سے جو تحریکیں یورپ میں بادِ سموم کی طرح چھا گئی ہیں۔ اُن کی پیشین گوئی کا شرف کسی کو حاصل نہ ہوسکا۔ جس طرح آسمان پر اچانک کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے اُسی طرح یہ تحریکیں بھی ذہنِ انسانی کے اُفق پر یکدم نمودار ہوئی ہیں [illegible] اشتراکی تحریک کے انقلاب کی توقع نہ تھی، لیکن اشتراکی تحریک صرف شروع شروع میں ہی جاذبِ توجہ رہی۔ اس کے علاوہ روس کی پہلی حالت تو ایسی تھی گویا وہاں کوئی زوردار حکومت قائم ہی نہ ہو اور اس لئے اشتراکیت کو اپنے سامنے جیتنے کے لئے تقریباً ایک کھلا میدان مل گیا۔ البتہ اشتراکیت کے زور شور کے بعد چند ایسی باتیں ہوئیں جن کی پیش گوئی اگر کوئی شخص پہلے کرتا تو اُس کے کہنے کا کسی کو یقین ہی نہ آتا۔ پہلے مسولینی نے اطالیہ میں اپنا کمال دکھلایا۔ پھر یہ یورپ نے سپانیہ میں تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز کیا جو ابھی تک اپنے منطقی انجام کو نہیں پہنچا اور اس کے بعد المانیہ میں نازیوں کی کارگذاری نے تو ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

سائنس کو پسند و ناپسند سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مندرجہ بالا حقائق نور روشن کی حیثیت رکھتے ہیں خواہ یہ خوشگوار ہوں خواہ تلخ۔ اور سائنس کا کام انہیں سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔ ان بڑی سیاسی تحریکوں کے علاوہ ذہنِ انسانی کو بعض دوسری باتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے جن میں سے صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ تحریکِ عریانی۔

سائنس کا کام نہ صرف پریشان کن مشاہدات کا پرسکون مطالعہ ہے بلکہ یہ بھی اُس کے فرائض میں داخل ہے کہ فعل و عمل کے گرد و غبار سے اصلیت اور اس کے متعلقات پر جو پردہ پڑ جائے اُسے بھی وہ اُٹھانے کی کوشش کرے۔ ایک ماہرِ معاشیات کے لئے ان تمام تحریکوں میں ایک بات یکساں ہے، اور اُس کی نظروں میں ان تمام شاخوں کی ایک ہی زبردست جڑ ہے اور وہ ایک بات اس قدر اہم ہے کہ اُس کے سامنے تمام سطحی اختلافات ——— مثلاً یہ کہ ان تحریکوں کے پیرو ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور باہم دگر کوئی مماثلت نہیں پاتے ——— کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ مماثلت یہ ہے کہ ان تمام تحریکوں کے پیرو ایک زبردست تگ و دو میں مصروف ہیں اور اس تگ و دو میں یہ تمام کامیاب ہیں خواہ وہ اس کامیابی کے باوجود حقیقتاً کوشش لگا رکھ کر چلے تھے انہیں حاصل نہ کر سکے ہوں۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ تگ و دو کس بات کی ہے۔ سنئے۔ وہ تگ و دو ہے شعورِ نفس سے رہائی حاصل کرنے کی۔

فاشیت کے علم برداروں کو سیاہ قمیص پسند ہے۔ نازی کو ہٹلر سے محبت اور یہودی سے نفرت ہے اور تحریکِ عریانی کا پیرو اُس جامے کو حاصل دینا

مدیں سمجھتا ہے جس کا اصل سبب ابھی آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ یہ تمام لوگ ایک ہی کپڑے کے مختلف رنگ ہیں جس کا تار و پود ایک ہے۔ صرف ظاہری جھلکیاں اختلاف کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ گروہ ایک زمانے کے انجام کا اشارہ کر رہی ہیں۔ ایک دور کے گذر جانے کا نشان ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ذہنِ انسانی میں ایک زلزلہ سا آ رہا ہے اور ہم اُس زلزلے کے تماشائی ہیں۔ ہماری نگاہوں کے سامنے ہی ہماری فطرت میں ایک تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ آج تک پڑھے لکھے اور روشن خیال لوگ کسی غیر مدلل یا نامعقول بات کے ارتکاب سے گھبراتے اور شرماتے تھے۔ لیکن اب وہ گھبراہٹ اور وہ شرم مٹ چکی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحت الشعور، شعور پر غالب آ چکا ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اور اکثر سائنس دان یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تبدیلی انسانیت کے لئے ایک تباہی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس تبدیلی سے سائنس اور تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہو جائے گا۔

لیکن کیا واقعی خاتمہ ہو جائے گا؟ کیا اس طرح خاتمہ ہو بھی سکتا ہے؟ سب سے پہلے ہمیں اس بات کو یاد کرنا چاہیئے کہ یہ سائنس ہی تھی جس نے تحت الشعور کے دبے ہوئے جزیرے کو ذہنِ انسانی کے سمندر سے نکال کر لوگوں کو اس کا احساس دلایا تھا۔ ابھی ہمارے ڈکشنریوں نے اس کا نام بھی نہ سنا تھا، ابھی انہوں نے اس کی طاقتوں کو اپنے لئے مفیدِ مطلب نہ بنایا تھا کہ سائنس دانوں نے تحت الشعور کو دریافت کیا۔ اس کے علاوہ ماہرینِ سائنس کو حاکموں اور سیاست دانوں سے پہلے اس بات کا احساس تھا کہ تحت الشعور کی دریافت ایک ضروری چیز ہے۔ کیونکہ زندگی کے عملی پہلو پر نظر رکھتے ہوئے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ جب تک ذہنِ انسانی پر قابو پانے کے طریقے دریافت نہ کر لئے جائیں گے، انسان سائنس کی عطا کردہ غیر معمولی طاقتوں کو آسانی سے ہضم نہ کر سکے گا۔ گویا انسانیت کی گاڑی کو بریک کی ضرورت تھی اور ماہرینِ علم و فن کو اس کا احساس تھا۔ اور اسی طرح نظری پہلو پر نگاہ ڈالتے ہوئے سائنس کو یہ معلوم ہوا کہ وہ تحت الشعور کی کس قدر محتاج ہے اور اُس نے یہ بھی جانا کہ اس محتاجی کے بغیر یعنی تحت الشعور کی خفیہ طاقتوں سے مدد لئے بغیر اُس کی اپنی ہستی کے مٹ جانے کا امکان ہے۔

سائنس دان یہ سمجھتے تھے کہ ہر بات کا تجزیہ کرنے ہی سے جانچ پڑتال ہو سکتی ہے۔ ایک چیز کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے ہی سے حقائق ایک نئے قانون کی روشنی میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لیکن جب انہوں نے سوچ بچار اور ذہنی حرکات کے متعلق سوچا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ طریقہ کچھ صحیح نہیں دکھائی دیتا۔ سائنٹیفک سوچ بچار کا ایک تحت الشعوری پہلو بھی ہے۔ اور یہی وہ تاریک خطہ ہے جو بعض اوقات حیرت ناک سحر کاریوں کا موجب بنتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کوئی مشہور حساب دان یا ماہرِ سائنس کسی مسئلے کو سوچ سوچ کر عاجز آ گیا اور اُس نے سوچنے ہی سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ لیکن بعد میں اچانک اُس مسئلے کا حل اُس کے تحت الشعور سے انگڑائی لے کر اُٹھا اور ایک پل میں ساری مشکل دور ہو گئی۔ گویا اس طرح سائنس بھی آرٹ اور ادب کی طرح تخلیقی خصوصیات رکھتی ہے اب وہ تحقیق جس کی بنیاد صرف حقائق پر ہوگی۔ اس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکے گی جس قدر کہ تخلیقی تحقیق۔

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جرمنی کے باشندے اپنی سائنٹیفک تحقیقات میں بغیر سوچے سمجھے ہوئے حقائق کے اجتماع پر ہی زور دیتے رہے ہیں، لیکن یہی لوگ ہیں جنہیں اصولوں پر اس قدر اندھا دھند اعتقاد ہے۔ کہ وہ اپنے اس ردِ عمل میں سائنٹیفک دلیل و برہان کے قائل ہی نہیں رہتے۔

ہم اس وقت ایک زبردست ہنگامہ پرور دور سے گذر رہے ہیں ہمارے سامنے ذہن کا ایک نیا حصہ نمودار ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اس نمود کے ہنگامے سے ہم عہدہ برآ ہو گئے تو ہم ایک نئی دنیا میں جا پہنچیں گے، جہاں نئے خیالات ہونگے نیا اندازِ نظر اور نئی طاقتیں۔ اب تک گویا یہ کیفیت تھی کہ ہم خیالات کو سطحِ آب پر پھینک دیتے تھے، وہ لہروں کے نیچے ڈوب جاتے تھے اور ہم اُن کے از سرِ نو نمودار ہونے کا انتظار کھینچتے تھے۔ اب ہم آپ بھی اُن خیالوں کے ساتھ ہی ساتھ اس تمام عمل کا جائزہ لے سکیں گے۔

لیکن لوگوں میں آسانی سے بھڑک اُٹھنے والی ایک خصوصیت پیدا ہو چکی ہے کیا اس کی وجہ سے جنگیں نہ ہونے لگیں گی اور اُن جنگوں سے ذہنی ترقی کے اس میدان میں ہماری تمام کارگذاری ملیامیٹ نہ ہو جائے گی؟ -- اس سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک ہم نے اُس انقلاب کی اہمیت ہی کو پورے طور پر نہیں سمجھا ہے جو تحت الشعور کی دریافت سے ہماری ذہنی زندگی میں آ چکا ہے۔ تحت الشعور کی دریافت ایک ایسی زبردست حقیقت ہے کہ اگر جنگوں پر جنگیں ہونے بھی لگیں۔ تو اُن کی باہمی نوعیت اس قدر مختلف ہوگی کہ ہم انہیں دیکھ کر یہ نہ کہہ سکیں گے۔ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

اُن جنگوں میں تشدد ہوگا لیکن تشدد میں بھی زبردست انقلاب آ جائے گا۔ کیونکہ اب اپنی بات منوانے کا ایک بالکل نیا طریقہ دریافت ہو چکا ہے اور یہ طریقہ اس قدر نیا اور کارگر ہے کہ اس کے سامنے پہلی جنگوں کا تشدد بالکل بے اثر اور بے معنی سی چیز معلوم ہوتا ہے۔ جنگ کے پہلے طریقوں کے ہیبت ناک انجام سے تو اُس کیفیت کے پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے کہ جنگ

کے بعد نہ ذہن تیار ہوگا اور نہ امن و تہذیب کی راہ ہموار ہو سکے گی۔ لیکن اس نئے طریقے سے تیار کی ایک مدت بھی ضائع نہیں ہونے پائے گی۔ اس کے ساتھ ہی یہ طریقہ اس قدر مؤثر اور ... کہ اگر راست تشدد کی بجائے استعمال کیا گیا تو اس کے نتائج مہلک تشدد سے بھی کہیں زیادہ بُرے ہوں گے۔

بعض لوگوں نے ... اصطلاح ... براہ راست عمل اور اس سے وہ سماجی تشدد کا مفہوم لیتے ہیں یعنی جسمانی تشدد کو براہ راست عمل سمجھتے ہیں لیکن یہ لفظ کا غلط استعمال ہے۔ جسمانی تشدد تو ایک بالواسطہ عمل ہے۔ باپ بچے کو چھڑی سے پیٹتا ہے یا محض دھمکی دیتا ہے اور بچہ اس سے ڈر جاتا ہے۔ یہ بچے کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرنے کا طریقہ بالواسطہ عمل ہے۔ اصلی براہ راست عمل وہی عمل ہے جس کے ذریعے سے ہم کسی کی قوت ارادی پر حملہ کریں اور اس کی سب سے مکمل صورت ہپناٹزم ہے۔ اس حالت میں قوت ارادی بےکار ہو جاتی ہے اور جسم مزاحمت نہیں کر سکتا۔

مغربی دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے بلکہ کافی سے زیادہ حد تک ہو چکا ہے اور ان دوسرے ممالک میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے جہاں خیالات کو منوانے کا ذریعہ پروپیگنڈا بنایا گیا ہے۔ پروپیگنڈا قوت ارادی پر براہ راست حملہ ہے۔ ان ممالک کے افراد کی بھی بالکل ایسی ہی کیفیت ہے جیسی ان ملکوں کی جو اوہام کے دام میں گرفتار ہیں۔ جہاں بربریت کا دور دورہ ہے ان ممالک میں کوئی شخص اس کا خیال تک نہیں کر سکتا کہ وہ روایات کے بندھن سے رہائی حاصل کر سکے لیکن یورپ کی موجودہ کیفیت بربریت کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک انوکھی طاقت کی نمودِ ثانی ہے جس کے بغیر تہذیب و تمدن اور سائنس کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ ایک ایسی طاقت کی نمودِ ثانی جس پر صرف سائنس ہی قابو پا سکتی ہے اور اُسے مفید اور تخلیقی بنا سکتی ہے۔

اسی نئی طاقت کی وجہ سے سائنس ترقی کے راستے میں ایک ایسا قدم اُٹھائے گی جو اُس کی پہلی تمام فتوحات کو ہماری نگاہوں میں ہیچ بنا دے گا۔ اب تک چند ضروری باتیں سائنس کو حاصل نہ تھیں، لیکن اب وہ حاصل ہو چکی ہیں۔ یہ باتیں تین ہیں۔

فرد میں اُس کی قوتِ ارادی پر قابو پانے کی طاقت پیدا کی جائے تاکہ وہ اپنے افعال کا ارتکاب ایک مکمل ذمہ داری کے ساتھ کرے

فرد کو اپنے جسم پر قابو پانے کی طاقت دی جائے، تاکہ وہ اپنے آپ پر شعور کے ساتھ وہ اثرات ڈالے جو آج اُس پر ہپناٹزم کے ذریعے سے ڈالے جا رہے ہیں۔

اور تیسرے سائنس کو ایک ایسی طاقت عطا کی جائے جس کے ذریعے سے وہ اپنی پہلی حالت کو بدل کر ایک حقیقی سائنس بن جائے۔ اور شعور کے ساتھ مکمل طور پر نئی باتیں دریافت اور ایجاد کرے۔

اس وقت تمام دنیا اور خصوصاً یورپ میں جو ہنگامہ برپا ہے یہ سائنس کے لئے ایک سنہری موقع ہے کہ وہ ایک ایسی جیت حاصل کرے جس کی بدولت ناممکن پر قابو پایا جا سکے۔

سائنس کو اس کارِ عظیم میں جیت کی اُمید ہے اور ہمیں بھی سائنس پر بھروسہ ہے۔

بسنت سہائے

دو نظمیں

محبت

میری محبت تیری محبت — ہیں یہ دو معصوم فرشتے
بھولے بھالے پیارے پیارے — سندر صورت موہن مکھڑے
بوئے گل کی صورت ہر سو — پھرتے ہیں گلشن میں طرارے

خواہش

میری خواہش تیری خواہش — دونوں زبانیں، دونوں شعلے
آگ کے شعلے برق کے پارے — ہر سو اُٹھتے، ہر سو گرتے
دور خموشی ان سے کوسوں
اونچا روتے، اونچا ہنستے

مسعود شاہد

دو غزلیں

مرا شوقِ دیدار، پھر جوش پہ ہے
یہاں سے وہاں تک نظر ہی نظر ہے

خدا کے لئے، اک ذرا مسکرا دو
شبِ غم کو پھر انتظارِ سحر ہے

مرے ذوقِ سجدہ کا عالم نہ پوچھو
نظر آسماں پر، جبیں خاک پر ہے

اِدھر آرزوئیں، اُدھر آرزوئیں
جوانی کی منزل بہت پُر خطر ہے

زباں پر مری آکے جو رُک گیا تھا
وہ افسانہ اب کو بکو دربدر ہے

مرے حال پر اور اتنی نوازش!
وہ کیوں مہرباں ہیں خدا کو خبر ہے

جو چمکی تھی فاران کی چوٹیوں پر
وہ برقِ صفا آج تک جلوہ گر ہے

تمہاری عنایت سے ناشاد ماہرؔ
شہیدِ تبسم قتیلِ نظر ہے

کس قیامت کی گھٹا چھائی ہے
دل کی ہر چوٹ اُبھر آئی ہے

ہیں ترے حسنِ تصور کے نثار
ہر جگہ انجمن آرائی ہے

آج ایک ایک سرشکِ خوں میں
دل کی تصویر اُتر آئی ہے

دردِ بدنام، تمنا رسوا
عشق رُسوائی ہی رُسوائی ہے

اُس نے پھر یاد کیا ہے شاید
دل دھڑکنے کی صدا آئی ہے

میں ہوں اور کشمکشِ دردِ فراق
وہ ہیں اور ذوقِ خود آرائی ہے

زلف و رخسار کا منظر، توبہ!
شام اور صبح کی یکجائی ہے

ہم سے چھپ چھپ کے سنورنے والے
چشمِ آئینہ تماشائی ہے

دل تمنا سے ہے یکسر بیزار
ٹھوکریں کھا کے سمجھ آئی ہے

حسن و مستی کو جدا کون کرے؟
تُو ہے یا یہ تری انگڑائی ہے

میری راتوں کا اُجالا ہی کیا!
چند تاروں سے شناسائی ہے

تم سے ماہرؔ کو نہیں کوئی گلہ
اُس نے قسمت ہی بُری پائی ہے

ماہر القادری

انتظار

رفتہ رفتہ رات ہوتی جا رہی ہے خوفناک　　دور تاریکی میں لہراتے ہیں اسرارِ مہیب
راستے چپ چاپ گنتے ہیں نقوشِ رہرواں　　اک مسلسل راگ سے معمور ہیں دور و قریب
محفلِ انجم میں چھڑتا ہے ترانہ روح کا　　ذہن میں آتے ہیں رہ رہ کر خیالاتِ عجیب

لوگ کہتے تھے کہ آج آئے گا اپنا بادشاہ　　اپنے شاہی طنطنے سے سونے کے رتھ پر سوار
اونچے مندر میں لگے گا ایک دربارِ عظیم　　جس جگہ سب کی سنی جائے گی فریاد اور پکار
سب نے بستی کو سجایا اور دیئے روشن کئے　　میں نے مندر کو کیا فردوس کا آئینہ دار

راہ تکتے تکتے آخر سو گئے سب اہلِ دہ　　اور ہوا کے تند جھونکوں نے دیئے گل کر دیئے
میری آنکھوں کی طرح بے نور قندیلیں ہوئیں　　اک دیا باقی ہے اپنی ہلکی ہلکی ضو لئے
آہ ایسی تیرگی اور میں سراپا انتظار　　بیٹھا ہوں دروازے پر دل کو قتیلِ غم کئے

تاجور سامری

ایک ایکٹ کے ڈرامے

ڈراما نگاری ایک قدیم فن ہے اور سماجی اور تمدنی ماحول کے مطابق اس فن میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ دنیا کے ہر تمدن میں عبرت و نصیحت اور تفریح و تسکین کے لئے ہمیشہ سے قصوں حکایتوں اور ڈراموں کے کہنے سننے اور دیکھنے کا رواج رہا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں ان چیزوں نے بھی مختلف صورتیں اختیار کیں۔ موجودہ مشینی معاشرت کے تمدن میں افسانہ نویسی اور چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھنے کا رواج زوروں پر ہے۔ کیونکہ موجودہ مشینی معاشرت میں عوام الناس کو اپنا بیشتر وقت زندگی کی ضروریات حاصل کرنے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اُن کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ تفریح طبع کے لئے لمبے لمبے ناول پڑھیں یا ساری رات ڈراما دیکھ کر صبح کو پھر دوبارہ محنت و مشقت میں مصروف ہو جائیں۔ انہیں تو تازہ دم ہونے کے لئے روزمرہ کی مشقت کی زندگی میں تفریح کے چند چھینٹے چاہئیں۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے کو بھی موجودہ سماجی ماحول میں ہی فروغ حاصل ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں ادب کی اس صنف نے مغربی ممالک میں عام قبولیت حاصل کر لی۔ شروع شروع میں تو ایک ایکٹ کے ڈرامے یورپ میں انگلستان کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں زیادہ کامیاب ہوئے۔ لیکن بعد ازاں انگلینڈ کی سٹیج پر بھی ایک لمبے ڈرامے کی بجائے تین ایک ایکٹ کے ڈرامے ہی کھیلے جانے لگے۔ موجودہ معاشرت میں ادب بھی ایک تجارتی جنس ہے۔ جس کی تخلیق یا تخریب مانگ کے بڑھنے یا گھٹنے پر مبنی ہے اور ادب کی کسی شق کے مستقبل کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے اقتصادیات کے اصولوں کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ ان اصولوں کی بنا پر یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ایک ایکٹ کے ڈراموں کا مستقبل نہایت روشن اور شاندار ہے۔ یہاں تک کہ افسانوی ادب سے بھی زیادہ۔

اس سائنس اور میکانیت کی تہذیب نے فنون کے پردے میں بہت سی دلچسپیوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ ہر جاندار سائنس نے لے لی ہے۔ پہلے ہم انسانی گانا سنا کرتے تھے۔ اب مشینی گانا سنتے ہیں۔ پہلے ہم سٹیج پر زندہ انسانی ایکٹروں کے تماشے دیکھا کرتے تھے۔ اب ان کی جگہ فلم کا مسالے سے بنا ہوا جادو پردہ سیمیں پر موجود ہے لیکن سائنس کی ان تمام ایجادات یعنی گراموفون، فلمیں، ریڈیو وغیرہ کے باوجود انسان اپنی فطرت کو نہیں دبا سکتا۔ ان سب کے باوجود فن کو اس کے اصلی انسانی رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ آج بھی اگر کوئی مشہور اداکار اپنے فن کی نمائش کے لئے سٹیج پر آئے اور اُس کے مقابلے میں کوئی بہترین فلم دکھائی جائے تو لوگوں کا رجحان زیادہ تر اداکار کی طرف ہی ہوگا۔[1] اس کے علاوہ اگر کوئی مشہور فلمی اداکار سٹیج پر آ کر لیکچر یا گانا یا ناچ سنائے یا دکھائے تو اُس کے سننے یا دیکھنے کے لئے لوگوں میں از حد اشتیاق پایا جاتا ہے۔ لیلا ڈیسائی سٹیج پر زیادہ جاذب ہے بہ نسبت کپال کنڈلا فلم کے دیکھنے سے۔ تو فلم میں بھی اداکار انسان ہی دکھائی دیتے ہیں لیکن مشین پر آنے سے اُن کا اصل انسانی پہلو تلف ہو جاتا ہے۔ فلم میں ڈرامائی فن چاہے اپنے کمال پر کیوں نہ پہنچ جائے وہ اس خوبی سے انسانی کیفیتوں کو بیان نہیں کر سکتا جس طرح ایک انسانی کردار اپنے اصل روپ میں۔ وہ نفسیاتی رابطہ، وہ روحانی اور روحانی شرکت جو ایکٹر اور اس کے سامعین میں ہونی لازمی ہے مفقود ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح فوٹوگرافی کے باوجود فن مصوری زندہ ہے۔ اسی طرح اس مشینی تفریح اور مشینی فن کے باوجود ڈراما نگاری اور اس کے لئے سٹیج بھی زندہ رہے گی۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک ایکٹ کے ڈراموں کو زیادہ توسیع حاصل ہو گی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے لئے ایک اور جگہ پیدا ہو رہی ہے یہ نیا میدان ریڈیو ہے۔ ریڈیائی ڈرامے ضرورت کے مطابق صرف ایک ایکٹ پر ہی مشتمل ہو سکتے ہیں بلکہ ان میں تو سین بھی ایک سے زیادہ ہونا قریب قریب ناممکن ہے۔ ریڈیو کے علاوہ بہت ممکن ہے کہ بہت جلد ٹیلی ویژن کے تجربات بھی مکمل طور پر کامیاب ہو جائیں

[1] بشرطیکہ چار آنے والا نشست وہاں بھی ہو! (ادارہ)

اس صورت میں سننے کے علاوہ ریڈیو سے یہ ڈرامے دیکھ بھی سکیں گے اور چونکہ عملی دنیا کے ڈراموں کی نوبت تجربہ ہی سے آئے گی جو ریڈیائی ڈراموں کی نسبت اس لئے ایک ایکٹ کے ڈراموں کی مانگ بہت بڑھ جائے گی۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے کی بنیاد آن سے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک ایکٹ کے ڈرامے کی بنیاد سب سے پہلے تمثیلی تکنیک کے ساتھ ہی رکھی گئی تھی۔ ان کے خیال میں ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے جو ایک چھوٹا سا فارس یا نقل یا ذخیرہ منظر پیش کیا جاتا تھا وہی ابتدائی صنف ایک ایکٹ کے ڈرامے کی اولین صورت تھی لیکن در اصل جس طرح مختصر افسانوی ادب وقتی ماحول کے مطابق پیدا ہوا اسی طرح ایک ایکٹ کے ڈراموں کی بنیاد بھی وقتی ضرورت کے مطابق رکھی گئی۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے نوعیت سے کوئی مطابقت رکھتے ہیں اور نقل یا مذہبی مناظرت۔ ایک ایکٹ کا ڈرامہ کسی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے اس میں طنزیہ طربیہ، حزنیہ ہر ایک کی موضوع کی قید نہیں۔ اس قسم کا ڈرامہ ایک پوری کیفیت پر مبنی ہوتا ہے زندگی کے کسی ایک دور کی ایک مکمل تصویر۔ اس میں تاثر کی وہی وحدت پائی جاتی ہے جس طرح ایک مکمل ... ایک ایکٹ کے ڈرامے کو ایک مکمل ڈرامے کا ... نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح ایک افسانہ ناول کا اختصار نہیں ہو سکتا اور جس طرح افسانہ نویسی بجائے خود ایک مکمل فن ہے اسی طرح ایک ایکٹ کی ڈرامانگاری بھی ایک مستقل اہم اور مکمل صنف ہے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایک ایکٹ کا ڈرامہ اور ایک لمبا ڈرامہ ایک ہی خیال سے متاثر ہو کر لکھا جائے۔ لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کا موضوع ایک سا ہی ہو لیکن دونوں کی فن کاری میں فرق ہوگا بہت سی تفصیل اور تمہیدی چیزیں آپ کو ایک ایکٹ کے ڈرامے میں نہیں ملیں گی ایک ایکٹ کے ڈرامے میں پہلے ہی سین میں کہانی کی بنا ہو جاتی ہے اور اس کا عروج عام طور پر ڈرامے کے اختتام پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کردار نگاری، کیفیت یا وحدت میں کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل [illegible] میں فرانس کی ایک گیس فیکٹری کے ایک ملازم آندرے انتوان نے اپنے بچے ہوئے چند فرانک کی مدد سے ایک چھوٹا تھیٹر قائم کیا جس میں ایک لمبے ڈرامے کی بجائے دو تین چھوٹے چھوٹے ڈرامے دکھانے کا انتظام کیا۔

فن ڈرامہ بازی دوسرے فنون سے اس بات میں مختلف ہے کہ یہ زندگی کی عملی تصویر اور تفسیر ہے نہ کہ بیانیہ۔ ایک افسانہ نویس یا ناول نگار زندگی

... ہمارے خیال میں عملی ذہن کے ڈرامے پڑھنے والوں سے زیادہ ... رکھیں گے۔ ادارہ

کے واقعات کو بیان کرتا ہے لیکن ڈرامانگار آپ کے سامنے زندگی کو جوں کا توں لے آتا ہے۔ ڈرامے میں زندگی کا بیان نہیں ہوتا بلکہ اس میں زندگی اپنے اصلی رنگ میں دکھائی دیتی ہے۔ چلتی پھرتی۔ بولتی چالتی یا ہنستی روتی۔ آسودہ یا تھکی ہوئی زندگی زندہ انسانی کرداروں کے ذریعہ آپ کے سامنے اپنی اصلی صورت میں پیش کی جاتی ہے۔ ڈرامے میں اگر کردار کچھ بیان بھی کرتے ہیں تو وہ بیان بھی عمل ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ڈرامہ زیادہ تر کھیلنے کے لئے لکھا جاتا ہے نہ کہ پڑھنے کے لئے بلکہ اگر پڑھا بھی جائے تو ذہن میں ایک سٹیج کا ہونا لازمی ہے۔ ان حالات میں ایک ڈرامہ نویس کے لئے سامعین اور سٹیج کے تمام لوازم ... کو مد نظر رکھنا ایک ضروری امر ہے۔

یوں تو ہر ایک ڈرامے میں یہ لازمی ہے کہ ایک منٹ بھی کسی فضول یا غیر ضروری واقعہ تفصیل یا کیفیت کو بیان کرنے میں صرف نہ کیا جائے تاکہ سامعین کی توجہ ضروری ... بھی کسی اور چیز کی طرف منعطف نہ ہو۔ لیکن ایک ایکٹ کے ڈرامے کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس میں ضائع ہونے کے لئے کوئی فالتو وقت بچتا ہی نہیں۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے میں پردہ اٹھتے ہی پلاٹ کا آغاز ہو جانا چاہئے اور ... کے بعد ڈرامانویس کی کامیابی اس امر پر منحصر ہے کہ وہ سامعین کی توجہ پوری طرح سے اور پورے وقت کے لئے اپنی طرف مبذول رکھے۔ ایسا کرنے کے لئے ... باتوں کی بہت ضرورت ہے۔

سب سے ... سامعین کو امید و بیم کی حالت میں رکھنا لازمی ہے۔ لوگوں کو اس بات کا اشتیاق ہونا چاہئے کہ "اب کیا ہوگا"؟ تماشائی اسی اشتیاق میں اپنے آپ کو بکسر ... اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ڈرامے کے پلاٹ کے متعلق سامعین کی ... آرزوئیں درست ثابت نہ ہوں۔ اور اگلے سین میں جس نتیجے یا واقعے کی ... توقع کرتے ہوں در اصل اس کے بالکل برعکس ہو اور آہستہ آہستہ ... کی مدد سے ان کا اشتیاق بڑھتا جائے۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے میں ... حیرت کا ہونا لازمی ہے۔

تیسری ... ڈرامے میں تیاری ہے مضمون ڈرامانگار کردار یا واقعات یا امید ... کسی قسم کی اچانک تبدیلی گوارا نہیں کر سکتے۔ ہر ایک موقع کو تبدیل کرنے کے ... پہلے سے ان کو تیار کرنا چاہئے۔ ڈرامے کے پلاٹ میں تسلسل کا ہونا لازمی ہے ... کی ابتدا اور انتہا میں ترتیب کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اصل میں پلاٹ کا تسلسل ... واقعات کی ترتیب مناسب سلسلے کے ساتھ اور ایک ڈرامہ نویس ... اڑانے والے اس مزدور کی طرح ہے جو آہستہ آہستہ اپنا راستہ ... کرتا ہوا اس جگہ جا پہنچتا ہے جہاں اسے ڈائنامیٹ

کی ضرورت پیش آتی ہے اور ڈرامائی بیٹ ملکر کرہ بعک سے پہاڑ اُڑا دیتا ہے ڈراموں میں یہ مقام عروج یعنی کلائی میکس کہلاتا ہے۔ اور ایک ایکٹ کے ڈراموں میں عام طور پر یہ مقام آخر میں ہی آتا ہے (اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ایکٹ کے ڈراموں میں عروج اختتام کے سوا اور کسی مقام پر نہیں آسکتا) ایک کامیاب ڈرامانویس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مقام تک گومگو کی حالت قائم رکھے۔

ایک ایکٹ کے ڈراموں میں یہ عام غلطی ہوتی ہے کہ بہت سے مصنفین وقت کا بیشتر حصہ کردار نگاری یا کسی تفصیل میں ضائع کر دیتے ہیں اور اس کے بعد جب انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ڈرامے کا اختتام نزدیک ہے۔ تو وہ ایک غیر مکمل اور غیر معقول عروج پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں وہ بہت بُری طرح سے ناکام ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ڈرامے میں تناسب اور وحدت تلف ہو جاتی ہے۔ وحدت کا وجود ہر ڈرامائی پلاٹ میں نہایت ضروری ہے۔ ہیرو یا کسی اور کردار کی وحدت نہیں بلکہ عمل کی وحدت یعنی سارے اعمال کو ایک مرکزی عمل کے گرد گردش کرنا اور انہیں عملی طور پر اس خاص بنیادی عمل سے وابستہ ہونا چاہیئے۔ اسی کو وحدتِ عمل کہتے ہیں۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے میں سب سے مشکل کام کردار کو قائم کرنا ہے ایک لمبے ڈرامے میں ہر ایک کردار کو کافی وقت ملتا ہے کہ وہ اپنا تعارف حاضرین سے کرائے اور اپنی شخصیت اُن پر اچھی طرح سے واضح کر دے لیکن ایک چھوٹے ڈرامے میں اگر وہ اپنا تعارف کرانے میں ذرا بھی دیر کر دے تو بانی پلاٹ کے مناسب انکشاف کے لئے وقت نہیں بچتا اور توازن ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے عام طور پر ایک ایکٹ کے ڈراموں میں کردار کو سٹیج پر آتے ہی اپنا تعارف کرا دینا چاہیئے تاکہ سامعین کو معلوم ہو جائے کہ پلاٹ کا اس کے ساتھ کیسا تعلق ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کردار کے سٹیج پر وارد ہونے سے پہلے ہی سامعین اُس کو دیکھنے کے لئے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ اُسے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے میں زندگی کے مختلف تضاد یا اختلافات کو پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے لئے تصادم یا کشمکش کا ہونا لابد ہے۔ لمبے ڈراموں میں چیخوف نے چند ایسے کامیاب ڈرامے لکھے ہیں جن میں تصادم نام کو بھی نہ تھا لیکن ایک ایکٹ کے ڈراموں میں یہ بات قریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ جدید ڈرامانگاری میں ایک اہم خصوصیت واقعیت بھی ہے۔ عصر جدید کے ڈرامانگار زندگی کے مسئلوں سے بحث کرتے ہیں اور اس کی سچی تصویر کھینچتے ہیں۔ اور یوں انہیں زندگی کے اختلافات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر انسان اور سماج کا تصادم۔ انسان اور ماحول کا تصادم۔ ایک خاص جماعت کا دوسری جماعت سے تصادم۔ عقائد اور اصول کا تصادم۔ انسان کے متضاد رجحانات کا تصادم وغیرہ وغیرہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور ایک ڈرامانگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زندگی کی کشمکش کے مختلف پہلوؤں کو اچھی طرح سے واضح کرے۔ چونکہ ایک ایکٹ کے ڈرامے میں ایک وقت میں صرف ایک ہی پہلو نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس میں تصادم یا کشمکش کا ہونا ضروری ہے۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے میں تمہید ایک غیر ضروری عنصر ہے شیکسپیئر اپنے ڈراموں کی ابتدا کسی دہشت انگیز سین سے کیا کرتا تھا۔ اُس کا ڈرامہ "طوفان" جہاز کی تباہی کے منظر سے شروع ہوتا ہے اور ہملٹ میں ابتدائی سین کا آغاز ایک بھوت سے ہوتا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ ایک ایکٹ کے ڈرامے بھی دہشت انگیز منظر سے شروع کئے جائیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ سامعین میں پہلے ہی منظر سے دلچسپی پیدا ہو جائے اور آخری منظر تک قائم رہے۔ آپ جس واقعہ، حقیقت یا صورت حال کا انکشاف ڈرامے میں کرنا چاہتے ہیں وہ جلد از جلد حاضرین کے سامنے آ جانا چاہیئے اور اس کے انکشاف میں اس کی دلچسپی آخر تک قائم رہنی چاہیئے۔

مکالمہ ڈرامے کی جان ہوتا ہے اور ایک ایکٹ کے ڈرامے کا تو پلاٹ بھی مکالمے کے ذریعے ہی سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس لئے مکالمہ لکھنے میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض مصنفین مکالمے سے عمل کا کام لینا چاہتے ہیں۔ لیکن مکالمہ کسی بھی صورت میں عمل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ مکالمہ لکھنے سے پیشتر اس بات کا خیال ہونا چاہیئے کہ آپ کے ڈرامے کا پلاٹ ایک سڑک کے نقشے کی طرح ہے اور مکالمہ ایک سچے رہبر کی طرح سامعین کو راستہ بتا رہا ہے اور رہبر کا کام ہے کہ سفر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرے، صحیح راستہ بتائے اور راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ کرے۔ مسافر کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور وہ ہر منزل پر یہ پکار اُٹھے "کتنا دلکش منظر ہے مجھے اس کی ہرگز امید نہ تھی"۔

ایک ایکٹ کا ڈراما لکھتے وقت ڈرامے کا اختتام مدِ نظر میں ہونا چاہیئے تاکہ مناسب تسلسل قائم رہ سکے بعض حالتوں میں دیکھا گیا ہے کہ بعض ڈراموں کی ابتدا تو نہایت شاندار، دلچسپ اور فنی نقطۂ نگاہ سے بہترین ہوتی ہے لیکن اُن کا اختتام اُن کی تمام خوبیوں کو مٹا دیتا ہے۔

ایک ایکٹ کے ڈراموں میں عام طور پر ایک ہی سین ہونا چاہیئے اور کرداروں کو بار بار اپنا لباس تبدیل کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہونی چاہیئے۔

سطور نے مجھے ایک ایسا امریکی ڈرامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں مکالمے کی ادائیگی کی تیز رفتاری سے عمل کا کام لیا گیا تھا۔ (مدیر [illegible])

اس سے یہ مراد نہیں کہ ایک ایکٹ کے ڈرامے صرف ایک ہی سین پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ دو یا تین سین بھی۔ چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھے جا سکتے ہیں لیکن ایسا کرنے میں ڈراما نویس کو فن پر پوری طرح حاوی ہونے کی ضرورت ہے۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے کی فنی اور ادبی سربلندیاں دیکھنی ہوں تو ایک ایکٹ کے چند مغربی ڈراما نگاروں کے شاہکار پڑھنے چاہئیں۔ چند ڈراما نگاروں کے نام یہ ہیں۔

امریکی ڈراما نگاروں میں لارڈ ڈنسانی (DUNSANY) یوجین اونیل (Eugeon O. Neil) جارج مڈلٹن (George Middlton) اور پرسیول وائیلڈ (Percival Wilde) کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان مصنفین کے ڈرامے ٹیکنیک کے لحاظ سے بہترین شمار کئے گئے ہیں۔ فرانس جرمنی وغیرہ کے بہترین ایک ایکٹ کے ڈراما نگاروں کے شاہکار انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند فرانسوا ڈی کیورل (Francois De Curel) پال ہرویو (Paul Hervieu) ہنری لاویدان (Lavedan) رومین رولاں (Romain Roland) الفریڈ کاپس (Alfred Capus) ویدکائنڈ (Wede Kand) اور آرتھر شنلر (Sehuglea Caansl) قابل ذکر ہیں۔ انگریزی میں اے اے ملنے (A. A. Milne) ہیرلڈ برگ ہوس (Harold Brighouse) ہیرلڈ روبنسٹین (Harold Rubinstein) جے ٹالبٹ (J. Talbot) جے ایم باری (J. M. Barry) اور کلفرڈ بیکس (Clifford Bax) عصر جدید کے بہترین ڈراما نویس ہیں۔

ہندوستان میں فن ڈراما و اداکاری ہزارہا سال قبل اپنے عروج پر تھا۔ آریہ تہذیب سے بھی پہلے جنوبی ہند میں دراوڑی تہذیب کے عروج کی یادگار آج بھی کتھا کلی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستانی ڈراموں کی روشن تاریخ میں آج بھی کالی داس اور بھوبھوتی زندہ ہیں اور ان کا فن بھی ابد تک زندہ رہے گا۔ لیکن آج اسی ہندوستان میں ڈرامائی ادب پستی اور انحطاط کے گڑھے میں گر گیا ہے۔ نہ تو اس میں سنسکرت ڈرامے کی خوبصورت روایات ہیں اور نہ جدید ڈراما نگاری کی خوبیاں۔ ہندوستانی ڈراما یا تو مغرب کے فن کاروں کے ترجمے پر محدود ہے یا تاریخی اور مذہبی قصوں پر جن کو ادبی زبان کا لباس پہنا کر ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اردو زبان میں تو ڈراما نویسی ابھی عالم طفلی ہی میں ہے اور کوشش کے باوجود معیاری ڈرامے بہت کم ملتے ہیں۔ دور اول کے ڈراما نگار جو زیادہ تر تین یا چار ایکٹ کے ڈرامے لکھتے تھے۔ مثلاً ناظر بیگ، رونق بنارسی، احسن لکھنوی، بیتاب دہلوی، آغا حشر کاشمیری وغیرہ۔ وہ مختلف تھیٹریکل کمپنیوں کے ساتھ وابستہ تھے اور شاید تمثیل کی فنی خصوصیات سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کے ڈراموں کا معیار ان کی ناٹک کمپنیاں اپنے تجارتی اور دوسرے ماحول کے مطابق مقرر کرتی تھیں اور ان کا موضوع زیادہ تر مذہبی روایات یا عشقیہ اور تاریخی حکایات تک ہی محدود تھا۔ ان ڈراما نویسوں میں سے آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے سب سے زیادہ مقبول عام ہوئے اور کئی لوگ تو حشر کو انڈین شیکسپیئر کے نام سے ہی یاد کرنے لگے لیکن فن کے لحاظ سے ان کے ڈراموں کا معیار کوئی بلند نہ تھا[۱]۔ اردو ڈراما نویسی کے دور اول سے متعلق ایک علیحدہ فنی اور تاریخی مقالے کی ضرورت ہے لیکن اس وقت تو زیر بحث موضوع ایک ایکٹ کے ڈرامے ہیں۔

ایک تو اردو ادب میں معیاری ڈرامے ویسے ہی بہت کم ہیں۔ لیکن ایک ایکٹ کے ڈرامے تو تقریباً نایاب ہیں۔ اب کچھ عرصے سے ریڈیو کی سرگرمیوں کی وجہ سے چند ریڈیائی ڈرامے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ لیکن سنا جاتا ہے کہ ریڈیو والوں کو بھی یہی شکایت ہے کہ انہیں ان کے مطلب کے ڈراما نویس ملتے ہی نہیں اور اس لئے انہیں بار بار صرف چند اشخاص سے استدعا کرنی پڑتی ہے کہ برائے خدا ہمارے لئے ڈرامے لکھئے[۲] اور اسی وجہ سے انہیں چند محدود ادیبوں کے قلم سے انگریزی ڈراموں کے چربوں یا ترجموں پر ہی اکتفا کرنی پڑتی ہے۔

اردو میں ایک ایکٹ کے جو ڈرامے لکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر انگریزی یا دوسری مغربی زبانوں سے اخذ شدہ ہیں۔ بعض مصنفین تو بانگ دہل اس بات کا اعلان بھی کر دیتے ہیں کہ یہ ہمارا طبعزاد ڈراما نہیں بلکہ فلاں انگریزی یا کسی اور مصنف سے ترجمہ کیا گیا ہے لیکن بہت سے حضرات تو اسے مقامی رنگ دے کر بالکل اپنا بنا لیتے ہیں۔ ریڈیو سے بھی جو ڈرامے نشر کئے جاتے ہیں ان میں سے اکثر ڈرامے اخذ شدہ ہی ہوتے ہیں۔ اگر کہیں کوئی طبعزاد ڈراما مل بھی جائے تو وہ فن کاری کے لحاظ سے ناقص ہوتا ہے اور عام طور پر اس کے پلاٹ کا مرکزی موضوع ایک ہی ہوتا ہے۔ مذہبی، تاریخی اور عشقیہ ڈراموں کے علاوہ ایسے ڈرامے بھی موجود ہیں جن میں نیکی اور بدی، فرض اور محبت یا کردار اور مافوق الفطرت کا تصادم دکھایا گیا ہو۔ ان کے علاوہ اور کسی موضوع پر اردو زبان میں ڈرامے نہیں

[۱] حشر کے بارے میں یہ کہنا زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ (ادارہ)

[۲] ادھر اس کا رد عمل یہ ہے کہ ریڈیو کو اس وجہ سے بے شمار لکھا جا رہا ہے [illegible]

[۱] اس قسم کے [illegible] تو مضمون حشر [illegible] ڈراما نگاری بھی شامل ہو رہا ہے (ادارہ)

لکھے گئے۔ مثال کے طور پر فضل حق قریشی جن کے اکثر ڈرامے دہلی ریڈیو سٹیشن سے نشر ہو چکے ہیں۔ اُن کے ڈراموں میں بھی یہی چیزیں نظر آئیں گی۔ ان کے ڈراموں میں جو کشمکش دکھائی گئی ہے۔ زندگی میں بہت کم موجود ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو آپ نے خارجی عمل اور روحانی تاثرات سے ڈرامے کو بالکل ناقابلِ یقین بنا دیا ہے۔ آپ کے چند ڈراموں میں مقامِ عروج بھی موجود نہیں ہوتا اور وہ محض ایک مکالمہ بن کے رہ جاتے ہیں۔

منصور ناصری کے ڈرامے فن کاری کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں لیکن پلاٹ میں اُن کے بھی یہی خامی ہے۔ ہندوستانی زندگی میں جو تصادم اور مصنفوں کے لئے جو خام مواد موجود ہے۔ اُس کا فائدہ ناصری صاحب نے نہیں اٹھایا اور اگر اٹھایا بھی ہے تو بہت کم۔ شاید اس لئے کہ اصل واقعیت کی زندگی ریڈیو والوں کو نہیں بھاتی اور ادب کی تخلیق اس کی مانگ پر مبنی ہے۔

امتیاز علی صاحب تاج کے قلم میں روانی ہے اور وہ ڈرامے کی ٹیکنیک پر بھی پورے طور پر حاوی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کے زیادہ تر ڈرامے انگریزی یا کسی اور زبان سے ہی اخذ شدہ ڈرامے ہیں کاش کہ وہ اردو میں طبعزاد ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھنا شروع کریں۔ ادب اُن کی اس خدمت کا احسان مند رہے گا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ڈرامانویس ہیں جن کا نام ریڈیو سٹوڈیو کی حدود سے باہر نہیں آیا اب کئی افسانہ نویسوں نے ڈرامانگاری کی طرف رجوع کیا ہے۔ ان میں سے ترقی پسند مصنفین نے چند کامیاب ڈرامے لکھے بھی ہیں لیکن وہ معیاری ڈرامے نہیں کہلائے جا سکتے اور پھر وہ اس قدر بکھرے ہوئے ہیں کہ اُن کے متعلق مکمل طور پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی ادارہ انہیں کتابی صورت میں لانے کی ہمت کرے تو یہ ادب کی ایک خدمت ہو گی۔

آج تقدیر کی حکومت کا زمانہ نہیں۔ آج انسان نے وہ کچھ کر دکھایا ہے اب سے دو ہزار یا ایک سو سال پہلے وہ اُس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ چیزیں جو انسان کے لئے پُراسرار تھیں اور جنہیں وہ کسی مافوق الفطرت قوت کے ساتھ وابستہ کیا کرتا تھا آج پُراسرار نہیں ہیں۔ اُن کی اصلیت آج انسان پر ہویدا ہو گئی ہے اور وہ عقدے جو تقدیر کی پُراسرار تاریکیوں میں اُلجھے ہوئے تھے آج انسان نے خود حل کر لئے ہیں۔ آج سائنس کی دنیا میں ہمیں تقدیر کی دنیا کے سحر اور جادو معجزہ دعا اور بد دعا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہمارے پیشِ نظر صرف انسان ہے اور اس کی کمزوریاں اور استواریاں۔ اس لئے ڈرامے میں بھی بنیادی تصادم انسانی نفس کے مختلف پہلوؤں میں یعنی کردار کے رجحانات اور احساسات کے درمیان ہونا چاہئے۔ یا دوسرے الفاظ میں اصلی کشمکش انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ہونا ٹھیک ہے بلکہ موجودہ فن ڈرامانگاری کے متعلق تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ خارجی حرکت کا اس میں بالکل فقدان ہو اس لئے ہندوستانی ڈرامانگاروں کے لئے بھی یہ لازمی ہے کہ وہ بجائے قدرت اور قسمت کو مخاطب کرنے کے زندگی کے مسائل کا اصل حل ڈھونڈنے کی کوشش کریں اور اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کی دنیا میں خارجی دنیا کا بدل تلاش کریں۔ اس صورت میں وہ ہندوستان میں فن ڈرامانگاری کی توسیع کر سکتے ہیں۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے تھوڑے ہی عرصے میں یورپ اور امریکہ کی سٹیج پر قابض ہو گئے۔ باوجود اس بات کے کہ وہاں فن فلم سازی ہندوستان سے کہیں بہتر اور وسیع پیمانے پر ہے۔ لیکن ہندوستان میں جب سے پردۂ سیمیں پر فلمیں وارد ہوئیں تھیٹر ختم ہو گیا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو فنی لحاظ سے فلمیں جو امریکہ اور یورپ سے بھی درآمد ہوتی ہیں بدرجہا بہتر ہیں اور بتدریج ترقی کر رہی ہیں اور دوسرے ہندوستانی سٹیج لمبے ڈراموں کا بدل پیش نہ کر سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈرامے کھیلنے کا رواج قریباً قریباً بند ہو گیا ڈراموں کی مانگ نہ رہی اور اس وجہ سے ہندی یا اردو میں فن ڈرامانویسی کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ جب کسی چیز کی مانگ ہی نہ ہو تو اس تجارتی نظام میں اس کو فروغ کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ آج کل وہ زمانہ نہیں کہ ادیب چند امراء کو خوش کرنے کے لئے لکھتے جائیں اور اُن کے ٹکڑوں پر پڑے رہیں۔ آج کل ادیبوں کو اپنی شکم پروری بھی کرنی ہے اور ڈرامے جو کھیلنے کی چیز ہے لیکن اُس کے لئے سٹیج موجود نہیں ہے اُن کی اس پہلو میں مدد نہیں کرتے۔ لیکن ریڈیو کے آنے سے حالات کچھ امید افزا ہو رہے ہیں اور ممکن ہے کہ سائنس کی اس ایجاد کی وجہ سے ہندوستان میں بہترین ڈرامے لکھے جا سکیں۔ اور موجودہ مغربی ڈرامانگاری اور قدیم سنسکرت ڈرامے کی روایات کے امتزاج سے وہ فن پیدا کیا جا سکے جو اِبسن اور برنارڈ شا سے کہیں بڑھ کر ہے۔

لیکن اس کے لئے محض ریڈیو ہی کافی نہ ہو گا۔ ایک تو ریڈیو سیاسی پروپیگنڈا کی قید سے آزاد نہیں اور دوسرے ایک سرکاری محکمہ ہونے کی وجہ سے ادب کی اتنی خدمت نہیں کر سکتا اور دوسرے ریڈیائی ڈرامے اور سٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے میں کافی فرق ہوتا ہے۔ ایک محض سننے سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا دیکھنے سے۔ اس لئے ڈرامہ نگاری کو فروغ دینے کے لئے سٹیج

پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو ڈراما نگاری کو عالمِ طفلی سے عالمِ جوانی تک لے جانے کے لئے ہندوستانی سٹیج کا ہونا لازمی ہے۔ ڈراما اور سٹیج لازم و ملزوم ہیں اور ایک کے بغیر دوسری چیز بے معنی ہے۔ ہندوستانی سٹیج یہاں تفصیلی نقد و نظر سے بھی کوئی تعلق رکھنے والا سوال نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی انگریزی یا انگریزی سے اخذ شدہ ڈرامے کو سٹیج کرے تو لوگ اسے دیکھنے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں اور جیسے گراں ہو جانے کی وجہ سے ناکام لوٹنا پڑتا ہے اور یوں بھی تو تفریح ہی کے لئے سینما یا عمل کافی ہے۔ ہندوستانی زندگی ابھی مکمل طور پر ایک سوشل زندگی نہیں ہے لیکن سوشل زندگی بنا سکتی ہے اور ہندوستانی سٹیج اس معاملے میں کافی مدد دے سکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر چند منتخب خود ہی خدمتِ ادب بجا لائیں اور خود ہی ہندوستانی ڈرامے کے لئے سٹیج بنائیں وہ خود کہاں سے کب قائم کریں اور ایک ایکٹ کے ڈرامے سٹیج کریں۔ اس سے ایک تو وہ اپنے صحیح مفہوم سٹیج کے ذریعے سے پیش کر سکیں گے اور دوسرے ہندوستانی زندگی کو سوشل بنانے میں معاون ثابت ہوں گے۔

نرینڈر ناتھ

برسات کی رات

موسمِ برسات ہے ۔۔۔ کھوئی کھوئی رات ہے
گر رہی ہیں بوندیاں ۔۔۔ راگ سے پُر ہے جہاں
جاگ اُٹھا ہے سازِ فطرت خواب سے
چھیڑتی ہے کیوں پھوار ۔۔۔ دل بہت ہے بے قرار
جیسے بجتا ہو ستار
جب اُسے چھیڑے کوئی مضراب سے
آہ! کیوں تنہا ہوں میں ۔۔۔ ہائے! یوں تنہا ہوں جب
کیوں نہیں ہمدم مرا ۔۔۔ سب مزے ہیں بے مزا
بے مزہ ہے کس قدر یہ رات بھی
کاش یہ عالم نہ ہو ۔۔۔ کاش یہ موسم نہ ہو
جب کوئی ہمدم نہ ہو
کاٹتا ہے موسمِ برسات بھی

روشن ورین

قطعات

[illegible]

محمد داؤد راہبر

حقیقت یا افسانہ

تازہ محبت سادہ سادہ   پاسِ وفا کا حد سے زیادہ   قامتِ زیبا مطلعِ جامی   حسن سراپا، کیفِ تمامی
موجِ تبسم، موجِ بادہ   پھولوں سے بکھرا عشق کا جادہ   بوئے سمن سی مست خرامی   لکھا صبا نے خطِ غلامی

دل میں امنگیں لب پہ ترانہ   دل میں امنگیں لب پہ ترانہ
کل تھی حقیقت آج فسانہ   کل تھی حقیقت آج فسانہ

حال کی پرسش میں موسیقی   ہونٹوں کی جنبش میں موسیقی   لہجے میں نرمی، لوچ صدا میں   شائبہ اک شوخی کا حیا میں
پلکوں کی لرزش میں موسیقی   خون کی گردش میں موسیقی   سو سو ادائیں ایک ادا میں   ناز و کرشمہ لطف و عطا میں

دل میں امنگیں لب پہ ترانہ   دل میں امنگیں لب پہ ترانہ
کل تھی حقیقت آج فسانہ   کل تھی حقیقت آج فسانہ

آدھی رات اور سیرِ چمن کی   چاند پہ بدلی ہلکی ہلکی   آنکھوں میں کاجل پھیلا پھیلا   یا پی پی کے کنول رس بھنورا
زلف کسی نے چہرے سے جھٹکی   بدلی چھٹی اور چاندنی چھٹکی   رات گئے کچھ اڑنے ہی کو تھا   پلکوں نے لیکن جال میں پھانسا

دل میں امنگیں لب پہ ترانہ   دل میں امنگیں لب پہ ترانہ
کل تھی حقیقت آج فسانہ   کل تھی حقیقت آج فسانہ

اثر لکھنوی

سراب

افراد

۱۔ ایکٹر ۲۔ ایکٹریس ۳۔ مینیجر ۴۔ فلسفی ۵۔ ہیرو

مقام: بمبئی۔ ایک مشہور فلم کمپنی کا سٹوڈیو۔ سٹوڈیو کا دفتر۔ **وقت:** ۱۱ بجے دن۔ دفتر ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جو باہر دالان میں کھلتا ہے۔ دالان کے بائیں طرف گانے کا کمرہ ہے۔ جہاں گانوں کی ریہرسل ہوا کرتی ہے۔ کمرے میں ایک طرف ذرا ہٹ کر ایک میز لگی ہے اور کچھ کرسیاں۔ دیوار پر دو تین ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی تصویریں لٹکی ہیں۔ اس وقت دفتر میں چار افراد بیٹھے ہیں۔ میز کے پیچھے دیوار کی طرف بیٹھے کمپنی کا مینیجر ہے۔ سامنے کرسی پر دروازے کی طرف منہ کئے ایکٹریس بیٹھی ہے۔ مینیجر کے سامنے میز کی دوسری طرف دو اور آدمی بیٹھے ہیں۔ ایکٹر اور فلسفی۔ ان کی نہ تو پشت دروازے کی طرف ہے نہ پورا چہرہ۔ مینیجر ایک رجسٹر کے صفحے الٹ رہا ہے۔ ایکٹریس بے دل سی بیٹھی باہر دالان کے پرے باغ اور آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ایکٹر ایک چہرے پر ملنے والی کریم کی شیشی سامنے میز پر رکھے اس سے کھیل رہا ہے۔ فلسفی آنکھیں پسارے، اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ٹکراتے ہوئے چھت پر خیالی نقشے بنانے میں مشغول ہے۔ اس ڈرامے کا ماحول یہ چار افراد ہیں۔ کچھ نہیں۔ اس لئے کمرے کو اور وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن ان افراد کی بابت ہمیں کچھ کہنا ہے۔ ان کے چہرے ان کے ماضی، ان کے عادات اور ان کے حالات کا آئینہ ہیں۔

مینیجر نے ابھی چالیسویں سال میں قدم نہیں رکھا لیکن اس کا شمار بڈھوں میں ہونے لگا ہے۔ اس کے سر کا اوپر کا حصہ ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح صاف ہے۔ عمر کے تقاضے کی وجہ سے اس کی کنپٹیوں کے سب بال سفید ہو گئے ہیں۔ فلم کمپنی کا آغاز ہوا تو آپ کو بھی مینیجری ہاتھ آ گئی۔ مینیجر اپنے مالک کے چیدہ چیدہ معزز دوستوں میں سے تھے۔ دوسرے سیٹھوں کی طرح اس مالک کے گھر میں بھی ہر روز شراب سے ہولی کھیلی جاتی تھی۔ سیٹھ جی کا گھر ہر قسم کے دوستوں کے لئے چلتا ہوا میخانہ تھا اور طوائفوں کے لئے پیسے کی ٹکسال۔ ایسے سیٹھوں کو دوستوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن وہ ان سب کی قیمت کو پہچانتے ہیں۔ ان کا معتمد چیلا ہر کوئی نہیں ہوتا۔ شراب کے ان بیوپاریوں کو ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جس پر وہ کبھی کبھار اپنے غصے کا غبار نکال سکیں۔ جب بوتل اور گلاس خالی ہو کر زمین پر لڑھکنے لگتے ہیں تب وہ اپنی مادی ہستی کو بھول کر اپنے خیالوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتے ہیں۔ ان کے جسم میں ایک عجیب قسم کی پھرتی سی آ جاتی ہے۔ ان کے دل میں باتیں کرتے رہنے کی بس باتیں کرتے کرتے ہی زندگی گذار دینے کی ایک پرزور تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ ایسے وقتوں میں وہ کسی کو بتانا چاہتے ہیں کہ انہیں پیسے کی پرواہ نہیں ہے نیز انہیں اپنی عورت کے چال چلن پر شک ہے۔ یا ان کے سب دوست انہیں لوٹنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو کسی پھڑکتی ہوئی دوشیزہ کو پھانس کر لا سکے، نیز عورت کا لطف سترہ اور بیس برس کے درمیان ہے۔ ورنہ اسے بڑھیا ہی سمجھنا چاہئے۔ نشے میں جھوم کر سیٹھ جی کہنا چاہتے ہیں کہ ہاتھ میں پیالہ ہو اور بغل میں کوئی ماہ لقا بیٹھی ہو، ایک ہو، دو ہوں، دس ہوں۔ اب ہوں۔ کل ہوں۔ ہمیشہ رہیں اور ایسی سب باتیں سننے کے لئے انہیں دیوار کی مانند ایک آدمی چاہئے جو گالیاں بھی سنے لعن طعن بھی سہے۔ تلوے بھی سہلائے لیکن

مسکراتا ہے اور اس کی زبان پر صرف ایک کلمہ ہوتا ہے: جی ہاں، جی ہاں۔ سیٹھ جی کو بھی منیجر ایسا ہی ملا تھا۔ منیجر کی طرح کے لوگوں کو پیسے کی کمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسی باتوں میں سیٹھ دل کے دلیر ہوتے ہیں۔ پی کر بہک سکتے ہیں، کچھ گالیاں سنتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ایک دس روپے کا نوٹ بھی اُس کے آگے پھینک دیتے ہیں کہ "جا بیرے" موڈ کر۔ عام طور پر ایسے "جی ہاں" کرنے والوں کو سیٹھ لوگ "بیرا" کہہ کر پکارا کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں۔ بیرے کو شراب ملتی ہے اور مرغ پلاؤ بھی۔ اُسے ہمیشہ اچھے اچھے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ لیکن سب سیٹھ جی کے خرچ پر۔ سیٹھ جی کا دل بہلانے کے لئے۔ آہستہ آہستہ بیرے کے احساسات کند ہونے لگتے ہیں۔ محسوس کرنے کی طاقت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ وقت کے ساتھ یہ طاقت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔

سیٹھ جی عیش و عشرت میں خلوت کے قائل نہیں۔ جب زہرہ جان یا اختری بائی کے سامنے محبت کے گیت گانے میں مشغول ہوتے ہیں تب بھی بیرا اُن کے پاس رہتا ہے۔ اُسے پاس رہنا پڑتا ہے۔ لیکن دوشیزہ سے دور۔ اُس کے پاس بیرے کی پہنچ نہیں ہو سکتی وہ اُسے پیاسی نگاہوں سے ہی دیکھ کر رہ جاتا ہے۔ زبان سے ہونٹوں کو چاٹ کر اپنی ہوس کو مٹا لیا کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھوں میں حسرت ——— تمناؤں کے کھنڈر ——— پیدا ہو جاتے ہیں۔

مردوں کے لئے بیرے کے دل میں حسد کی آگ روشن ہو جاتی ہے۔ لیکن منہ پر "جی ہاں" رہتی ہے اور عورتوں کے لئے ———۔ جو اُس کی نظروں کے سامنے ہو کر بھی اُس سے کوسوں دور رہتی ہیں۔ ایک بیزاری، ایک نفرت اُسے اپنے دامن میں لپیٹے رہتی ہے اور یہ سب خیالات بیرے کے چہرے پر دریا کے کنارے کے درختوں کے سائے کی طرح لہراتے رہتے ہیں۔ منیجر کا چہرہ بھی ان خیالات کا آئینہ ہے۔ آنکھوں میں حسرت، ہونٹوں پر نفرت، دل میں حسد۔

ایکٹر کی چال ڈھال اور ہی قسم کی ہے۔ وہ کئی چھوٹی موٹی ایکٹریسوں سے لطف اندوز ہوا ہے لیکن ابھی کسی ایسی ایکٹریس تک بار نہیں پایا جو اچھے گھر کی ہو اور ہیروئن ہو یا ہیروئن بننے والی ہو۔ اس کو اپنے گھر بار کا اتا پتا بتلاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے اس لئے اس کی تمنا ہے کہ کسی اونچے گھر کی بہو بیٹی کو اپنی محبت کے جال میں پھانس لے۔ وہ ابھی تک ذات پات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور گھرانے پر مرنے والوں میں سے ہے۔ وہ جن جن عورتوں سے آج تک کھیلا ہے اُن سے اُسے کوئی محبت نہ تھی۔ وہ اس کے لئے محض وقت کٹی کا ایک ذریعہ تھیں۔ لہٰذا اُس کے چہرے سے ایک بیزاری سی ٹپکتی ہے لیکن ہماری ایکٹریس کو دیکھ کر اُس کا دل ہواؤں میں پتے کی طرح لرزنے لگتا ہے۔

اُس نے ایکٹریس کو اپنی محبت سے بھری ہوئی کلیوں کی سوغات بھینٹ چڑھانے کے لئے اپنے من مندر کی دیوی بنا لیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی یہ محبت بھی دوڑتے ہوئے بادل کی طرح دو دن کی ہو لیکن آج کل تو ایکٹریس کی تصویر کو اپنے دل کے ساتھ لگائے پھرتا ہے۔ اُس کے گھر کی دیواریں، اُس کے میز پر پڑا ہوا البم ایکٹریس کی سینکڑوں تصویروں سے بھرپور ہے۔ ایکٹریس بہت خوبصورت ہے۔ اُس کا فوٹو عام طور پر اخباروں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ایک چہرے پر ملنے والی کریم کے اشتہار کے لئے۔ اُس نے اس کریم کا خود تو کبھی استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا لیکن کریم والوں نے اُسے بہت سا روپیہ دیا ہے یہ کہنے کے لئے کہ میرے چہرے کی تازگی اور شگفتگی اسی کریم کی وجہ سے ہے

اس میں شک نہیں کہ وہ ان تصویروں میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے، اور اصل میں وہ ہے بھی کھلی ہوئی کلی سی۔ ایکٹر اس کریم کی ایک شیشی ہمیشہ جیب میں رکھتا ہے۔ اسٹوڈیو میں اکثر اوقات اس کو استعمال میں لایا کرتا ہے۔ اُس نے ایکٹریس سے ظاہرا طور پر تو یہ کبھی نہیں کہا کہ میں اس کریم کا مشتاق اس لئے ہوں کہ یہ تمہاری پسندیدہ چیز ہے لیکن یہ سچ ہے کہ جب کبھی ایکٹریس اُس کے پاس ہو تو وہ کریم کی شیشی کسی بہانے سے باہر نکال کر میز پر رکھ دیتا ہے یا اُسے ہاتھ میں لے کر کھیلا کرتا ہے اس حرکت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ شیشی کو دیکھ کر ذرا مسکرائے اور جان لے کہ یہ سب اُسی کی خاطر ہے۔ اب تو ہمارے ایکٹر نے اپنا بھیس ہی بدل دیا ہے۔ پہلے تو وہ اچھا بھلا ہوا کرتا تھا۔ کوٹ پتلون سب کچھ پہنتا تھا۔ نکٹائی بھی لگاتا تھا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ ان کپڑوں کا اُس کے دل کی رانی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اب ان سب کو چھوڑ کر وہ ایک بنگالی آرٹسٹ کا نمونہ بن گیا ہے۔ ریشمی کرتا، سفید دھوتی، اور سفید ریشمی پٹکا۔ منہ میں پان۔ بال لمبے اور پیچھے کو پھینکے ہوئے۔ بات کرتا ہے تو گلے میں سوز پیدا کر کے اور ایک ہاتھ دل پر رکھ کر۔ یہ تمنا یہ ہوس۔ یہ ایکٹریس کو پالینے کی خواہش اُس کے چہرے پر جھلکتی ہے۔ وہ جو کام کرتا ہے موقعہ دیکھ کر مسکراتا ہے تو یہ سوچ کر کہ کیا اس وقت میری ایکٹریس مجھے مسکراتے دیکھنا چاہتی ہے یا غمگین۔ بات کرتا ہے تو رخ دیکھ کر کہ اب میری رانی بات کا کون سا پہلو صحیح سمجھے گی۔ وہ ہنستی ہے تو اور بھی زور سے ہنس کر اُس کے ہنسنے کی داد دیتا ہے۔ وہ چپ ہو جاتی ہے تو اُس کے وقار اور ضبط کی تعریف کرتا ہے۔ وہ چھینکے بھی تو جھٹ سے اپنا رومال نکال کر پیش کرتا ہے۔ ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ ایکٹریس کی کوئی چیز گرے اور میں اُسے اُٹھا کر دوں۔ وہ کرسی سے اُٹھنے لگتی ہے تو یہ پہلے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ "آئیے" کہہ کر راستہ دکھاتا ہے اُسے موٹر تک چھوڑنے جاتا ہے۔ اُس سے بات کرتا ہے تو ڈرامائی انداز سے اُس کی ہر بات میں اُسے شعریت نظر آتی ہے۔ وہ بولے تو منہ سے پھول جھڑتے

معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہنسے تو لڑکے کے دل پر بجلی گرتی ہے۔ یہ گلا، یہ زبان، یہ مسکراہٹ!

اور اس مسکراہٹ اور اس گلے کی تعریف میں پاگل ہونے والا صرف ہمارا ایکٹر ہی نہیں ہے۔ ہم بھی تعریف کئے دیتے ہیں لیکن اتنا ہوتے ہوئے بھی تعجب قدرت کے خلاف ایکٹرس ایکٹر کو مجبوری تک کر دیکھتی ہے۔ اس کا بس چلتا تو ہمارے ایکٹر کو جا بجا مار مار کر سٹوڈیو سے باہر نکال دیتی۔ اگر یہی آسانی سے عاشق اور معشوق میں باہمی محبت کا بیج پھوٹ پڑے تو قدرت کو فن کار کون کہے۔ ایکٹریس کا اپنا خاندان ہے لیکن ہیرو اس کو بے اعتنائی سے دیکھتا ہے۔ اس کی بدقسمتی ہمیں زیادہ ایکٹرس بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ وہ یا تو انہیں نیم وا رکھتی ہے جس سے ان میں سے ایک نشہ سا نکل کر چاروں طرف پھیلنے لگتا ہے۔ وہ آنکھیں اپنے اندر زندگی کے راز کو منعکس کرتی معلوم دیتی ہیں۔ محبت بھری، مست، رومانی۔ وہ گردن کو ذرا خم دئے رکھتی ہے جس سے اس کے کانوں میں لٹکتے ہوئے گول طرز کے آویزوں میں سے ایک تو قریب قریب کندھے تک آکر جھومنے لگتا ہے اور دوسرا ذرا سا اوپر اٹھ کر اس کے رخسار، بائیں رخسار کو چومنے لگتا ہے ـــــ وہ رخسار جس پر پاؤڈر کی ہلکی سی تہہ ہے اور اس پر غازے کی ہلکی سی بارش ہے۔ ریشمی گلابی ساڑی پہننے سے اس کے گالوں کا نقلی رنگ اور بھی نکھر آیا ہے۔ لب۔ مسکراتے لبوں پر لپ سٹک کا استعمال اس صفائی سے کیا گیا ہے کہ وہ نم دار ہو گئے ہیں اور وہ لمبی سفید گردن! ہیرو کی بدقسمتی کہ اس کو ان انمول چیزوں کی قدر نہیں کرنی آتی لیکن ہیرو کی کم نصیبی میں ہی ہماری خوش قسمتی پنہاں ہے کیونکہ اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے مل مل جاتے تو ممکن ہے یہ ایک ایکٹ کا ڈراما مصنف کے دماغ میں ہی رہ کر ضائع ہو جاتا۔

فلسفی ایک دبلا پتلا آدمی ہے، کوئی پچیس سال کا۔ دیس دیس گھوم آیا ہے۔ اس صحرا نوردی کا اس پر گہرا اثر ہوا ہے۔ بدقسمتی سے اس نے بہت عالی دماغ پایا ہے اور اپنے ذہن کے متواتر استعمال سے اسے اتنا تیز کر لیا ہے کہ جذبات یکسر مفقود ہو کر رہ گئے ہیں اور وہ ایک فلسفی بن گیا ہے۔ دنیا کی ہر ایک شے کو نقاد کی گہری نظر سے دیکھنے لگا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا کی رنگینی، چلبلاپن، مستی، سبھی نے اس سے ہمیشہ کے لئے منہ پھیر لیا ہے۔ اس دنیا میں خوش رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ آنکھیں بند کئے اپنی عقلِ حیوانی کا پیچھا کرتے رہنا اور جذبات کے سمندر میں غوطے لگاتے رہنا۔ خشک فلسفے سے آج تک کوئی شخص دنیوی مسرت حاصل کرتے نہیں دیکھا گیا

فلسفیوں کی خوشی اسی تصور میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا سمجھتے رہتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی دوسروں کی حیوانیت، ان کی بے وقوفی اور جہالت پر رحم کرنے اور آنسو بہانے میں ختم ہو جاتی ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ دنیا اس دکھی اور ادھوری زندگی کو کامیاب زندگی کہتی ہے۔

ہمارے فلسفی کو آج تک ہر جگہ سراب ملا، دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ اس نے محبت کی۔ دوشیزہ اسے چاہتی تھی، بہت چاہتی تھی۔ اس میں روپ تھا، گن تھا، شگفتگی تھی، ذہانت تھی لیکن ایک ہی مہینے میں فلسفی اس نازنین سے بیزار ہونے لگا۔ جب وہ اس سے ملتا اسے اس دوشیزہ کی خوبصورتی غیر قدرتی معلوم ہوتی اور اس کی نزاکت ایک فریب۔ اس کا علم سطحی دکھائی دیتا اور اسی کے گن ایک زمانہ سازی۔ اس کا دل اس سے پرے ہٹتا اور پرے ہی ہٹتا چلا گیا۔ لیکن ظاہری طور پر ان میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ کبھی کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چاندنی رات میں باہر گھومنے جایا کرتے۔ ویران جگہوں پر سمندر کے کنارے جہاں لہروں کا گیت روح میں سما جاتا ہے اور محبت کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ کبھی کبھی محبت کے جوش میں دوشیزہ اس کا ہاتھ بھی دبا دیتی اور وہ بھی ہاتھ دبا کر اس کا جواب دیتا۔ دونوں کے جسموں میں بجلی سی دوڑ جاتی لیکن بات کچھ وہیں ہی رہتی۔ اور اسے اپنی بے وقوفی پر ہنسی آنے لگی۔ چاندنی رات اور سمندر کا کنارا! شاعروں نے ایسے ماحول کو محبت کی کامیابی کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ یہ شاعر کا تصور ہے۔ ہماری اصلیت میں بھی تصور کی بڑی آمیزش ہے۔ ٹھیک تو یہ ہے کہ اصلیت کے اسی خیالی حصے کو ہم رومان کہتے ہیں۔ اپنی محبوبہ سے بار بار ملنے پر یہ رومان گم ہو گیا اور اس کی معشوقہ بھی اور لڑکیوں کی طرح ایک معمولی لڑکی نظر آنے لگی۔ ایک دوسرے کے ہاتھ کو دبانا بھی جاری رہا۔ لیکن وہ بجلی اور شوق جس سے اس کا سارا جسم اور دماغ تھرا اٹھتا تھا، جاتا رہا۔ اب تو فلسفی صرف اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے سوچتا کہ سبھی عاشق ایسے ہاتھ دبانے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ میں بھی ان کی پیروی کرتا ہوں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔

کچھ وقت اور گذر گیا۔ فلسفی کو ایک نئی بات محسوس ہونے لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دل میں اپنی محبوبہ کے ساتھ چاندنی رات میں سمندر کے کنارے گھومنے کی پُرزور خواہش رہتی ہے اور جب تک رات نہیں پڑتی اس کے ساتھ گھومنے کے خیال سے اس کے سارے جسم میں ایک برقی لہر دوڑتی رہتی ہے لیکن جب وہ اپنی محبوبہ سے چاندنی میں سمندر کے کنارے ملتا ہے تو اسے کچھ لطف نہیں آتا۔ اپنی محبوبہ سے ملنے کی تمنا اسے تمام دن

ستاتی رہتی ہے۔ لیکن ملاپ پھیکا ثابت ہوتا ہے۔ اُسے اپنے دل کو بزور منانا پڑتا ہے کہ وہ اس ملاپ سے مسرت حاصل کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اپنے تصوّر کی محبوبہ کی محبت میں مطمئن رہ سکتا ہے اور یہ ختم نہ ہونے والی خوشی اُسے اُسی وقت تک وجد میں رکھ سکتی ہے جب تک اس کی محبوبہ مجسم شکل میں اُس کے سامنے نہیں آتی۔ تب وہ بھی اور لڑکیوں کی طرح ایک عام لڑکی بن جاتی ہے۔ اس طرح اپنی دماغی طاقت کے صرف سے وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اصل میں حقیقت تو تصوّر اور تخیّل میں ہے۔ بیرونِ تخیّل سب دھوکا ہے۔ وہ بڑی امیدوں کے ساتھ مشہور فنکاروں اور مصنفوں کے پاس گیا۔ انہوں نے زمانے بھر کی گندی اور بھدّی باتیں کیں۔ وہ سدھو مہاتماؤں کے پاؤں پر شردھا اور بھگتی کے پھول چڑھانے گیا۔ اُس نے انہیں لاعلمی اور جہالت کے مجسّمے پایا۔ وہ بلند توقعات لے کر اپنے دوستوں سے ملنے گیا۔ ایک کو اس نے ہمیشہ اپنے دفتر کی فائلوں پر جھکے ہوئے پایا اور اُسے دو گھنٹے تک دوست کی بیوی سے اپنے بچوں کی خوش اطواری کے متعلق لیکچر سننے پڑے۔ ایک دوسرے دوست کی بیوی کو اس نے ہمیشہ اپنے خاوند سے پوچھتے پایا کہ میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں، کرتی ہوں، یا نہیں؟ اور ایک تیسرا دوست بھی ہے جو زیادہ بات کرنا ہی نہیں جانتا۔ ایک آدھ بات کو ہی بار بار دہرائے جاتا ہے اور ہر دس منٹ بعد کہتا رہتا ہے "آؤ کچھ کھیلیں۔ میں تاش بھی لے آیا ہوں اور شطرنج بھی۔" اس کو وقت گزارنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں نظر آتا۔ یہ سب باتیں دیکھ دیکھ کر فلسفی کے دل میں ساری دنیا کے لئے ایک ہلکی سی نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ اُسے دنیا کے رہنے والے لاعلمی کے جنگل میں گمراہ بھیڑوں کی طرح بھٹکتے ہوئے معلوم ہونے لگے ہیں جو ابھی تک اصلیت کو نہیں سمجھ سکے۔ رفتہ رفتہ اُسے اپنی برتری کا یقین ہونے لگا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک گہری مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ وہ دنیا کی برائی بھلائی کو دیکھتا ہے۔ نازنینوں اور نوجوانوں کو آپس میں محبت کرنے کی کوشش کرتے دیکھتا ہے۔ چھوٹوں کو بڑا بننے کا راستہ ڈھونڈتے دیکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے کو ٹھگنے کے ذرائع سوچتے ہوئے دیکھتا ہے اور وہ مسکراتا رہتا ہے ـــ اپنی برتری کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رہتی ہے۔

تاہم یہ سب مایا ہے کی جھلک فلسفی کے چہرے سے صاف عیاں ہے۔ اُس کے دُبلے پتلے چہرے پر منطق کی مہر لگی ہوئی ہے۔ آنکھیں سست سی رہتی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی چیز کو ڈھونڈھ رہی ہوں۔

ایکٹریس کے متعلق اور کیا کہیں؟ وہ تو اپنے لفظوں سے اپنا حال خود ہی بتا دے گی۔ جن افراد کو اس ڈرامے میں گونگے بنے رہنا ہے اُن کی حالت پر رحم کھا کر ہم نے اُن کی بابت کچھ کہہ دیا ہے۔ جس وقت یہ ڈراما شروع ہوتا ہے، ساتھ کے گانے والے کمرے سے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ ہلکی سی۔ میٹھی سی۔ سٹوڈیو کا مالک، ہیرو وغیرہ سبھی اس موسیقی کے کمرے میں ہیں ایک نئی ایکٹریس کے گانے کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اچانک گانا بند ہو جاتا ہے۔ تالیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ ایکٹریس، مینجر، ایکٹر ٹھٹھک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ فلسفی یونہی چھت کی طرف دیکھنے میں مشغول ہے۔ گانے کی آواز پھر شروع ہو جاتی ہے۔ ایکٹریس اپنی کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے کہتی ہے)

ایکٹریس: "اپنے آپ کو دھوکا دینے کی بھی حد ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

[ایکٹر توجہ سے سننے لگتا ہے۔ مینجر ایک بار آنکھیں اُٹھا کر ایکٹریس کی طرف دیکھتا ہے، پھر اپنا رجسٹر دیکھنے لگتا ہے۔ فلسفی آنکھوں کو چھت سے ہٹا کر انہیں ایکٹریس کے چہرے پر گاڑ دیتا ہے۔]

"۔ ۔ ۔ ۔ اپنے آپکو دھوکا دینے کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہ شمشاد بانو ہے نا! وہی جو سلور ٹاکیز میں کام کرتی تھی۔ شاید اپنے کو اداکاروں کی پہلی صف میں سمجھتی ہے۔ وہ کون سی تصویر تھی مینجر جس میں اس نے ابھی ابھی کام کیا ہے؟ وہی جو پربھات سینما ہاؤس میں چل رہی تھی، "بھولی ہوئی یاد"۔ کہا! نہیں "پرانی یاد"۔ اُس میں اس نے ہیروئن کا کام کیا ہے نا! ہیرو کی محبوبہ بنتی ہے۔ بڑے گھر کی بہو۔ یہ خوب! یہ بازار کی چھوکری۔ یہ کیا جانے اونچے گھر کی لڑکیوں میں کیا قدرتی نفاست ہوتی ہے۔ کتنے ہاتھ پاؤں چلاتی تھی۔ کیسے آنکھوں کو مٹکاتی تھی۔ نخروں سے بھی کبھی کوئی بڑا بنا ہے۔ لیکن اس بے چاری کو کیا معلوم۔ وہ تو سمجھتی ہوگی میرے ایکٹنگ میں جادو ہے۔ تصویر دیکھ کر تو مجھے خود شرم آ رہی تھی لیکن اُس پر غصہ آنا بیکار ہے۔ وہ اس قابل ہی نہیں۔ ہاں مجھے یہ افسوس ضرور تھا کہ ڈائرکٹر کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے تھے۔ اُس نے شاید اس کے گلے کی مٹھاس پرست ہو کر اس کو ہیروئن کا پارٹ دے دیا [گانے کی آواز تیز ہو جاتی ہے] گانا! چلو مینجر، ہم بھی سُنیں، گانا تو برا نہیں معلوم ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

[ایکٹریس اُٹھ کر چلنے لگتی ہے۔ ایکٹر بھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایکٹریس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ مینجر اور فلسفی بیٹھے رہتے ہیں۔ صرف نگاہوں سے دونوں جانے والوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ ایکٹریس دروازے تک پہنچ کر رُکتی ہے۔ ایکٹر بھی ٹھہر جاتا ہے۔ وہ مُڑ کر مینجر اور فلسفی کی طرف دیکھتی ہے مینجر کی آنکھوں میں نفرت ہے۔ گویا کہہ رہی ہوں "میری طرف سے جہنم

میں جاؤ، مجھے کیا؟ فلسفی کی آنکھوں سے مہربانی اور ہمدردی ٹپکتی ہے... ع

ایکٹریس (کچھ سوچ کر) کیا جاتا ہے۔ جاکر یہ آپ کو ہی ذلیل کروں گی یہ تو معمولی نوکری تو ہے نہیں جو محض گھنے کے بل پر کسی کو ہیروئن کا پارٹ دے دیا جائے گا (واپس اپنی جگہ پر آتے ہوئے) ہمارے ہیرو کو یوں ایک ہی جست میں چوٹی پر پہنچ جانا ٹھیک نہیں تھا۔ اُس کا راستہ کرپٹ پر چلنے کے لئے تھا۔ آہستہ آہستہ ایک ایک سیڑھی چڑھ کر جانا ضروری ہے۔ اچھی طرح سے سوچ سمجھ کر ہر ایک سیڑھی پر پیر رکھ یوں لینے کا ڈر نہیں رہتا۔ درحقیقت سے چوٹی پر پہنچے ہوؤں کا لڑھکنے کا خدشہ ... ہوتا۔ (فلسفی دستمبر کی طرف دیکھ کر) تمہیں پتہ نہیں ہے فلسفی۔ (دیوار پیرونی سستی صحبت کو کس قدر جلا دیتی ہے۔ سمندر ہی کے لئے ایک تاپنیدہ علم کتنی سستی ہے۔ میرے فلموں میں آنے کی وجہ بھی تو یہی ہے۔ زنجیر سے چمٹ جاتی ہے۔ اپنے ہینڈ بیگ میں سے آرام سے ہیرو کا ایک چھوٹا سا فوٹو نکال کر اسے بڑی عزت اور پیار کی نگاہوں سے دیکھتی ہے) آہ! میں اُس کی کتنی ممنون ہوں اُس نے مجھے اپنی دلی خواہشوں کو پورا کرنے کا موقع دیا۔ ہیرو کے ایکٹنگ کا مجھ پر گہرا اثر تھا۔ جس ... میں اُس نے کام کیا میں اُسے بار بار دیکھا کرتی تھی۔ مجھے یہ خیال ہونے لگا تھا کہ ہیرو دل ہی دل میں بہت دکھی ہوگا میرے خیال میں اُسے آج تک ایسی کوئی ہیروئن نہیں ملی تھی جو اپنے باکمال ایکٹنگ سے ہیرو کی دبی ہوئی طاقتوں کو اُکسا سکے۔ اسی لئے مجھے ہیرو کا کام بہت اچھا تو معلوم ہوا لیکن اس میں کچھ الہامی کیفیت کی کمی تھی۔ وجہ یہ کہ اگر کوئی ہیروئن گانا اچھا جانتی تو اداکاری میں بالکل کوری ہوتی۔ کوئی صرف خوبصورت ہوتی کسی کا صرف تلفظ ٹھیک ہوتا لیکن سبھی دلی جذبات کو خوش اسلوبی سے ظاہر کرنے میں ناکامیاب رہتیں۔ میں ہیرو کی فلموں کو بار بار دیکھتی گھر پر آتی تو اپنے کو ہیروئن سمجھ کر ایک خیالی ہیرو کے ساتھ پارٹ ادا کرتی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر تصویر کے واقعات کو دہراتی۔ ہیروئن کو یوں کرنا چاہئے تھا یوں۔ تب تصور میں سوچتی کہ کیسے میری اعلیٰ ایکٹنگ سے ہیرو کے فن کی برتر طاقتیں خواب سے بیدار ہو رہی ہیں کیسے وہی تصویر جو ہیروئن کی لاعلمی کی وجہ سے ایک معمولی فلم تھی، اب بڑھتے بڑھتے فن کے لحاظ سے ایک اونچے درجے کا کھیل بن گئی ہے۔ بس ہیرو کو ایک مجھ جیسی پڑھی لکھی ہیروئن کی ضرورت ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑی کھڑی میں اپنے فن کی قابلیت کے نشے میں جھومنے لگتی اور انہی دنوں جب میں نے تازہ تازہ بی اے پاس کیا تھا اور جب میرے دل میں آرٹ اور فن کو ترقی دینے کا جوش تھا۔ مجھے سہارا دینے کے لئے ہیرو خود آ پہنچا۔ میری آرزوؤں کو مجسم صورت دینے کے لئے ایک دیوتا کی طرح نمودار ہوا۔ پردۂ سیمیں پر وہ صرف ایک خوبصورت فن کار معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقت میں وہ اس سے بھی بڑھ کر نکلا۔ میں تو اس پر فریفتہ ہو کر رہ گئی۔ میں فلموں میں آنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے مجھے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ ایک اچھے گھر کی لڑکی کے لئے سٹوڈیو سے بڑھ کر دوسری کوئی بُری جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ خوف اب دُور ہو گیا جس فلم کمپنی میں ہیرو جیسا سادہ لوح اور اچھا فن کار ہو وہاں برائی کبھی نہیں آ سکتی۔ میرے خیال میں ہیرو سے کسی بُری حرکت کی اُمید کرنا بھی گناہ تھا۔ اس بات کا مجھے پورا یقین ہو گیا اور ایک بات ایسی ہوئی کہ میرا فلم کمپنی میں جانے کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہیرو اور کمپنی کا مالک ہمارے شہر میں ایک خاص کام کے لئے آئے ہیں۔ دونوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے چائے پارٹی دی۔ اُن کو سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا۔ اس کے جواب میں ہیرو نے اُٹھ کر شہر کے لوگوں کا شکریہ ادا کیا کہ اُس کے لئے شہر والوں کے دل میں اتنی عزت ہے۔ اس کے بعد ہیرو نے کہا کہ میں تو ہمیشہ یہی کوشش کرتا رہا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح آرٹ کی خدمت کر سکوں۔ مجھے خوشی ہے کہ شہر میں فن کی قدر کرنے والے اور اسے سمجھنے والے موجود ہیں۔ میرا دل دھڑک اُٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا ہیرو کا اشارا میری ہی طرف ہے۔ گویا وہ میری طرف ہی دیکھ رہا ہے اور یہ سن کر تو میں جھوم اُٹھی کہ وہ وقت آپہنچا ہے جب فلم کمپنیوں کو بے علم اور جاہل آدمیوں سے اور بازاری عورتوں کی گندگی سے صاف کر دیا جائے۔ سینما بھی ایک آرٹ ہے باقی فنون سے برتر کیونکہ اس میں ہم ہیرو اور ہیروئن کو دیکھ سکتے ہیں۔ اُن کے سُکھ دُکھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ ہم اُن سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ آج تک ہندوستان کے سینما کی بُری حالت اس لئے رہی ہے کہ ابھی تک شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں اس میں آنے سے جھجکتی رہی ہیں۔ میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اب فلم کمپنیوں میں گندگی کا زمانہ ختم ہونے کو ہے۔ جوان لڑکیاں اپنے گھر کے اصولوں کو۔ اپنے ولولوں کو۔ اپنی عصمت کو کسی قسم کے ڈر اور خطرے کے بغیر محفوظ رکھ سکیں گی... کم سے کم ہماری فلم کمپنی میں تو کوئی خدشہ نہ ہوگا۔ اب احیائے قومی کا وقت ہے۔ سبھی فنون میں ایک نئی زندگی کا موقع ہے۔ اودے شنکر کو دیکھئے سادھنا بوس کو دیکھئے انہوں نے ناچ کے فن کو بازاری عورتوں کے پنجے سے چھڑا کر ایک قومی فن کا درجہ دیا ہے۔ دشنو دگمبر اور اونکار ناتھ کو دیکھئے انہوں نے موسیقی کو میراثیوں کے پنجے سے چھڑایا ہے۔ اور یہ سب لوگ اچھے گھرانوں کے ہیں۔ ملک و قوم اور فن کی ترقی کے لئے انہوں نے اپنا سب

کچھ قربان کر دیا۔ اور آج ہر گھر میں ناچ اور گانا سکھایا جاتا ہے۔ ایسے ہی اب فلمی صنعت میں بھی قربانی کی ضرورت ہے۔ طوائفوں اور بازاری عورتوں سے تو اس آرٹ کی ترقی ہو چکی۔ اس نئی زندگی کے لانے میں جب تک اچھے گھر کی بہو بیٹیاں حصہ نہیں لیں گی اس فن کی کمتی معلوم! کتنا بھڑکانے والا پیام تھا۔ مجھے یوں معلوم ہونے لگا کہ مجھے بلاوا آپہنچا ہے۔ میرے دل سے ایک آواز آئی اُٹھ! جا! ایک قومی صنعت کو تیری خدمات کی ضرورت ہے۔ سماجی بندھنوں کو توڑ ہمت اور حوصلے سے کچھ کر کے دکھا! ہیرو خود اچھے گھر کا لڑکا تھا۔ وکالت پاس کر چکا تھا اور اب اُس نے اپنا سب کچھ فلمی صنعت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ میرا سر اُس کے قدموں پر جھکنا چاہتا تھا۔ میرے دل میں اپنی برتری کا طوفان اُمڈ پڑتا تھا۔ کچھ کر کے دکھانے کی تمنا میرے دل میں تھی۔ دنیا میں نام پیدا کرنے کی مجھے خواہش تھی۔ اس سے اچھا کونسا موقع ہو سکتا تھا۔ میں نے ہیرو سے فلمی صنعت میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے مسکرا کر "ہاں" کہا فلسفی، مجھے اب تک یاد ہے کہ ہاں کہتے وقت ہیرو کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک سی آگئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بھی مجھ میں اپنی دلی ہیروئن کو پہچان لیا ہو۔ میں خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ گھر والوں نے کچھ کہا سنا۔ نگار خانے کے گندے ماحول کا ذکر کیا۔ باپ دادا کے نام اور آبرو کا واسطہ دلایا۔ لیکن میں تو فیصلہ کر چکی تھی۔ میری آرزو تو یہ تھی کہ ان سب کو دکھا دوں کہ ایک کامیاب ایکٹریس بننے کے لیے اپنی عصمت کو بیچنا یا اپنے کو ذلیل کرنا ضروری نہیں ہے۔ میں انہیں یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ صحیح فن اور بلند خیالات ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ اور فلسفی میں خوش ہوں کہ میں چلی آئی۔ میں نے ابھی تک اپنی عزت پہ آنچ نہیں آنے دی۔ خوشی سے گھر کا کاروبار بھی چلا رہی ہوں اور رفتہ رفتہ فلمی دنیا میں بھی نام پیدا کر رہی ہوں۔ ہیرو نے کہا تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھانا۔ میں اس کی نصیحت پر عمل کر رہی ہوں۔ پہلی تصویر میں میں نے نوکرانی کا پارٹ ادا کیا تھا۔ دوسری میں بھکارن کا۔ پچھلی تصویر میں میں ہیروئن کی سہیلی بنی تھی۔ آہستہ رفتاری ہے لیکن یقیناً میرے قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک دن میری تمنا بر آئے گی۔ ایک دن جب میری اداکاری پختہ اور بے عیب ہو جائے گی تو ہیرو مجھے اپنے ساتھ ہیروئن کا پارٹ دے گا۔ تب دنیا دیکھے گی کہ آرٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا کسے کہتے ہیں اور آج یہ بازار کی چھوکری ہیروئن بننے آئی ہے۔ ہمارے ہیرو کے ساتھ تو تتلیاں بھی جنت کے خواب دیکھنے لگیں۔ چہ خوش! [قہقہہ] [ایکٹریس ہیرو کے فوٹو کو ہاتھ میں تھامے کرسی میں پیچھے کو سر پھینک کر قہقہہ لگاتی ہے۔ اس کی گردن ـــ لمبی حسین گردن اور بھی حسین دکھائی دینے لگتی ہے۔ فلسفی اس کی طرف ہمدردی اور رحم کی نظروں سے دیکھ کر کہتا ہے]

فلسفی۔ تم کبھی ہیروئن نہیں بنو گی۔ اگلی تصویر کی ہیروئن شمشاد بائی ہو گی...

[ہیروئن کی ہنسی یکایک رُک جاتی ہے۔ وہ فلسفی کی طرف دیکھ کر کہتی ہے]

ایکٹریس۔ نہیں یوں کبھی نہ ہو گا، یوں بھلا کیوں ہونے لگا!

فلسفی۔ تم نے ہیرو سے اپنے جسم کو محفوظ رکھا، تم کبھی ہیروئن نہیں بنو گی.......!

ایکٹریس۔ آہ! [ایکٹریس زور سے ہنسنے لگتی ہے۔ پھر ایک دم رُک جاتی ہے۔ اُس کے چہرے پر ایک خلا سی آجاتی ہے۔ جوں جوں فلسفی کی بات کا مطلب اس کی سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ آنکھیں اور بھی کھل جاتی ہیں] جسم فلسفی (وہ بھولی ہوئی سی ایکٹر اور مینجر کی طرف دیکھتی ہے پھر ہاتھ میں تھامی ہوئی ہیرو کی تصویر پہ نگاہ ڈالتی ہے اور پھر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کچھ دیر تک فلسفی کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے آپ پر قابو پا کر کہتی ہے] جسم فلسفی میں نے ابھی تک اپنا جسم نہیں بیچا۔ تم ٹھیک کہتے ہو میں ہیروئن نہیں بننے کی۔ اب ساری باتیں میری سمجھ میں آنے لگی ہیں کتنی کھوکھلی ہنسی تھی اس کی جب میں نے اُسے پہلی بار بتایا تھا کہ میری شادی ہونے لگی ہے۔ وہ ایک منٹ تک بالکل گم سم ہو کر میری طرف دیکھتا رہا تھا۔ پھر ایک پھیکی سی ہنسی کے ساتھ اس نے کہا تھا "بڑی اچھی بات ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے۔" مجھے کیا معلوم تھا۔ یہ ہنسی اس فلم کمپنی میں میری ترقی کی موت کا وارنٹ ہے۔ میں تو شادی کر کے ہمیشہ کے لئے اپنے جسم کو اپنے خاوند کے سپرد کر چکی تھی۔ میں ہیروئن کیسے بنتی! ہیرو میری بے وقوفی پہ ہنستا ہو گا۔ میں کتنی بھولی تھی میں نے ایک چالاک آدمی کی باتوں پر یقین کر لیا تھا۔ (ایک پھیکی مسکراہٹ چہرے پر لا کر) اور تمہیں پتہ ہے فلسفی کہ میں نے شادی کیوں کی تھی۔ ہیرو نے کہا تھا کہ ہمیں باعصمت اور عزت والی عورتیں چاہئیں۔ مجھے اپنی عزت کو محفوظ رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ بدقسمتی سے میں خوبصورت تھی۔ میری پہلی فلم کے بعد ہی میرے دوستوں کا حلقہ بہت بڑھ گیا۔ سبھی مجھ کو اپنا بنانا چاہتے تھے۔ اُن کے خیال کے مطابق تو سینما میں کام کرنے والی سبھی عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ایکٹریس بھی عصمت اور عزت کی قدر کرنے والی ہو سکتی ہیں۔ اپنے آپ کو [illegible] کے لئے میں نے بیاہ

کر لیا۔

فلسفی بن بھول گئی کہ زبان تو جانور آدمیوں کے پاس اپنے خیالات کو چھپانے کا ذریعہ ہوتی ہے، انہیں ظاہر کرنے کا نہیں۔ مجھے ہیرو کی باتوں نے دھوکا دیا تھا اُس نے کہا تھا ہم اپنے کام کے رستے میں مجھے اخلاقی دیواروں کو پھلانگتے ہیں اور دوسری بھولی لڑکیوں کی طرح میں بھی کچھ سمجھی ... جو کچھ زبان سے کہتا ہے اُس کے دل کا مطلب بھی وہی ہوتا ہے ... اسی میں ... لیا جائے اور ... ہوگی جب ایسے ... کی ... پر ... ہیں ... انہیں ... میں ان کی ... کو ... کمپنی میں ... موقعہ نہیں ملتا۔ مجھے اس ... ہو سکتی تھی ... کے ... آ گئی ... کو ... اس کے ... اور ... مرعوب ہو گئی تھی۔ اُس نے ... کمزوریوں کا پورا فائدہ اٹھایا۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مجھے آئے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں لیکن آج تک میں ہیروئن نہیں بن سکی۔ ہیرو ... مجھے ٹالتا ہی رہا ہے کبھی کچھ کہہ کر، کبھی کچھ کہہ کر۔ اب سمجھی ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا رہا۔ اُس کی خواہش تھی کہ میں اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دوں، پھر میری قسمت کا ستارا ... پڑا جاتا۔ لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ہیرو جتنا دیکھنے میں ... اتنا دل کا صاف نہیں ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میری ساری زندگی خراب ہو جائے گی۔ سینما میں ... آج کل کے ہندوستانی سینما میں تو ترقی کا واحد راستہ اپنے حسن سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ہے۔ ہوتا ہوگا میں نے کہا تھا اب اصلاح کا زمانہ ہے۔ اب فنونِ لطیفہ کو طوائفوں اور بدمعاشوں کے ہاتھوں سے بچانے کا موقعہ آ پہنچا ہے۔ اپنے آپ میں گن ہوں، حوصلہ ہو، تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مجھے سیٹھ کی طرف سے تو کچھ اُمید نہ تھی۔ وہ تو کمزوریوں کا پتلا تھا۔ اُس کی تو ساری زندگی صرف عورتوں کے جسم دیکھنے ہی میں گزری تھی لیکن مجھے ہیرو پر بھروسہ تھا۔ وہ میرے تصور کا دیوتا تھا۔ اُس کے خلاف میں کوئی بات سننے کو تیار نہ تھی۔

ہیرو نے کہا تھا سیڑھی کے پہلے زینے سے کام شروع کرو جیا و بختہ ہوتی چلی جائے۔ مجھے بھی ایک دفعہ فلم کا درخشاں ستارہ بن کر پھر ہمیشہ کے لئے غروب ہو جانا پسند نہ تھا لیکن اب معلوم ہوا بات تھی جس کے لئے وہ مجھے پہلے زینے سے کام کرنے کو کہتا تھا تاکہ میں اچھی طرح سے اس کے شکنجے میں پھنس جاؤں۔ فلم میں کام کرتے وقت میں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ لوگوں نے بھی میرے کام کو بہت پسند کیا تھا۔ نقادوں نے خاص طور پر میرے کام کی تعریف کی تھی۔ انہوں نے مجھے ... کا ہونہار ستارہ کہا تھا۔ ہیرو نے بھی مجھے ... تم اچھا کام کرتی ہو۔ ایک نہ ایک دن تمہیں ضرور ہیروئن کا پارٹ ملے گا۔ لیکن یہ سب میری شادی سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب سکھ کے خواب تھے۔ ہیروئن اب ایک دوسری عورت بنے گی۔ (اس کا گانا گانے کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ آدھ منٹ تک سب خاموشی سے سنتے ہیں۔ ایکٹریس پھر منیجر کی طرف دیکھ کر کہتی ہے) خوش ہو جیے منیجر صاحب آپ کے ہیرو کو ایک نئی ہیروئن مل رہی ہے اور آپ کو بھی۔ (ستواں گلے میں چاندی ہی چاندی ہے۔ ہنستی ہے لیکن قہقہہ کچھ کھوکھلا سا ہے) ہمارا ہیرو اور یہ ہیروئن، ایک کی صورت اچھی۔ اپنے کام کا ماہر ... من موہن ہے دوسرے کی زبان میں مٹھاس ہے، چال ڈھال میں ... فلم بہت کامیاب رہے گی۔ ایک تو اتنا مشہور ڈائرکٹر اور پھر یہ ہیرو اور ہیروئن کی جوڑی۔ میں کہتی ہوں منیجر صاحب سیٹھ نونہال ہو جائے گا۔ آپ کو بھی ترقی مل جائے گی۔ سیٹھ نے جو نیا سٹوڈیو بنانے کا ارادہ کیا تھا وہ بھی پورا ہو جائے گا۔ میرے ہیروئن بننے سے بھلا یہ باتیں کہاں ہو سکتی ہیں ......

ایکٹر: نہیں نہیں میری رانی، تم ہیروئن بنو گی۔ میں کہے دیتا ہوں سیٹھ کو تمہیں ہیروئن بنانا پڑے گا۔ میں کمپنی کو چھوڑ جانے کی دھمکی دے دوں گا۔ تمہیں فکر کس بات کی ہے میری رانی؟ یہ بازاری چھوکری .....

ایکٹریس: (بات کاٹی جانے کی وجہ سے غصے سے بھری ہوئی ایکٹر کی طرف دیکھتی ہے پھر منیجر کو مخاطب کر کے اپنی بات جاری رکھتی ہے) میں ٹھہری ایک معمولی عورت۔ مجھے اداکاری بھلا کہاں سے آئے۔ میں کچھ قربانی کئے بغیر ہیروئن بننا چاہتی تھی۔ آخر

حوصلہ .....!

یکٹر:۔ نہیں میرے دل کی رانی تم اب بھی میری ہیروئن بنو گی تم.....

یکٹریس:۔ (اچانک اُس پر جھپٹ کر) چپ رہ بدتمیز! کل کے چھوکرے! تو بھی مذاق کرنے چلا ہے۔ مجھے اپنی ہیروئن بنائے گا۔ چہ خوب! جس کو بنانا چاہیے تھا وہ تو اوروں کے تلوے چاٹتا پھرتا ہے۔ اور اب آپ میرے ہیرو بنیں گے! اُس نے تو مجھے ہیروئن بنانے کا معیار میرے جسم کو ٹھہرایا تھا، تم کیا چاہتے ہو؟ کچھ نہیں؟ جھوٹا! بکتے ہو۔ آدمی ہمیشہ عورتوں سے ایک ہی چیز مانگا کرتے ہیں۔ وہ قیمت ادا کئے بغیر کوئی عورت کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ دنیا آدمیوں کی بنائی ہوئی ہے۔ یہاں مردوں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے عورت دوزخ میں جائے یا بہشت میں۔ کتا تبھی ہاتھ چاٹتا ہے کہ اُسے ہڈی کی امید ہو۔ تم لوگ طرح طرح کے جال پھیلاتے ہو۔ مگر تم سب کی منزل ایک ہی ہوتی ہے۔ تمہارے ہیرو ہی کے ہاتھوں میں اس کمپنی میں نوکری ڈھونڈنے والی عورتوں کی قسمت ہے۔ اس کو اپنی طاقت کا علم ہے۔ ایک کے بعد کئی عورتیں یہاں ہیروئن بننے کے لئے اپنی قیمت چکانے آئی ہیں وہ سیر ہو چکا ہے۔ نواب کو دھن کی کھوج میں نہیں جانا پڑتا امیر بننے کے خواہشمند خود ہی اس کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں۔ ہیرو بھی اپنی طاقت کے نشے میں مست پھر رہا ہے۔ صرف شروع میں اپنا جال پھیلاتا ہے کہ بھولی عورت پھنس جائے۔ پھر اُسے بھول جاتا ہے وہ آپ اُس کے پاؤں چومنے آئے گی۔ اس نے میری کمزوریوں سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور لڑکیوں کی طرح مجھے بھی سینما کا شوق تھا خوش کن تصورات اور تمنائیں سب کی زندگی میں ہوتی ہیں۔ ہر کسی کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب تخلیقی کام کرنے کی خواہش بہت شدت اختیار کر جاتی ہے۔ یہ تغیر کا وقت ہوتا ہے۔ بہت خطرناک! زندگی کی کشمکش میں کودنے سے پہلے ہی ایسے موقعے آیا کرتے ہیں اور پھر کشمکش ہر کسی کو ایک عام انسان بنا دیتی ہے۔ میں بھی زندگی کے ایسے ہی دور سے گزر رہی تھی میں اپنی چھپی ہوئی طاقتوں کی نمائش چاہتی تھی۔ ہیرو نے کہا "چلو چلو میرے ساتھ بمبئی چلی آؤ" اور یہاں لا کر اُس نے مجھے خود راستہ ڈھونڈنے کے لئے چھوڑ دیا۔ جب کبھی کوئی ایکٹریس اس کے پاس ہیروئن بننے آئے گی تو وہ اُسے اس بلند مقام کی قیمت بتا دے گا۔ شادی کر کے میں تو اپنے خاوند کی ہو چکی تھی۔ لیکن تم تو ابھی ہیرو نہیں ہو۔ تمہارے ہاتھوں میں ابھی کسی کی قسمت کے بنانے یا بگاڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ تم یہ سوچ کر کہ عورتیں خود بخود تمہارے پاس دوڑی آئیں گی، آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔ تمہیں خود اُن کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اُن کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اپنے آپ کو ذلیل کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں خیال ہے تم اونچے درجے والی عورت چاہتے ہو۔ لیکن تم اپنے کو اور دنیا کو دھوکا دے رہے ہو۔ اصل میں تم خواہش کر رہے ہو ایسی عورت کی جو تمہیں آسانی سے نہیں مل سکتی۔ جو تمہاری پہنچ میں ہیں اُن کی تم پروا نہیں کرتے۔ آسانی سے ملے ہوئے پھل کو چکھنے سے دل کی ہوس نہیں مٹتی۔ تمہاری مردانگی کو صدمہ پہنچتا ہے جب تمہیں خیال آتا ہے کہ ابھی تک تم کسی اچھے گھر کی لڑکی کو نہیں پھانس سکے اور تم اُن کی محبت کا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہو۔ آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو عافیت اور عقل کا واحد نگہبان اور رکھوالا سمجھتا ہے۔ ہر ایک پر اپنا سکہ جمانا چاہتا ہے اور اس کے لئے کیا کیا جال بچھاتا ہے۔ ہیرو اپنی طاقت کے رعب سے شکار پھانستا ہے لیکن تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس لئے تم ناک رگڑ کر یہ کام کرانا چاہتے ہو۔ کسی اور کے پاس پیسہ ہوگا وہ پیسے کا لالچ دے کر اپنا جال پھیلائے گا۔ اُس کو اپنی دولت ہی اپنی سب سے بڑی طاقت نظر آئے گی۔ مجھے تو حیرانی ہوتی ہے کہ مردوں کی اصلی تمنا کتنی محدود ہوتی ہے۔ سب کی ایک ہی منزل ہوتی ہے۔ عورت۔ عورت نہیں۔ عورت کا جسم (چیخ کر اپنے ہاتھ میں ہیرو کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے) یہ تمہارا ہیرو ہے۔ سارے مردوں کا نمائندہ۔ سب جھوٹ! ہاہا! کسی زمانے میں یہ میرا دیوتا ہوا کرتا تھا۔ دیوتا بھی کبھی کبھی دھوکا دے دیا کرتے ہیں۔ اس کا انجام یہی ہے۔

(تصویر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر پھینک دیتی ہے اور اسے پاؤں تلے روندتی ہے۔ ایکٹر جو ایکٹریس کے اس طرح پھوٹ بہنے سے ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اب بھی ویسے ہی منہ کھولے کھڑا رہ جاتا ہے۔ مینیجر بھی اس واقعہ سے کسی قدر حیران ہوتا ہے۔ فلسفی ویسے ہی غور سے ایکٹریس کی ہر بات، ہر اشارے کو دھیان سے دیکھ رہا ہے اور کچھ سوچ کر مسکرا رہا ہے۔

اچانک گانے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ پھر ہیرو ریہرسل کے کمرے سے نکل کر تیزی سے ہال کی دوسری طرف جاتا ہے۔ ایکٹریس جو ابھی تک کھڑی ہے شکستہ و مضمحل سی اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ ایک نوجوان ہیرو دھیمی تیزی سے ایک پانی کا گلاس لئے ہوئے ریہرسل کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں خاموشی سے سبھی اپنی آنکھوں سے ہیرو کی حرکات کا پیچھا کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ وقت یوں ہی گزر جاتا ہے۔ اتنے میں گانے کی آواز پھر شروع ہو جاتی ہے۔ منیجر کہتا ہے:

منیجر۔ پانی کا گلاس ہے — آج تو ہیرو جی ہیروئن کو اپنے ہاتھوں سے پانی پلا رہے ہیں۔ ایسی بات ہے ہمدردی کی!

(سب ہنس پڑتے ہیں)

منیجر۔ ہماری بدقسمتی کے اب آخری دن آگئے ہیں۔ جلد ہی ... ختم ہو...

ایکٹریس۔ جو جھگڑا ختم ہوا (آہستہ آہستہ اپنی کرسی پر جا بیٹھتی ہے)

ہیرو ... محض ... ختم ہو گیا۔ ایک عورت کی زندگی میں حقیقت کا دخل ہوا۔ ایک عورت کی شخصیت کے ٹکڑے میں بیٹھ کر ٹوٹ گئی تھی کسی کا ... میں نے دنیا کو ایسے نہ اور ایسے سمجھا تھا اسی طرح دنیا زندہ ہے ... پر میرا یا آنسو بہا اور آج میں اپنی یہ تصویر پھاڑ کر دکھانے کے لئے لائی تھی (اپنے بیگ سے اپنا ایک فوٹو نکالتی ہے) اپنے خیال میں تو بہت ناز سے تصویر کھنچوائی تھی۔ گردن تھوڑی سی جھکی ہوئی آنکھیں آدھی بند کانوں میں نئی قسم کے کانٹے لبوں پر مسکراہٹ کس کے لئے مسکراتی تھی۔ یہ تصویر اخباروں میں چھپی تھی۔ آدھی کریم کے اشتہار کے ساتھ۔ کریم والوں نے مجھے بہت خوبصورت سمجھا تھا نا۔ کہنے لگے تمہاری بھی شہرت ہوگی۔ اور ہماری کریم بکنے میں بھی سہولت ہوگی۔ شہرت! میرے لئے دنیا کی نگاہوں میں شہرت حاصل کرنا ضروری تھا۔ لوگوں میں مشہور ہوئے بغیر ہیرو مجھے ہیروئن کا پارٹ کیسے دیتا! (تصویر کو مخاطب کرکے) کیوں میری ہیروئن! تم نے اپنا شوق پورا کر لیا؟ بہت تمنائیں، بہت ولولے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ تم نے سوچا تھا، میری بھولی ہیروئن! کہ زندگی کا راز تخلیقی جوہر میں ہے۔ تمہاری خواہش تھی کہ یہ جو دل میں کچھ کام کرنے کی امنگیں اٹھ رہی ہیں ان کی مدد سے دنیا کو پستی سے بلند کر دو۔ پیشتر اس کے کہ یہ امنگیں زندگی کی کشمکش کے دور میں آ کر تھک جائیں۔ تم زندگی کے اس مرحلے سے گزر رہی تھیں جب دل چاہتا ہے کہ دنیا کے قواعد کی زنجیروں کو توڑ کر آدمی کہے میں آزاد ہوں، میں آزاد ہوں۔ اے سماج کے ٹھیکیدارو! ہمارے مذہب اور ایمان کے نگہبانو! اے کرم دھرم کے مجسمو! جنہوں نے خدا کی دی ہوئی آزادی کو پاؤں تلے مسل دینے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ میں تمہیں ٹھینگا دکھاتی ہوں۔ میرے جی میں جو آئے گا وہی کروں گی۔ سماج کے مردہ جسم میں پھر سے روح پھونکوں گی۔ ایسی روح جس سے سماج کی زندگی میں پھر سے رونق آجائے۔ آدمی کے دل کے باغ میں پھر سے روحانی موسم بہار آجائے۔ خدا خود ایک خالقِ جز وکل ہے۔ اس نے ہمیں اس لئے دنیا میں بھیجا تھا کہ اپنی طاقت سے کوئی نئی چیز پیدا کر کے اپنی زندگی کو مکمل بنانے کی کوشش کریں۔ اس نے ہر انسان کو پیدا کرنے کی طاقت عطا کی ہے۔ کوئی اپنے اندر سائنس کی چیزیں پیدا کرنے کی آگ چھپائے پھرتا ہے۔ کوئی فنون کی! اس طاقت کا صحیح استعمال کر کے ہی ہم اپنے پیدا کرنے والے تک پہنچ سکتے ہیں۔ مالا پھیرنے والوں نے جو دنیا کی پیدا کرنے والی طاقتوں کو مار دیا ہے اس سے دنیا کا بھلا نہیں ہوگا۔ میری لاڈلی ہیروئن! تو سنسار کا بھلا کرنے نکلی تھی۔ جا اب تیرا کام ختم ہو گیا۔ آرام سے گھر میں اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھ۔ جب بوڑھی ہو جائے گی تو رام نام کی مالا جپنا اور اپنے بچوں کو سکھانا کہ سکھ سبزی کی طرح اگنے میں ہے، جینے میں نہیں! ان سے کہنا، میرے بچو! آندھی کا سامنا خم ٹھونک کر نہ کرنا۔ اس کے آگے دمے کے مریض کی طرح جھک جانا۔ اسی میں خیریت ہے۔ جب کبھی بھی دل میں تمنائیں خواہشیں پیدا ہوں، ولولے اٹھیں ان کو لوہے کے ہاتھ سے دبا دینا۔ چلو جھگڑا ختم ہو گیا۔ تو میرے کس کام کی میری ہیروئن! اب تو یہیں رہ۔

(یہ کہہ کر اپنی تصویر کو پھاڑنے لگتی ہے پھر رک جاتی ہے۔ ایک منٹ تک حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ تصویر بہت خوبصورت ہے۔ پھر اچانک میز پر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگتی ہے۔ ایکٹر گھبرا کر کمرے میں ادھر ادھر چلتا ہے۔ منیجر بے پروائی کے انداز سے ایکٹریس کی طرف دیکھتا ہے۔ فلسفی کی آنکھوں میں ہمدردی اور رحم ہے۔ دوسرے کمرے میں گانا ابھی جاری ہے۔ ایکٹریس کی سسکیوں کی آواز گانے کی آواز میں گم ہو جاتی ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دھرم پرکاش آنند

سخن ہائے گفتنی و ناگفتنی

فراق گورکھ پوری کی یہ نظم موضوع اور فن کاری دونوں کے لحاظ سے ذرا وضاحت طلب ہے۔ فن کاری کے لحاظ سے تو صرف اسی قدر کہنا ہے کہ اس میں زحافات کا آزادانہ استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ موضوع کے لحاظ سے بہت سے "سخن ہائے گفتنی" ہیں۔

موسیقی میں عوام کی پہنچ صرف غزل گیت اور قوالی تک ہی ہے۔ ٹھمری دادرے کی نوک جھونک میں بھی تھوڑا بہت لطف اٹھا لیں۔ دھرپد اور خیال کی باریکیاں صرف خواص ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ شاعری کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ہر شعر ہر کسی کے لئے نہیں لکھا جاتا۔ اردو میں تو دلی [illegible] سے یہ کہ بہت عرصے تک واضح شاعری ہی ہوتی رہی۔ غالب وہ پہلا شاعر تھا جس نے چند منتخب افراد کو اپنا مخاطب بنایا۔ اگرچہ روایتی [illegible] احوال کی تن آسانی اس کی مخالف رہی۔ غالب کے بعد جب ملکی نظام درہم برہم ہوا تو بہت عرصے تک لوگوں کو حالی کی فطرت پرستی ہی سے نجات نہ مل سکی، ہو گئی لیکن جوں جوں مغرب کے اثرات چھاتے گئے۔ ادب میں بھی نت نئی ترقیوں کے ساتھ ساتھ ایک باقاعدگی آتی گئی۔ البتہ مغربی ادب کے [illegible] کی شعوری [illegible] تجربے اردو میں گذشتہ دس بارہ سالوں سے شروع ہوئے لازمی ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے [illegible] انقلابات آئے [illegible] ہیئت کے لحاظ سے انقلاب [illegible] ہم آہنگ ہیئت اور موضوع دونوں لحاظ سے ایک مثالی شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن

فراق گورکھ پوری اس سلسلے میں ایک [illegible] ہیئت کے لحاظ سے ان کی محبوب صنف شاعری غزل ہے۔ جو ہمارے ادب کی قدیم ترین اور بنیادی چیز ہے۔ لیکن موضوع اور ادائے بیان کے لحاظ سے اس میں چند ایسی باتیں ہیں جو صرف فراق اور ہندوستان کے مخصوص شعرا میں پائی جاتی ہیں۔ اپنی غزل کے متعلق لکھتے ہوئے ایک جگہ وہ کہتے ہیں "میری غزلیں طویل ہو جاتی ہیں اور فنی لحاظ سے یہ بات مستحسن نہیں لیکن میں قافیہ برتنے کے لئے غزل نہیں کہتا۔ ہر غزل کی زمین میرے لئے ان تمام وجدانی کیفیات اور محرکات کی جولانگاہ بن جاتی ہے جو میری زندگی کے [illegible] اور [illegible] دنوں میں سے سرجوش کی طرح چھلک آتے ہیں۔ میری شاعری کو صنف غزل سے بیک وقت ہم آہنگی بھی ہے اور طوالت کے لحاظ سے [illegible] بھی لیکن غزل کے علاوہ شاید میں نظموں میں اپنی زندگی اور اپنے وجدان کی حقیقی ترجمانی اتنی اچھی طرح نہ کرسکوں ـــــ اور اسی مضمون میں اپنے نظریہ شاعری کے متعلق [illegible] میرے نزدیک شاعری کا مقصد محض جذبات اور احساسات کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی مقصد ان جذبات اور احساسات کو کچھ اور بنا دینا ہے ـــــ اگر ہم فراق کے کلام کو اس نظریے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں تو ان کیفیات

[illegible] ہے۔

تک ہماری پہنچ ہو سکتی ہے جن کے تحت شاعر کہتا ہے اور جن تک [illegible] کا مقصود ہے۔ [illegible] نظم ہے یا نظم الامثال" ـــــ کیونکہ اس نظم کی زبان بھی فراقی

ایک بات اس نظم کی زبان کے متعلق جا بجا محاورات کے استعمال سے کہیں کوئی [illegible]۔ [illegible] محاورے یا کہاوتیں ہوتی ہیں۔ محاورے یا کہاوت میں رنگوں اور کیفیات کے عین مطابق ہے۔ ایک عام سیدھا سادہ سا لفظ جس کی وہ گہرائیاں نہیں رکھتا جو کسی محاورے یا کہاوت [illegible] سایوں کا ایک ایسا اجتماع پوشیدہ ہوتا ہے جو ترجمانی میں ایک ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

میراجی

پوچھ نہ جینے والوں کا حال (۱) ایک جان لاکھوں کا جنجال

دیکھیو اس بازی کا مآل (۲) حسن کی شہ ہے عشق کی چال

گرتی دنیا لے جو سنبھال (۳) ہے کوئی مائی کا لال

آج تو اس نے بھی پوچھا حال (۴) اہل غم کے بڑے اقبال

کون ہے اصل اور کون مثال (۵) حسن و عشق میں فرق محال

باتوں باتوں میں پوچھ لے حال (۶) آج دلوں کا چور نکال

عشق کو اب پانا ہے محال (۷) ہم بھی تجھ سے چل گئے چال

کیسا جواب اور کیسا سوال (۸) اسی ڈال سے پھر بیتال

ملک بقا کا چھوڑ خیال (۹) موت کے گھر میں ڈیرے ڈال

باطل وحق کا جواب محال ۱۰ تیری مثال نہ میری مثال
کل تھا عشق کا قحط رجال ۱۱ آج پڑا ہے حسن کا کال
حسن و عشق کا جاہ و زوال ۱۲ کافر کو سا ہے تیں [illegible]
ٹپکا جو [illegible] کا پوچھ نہ حال ۱۳ کون [illegible]
دیکھ کی آنکھیں [illegible] ۱۴ [illegible]
پوچھ نہ اس کے حسن کا حال ۱۵ دل کا شکیب اور جی کا [illegible]
رونی کو [illegible] ۱۶ بہشت پایا اس کی مثال
عشق میں غافل آنکھ تو کھول ۱۷ آپ سپنا [illegible]
دل کو آنکھوں آنکھوں میں تول ۱۸ عشق کو [illegible]
دل کی دھڑکن دے نہ سنائی ۱۹ [illegible]
موت بھی تک ہے منہ پھیرے ۲۰ عشق سے آن بہت بے حال
حسن کے رخ پر پڑنے والے ۲۱ مات نہ دے تجھ کو یہ چال
جو بھی لگے ہوں عشق کے بھاؤ ۲۲ دام کے دام بکا یہ مال
تین ہاتھ میں تینوں لوک ۲۳ عشق کی [illegible] کا پوچھ نہ حال
کوہِ طور تھا اک ٹھوکر کا ۲۴ عشق کی دھڑکن [illegible] چال
اہلِ ہوس کو مول نہ لے ۲۵ گراں پڑے گی آپ [illegible]
لوہا لوہے سے کٹتا ہے ۲۶ عشق کو [illegible] جلال
چاند کٹورا چاندی کا ۲۷ سورج اک سونے کا تھال

حسن سے لڑے جھگڑے آج ۲۸ کل کو یہ بھی ہوگا محال
عین حقیقت جلوۂ رخ ۲۹ زلف کے حلقے مایا جال
دین اور ایماں حسن کا مول ۳۰ جو لکھی قیمت جو لکھا مال
[illegible] کی ایک نگاہ میں ہیں ۳۱ مستقبل اور ماضی و حال
[illegible] نہیں یہ بھی کہ تری ۳۲ کیسی تھی صورت کیا خد و خال
ہم بھی تو اپنے [illegible] ۳۳ کس کو پرکھتے آپ کا کال
[illegible] ۳۴ پس ماندوں کا پوچھ نہ حال
گر تو عشق سے چکنا چور ۳۵ بعد ڈھٹائی کے بنے وہ ڈھال
حسن کے شہادت عشق کا ذکر ۳۶ اہلِ ہوس کو بھی آیا حال
عشق سے حسن، وفا کیا کرنا ۳۷ سب پہلے چُھما کا ٹا گال
اک دنیا میں سناٹا ہے ۳۸ اب نغمے پر پانی ڈال
اہلِ ہوس نے سر پیٹا ہا ۳۹ تجھ کو سمجھ کے پرایا مال
نکل گیا کچھ منہ سے اس کے ۴۰ اتنا دل میں کر نہ ملال
[illegible] کا قول یہ تو نے سنا ہے؟! ۴۱ اپنا وہی جو سب کا حال
دنیا دنیا سا درد اٹھتا ہے ۴۲ ماہ بہ ماہ کہ سال بہ سال
ہم شاید اچھا ہی بتاتے ۴۳ تو نے پوچھا تو ہوتا حال
واسطہ تیری مستی کا ۴۴ خود بھی سنبھل مجھ کو بھی سنبھال
اب اپنے انجام کو سوچ ۴۵ میرا مٹنا تو ہے محال

کل تھا بے سروساماں عشق ۴۶ آج حُسن بھی ہے کنگال

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس ۴۷ دنیا کیا ہے اسی کی مثال

مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ ۴۸ حُسن کی زد کا پوچھ نہ حال

فرقِ وفا و جفا مت پوچھ ۴۹ کون نکالے بال کی کھال

ٹھہرے ٹھہرے آنسو دیکھ ۵۰ گرتے گرتے خود کو سنبھال

ایسی سبک رفتاری آہ ۵۱ کر نہ دے عالم کو پامال

درد کی دولت بے پایاں ہے ۵۲ عشق کو کر دے مالا مال

آج اس کی بے خبری سے ۵۳ پوچھ لے دنیا بھر کا حال

چھوڑ محبت کا کھٹراگ ۵۴ اس کا پانا امرِ محال

حیرت میں ہے تغافل بھی ۵۵ آج کہاں ہے تیرا خیال

ایک ہی عالم ایک ہی وقت ۵۶ عشق کی عمر میں ماہ نہ سال

جس کا ہو سکتا ہو جواب ۵۷ ناداں وہ بھی ہے کوئی سوال

جامِ شباب چھلک ہی گیا ۵۸ آ ہی گیا اس مے میں اُبال

صاف جبیں پر ڈال نہ بل ۵۹ دیکھ آئینے میں آئے نہ بال

آنکھ برابر کون کرے ۶۰ کس کی ہمت کس کی مجال

بنتا ہے تو مٹنا سیکھ ۶۱ چھوڑ یہ بحثِ کمال و زوال

عشق میں ڈھونڈھ نہ صبر و شکیب ۶۲ اے دل دیکھ یہ روگ نہ پال

آج دکھا تلوار کے ہاتھ ۶۳ اہلِ وفا کو کر دے نہال

اپنی بلندی پستی دیکھ ۶۴ کیا آکاش اور کیا پاتال

عشق میں کھا نہ فریبِ شکست ۶۵ دیکھ ابھی ہتھیار نہ ڈال

معرکہ آرائی کے نثار ۶۶ تو بھی نڈھال اور میں بھی نڈھال

روز نہیں رُوٹھے گا عشق ۶۷ آج کے کام کو کل پہ نہ ٹال

گھر گھر میں اندھیر مچا دے ۶۸ دنیا بھر میں ہل چل ڈال

مال مفت دل بے رحم ۶۹ اہلِ حکومت کا ہے یہ حال

بیٹھنے والے بیٹھے رہے ۷۰ چلنے والے چل گئے چال

کیا ہے دیارِ حسن جہاں ۷۱ گلتی نہیں کسی کی دال

حُسن سے بدظن ایک جہاں ۷۲ اُلٹی بات اور ٹیڑھی چال

مجھ سے عہدِ وفا مت باندھ ۷۳ عشق کو اس دھوکے میں نہ ڈال

تلخ کام ترے کیا کھائیں ۷۴ نیم کی پتّی نیم کی چھال

ایک بگولا نخلِ عشق ۷۵ اس برد کے پات نہ ڈال

جنسِ حُسن کا مول نہ پوچھ ۷۶ بازاروں میں ہے ہڑتال

قرض کا کھانا یونہی ہے جیسے ۷۷ تاپے کوئی جلا کے پُوال

بجھے دلوں میں جوشِ محبت ۷۸ جیسے باسی کڑھی میں اُبال

خاک تری برباد نہیں ۷۹ عشق میں تو کچھ نام اچھال

قد ہے ترا یا فتنۂ حشر ۸۰ چال تری یا ہے بھونچال

دیکھ بدلتی دنیا دیکھ ۸۱ پوچھ نہ عشق کے غم کا مآل

اس پہ حقیقت کو بھی ہے شک ۸۲ عشق ہے یوں تو خواب و خیال
اہلِ قفس نے اک مدت میں ۸۳ کچھ تو نکالے ہیں پر و بال
رو کر یہ ہنس کر ہم نے بھی ۸۴ دیکھے بہت ہیں ہجر و وصال
عشق ترا ناکام سہی ۸۵ اس سے بھی جو کام نکال
تیرا دوام تری شمشیر ۸۶ موت کے منہ میں لگام تو ڈال
تیرے نقشِ قدم پر غیر ۸۷ کوا چلے ہنس کی چال
جاگتا رب سوتا سنسار ۸۸ کس لئے بجتے ہیں گھڑیال
کچا پانی آبِ حیات ۸۹ پی کے اس کو نہ ہوگا بحال
مذہب والے دولت والے ۹۰ دونوں بڑے گرو گھنٹال
اس دریا کا اور نہ چھور ۹۱ اس کے غم کا پوچھ نہ حال
وائے جو تجھ سے بھی نہ مٹے غم ۹۲ ہائے جو ہو یہ صورتِ حال
عشق کی گتھی ہے لیکن ۹۳ اب اتنے بھی پیچ نہ ڈال
غیب کو وہ سمجھے ہیں شہود ۹۴ اہلِ نظر کا دیکھ کمال
خضر کو دے زہرابۂ عشق ۹۵ مُردوں سے ہے ابتر حال
بات تری بے بات کی بات ۹۶ چال تری بے چال کی چال
ایک مدت تک مٹنے کے بعد ۹۷ ہم بھی نظر آتے ہیں بحال
دل میں دل بھی پڑ جائے گا ۹۸ پہلے آنکھ میں آنکھ تو ڈال
سرمہ بنا دے مجھ کو لیکن ۹۹ اب اتنا بھی پیس نہ ڈال
بچتے بچتے حسن کو پھانس ۱۰۰ رفتہ رفتہ ڈورے ڈال
حسن اک بازگشت آواز ۱۰۱ وہی جواب بھی جو ہے سوال
آن یکایک آجاتا ہے ۱۰۲ بیٹھے بٹھائے تیرا خیال
حرف و حکایت تیری نظر ہو ۱۰۳ یعنی بات میں بات نکال
اس کی سچائی کی فکر نہ کر ۱۰۴ اپنے دل سے کھوٹ نکال
اُڑتا رنگ اور کھلتا رنگ ۱۰۵ دو کے دونوں خواب و خیال
موت کا دے پیغام اور لوٹ ۱۰۶ دولت و ثروت جاہ و جلال
سوچ کے کچھ مجبور ہے ورنہ ۱۰۷ عشق کو اور ہمت کا کال!
بولتی صورت چپ کی داد ۱۰۸ ہنستی صورت غم کی مثال
مدت سے جینا ہے حرام ۱۰۹ عشق بُرے ہی پڑا ہے خیال
حسن سے رکھ نہ امیدِ وفا ۱۱۰ آستین میں سانپ نہ پال
آج اس کی مست آنکھ کو دیکھ ۱۱۱ آج حرام کو کرے حلال
روتے ہیں تجھ سے ہو کر صاف ۱۱۲ آج کہاں ہیں دل کے ملال

۱۱۳
ہجر میں اس کے روتے فراق
گذرے کتنے ماہ و سال

فراق گورکھپوری

آغا حشر اور اردو ڈرامانگاری

آغا حشر مرحوم نے اردو ڈرامے کی جو خدمات سرانجام دیں، وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے کئی نئی چیزیں پیدا کیں جن سے اردو ڈرامے میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ یہ بلند پایہ ادبی حلقوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکے۔ اس مقالے میں ہم پہلے حشر کے مختصر سوانح درج کریں گے اس کے بعد حشر کی اردو ڈرامانگاری کی تدریجی نشوونما کا تجزیہ کریں گے اور آخر میں حشر کے اسلوب نگارش کی خصوصیات بیان کریں گے۔

حشر مرحوم کا وطن مالوف کشمیر تھا۔ آپ کا خاندان بنارس میں شال کی تجارت کرتا تھا۔ اور آپ کی ولادت امرتسر میں ہوئی۔ بچپن سے ڈرامے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس زمانے میں ڈرامے دیکھنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے آپ کے والدین جو شرع کے بہت پابند تھے۔ آپ کو تھیئٹر جانے سے روکتے تھے بہرحال حشر نے اس فن میں دلچسپی لی اور پہلے پہل نیو الفریڈ تھیئٹریکل کمپنی میں تھوڑی سی تنخواہ پر ملازم ہوگئے اور بعد میں بمبئی پارسی تھیئٹریکل کمپنی۔ نیو انڈیا کمپنی۔ الفنسٹن تھیئٹر کلکتہ اور لاہور تھیئٹریکل کمپنی میں کام کیا۔ موخر الذکر کمپنی ٹوٹی تو حشر نے انڈین شیکسپیر تھیئٹریکل کمپنی کے نام سے خود ایک کمپنی کھول لی۔ یہ کمپنی چنداں کامیاب نہ رہی اور سیالکوٹ میں ٹوٹ گئی۔ ایک سال لاہور میں رہے۔ پھر میڈن تھیئٹرز کلکتہ کی دعوت پر وہاں ایک معقول مشاہرے پر ملازم ہوگئے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے کلکتہ چھوڑا اور مہاراجہ چرکھاری کی دعوت پر چرکھاری گئے۔ جہاں ایک تھیئٹریکل کمپنی قائم کی۔ چار پانچ برس کے بعد واپس آئے تو تھیئٹر کا بازار سرد ہوچکا تھا اور متکلم فلموں کا دور دورہ تھا۔ آپ نے عورت کا پیار کے نام سے فلمی ڈراما لکھا۔ جسے ایسٹ انڈیا فلم کمپنی نے فلم بنا لیا۔ یہ تصویر[1] بہت پسند کی گئی۔ چنانچہ نیو تھیئٹرز لمیٹڈ کلکتہ نے آپ سے یہودی کی لڑکی اور چنڈی داس کے مکالمے لکھوائے ان کی بھی ادبی[2] حلقوں میں بہت تعریف ہوئی ۱۹۳۲ء میں آپ لاہور آئے اور حشر پکچرز کے نام سے ایک کمپنی قائم کردی۔ ابھی آپ اپنے تازہ شاہکار بھیشم پرتگیا کو فلم کر رہے تھے کہ ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کے روز اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ حشر مرحوم نہ صرف ایک بلند پایہ ڈرامانگار تھے بلکہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور مقرر بھی تھے۔ آپ کو دینیات پر کافی عبور حاصل تھا۔ چنانچہ اکثر مذہبی قسم کے مناظروں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ آپ غزل نہایت اچھی کہتے تھے۔ اور قومی شاعری میں بھی ایک اہم حیثیت کے مالک تھے آپ کی دو قومی نظمیں "شکریہ یورپ" اور "موج زمزم" نہایت مقبول ہوئیں۔

افسوس کی بات ہے کہ آپ کے ڈراموں کے صحیح نسخے نایاب ہیں۔ ادنےٰ درجے کے ناشرین نے آپ کے ڈرامے شائع کئے ہیں لیکن وہ نہایت مسخ شدہ حالت میں ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ کاغذ خراب اور لکھائی غلط اور بدنما اور چھپائی نہایت گندی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی ناشر کتب حشر کے کلام اور ڈراموں کو یک جا کر کے شائع کرے۔ حشر مرحوم اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو یہ کام خود کر جاتے۔ لیکن وہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

حشر کی ڈرامانگاری کے تدریجی نشوونما کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں اسے تین ادوار میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ پہلے دور میں اس نے شیکسپیر کے تراجم لکھے۔ دوسرے دور میں حشر کے ڈرامے قدیم[3] ڈرامانگاری کی خصوصیات کے حامل تھے۔ تیسرے دور میں بلوا منگل۔ بن دیوی۔ آنکھ کا نشہ[4] وغیرہ لکھے۔ جن سے اردو ڈرامے کی کایا پلٹ گئی۔ اب ہم ان ادوار کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

پہلا دور:۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ پہلے دور میں حشر نے شیکسپیر کے بعض ڈراموں کا ترجمہ کیا لیکن اصل میں یہ ترجمہ نہ کئے گئے تھے،

[1] یہ کھیل اپنے زمانے کے معمولی کھیلوں میں سے تھا اور صرف عوام ہی نے سے تھوڑا بہت پسند کیا تھا (ادارہ) [2] ادبی حلقوں میں تو اب تک کسی فلم کے افسانے یا مکالمے کو کوئی خاص درجہ دیا ہی نہیں جاتا، اور یہی حال یہودی کی لڑکی اور چنڈی داس کا تھا۔ البتہ اتنی بات تھی کہ آغا حشر کے نام کی وجہ سے جمہور کو یہ خیال ضرور تھا کہ ان کھیلوں کی ادبی حیثیت اچھی ہوگی اور مذکورہ فلموں کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی (ادارہ) [3] قدیم اردو ڈرامانگاری (ادارہ) [4] اسی دور میں سنسار چکر بھی شامل ہے (ادارہ)

کیونکہ حشر انگریزی سے ناآشنا تھے کہا جاتا ہے کہ ان کے دوست انہیں شیکسپیئر کے بعض ڈراموں کا ترجمہ سناتے تھے اور حشر شیکسپیئر کے قصوں کو اردو ڈراموں کے قالب میں ڈھال لیا کرتے تھے چنانچہ ان ڈراموں اور شیکسپیئر کے اصل انگریزی ڈراموں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ حال [illegible] ذیل میں [illegible] یادگار ہیں۔

۱۔ شہید ناز — MEASURE FOR MEASURE
۲۔ مرید شک — OTHELLO
۳۔ صید ہوس — KING JOHN
۴۔ سفید خون — KING LEAR

اب ہم ان ڈراموں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کریں گے

۱۔ شہید ناز۔ اس ڈرامے کو [illegible] کمپنی نے [illegible] میں سٹیج کیا۔ اس میں [illegible] بڑی تبدیلیاں کی گئی ہیں جن کا مقصد تماشائیوں کو خوش کرنا تھا کہیں کچھ بڑھا دیا اور کہیں کچھ حذف کر دیا۔ ڈراما سب سے پہلے [illegible] منظر سے شروع ہوتا ہے ایک باغ میں [illegible] نغمے گاتی ہیں۔

۲۔ مرید شک۔ اس ڈرامے کو ۱۹۰۹ء میں الفریڈ کمپنی بمبئی نے سٹیج کیا۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے احسن نے لکھا ہے۔

۳۔ صید ہوس۔ یہ ڈراما کنگ جون کا ترجمہ ہے اسے بمبئی پارسی کمپنی نے [illegible] میں سٹیج کیا۔ ویسے تو حسب معمول اردو ترجمے میں بے شمار تبدیلیاں کی گئی ہیں لیکن اس ڈرامے کے انجام کو تو بالکل ہی بدل دیا گیا ہے تیسرے ایکٹ میں آرتھر اپنے رفقاء سمیت مل کر چڑھائی کرتا ہے۔ ظالم کے تمام منصوبے بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ اور وہ پابہ زنجیر کر لیا جاتا ہے پھر آرتھر تخت پر بیٹھتے ہی بلانشے (BLANCHE) سے شادی کر لیتا ہے اور بیوی کی خواہش پر ظالم کو عمر قید کی سزا دیتا ہے یوں شیکسپیئر کی المیہ میں تبدیلی۔ اس کے علاوہ FALCON BRIDGE والی مزید ظرافت کے بجائے ایک اور ادنیٰ قسم کا ذیلی قصہ شامل کر دیا گیا ہے

۴۔ سفید خون۔ یہ سفید خون کنگ لیئر کا ترجمہ ہے اس ڈرامے کو لوگ انگریزی میں بھی طربیہ ہی سمجھتے رہے۔ چنانچہ اس کے جتنے ترجمے اردو میں ہوئے ان میں اس کا انجام اچھا ہی ظاہر کیا گیا۔ یہی حال حشر کے ترجمے کا ہوا۔ اس ڈرامے کو [illegible] میں بمبئی پارسی کمپنی نے سٹیج کیا۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ حشر انگریزی زبان سے ناواقف تھے اور دوستوں سے شیکسپیئر کے ڈراموں کے قصے سن کر ان پر اپنے ڈرامے تعمیر کر لیتے تھے۔ جن میں بڑی بڑی تبدیلیاں بھی کر لیتے۔ مثلاً ایک تبدیلی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں المیہ سے متعلقہ کردار طربیہ پارٹ بھی ادا کرتے تھے۔ اور وہ قصے کا جزو ہوتے تھے لیکن حشر نے یہ تبدیلی پیدا کی کہ المیہ کے کرداروں کو طربیہ کے کرداروں سے کوئی تعلق نہ ہو یعنی بیک وقت دو ڈرامے دکھائے جاتے تھے۔ ایک المیہ۔ دوسرا طربیہ میرے خیال میں یہ جدت قابل تعریف ہے۔ کیونکہ اگر کسی موقع پر متین اور سنجیدہ طبقے کو حشر کا کوئی المیہ دکھانا مقصود ہو تو اُسے بغیر کسی مزاحیہ حصے کے دکھایا جا سکتا ہے۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ حشر کے ڈرامے عوام الناس اور بلند ادبی ذوق رکھنے والوں میں یکساں مقبول ہوئے۔

حشر کو انڈین شیکسپیئر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حشر نے شیکسپیئر کے ڈراموں کو اردو کے قالب میں ڈھالا نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں حشر کو وہی رتبہ حاصل ہے جو انگلستان میں شیکسپیئر کو ہے۔[۲]

دوسرا دور۔ اب ہم حشر کی ڈراما نگاری کے دوسرے دور کی طرف آتے ہیں۔ اس دور میں حشر نے قدیم طرز میں ڈرامے لکھے۔

حشر نے پہلے پہل اُسی طریقے کی تقلید کی جو اُس سے پہلے احسن بیتاب اور طالب نے اختیار کیا تھا یعنی کردار پہلے کچھ نثر اور پھر اشعار میں باتیں کرتے نیز ان کی نثر نہایت مقفیٰ و مسجع ہوتی۔ اس قسم کے ڈراموں میں حشر نے اپنی قادر الکلامی اور ادبی صلاحیتوں کا نہایت وسعت قلب کے ساتھ مظاہرہ کیا ہے میں نے اپنے گزشتہ مقالے میں قدیم ڈراما نگاری کی خصوصیات بیان کر دی ہیں۔ اس لئے یہاں اس پر زیادہ لکھنا بے سود ہے اب میں حشر کے ایک ڈرامے "اسیر حرص" کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے آپ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حشر نے قدیم طرز میں کیسے ڈرامے لکھے۔

چنگیز کے سامنے اس کا چچا زاد بھائی ناصر پابہ زنجیر کھڑا ہے۔ چنگیز اُسے ہر ممکن طریق سے ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن بہادر ناصر اپنی جان کا خوف نہ کرتے ہوئے انصاف کی طرفداری کرتا ہے۔

چنگیز۔ کہئے اے شہباز زمانہ۔ آپ نے اس ناچیز خادم کو پہچانا!
ناصر۔ پہچانا، پہچانا! شیطان کو کون شخص نہیں جانتا۔ بلکہ ہر شخص پہچانتا ہے ؎

شکل و صورت دیکھ لی کبر و رعونت دیکھ لی
نام پہلے ہی سنا تھا آج صورت دیکھ لی

۱۔ [illegible]

…نگیز۔ معزول تو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مگر اب بھی یوں اکڑا ہوا ہے ؎

سر سے غرورِ مسندِ مخمل نہیں گیا
رسّی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا

ناصر۔ عزّت والے مصیبت سے کب ڈرتے ہیں۔ تمہارے اکثر رات کے عوض دن کو نکلتے ہیں ؎

بھری برسات میں جن ندّی نالوں میں روانی ہے
نہیں گرمی میں دیکھو تو نہ موجیں ہیں نہ پانی ہے
مگر دریا کو اس تابش کا ہرگز غم نہیں ہوتا
لگا دو آگ بھی اُس میں تو پانی کم نہیں ہوتا

اور ؎

عطر کی مٹّی میں بھی مل کر مہک جاتی نہیں
توڑ بھی ڈالو تو ہیرے کی چمک جاتی نہیں
سختیاں ہوں لاکھ پر جوہر نہ جائیں گے کبھی
قید میں کچھ شیر کی شیرانہ خو جاتی نہیں

چنگیز۔ تو تو نے بادشاہی اس لئے چاہی کہ مجھ سے کرے برائی۔ میں تیرا کون تھا؟

ناصر۔ کون تھا؟

چنگیز۔ چچا زاد بھائی!

ناصر۔ بھائی؟ اف بھائی کا نام لے کر تو نے میرے مرحوم چچا کی روح کو تڑپا دیا۔ قبر میں سوتے ہوئے کو خوابِ راحت سے جگا دیا۔ مجھ کو تو کہتا ہے بھائی اور بھائی سے یہ کج ادائی۔ لعنت ہے او ناسزائی

جن کی گودوں میں پلا دشمن انہی کا ہو گیا
تو نہیں پیدا ہوا اک سانپ پیدا ہو گیا

تیسرا دور۔ اب ہم تیسرے دور کی طرف آتے ہیں اس دور کے اچھے ڈرامے بلوا منگل، بن دیوی، ترکی حور، آنکھ کا نشہ اور سنسار چکر ہیں۔ ان تمام ڈراموں میں حشر نے ہمارے معاشرتی نقائص کو قلمبند کیا۔ نیز ہمیں تمدنی اصلاح کی تعلیم دی۔

اس دور میں حشر کے طرزِ انشا میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ گانوں میں ایک حد تک تخفیف کی گئی۔ مقفّٰی و مسجع عبارت کو بند کر دیا۔ زبان نہایت

سلہ عزیز شیر نے شہر پیکر بیا جیکیا۔ اداسدہ ہلکا ش کرنے میں تو مقفّٰی عبارت قائم ہے (ادارہ)

صاف ستھری ہو گئی۔ مثال کے طور پر میں بلوا منگل اور آنکھ کے نشے کا ایک ایک منظر پیش کروں گا۔ پہلے بلوا منگل کا مختصر سا پس منظر ملاحظہ ہو۔

بلوا منگل ایک نوجوان تعیش پسند شخص ہے اس کے باپ کا نام رام داس ہے۔ بلوا منگل کی بیوی "رمبا" نہایت حسین و جمیل ہے۔ لیکن وہ اُس سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے "چنتا" نامی ایک بازاری عورت سے محبت ہو گئی۔ رمبا ایک نہایت وفادار لڑکی ہے۔ رام داس بسترِ مرگ پر دراز ہے آج پورے دس دن گھر سے باہر رہ کر بلوا منگل واپس گھر آیا ہے۔ رام داس اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے ...

رام داس:۔ بلوا! آدمی کھیت بوتا ہے پھل کھانے کے لئے۔ سیوا کرتا ہے آرام پانے کے لئے۔ محنت کرتا ہے لابھ اٹھانے کے لئے۔ اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ میں نے تمہیں پالا۔ دکھ بیماری میں سنبھالا تم کو آدمی بنانے کے لئے اپنے آپ کو مٹا ڈالا اُس کا تم نے کیا بدلہ دیا۔ ان خدمتوں اور مہربانیوں کا مجھے کیا پرتی دان ملا۔

بلوا منگل:۔ تو مجھے ان مہربانیوں سے کب انکار ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میرا بال بال آپ کا قرضدار ہے۔

رام داس:۔ تو پھر یہ قرض!

بلوا منگل:۔ ضرور ادا کروں گا۔

رام داس:۔ کب۔ کس دن۔ کس طرح۔ کس چیز سے۔ دل تھا وہ اپنے تر دچاروں کو ارپن کیا۔ پیار تھا وہ ایک بازاری ویشیہ کو دے ڈالا۔ دھرم تھا سو ادھرم کو بھینٹ دیا۔ اب تمہارے پاس میرا قرض ادا کرنے کے لئے رکھا ہی کیا ہے۔ اگر کچھ ہے تو لاؤ دو۔ میں آج تم سے اپنی سیوا۔ اپنے پیار اپنے اُپکار ہر چیز کا بدلہ چاہتا ہوں۔

بلوا منگل:۔ آپ بدلے میں کیا چاہتے ہیں؟

رام داس:۔ دھن۔ دولت۔ سیوا۔ کچھ نہیں۔

بلوا منگل:۔ پھر!

رام داس:۔ ادھر دیکھو۔ یہ بھارت کی ہندو لڑکی۔ جس کی جات میں پرماتما نے شکنتلا کی خوبصورتی۔ سیتا کا پتی برت دھرم اور رادھا کا پریم جمع کر دیا ہے۔ اس کے لئے محبت کا برتاؤ اور اپنے واسطے آ گیا کاری سو بھاؤ۔

بلوا منگل:۔ محبت کے سوا اس کے لئے اور سب کچھ کر سکتا ہوں۔

رام داس:۔ لیکن وہ محبت کے سوائے تم سے کچھ نہیں مانگتی۔

بلوا منگل:۔ میرے پاس سب کچھ ہے محبت ہی نہیں!

. . . .

بلوا منگل:۔ ایک دن جو [illegible] نے دو پیسے کے [illegible] تو میں نہیں آ سکتی [illegible] جاتی ہیں اور ان آنکھوں کو دھوکا نہ دے۔ اس [illegible] میں بھی شمع نہیں بن سکتی

رام داس:۔ مینڈھا! مینڈھا! مینڈھا! [illegible] دنیا کی [illegible] منہ کالا ہو [illegible] کی [illegible] جس کا [illegible] جس کی زندگی بے حقیقی [illegible] سے [illegible] کو [illegible] کرتی ہے

دیکھئے بازاری عورت کی جو گھناؤنی صورت حشر نے [illegible] کی ہے وہ آج تک کسی اور ڈرامہ نگار [illegible] پیش نہیں کی۔ اس سے آپ حشر کے ڈراموں کی [illegible] کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اب آنکھ کا نشہ کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

کام لتا نامی طوائف کی [illegible] سے روپیہ وصول کرنا چاہتی ہے [illegible] کام لتا طوائف [illegible] کی بیٹی راج کنور۔ اس کا سازندہ سدا رنگ اور دو تماشائی بینی اور جنگل شامل ہیں بینی اور جنگل کی موجودگی میں راج کنور محفل سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

راج کنور:۔ سدا رنگ جی۔ کندن لال سیٹھ کی گدی آٹھ بجے بند ہو جائے گی میں ذرا ہو آؤں۔

بینی:۔ راج کنور جی جائے سو آپ کے کہار جائیں

راج کنور:۔ (کام لتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کیا کروں۔ یہ تو بچے کی طرح ہٹ کر بیٹھتی ہے۔ آج ایک گلابی ساٹن پر کارچوبی کام کی پشواز بکنے آئی تھی (کام لتا کو دیکھ کر) وہ دیکھئے آنکھ مار کر منع کر رہی ہے نہ باوا میں نہ کہوں گی۔

کام لتا:۔ کہہ دو۔ کہہ دو۔ یہ سن کر کیا مجھے پھانسی دے دیں گے!

بینی:۔ تمہارے ہی روکنے سے تو جیتی مونڈ میں شکنجہ ہو گیا۔ بائی جی! اب تو تمہیں کہنا ہی پڑے گا

راج کنور:۔ سرکار آج ان سدا رنگ جی کے بہنوئی ایک نئی پشواز بیچنے کے لیے لائے تھے۔ مال تو ہزار سے اوپر کا نہ تھا۔ مگر چھوٹی بائی جی نے جھٹ پانچ سو دام لگا دئیے۔ کہنے لگیں بسنتی پچھی ہے۔ یہی پشواز پہن کر سرکار لوگوں کے سامنے ناچوں گی۔

بینی:۔ سوجھی تو اچھی۔ ان کی سمجھ کبھی بے تال نہیں چلتی۔

راج کنور:۔ بس آپ ہی لوگوں نے نخرے اٹھا اٹھا کر اس کا مزاج بگاڑ دیا ہے یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ گھر میں بنک کی طرح ہر وقت روپے نہیں رکھے رہتے۔ کندن لال سیٹھ نے چاہا۔ آنے بیاج پر بھی روپے نہ دئیے تب بائی جی۔ نئی پشواز پہن کر سرکار لوگوں کو کیسے خوش کروگی۔

سدا رنگ:۔ بڑی بائی جی۔ یہی دن ان کے اوڑھنے پہننے کے ہیں۔ گھر کے لوگوں سے کیا شرم ہے۔ باہر نہ ملے تو سرکار سے ادھار لے لو۔

کام لتا:۔ استاد جی کمبل ڈال کے سرکار کو لوٹ نہ لو۔ انہی باتوں سے تو طوائفوں اور میراثیوں کا نام بدنام ہو گیا ہے۔ دیکھو جی تم یا تم ایک پیسہ بھی دو گے تو میں بگڑ جاؤں گی۔

جنگل:۔ پیسہ دوں گا تب بگڑو گی نا۔ میں تو روپے دوں گا۔ راج کنور بائی یہ لو۔

راج کنور:۔ جیو۔ دولت بڑھتی ہو۔ روپوں کو بنک میں سمجھا میں بیاج کے ساتھ مول لوٹا دوں گی۔

جنگل:۔ مول معاف ہے۔ درمیان میں ان کی مہربانی چاہیے۔

کام لتا:۔ دیکھو۔ مول معاف ہے۔ یہ سنتے ہی بڑھاپے پر جوانی آ گئی۔ ارے نالکاؤ تم بڑی بیچے کی ہو بھی ہوتی ہو۔

دیکھئے۔ اب حشر کتنے نظری مکالمے لکھنے لگ گیا۔ آنکھ کا نشہ حشر کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے کیونکہ یہ اردو ڈرامہ نگاری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے

ہم نے حشر کی ڈرامہ نگاری کے مختلف ادوار کا مطالعہ کر لیا۔ آئیے اب ہم مجموعی طور پر اس کے اسلوبِ نگارش کا تجزیہ کریں۔

حشر کی ڈرامہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض مصنفین نے انتہائی بے انصافی سے کام لیا ہے ناٹک ساگر میں حشر پر طرح طرح کی چوٹیں کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حشر ہندی سے نابلد تھے۔ اور ان کے ہندی ڈرامے کسی پنڈت کی مدد کا نتیجہ ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ حشر مرحوم جوانی کے زمانے میں آریہ فرقے کے پنڈتوں سے اکثر مناظروں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ وہ ہندی پڑھے ہوئے تھے اس لئے وہ

۱؎ مقفیٰ عبارت تو اس تمام ڈرامے میں اکثر نظر آ رہی ہے (ر ا ر ا)

۲؎ اس سے ہمیں اختلاف ہے یہ تصویر تو بھی کچھ بھی نہیں اس سے کہیں بڑھ کر [illegible] بازاری عورت کی دوسرے مصنفین نے پیش کی ہے مثال کے طور پر ناول فرانس کی تائیس [illegible]

ان پنڈتوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے تھے۔

اسی کتاب میں حشر کو طالب۔ احسن اور بیتاب کی صف میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ حشر کے اسلوبِ نگارش اور ان تمام حضرات کے طرزِ تحریر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

حشر کی ظرافت کے متعلق ایک اعتراض بجا طور پر کیا جاتا ہے کہ ان کی ظرافت نہایت ادنیٰ قسم کی ہوتی تھی۔ مثلاً "سلور کنگ" سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

(سلور کنگ۔ باب اول۔ منظر چہارم گانا)

مرزا۔ بی بی ہے مجھے کیسی چٹخارے دار۔

زلفن۔ میاں ملا ہے مجھے کیسا ہی مزیدار۔

ایک توے کی روٹی۔ کیا چھوٹی کیا موٹی۔

مرزا۔ تیرا میرا جوڑا جیسے دھوتی اور لنگوٹی۔

زلفن۔ تو جگنو میں بیر بہوٹی۔

مرزا۔ ارچھی۔ برچھی۔ الم غلم۔ بتم۔ ہر دم لڑنے کو تیار۔

زلفن۔ میں گھما گھر اپلٹن کی میجر اور تم صوبیدار۔

مرزا۔ بی بی ہے مجھے کیسی چٹخارے دار۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی ظرافت مذاق سلیم پر بہت گراں گزرتی ہے اور یہی نہیں کہ یہ منظر یا کوئی خاص ڈراما ایسی ظرافت کا حامل ہے بلکہ جب بھی حشر مرحوم نے کوئی ظریفانہ چیز لکھی۔ اس میں وہ ہر قسم کی بازاری باتیں لکھ دیتے تھے۔

میں نے حشر کے ایک دوست اور مداح سے پوچھا کہ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ حشر مرحوم طربیہ ڈرامے لکھنے میں کیوں ناکام رہے اور ان کی ظرافت کیوں اتنی عامیانہ اور بازاری ہے؟ ان کا جواب گو تسلی بخش تو نہ تھا۔ بہرحال دلچسپ ضرور تھا۔ ملاحظہ ہو۔

"حشر جب بھی کوئی ظریفانہ ڈراما لکھتے تو وہ عام لوگوں کو مثلاً گنڈیریاں بیچنے والوں یا دوسرے دکانداروں کو اپنے پاس بلا کر انہیں اپنے ظریفانہ ڈرامے سناتے۔ اگر وہ لوگ ایسے ڈرامے سنتے ہوئے بے ساختہ طور پر ہنس پڑتے تو حشر اسے اپنا کامیاب ڈراما سمجھتے۔ لیکن اگر ان لوگوں کے لبوں پر تبسم نہ آتا تو حشر یہ سمجھتے تھے کہ یہ ڈراما ظریفانہ معیار پر پورا نہیں اترتا میں نے پوچھا آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ ظریفانہ چیزیں عام طبقے کے مذاق کے مطابق لکھتے ہیں انہوں نے کہا کہ میرے ڈراموں کو دیکھنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جو آٹھ آنے دے کر تھیٹر دیکھتے ہیں۔ اس لئے میں عام لوگوں کی پسند کے ڈرامے لکھتا ہوں"۔

حشر کے لکھے ہوئے مکالمے نہایت زوردار ہوتے ہیں بعض نقاد اس زورِ بیان اور بلند آہنگی پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حشر کے مکالمے غیر فطری ہیں۔ لیکن یہ کہتے ہوئے وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مکالموں کا مطابقِ فطرت ہونا ڈرامے کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ ڈراما ایک آرٹ ہے اور آرٹ میں بہت سی ایسی خوبیاں موجود ہیں۔ جن سے فطرت محروم ہے۔ اگر ڈرامے میں ہمارے گرد و پیش کے حالات فطری رنگ میں پیش کئے جائیں تو ڈراما ہمارے لئے دلچسپی کا باعث نہ رہے گا کیونکہ روزمرہ کے واقعات کا مشاہدہ تو ہم ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے حشر کے مکالموں کی بلند آہنگی ایک اہم خصوصیت ہے۔ بلند آہنگ مکالموں سے ہمارے قلب پر اثر پڑتا ہے اور ہم ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں[1]

حشر کی ڈراما نگاری کی بعض اور خصوصیات بھی ہیں جو اسے دیگر ڈراما نگاروں سے ممیز کرتی ہیں۔

قصے کے انتخاب میں وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اول تو یہ قصہ عوام میں مقبول ہو۔ دوسرے انہیں اس میں اپنی ادبی صلاحیتوں کے مظاہرے کا موقع مل سکے۔ نیز وہ ایسا ڈراما لکھتے جس کے سٹیج کرنے میں غیر معمولی دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ اتحادِ زمان اتحادِ مکان اور اتحادِ کردار کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے المیہ ڈراموں کا انجام ہمیشہ موت پر ہوتا تھا اور طربیہ ڈراموں کا انتہائی خوشی پر۔

اردو ڈراما نگاری کا پہلا دور وہ تھا جب کہ امانت نے اندر سبھا لکھی اسی دور میں طالب اور احسن نے ڈرامے لکھے جن میں مکالموں کا مقفٰی و مسجع ہونا۔ شعروں کی کثرت۔ گانوں کی زیادتی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر خصوصیات ہیں حشر نے اپنی ڈراما نگاری کے پہلے دور میں ایسے ہی ڈرامے لکھے۔ چنانچہ بیتاب، محشر وغیرہ نے اس کی تقلید کی۔ حشر نے تو کچھ عرصہ بعد ترقی کر کے اردو ڈراما نگاری میں ایک نئی طرح ڈالی لیکن اس کے مقلد اسی پرانی راہ پر گامزن رہے۔ حشر کے بعد اردو ڈراما نگاری کا جدید دور شروع ہوتا ہے جس میں سید امتیاز علی تاج حکیم احمد شجاع۔ پنڈت کیفی۔ محمد عمر نور الٰہی وغیرہ ممتاز ہیں۔ اس دور کا ذکر آئندہ مقالے میں کریں گے۔

عبدالسلام خورشید

---

[1] حشر کے مکالموں کی ڈرامائیت کے جواز کی یہ دلیل بہت خیال برداشت [illegible] ہے کیونکہ اس کی علت غائی بھی زمانے کی روش ہی تھی۔ اس زمانے کے تماشائی اکتا [illegible] ہے مطابق فطرت نظریے سے [illegible] نہ ہوتے تھے لیکن جوں جوں زمانہ [illegible] مکالموں کا رنگ بدلنا شروع کر دیا یہاں تک کہ [illegible] آج بھی اگر سٹیج کیا جائے تو [illegible] کا ڈراما محسوس ہو۔ (ادارہ)

چودہ مئی کی رات

اب کچھ نہ رہا مٹی میں ملا، جو دھن تھا پاس وہ دُور ہوا،
وہ دھن بھی دھیان کی دولت ہی تھی، پگلی، اُبھری، ڈوبی کھوئی۔
وہ پہلی اچھوتی سندرتا، نیند آ ہی گئی اس کو، سوئی۔
نادان جوان رہے دل کا ـــ نشہ تھا نیا ـــ مخمور ہوا۔
اک گیان کی موج اٹھی چنچل، چپل، البیلی سی ناری،
جو بات بتائی اس نے مجھے وہ بات لگی دل کو پیاری۔
کچھ سوچ نہیں، کچھ سوچ نہیں، کیوں سوچ میں کھوئے دل میرا؟
کیوں اپنے لہو کی بوندوں سے آنکھوں کو دھوئے دل میرا!
اب رنگ لہو کا اور ہوا، اب رنگ لہو کا اور ہوا۔
کیسو کی کلیاں مرجھائیں، اک کھیت کپاس کا پھولا ہے،
من سوچ کرے تو گیانی نہیں، اگیانی ہے من بھولا ہے۔

اس جگ کی ریت ہے یہ نادان، ہر بات بدلتی رہتی ہے،
رُت آتی ہے، رُت جاتی ہے، یوں وقت کی ندی بہتی ہے۔
بچپن آیا، کیسا نخا سماں، جگ کی ہر بات نرالی تھی،
من اپنا بھولا بھالا تھا، سب دنیا بھولی بھالی تھی۔

پھر من کی دھارا پھوٹ بہی، بسنتی رُت آئی جوانی کی،
من میں تھیں اُمنگیں پریتم کی، آشائیں پریم کہانی کی۔
یہ دنیا ایک شکاری تھی، کیا جال بچھایا تھا اِس نے!
دو روز میں ہم نے جان لیا سکھ اور کا ہے اور دُکھ اپنا،
سنجوگ کے دن گنتی میں نہیں، اور پریم کی راتیں ہیں سپنا۔
یہ دنیا اک بیوپاری تھی، کیسا بہکایا تھا اِس نے!

من جال میں پھنس کر جب تڑپا، جھنجھلا اُٹھا، جھنجھلا اُٹھا،
اک رات کے جادو میں کھو کر پھر آیا جوانی کا ریلا،
دل میں الجھن تھی، آنکھوں میں اک رنگ لہو سا چھایا تھا،
دو پل کو مدماتے ہو کر دیکھا ہم نے، انوکھا میلہ،
اک گیان کی چنچل موج اُٹھی، اس جگ میں جیون دو دن کا!
اب من کو کیسے سوچ آئے، انجانی ہولی کیوں کھیلا

میراجی

نغمۂ فردوس

"آخر نیند کے ملتے ایک طویل خوشگوار خواب کے بعد بیدار ہو جائیں گے۔ اور ان کا گھر اس کثیف دنیا کی بجائے جنت الفردوس میں ہوگا۔ جہاں دور ، بہت دور کوئی لطیف اور سہانی آواز نغمہ ریز ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔"

مریض نے یہ الفاظ بہ آواز بلند کہے اور کروٹ لے کر آنکھیں کھولیں تو اپنے معالج کی سرد اور روکھی نظروں کو دیکھا جو گھڑی ہاتھ میں لئے ، جھکا ہوا اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا "ہوشیار ہو! نبض دیکھیں!"

مریض نے کلائی آگے بڑھا دی۔ "ٹھیک ہے۔ نہ جانے ابھی آپ بحران میں کیا بک رہے تھے۔ مسٹر ڈینور!"

ڈینور کے چہرے پر ایک غمگین مسکراہٹ آئی اور وہ آہِ سرد بھر کر بولا "واقعی! میں تو شاید خواب دیکھ رہا تھا ــــــ" وہ ذرا رک گیا اور پھر اپنا فقرہ پورا کیا "جنت کے متعلق!"

ڈاکٹر نے گھڑی جیب میں رکھ لی اور اپنی ٹوپی اور دستانے اٹھانے کے لئے مڑا۔ "ہوں!" وہ رکھائی سے کہنے لگا "خواب اکثر ہوتے تو دلچسپ ہیں۔ مسٹر ڈینور! ابھی اس دوا کو جاری رکھئے، اس سے آپ کے درد میں افاقہ ہوگا فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا آپ میں طاقت آ جائے تو پھر آپریشن کا سوچیں، اس وقت تو جراحی غیر مفید رہے گی۔"

ڈینور کی گہری اُداس آنکھیں اس پر جم گئیں "ڈاکٹر صاحب! ذرا ٹھیرئیے۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے سرسام نہیں ہے میں بالکل اپنے آپ میں ہوں۔ میرے ہوش و حواس بجا ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا مرض لاعلاج ہے۔ سرطان دیر یا سویر، ضرور میرا خاتمہ کر دے گا۔ لیکن آپ بھی تو فانی ہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ آپ بھی اسی راستے پر گامزن ہوں گے جس پر میں چل رہا ہوں۔ میری کشتی کنارے آ لگی ہے ..... جھوٹی تسلی تشفی دے کر مجھے دھوکے میں رکھنے سے کچھ فائدہ نہیں مجھے آپ ایمانداری سے بتا دیجئے کہ آپ کا دوزخ جنت پر اعتقاد ہے؟"

ڈاکٹر نے صاف صاف جواب دیا "اگر جنت سے آپ کی مراد کوئی مافوق الفطرت شے ہے تو قطعی نہیں۔ انسان کے لئے جنت کے صرف یہی معنی ہیں کہ دل و دماغ میں کچھ ایسے احساسات پیدا ہوں جن کی لذت سے اس پر مسرت طاری ہو جائے۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ جنت کوئی مقام نہیں، بلکہ ایک ذہنی کیفیت ہے"۔

ڈینور نے آہستگی سے پوچھا "پھر تو آپ کی رائے میں موت کے بعد انفرادی یا شعوری زندگی ناممکن ہے؟"

ڈاکٹر زچ ہوگیا۔ ویسے بھی وہ بہت بڑا ڈاکٹر تھا بیسیوں لوگ اس کے زیر علاج تھے۔ "یہ سوال آپ پادری سے کیجئے۔ میں اس مسئلے پر کچھ نہیں کہہ سکتا میں نے تھوڑی سی سائنس پڑھی ہے۔ اس لئے میں صرف یہ جانتا ہوں کہ موت مریض اور تھکے ہوئے انسان کا قدرتی انجام ہے، اور جب وہ مر جاتا ہے تو پھر اس کی کسی قسم کی بقائے حیات کا ذرہ بھر امکان نہیں"۔

جون ڈینور نے اسے نگاہ بھر کر دیکھا، پھر قدرے رک کر بولا۔ "آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ میں ہمیشہ سے جاہل ہوں لیکن جب لڑکپن میں میں پیٹ پالنے کے لئے کانوں کی گہرائی میں کام کرتا تھا اور رات کی تاریکی میں کبھی کبھی مجھے تاروں سے جھلملاتے ہوئے آسمان کو دیکھنے کا موقع ملتا تو میں سمجھتا تھا کہ وہیں جنت ہے اور خدا ان تاروں کے کہیں بیچ میں رہتا ہے۔ بے شک یہ خیال واہیات تھا۔ مگر کاش اب بھی میرے وہی اعتقادات ہوتے اور میں یہ روحانی کرب آسانی سے سہہ لیتا"!

ڈاکٹر تنگ آ گیا۔ یہ داستان اس کے لئے پرانی تھی۔ بہت سے مریض اس سے اس قسم کی گفتگو کر کے اُسے پریشان کر دیا کرتے تھے اور جون ڈینور اگر غریب ہوتا تو وہ حسبِ معمول اس کی بات کا جواب تکسند دیتا

لیکن کلد چتی لوگ ڈاکٹروں کے دام میں روز روز تھوڑا ہی پھنستے ہیں

آپ بہادری کیوں نہیں دکھا لیتے؟ اس سے پوچھا شاید وہ آپ

کا اعتقاد پھر بحال کر دے۔

ڈینور نے افسوسناک لہجے میں جواب دیا "یاد رکھو! میں کرارضی

آرام و آسائش کا قدر دان ہوں اصل دولت ہے جو وہ ہماری لطف و انبساط

کا خیال کرے۔ آخری بار جب وہ مجھ سے ملا تو میں نے گزارش کر کہا کہ آپ اپنی

وصیت میں کچھ اپنا شکریہ کے لئے بھی صرف کر دیجئے کہنے لگا مجھے یقین

کر افسوس ہوا کہ آپ کا اس اخلاق سے محروم نہیں ہے آپ کی یہ خواہش

پوری ہو گی کہ آپ کی تھوڑی سی دولت اس نادار مخلوق کے کام آ سکے تو یہ

انسان کی دولت واقعی عالی موجودات کے کام آ سکتی ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب

یہ میں آزمائش میں مبتلا ہوں بہادری سے میں کوئی مدد نہیں دے سکتے ہیں

سب کچھ خود ہی برداشت کرنا ہے مجھے اب آپ کو بھی زیادہ نہیں ٹھہرانا چاہئے۔

خدا حافظ

ڈاکٹر جلدی سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ وہ خوش تھا کہ اسے

اس مجذوب کی باتوں سے چھٹکارا مل گیا ہے

جوں ڈینور اب اکیلا رہ گیا تھا تنہائی سے گھبرا کر اس نے وسیع لمبے

میں نظر دوڑائی جس کے ٹھاٹ امیرانہ تھے سامنے کے ایک دریچے میں

سے اسے دور دور تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب باغات نظر آئے جو

اس کی ملکیت تھے۔ ابلا ہوتے ہوتے اگلی پچھلی تمام باتیں اس کی نگاہوں

کے سامنے پھر گئیں۔ اسے وہ وقت یاد آگیا جب وہ موجودہ دولت و امارت

کے حصول کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرتا اور محنت و استقلال سے کبھی

جی نہ چراتا تھا۔ پھر خدا نے اسے چھپر پھاڑ کر دولت دی اور سان و گمان،

ایک روز اسے کسی خام چاندی کی کان کا پتہ چلا جس نے اسے دنیا کے امیر ترین

لوگوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور جب سے روپے کی ریل پیل ہوئی، سوسائٹی

کی جھوٹی چمک دمک اور مطلبی دوستوں نے اسے آگھیرا۔ پھر اسے اس خوبصورت

دوشیزہ کا خیال آیا جس سے اس نے شادی کر لی تھی —— وہی دوشیزہ

جس نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس پر دل و جان سے فدا ہے لیکن شادی

ہوتے ہی اس نے کینچلی بدل لی اور اپنی اصلیت پر آگئی یعنی ایک فیشن پسند اور

دولت پرست عورت جس کے لئے سوسائٹی والوں کی خوشنودی سے

بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں تھی اور جس کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر پتھر سے

زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ پھر وہ اپنی اولاد کے متعلق سوچنے لگا۔ مگر ان میں سے بھی

کسی کو اس سے کبھی ہمدردی بلا غرض محبت نہیں ہوئی —— ایک لڑکا

تھا جو اسے صرف اپنے اخراجات کا کفیل سمجھتا تھا۔ ایک لڑکی تھی جو ہر وقت

سجے نوجوانوں میں رہا کرتی تھی تاکہ کسی خطاب یافتہ نواب کو پھسلا کر اپنا شوہر بنا

لے اور یہ احساس نہیں تھا کہ اس کا باپ ایک لاعلاج مرض میں گرفتار بستر

مرگ پر پڑا ہے۔ ان تمام تکلیف دہ باتوں کی یاد سے اسے بڑا صدمہ ہوا اور

اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے "اے خدا! میں نے اپنی زندگی میں

کیا کمایا! اور اگر موت لابدی ہے تو زندگی کا مقصود کیا ہے؟"

دروازے پر کسی نے دستک دی اور پیشتر اس سے کہ وہ اسے اندر

آنے کی اجازت دیتا ملاقاتی خود بخود کمرے میں آگیا اور اس نے مدھم سی آواز میں

لہجے میں کہا "میرا خیال تھا تم اس وقت تنہا ہی ہو گے۔ جون ڈینور! مجھے باغ میں

تمہاری بیوی ملی تھیں انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ابھی ابھی تم کو دیکھ کر گیا ہے۔"

ڈینور نے آہستہ سے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ اس وقت وہ

بڑی تکان محسوس کر رہا تھا یوں بھی وہ اپنے اس عجیب و غریب دوست کے

سامنے بہت کم زبان کھولتا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ پال واسکی، جس پر

لوگ دہشت پسند روسی ہونے کا شبہ کرتے تھے، غیر معمولی وجاہت

اور رعب داب کا آدمی تھا۔ مزید برآں اس کے بشرے میں کچھ ایسے مقناطیسی

اثرات پنہاں تھے کہ بہت سے لوگ اس کشش کے زیر اثر اسکی طرف کھنچے

چلے آتے تھے اور بعض اس سے دور ہی رہنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ وہ

پستہ قد اور زرد رو تھا لیکن اس کی سبزی مائل آنکھیں اس کے چہرے کے

لئے بے پناہ حسن کا خزانہ تھیں جن سے ناظر کبھی مسحور ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اس نے ڈینور کو

دیکھا اس کی نظروں میں حد درجہ رحم اور ہمدردی تھی۔

"زندگی کا چراغ گل ہو چلا ہے! سب کو ایک دن یہاں سے جانا ہو گا!"

واسکی نے محبت بھری آواز میں کہا "لیکن زندگی میں بہت سی چیزیں موت سے بدتر ہیں"

ڈینور کے لبوں پر پھر خاموشی لگی ہوئی تھی۔

اس کا ملاقاتی قدرے ٹھہر کر بولا "تمہیں موت عزیز نہیں ہے!

مقبرے کی تنہائی اور خاموشی تم پسند نہیں کرتے! ہم کچھ بے چین معلوم ہوتے ہو

مگر تم تو بہادر ہو —— تم کو موت سے نہیں ڈرنا چاہئے۔"

ڈینور نے استقلال سے جواب دیا "نہیں، نہیں نہیں میں تو بس ——

متاسف ہوں!"

"متاسف کیوں؟"

اس لئے کہ میں نے اپنی زندگی کی قدر نہیں کی۔ میرا سارا وقت صرف دولت جمع کرنے میں گذرا اور اس کا نتیجہ؟ —— ایک فعلِ باطل بلکہ مضطرب کن نفع، کیونکہ میری گاڑھی کمائی میرے کام نہیں آئی! یہ دھن دولت میرے مرض کا علاج نہیں کر سکتی نہ اس سے موت کو پرے دھکیلا جا سکتا ہے، اور پھر بدقسمتی سے" وہ رکا اور آہِ سرد بھر کر کہنے لگا "مجھے کسی کی محبت و ہمدردی بھی تو حاصل نہیں۔ دیکھ لو۔ میں یہاں اپنی بدنصیبی کو بھگتنے کے لئے تن تنہا پڑا ہوں۔ پھر کیوں نہ مجھے مرنے کا افسوس ہو! اس خوبصورت دنیا سے جانے کا مجھے سخت رنج ہے۔ اس نیلے آسمان اور چمکدار دھوپ سے عنقریب محروم ہو جانے کا بڑا قلق ہے —— " دفعتہً اس نے بات کا رُخ بدلا" لیکن پال! اگر مجھے تمہاری طرح حیاتِ بعد الموت کا یقین ہو جائے اور جو خواب میں نے ابھی گھنٹہ بھر ہوا دیکھا تھا، حقیقت ہو تو پھر مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں بلکہ خوشی ہوگی۔"

واسکی نے ہمدردی سے استفسار کیا "کونسا خواب؟ کیا دیکھا تھا تم نے؟"

"میں نے دیکھا کہ میں جنت میں ہوں۔" ڈینور کا بے چین بشرہ روحانی وجدان سے چمک اُٹھا۔ "لیکن اس جنت میں نہیں جس کا ذکر پادری کرتے ہیں وہ جگہ تو اس دنیا سے ملتی جلتی تھی۔ ہاں اس سے زیادہ وسیع اور حسین ضرور تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں یکایک گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں، اور جب میں جاگا تو مجھے ایک سہانی آواز سنائی دی —— ایسی آواز جس سے زیادہ لطیف اور شیریں آواز کا تصور نا ممکن ہے —— معلوم نہیں وہ روح پرور نغمہ کون گا رہا تھا، مگر پال، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس نادیدہ مغنّی کو جانتا اور چاہتا ہوں۔"

پال دریچے کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ سُن کر وہ کھڑا ہوا اور اس کے پلنگ کے قریب آکر اُس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے پہنچے پر رکھ دیا۔

"تو تم نے دوسری دنیا کی آواز سُن لی ہے، میرے دوست!" پال نے اس کی نظر اپنی بے پناہ اور پُر سحر نگاہوں سے گرفت میں کر لی "اور پھر بھی تمہیں شبہ ہے! تم جانتے ہو کہ بعض اوقات غیر مرئی دنیا کے پردے میری آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جاتے ہیں۔ لوگوں نے مجھے ساحر روحانی اور خبطی سمجھ رکھا ہے کیونکہ مجھ پر وہ راز منکشف ہو جاتے ہیں جن تک ان معمولی دنیاداروں کی پہنچ نہیں ہوتی۔ لیکن مجھے ان کی کیا پروا ہے! موت کے وقت میری روح کو سکون و اطمینان ہوگا اور ان لوگوں کی مادیت خوف د

ہراس سے تھرائے گی جو آواز تم نے سنی ہے، کیا وہ اس جیسی تھی ——؟"

اس نے ایک ہاتھ بلند کر کے ہلایا —— اور دور بہت دور، نغمے کی ایک کرن پھوٹی، دھیمی، شیریں اور صاف، گویا آسمان سے بارشِ غنا ہو رہی ہے۔

ڈینور چونک پڑا "یا رالہ! یہ تو وہی ہے —— بالکل وہی! پال! اس کا کیا مطلب ہے؟"

واسکی نے سمجھا سمجھا کر کہا "اس کا یہ مطلب ہے، میرے دوست! کہ تم دوام و بقا کے کنارے آپہنچے ہو اور مجھے، جو ایک معمولی واسطہ ہوں، حکم دیا گیا ہے کہ تم کو اس حقیقت کا یقین دلا دوں جو جنت تم نے خواب میں دیکھی وہ اصلی ہے جو آواز تم نے سنی وہ واقعی ہے۔ اور مغنّی تمہارے انتظار میں ہے تاکہ وہ تمام محبت جس سے تم اب تک اپنی زندگی میں محروم رہے ہو، تم پر نچھاور کر دے۔ تم چاہے مجھ پر اعتبار کرو یا نہ کرو، لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے۔ فانی انسان جس شے کو موت کہتے ہیں وہ تم کو ایسی بے پایاں مسرت عطا کرے گی جو انسانی ذہن اور اندازے سے باہر ہے، لیکن اس کے ساتھ مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ تمہیں انتخاب کا حق حاصل ہے۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتلایا اُسے جانتے ہوئے بھی تم یہ فیصلہ کرنے کے لئے بالکل آزاد ہو کہ تم موت کو پسند کرو یا زندگی کو ترجیح دو۔"

حیرت سے ڈینور کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں "تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو، پال! زندگی کو ترجیح دوں؟ میں؟ میری تقدیر تو طے ہو چکی ہے، میرا وقت تو آیا چاہتا ہے۔ مانا کہ تم ماہرِ روحانیات ہو لیکن تم کر کچھ نہیں سکتے۔ موت کو بھلا تم کیسے ٹال دو گے؟"

واسکی نے اٹل انداز میں کہا "تم اگر زندگی کو پسند کرو، تو تم زندہ رہو گے! میں اس کا ذمہ لیتا ہوں، کیونکہ مجھے اس کا حکم ملا ہے۔ سرطان تمہیں موت کے گھاٹ نہیں اتارے گا اور نہ کوئی اور بلا تمہارا رشتۂ حیات منقطع کرے گی۔ لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں موت کو زندگی پر ترجیح دیتا۔"

اس نے آہستہ سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا "تم —— تم میری زندگی کا وعدہ کرتے ہو؟ اگر میں جینا چاہوں تو کیا مجھے اس کی مہلت مل جائے گی؟"

"ہاں، ضرور۔ میں اس کی قسم کھاتا ہوں! میں آج اسی غرض سے تو تمہارے پاس آیا تھا۔ مگر فیصلہ کرنے سے پہلے خوب غور کر لو —— آخرت کے دروازے ایسے میں تمہارے استقبال کو کھلے ہوئے ہیں۔ اگر تمہاری

ہی مرضی سے یہ بند ہو گئے تو جو آواز تم نے سنی تھی، پھر کبھی نہ آئے گی!

ڈینور کی پُرتجسس اور متعجب نگاہیں اپنے دوست کے زرد چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ میری کی آنکھوں میں خیرہ ہونے والی چمک اور [illegible] پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خالی الذہن ہو گیا [illegible] بات کیجئے [illegible] ایک مدت سے خیال آیا کہ والسکی کے متعلق بے شمار دو طلسمی روایات مشہور ہیں [illegible] انداز گفتگو سے متاثر ہو [illegible] دیا اور بحث [illegible] ڈیوں گا ——— کیا خبر آخرت محض خواب و خیال ہو، کون جانے وہ [illegible] آواز جس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا [illegible] کے مطابق [illegible] سچ مچ کی ہے [illegible] ہم جیتے جی [illegible] سانس لیتے ہیں [illegible] چکے ہیں [illegible] واقعی وہ طاقت ہے جو بظاہر معلوم ہوتی ہے تو [illegible] مجھے زندگی [illegible] دو ——— یہ زندگی ہی میرا انتخاب ہے، جنت نہیں [illegible] زندہ رہنا چاہتا ہوں!!

والسکی آہستگی سے [illegible] کے بستر سے پرے ہٹ گیا اور اس نے حقارت و ہمدردی کی ملی جلی نظروں سے ڈینور کو سرتاپا دیکھا۔ یہی سہی۔ اس نے جواباً کہا: بس تو زندہ رہو اور کوشش کرو کہ اس زندگی میں تمہیں خوشی، سکون اور محبت میسر آ جائے میرے دوست! افسوس تم نے غلط انتخاب کیا! تم نے آفات سے لبریز جہان کے لئے آرزوئے جلیل المرتبت حقیقت کو ٹھکرا دیا ہے۔ خیر، جب تم اپنے انتخاب سے تنگ آ جاؤ، تو مجھے اطلاع کر دینا۔ اچھا اب خدا حافظ!

دروازہ آہستہ سے بند ہو گیا ——— وہ جا چکا تھا۔

جون ڈینور کئی گھنٹے تک آنکھیں کھولے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اپنے اس عجیب و غریب ملاقاتی کی حیرت ناک گفتگو اس کو شروع سے آخر تک بار بار یاد آتی رہی اور وہ سوچنے لگا، کیا یہ سچ ہے کہ مجھے زندگی کی ایک اور مدت عطا کر دی گئی ہے، یا والسکی محض سفیلی گھمار کر گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ طویل نیند کے آغوش میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

اگلے روز وہ بیدار ہوا تو اس کے درد کو آرام تھا اور ایک ہفتے کے اندر اندر وہ اس قابل ہو گیا کہ پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا اور روزمرہ کے کام سرانجام دے سکے۔ وہ بڑا ڈاکٹر جو اس کے علاج سے مایوس تھا، اس کی صحتیابی سے حیرت میں رہ گیا۔ اب پتہ چلا کہ اسے سرطان کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ گویا ایک بار پھر ثابت ہو گیا کہ بڑے سے بڑے معالج کی تشخیص بھی غلط ہوتی ہے۔ والسکی کے وعدے کے مطابق ڈینور موت کے منہ سے واپس آ گیا، لیکن زندگی کے اس نئے عرصے میں اس کی آنکھوں نے کیا کیا دیکھا! ——— اس کے بیٹے کو کسی شخص کے جعلی دستخط کرنے کے جرم میں قید ہوئی۔ اس کی بیٹی نے ایک نامہذب نواب سے شادی کی جو حد درجہ بدمعاش، شرابی اور جواری تھا۔ اس کی بیوی بے وفا نکلی، کیونکہ اُسے تو اس کی موت کی تمنا تھی۔ اب اس کی تطویل حیات سے اس کے ارادوں پر پانی پھر گیا۔ اس سے زیادہ یہ کہ ڈینور نے خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی دولت کو مطلبی دوستوں اور نمک حرام ملازموں پر لٹایا اور لٹاتا گیا، حتیٰ کہ اس کی آنکھیں کھلیں اور اسے اپنے ہی ہم جنسوں کی جھوٹی خوشامد [illegible] اور خود غرضی کا پورا پورا احساس ہو گیا۔ گویا بس یہی اس نئی زندگی کے تحفے تھے! سات سال اسی طرح بیت گئے۔ ایک شام وہ اکیلا اپنے وسیع و شاندار کتب خانے میں بیٹھا ہوا انگاروں میں غلطاں و پیچاں تھا اور اس کی نظریں باہر چاندنی میں ملفوف سبزے پر جمی ہوئی تھیں، کہ وہ سوچنے لگا "یہ حیات بھی ناکام اور بے فائدہ گزر رہی!" اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابل پڑے۔ "کاش میں جنت کا پھر خواب دیکھوں اور بیدار ہو کر وہی حسین و محبوب نغمہ ایک بار اور سنوں!"

معاً اس نے قلم اٹھایا اور پال والسکی کو مندرجہ ذیل سطور لکھیں:

"زینو ——— تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جب میں اس زندگی سے تنگ آ جاؤں تو تمہیں مطلع کر دوں۔ تو سنو، میں اس جینے سے بیزار ہو گیا ہوں۔ اس زندگی نے مجھے کچھ نہیں دیا اور تم نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف سچ نکلا۔ بیشک میرا انتخاب غلط تھا...... اگر تم جنت کے معتقد ہو تو خدارا مجھے بھی اس کا یقین دلا دو! جو آواز میں نے اس دن سنی تھی اگر وہ حقیقی ہے، اگر یہ اس کی ہے جو رحیم، صادق اور رحمان ہے، تو کیا میں اسے اب کبھی نہ سن سکوں گا؟ تم پر بہت سے رازہائے سربستہ منکشف ہیں، بہت سے اعتقادات واضح ہیں۔ اگر یہ تطویل حیات تمہارے ہی باعث ہوئی ہے، تو میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اپنی عنایت واپس لے لو اور مجھے اسی دوام و بقا کے کنارے چھوڑ دو جہاں میں سات سال پہلے پہنچ گیا تھا اور جہاں سنہرے دروازے میرے لئے وا تھے!"

کئی دن گزر گئے۔ اس کی بے چینی اور بے صبری روز بروز بڑھنے لگی۔ آخرکار جواب آیا جس سے اس کی پُرشور طبیعت قدرے سکون آشنا ہو گئی

لکھا تھا: میرے دوست! جنت اب بھی ویسی ہی ہے۔ اندھے دنیا داروں کی خاطر کہ وہ اس کے متعلق شبہ کرتے ہیں، اس نے اپنا نقشہ یا مقام نہیں بدلا۔ جو سات سال تم نے گذارے وہ جنت والوں کے نزدیک محض سات لمحے ہیں ــــ یا اس نغمے میں جو تم نے سنا تھا ایک ننھا سا وقفہ! مطمئن رہو ــــ جس رات تمہیں یہ خط ملے گا، وہی نغمہ پھر سنائی دے گا اور تم عنقریب سے واقف ہو جاؤ گے"!

خط ہاتھ میں لئے جون ڈینور خواب آلود نگاہوں سے کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دنیائے رنگ و بو غروب آفتاب کی گلابی روشنی میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ایک بلبل ہزار داستان شمشاد کی ٹہنی پر جھولتی ہوئی نغمۂ شام الاپ رہی تھی۔ اس نے سنا۔ ایک غیر معین مسرت چھا چلی تھی۔ وہ بالکل تنہا تھا ــــ کیونکہ بہت عرصہ ہوا اس کی شریک حیات تک اُسے چھوڑ کر اپنے کسی عاشق کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ کیا! یہ تو عجیب و غریب احساس سرایت کر رہا ہے! وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ دوئی میں رنگا جا رہا ہے گویا وہ، یعنی جون ڈینور تو محض چوکھٹا یا خول ہے کسی لائق شخصیت کا، جو اب تک تکالیف اور صعوبتیں اٹھانے کے لئے آب و گل میں مقید رہی، لیکن اس وقت آزادی اور مسرت بے پایاں حاصل کرنے کے لئے اس قید خانے کی زنجیریں ایک جھنکار کے ساتھ توڑ پھینکنا چاہتی ہے۔

اس نے نیم بلند آواز میں کہا: لیکن جنت اگر ہو بھی تو مجھے اس میں جانے کا کیا حق ہے! میں نے کوئی ایسا کارِ ثواب نہیں کیا جو اس کا مستحق بنوں۔ بیشک میں نے اپنی طرف سے ہمیشہ اچھا ہی کام کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے! یہ ٹھیک ہے کہ میں دنیا میں محبت سے محروم رہا، لیکن میں یہ توقع کیوں کروں کہ آخرت میں یہ مجھے حاصل ہو جائے گی؟ وائسکی کہتا ہے کہ خدا کا کارخانہ مساوات پر قائم ہے اور ہر انسان کا جوڑا بنا یا گیا ہے۔ کسی کو اپنا رفیق یہیں مل جاتا ہے، کسی کو بعد الموت ملتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے ــــ اگر یہ صحیح ہو سکتا ہے تو پھر شاید خدا کے قانون کے مطابق جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، مجھے وہی فردوسی نغمہ نواز مل جائے"!

عین اسی ساعت ایک دلنواز اور قلب کے پار ہو جانے والی آواز نے خاموشی کو توڑا جس کی شیرینی کو دنیا کا کوئی ارگن یا یہ کی ماری بلبل بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جون ڈینور ــــ وہ دنیوی تفکرات سے تھکا اور مایوسیوں کا ستایا ہوا انسان ــــ ایکا ایکی سرو قد کھڑا ہو گیا، زرد رو اور متوقع! اس نے گھبرا کر کمرے میں جمع ہونے والے بے شمار سایوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ دنیا اور دنیا کے منافع تو سراب ثابت ہوئے ــــ کیا آخرت کی امید بھی اسی طرح خیال خام ثابت ہوگی!

اُس کے مُنہ سے، خوشی میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے نکلا "وہی نغمۂ مقدس ہے! وہی محبوب نغمہ جسے میں نے پہلے سنا تھا! ...... لو وہ پھر گونجا! ایسی شیریں آواز فریب نہیں دے سکتی۔ یہ قطعی خدا کی صداقت کا یقین دلا رہی ہے"!

اس نے آنکھوں پر زور دے کر، دم بدم بڑھنے والی تاریکی کو پھر دیکھا ...... کہیں تخیل تو کارفرما نہیں ہے! اور یا یہ سچ مچ کوئی فرشتہ ہے جس کی صورت مدورج دلکش ستارے کی مانند تابناک اور محبت و معصومیت کی تصویر ہے! اس نے آپ ہی آپ اپنے ہاتھ بڑھا دیے ...... یہ استعجاب، یہ مسرتِ بے پایاں اس میں کہاں سے آئی!

"یہ سچ ہے!" اس نے کہا "دنیا داروں کی تنگ نظری اور شکوک کے باوجود، خدا انصاف والا ہے اور جنت کا وجود ہے ــــ محتاجوں، گنہگاروں اور جاہلوں تک کو روحانی تسکین عطا کی جائے گی! کیونکہ موت، موت تھوڑی ہے، یہ تو حیات تازہ ہے"!

اس کے پاؤں لڑکھڑائے ــــ اس کا تنفس اس کا ساتھ چھوڑنے لگا ــــ وہ کرسی پر گرا اور گرتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ الہامی آواز گونجتی رہی جس کی بے پناہ موسیقی کا سیلاب پیمانۂ سکوت کو لبریز کئے جا رہا تھا۔ وہ سنتا رہا اور مسکرائے گیا۔

"طویل نیند کے بعد ہم جنت میں بیدار ہوں گے اور ایک حسین نغمہ ہماری روح کو محظوظ کرے گا۔" اس نے زیر لب کہا اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

ــــ اور اس طرح جون ڈینور کو موت کی نیند آ گئی، اور اگر اعتقادات جنون و خبط نہیں ہوتے تو اسی طرح وہ بیدار بھی ہوا ہوگا۔

(میری کوریلی) صادق الخیری

بانسری کی دھن

یہ سحر دم کس نے بستی میں بجائی بانسری
دل میں اک بے نام چنگاری سی لہرانے لگی

روح نے انگڑائی لی آنکھوں میں آنسو آگئے
ننھے تارے دیکھتے ہی دیکھتے دھندلا گئے

اک ہیولے ذہن میں ابھرا، ابھر کر کھو گیا
دل کی دھڑکن رک گئی، اور اک بے بس ہو گیا!

کھچ گئے آنکھوں میں وہ نظارہ ہائے دلنشیں!
محتسب کی روح جن کی تاب لاسکتی نہیں

جنبشِ مضراب سے جب تھرتھرا اٹھتے تھے تار
راگ کی مستی سے ہو جاتی تھیں آنکھیں سوگوار

جب دھواں بن کر مچلتا تھا جہانِ رنگ و بو
مسکراتی تھی ستارہ بن کے دل کی آرزو

وہ جھکی آنکھوں کے وعدے ہنستے لفظوں کے پیام
کپکپاتے لب، دھڑکتا دل، نظر محوِ کلام

ہائے وہ شرمیلے آنسو، ہائے وہ تپتے دماغ
پتلیوں میں جھلملاتے تھے محبت کے چراغ

میری باہیں ان کی زلفیں، میرا دل اور ان کے ناز
ہائے وہ گیسوئے مشکیں، اف وہ چشمِ نیم باز

اب نہ گا اے بانسری والے! تجھے اپنی قسم
راگ کے پردوں میں واپس آرہا ہے درد و غم

پربتوں کی آڑ سے ابھریں سنہری برچھیاں
جانے کیا باعث کہ پیلا پڑ گیا ہے آسماں!

احمد ندیم قاسمی

شان دار ترقی!

۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۰ء

سنلائٹ انشورنس کمپنی کی ترقی پبلک کی طرف سے اس کی خدمات کی بڑھتی ہوئی قدردانی کا نتیجہ ہے



سنلائٹ کی ہیڈ آفس بلڈنگ واقع مال روڈ۔ لاہور

(جو کہ زیر تعمیر ہے)

سنلائٹ کی کامیابی کی وجوہات

مطالبات کی فوری ادائیگی۔ جدید ترین مقبول عام سکیمیں پالیسی کی آزادانہ شرائط
کفایت شعارانہ انتظام مستحکم مالی پوزیشن اور سب سے بڑھ کر کھرا لین دین

کل مکمل شدہ کاروبار زائد از دو کروڑ روپیہ

سنلائٹ کے وظائف میٹرک کے بعد کی پڑھائی کے لئے

سنلائٹ کی ایک بے نظیر خصوصیت۔ بغیر کسی زائد ادائیگی

سنلائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہیڈ آفس - لاہور — کناٹ سرکس نیو دہلی — کلائیو سٹریٹ کلکتہ — لال باغ لکھنو — بندر روڈ کراچی

ودّیاساگر

(لی کاک سے معذرت کے ساتھ)

خودپسندی اور خودستائی ایک حد تک ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مجھے نہ فرشتہ ہونے کی غلط فہمی ہے اور نہ شیطان کہلانے کا شوق۔ اس لئے اس امر کا صاف اعتراف ہے کہ بعض اوقات دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میں بہت خوش ہوتا ہوں۔ کبھی کبھی ”ناقدریٔ ابنائے روزگار“ سے تنگ آ کر مجھے اپنی شان میں خود منظوم قصیدے بھی تصنیف کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے میں بڑا انکسار پسند اور نیاز مند قسم کا نوجوان واقع ہوا ہوں اور مجھے اپنی ذات کے متعلق کچھ زیادہ حسن ظن بھی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ میں بے حد مغرور ہوں۔ اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہوں اور دوسروں کو خاطر میں ہی نہیں لاتا۔

ڈاکٹر متین صاحب ہی کا قصہ سنئے۔ آپ پچھلی جنگ میں کسی ہندوستانی پلٹن کے ساتھ ایک کمپاونڈر کی حیثیت میں فرانس تشریف لے گئے تھے۔ اللہ کو ہندوستان کی بہتری مقصود تھی کہ جہاں اس جنگ میں لاکھوں افراد ہلاک ہوئے متین صاحب کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ آپ نے پنجاب واپس آکر چیچکی ملیاں میں پریکٹس شروع کر دی۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سے لاہور اُٹھ آئے۔ ڈاکٹر صاحب بات بات میں فرانس کا ذکر کرتے ہیں۔ کہیں سڑک پہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر دیکھا تو جھٹ منہ پہ رومال رکھ کر فرمانے لگے ”فرانس میں یہ بیہودگی ہم نے کہیں نہیں دیکھی“۔ کہیں کوئی سکول ماسٹر کسی بچے کو پیٹتا نظر آیا تو فوراً بول اٹھے ”فرانس کے ابتدائی مدرسوں میں یہ منظر آپ کو کہیں نظر نہ آئے گا“۔ کہیں دیکھا کہ بارش کا پانی جمع ہے اور نکاس کی کوئی صورت نہیں تو بڑی حسرت سے ارشاد فرمایا ”پیرس میں شہری غیر ذمہ داری کا یہ نظارہ کبھی نہیں دیکھا“۔ پیرس اور فرانس کی یاد میں اس طرح کا ہے گاہے آہیں بھرنے اور ٹھنڈے سانس لینے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ ڈاکٹر متین نے طب کی تعلیم فرانس میں حاصل کی ہے اور آپ کافی مدت تک اس ملک میں رہے ہیں۔ یہ بات تو ہم ایسے دو چار نیاز مند ہی جانتے ہیں کہ حضرت قبلہ کس سلسلے میں فرانس تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے کیا سیکھ کر آئے۔

ڈاکٹر متین کا معمول ہے کہ شام کو اپنی دوکان بند کر کے سیر کو نہیں جاتے بلکہ بغداد ہوٹل میں آ بیٹھتے ہیں۔ شہر کے کچھ اور شاعر مزاج لیکن بیکار حضرات وہاں پہلے سے ہی جمع ہوتے ہیں۔ دو چار اخبار نویس بھی آ نکلتے ہیں۔ ایک مختصر سی محفل جم جاتی ہے۔ بات کسی کی ہو۔ ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی طرح فرانس کا ذکر ضرور چھیڑ دیتے ہیں۔ اور اسی ضمن میں دنیا بھر کے ادب اور سیاست پر بھی تنقید فرما جاتے ہیں۔

بغداد ہوٹل میں آنے والے لوگ ڈاکٹر صاحب کے تبحر علمی سے بہت مرعوب ہیں۔ جب آپ کسی مسئلے پر اظہار خیال فرما رہے ہوتے ہیں تو یہ بے چارے بڑے ادب سے ان کے منہ کی طرف تکتے رہتے ہیں۔ اب اسے میری بد قسمتی سمجھئے یا ڈاکٹر متین کی بے احتیاطی کا نتیجہ کہ مجھے کسی نہ کسی طرح یہ پتہ چل چکا ہے کہ آپ کے سفرِ فرانس کی علتِ غائی کیا تھی؟ محض یورپ ہو آنا میرے نزدیک علم و فضل کی کوئی سند نہیں۔ اس لئے کوشش کے باوجود میں اپنے دل میں ڈاکٹر صاحب کے لئے وہ جذبۂ احترام پیدا نہیں کر سکا جس کے وہ مجھ سے متوقع ہیں۔ اس وجہ سے ان کا خیال ہے کہ میں بے حد مغرور واقع ہوا ہوں۔ بزرگوں کا ادب نہیں کرتا۔ انگریزی کے چار حرف پڑھ کر اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہوں۔ حالانکہ مجھے شیکسپیئر کے ڈراموں سے بھی پوری طرح واقفیت نہیں۔

اب ذرا شیکسپیئر کے ڈراموں سے میری ناواقفیت کا ثبوت بھی سن لیجئے۔ کبھی کبھی میں بھی بغداد ہوٹل جا نکلتا ہوں۔ ایک شام جو وہاں پہنچا تو میرے پاس شیکسپیئر کا ڈراما ”مرچنٹ آف وینس“ تھا۔ اتفاق کی بات سمجھئے کہ اس وقت ڈاکٹر متین کے حلقۂ احباب میں سے کوئی شخص بھی ہوٹل میں موجود نہ تھا اس لئے مجبوراً انہیں مجھے شرف تکلم بخشنا پڑا ورنہ وہ عام طور پر کالج کے لڑکوں سے بہت کم گفتگو فرمایا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ کالج کے لڑکے پرلے درجے کے کم علم، کم سواد اور نالائق ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو سمجھتے بہت کچھ ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کو جس بات سے سب سے زیادہ

نفرت ہے وہ یہی ہے کہ کوئی شخص جہل مرکب ہونے کے باوجود اپنی قابلیت کے زعم میں کسی کو خاطر میں نہ لائے۔ وہ فرمایا کرتے ہیں کہ ہمیں ساری دنیا علامہ [illegible] سمجھتی ہے لیکن ہم نے کبھی کسی محفل میں ایسی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہمیں بھی قدرت نے علم کی دولت بخشی ہے۔ لیکن یہ کالجوں کے لڑکے [illegible] حالات پر اس [illegible] تو [illegible] کرتے ہیں کہ الامان [illegible] معاف [illegible] بعد معتقد [illegible] میری [illegible] کی [illegible] سنئے۔

"ڈاکٹر صاحب! [illegible] کی کتاب [illegible] آپ نے [illegible]"

"شیکسپیئر کا ایک ڈرامہ ہے ہی۔ مرچنٹ آف وینس۔"

ڈاکٹر صاحب قہقہہ لگا کر بولے!

"مرچنٹ آف وینس بھی بہت خوب لکھا ہے۔ نام سنتے ہی [illegible] تو [illegible] دیا ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں اس کے پائے کا کوئی ڈرامہ نہیں ہے"

"جی ہاں بہت اچھی چیز ہے!"

"بہت اچھی چیز ہے! ارے میاں [illegible] انگریزی کی کتاب کا نام لے سکتے جو مرچنٹ آف وینس کے مقابلے میں پیش کی جا سکی!"

"خود شیکسپیئر کے اکثر ڈرامے اس سے بدرجہا اچھے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب پہلے سے زیادہ زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

"آپ نے ہیملیٹ کا نام ہی لیا! شیکسپیئر تو خلاق معانی ہے۔ لیر کا بادشاہ۔ مرچنٹ آف وینس کے کرداروں کو ہی لیجئے۔ انطونیو، شائیلاک، سلونیو۔۔۔۔!"

میں نے فوراً حیرت سے ڈاکٹر متین کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سلونیو ڈاکٹر صاحب! غالباً آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اس ڈرامے میں انطونیو ہے۔ ایک شائیلاک بھی ہے لیکن سلونیو نام کے کسی کردار کا نام نہیں"

ایک لمحے کے لئے ڈاکٹر متین کی آنکھوں میں شبہ کی جھلک پیدا ہوئی لیکن وہ شخص جو کئی سال تک فرانس میں چھوکروں کی مرہم پٹی کر چکا ہو اپنی غلطی کا اعتراف کب کرتا ہے! ڈاکٹر متین چمک کر بولے۔

"بھئی خوب۔ میاں اگر تم اسی طرح کتابیں پڑھ کر بھول جاتے رہے تو ایم اے میں پاس ہو چکے۔ ہمارے حافظے کا یہ حال ہے کہ آج سے بیس برس پہلے پیرس کے کسی رسالے میں سلونیو پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ اب تک اس کا ایک ایک حرف یاد ہے اور ــــــ"

یہ سوچ کر کہ اگر فرانس کا ذکر شروع ہو گیا تو میرا مارا جانا یقینی ہے۔ میں نے کہا: "ڈاکٹر صاحب قطع کلام معاف۔ لیکن "مرچنٹ آف وینس" میں کوئی سلونیو نہیں ہے۔ میں نے یہ ڈرامہ کوئی چھ بار پڑھا ہے۔"

"کیا احمقانہ بات ہے۔ بالکل احمقانہ۔ کالج کے لونڈوں کی طرح احمقانہ"

بات یہ تھی کہ اس گفتگو کے دوران میں ڈاکٹر متین کے بعض عقیدت کیش بھی آپہنچے تھے اور ان لوگوں کے سامنے میرا اس طرح ان کی بات جھٹلانا ڈاکٹر صاحب کو بہت ناگوار گزرا۔ میں ڈاکٹر صاحب کی اس کمزوری کو بھانپ گیا۔ اس لئے ذرا مسکراتے ہوئے بولا "ڈاکٹر صاحب جو جی میں آئے کہہ لیجئے۔ لیکن اس ڈرامے میں سلونیو کا وجود ثابت کرنا مشکل ہے"۔

"آپ میں آپ سے کیا مغز کھپائی کروں! میں نے خود یہ ڈرامہ پڑھا ہے۔ اپنی آنکھوں سے سٹیج ہوتے دیکھا ہے۔ سب سے اہم پارٹ ہی سلونیو کا ہے۔ سلونیو کا وجود ثابت کرنا مشکل ہے! بھئی خوب! کالج کے لڑکے ہر بات اس یقین کے ساتھ کرتے ہیں کہ الامان۔ اچھا صاحب یہ سلونیو کا دوست کون ہے جو بسانیو کے دشمن ہو جانے کے باوجود اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ آفیلیا کو شاہی [illegible] سے کون چھڑاتا ہے! لارٹیز کو اس کی بہن کے متعلق کون بدظن کرتا ہے! اور آپ فرماتے ہیں مرچنٹ آف وینس میں سلونیو نام کوئی کردار ہی نہیں!"

میں سمجھ گیا کہ دریا ساگر میں طغیانی آ چکی ہے اور ہر چیز مرکز ثقل سے ہٹ چکی ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر متین کا دماغ بھی ــــــ ورنہ ہیملیٹ کے لائرٹیز کو مرچنٹ آف وینس کے دامن میں پناہ نہ لینی پڑتی۔ میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب میں پھر کہتا ہوں کہ اس ڈرامے میں کوئی سلونیو نہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی یہ بات جانتے ہیں"

لیکن ڈاکٹر متین میں ایک خوبی ہے کہ انہوں نے اپنی غلطی کا کبھی اعتراف نہیں کیا۔ وہ تڑپ کر بولے "سنئے۔ سلونیو۔ مرچنٹ آف وینس کا سب سے اہم کردار ہے۔ وہ نمونہ ہے نمونہ۔ انگریزی میں اس قسم کے کرداروں کو ٹائپ کہتے ہیں۔ آپ تو انگریزی کا ایم اے کر رہے ہیں۔ یہ ابتدائی باتیں آپ کو معلوم ہونی چاہئیں" میں نے جی میں کہا۔ میری لاعلمی کا تو گلہ ہی فضول ہے۔ اس سلونیو کا علم تو بے چارے شیکسپیئر کو بھی نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب فرما رہے تھے۔

"سلونیو ٹائپ ہے مکمل اطالوی جنٹلمین کا۔ وہ ایک مثال ہے۔ ایک ــــــ"

میں اسی اثنا میں ڈرامہ کے افراد کی فہرست نکال چکا تھا۔ میں نے کتاب

اکٹر متین کے سامنے رکھ دی اور کہا دیکھئے ڈاکٹر صاحب ڈراما کے افراد کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کا سلونیو اس میں نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب اس پر بھی نہیں گھبراتے بلکہ فرمانے لگے۔

"تو یہ کس کم بخت نے کہا کہ اس کا نام کرداروں کی فہرست میں ہے؟ حضرت یہی تو شیکسپیئر کا آرٹ ہے۔ کمال تو یہی ہے کہ سب سے اہم کردار کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔ شیکسپیئر! شیکسپیئر!! خلاق معانی!!! کرداروں کا بادشاہ شیکسپیئر!!! میاں صاحبزادے یہ باتیں تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ڈرامے کا آرٹ سمجھنے کے لئے شئے لطیف کی ضرورت ہے شئے لطیف کی ضرورت"

میں نے سوچا کہ اب اس بڈھے سے مزید بحث بیکار ہے۔ تنہائی میں جب سوچے گا تو خود بخود اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جائے گا۔ لیکن سلونیو ڈاکٹر متین کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب انتہائی فصاحت سے اس مثالی کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے تھے۔ سلونیو کا موجودہ معاشرت سے تعلق۔ سلونیو اور صنف نازک سلونیو کے پاکیزہ اخلاق۔ سلونیو اور ہیملٹ۔ غرضیکہ کوئی موضوع نہ تھا جس پر ڈاکٹر صاحب نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔

تنگ آکر میں نے ڈراما ڈاکٹر صاحب کے سامنے پٹک دیا اور عرض کیا کہ افراد کی فہرست نہ سہی۔ ساری کتاب میں سے کہیں سلونیو کا نام نکال دکھائیے۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر ادھر ادھر صفحے الٹنے کے بعد بولے "یونیورسٹی کی بدمذاقی کی کوئی انتہا ہے۔ سلونیو کا سارا پارٹ ہی کتاب میں سے نکال دیا ہے۔ سلونیو کی گفتگو ذرا بے باک ضرور تھی۔ مگر اخلاق سے گری ہوئی نہ تھی۔ مگر ان یونیورسٹی والوں کے اخلاقی معیار بھی نرالے ہیں۔ سارا پارٹ ہی خارج کر دیا۔ تبھی تو ڈراما بالکل بے جان بن کر رہ گیا ہے۔ کہیں اس طرح بھی نوجوانوں کے اخلاق کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ اخلاق کی خاطر ادب کا ستیاناس ......؟

مجھے دراصل کالج پہنچنا تھا۔ اس لئے میں ڈاکٹر متین کا پورا فقرہ سنے بغیر اٹھ کر چلا آیا۔ بعد میں لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر متین رات کے دو بجے تک بغداد ہوٹل میں سلونیو کی شخصیت۔ یونیورسٹی کی بدذوقی اور کالج کے لڑکوں کی نالائقی پر تقریر فرماتے رہے۔

حمید نظامی

کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟

صبح کو کوئی پھول جو دیکھا میں نے جانا تم خنداں ہو پیارا، غیر سے بڑھ کر نکلا
دن کو کوئی موتی چمکا میں نے جانا تم تاباں ہو پھول تو اُف اک پتھر نکلا
رات کو کوئی تارا ٹوٹا میں نے جانا تم رقصاں ہو دیوتا، ایک ستمگر نکلا کیا الفت کے خواب یہی ہیں
لیکن جب کچھ غور کیا تو کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟

اُف! وہ پھول تو اک کانٹا تھا گھومنے کو گلزار میں آئے میں نے دل کا ٹکڑا سمجھا
موتی، آنسو کا قطرہ تھا چمبیلی کے ہار میں آئے میں نے دل کی مالا سمجھا
تارا تو اک انگارا تھا کیا الفت کے خواب یہی ہیں گھنگرو کی جھنکار میں آئے میں نے دل کا نغمہ سمجھا
کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟ لیکن جب کچھ غور کیا تو

پیارے پیارے نظاروں میں میں نے تم کو پیارا سمجھا غم کی کلی بھی پھوٹ چکی تھی
رنگیں رنگیں گلزاروں میں میں نے تم کو چمپا سمجھا دل کی مالا ٹوٹ چکی تھی
اونچے اونچے کہساروں میں میں نے تم کو دیوتا سمجھا گیتوں کی لے چھوٹ چکی تھی کیا الفت کے خواب یہی ہیں
لیکن جب کچھ غور کیا تو کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟

سلام مچھلی شہری

تقسیم

بابو سیتلا پرشاد دفتر سے لوٹے تو پہلے ہی اُن کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں گھر میں آکر انہوں نے اپنی چار خانے کی ٹوپی اور اچکن اتاری ہی تھی کہ ان کا سب سے چھوٹا بچہ تین سالہ پرمود مٹی کھاتا کیچڑ میں لت پت آکر ان سے لپٹ گیا۔ ان کی اچکن پہ جا بجا کیچڑ کے نشان بن گئے۔ پہلے تو وہ دور ہی سے "ہاں ہاں" کرتے رہے اور کمرے بھر میں بچنے کے لئے بھاگنے لگے۔ لیکن پرمود نے سمجھا کہ بابوجی ہم بھاگیں تم چھوڑ کھیل رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے ننھے ننھے پیروں سے ان کا تعاقب کرنے لگا۔ بچے کو بری طرح پیچھے پڑا ہوا دیکھ کر سیتلا پرشاد ایک مغرور افسر کی طرح پیشانی پر بل ڈال کر اور سنجیدہ صورت بنا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ متوقع تھے کہ ان کی یہ اداکاری کچھ کارگر ہو گی۔ لیکن پرمود نے ایک نہ مانی اور لپک کر انہیں کیچڑ میں لت پت کر دیا۔ انہوں نے اُسے کرخت آواز میں چیخ کر ڈانٹا۔ اور پھر بھی بھولے پرمود کے نہ ملنے پر زور سے اس کا کان مروڑ دیا اور اسے روتا اور "اماں اماں" کہتا ہوا چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

بچے کو چیختا سن کر اس کی ماں جو اندر باورچی خانے میں پھلکی تل رہی تھی۔ دوڑ کر باہر آئی اور کلیجے کے ٹکڑے پرمود کو روتا دیکھ کر چراغ پا ہو گئی۔ اس نے وہیں سے بڑے لڑکے — ونود کو زور سے پکارا — "ونود! ونود!! ادھر چلو جاؤ اپنے بابوجی کو باہر سے بلا لاؤ"۔

اس نے شوہر کی اچکن لٹکتی دیکھ لی تھی ——

"تم نے میرے پرمود کو کیوں مارا!"

"میرے منع کرنے پر بھی مجھ پر چڑھ کر اس نے کیوں میرے کپڑے خراب کئے؟"

"وہ بچہ ہے۔ اتنا نہیں سمجھتے؟"

"اچھا تو بچے کے لاڈ پیار کے لئے ہر روز نئی اچکن کہاں سے آئے گی؟ ذرا سنوں تو؟"

"تو کیا بے سمجھ بچے کو مار کر اس کی جان لے لوگے؟"

"کیوں جھوٹ موٹ مجھے الزام دیتی ہو؟ میں نے جان لینے کو کب کہا؟"

"یہ جان لینا نہیں تو اور کیا ہے؟ کہنے نہ کہنے کی بحث تھوڑی ہے"۔

"واہ تمہارے جیسے سمجھنے والے ہوں تو سمجھ لیں ——

"سمجھ کیا لیں۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ دودھ پیتی بچی تو ہوں نہیں"۔

"سمجھو چاہے نہ سمجھو۔ اس سے مجھے کیا! اگر پھر وہی حرکت کرے گا تو پھر اسی طرح سے مار کھائے گا"۔

"اُفوہ! یہ مزاج! بڑے آئے کہیں کے مارنے والے!

"مزاج نہیں تو اور کیا۔ اگر وہ تمہارے کلیجے کا ٹکڑا ہے تو اسے منع کیوں نہیں کر دیتیں کہ میرے پاس آکر فضول پریشان نہ کیا کرے۔ مجھے پریشان ہونا پسند نہیں"۔

"پریشان ہونا کیسے پسند ہو سکتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے لیکن اس کے کان مروڑنے سے کیا ملا؟ کیا اس کی جان کی قیمت دو پیسے بھی نہیں دو پیسے میں آپ کی اچکن بگلے کی طرح سفید ہو کر آ جاتی۔ یا میں ہی صاف کر دیتی لیکن یہ بات میری سمجھ میں مطلق نہ آ سکی کہ آپ نے اسے مارا کیوں؟"

"سیدھی سی تو بات ہے۔ اس نے مجھے پریشان کیا۔ میں نے اسے مارا۔ میں اپنے آرام کے بارے میں کسی کا ساجھا نہیں چاہتا۔ سمجھیں؟ آخر آدمی کی طبیعت ہی تو ہے۔ تنگ ہونا برداشت ہو گا نہ ہوا"۔

اپنی سمجھ سے سیتلا پرشاد نے بڑی نرمی سے اپنی صفائی پیش کی تھی۔ ان کی نقل اتارتے ہوئے ان کی بیوی نے اسی لہجے میں جواب دیا —— "یہ جُل کسی اور کو دیجئے گا۔ میں یہ سمجھے بیٹھی ہوں۔ آخر آدمی کی طبیعت ہی تو ہے برداشت ہوا نہ ہوا۔ گویا پرمود نے کچھ کیا اور آپ کی طبیعت پر فالج گرا۔ اور ونود چاہے جو بھی کرے۔ آپ کی برداشت پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا۔ ٹھیک کہتی ہوں نا! ذرا ایمان سے کہئے گا۔ یہ ساری اچکن اکیلے پرمود نے خراب کی ہے؟"

اس سے پہلے کہ بابو سیتلا پرشاد بغلیں جھانکنے سے فرصت پائیں پرمود

نے مچھلی کے اشارے سے بتا دیا کہ اس نے کہاں کہاں مچھلی کھا رکھی ہے اور پرمود
ونود نے بھی یہ دیکھ کر کہ مچھلی خراب ہے۔ مچھلی ساری ماں پرمود ہی سمیٹے جا رہا ہے
اس نے اپنے [illegible] کرتا تے ہوئے بڑے فخر سے کہا ——
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ونود بیٹا ان لوگوں کو [illegible] ان کے پاس جانا۔ چل تجھے
خوب مزے کی تلی ہوئی مچھلی کھلا دوں۔ ونود بھی مچھلی مانگنے آئے تو [illegible]
گی اس سے۔ بدمعاش [illegible] !

بابو سیتلا پرشاد نے بیوی کے شہر میں منہ دکر کہا —— چلو بیٹا تمہیں
پنو بابو کے ہاں سے چاکلیٹ اور [illegible] کھلاؤں۔ ماں جانے دے ان
کی سڑی ہوئی مچھلی۔ کیسی بدبو آرہی ہے۔ پرمود بھی چاکلیٹ مانگنے آئے گا تو
اس سے پوچھوں گا کہ مچھلی کیسی تھی؟ [illegible] بات بات پر رونے"

ونود اپنے باپ کے ساتھ باہر چلا گیا اور پرمود ماں کے ساتھ باورچی
خانے میں جا گھسا
بھلا بچے کی طبیعت مچھلی کھائے بغیر کیسے مانتی! ونود آدھ گھنٹے کے
بعد باورچی خانے میں پہنچا اور بولا —— "ماں مجھے بھی مچھلی دو"
ماں نے تیور بدل کر کہا —— اب آیا ہے بڑا ماں کا سگا بننے؟ ابھی
تو نواب بنا گھومتا تھا۔ جا بھاگ جا میرے پاس سے۔ تجھے مچھلی نہیں مل سکتی
جا تا کیوں نہیں اپنا چاکلیٹ کھا لیٹ"۔

ونود چل گیا اور زمین پر لوٹ کر رونے کی تیاری کرنے لگا۔
ماں نے اور بگڑ کر کہا —— رو رو خوب رو۔ تجھے مچھلی کے یہی کانٹے
[illegible] تو تو بھی [illegible] گا"

اس [illegible] ماں اپنے قول کو عمل کا جامہ بھی نہ پہنا سکے ونود
[illegible] باپ کے پاس چلا گیا۔ اس کی ماں نے سچ مچ ایک روز اسے
[illegible] تھی۔

. . . .

[illegible] تقسیم کی [illegible] میرے پاس نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے ونود
[illegible] اپنی ماں کو پڑا ہو!

آسی رام نگری

دو غزلیں

(۱)

ظلماتِ ممکنات میں پھینکا گیا ہے دل
جانے خضر کہ چشمۂ آبِ بقا ہے دل

فطرت ہے اس میں اور یہ فطرت میں خودنما
کیا جانیں وہ ہے آئنہ یا آئنہ ہے دل

ارض و سما میں دھاک ہے جس کی وہی تو ہے
لاریب مشتِ خاک اِترا ہی بلا ہے دل

اس کا اک ایک قطرہ ہے طوفان دربغل
معمور بجلیوں سے ہے جو وہ گھٹا ہے دل

سمجھے ہوئے ہوں میں تو یہی اس کی ماہیت
اک حسنِ لاجواب کی رنگیں ادا ہے دل

اک اہلِ دل نے کیا ہی پتے کی کہی ہے بات
حقدار دل کا ہے وہی جس نے دیا ہے دل

یہ کائنات آئنہ خانہ ہے اور آئیں
مجبوریوں کے زیرِ اثر خودنما ہے دل

اک برق ہے ہجومِ تقاضا لئے ہوئے
جانے میں آ گیا ہوں یہاں کیا لئے ہوئے

محمل کی اوٹ میں لبِ لیلیٰ شفق فروش
دشتِ جنوں میں قیس ہے غوغا لئے ہوئے

اک تو کہ بے حجاب نہ ہونا تری ادا
اک میں کہ شوقِ دید کی دنیا لئے ہوئے

اک تو کہ اپنے حسن کی ہے آپ ہی دلیل
اک میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لئے ہوئے

اک تو کہ تیری مست نگاہوں کے میکدے
اک میں کہ لب پہ حسرتِ صہبا لئے ہوئے

مقصود امتحان ہے رندوں کے ظرف کا
پھرتا ہوں بزم بزم میں مینا لئے ہوئے

اتنا اثر تو شیخ کی صحبت کا ہے امیں
ہاتھوں میں جام لب پہ ہوں توبہ لئے ہوئے

امینِ حزیں

روشنی کا مینار

[illegible] رحیم جب [illegible] کیا تو [illegible] کے کمرہ میں داخل [illegible]
کے [illegible] پہنچ [illegible] اداس رحیم کو [illegible] نہ تھا [illegible] رحیم سے رخصت
[illegible] میری [illegible] ان میں سے ایک
مینارہ سے خشکی پر سے جانے کے لئے کشتی آئے تو وہ اپنی تعطیل [illegible] کے ساتھ
[illegible] کر اسے [illegible] نے زندگی
[illegible] خواہش [illegible] اپنا [illegible]
دیا تھا کہ وہ خشکی پر پہنچ جانے کے بعد پھر کبھی اس مینارے پر واپس آئے گا۔ مگر ضدی رحیم نے اس کی ایک نہ سنی۔

رحیم نے اصرار کے ساتھ کہا "اس مرتبہ میری باری ہے۔ تم اپنی تعطیل گذار چکے ہو اور اب میری تعطیل بھی مجھ سے لینے کی امید رکھتے ہو۔"

اختر نے دماغ کمی کے ساتھ جواب دیا "صرف اس مرتبہ۔ میری ماں بیمار ہے۔ آئندہ تم دو تعطیلیں اپنے ساتھ لے لینا۔"

رحیم نے سر ہلا کر کہا "مجھے بھی شہر میں کام ہے۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اپنی تمام زندگی اسی مینارے پر بسر کردوں؟"

اختر نے جب یہ سنا تو اس نے اپنے دل میں سوچا "مجھے تعجب ہے کہ رحیم اور کیا کرے گا۔ کیا اس نے اپنی زندگی کے پندرہ سال وہیں بسر کئے تھے اور کیا اس سے پہلے دس سال دوسرے مینارے پر نہیں گذارے تھے، اس کا یہ کہنا کہ اس کو بھی شہر میں کچھ کام ہے کتنا مضحکہ خیز ہے جبکہ اس نے اس چھوٹے سے کمرے میں رہ کر، ہوا کی سنسناہٹ اور موجوں کا شور سن کر، جہازوں کو فاصلے پر گذرتے ہوئے اور ان کا دھواں چمنیوں سے ایک باریک فیتے کی طرح اٹھتے ہوئے دیکھ کر، یا ان خانہ بدوش چڑیوں کو دیکھ کر جن کے رنگین پر سورج کی روشنی میں چمک اٹھتے ہیں اور جو مینارہ کے جنگلے پر تھوڑی دیر آرام کر کے سال میں دو مرتبہ گرم ملک کو سفر کیا کرتی ہیں، ایک چوتھائی صدی بڑے اطمینان سے کاٹی ہے۔"

اس نے کہا: "لیکن تمہاری تو شادی نہیں ہوئی؟"

رحیم نے ہنس کر کہا "شادی، میری شادی، میری مہینوں کی غیر حاضری میں میری بیوی کیا کرتی؟ نہیں دوست! یہاں کی نوکری کرنا صرف غیر شادی شدہ مردوں کا کام ہے لیکن ایک غیر شادی شدہ شخص کے بھی دوست احباب ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ اُن سے ملنا چاہتا ہے"

اختر نے رحیم کو کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے دروازہ بند کر دیا تاکہ طوفانی سمندر کی موجوں کے چھینٹے اندر نہ داخل ہوں۔ اُس نے ہوا کی سنسناہٹ کے درمیان چیخوں میٹھی کی باریک آواز سنی۔ وہ آتش دان کے قریب بیٹھ گیا اور حسینہ کی تصویر نکال کر دیکھنے لگا۔ حسینہ کی پہلی ملاقات کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

رخصت ہوتے وقت اُس نے حسینہ سے کہا تھا "ایک ماہ بعد پھر آؤں گا" حسینہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا "پھر تو مینار کو واپس نہ جاؤ گے؟ ایسی حالت میں جب کہ تم سال کا تین چوتھائی حصہ مینارہ پر بسر کرو۔ اور میں تنہا ایک فرش فروش سے آراستہ مکان میں پڑی رہوں ہماری ازدواجی زندگی اطمینان و مسرت سے نہیں گذر سکتی۔" اُس نے جواب دیا تھا "نہیں۔ میں شہر ہی میں کہیں کوئی کام تلاش کرونگا۔" حسینہ یہ سُن کر اُس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ کتنا خوش نصیب تھا کہ اپنی تعطیل کے دوسرے ہی روز وہ حسینہ سے اچانک ملاقات ہو جانے کی مسرت حاصل کر سکا تھا۔ وہ ضرور واپس جائے گا۔ وہ اپنی تمام زندگی اُس بے وقوف بڈھے رحیم کے ساتھ رہ کر بسر نہیں کر سکتا جو یہ سمجھتا ہے کہ مینارہ میں روشنی کرنے اور ہر وقت سمندر کو دیکھنے ہی میں راحت ہے۔ زندگی! کیا اسی کا نام زندگی ہے جب وہ مینارہ کو لوٹا تو دوسری تعطیل تک ایک ایک دن گنتا رہا۔ درحقیقت اس مرتبہ رحیم کی رخصت کی باری تھی لیکن اُس نے اس کا کچھ خیال نہ کیا کیونکہ رحیم کو مینارہ سے محبت تھی۔ اُس کی تمام چیزیں وہیں تھیں جو مختلف الماریوں میں رکھی تھیں یا کھونٹیوں پر لٹک رہی تھیں تاکہ جس وقت وہ نوکری سے علیحدہ ہو تو ایک چھوٹی سی جھونپڑی آراستہ کرنے کے لئے کافی سامان مہیا ہو سکے۔ اُس کا خیال تھا کہ رحیم کو تعطیل کی باری بدل دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ ہوگا اور جس وقت وہ خشکی پر پہنچ جائے گا۔ تو حسینہ سے شادی کر کے شہر میں کوئی کام تلاش کرلے گا۔

اب تک اُس کو یہ دقت تھی کہ اُس کی کوئی شریکِ زندگی نہ تھی جو اُس کی

حوصلہ افزائی کرتی لیکن اب حسینہ . . . . اُس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اب اُس کی زندگی آرام سے کٹے گی حسینہ کو اپنی شریکِ حیات بنا کر وہ بہت سکھی ہوگا اگر وہ کوشش کرے گا تو شہر میں ضرور کوئی مستقل کام مل جائے گا۔ وہ ایک اچھے مکان میں رہے گا سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگائے گا اور آئندہ شاید بچے بھی

لیکن رحیم نے اُس کی درخواست یہ کہہ کر ٹھکرا دی: "مجھ کو بھی کام ہیں۔ تم پچھلی ترِ رخصت پر جا چکے ہو۔"

اُس کے بعد اختر نے اپنی ترکیب سوچ کر اُس کو عملی جامہ پہنانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ جو کچھ وہ کرنے والا تھا اُس کے متعلق اُس کو ذرا بھی وحشت نہ ہوئی۔ رحیم آخر ایک بڈھا آدمی ہی تو تھا وہ اپنی زندگی کی بہاریں ختم کر چکا تھا خشکی پر کوئی مسرتِ شباب اُس کی منتظر نہ تھی۔ اُس سے قبل بہت سے آدمی منارہ پر سے گر کر سمندر میں موت کے مُنہ میں جا چکے تھے۔ وہ زیادہ انتظار نہ کر سکتا تھا کیونکہ دوسری رخصت کئی مہینوں کے بعد آنے والی تھی۔ اُس وقت تک خدا جانے کیا صورتِ حال درپیش ہو۔ ممکن ہے حسینہ اُس کی آس چھوڑ بیٹھے یا کوئی دوسرا شخص اُس کے راستے میں حائل ہو جائے۔ ممکن ہے حسینہ کی نوکری جاتی رہے اور وہ شہر چھوڑ کر بے پتہ ہو جائے۔

اس میں شبہ نہ تھا کہ رحیم بوڑھا اور ناتواں تھا۔ اختر نے اکثر اُس کو سیڑھیوں پر ٹھوکر کھاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اپنے ہاتھ کو دائیں کان کے پیچھے لگا کر اختر سے پوچھا کرتا: "کیا تم نے بھی کچھ سنا؟" اختر کو اُس کا وجود بیکار سا معلوم ہوتا تھا۔

جس وقت رحیم جنگلے پر جھکا ہوا تھا اختر نے اُس کے سر پر ایک ضربِ کاری لگائی۔ بڈھا آدمی بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اُس کا مُنہ ذرا سا کھلا رہ گیا۔ اُس کے چہرے پر حیرت چھا گئی جیسے کہ وہ متعجب سا ہو رہا تھا اور اس معمّہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ چوٹ کیسے لگی؟

اختر خاموشی کے ساتھ اُس کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ایک قسم کا اطمینان محسوس کیا اور اُس کو اُس بے حس و حرکت نعش میں حسینہ تک پہنچنے کا صاف راستہ نظر آ رہا تھا۔ اُس نے نعش کو اُٹھایا۔ اُس کو سخت حیرت ہوئی کہ رحیم کتنا ہلکا تھا گویا اُس کے جسم میں خون اور گوشت تھا ہی نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کا پوست ہی پوست تھا جس کی زندگی کو سمندر اور برسوں کی تنہائی نے چوس کر کھوکھلا کر دیا ہو۔ اُس نے اُس بے جان جسم کو جنگلے کے اوپر سے سمندر میں پھینک دیا۔ دو آبی چڑیاں اُس کے پیچھے جھپٹیں۔ تھوڑی دیر تک جسم پانی پر تیرتا رہا اور پھر ڈوب گیا۔ اختر نے پانی کے اندر جسم کو چٹانوں کے ساتھ ٹکراتے ہوئے دیکھا اور پھر اندر چلا گیا۔

اُس نے ایک سگریٹ جلایا اور رحیم کی کرسی، صندوق اور کپڑوں کو دیکھا۔ اُس نے بلند آواز سے کہا: "معمولی بات ہے بہت سے آدمی سمندر میں بہہ گئے ہیں اور آخر وہ بوڑھا" تھا۔ اُس نے اس لفظ کو کئی بار دُہرایا گویا اُس کو اس لفظ میں اپنے جذبات کے لئے کچھ سکون و آرام معلوم ہوتا ہو لیکن اُس نے کسی خوف یا جُرم کا احساس نہ کیا۔ دوسرے دن جب کشتی آئے گی وہ اس حادثے کی اطلاع کر دے گا اور چوبیس گھنٹوں کے بعد اُس کے اعصاب پر جو گہرا اثر ہوا ہوگا اُس سے نجات اور سکون دلانے کے لئے اُس کی جگہ دوسرا آدمی آ جائے گا۔ اور اُس کو چند روز کے لئے خشکی پر بھیج دیا جائے گا۔ اُس نے سگرٹ پھینک دیا۔

اُس نے باہر ہوا کا شور، چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے سمندر کی غضبناک پھنکار اور طائرانِ آبی کی تیز چیخ پکار سنی۔ اُس کو یاد پڑا کہ رحیم نے کہا تھا کہ اُس رات کو سمندر میں طوفان آئے گا۔ طوفان؟ وہ مسکرایا۔ اُس کو طوفان کی کیا پروا تھی جبکہ بہت جلد وہ ہمیشہ منارہ سے چلا جائے گا اور رحیم کی طرح کوئی دوسرا بیوقوف شخص آ کر روشنی کیا کرے گا، سمندر کی طوفانی آواز سُنے گا اور اپنے کو اس امینار کے ماحول کے لئے لازمی و ناگزیر تصور کرے گا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں گیا اور رحیم کی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

۲

اختر نیم خوابی کی حالت میں تھا جس وقت اُس نے جہاز کے بگل کی آواز سنی، وہ بستر پر نہ لیٹا تھا بلکہ کرسی پر دراز ہو گیا تھا۔ رحیم کی چیزیں اُس کے ارد گرد بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ اُس کو بڑھتے ہوئے طوفان کا شور کچھ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ آواز کے سنتے ہی اُس نے بے چینی کے ساتھ حرکت کی اور اُس نیم بیہوشی کی حالت میں اُس کو خیال ہوا کہ رحیم روشنی کے پاس موجود ہوگا۔ اور اُس کو اُٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ان معاملات میں رحیم کو اُس سے زیادہ تجربہ تھا وہ کسی خاص حیوانی شعور کی مدد سے صحیح طور پر جان لیتا تھا کہ کس وقت بگل بجانا اور روشنی کو گردش دینا چاہیئے لیکن اختر نے خیال کیا اس میں کونسی تعجب خیز بات تھی جب کہ روشنی خود بخود گردش کرتی رہتی تھی اور اُس کی مشین کو سمجھ لینے کے بعد ایک بچہ بھی اُس کو کام میں لا سکتا تھا۔

اُس نے کروٹ بدلی۔ جہاز کے بگل نے پھر شور مچایا۔

اچانک اختر کو یاد پڑا کہ رحیم وہاں موجود نہیں۔ وہ مر چکا ہے اور سمندر میں بہہ کر اُس کا جسم اب تک دریائی جانوروں کی خوراک بن چکا ہوگا۔

وہ فوراً کرسی سے اُٹھ بیٹھا۔ نیند کی وجہ سے اُس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو مَلا۔ بگل کی آواز پھر سنائی دی۔ سمندر کا شور بڑھ گیا تھا۔ موجیں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں گویا وہ اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے منارہ کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں گی۔

اختر نے اپنا کوٹ پہنا اور اُوپر سے برساتی پیٹی لی۔ اُس کو اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر اتنا شور و غل کیوں ہو رہا ہے۔ جہازران کچھ اندھے نہ تھے وہ روشنی

کو دیکھ سکتے تھے کیونکہ اتنی تیز ہی نہ تھی کہ روشنی نہ دکھائی دے۔ یا غالباً اُن کو کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ یا شاید اس طوفانی سمندر میں جہاز کو گھمانے والا پہیہ ٹوٹ گیا ہو۔ جب اُس نے دیوار سے نکلتے ہوئے بگل کی آواز سنی تو اُس کے جسم میں خوف کی وجہ سے لرزہ پیدا ہو گیا۔ اُس کو خیال آیا کہ سارا گناہ اُس شخص کے سر ہے جس نے روشنی کے مینار [illegible] سوچ کر ایک عجیب شکر پیدا ہو گیا۔ وہ [illegible] تھے اور اُن میں [illegible] ہو رہا تھا جہاں پانی پانچ فٹ بہہ رہا تھا۔

رحیم زندہ ہوتا تو یہ طوفانی جوش و خروش [illegible] معلوم کر لیتا کہ آواز کس سمت سے آ رہی ہے۔ اُس نے دروازہ کھول دیا [illegible] آیا۔ [illegible] کے جھاگ [illegible] پیچھے کی طرف [illegible] دیوار سے ٹکرا دیا۔ اُس نے اپنی تمام طاقت لگا کر دروازے کو بند کرنا چاہا۔ اُس کوشش [illegible] سے وہ ہانپنے لگا اور دیوار کے سہارے کھڑا ہو کر [illegible] تاریکی کا مقابلہ کرنا چاہا [illegible] دہشت ناک تاریکی میں اُس کے چہرے پر پانی کے قطرے بہہ رہے تھے۔

اُس نے اپنی آنکھوں کو بیدار کر کے آگے کی طرف نگاہ ڈالی۔ تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر [illegible] کی طرف اُس نے [illegible] مگر روشنی [illegible] پانی میں ڈوبتے اور پھر ابھرتے ہوئے دیکھا۔ اُس [illegible] ڈوبنے [illegible] لگا۔ وہ ایک جہاز ران تھا اُس [illegible] اس کام [illegible] کی فرصت تھی پھر بھی اُس کو معلوم ہو گیا کہ جہاز سیدھا چٹانوں کی طرف آ رہا ہے۔ اور جو [illegible] میل کے [illegible] اُن سے [illegible] اُس کا ذریعہ تھے۔ پاش پاش ہو کر اُس میں پانی بھرنا شروع ہو گا۔ اُس نے سوچا۔ بیوقوف کتنے بیوقوف! روشنی ہو رہی ہے وہ اُس کو دیکھ سکتے ہیں۔ اُن کو ضرور دیکھنا چاہیے۔ پھر بھی سیدھے اسی طرف چلے آ رہے ہیں"

اُس نے اوپر نظر ڈالی۔ وہاں روشنی نہ تھی۔ اور وہ روشنی کرنا بھول گیا تھا! اپنی عجلت اور گھبراہٹ میں اُس کو روشنی کا بالکل خیال ہی نہ رہا جس کو رحیم ہمیشہ دیکھ لیا کرتا تھا۔ جہاز سیدھا اُس کی طرف آ رہا تھا تھوڑی دیر میں وہ چٹانوں سے ٹکرا جائے گا۔ آدمی لقمۂ اجل بن جائیں گے۔ آدمی جن کی بیویاں ہوں گی۔ نوجوان جو حسینہ کی طرح دلربائیں رکھتے ہوں گے۔ آہ حسینہ! اُس کا بھائی بھی جہاز میں نوکر ہے۔ غالباً وہ بھی اُسی جہاز میں ہو۔ اختر پیچھے پھرا۔ اور دیوار سے ٹکرا گیا۔

اُس نے زور لگا کر دروازہ کھولا اور اُس کھونٹی کی طرف دوڑا جہاں روشنی کے کمرے کی کنجی لٹکی رہتی تھی۔ کنجی وہاں نہ تھی۔ وہ ایک مفلوج شخص کی طرح وہاں کھڑا رہ گیا اور اُس کو حیرت ہوئی کہ آخر کنجی کیا ہوئی۔ رحیم ہمیشہ اُس کو کھونٹی سے اُتار کر اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا۔ جس وقت اختر نے رحیم کے سر پر ضربِ کاری لگائی تھی اُس سے ذرا ہی پہلے رحیم نے کنجی اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ کنجی رحیم کی جیب میں تھی!

اُس نے جہاز کے بگل کی آواز نزدیک آتے ہوئے سنی۔ چند لمحوں میں جہاز چٹانوں سے متصادم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ آدمی مر جائیں گے اور اُن کی بیویاں خشکی پر اُن کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ حسینہ کا بھائی . . . اور کنجی — رحیم کے پاس تھی جس کا جسم چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا۔

پانی دروازے سے اندر آ رہا تھا۔ چھت سے لٹکی ہوئی لالٹین ادھر اُدھر جھول رہی تھی۔ اختر نے لالٹین کو دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس وقت کیا کرے۔ وہ مجبور تھا۔ وہ صرف رحیم کا قاتل ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کی بھی جان لے گا جن کے ساتھ اُن کو کوئی مخاصمت نہ تھی۔ جنہوں نے اُس کا کچھ بگاڑا نہ تھا اور جن کی بیویاں تھیں اور [illegible] بھی ایک شریکِ حیات بنانے کی اُمید میں تھا۔

اُس نے لالٹین پکڑی اور باہر کی طرف دوڑا۔ ہوا نے اُس کو پھینک دینا چاہا لیکن اُس نے دیوار کو پکڑ لیا۔ وہ ہانپنے لگا اور آگے نہ بڑھ سکا۔ تب وہ آگے کی جانب جھکا۔ جنگلے کو ایک ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے لالٹین کو اپنے سر کے اوپر ہلانے لگا جو اُس کے اردگرد طوفانی جوش و خروش میں ایک کرن کی طرح روشنی پھینک رہی تھی۔ اُس نے جہاز کو قریب تر آتے دیکھا۔ جنگلے کو چھوڑ کر وہ دیوانہ وار لالٹین ہلانے لگا اور طوفان خیز ہوا کی سنسناہٹ میں اُس نے چلانا شروع کیا۔ اُس نے جہاز کے بگل کی آواز سنی اور اُس کی روشنی کو دیکھا۔ اُس وقت اُس کو کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ اُس کو صرف دو کام کرنے تھے اُس لالٹین کو پکڑ کر اُس کی مختصر اور جھلملاتی ہوئی روشنی کو تاریکی میں اہلِ جہاز کو دکھلانے کی کوشش کرنا اور اُس غضب ناک طوفان میں چلاتے رہنا تاکہ اُس کی کمزور آواز سنائی دے سکے اُسے اُن آدمیوں کو حسینہ کے بھائی ایسے آدمیوں کو موت کے منہ سے بچانا تھا جن کے لئے عورتیں —— حسینہ کی طرح عورتیں منتظر ہوں گی۔

موجوں کے تھپیڑوں نے اُس کو دیوانہ بنا دیا۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگا لالٹین اُس کے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی لیکن اُس نے زور سے اُس کو پکڑا اور پھر ہلانا شروع کیا۔ وہ چیخنے لگا۔ اُس کا منہ سمندر کے نمکین پانی سے بھر گیا۔ اُس کا سر چکرایا۔ اُس کے چاروں طرف ہوا اور پانی کے شور نے اُس کو بہرا بنا دیا۔ جہاز تیزی کے ساتھ گھوما۔ اختر نے ایک لمحے کے لئے اُس کی روشنیوں کو جھلملاتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ غائب ہو گئیں۔ بیشمار دوسری روشنیاں نظر آئیں بگل کی آواز سنائی دی۔ لیکن اب اُس کو کوئی بھی خوف نہ تھا۔ جہاز چٹانوں سے دور

رہ کر دوسری طرف مڑ گیا تھا۔ اس شفقت سے اُس کا جسم مردہ ہو چکا تھا اُس نے لالٹین پھینک دی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کو دیکھا پھر وہ بجھ گئی۔ جوں ہی اختر لالٹین اُٹھانے کے لئے جھکا طوفانی ہوا نے اُس کے خستہ جسم کو اُٹھا کر جنگلے سے ٹکرا دیا اور پھر اُس کے اُوپر پھینک دیا۔ اُس نے ایک چیخ ماری اور نیچے گر پڑا!

محمود یار خاں اثر

احتیاط

کب تھے فردوسِ سماعت نغمہ ہائے آبشار
کب تھا میرے واسطے دلچسپ موجوں کا ستار
کب تھے فوّارے چمن کے لطف بار و کیف بار
کب تھے غنچے مائلِ صد خندۂ بے اختیار
کب تھا خوابیدہ سرورِ جاوداں میں سبزہ زار
کب نویدِ زندگی تھا جوشِ عنوانِ بہار
کب تھا ناواقف تمنّائے الم انجام سے
کب بسر ہوتی تھیں راتیں چین سے آرام سے
کب ہوا کرتی تھی اُلجھن کثرتِ آلام سے
کب ٹھہر جاتی تھی طبعِ منتشر اک جام سے
کب برستی تھی فضا سے بے خودی گلزار پر
کب مے گلرنگ سے لبریز تھا جامِ نظر
کب چھلکتی چاندنی رعنائیوں میں ڈوب کر
کب مچلتی روح، بوئے عطرِ گل پر رات بھر
شام کے غمّاز سنّاٹے تھے کب فرحت اثر
صبح کے ٹھنڈے دھندلکے کب تھے تسکینِ نظر
کہہ تو دوں، لیکن یہ ڈرتا ہوں کسی کا راز ہے
اور وہ، جس سے قرارِ خاطرِ ناساز ہے

سحر رام پوری

اعرابیوں کا جنگی گیت

یہ غیرت ہی سپر ہے یہی ایک صفات
آزادی میں پابندیِ ہنگامِ وفات
کرتے ہیں فنا قصر ہی جنبشِ بات
اے غرب کے شاہانِ عجم آشا، خبردار
ہم اطلس و کمخاب کے بستر نہیں کرتے
مرتے ہیں تو سو پردوں میں چھپ کر نہیں مرتے
سب نوحۂ احباب جہاں سے ہیں گذرتے
سنتے نہیں اولاد کی ہم آہِ شرربار
سوتے ہیں تو خیمے کی طنابوں کے سہارے
چڑھتے ہیں بیک بانگِ دداعی کے اشارے
شمعیں ہیں ہماری سدا انجم کے شرارے
اور بادِ مخالف سے نہیں ہم کو سروکار
ہم ہند سے لے تا بہ سرِ سرحدِ بلغار
ہر کشورِ خودسر سے ہوئے مائلِ یلغار
اب روم پہ لاتے ہیں چمکتی ہوئی تلوار
اور اخترِ اقبال کہ ہے چرخِ بریں پر
تھے سندھ سے چڑھ کے گئے ہسپانیہ پر ہم
اور جائیں گے واللہ وہاں بار دگر ہم

وہ بحرِ نحوست کہ سدا رہتا ہے برہم
ساحل سے تھے کبھی اُس کے بھی جولانگہِ خاور
ویراں کدہ تھا ہم نے تجلّی کو بنایا
وہ شہر کہ تھا جس نے بسا کر کو ڈالیا
چھایا تھا وہاں چار طرف موت کا سایا
بجز خنجرِ خونخوار نہ تھا واں کوئی رہبر
نیزوں کو تھا صحرا میں جنوں چارہ گری کا
بہرہ تھا وہاں آبِ جوانانِ جری کا
لاکھوں کا ہوا دور مرض ناموری کا
پی کر مے تلخاب ہوئے غرقِ جہنم
نادان کے حق میں سپر از بسکہ زیاں تھی
جو چشمۂ صحرا کی طرح نور فشاں تھی
جاں کہ وہ ستنبول[1] وہ ہر دل پہ گراں تھی
برپا صفِ اعدا میں تھا جب حشر کا عالم
جب جنگ کے قلزم میں تلاطم ہوا برپا
بزدل بھی جواں مرد بھی غرقاب تھے یکجا
مردوں کو کیا ہم نے سپردِ سرِ صحرا
اور گا کے پڑھے حمدِ خداوندِ معظم

(ماخوذ از جے اے میکر)

فضل شاہ [illegible]

[1] [illegible] استنبول۔

ایک نظم اور ایک غزل

وقت رفتہ

تم بھول گئے لیکن
ہے یاد مجھے اب تک
وہ چاندنی راتوں میں جمنا کے کنارے پر
چھائی ہوئی مدہوشی
بہتی ہوئی موجوں کی دلچسپ سی خاموشی
عالم کی نگاہیں تھیں فطرت کے اشارے پر
میں بھول نہیں سکتا
ہے یاد مجھے اب تک
تم بھول گئے لیکن۔

کیا یاد نہیں تم کو
چھیڑا تھا کبھی تم نے
سازِ دلِ ناداں کو مضرابِ محبت سے
ہر سمت سے گھر آئے بادل کے حسیں ٹکڑے
گلزارِ جوانی پر نغموں کی ہوئی بارش
جذبات کے پھولوں میں
فردوس نظر آیا

تم مجھ سے جدا ہو کر مجھ کو ہی بھلا بیٹھے
یا تم ہی نہیں ہو وہ
یا میں ہی نہیں ہوں وہ
جو وقت گذر جائے کب لوٹ کر آتا ہے
گذرے ہوئے لمحوں کا کیوں ذکر کیا جائے
یہ ذکر ہے لاحاصل
حاصل ہے محبت کا ناکامی و بربادی
کر لینا محبت تو آساں ہے بہت لیکن
دراصل محبت کا دشوار نبھانا ہے۔

غزل

بات کرتے ہی یہ کہہ اُٹھتے ہو منشا کیا ہے؟
بات کرنے کا تمہارے یہ طریقہ کیا ہے؟
ضد پہ آ جاؤں تو جی بھر کے ستا کر چھوڑوں
تو نے اسے چھیڑنے والے مجھے سمجھا کیا ہے؟
اس نے تو عرضِ تمنا کی اجازت دے دی
میں ہوں اس سوچ میں یارب کہ تمنا کیا ہے؟
درد تو بخش دیا خیر کوئی بات نہیں
اب ذرا یہ تو کہو اس کا مداوا کیا ہے؟
تم سے کرتا ہے شکایت جو کوئی کرنے دو
اس میں سچ پوچھو تو نقصان تمہارا کیا ہے؟
ایک اظہارِ محبت پہ یہ غصہ؟ توبہ!
جانے بھی دیجئے ان باتوں میں رکھا کیا ہے
میں کبھی یہ نہ کہوں گا کہ کرم کیجئے آپ
آپ خود سوچئے الفت کا تقاضا کیا ہے
رنج اٹھاتے ہیں ستم سہتے ہیں چپ رہتے ہیں
جانتے ہیں کہ شکایات سے ہوتا کیا ہے
رنج دن رات کا دیکھا نہیں جاتا اختر
نہیں معلوم کہ اس عشق میں ہوتا کیا ہے

اختر بریلوی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

اردو ۔ ہفت روزہ ماہی اپریل تا جون

گریہ و تبسم ۔ شام کے جواں سال شاعر خلیل بن جبران کے کلام سے ناظرین اردو کی دنیا ایک مدت تک آشنا رہی ہے۔ کچھ عرصہ گزرا ملک محمد اللہ صاحب کلیم نے ان اوراق میں جبران کے چند جواہر پارے پیش کئے تھے اور ان کی حیرت ناک تازگی اور فکر انگیزی نے اکثر اہل ذوق کو دیوانہ بنا ڈال دیا تھا۔ خلیل جبران کی بعض مختصر تحریریں کتابی صورت میں بھی اردو کا لباس پہن چکی ہیں۔ مثلاً المجنون جس کا ترجمہ پاگل کے عنوان سے بشیر ہندی صاحب نے کیا، النبی جسے قاضی عبدالغفار صاحب نے پیغمبر کے نام سے اور الارواح المتمردہ کو جناب ابو العلا صاحب چشتی نے سرکش روحیں کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ زیر نظر مضمون میں جناب محمد رضا انصاری نے جبران کی کتاب "دمعۃ و ابتسامۃ" پر ایک نظر ڈالی ہے اور اس کے منتخب مقامات سے اچھے اچھے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ مضمون کے شروع میں جبران کے مختصر سوانح حیات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی نوجوانی کا بیشتر حصہ شام سے ترک وطن کر کے امریکہ میں بسر کیا اور مغربی خصوصاً انگریزی ادب کا غائر نگاہ سے مطالعہ کیا۔ عربی اس نے بعد میں وطن واپس آکر سیکھی اور پھر قدرتی طور پر اسی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ جبران نے عربی میں ایک نئے اسلوب بیان کی بنیاد رکھی اور قدیم طرز کے تکلف و تصنع کو ترک کر کے براہ راست انسانی فکر و احساس سے رشتہ پیدا کیا۔ زیر نظر تصنیف اس کے اوائل عمر کا کارنامہ ہے جب اس کے دل و دماغ پر رومانیت کا غلبہ تھا اور فکر و تخیل پختہ نہیں ہوئے تھے۔ لیکن نزاکت احساس اور زور بیان کے لحاظ سے یہ تصنیف بھی ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ گریہ و تبسم نفس مضمون کے اعتبار سے اگرچہ ایک رومانی فرار تھا لیکن اس کے اسلوب بیان کی جدت اور تازگی ادب میں ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور پہلی بار لوگوں کے سامنے ایک صحیح معیار آیا جس سے ادیب و شاعر پرکھا جا سکتا تھا۔"

جبران پر یہ رومانی رنگ ۳۰ برس کی عمر تک چڑھا رہا لیکن ۱۹۱۳ء میں جب وہ اپنی سیاحت ختم کر کے نیو یارک میں آکر رہا تو اس وقت وہ ایک جذباتی نوجوان نہیں تھا، وہ خیالی دنیا میں چکر لگاتا تھا۔۔۔۔۔ اب وہ ایک انقلابی ادیب اور آتش نگار انقلابی تھا۔ بعد کے تمام مضامین میں یہ حقیقت نمایاں ہے۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود جبران کو اپنے خیالات کی تبدیلی کا پورا احساس رہا اور ایک بنیادی ادیب پر جس وقت اس نے اگر یہ دیا تو تمام اپنے ابتدائی کارناموں کو بے کار اور مہمل سمجھتا ۔۔۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

اس کے ایک دوست نے گریہ و تبسم کی اشاعت کے لئے مجبور کیا تو اس نے یہ شعر پڑھا۔

واک عہد من میثاق قد مضی بین تشبیب وشکوی ونواح

"یہ میری زندگی کا وہ حصہ ہے جو عشق و عاشقی، شکوہ و شکایت آہ و فغاں میں گزر گیا"۔

اب اس زمانے کی یاد بے کار ہے۔

اس کے دوست نے جواب دیا "آپ کے لئے تو وہ عہد گزر گیا لیکن دوستوں اور عقیدت مندوں کے لئے اب تک ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا"۔

جبران گریہ و تبسم لکھنے والا نوجوان، خیالات کی وادیوں میں بھٹک بھٹک کر مر گیا۔ اب اس کی قبر کھودنے سے حاصل!

دوست، نوجوان نے مرنے سے پہلے اپنے نغمے سنا ۔۔۔

وہ جیسے بھی ہوں ہمارا فرض ہے کہ ان نغموں کو ضائع ہونے سے بچائیں!
جبران۔ تمہارا جو جی چاہے کرو مگر یہ تو ہی یہ نہ بھولنا کہ اس نوجوان کی روح اب ایک ایسے آدمی کے جسم میں منتقل ہو گئی ہے جو جذبات اور خیالات کا نہیں، طاقت کا پجاری ہے!! جو تخریب کا اسی طرح دلدادہ ہے جس طرح تعمیر کا!"

جبران کے اس حقیقت پرستانہ دور کی چند تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) المواکب (۲) الموسیقی (۳) عرائس المروج (۴) الاجنحۃ المتکسرۃ (۵) الارواح المتمردۃ (۶) العواصف (۷) البدائع والطرائف۔

ان کے علاوہ کچھ تصانیف انگریزی میں بھی ہیں۔ جن میں اکثر عربی اور دیگر زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ان میں سے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے

THE MADMAN, HIS PARABLES اور

THE PROPHET اردو کا جامہ بھی پہن چکی ہیں۔

اب مجموعہ زیر نظر کے چند لطیف اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:۔

گریہ و تبسم۔ رات آتی ہے تو شگوفہ اپنی پنکھڑیوں سے لپٹ کر جذباتِ شوق کو گلے لگائے سو جاتا ہے اور جیسے ہی صبح ہوتی ہے اپنے دونوں ہونٹ آفتاب کی کرنوں کو بوسہ دینے کے لئے کھول دیتا ہے۔

شگوفوں کی زندگی شوق و وصال ——— گریہ و تبسم ——— ہے

سمندر کا پانی بخار بن کر اٹھتا ہے اور بڑھتا چلا جاتا ہے، پھر ایک جگہ جمع ہو کر بادل بن جاتا ہے اور ٹیلوں اور وادیوں کے سروں پر سے گذرتا رہتا ہے اور نالیوں کے ذریعے اپنے وطن ——— سمندر ——— کو واپس چلا جاتا ہے۔

بادلوں کی زندگی ہجر و وصل ——— گریہ و تبسم ——— ہے۔

اسی طرح نفسِ انسانی "روح کل" سے جدا ہو کر مادی دنیا میں آتا ہے اور بادلوں کے مانند غموں کے پہاڑوں اور خوشی کی وادیوں پر گذرتا رہتا ہے یہاں تک کہ موت کی لطیف ہوائیں اس سے ملتی ہیں تو وہ لوٹ جاتا ہے! جہاں پہلے تھا!! محبت و جمال کے بحرِ بیکراں ——— پروردگار عالم ——— کی طرف

محبت کی زندگی:۔

بہار:۔

آ! اے میری محبوبہ! آ، ہم دونوں مل کر ٹیلوں کے درمیان سیر کریں اب برف پگھل چکی ہے اور زندگی اپنی خوابگاہوں سے بیدار ہو کر وادیوں اور گھاٹیوں میں خراماں خراماں ٹہل رہی ہے۔

...... آ، ہم دونوں بارش کے باقی ماندہ آنسوؤں کو نرگس کے پیالوں میں پئیں۔ اپنے دلوں کو خوش و خرم چڑیوں کے گیتوں سے مسرور کریں اور نسیم سحری کی عطر فشانی کو غنیمت جانیں۔

ہم دونوں کو، اس چٹان کے قریب ——— اس طرح کہ بنفشہ نہ دیکھ پائے ——— بیٹھ کر محبت کے بوسوں کا تبادلہ کرنا چاہئے۔

گرمی۔ آ، اے میری محبوبہ! میرے ساتھ کھیتوں تک چل۔ فصل کٹنے کا زمانہ آگیا ہے کھیتی اپنے شباب پر پہنچ گئی ہے اور فطرت کے ساتھ سورج کی محبت کی تپش نے انہیں پختہ کر دیا ہے

...... آ، ہم دونوں درختوں سے پھلوں کو چنیں اسی طرح جیسے ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں محبت کے بوئے ہوئے وفا کے بیجوں سے "نفس" سعادت کے دانے" چنتا ہے ......

خزاں۔ اے میری محبوبہ! ہم دونوں کو انگور کی بیل تک جا کر انگور نچوڑنا چاہئیں ——— اصل ——— حقیقت ——— کی بجائے نقل ——— خواب ——— ہی پر اکتفا کرنا چاہئے آ، اب گھر لوٹ چلیں اب تو درخت کے پتے تک زرد ہو گئے ہیں اور ہوا نے انہیں منتشر کرنا شروع کر دیا ہے گویا وہ ان پھولوں کو پتوں کی پھیلی ہوئی چادر سے کفنانا چاہتی ہے جو گرمی کے رخصت ہو جانے پر سوز فراق سے جھلس کر مُردہ ہو گئے ہیں......

جاڑا۔ قریب ہو، اے شریکِ حیات! برف کی ایسی ٹھنڈی سانسوں کو اس کا موقع نہ دے کہ وہ ہمارے جسموں کو جدا کر دیں اس انگیٹھی کے سامنے میرے پہلو میں آکر بیٹھ جا۔ آگ ہی جاڑے کا سب سے مزے دار میوہ ہے ...... میرے کان ہوا کی آہوں اور عناصر کے نالوں سے تھک گئے ہیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کر دے، فضا کا غضب ناک چہرہ مجھے مغموم کرتا ہے شہر ——— ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نوحہ کرنے والیاں برف کے شامیانہ کے نیچے بیٹھی ہوئی ہیں......

چراغ میں تیل ڈال دے اے رفیق زندگی! وہ بجھنے والا ہے، اس کو اپنے قریب ہی کہیں رکھ دے تاکہ میں وہ نقوش دیکھ سکوں

مرے زخم سے نچوڑے جیسے پیالے پی ۔۔۔

۔ ۔ دوست آج [illegible] سب ہیں اور شراب ختم ہونے کا نشہ

دیکھ [illegible] قریب ہوا [illegible] اسے کچھ یاد آگ بجھ گئی

[illegible] بلبلے دھیرے ہی ہے سے چھلکے [illegible]

بجھ گل ہو گیا اور اندھیرا چھا گیا ہے [illegible] کھدر کونہ

[illegible] میری [illegible]

چپے [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] لگے [illegible]

تیرے پیارے — چھا گئی ہے۔

آہ اے میرے [illegible] کا سمندر کتنا گہرا ہے !!

آہ اس دنیا میں [illegible] کتنی دور ہے !!

آخری بات اپنی شدت تاثیر اور کیفیت نگاری کے اعتبار سے ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ مشرق میں اس کا جواب شاید ہی مل سکے۔ ان کے علاوہ ایسی صحیح عکاسی اور حسن کاری نایاب ہے۔ جہاں تک اس مجموعہ کی خاص سب سے نمایاں خصوصیت اس کے وہ دل آویز نوشتے ہیں جو اس نے سماج کی بے انصافیوں سے متاثر ہو کر حوالۂ قلم کئے ہیں۔ ان میں سے "دو بچے" اور "بے کس ماں" خاص طور پر توجہ کے لائق ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

دو بچے

تصویر کے دو رخ :-

ایک عالی شان محل کی برجی پر کھڑے ہو کر اس نے مظلومات رعایا کی طرف جو اس کے نیچے باغ میں کھڑا ہوا تھا خطاب کرتے ہوئے کہا میں تم لوگوں کو اور تمام اہالیان ملک کو مبارکباد دیتا ہوں اور خوش خبری سناتا ہوں کہ میری ملکہ نے بچہ جنا ہے جو میرے محترم خاندان کی عزت کو زندہ کرے گا۔ تم لوگوں کے لئے قابل فخر اور ہیبت پیدا ہوگا۔ اور ان تمام چیزوں کا وارث ہوگا جو میرے نامور اجداد بطور میراث چھوڑ گئے ہیں۔ خوش ہو اور شکر ادا کرو۔ تمہارا مستقبل ایک عجیب الطرفین بچے سے وابستہ ہو گیا ہے۔

مجمع نے پر زور نعرے لگائے۔ فضا خوشی اور مسرت کے نغموں سے گونج اٹھی۔ اس خیال سے کہ بچہ ناز و نعمت کی گود میں پرورش پائے گا اور بعد ازاں حکمرانی کے منصب پر جلوہ گر ہوگا۔ اس کے بعد مخلوق خدا پر حاکم مطلق ہو جائے گا۔ ان کے جسموں کا حقدار اور روحوں کا مالک ہوگا۔ اس لئے لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ مسرت کے گیت گا رہے ہیں اور خوشی کے جام پر جام لنڈھا رہے ہیں۔

مگر اس وقت — جب کہ اہالیان شہر سلطنت و جبروت کے گن گا کر اپنی پستی کا اعلان کر رہے تھے اور مالکان کی حماقت پر فخر کر رہے تھے۔ ایک معمولی بوسیدہ مکان میں ایک عورت بستر مرگ پر پڑی ہوئی تھی۔ جھکے ہوئے [illegible] نوزائیدہ بچہ کو جو چیتھڑوں اور گدڑیوں میں لپٹا ہوا تھا چمٹائے ہوئے تھی۔

یہ ایک لڑکی ہے جو مفلسی اور مصیبت کا شکار ہے۔

ایک مظلوم کی بیوی ہے جس کو قاتل ظالم نے تباہ کیا ہے۔

عورت اکیلی ہے اس کے پاس آج کی رات دنیا کے پالنے والے نے ایک چھوٹا سا فرشتہ بھیج دیا ہے جس نے محنت اور مزدوری کی طرف سے اس کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں۔

جب سڑکوں پر شور و غل ختم ہو چکا تھا، غریب لڑکی نے اپنے بچے کو گود میں اٹھایا اور اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر رونے لگی گویا وہ اپنے گرم آنسوؤں سے اسے بپتسمہ دینا چاہتی ہے۔ ایک دل خراش آواز میں اس نے کہا۔ لخت جگر تو عالم ارواح کو چھوڑ کر کس لئے یہاں آیا ہے؟ کیا میری تلخ زندگی میں حصہ لینے کے لئے؟ یا میری بیکسی پر رحم کرنے کے لئے؟ ملائکہ اور وسیع فضا کو چھوڑ کر اس تنگ اور تاریک اور بدبختی سے بھری ہوئی زندگی کو تو نے کیوں اختیار کیا؟

اے میرے اکلوتے بچے، میرے پاس گرم آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا دودھ کے بدلے اس کو غذا بنائے گا؟ کیا میری ننگی بانہیں دیبا اور ریشم کی بجائے تیرا لباس ہوں گی!

آہ چوپایوں کے بچے گھاس چرتے ہیں اور اپنی جھاڑیوں میں چین سے رات بسر کرتے ہیں۔ پرندوں کے بچے دانا چگتے ہیں۔ اور شاخوں کے درمیان بہت آرام سے سوتے ہیں مگر — اے میرے بچے تیرے لئے ٹھنڈی آہوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اس نے بچے کو اپنے سینے سے بہت بھینچ کر چمٹا لیا گویا وہ دونوں جسموں کو ایک کرنا چاہتی ہے۔ پھر آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بلند آواز سے پکاری رحم۔ اے پروردگار عالم رحم۔

جب چاند سے بادل چھٹ گئے، ایک لطیف شعاع جھروکے

سے اندر داخل ہوئی اور وہ بے حس و حرکت جسموں پر پھیل گئی۔

بےکس دوست

اے وہ شخص جو بدنصیبی کے گہوارے میں پیدا ہوا ذلت کی گود میں پلا اور پرورش ہوا اور ظلم و استبداد کے محل کے سائے میں جوان ہوا۔ اپنی سوکھی روٹی ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ کھاتا ہے اور میلا پانی جس میں آنسوؤں کے قطرے شامل ہیں۔ گھٹ گھٹ کر پیتا ہے۔

اے وہ سپاہی جس کے اوپر انسان کے قانون کی رو سے یہ فرض ہے کہ اپنی بیوی بچوں اور دوست احباب کو چھوڑ کر موت کے میدان کی طرف جائے لوگوں کے ظلم کی آگ بجھانے کے لئے، جس کا نام انہوں نے واجب، ادائے فرض رکھ چھوڑا ہے۔

اے وہ شخص جو اپنے وطن میں مسافروں کی طرح اور دوستوں میں غیروں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اور قلم دوات کے علاوہ دنیا کی نعمتوں سے صرف بقدر ایک نوالہ زندہ رہنے کے لئے راضی ہے۔

اے وہ قیدی جو تاریکی میں ڈال دیا گیا ہے، معمولی غلطی پر جن کو ان لوگوں کی جہالت نے جو بدی کا مقابلہ بدی سے کرتے ہیں بہت برا سمجھ لیا ہے اور اُن کی عقلوں نے جا اصلاح چاہتے ہیں فساد کے ذریعے سے حیرت انگیز خیال کر لیا ہے۔

اے خوبصورت غریب لڑکی جس کے حسن و جمال کو مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان نے دیکھا اور پیچھے لگ گیا تیرے افلاس پر اپنی ریاست سے غلبہ پا لیا اور زر نے اپنے کو اس کے حوالے کر دیا، اس کے بعد اس نے تجھ کو مجروح شکار کی طرح چھوڑ دیا اور اب تو ذلت اور بدبختی کے جنگل میں کانپ رہی ہے۔

تم لوگ اے بےکس دوستو، انسانی شریعت کے شکار رہنے ہو تم لوگ بدنصیب ہو اور تمہاری بدنصیبی زبردست کی بغاوت حاکم کی ناانصافی، سرمایہ دار کے ظلم اور بندۂ ہوس کی سرکشی و دنائت کا نتیجہ ہے۔

تم لوگ شگوفوں کے مانند ہو جو سرما میں اُگے ہیں عنقریب لطیف ہوائیں چلیں گی اور ابر رحمت کو آفتاب کی روشنی میں لے جائیں گی۔ تم وہاں خوبصورت زندگی پاؤ گے۔

تم لوگ ان بےبرگ و ثمر درختوں کی طرح ہو جو جاڑے کی برف سے بوجھل ہو گئے ہیں۔ بہار کا زمانہ آنے والا ہے جو تم کو تر و تازہ پتوں کا لباس پہنائے گا۔ بہت جلد حقیقت آنسوؤں کے نقاب کو تمہارے تبسم سے الٹ دے گی۔

میں تمہیں پیار کرتا ہوں۔ اے دوستو اور تمہارے ظلم کرنے والوں پر لعنت)

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

رس بھرے ہونٹ

از ڈاکٹر تاثیر پی ایچ ڈی۔ نیرنگ خیال جون ۱۹۴۰ء

رس بھرے ہونٹ، پھول سے ہلکے
جیسے بلّور کی صراحی میں
بادۂ آتشیں نفس چھلکے
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفقِ صبح سے درخشندہ
دھیرے دھیرے، سنبھل سنبھل ڈھلکے

رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں،
یوں لرزتے ہیں جس طرح کوئی
رات دن کا تھکا ہوا راہی
پاؤں چھلنی، نگاہ متزلزل،
وقت صحرائے بےکراں، کہ جہاں
سنگِ منزل نما، نہ آج نہ کل

دفعتاً دور، دور، آنکھ سے دور
شفقِ شام کی سیاہی میں
طلب کی آرزو نگاہی میں
فرش سے عرش تک لپک اٹھے
ایک دھوکا، سراب، منبعِ نور

۱۹ رس بھرے ہونٹ دیکھ کر تاثیر

۲۰ رات دن کے تھکے ہوئے راہی

۲۱ یوں لرزتے ہیں رس ترستے ہیں

دوسرے الفاظ میں جب کبھی [illegible] نے عورت کے [illegible] [illegible] ہے اور اگر کسی ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] آنکھوں میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آنکھوں سے [illegible] ہو سکے اور یوں شعر محض [illegible] دکھائی [illegible] [illegible] بظاہر [illegible] یہاں بھی [illegible] ہی عام ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو [illegible] استعارے کے [illegible] جو کام [illegible] شاعرانہ [illegible] دوسرے شاید ان اشعار سے [illegible] تاثر پیدا کرنا مقصود ہے۔

تاثیر کی مندرجہ بالا نظم کے موضوع کا تعین ذرا مشکل ہے۔ کیا اس کا موضوع رس بھرے ہونٹ ہیں؟ —— ان ہونٹوں کی لرزش ہے؟ —— یا موجودہ تہذیب و تمدن کے جنس و قوانین [illegible] رات دن کے تھکے ہوئے راہی کہا جا سکتا ہے؟ —— بہرحال شاعر ہونٹوں کو دیکھتا ہے۔ ان ہونٹوں کو جو پھول سے ہلکے ہیں، دوسری تشبیہ (جیسے بلور کی صراحی میں بادۂ آتشیں نفس جھلکے) رنگ کی ہے لیکن اس وقت شاعر کو ہونٹوں کی حرارت کا بھی احساس ہے (آتشیں نفس) اور ساتھ ہی اس گداز سے لبریزی کا احساس بھی ہے جس کا تلازمِ خیال شاعر کو شبنم کے اس ارغوان قطرے تک لے جاتا ہے جو شفقِ صبح سے درخشندہ ہو اور نرگس کی گول آنکھوں سے دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کر ڈھلک رہا ہو۔ —— اب تک شاعر کی نگاہوں میں صرف ایک عورت کا حسین چہرہ تھا۔ اور اس چہرے میں بھی اس کی توجہ کو صرف وہ رس بھرے ہونٹ ہی متوجہ کئے ہوئے تھے۔ اچانک ان ہونٹوں میں ایک لرزش پیدا ہوتی ہے اور وہ سوچتا ہے، یہ لرزش کیسی! —— کیا ایسی کسی لرزش سے شاعر پیشتر آگاہ ہے! —— ہاں، یہ لرزش تو اس رات دن کے تھکے ہوئے راہی کی لرزش سے ملتی جلتی ہے جس کے پاؤں چھلنی تھا جس کی نگاہ منزل [illegible] جو وقت کے ایک ایسے صحرائے بے کراں میں چلا جا رہا ہے جہاں نہ کوئی سنگِ منزل تھا نہ آج نہ کل۔ یہاں وقت اور فاصلے کے تصورات ایک دوسرے میں الجھ گئے ہیں۔ صحرائے بیکراں کہ جہاں سنگِ منزل نہیں ہے، وقت نہ آج نہ کل۔ یہاں اس تھکے ہوئے راہی کی حیثیت بھی عالمگیر ہو گئی ہے۔

نظم کے اس مقام تک ہونٹوں کی لرزش سے جو تلازمِ خیال پیدا ہوا اس نے تصورات کی تکمیل ہو گئی۔ لیکن اس لرزش کو دیکھ کر یا ان ہونٹوں کو دیکھ کر ایک خواہش بھی شاعر کے ذہن میں پیدا ہوئی تھی اور چونکہ وہ اس لرزش سے ملتی جلتی لرزش کے خیال میں کھو گیا تھا۔ اس لئے وہ خواہش ذہن میں آسودہ ہو گئی تھی۔ اب ملتی جلتی لرزش کا خیال ختم ہو گیا تو وہ آسودہ آرزو جاگی [illegible] اس صحرائے بے کراں اور اس کے تھکے ہوئے راہی کا اثر ذہن پہ [illegible] ہے۔ اس لئے انہی اثرات کے ماتحت اس آرزو کا اظہار، ایک جھجکتا ہوا اظہار ہوتا ہے۔

یہاں پہنچ کر اگر ہم نظم کو از سر نو پڑھیں تو اچھا ہو، کیونکہ آٹھ سے تیرہ تک کے مصرعے اس دفعہ ہمارے لئے کارآمد نہیں ہیں۔ گویا ہمارا تصور اب یوں ہونا چاہئے کہ شاعر کی نگاہوں میں ایک عورت کا حسین چہرہ ہے۔ اور اس چہرے میں بھی اس کی توجہ کو وہ "رس بھرے ہونٹ" ہی متوجہ کئے ہوئے ہیں جو پھول سے ہلکے ہیں، جن کا رنگ ارغوانی ہے اور جن میں گداز سے لبریزی بھی ہے، اور حرارت بھی ہے۔ ان ہونٹوں کو دیکھ کر ان سے جو کام لیا جا سکتا ہے اس کا خیال آ جاتا ہے۔ لیکن اس آرزو کی تکمیل ایک دھوکا ہے، ایک سراب۔ صرف وہ ہونٹ وہ منبعِ نور ایک شعلے کی مانند لپک اٹھتے ہیں یعنی ایک شعلہ سا لپک اٹھتا ہے، اور یہ لپک شاعر کو اپنے آپ سے بہت ہی دور محسوس ہوتی ہے گویا اس نے ہونٹ دیکھے تھے، ایک منبعِ نور دیکھا تھا، ان میں لرزش پیدا ہوئی تھی، ایک شعلہ سا لپک اٹھا تھا۔ اور اب شاعر تنہا ہے اور اسے صرف اس لرزش کا احساس ہے جو اس منظر کو دیکھ کر اس کے اپنے دل میں پیدا ہوئی تھی۔

نظم کے شروع میں شاعر کا ذہن صرف ہونٹوں کا شگفتہ تصور لئے ہوئے ہے اس لئے شبنم کا ارغوان قطرہ شفقِ صبح سے درخشانی میں بڑھ جاتا ہے یعنی شاعر ہونٹوں کی نمی کو صبح کے تازہ، شگفتہ اور ٹھنڈک پہنچانے والے منظر سے مماثل پاتا ہے۔ لیکن آگے چل کر جب رات دن کے تھکے ہوئے راہی کا تصور نظم پر چھا جاتا ہے تو تاثر کے لحاظ سے بھی ذہن میں ایک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے

ہونٹ صبح کا سادہ اور سکون پرور منظر ہیں لیکن ہونٹوں کی لرزش ایک شعلہ ہے جو شفق شام کی سیاہی میں لپک اٹھتا ہے۔ صبح اور شام کو افق کے منظر میں جو رنگ اور احساس کا فرق ہے اُس سے شاعر کے ذہن نے یہاں خاطر خواہ کام لیا ہے۔

میرے خیال میں فنی لحاظ سے اس نظم میں ایک عیب بھی ہے اور وہ تخلص کا استعمال ہے۔ تخلص غزل کی پیداوار ہے اور غزل تک ہی اسے محدود رہنا چاہیئے۔ کیونکہ غزل میں اس کی کھپت بہت خوبی سے ہو جاتی ہے نظم میں اس کے استعمال سے تسلسل میں فرق پڑتا ہے۔ خصوصاً اس نظم میں جس کی خوبی اس کے تصوّرات کا بہاؤ ہے۔

رباعیات

از جوش ملیح آبادی۔ زمانہ مئی ۱۹۴۰ء

خاتم سے علٰحدہ نگیں ہو، ہے ہے!
روتی ہوئی چشم سرمگیں ہو، ہے ہے،
جھونکوں میں کراہنے کی ہیں آوازیں!
یہ کون ہے، کیا تم ہو؟ نہیں ہو، ہے ہے!

(۲)

اے دردِ نہاں! دوچند ہو جا۔ للہ!
اے موجِ الم! بلند ہو جا۔ للہ!
ہاں اے حرکت جوش کے دل کی حرکت!
غیرت ہو اگر تو بند ہو جا للہ!

جوش کی نفسیاتی شاعری کو اُس کی انقلابی شاعری نے عرصے سے پسِ پشت ڈال رکھا تھا۔ اوپر کی رباعیاں ایک نوید کا درجہ رکھتی ہیں کہ شاید اب ہم پھر جوش کی نفسیاتی بلندیوں کا مطالعہ کر سکیں گے۔

پہلی رباعی میں شاعر اکیلا بیٹھا ہے، وقت خواہ دن کا ہے یا رات کا، ایک بات لازمی ہے، سکون ہے، خاموشی مکمل! اچانک اُسے رہ رہ کر کراہنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ آواز کی نزاکت سے ظاہر ہے کہ کوئی عورت ہے جسے کسی انجانے دکھ نے بے چین کر رکھا ہے۔ کراہنے والے کی جنس کا تعین شاعر نے آواز سے کیا ہے لیکن ہم شاعر کے الفاظ "چشم سرمگیں" سے کرتے ہیں۔ اس خاموشی، سکون اور تنہائی میں جب شاعر کو ایک عورت، ایک حسین عورت (حُسن شاعر کا مفروضہ ہے) کے کراہنے کی آواز آتی ہے تو اس کے احساسِ مردانگی کو تحریک ہوتی ہے اور اُس کے ذہن میں تاسف کی تخلیق ہوتی ہے اُسے افسوس ہوتا ہے کہ چشم سرمگیں تو رونے کے لئے نہیں بنی، یہ ظلم کیوں ہو رہا ہے، یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ انگوٹھی سے نگینے کو علٰحدہ کر کے ایک حسین چیز کو ضائع کیا جائے ـــــ اور پھر یک دم اُسے احساس ہوتا ہے کہ یہ آواز تو مانوس معلوم ہوتی ہے اور تجسس پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون ہے؟ ـــــ اُسے شک ہے کہ یہ آواز اُس عورت کی ہے جس سے اُسے نسبت رہی ہے۔ اسی لئے وہ سوال کرتا ہے "کیا تم ہو؟" ـــــ رہ رہ کر کراہنے کی آواز اب بھی آ رہی ہے اور اُس کا شک یقین سے بدل جاتا ہے "نہیں ہو" ـــــ اور تاسف کا جو نغمہ اُس کے سازِ دل سے چھڑا تھا۔ اس کے سُر اونچے ہو جاتے ہیں

اس رباعی کی اشارتی حیثیت بہت بلند ہے۔ ہم اس کے قصے کو کئی طرح فرض کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کراہنے کی کوئی آواز نہ آ رہی ہو۔ صرف شاعر کے دل ہی میں غم و الم کے احساس چھائے ہوئے ہوں اور اُس کا ذہن کسی محبوب ہستی کی طرف چل پڑا ہو اور ایک طرح کی ذہنی پیغام رسانی کے ذریعے سے اُس نے پہلے اپنے غم و الم کو اپنی محبوب ہستی کا غم و الم بنایا ہو اور پھر اُس کے دکھ پر خود اظہارِ تاسف کر کے اپنی ہمدردی کو دوسرے کی ہمدردی کے پردے میں پورا کیا ہو۔

دوسری رباعی کو موضوعی لحاظ سے پہلی سے کافی حد تک ہم آہنگی حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ پہلی رباعی میں جو درد و الم ایک پُر اسرار کیفیت لئے ہوئے ہے اسی کو مخاطب کر کے شاعر کہہ رہا ہو کہ "اے دردِ نہاں! دوچند ہو جا" ـــــ دوچند یوں ہو جائے! اس لئے کہ یوں اُس کا شعوری احساس ہو سکے گا بھید کا رنگ مٹ جائے گا پہلی دھندلی کیفیت باقی نہ رہے گی۔ موجِ الم کے بلند ہونے ہی سے اُسے معلوم ہو سکے گا کہ یہ درد کیسا ہے، کیوں ہے۔ شاعر اپنے دل کی حرکت کے بند ہو جانے کا طلبگار کیوں ہے؟ شاید اس لئے کہ یوں اس دردِ نہاں سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ لیکن چوتھے مصرعے میں "غیرت" کا لفظ بہت الجھانے والا ہے۔ غیرت کس بات کی؟ ـــــ اور اسی لفظ کی بنا پر اس رباعی کا تعلق پہلی رباعی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ شاعر کی محبوب ہستی دکھ میں ہے۔ اُس کے دکھ سے شاعر بھی دکھی ہے۔ لیکن ان دونوں کے درد کی نوعیت پُر اسرار ہے، یہ درد ایک بھید کی بات ہے ایک پیچیدہ نفسی احساس۔ البتہ اتنی بات کا شاعر کو اب یقین سا ہو چکا ہے کہ ایک محبوب عورت بے چین ہے لیکن وہ اُس کے درد کا مداوا کرنے سے عاجز ہے۔ اُس کے احساسِ مردانگی کو اس درد کے علم سے جو تحریک ہوتی ہوتی ہے۔ وہ اس کی تسکین نہیں کر سکتا اور اسی لئے کہتا ہے کہ اے جوش کے دل کی حرکت! اپنے درد کی تو بات ہی الگ تو اُس کے درد کو بھی نہیں مٹا سکتی اگر تجھے ذرا بھی غیرت ہے تو بند ہو جا۔

میراجی

نقد و نظر

حیاتِ جاوید ۔ از مولانا الطاف حسین حالی مرحوم ۔ حجم ۹۵ے صفحات ضمیمے اور انڈیکس کے سوا سو صفحات اس کے علاوہ ہیں ۔ سائز آب حیات کا ۲۲×۲۰ ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ۔ مولانا حالی اور سرسید کی عدہ بڑی علمی تصاویر بھی شامل ہیں۔

انجمن ترقی اردو نے سرسید مرحوم کی اس مستند سوانح عمری کو دوبارہ اہتمام سے شائع کر کے اردو زبان کی ایک خدمت انجام دی ہے۔ "حیاتِ جاوید" کی تصنیف میں حالی کے مدِنظر صرف وہی سرسید نہ تھے جنہوں نے ملک و قوم کی خدمت کی اور مسلمانوں کو تعلیم کے زیور سے مالا مال کرنے کی بے مثل خدمات انجام دیں بلکہ اُن کا سیرتی پہلو زیادہ اہمیت رکھتا تھا ۔ حالی کے قول کے مطابق سرسید نے اُس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اپنی قابلِ تقلید زندگی کا نمونہ پیش کیا جب نوسو سال سے نیا سوادوں کی حیاتِ قومی میں ایک انقلابِ عظیم آگیا تھا اور وہ کسی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ علم اور لوگوں کا کام ہے اور باورچی گری اور لوگوں کا"

دیباچے میں حالی نے لکھا ہے " جس قدر یہ زمانہ گذرتا جائے گا اُسی قدر سرسید کے کاموں کی زیادہ قدر اور اُن کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی۔ متعدد لوگ اُن کی بائیوگرافی لکھنے پر قلم اُٹھائیں گے ۔ اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا" یہ بات بالکل صحیح ہے۔ لیکن یہ بات بھی کم صحیح نہیں کہ حالی نے خود سرسید کی جو سوانح عمری لکھی ہے اُس کی حیثیت بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پائیدار ہو چکی ہے۔ (قیمت کتاب پر درج نہیں ہے)

ملنے کا پتہ ، انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

سلطان محمود غزنوی از مولوی محمد حبیب صاحب بی اے آکسن) پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی ۔ مرتبہ سید جمیل حسین صاحب ایم اے علیگ حجم ۱۲۰ صفحات ۔ لکھائی ٹائپ کے حروف میں ۔ کاغذ اچھا ۔

غزنوی کی ہندوستان پر چڑھائی ہماری تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ حادثہ ہے ۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے اُسے حادثہ بھی کہا جا سکتا ہے ۔ ایسے تاریخی حقائق عموماً جانبداری کے سیلاب میں ڈوب کر دھندلا جاتے ہیں لیکن اس کتاب کے مؤلف سے ہمیں یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ دیباچے ہی میں مؤلف نے لکھ دیا ہے کہ یہ کتاب ہماری عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے ایک [illegible] دور کو پیش کرتی ہے ۔ ایک بادشاہ اور فاتح کی حیثیت سے محمود غزنوی کے کارنامے نے بعد کی نسلوں پر اس قدر گہرا اثر ڈالا ہے کہ ان کی نظریں لامحالہ ہمیشہ اس پر پڑتی رہیں گی۔ اس لئے اس کی سیرت کے متعلق بھی مختلف خیالات کا پھیلنا لازمی ہے ۔ نہ معلوم مجھے اس [illegible] کے ساتھ کسی جذبۂ ہمدردی نے متاثر کیا ۔ یا [illegible] کچھ دنوں سے بعض ہندی مسلمانوں کا رجحان اس طرف ہو [illegible] محمود کو اولیاء اللہ کے مرتبے پر پہنچا دیں۔ اُن حضرات کو البتہ اس کے [illegible] حضرت کی تحقیق ناگوار گذرے گی ۔ میں اپنی صفائی میں صرف [illegible] مذہبی اعتبار سے اسلام احکامِ قرآنی اور سنتِ [illegible] کی پیروی کا نام ہے ۔ اگر سلطان محمود اور اس کے عمالِ سلطنت [illegible] سے غلطی ہوئی تو یہ اُن کی بدقسمتی ، ہم بتوں کے پرستار نہیں ہیں"۔

ہمارے خیال میں محترم مؤلف کو یہ تاویل پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی [illegible] جانبداری سے انہوں نے اس متنازعہ فیہ مسئلے پر اپنی قابلِ [illegible] تحقیق علمی سے روشنی ڈالی ہے وہ اپنا جواز آپ ہے ، اور ذیلی حوالوں نے بھی [illegible] دلائل میں کمزوری نہیں پیدا ہونے دی۔

کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ ۱۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ۔ ۲۔ سلطان محمود کا عہدِ حکومت ، غزنوی سلطنت کی ابتدا محمود کی سیرت ، ہندوستان پر حملے ، وفات ۔ ۳۔ محمود کے کارنامے کی نوعیت اور اہمیت اور ۴۔ غزنوی سلطنت کا زوال اور خاتمہ ۔ سلطان مسعود سلجوقی۔

محترم مؤلف کا اندازِ بیان علمی بحث کی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک داستان گو کی دلکشی بھی لئے ہوئے ہے جس سے کتاب کی دلچسپی میں معتدبہ اضافہ ہوگیا ہے ۔ قیمت ۔ ایک روپیہ ۔ ملنے کا پتہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۔ یوپی۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی و کراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام۔

نئی وضع کے سات جہازوں کا شاندار بیڑہ۔ جس میں جہازوں کا سرتاج ایس ایس

18 (8)

"اسلامی" (وزن ۵۸۷۹ ٹن)

بھی شامل ہے

گذشتہ موسم حج میں جبکہ جنگ کی وجہ سے جہازرانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے، مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا اور نہ حج سروس بند کی۔

بمبئی اور کراچی سے عدن، جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور

ماریشس تک مسافر اور باربرداری کی سروس

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں۔

تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے:-

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶ بنک سٹریٹ بمبئی

سحر فرانس

جو فرانس کے افسانہ نگار گائی دموپساں کے بائیس دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے

جس کا ترجمہ طاہر قریشی بی اے نے کیا ہے۔ تعارف جناب عاشق بٹالوی بی اے ایل ایل بی نے سپرد قلم کیا ہے اور موپساں کی افسانہ نگاری پر ایک مبسوط محققانہ مقالہ حضرت شاہد احمد بی اے آنرز ایڈیٹر ماہنامہ ساقی دہلی کے قلم کا مرہون منت ہے۔

اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت دلکش۔ سرورق خوشنما جلد ضخامت سوا تین سو صفحات۔ ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ کتاب میں مصنف و مترجم کی تصویریں بھی شامل ہیں۔

قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

کتب خانہ ادبی دنیا۔ لاہور

نوائے وقت

"نوائے وقت" پنجاب کا واحد ادبی و سیاسی اخبار ہے جو انتہائی پابندیٔ وقت کے ساتھ لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ میاں بشیر احمد مدیر "ہمایوں" اس کے سرپرست اور خواجہ شبیر حسن اس کے مدیر ہیں۔ اس اخبار کے مستقل مضمون نگاروں میں اردو زبان کے صف اول کے ادیب و شاعر مثلاً خواجہ غلام السیدین، علامہ کیفی، پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر ڈاکٹر باقر، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، حضرت احسان دانش، پروفیسر فیض، پروفیسر آل احمد سرور، شیخ الوار الحق ایم اے آئی سی ایس، حضرت جلال الدین اکبر، میراجی، جمیل احمد ناخدا، مسٹر کرشن چندر، سندباد جہازی وغیرہ شامل ہیں۔ چندہ سالانہ دو روپے۔ طلبہ اور لائبریریوں سے صرف ایک روپیہ سالانہ بشرطیکہ منی آرڈر کے ذریعے بھیجا جائے۔ نمونہ کے لئے پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیجیں مفت نہیں بھیجا جائے گا

منیجر
نوائے وقت۔ لاہور

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اگست ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — تصویر: از پئے جاناں جاں ہم رفت؟ — نمبر ۸

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا موہنی روڈ لاہور سے شائع ہوا۔ تصاویر ... پریس لاہور میں چھپیں۔

دنیائے کاروبار

نیشنل لیبارٹریز لاہور

میسرز بیلی رام اینڈ برادرز سوداگران ادویات" اس مشہور عالم اور معتبر فرم نے جو ہندوستان میں ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں اس کی دیانتداری اور خوش اخلاقی اور معاملہ فہمی تمام ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی ہر نیشنل لیبارٹرز کی بنائی ہوئی تمام ادویات۔ عمدگی۔ صفائی اور قیمت کی کفایت کے لحاظ سے ولایتی اشیاء پر سبقت لے گئی ہیں۔ اور نیشنل لیبارٹریز اس فرم کا ایک صنعتی شعبہ ہے۔ جس کے روح رواں مسٹر ملک رام بالی ہیں۔ جو نہایت معتمد ہوشیار وبا اخلاق ہیں۔

ملک میں روز بروز بڑھتی ہوئی بیکاری سے متاثر ہو کر انہوں نے اس صنعتی شعبے کی داغ بیل ڈالی جو اس وقت سے اب تک نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اس کی تیار کردہ اشیاء مثلاً مونا سنو، مونا کریم، اوسنج اور لیمن سکویش، عرقیات، عطر، سینٹ، تیل۔ کریم اور اپنی سپشال سوپ اپنے مقابلے کے ولایتی مصنوعات سے صفائی اور ہر خوبی سے ہزار درجہ بہتر ہیں اور قیمت میں بھی باکفایت، خصوصاً مونا سنو کے استعمال سے چہرے کی تمام کیل چھائیاں، جھریاں اور ہر قسم کے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں اور چہرہ چاند کی مانند نکل آتا ہے۔

صندل آئل یہ بھی ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا تیل ہے جس کے لگانے سے دائمی درد سر دور ہو جاتا ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک بے نظیر تحفہ ہے۔

مندرجہ بالا اوصاف کی بنا پر اس دوکان سے تمام معززدکاندار اس کا سٹاک اپنے پاس جمع رکھتے ہیں اور اپنے گاہکوں سے ان کے استعمال کی سفارش کرتے ہیں۔

لمٹن واچ کمپنی

عہد حاضر میں سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں بھی باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے گھڑی کا احساس شدت سے پیدا ہو چکا ہے جس کی وجہ سے گھڑی کا وجود ہماری ضروریات زندگی کے لئے از بس ضروری ہو چکا ہے۔

لمٹن واچ کمپنی ۱۴۲ ڈلہوزی اسکوائر کلکتہ۔ انسانی ضروریات کے عین مطابق نہایت اعلیٰ قسم کی پائیدار گھڑیاں فروخت کرنے میں امتیازی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

لمٹن گھڑیاں شکل وصورت کے اعتبار سے نہایت خوبصورت ہوتی ہیں۔ صحیح وقت دینا، خوشنمائی، دلکشی اور نفاست ان گھڑیوں کی ممتاز ترین خصوصیات ہیں جن کی بنا پر یہ غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ ان گھڑیوں کی ساخت میں بے نظیر خوبی اور ناقابل انکار امتیاز کے بلند معیار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ہر مذاق کے لوگوں کے لئے دلکش نمونوں اور سائزوں میں مل سکتی ہیں۔ قیمتیں نہایت واجبی ہیں اور خریدار کو اس کے روپے کا پورا پورا بدل دیا جاتا ہے۔ ہم ناظرین سے پر زور سفارش کرتے ہیں کہ لمٹن واچ کی گھڑیاں خرید کر اپنے پاس رکھیں۔

مکمل فہرست اس پتے سے طلب فرمائیے۔
لمٹن واچ کمپنی ۱۴۲ ڈلہوزی اسکوائر کلکتہ۔

فضل الٰہی
مہتمم اشتہارات ہوبی دنیا لاہور

روزمرہ کا ایک ضروری واقعہ



جس وقت آپ کا شوہر اپنے کام سے اور
آپ کے لڑکے اسکول سے واپس آتے ہیں اس وقت
آپ کو چائے بنانے میں مصروف ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح آپ اپنے گھر میں
روزانہ چائے کی مجلس قائم کرتے ہیں۔ جو کہ گھریلو خوشی کی انتہا ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ
یہ خوشی کا واقعہ جس طرح آپ کے گھر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے گھروں میں بھی ہوتا ہے

آؤ ہم ہندوستانی چائے پئیں

چائے کس طرح تیار کرنی چاہیے۔ تازہ پانی اُبال لیجئے۔ اور پھر ایک
صاف برتن کو ذرا گرم کر لیجئے۔ اس میں ہر شخص کے لئے ایک ایک چمچہ ہندوستانی چائے
کا ڈال دیجئے۔ اور ایک چمچہ زائد ڈال لیجئے۔ جونہی پانی اُبلنے لگے اس کو چائے والے
برتن میں ڈال دیجئے۔ اور پانچ منٹ تک ڈھکا رہنے دیجئے۔ بعد ازاں دودھ
اور کھانڈ ملا کر پیالیوں میں ڈال کر استعمال کیجئے



از پئے جاناں جاں ہم رفت

بزم ادب

ادبی حلقوں میں یہ خبر رنج اور افسوس سے سنی جائے گی کہ خواجہ عبدالروف صاحب عشرت کا لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ خواجہ صاحب مرحوم ہمارے اُن اُدبا میں سے تھے۔ جنہوں نے مشرقی درباداری اور تمدن کی آخری جھلک دیکھی تھی۔ آپ نے متعدد گراں پایہ تصانیف کے علاوہ جن میں سے بیشتر شاعری اور تنقید سے متعلق ہیں۔ ایسے مضامین کا ایک نادر مجموعہ بھی یادگار چھوڑا ہے جن کو دربار اودھ اور امرائے اودھ کی معاشرت کے بے نظیر مرقع کہا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کی وفات سے ہماری محفل میں ایک ایسی نشست خالی ہوگئی ہے جو شاید اب خالی ہی رہے گی۔

بعض مضمون نگار حضرات اور شعرائے کرام میں جہاں اور دلچسپ خصوصیات ہیں وہاں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو لوگوں کے سامنے فرضی ناموں سے پیش کرنا چاہتے ہیں" ادبی دنیا کا مسلک ایک عرصے سے اس روش کے خلاف تھا۔ ہمارے ہاں اگر کوئی فرضی نام شائع بھی ہوا ہے تو اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مصنف اپنی پرائیویٹ زندگی میں بھی اسی نام سے معروف ہے۔ لیکن بعض اصحاب ہمیشہ اپنے فرضی ناموں کی اشاعت پر اصرار کرتے رہے۔ اس اصرار کی روز افزوں شدت کو دیکھ کر آئندہ کے لئے ہم نے فرضی ناموں کے متعلق پابندی ہٹا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیونکہ آخر یہ مضمون نگار یا شاعر کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اپنی تخلیق کسی اور نام سے منسوب کرے۔

اس ماہ کے تینوں مضامین اپنی اپنی جگہ نہایت دلچسپ اور خیال افروز ہیں۔ انشائے لطیف (ESSAY) کے سلسلے میں جو چند ماہ سے ادبی دنیا میں جاری ہے، ممتاز مفتی صاحب کا بیش قدر مضمون جھوٹ خاص طور پر توجہ کے قابل ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے شگفتہ انداز تحریر میں، جو کبھی بیزارکن نہیں ہوتا، ہماری اس سب سے دلچسپ عادت کا جائزہ لیا ہے۔ اور ایسے ایسے لطیف نکتے پیدا کئے ہیں کہ آئندہ جھوٹ بولتی دفعہ شاید ہم اس کے نفسیاتی پہلو پر غور کرتے رہ جائیں گے اور جھوٹ بولنا بھول جائیں گے۔

اقبال اور اس کے نقاد لکھ کر جناب مبشر علی صدیقی نے ایک دلکش انداز میں ان نکات و مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو اقبال کی شاعری اور اس کے پیغام سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسئلہ زیر بحث اگرچہ خاصہ دقیق تھا۔ لیکن مکالمے کی شگفتگی نے اسے ایک واضح اور عام فہم صورت دے دی ہے۔ امید ہے کہ علمی مسائل کی توضیح و تسہیل کا یہ انداز ناظرین کو بہت پسند آئے گا۔

ترقی پسند ادب اور مزدور ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جسے جناب مسعود جالندھری نے، معلوم ہوتا ہے، کہ نہایت غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ یہ بیش قیمت مضمون اُس افراط و تفریط سے قطعاً مبرا ہے جو ترقی پسند ادب کے حامیوں اور مخالفوں کی تحریروں میں عموماً نظر آتی ہے۔ مسعود صاحب نے ترقی پسند ادب کا صحیح مقام واضح کرنے میں اپنے حسن مذاق اور دقت نظر کا نہایت روشن ثبوت دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اس دلچسپ مسئلے پر آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔

محمد حسن صاحب عسکری کا "مطالعہ گھر سے کالج تک" مزاح نگاری کی ایک کامیاب مثال ہے۔ زندگی کے بعض مسائل ایسے خاردار ہوتے ہیں کہ ہم اپنی سنجیدہ تحریروں میں اُن کے متعلق صاف بیانی سے کام نہیں لے سکتے۔ لیکن مزاح کے پردے میں وہ سب کچھ "بلا تکلف عرض کیا جا سکتا" ہے۔ جو عام طور پہ کہنے سے ہم لوگ ہمیشہ ہچکچاتے ہیں۔ زیر نظر مطالعہ میں آپ کو صاف بیانی کی چند دلچسپ مثالیں نظر آئیں گی۔

ایشور سنگھ کے نقوش اب مستقلاً ادبی دنیا کی زینت ہوتے جا رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ نقوش اردو دان طبقے کو اپنے ملکی معبدوں میں دلچسپی لینے پر مائل کریں گے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

موسموں کے تاثرات یوں تو ہر ملک اور قوم کے لوگوں پر مرتسم ہوتے ہیں لیکن ہندوستان کے رہنے والوں کی زندگی اور زمانہ اوسی معصومیت کی وجہ سے موسم کے [illegible] خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ساون کا موسم جذبات انگیز ہے اور اس لئے ساغر جلیلی کی نظم برسات کا جوبن ہمیں اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ اس نظم میں دنیا کی باتیں ہیں ان کی کیفیت نزاکت لئے ہوئے [illegible] لیکن اس کا زیر و بم اور موسیقی یوں ہے گویا لگاتار حضوری تک رکی ہو [illegible] کا ساز چل رہا ہو اور دل ——— لیکن دل سے متعلق خاموشی ہی بہتر ہے۔

علی احمد ساون کے ماحول سے بے نیاز ہیں بلکہ وہ تو رسیلی کی محبت اور [illegible] کے تاثرات کا بیان کرتے ہیں۔ جب دنیا ایک سب سے لذت یاب ہو کر رہ جاتی ہے ایسے میں دل میں جو ایک انتشار سا محسوس ہوتا ہے اس کے تاثر میں اپنی محبوب کو بھی منوانا چاہتے ہیں۔ اور رسیلی یہ دنیا ہے اگرچہ یہ آواز نہیں کہا کہ جس طرح ہماری محبت ہوگی اسی طرح جوانی بھی چلی جائے اس لئے عشق و الفت کی مہمات سے میاں بیت آؤ کہ جوانی کو بھولئے جایئے ——— اس نظم میں ہر بلبل کا اشارہ اس نظم کی صرف ایک خوبی ہے اور پھر آخر میں جا کر بھی شاعر ایک دلکش کنایتی انداز اختیار کرتا ہے۔ جب وہ اپنی محبوب کے دامن پر آنسو بکھالی دیتے ہیں۔ یہ آنسو کیسے ہیں؟ کیا خزاں کے تاثر کی وجہ سے یا شاعر کی باتوں کے تاثر کی وجہ سے یا ..... ایسی بہت سی [illegible] کنایتیں بہت سے امکانات پوشیدہ ہیں اور جس طرح خزاں کے ماحول میں ذہن ایک سکون اور خاموشی میں کھو کر کچھ سوچنے لگتا ہے اسی طرح کا اثر اس آخری کنایے سے ہم پر ہوتا ہے۔ ہم کچھ سوچنے لگتے ہیں

کوکب شاہ والی اور میراجی کی نظموں میں فنی پہلو کی طرف توجہ کی گئی۔ اردو میں لمبی بحروں کو ہندی کی بحریں بھی کہا جا سکتا ہے لیکن ہندی کی بحروں میں عموماً ساڑھے سات رکن استعمال ہوتے ہیں ——— یہاں کوکب کی غزل میں شاعر نے پورے آٹھ رکن استعمال کر کے موسیقی میں ایک تجدید سی پیدا کی ہے اسی طرح "ایک گیت کے دو بھاؤ" میں آٹھ کی بجائے ساڑھے آٹھ ارکان کے استعمال سے ہیئت میں ایک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تبدیلی ابھی محض ایک تجربہ ہے۔

زیر نظر شمارے میں احتشام حسین کی نظم خصوصاً توجہ کے لائق ہے۔

اس نظم کی حیثیت انفرادی ہے لیکن انفرادیت ہی سے شاعر نے اجتماعی تفکر کی راہ سدھ کر دیا ہے۔ اس کی بحر میں جو ایک اختلال خیزاں اور ڈھیلی ہی کیفیت نظر آتی ہے وہ ہماری سماج کے ماحول سے ہم آہنگ ہے۔ آج سے بیس پچیس سال پیشتر جب ابھی بین الاقوامی حالات نے بہت سے نئے زاویے ہماری نظروں کے سامنے نہیں پیش کئے تھے، ہم اپنے خوابوں ہی میں کھوتے ہوئے تھے۔ انہی کے خوابوں میں اور اب نئے زاویوں نے ہمیں نئے خواب مہیا کر دیئے ہیں مستقبل کے خواب۔ یہ نظم حال کی حقیقت سے ہٹتے ہوئے مستقبل کے خوابوں کا آئینہ ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں انسان بنیادی لحاظ سے ہمیشہ سپنوں ہی کا عادی رہے گا۔

سعید احمد اعجاز "نکہت گل" میں صرف خیال کی نزاکت ہی کو ظاہر کر رہا ہے لیکن جلد ہی وہ حقیقت کی طرف آ ملتا ہے اور "تشکر" "تجربہ ناگوار" اور "واردات" تینوں نظموں میں [illegible] کا اظہار کرتا ہے جس سے ہمیں اس درد کی ماری دنیا میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اور سب سے آخر لیکن ہر طرح بہتر اختر شیرانی کا تغزل اس بار ادبی دنیا کے صفحات کی زینت ہے۔

اس دفعہ کی تصویر | بظاہر دنیا میں دو ہی غم نظر آتے ہیں، غم عشق اور غم روزگار۔ غالب کہتا ہے کہ اگر ایک غم نہ ہو تو دوسرے کا ہونا لازمی ہے اور سعدی اس تلخ حقیقت کا اظہار اپنے ایک شعر میں کرتا ہے کہ دمشق میں ایک بار ایسا قحط پڑا کہ یاروں نے عشق ہی کو فراموش کر دیا۔ آج کل کی دنیا میں بھی کچھ ایسی ہی دمشقی کیفیت پیدا ہو رہی ہے جس کے سب سے بڑے نقیب ترقی پسند ادیب ہیں۔ اس دفعہ کی تصویر کا موضوع بھی انہی کے رجحانات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ظاہر کرتا ہے کہ روزگار ایک ایسی بلا ہے جس کے لئے لوگ جان کی پروا کئے بغیر مصروف تگ و دو ہیں۔ شاید امیر خسرو کو بھی جب وہ دھنیے کی دھن کو لفظوں کی قید میں لا رہے تھے تو غیر شعوری طور پر اس پیشے کے جانی پہلو کا احساس تھا۔ ورنہ ان الفاظ کے کیا معنی کہ "از پئے جاناں جاں ہم رفت"؟

میراجی

آئینۂ عالم

جاپان۔ ہندوستان اور چین

جاپان کے ملک الشعرا کا نظریّہ

جاپان گذشتہ کچھ عرصے سے جہانگیری کا جو عظیم الشان خواب دیکھ رہا ہے اور اُسے شرمندۂ تعبیر کرنے کی جو کوششیں اُس نے مختلف صورتوں میں اب تک کی ہیں وہ وہ ایک ایک کرکے ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ چین پر حملہ بھی اسی خواب کا ایک جزو تھا جسے اب تک جنرل چیانگ کائی شک نے پورا نہیں ہونے دیا۔ جاپان کے مدبّرین کی طرح جاپان کے موجودہ ملک الشعرا، یان نوگئی نے بھی جاپان کے اس اقدام کو حق بجانب ثابت کیا ہے۔ اور اپنی نئی کتاب جاپان جدید میں اسی مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس وقت ایشیا بھر میں صرف جاپان ہی ایک ایسا ملک ہے جو کسی غیر ملکی اثر و اقتدار سے آزاد ہے۔ اس کے سوا ایشیا کے باقی تمام ممالک ایک ایک کرکے مغربیت کے آگے سرِ تسلیم خم کرکے اپنی آزادی کھو چکے ہیں۔ اس لئے موجودہ صورتِ حال میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا میں ایک نیا نظام قائم کریں۔ اور ہم اسی غرض سے چین کی طرف بڑھ رہے ہیں جس میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ہم نے نصف سے زیادہ چین پر قبضہ کرلیا ہے۔ مگر جنرل چیانگ کائی شیک اور اس کے دوسرے ساتھی جو مغربی قوتوں کے آلۂ کار ہیں، ہمارے اس عزم کو پاش پاش کرنے پر تلے بیٹھے ہیں لیکن ہم ان باتوں سے گھبرانے والے نہیں۔ ہم نے ایک عزم کیا ہے اور اُسے پورا کرکے چھوڑیں گے خواہ راستے میں ہمیں کیسے ہی مصائب سے دو چار کیوں نہ ہونا پڑے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جنگ میں جو ہم نے چین کے خلاف جاری کر رکھی ہے۔ دن رات بہت سی چینی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اگر اتلافِ جان کا معیار یہی رہا تو یقیناً ہمارا پروگرام پورا نہیں ہوسکے گا۔ ان کو میرا جواب یہ ہے کہ ایسا صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہماری جنگ چین کے عام لوگوں کے خلاف ہو۔ ہم تو جنرل چیانگ کائی شیک کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے جو ہمیشہ مغربی طاقتوں کے اشارۂ چشم و ابرو پر ناچتے رہے ہیں، جاپان کی مخالف تحریکات میں نہایت سرگرمی سے حصّہ لیا ہے۔"

ہندوستان جاپان اور چین کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے جاپانی شاعرِ اعظم نے کہا کہ کچھ عرصہ ہوا ایک ہندوستانی نوجوان نے بھی اسی قسم کے اندیشے کا اظہار کیا تھا جس کے جواب میں میں نے کہا تھا کہ چین اور جاپان کی مثال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی سی نہیں ہے کہ دونوں کی زبان تمدن اور کلچر علیحدہ علیحدہ ہے بلکہ چین اور جاپان تو در اصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں ہم دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ہمارا ایک جیسا رنگ ہے اور ہم بہت مدّت تک بدھ بادشاہوں کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں اس زندگی میں ایک سکون تھا، چین تھا، آرام تھا، موجودہ دور کی بے اعتمادی اور بے اطمینانی نہیں تھی۔ اس زمانے میں ہم ایک دوسرے کو بدھ کے مجسّمے بطورِ تحفہ دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں کئی چینی جاپان میں آئے اور وہیں کے ہو رہے۔ دونوں ممالک کے بادشاہوں نے ایک دوسرے کے ممالک میں بدھ کے مندر بنائے جو آج بھی اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ہم ایک ہیں۔ اور بدھ مذہب نے تو ہمیں ہندوستان کے قدموں میں بھی لا ڈالا تھا۔ اگر ہم نیرا کے ہوریجی مندر کو دیکھیں تو اُس سے ننگ ہنگ کے چینی مندر یاد آجاتے ہیں اور ساتھ ہی ہمارا ذہن اجنتا کے مندروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کا یہ عکس معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں چین اور جاپان میں جو مورتیاں بنائی گئیں وہ شیو جی اور کالی دیوی کی شکل

کی تعبیر۔

اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ چینی اور جاپانی مندروں کے تعمیر کرنے والے ہندوستانی تھے۔ اس وقت ہندوستان جاپان کے کتنا قریب تھا۔ گو ہمارے ہندوستانی تعلقات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے۔ ان کو منقطع کرنے کی طرف زیادہ تر مغربی ممالک ہی سب سے پیش قدمی کرنے والے تھے۔ جو جاپان پر ہمیشہ کی صورت میں تھا۔ اس دولت کے لحاظ ہندوستان، چین اور جاپان آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔

ہم پھر انہی پرانے تعلقات کو قائم کرکے ایشیا میں ایک نیا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مغربی قوتیں جو یہ جانتی ہیں کہ اس حالت میں ان کے تجارتی مفاد کو سخت دھکا لگے گا کہ ان کی منڈیاں ختم ہو جائیں گی اور جاپان کو زیادہ منافع ہوگا، ہمارے اس ارادے کی مخالفت کر رہی ہیں۔ اور جنرل چیانگ کائی شیک ان کی طرف سے اس سلسلے میں ہماری مخالفت کرنے میں پیش پیش ہے"

ملک الشعرائے جاپان کے مندرجہ بالا خیالات جاپان کے خوابِ ملوکیت کا صحیح آئینہ ہیں جن کی روشنی میں بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کی آواز تمام جاپان کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں کی آواز ہوگی۔

دراصل اس خواب کو جاپان انیسویں صدی کی ابتدا سے دیکھ رہا ہے۔ اسی کی تکمیل کے لئے اس نے پہلے روس سے جنگ چھیڑی، منچوریا کو اپنے قبضے میں کیا اور پھر چین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن کیا اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا؟ اس کے متعلق یقین کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ بین الاقوامی صورتِ حال اس سرعت سے تبدیل ہو رہی ہے کہ کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آج شام کو کیا ہوگا اور کل صبح جب دنیا بیدار ہوگی تو اخبارات کی کونسی خبر ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کرے گی۔

روس کا نظامِ حفظانِ صحت

روس کی خارجی حکمتِ عملی سے کسی کو اختلاف کیوں نہ ہو، اشتراکیوں کے مذہبی تصورات اور ان کے نظامِ حکومت کا کوئی کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو، لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی کو باک نہ ہوگا کہ دنیا کی کسی حکومت نے حفظانِ صحت کی طرف روس سے بڑھ کر توجہ نہیں کی۔ سوویٹ حکومت نے برسرِ اقتدار آتے ہی محاربین کے قتل سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے جس محکمے کی اصلاح کی طرف توجہ دی تھی، وہ محکمۂ حفظانِ صحت تھا۔

زاروں کے زمانے میں روسیوں کو سب سے بڑی تکلیف یہی تھی کہ ملک کی آبادی کے مقابلے میں ڈاکٹروں کی تعداد بہت کم تھی۔ زار خود تو دن رات عیش و عشرت میں مشغول رہتے تھے لیکن ان کو اپنی رعایا کی تکالیف کا احساس نہ تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی حکومت کا دارومدار رعایا پر ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی روس میں طاعون، ہیضہ یا دیگر متعدی امراض پھیلتے تو آنِ واحد میں شہر کے شہر صفایا ہو جاتے اور حکومت ان کے انسداد کی طرف توجہ ہی نہ کرتی اور اگر توجہ کی بھی جاتی تو محض اس لئے کہ امرا کے طبقے کو نقصان نہ پہنچے۔ ۱۸۹۶ء میں محکمۂ حفظانِ صحت کے اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ روس جیسے وسیع و عریض ملک میں تمام سند یافتہ ڈاکٹروں کی تعداد ۶۹۵۹ تھی۔ اس کے علاوہ تعویذ گنڈا کے ذریعے علاج کرنے والوں اور نیم حکیموں کی تعداد تیرہ ہزار تھی اور ایسے معالج طاعون اور دیگر امراض سے بھی زیادہ نقصان کا باعث تھے۔ اُس زمانے میں چیچک بہت پھیلتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہر سال صرف چیچک سے ہی ایک لاکھ آدمی مر جاتے تھے۔

اشتراکی چونکہ برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ان لوگوں میں ہی شمار ہوتے تھے جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ لوگ امرا کو راحت پہنچانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے عوام کی تکالیف کو محسوس کرتے ہوئے حکومت کا نظام ہاتھ میں لیتے ہی بیماریوں کے انسداد کی طرف توجہ کی۔ ملک میں ہسپتال بنائے اور ان میں مریضوں کا علاج کیا جانے لگا۔ آج کل اگر کوئی کسی پرانے زار کے زمانے کا روسی قبر سے نکل آئے اور روس کی حالت کو دیکھے تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔ کہاں وہ روس جب بیمار سسک سسک کر مر جاتے تھے مگر کوئی اُن کو پوچھنے والا نہ ہوتا تھا اور کہاں آج کا روس کہ ملک میں ہر طرف ہسپتال کھلے ہوئے ہیں جن میں ہر بیماری کا علاج مفت ہوتا ہے۔

۱۹۲۳ء تک روس میں جتنے ہسپتال تھے ان میں بیک وقت چھ لاکھ پچاس ہزار مریضوں کے علاج کا انتظام تھا اور آج کل تو اور بے شمار ہسپتال بھی بن چکے ہیں۔ اشتراکیوں نے صرف اپنے ہی ملک میں ہسپتالوں کا جال نہیں پھیلایا بلکہ اپنی نوآبادیوں کو بھی اس نعمت سے مالا مال کرنے کی کوشش کی ہے۔ زاروں نے اپنے ملک میں تو کچھ ہسپتال بنا دیئے تھے مگر نوآبادیوں میں کئی کئی سو میل کے فاصلے پر کوئی ہسپتال نہیں ملتا تھا۔ مگر اشتراکیوں نے اپنی نوآبادیوں کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے انہیں پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

زاروں کے روس میں بازاری عورتوں کے اڈے بھی بازاروں میں بہت زیادہ تھے۔ یہ عورتیں بھی نوجوانوں کی صحت کو خراب کرنے کا باعث بنتی تھیں اور بہت لوگ خفیہ امراض کا شکار ہوا کرتے تھے۔ اشتراکیوں نے آتے ہی عورتوں کے اڈے بازاروں سے اٹھوا دیئے اور اُن عورتوں کو جو محض روزی کمانے کے لئے یہ پیشہ اختیار کرتی تھیں۔ کارخانوں، فیکٹریوں اور دیگر کاموں میں لگا دیا۔ تاکہ یہ افعالِ شنیعہ ان سے چھوٹ جائیں اور مردوں کو اُن کی پالی ہوئی بیماریوں سے امان ملے۔ یہی وجہ ہے اب روس میں پہلے کی نسبت یہ امراض پندرہ گنا کم ہیں۔

حفظانِ صحت کے چند معمولی مسائل طے کرنے اور ہسپتال بنانے کے بعد اشتراکیوں نے تپ دق کے انسداد کی طرف توجہ کی۔ زاروں نے اسے بھی پھلنے پھولنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔ ان کے زمانے میں صرف چند ہی تپ دق کے ہسپتال تھے اور وہ حکومت کے خرچ سے نہیں چلتے تھے بلکہ ملک کے چند اداروں نے انہیں قائم کیا ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تپ دق سے اموات کی تعداد برابر بڑھ رہی تھی۔

اشتراکیوں نے نظامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت روس میں ایک ہزار اعلیٰ درجہ کے ہسپتال قائم ہیں۔ جن میں بیک وقت بیس لاکھ مریضوں کا علاج ہو سکتا ہے۔ تپ دق کے مریضوں کے لئے صحت افزا مقامات بھی ہیں جہاں پنتالیس ہزار مریض بیک وقت ٹھہر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ماسکو میں ۱۹۳۶ء میں ۱۹۱۴ء کی بہ نسبت جب کہ روس پہ زار کی حکومت تھی۔ تپ دق کے مریضوں کی تعداد پہلے کی بہ نسبت ۵۰ فی صدی کم تھی۔ ابھی حکومت نے اس کی روک تھام کی تدابیر ترک نہیں کیں۔ بلکہ ابھی تپ دق کے علاج کے مزید مؤثر اور سہل طریقے معلوم کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اس کام کے لئے اٹھارہ بڑے بڑے ادارے قائم ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں زار کی حکومت سارے محکمۂ حفظانِ صحت پر بارہ کروڑ اسی لاکھ روبلز خرچ کیا کرتی تھی مگر آج کل صرف تپ دق کے انسداد پر ہی دس ارب روبلز خرچ کئے جاتے ہیں غالباً اتنی بڑی رقم دنیا کی کوئی حکومت بھی حفظانِ صحت پر یا اُس کے کسی شعبے پر خرچ نہ کرتی ہوگی۔

چونکہ سوویٹ نظام مزدوروں کے بل پر قائم ہے۔ اس نے ان کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر کارخانے اور فیکٹری کے ساتھ چھوٹے چھوٹے شفاخانے بنے ہوئے ہیں جہاں فوری حادثات کے علاوہ ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے۔ ان کے کام کرنے کے اوقات مقرر ہیں۔ اور تفریح کے لئے بھی ان کو چھٹی دی جاتی ہے ہر کارخانے کے ساتھ تفریح گاہیں ہیں اور ان میں تفریح کا سامان بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں ان کے لئے آرام گاہیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ زاروں اور اُمراء کے محلات کو ایک فرمان کے ذریعے ریسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

بچوں اور صنفِ نازک کی صحت پر جتنا روپیہ یہاں خرچ کیا جاتا ہے اتنا یورپ کے کسی ملک میں خرچ نہ کیا جاتا ہوگا بیان کیا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ برطانیہ فرانس امریکہ اور جرمنی سے بھی بڑھا ہوا ہے جتنے زچہ خانے اور بچہ خانے اور عورتوں کے لئے مشورہ گاہیں یہاں ہیں اتنی تمام ممالک میں بھی نہ ہوں گی۔

جب عورت کے وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے تو اُسے زچہ خانے میں لے جاتے ہیں جہاں بچہ پیدا ہونے کے کچھ دنوں کے بعد عورت کو معمولی کے کام پر روانہ کر دیا جاتا ہے اور بچے کی حفاظت اور نگہداشت حکومت اپنے ذمے لے لیتی ہے اس سے عورت کے روزانہ کام میں بھی حرج نہیں ہوتا اور بچے کی نگہداشت بھی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔

آخری زار کے زمانے میں عورتوں کے علاج کی مشورہ گاہیں صرف نو ۹ تھیں اور بچہ گاہوں میں صرف ۵۵۰ بچوں کی نگہداشت کا انتظام تھا اور وہ بھی امراء کے بچوں کے لئے۔ مگر آج کل ان بچہ گاہوں میں جو شہروں میں ہیں ستر لاکھ بچوں کی بیک وقت نگہداشت ہو سکتی ہے علاوہ ازیں تینتالیس ہزار مشورہ گاہیں بھی ہیں اور ہر سال ان کو اور وسعت دی جا رہی ہے۔

ان بچہ گاہوں میں اعلیٰ درجہ کی دائیاں ملازم ہیں۔ بچوں کو جو دودھ پینے کے لئے دیا جاتا ہے وہ سائنٹیفک طریقوں سے صاف کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۴ء کی تمام زچہ گاہوں میں ۶۸ ہزار عورتوں کے لئے انتظام تھا مگر ۱۹۳۶ء میں ایک لاکھ نو ہزار عورتوں کے واسطے انتظام کر دیا گیا اور ۱۹۳۷ء میں حکومت نے جدید وضع کے زچہ خانوں پر پچاس کروڑ روبل خرچ کئے۔

روس کو بچوں کی صحت کا بہت زیادہ خیال ہے "سب کچھ بچوں کے واسطے" اشتراکیوں کا نعرہ ہے۔ اسی واسطے زچہ خانوں اور بچہ خانوں کے علاوہ ایسے بھی بہت سے مرکز بنائے گئے ہیں جہاں صرف بچوں کے امراض کا علاج کیا جاتا ہے اور حکومت نے بچوں کو سرکاری خرچ پر دیہات اور صحت افزا مقامات پر بھیجنے کا انتظام کر رکھا ہے ....

.... ۱۹۳۷ء میں ترسیٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ روبلز بچوں کو صحت افزا مقامات پر بھیجنے میں خرچ کئے گئے تھے۔

ان ہی حالات کے پیشِ نظر آج کل طبی سائنس کو بھی بہت زیادہ ترقی دی جا رہی ہے۔ زاروں نے اس کی طرف سے بھی غفلت برتی تھی اور ایک بار تو ایک ڈاکٹر کو دماغی امراض کے متعلق ایک کتاب لکھنے کے جرم میں قید کر دیا تھا۔

اور اس طرح اس کو اس کی خدمات کے بدلے [illegible] اس نے طب کے شعبے میں انجام دی تھیں [illegible] اکیڈمی کا ممبر بھی نہیں بنا دیا گیا تھا۔ مگر موجودہ حکومت اس سے [illegible] ڈاکٹروں کی عزت افزائی کر رہی ہے [illegible] ۱۹۴۸ء [illegible] اعلیٰ پیمانے پر [illegible] حکومت پانی کی طرح [illegible] رہی ہے اور بیماریوں [illegible] سامان صحت [illegible] رہا ہے [illegible] ۱۹۳۲ء میں حکومت نے پانچ کروڑ روبل کے خرچ سے [illegible] میں ایک [illegible] بنائی [illegible] چھ ہزار پانسو کمرے ہیں [illegible] سے بڑے [illegible] ڈاکٹر [illegible] رہتے ہیں اور ۱۹۳۲ء میں ایک [illegible] ثبوت قائم کیا گیا جہاں [illegible] کے متعلق [illegible] جاتے ہیں [illegible] دو سو سے زیادہ [illegible] علاج معالجہ کے بدلے ہیں اور ان کو مسلسل طور پر اختیار کیا جاتا ہے تاکہ [illegible] صحت کا معیار بلند کیا جائے۔

صحت کا معیار بڑھانے کے لئے [illegible] استعمال کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ [illegible] کی بات یہ ہے کہ کسی شخص کو [illegible] سے یا بہتر شراب پینے کی اجازت نہیں ہے اور نوجوانوں کو [illegible] سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

غرضیکہ حفظانِ صحت کے سلسلے میں اس وقت روس دنیا کے تمام ممالک سے بڑھا ہوا ہے اور اس سلسلے میں اس نے جو ترقی کی ہے وہ دیگر ممالک کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔

تابش صدیقی

برسات کا بلاوا

آکاش پہ اودی اودی اور سرمست گھٹائیں تیرتی ہیں
ساون کے جھولوں پر بھیگی بھیگی سی ہوائیں تیرتی ہیں
ان کالی کالی راتوں کو فردوسِ نو بنا دونا!
سلمیٰ! وہ حسیں، مہتاب آلودہ جبیں اک بار دکھا دونا!

اک کیف جہاں پر طاری ہے اک سکر فضا میں سارے ہے
اک بزمِ رامش و رنگ بپا، اک جشنِ مسرت جاری ہے
میرے بھی دلِ غم دیدہ کو مرہونِ کیف بنا دونا!
ان مست گھٹاؤں کے سایوں میں چھپ کر اک جام پلا دونا!

وہ دن کیسے رنگین تھے جب مدہوشِ عشق جوانی تھی!
جب دورِ زماں افسانہ تھا، اور گردشِ چرخ کہانی تھی!
سلمیٰ! پھر پریم کے دھیمے بہکے سے گیت سنا دونا!
پھر آرزوؤں کی سوئی ہوئی دنیا میں حشر اٹھا دونا!

کچھ شغل نہیں، کچھ کام نہیں، اب ہر دم یاد تمہاری ہے!
دن بیت رہے ہیں ساون کے، آنکھوں سے برکھا جاری ہے،
ایسے میں تو اے سلمیٰ! آ کر وہ سندر روپ دکھا دونا!
آ غم کے تلاطم میں جشنِ الفت کی نوید سنا دونا!

ساغر جلیلی

دو شعر

کسی کا کون رہا ہوں تو عمر بھر — پھر بھی!
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب — مگر پھر بھی!
ہزار بار ادھر ہی سے لوگ گذرے ہیں
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گذر پھر بھی

فراق گورکھپوری

غزل

نہ سازو مطرب، نہ جام و ساقی، نہ وہ بہار و چمن ہے باقی
نگاہِ شمعِ سحر کے پردے پہ نقشۂ انجمن ہے باقی

زمانہ گذرا اُوہ یاسمن بُو، جدا ہوئی ہم سے کنار رہو کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی

بھلا چکی دل سے شامِ غربت، ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغِ صبحِ وطن ہے باقی

حباب آسا محیطِ ہستی میں جو ہے، مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیرِ چرخِ کہن ہے باقی

مٹا دیئے بے ستونِ چرخِ کہن نے شیریں لقا ہزاروں
مگر محبت کے لب پر اب بھی ترانۂ کوہ کن ہے باقی

زمانہ بدلا، مٹی جوانی، نہ وہ محبت، نہ زندگانی۔
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگِ داغِ کہن ہے باقی

غمِ زمانہ کی تلخیوں سے ہوئی ہے پامال طبعِ اختر
نہ وہ نشاطِ کہن ہے باقی، نہ وہ مذاقِ سخن ہے باقی

اختر شیرانی

بیماری کی خبر

جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں
کچھ ماتھے کوڑھی، دیوانے آنکھوں میں سمانے لگتے ہیں
کچھ قحط زدہ بھوکے پیاسے، جاں دے دے کے خاموشی سے
دنیا میں غ[illegible]ں ہونے کی تعزیریں پانے لگتے ہیں!
کٹتے ہیں جن کے شام و سحر اک قابلِ نفرت خواری سے
جو مرتے ہیں آسانی سے اور جیتے ہیں دشواری سے
خوں چوس لیا ہے غیروں نے بیمار بھی ہیں نادار بھی ہیں
جینے کی تمنا ہے دل میں اور جینے سے بیزار بھی ہیں

اس درد کی ماری دنیا میں ایسے انساں کیوں بستے ہیں
جو ساری عمر ضرورت کی چیزوں کے لئے بھی ترستے ہیں؟
گو ایسے لوگ بھی ہیں جن کو آسائش ہی آسائش ہے
وہ سب ہے مہیا ان کے لئے جس چیز کی ان کو خواہش ہے
جن کے لئے سونا مٹی ہے جن کے لئے موتی سستے ہیں

لیکن مجبور انسانوں کو حق کیوں نہیں حاصل جینے کا؟
طوفان ہی کے قبضے میں کیوں پتوار ہے ان کے سفینے کا؟
کب تک بے بس انسان یونہی تقدیر کا رونا روئے گا
کب تک بے کچھ بھی پائے ہوئے اپنا ہی سب کچھ کھوئے گا
کب تک اندھی بھیڑوں کی طرح یہ اپنی راہ نہ پائے گا؟
کب تک یہ موت کے آگے سے پیچھے ہی ہٹتا جائے گا؟

پھر خود ہی دل بول اٹھتا ہے اب وقت بدلنے والا ہے
ذرے سورج بن جائیں گے وہ دور بھی آنے والا ہے
امید کی اک ننھی سی کرن مایوسی پر چھا جاتی ہے
اور اس کی ضو میں ایک نئی دنیا بازو پھیلاتی ہے
سوئی سی رگوں میں چبھتی ہے آنکھوں میں آنسو آتے ہیں
دل بے قابو ہو جاتا ہے جینے کی ہوس بڑھ جاتی ہے
جاں وقفِ تپش ہو جاتی ہے اور عزم بغاوت کرتی ہے
اس وقت اک سیلِ ارادوں کی سینے سے ہو کے گزرتی ہے
دنیا کو خلد بنانے کا جو دھیان سا دل میں آتا ہے
ایسی خبروں کے سننے سے وہ اور قوی ہو جاتا ہے
جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں
ہم جنگ کریں گے فطرت سے فطرت پر قابو پائیں گے
اور فطرت پر قابو پا کر اک روز امر بن جائیں گے۔

(سید) احتشام حسین

اقبال اور اُس کے نقاد

(ایک ادبی مکالمہ)

افراد:۔ اقبال۔ ماہرِ تعلیم۔ علامہ۔ پروفیسر۔ طالب علم۔

وقت:۔ آج کل کا زمانہ۔

(اقبال اپنے کچھ اشعار گنگنا رہے ہیں)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ — سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ
نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ — فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ
کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر — اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ
مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال — مقامِ شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ

ماہرِ تعلیم:۔ آخری شعر آپ نے بہت خوب کہا۔

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال — مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

آپ کی شاعری کا مقصد اس شعر سے خوب واضح ہو جاتا ہے۔ آپ نے عقل و عشق کا مقام کس خوبی سے سمجھایا ہے۔

علامہ:۔ آج کل فلسفے کا زمانہ ہے۔ ہر چیز اور ہر شخص کا فلسفہ نکالا جاتا ہے حتیٰ کہ اقبال کا شیطان، اقبال کا انسان، ان سب کا فلسفہ نکالا گیا ہے۔ اور ان ماہرِ تعلیم نے تو غضب ہی کر دیا اقبال کے کلام سے تعلیم کا ایک فلسفہ اخذ کر کے پوری ایک کتاب لکھ ڈالی۔ حیران ہوں یہ فلسفے اقبال کے ہیں یا ان حضرات کے! دیکھئے پروفیسر صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے شیطان کا فلسفہ مرتب کیا ہے۔

پروفیسر:۔ علامہ۔ اس میں آخر کیا مضائقہ ہے کہ اقبال کے کلام سے چند فلسفے مرتب کر لئے جائیں۔ انہوں نے سوائے فلسفۂ خودی کے اور کسی فلسفہ کا گو صریح اظہار نہیں کیا لیکن ان کے کلام میں بعض دوسرے فلسفوں کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ اگر ماہرِ تعلیم نے اور میں نے ایک نیا فلسفہ اقبال کے کلام سے مرتب کر لیا تو کیا غضب

ہوا؟ بہتر ہو گا اگر اقبال خود اس مسئلے پر روشنی ڈالیں۔ وہ یہاں موجود ہیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

اقبال:۔ معاف فرمائیے۔ آپ حضرات میرے گنگنانے میں خلل انداز ہوئے۔ یہ سلسلہ تو خیر اب منقطع ہو گیا لیکن آپ کی بحث بہت دلچسپ ہے۔ میں اپنا اظہارِ خیال سب سے آخر میں کروں گا۔

طالب علم:۔ دنیا کہتی ہے کہ اقبال ایک فلسفی شاعر ہے۔ فلسفہ اور شاعری تو متضاد چیزیں ہیں۔ بھلا یہ دونوں ایک جگہ کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔

پروفیسر:۔ آپ غلط سمجھے۔ اقبال کا کلام تو آبِ حیات ہے جس سے ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ تو امرت ہے جس سے روح کو بالیدگی اور دل کو توانائی ملتی ہے۔ اُن کا کلام فلسفیانہ اس نقطۂ نظر سے ہے کہ وہ زندگی کا ایک مکمل تصور پیش کرتا ہے۔ وہ پڑھنے والے کو الفاظ کی بھول بھلیاں یا تخیل کی بلند پروازی میں نہیں چھوڑ جاتا بلکہ وہ اُسے زندگی کے حقائق سمجھاتا ہے۔ اقبال کو ہم فلسفی شاعر اس نقطۂ نظر سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے زندگی کے متعلق چند نظریے پیش کرتے ہیں اور ان کا ایک مخصوص پیغام ہے۔

طالب علم:۔ ان کے نظریے کیا ہیں۔

پروفیسر:۔ ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال بھی اپنے زمانے کا ترجمان ہے۔ حالی نے قوم کا مرثیہ لکھا۔ وہ وقت مرثیہ خوانی ہی کا تھا۔ ظرافت و طنز نے اکبر کو تقریب ... دونوں کا کام دیا۔ وہ ان لوگوں پر ہنستے تھے جو مغربی تہذیب پر بڑی بڑی چوٹیں کر گئے۔ یہ بھی ان کے زمانے کا تقاضا تھا۔ اقبال نے عمل اور جدوجہد کی تعلیم دی۔ انہوں نے دوش کے آئینے میں فردا کو دیکھ لیا۔ اس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی ماضی کے شاعر ہیں، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے۔ حالی کا کلام اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ حالی کہتے ہیں

بہت سی باتیں بھول جانے کی مگر کیونکر کوئی

بھول جائے جن کے کہنے ہی وہ سب ... حالی

ہم کو بہت ... میں گذری ہیں

اٹھ رہا ہے دل سے شمع بزم کے ... دھواں

اکبر کا خیال ہے۔

نظم کرکے ہم تو یادگار انقلاب ... علم ہے ... نہیں ... ہوئی

اور اقبال فرماتے ہیں:۔

من صدائے شاعرِ فرداستم یا

دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

طالب علم:۔ اچھا پروفیسر صاحب۔ یہ تو بتلائیے ان تینوں کے مخصوص پیغامات کیا ہیں۔

پروفیسر:۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ حالی کا پیغام تھا چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی اکبر قدیم چیزوں کی طرف لوٹنے کی تلقین کرتے تھے اور اقبال ماضی و حال کے امتزاج سے ایک نئی چیز اسلامی حقائق کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ ہمارے علامہ نے تو اقبال کے علم الکلام پر ایک بسیط مضمون بھی لکھا ہے۔

علامہ۔ جی ہاں مضمون تو میں نے لکھا ہے لیکن میں کوئی فلسفہ مرتب نہ کر سکا۔ ماہرِ تعلیم کو دیکھو۔ پہلے تعلیم کے متعلق ایک فلسفہ مرتب کیا اور پھر اس پر ایک نئی کتاب انگریزی میں لکھ ڈالی۔ تعریف یہ ہے کہ اپنے دلائل کے ثبوت میں خود اقبال کے اشعار پیش کرتے ہیں۔ فرمائیے حضرت دراصل آپ کہنا کیا چاہتے ہیں!

ماہرِ تعلیم:۔ اس سے تو غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا کہ اقبال کی شاعری کا محور ان کا فلسفۂ خودی ہے۔ ان کے اور چیزوں کے متعلق مختلف نظریئے ہیں لیکن وہ سب اسی محور کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ وہ فرد کی صلاحیتوں کو ابھارنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے جدوجہد اور حرکت کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ اسے زندگی سے نفرت نہیں بلکہ محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ لفظ خودی ہمارے یہاں عموماً نخوت و غرور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خودی سے مراد خودداری نہیں بلکہ خود پسندی لی جاتی ہے لیکن اقبال کے یہاں یہ لفظ ایک مخصوص معنی میں استعمال ہوا ہے۔ وہ اس سے مراد فرد کی پوشیدہ قوتوں کو ابھارنے کی لیتے ہیں۔ خودی کی تکمیل کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں یعنی اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہیہ۔ فرد کی خودی جب جماعت کی خودی میں ضم ہوتی ہے تو اس کا دوسرا نام بے خودی ہو جاتا ہے۔ بے خودی بھی دراصل خودی ہی کی ایک کیفیت ہے اور ایک حد تک مکمل۔ میں نے اس خودی کے تصور کو تعلیم کا ایک اہم جزو قرار دیا ہے اور مثال میں اقبال کے اشعار پیش کئے ہیں کیونکہ میرا خیال ہے

رائی زورِ خودی سے پربت پربت ضعفِ خودی سے رائی

اگر ملک کے بچے اس صحیح تعلیم سے جس کا ایک اہم جزو خودی بھی ہے آراستہ ہو کر نکلیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دن پھر جائیں گے۔ غرض میں نے اپنی کتاب اس نظریئے کے ماتحت مرتب کی ہے۔

علامہ:۔ آپ ماہرِ تعلیم بھی ہیں اور ایک حد تک فلسفی بھی لیکن ان پروفیسر صاحب کو دیکھئے کہ یہ ماہرِ تعلیم تو خیر ہو سکتے ہیں لیکن فلسفی ہرگز نہیں۔ پھر بھی انہوں نے اقبال اور ابلیس کا فلسفہ مرتب کر ڈالا۔ میں نے ابلیس کے اس نئے تصور کے متعلق ان کا مضمون پہلی مرتبہ رسالہ "ہندوستان" میں دیکھا۔ واقعی انہوں نے کمال کر دیا۔ خواہ مخواہ بال کی کھال نکال کر ایک نیا فلسفہ مرتب کر لیا۔ کیا آپ اپنے فلسفے کی وضاحت کریں گے۔

پروفیسر:۔ کیا آپ کے نزدیک یہ فلسفے اقبال کے نہیں ہیں! ہم لوگوں نے محض مرعوب کرنے کے لئے گھڑ لئے ہیں۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ اقبال کے یہاں شیطان کا ایک مخصوص تصور ملتا ہے۔ وہ اسے محض بدی کی قوت نہیں سمجھتے۔ وہ اس میں جوش و حرکت پاتے ہیں۔ ان کے نزدیک شیطان ہمیشہ ترقی کی طرف گامزن رہتا ہے۔ لیکن اس کی خودی تعمیری نہیں بلکہ تخریبی ہے۔

وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا ہے۔ جمود و سکون شیطان کے لئے بے معنی لفظ ہیں۔ اکثر بڑے شاعروں کے یہاں شیطان کا ایک مخصوص تصور ملتا ہے، کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ملٹن کی "فردوس گم شدہ" کا اصل ہیرو آدم نہیں بلکہ شیطان ہے۔ گوئٹے کے "فاوسٹ" میں بھی شیطان کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ غرض شعر و ادب کا شیطان مذہب کے شیطان سے بالکل مختلف ہے۔ اقبال کے یہاں پہلی مرتبہ شیطان کا تصور "پیامِ مشرق" کی ایک نظم میں ملتا ہے۔ اس کے بعد "جاوید نامہ" میں "نالۂ ابلیس" کے نام سے فلک مشتری کے آخر میں جو نظم ہے، اُس کے مطالعہ سے یہ نظریہ اور واضح ہو جاتا ہے۔ "بالِ جبریل" میں ہمیں دو نظمیں ابلیس کے متعلق ملتی ہیں یعنی "ابلیس کی عرضداشت" اور "جبریل و ابلیس"۔ آخر الذکر نظم کا شمار اقبال کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ "ضربِ کلیم" میں بھی ابلیس کے متعلق دو نظمیں ہیں یعنی "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" اور "تقدیر، ابلیس و یزداں"۔ لیکن ابلیس کے متعلق ان کی معرکہ کی نظم "ارمغانِ حجاز" میں ہے اس کا عنوان ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"۔ یہ نظم بہت رنگین و مرصّع ہے۔ اس میں ابلیس اپنے مختلف مشیروں سے گفتگو کرتا ہے۔ مشیر اپنے شیطانی نظام کے متعلق مختلف خطرے ظاہر کرتے ہیں آخر میں ابلیس اپنا خطرہ ظاہر کرتا ہے وہ کہتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اس سلسلے میں جمہوریت، الٰہیات، کارل مارکس اور دیگر سیاسی رجحانات کی طرف جو لطیف اشارے کئے گئے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں۔ غرضکہ ہمیں اقبال کے ابلیس میں اور دوسرے شعرا کے ابلیس میں فرق کرنا چاہئے۔

طالب علم: ابلیس کی بحث کو اب ختم کیا جائے تو بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اقبال نطشے اور برگسان سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔

پروفیسر: رومی سے بھی ــــ رومی کا ایمان اور نطشے کا کفر اقبال کے لئے ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اقبال رومی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتا ہے اور نطشے کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس کا دماغ کافر ہے اور قلب مومن کا۔ نطشے کا فوق البشر اقبال کے یہاں خیر البشر ہو گیا ہے۔ نطشے اور اقبال دونوں خودی کی نشوونما کے قائل ہیں اور عیسائیت سے بیزار ہیں۔ نطشے خدا کا منکر ہے اور اقبال اس کا قائل، وہ نطشے سے خطاب کرتا ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے۔

رومی اور اقبال دونوں اسلامی شاعر اور مفکر ہیں۔ دونوں ارتقاء کے قائل ہیں۔ دونوں وحدت الوجود کے نظریے کے خلاف ہیں۔ دونوں کے یہاں سکون اور جمود موت کے مترادف ہے دونوں فرد کی خودی کو ابھارنا چاہتے ہیں۔ اقبال رومی سے بہت متاثر ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا ذکر بڑے ادب سے کرتا ہے۔ برگسان کا زمان و مکان کا نظریہ بھی اقبال کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن صحیح طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کہاں تک متاثر ہوئے ہیں اقبال یورپ کے قیام میں برگسان سے فرانس میں ملا اور اس بڈھے فلسفی نے اقبال سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ برگسان بذاتِ خود اقبال سے بہت متاثر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے تخیل کی بلند پروازی معلوم کرنے کے لئے ہمیں بعض دوسرے فلسفیوں پر بھی نظر ڈالنا پڑے گی۔

طالب علم: لیکن اُن کا اثر اقبال پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

پروفیسر: اثر تو کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ لیکن اقبال کی نظر ان فلسفیوں کے فلسفہ پر بھی ہے۔ وہ ان کے فلسفوں کی خوبیاں اور خامیاں اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ہم اس سلسلے میں کانٹ، ہیگل، شوپنہار وغیرہ کا نام لے سکتے ہیں۔

علامہ: آپ دونوں حضرات رومی کو چھوڑ کر بقیہ مشرقی مفکرین کو بالکل نظر انداز کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ مجدد الف ثانی۔ محی الدین ابن عربی اور ابن خلدون کے فلسفے بھی اقبال کی نظر میں تھے۔ ہم مغربی فلسفہ کے جوش میں اُن کے نام بالکل بھول جاتے ہیں۔

پروفیسر: آپ نے درست فرمایا۔ "ضربِ کلیم" میں تقدیر پر جو نظم ہے وہ محی الدین ابن عربی سے ماخوذ ہے۔ ان مفکرین کے علاوہ کچھ شاعروں کا بھی اقبال پر اثر پڑا ہے

طالب علم: کن شاعروں کا اقبال پر اثر پڑا ہے؟

پروفیسر: یہ اثر دو طرح کا ہے۔ ایک اسلوبِ بیان پر اور دوسرا تخیل پر۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ داغ اور غالب کا اثر ایک حد تک اقبال

کے سامنے پیش کیا اور کہتے ہیں کہ غنی کاشمیری کا اُن کے تخیل
پر بہت اثر ہے۔ اسلوب اور بیان کو ایک دوسرے سے علیحدہ
کرنا مشکل ہے۔

طالب علم: میں اقبال، حالی اور بیدل سے متاثر نہیں ہوئے ہیں
پروفیسر: حالی و اکبر سے متاثر ضرور ہوئے ہیں لیکن بیدل سے کوئی نہ
تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف کا خیال ہے کہ اقبال نے شکوہ و جواب
شکوہ حالی کے مسدس سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ بانگ درا
کے آخر میں جو کلام ہے کہ دو ایک زعفران زار کی خوشہ
چینی نہیں تاہم ایسے اثرات پیدا ہوئے اور ختم ہوگئے ہیں۔ یہاں
تک کہوں گا کہ غالب اور حالی کا اثر بھی کچھ زمانے بعد ختم ہوگیا
غنی کاشمیری بھی کچھ عرصہ تک سامنے رہے۔ گوئٹے
پیام مشرق تک اقبال کے ہم سفر رہے۔ البتہ رومی وہ شاعر
ہے جس نے اقبال کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ رومی کے متعلق جو
اشعار جاوید نامہ اور بال جبریل میں ہیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
علامہ: رومی اور نطشے کا اثر اقبال پر نمایاں ہے لیکن میرے خیال میں
رومی کا اثر اقبال پر اسرار خودی کی اشاعت کے وقت سے شروع
ہوا ہے اور نطشے کا اثر تو غالباً اُن کے قیام ولایت کی پیداوار ہے
پروفیسر: مناسب ہوگا اگر ہم اقبال کے ذہنی ارتقا پر ایک سرسری نظر
ڈال کر ان کی شاعری کے ادوار مقرر کرلیں۔ تمام مؤثرین اور شعرا کے
اثرات کا زمانہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔ لیکن یہ مسئلہ ذرا پیچیدہ
ہے۔ بہت ممکن ہے یہاں ہم میں سے ہر ایک اقبال کی شاعری
کے مختلف دور قائم کرے۔ ان ماہر تعلیم نے اقبال کی شاعری
کا عمیق مطالعہ کیا ہے میں ادوار کے متعلق ان کی رائے معلوم
کرنا چاہتا ہوں۔
ماہرِ تعلیم: جہاں تک میں نے اس مسئلے پر غور کیا ہے میرا خیال ہے کہ
اقبال کی شاعری کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور
ابتدا سے ۱۹۰۵ء تک جیسا کہ بانگ درا میں ہے۔ دوسرا دور
۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک۔ یہ اُن کے قیام ولایت کا زمانہ
ہے۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۲ء تک سمجھنا چاہئے اُن کی
مشہور نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر، والدہ مرحومہ
کی یاد میں، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام اور فارسی مثنویاں اسرار و رموز
اسی دور کی پیداوار ہیں۔ چوتھا دور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک ہے۔
اس دور کا بیشتر کلام فارسی میں ہے اور اردو کے مجموعہ کلام یعنی
بال جبریل میں بھی فارسی نظموں اور غزلوں کا چربہ اتارا گیا ہے۔
اقبال کا خیال دوسرے مفکرین کے متعلق اور مغربی سیاست
کے متعلق اُن کی رائے ہمیں پہلی مرتبہ واضح طور پر اسی دور کی
نظموں سے معلوم ہوتی ہے۔ پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ،
مسافر اور بال جبریل اس دور کی اہم تصانیف ہیں۔ شیطان کا
نظریہ بھی پہلی مرتبہ اسی دور میں ملتا ہے۔ پانچواں دور ۱۹۳۵ء
سے ۱۹۳۸ء تک ہے۔ اس میں ہمیں اقبال کے تھکے ہوئے
ذہن کے چند نقوش ملتے ہیں۔ وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی
طرح جو ایک مرتبہ گولی کھا چکا ہو اپنے دشمن یعنی مغربی تہذیب و
معاشرت پر حملہ کرتا ہے اور اس کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ ضرب کلیم
کی نظموں میں وہ ہمیں بنی اسرائیل کے کسی پیغمبر کی طرح دکھائی دیتا
ہے جو اپنی گمراہ قوم کو نصیحت کر رہا ہے۔ اس دور کی تصانیف
ضرب کلیم، پس چہ باید کرد اور ارمغان حجاز ہیں۔
علامہ: مجھے اس تقسیم سے اتفاق نہیں۔
پروفیسر: میں نے اسی لئے کہا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک اقبال کی شاعری
کے مختلف دور قائم کرے گا۔ اچھا آپ کی رائے میں کتنے دور
ہونا چاہئیں۔
علامہ: کیا ضرورت ہے کہ بانگ درا کے تینوں دوروں کو برقرار رکھا
جائے۔ ہم ابتدا سے ۱۹۰۸ء تک پہلا دور قائم کرسکتے ہیں۔
اس دور کی ممتاز خصوصیات وطنیت اور منظر نگاری ہیں۔ "نیا شوالہ"
"تصویر درد" اور قیام ولایت کی تمام نظمیں اس کی ترجمانی کرتی ہیں۔
دوسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس
دور کی مشہور نظمیں شکوہ، جواب شکوہ اور شمع و شاعر ہیں۔ اُن
کے تصور خودی کا آغاز شمع و شاعر سے جو ۱۹۱۲ء کی تصنیف ہے
ہو جاتا ہے۔ تیسرا دور میرے خیال میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۲ء
تک قائم ہونا چاہئے۔ اس دور کی اہم خصوصیت اُن کا تصور خودی
ہے۔ وہ محدود وطنیت کے بجائے ایک عالمگیر اسلامی تصور
کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اُن کی مشہور مثنویاں اسرار و رموز اس
دور کی پیداوار ہیں۔ چوتھا دور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک

ہونا چاہیئے۔ اس دور میں ہمیں اقبال کی بعض اہم تصانیف ملتی ہیں مثلاً خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، مسافر اور بالِ جبریل۔ یہ اقبال کی شاعری کے شباب کا زمانہ ہے۔ اُن کے بعض اہم نظریے ہمیں اسی دور میں ملتے ہیں۔ ان کا شاہکار "جاوید نامہ" بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ اس دور میں گیارہ سال کے بعد اقبال کا دوسرا اردو مجموعۂ کلام بالِ جبریل منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اردو داں حضرات کو پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کا لطف بالِ جبریل کی نظموں میں آ گیا۔ پانچواں دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۶ء تک ہونا چاہیئے۔ دراصل یہ ضربِ کلیم اور دوسری مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کا دور ہے۔ مغربی تہذیب کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا ہے۔ چنانچہ "ضربِ کلیم" کے سرورق پر یہ اشعار درج ہیں۔ ؎

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

"پس چہ باید کرد" میں بھی مغربی تہذیب کی خامیاں اُجاگر کی گئی ہیں۔ چھٹا اور آخری دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک ہے۔ اس دور کو صرف "ارمغانِ حجاز" کے لئے قائم کرنا پڑا۔ یہ کتاب اقبال کی آخری یادگار ہے اور اپنے رنگ میں بھی اُن کی دوسری تصانیف سے مختلف ہے۔ وہ اسے ساتھ لے کر حج بیت اللہ کو جانا چاہتے تھے لیکن بیماری نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کتاب کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور آخر میں سو صفحات کے قریب متفرق اردو نظمیں ہیں۔ فارسی میں رباعی کا پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اردو کے حصے میں اُن کی بعض نظمیں اردو داں طبقہ کو ہمیشہ یاد رہیں گی مثلاً ابلیس کی مجلس شوریٰ، مسعود مرحوم، ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض، سر اکبر حیدری کے نام، حسین احمد وغیرہ وغیرہ۔

پروفیسر: میرے خیال میں آپ نے بہت زیادہ دور قائم کر دیئے۔ ہم اقبال کی شاعری کو صرف تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ کیا مضائقہ ہے اگر ایک دور میں متعدد خصوصیات موجود ہیں۔ ان کے ذہنی ارتقا اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے یہ دور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں پہلا دور ابتدا سے ۱۹۱۲ء تک ہونا چاہیئے۔ اس دور کی خصوصیات وطنیت، منظر نگاری اور لفظ تراشی ہیں۔ وطنیت پر ہمالہ، کنارِ راوی، نیا شوالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور تصویرِ درد ان کی بہترین نظمیں ہیں۔ منظر نگاری اور لفظ تراشی کے نمونے اس دور کی تقریباً ہر ایک نظم میں کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں۔ دوسرا دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۳ء تک ہے۔ اس دور کی ممتاز خصوصیات اُن کا تصورِ خودی اور ان کا مستقل طور پر فارسی میں اشعار لکھنا ہے۔ ان کی تمام اہم فارسی تصانیف اس دور کی پیداوار ہیں۔ ۱۹۱۲ء سے انہوں نے مثنوی "اسرارِ خودی" لکھنا شروع کر دی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں یہ مثنوی پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ "رموزِ بے خودی" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ پیامِ مشرق ۱۹۲۴ء میں، زبورِ عجم ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں، جاوید نامہ ۱۹۳۲ء میں اور مسافر ۱۹۳۳ء کی پیداوار ہے۔ تیسرا دور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک سمجھنا چاہیئے۔ اس دور میں اقبال نے "بانگِ درا" کی اشاعت کے گیارہ سال بعد پھر اردو کی طرف رُخ کیا۔ بالِ جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ ضربِ کلیم ۱۹۳۶ء میں اردو داں طبقہ کے ہاتھوں میں پہنچی۔ لیکن فارسی کلام کا سلسلہ اب بھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" اور "ارمغانِ حجاز" اقبال کی آخری فارسی تصانیف ہیں۔ شاعر کہیں مغربی تہذیب کی دھجیاں اُڑاتا ہے اور کہیں ابلیس کی مجلس شوریٰ منعقد کر کے مغربی سیاست پر رائے زنی کرتا ہے۔ بالِ جبریل کی غزلیات اس کی شاعری کا نچوڑ ہیں۔ ارمغانِ حجاز میں اگر ایک طرف وہ مسعود مرحوم کا مرثیہ لکھتا ہے تو دوسری طرف کشمیر پر اُس کے اشعار پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ غرض یہ دور اپنی گوناگوں رنگینیوں کی وجہ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ میرے خیال میں اقبال کے ذہنی ارتقا کی یہ تینوں ادوار اچھی طرح ترجمانی کرتے ہیں۔

طالبِ علم: جہاں تک اقبال کے ذہنی ارتقا اور ان کے کلام کے ادوار کا تعلق تھا میرے خیال میں سیر حاصل بحث ہو چکی۔ اب اس سلسلے میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن مجھے ابھی اقبال کے متعلق چند اور باتیں کرنا ہیں۔

ماہرِ تعلیم: فرمائیے، لیکن بحث طویل ہوتی جاتی ہے۔

علامہ: اعتراضات بہت سے ہو سکتے ہیں۔ آپ صرف اہم اعتراضات

بیان کیجئے۔

پروفیسر:۔ جواب نہایت مختصر دیئے جائیں گے۔

طالب علم:۔ اقبال ایک اسلامی فاشسٹ ہے۔

علامہ:۔ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ دنیا کے تمام امراض کا علاج اسلام میں پاتے ہیں۔ وہ اسلامی جمہوریت کے قائل ہیں۔

طالب علم:۔ وہ وطنیت کے دشمن ہیں۔

ماہر تعلیم:۔ محدود وطنیت کبھی اچھے نتائج نہیں پیدا کر سکتی۔ اقبال جغرافیائی حدود، وطن، رنگ اور نسل کا قائل نہیں لیکن اُسے اپنے وطن سے محبت ضرور ہے۔ بانگِ درا کی نظموں سے قطع نظر ضربِ کلیم میں "شعاعِ اُمید" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ وطن سے اس کی محبت کو اچھی طرح ظاہر کرتی ہے۔

طالب علم:۔ ان کے بعض اشعار میں زبان کی غلطیاں ملتی ہیں۔ جو نئے الفاظ انہوں نے وضع کئے ہیں اکثر جگہ محاورات کا خیال نہیں رکھا اور بعض جگہ کلام میں رنگینی بالکل مفقود ہے۔ ان کے کلام میں بعض جگہ تضاد پایا جاتا ہے۔

پروفیسر:۔ ہر بڑے شاعر کے یہاں افکار زبان پر غالب آجاتے ہیں۔ وہ زبان کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ زبان اس کی محکوم ہوتی ہے۔ نئے الفاظ وضع کرنے سے زبان کو وسعت ہوتی ہے۔ محاورہ اور بندش پر اعتراض کرنے کا زمانہ اب ختم ہو گیا۔ اقبال کے کلام میں رنگینی ملتی ہے۔ لیکن یہ رنگینی نگاہ پر اثر کرنے کے بجائے دل اور دماغ پر اثر کرتی ہے۔ اگر ان کے کلام کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ محض سطحی طور پر دیکھنے والوں کو تضاد ملتا ہے ورنہ در اصل تضاد نہیں۔ بالِ جبریل میں وہ مسولینی کی شخصیت کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ضربِ کلیم میں جبشہ کے فتح کرنے پر وہ اُسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ایک جگہ وہ مسولینی کو بحیثیت انسان کے پیش کرتے ہیں اور دوسری جگہ بحیثیت فاتح کے۔ ہمیں ان دونوں باتوں میں امتیاز کرنا چاہئے۔

طالب علم:۔ میرے ابھی چند اعتراض اور باقی ہیں لیکن بہتر ہے کہ اقبال اب کچھ فرمائیں۔

اقبال:۔ میں نے آپ حضرات کی گفتگو غور سے سنی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میرے کلام کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ آپ حضرات نے فرمایا کہ میرا خاص نظریہ خودی کا تصور ہے۔ میں نے اپنے اس نظریے کی مختلف جگہ پر وضاحت کی ہے آپ اُسے ملحوظ رکھئے۔ اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ دیکھئے۔ پیامِ مشرق کا دیباچہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خودی کا تصور مجھے اس درجہ عزیز تھا کہ میں نے بیشتر اپنے اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اگر فرد اپنی خودی پہچان لے تو وہ کل کائنات کو تسخیر کر سکتا ہے۔ لیکن یکجہتی و اتفاق بھی اُس کے ساتھ اہم ہے۔ اور فرد قطرے کی طرح دریا کے باہر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا قوم میں ضم ہو جانا نہایت ضروری ہے۔ اس طرح بے خودی بھی خودی کی ایک شکل ہو جاتی ہے مجھ پر بہت سے اعتراضات کئے گئے ہیں بعض کا جواب آپ حضرات نے دے دیا ہے۔ میں اس سلسلے میں صرف اس قدر کہوں گا کہ اگر لوگ میرے خطبات اور ان خطوط کو جو میں نے بعض اصحاب کو ان کے سوالات کے جواب میں وقتاً فوقتاً لکھے تھے اور جو مختلف رسالوں میں شائع ہو گئے ہیں نظر میں رکھیں تو پھر یہ اعتراضات پیدا نہیں ہوتے۔ میں نے اس خوابیدہ قوم کو اپنے اشعار سے جگانے کی کوشش کی اور تھوڑا بہت کامیاب بھی ہوا۔ لیکن ابھی اُس نے اپنی خودی کو نہیں پہچانا ہے اور جد و جہد اور حرکت میں زندگی کے راز کا پوشیدہ ہونا نہیں سمجھا ہے۔ جس وقت اُس نے یہ سمجھ لیا میرا کام پورا ہو جائے گا۔ آپ حضرات نے جو تعلیم اور شیطان کے متعلق فلسفے وضع کئے ہیں گو میں نے صریحاً اس کا اظہار کہیں نہیں کیا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان چیزوں کے متعلق میرا نظریہ تقریباً یہی تھا جو آپ پیش کرتے ہیں۔ آپ نے اچھا کیا کہ ان کو واضح طور پر بیان کر دیا۔ دنیا ہر چیز کو دیکھتی ہے، سوچتی سمجھتی ہے، اور تنقید کے آئینے کے سامنے اس کے اصل خد و خال دیکھنے کے لئے مضطرب رہتی ہے۔ لیکن ایک کامیاب موجد یا شاعر اکثر اپنا کام کر جاتا ہے۔

(ریڈیو)

مبشر علی صدیقی

چار نظمیں

شگفتِ گل

دخترِ صبحِ بہار ہو کے چند سے ہمکنار
قُربِ غنچہ سے اُٹھی کیا خبر کیا کہہ گئی ؟
غنچہ کچھ کہنے کو تھا
مسکرایا، کھل پڑا !

تجربۂ ناگوار

مجبور کیا میں نے! اک بوسہ لیا میں نے!
ایسی مرے ہونٹوں کو محسوس ہوئی خنکی
گویا مری عذرا تھی
مُورت کوئی پتھّر کی !!

شُکر

جب کھینچ کے آہِ سرد، کہتا ہے کوئی بندہ
جس حال میں بھی رکھے، سو شکر ہے اللہ کا !
میں سوچنے لگتا ہوں
یہ شکر کیا اس نے یا طعنہ دیا اس نے
رزّاقِ دو عالم کو!

واردات

کیا کہوں تم سے میں اپنی واردات !
بارہا ایسا ہوا ،
میں نے کی ہنسنے کی کوشش اِس قدر
چیخ کر میں رو پڑا !!

سعید احمد اعجاز

انتشار

بادِ بہاری ہو گئی رخصت   اب ہے خزاں کا دورِ حکومت
موت کا ہر سُو ہے سنّاٹا   اک بے لذت راگ ہے دنیا
آؤ میرے محبوب آؤ   میرے دل کے مطلوب آؤ
ہم تم ویراں باغ میں چل کر
سوگ کریں گے اس کا دن بھر
آؤ میری رانی آؤ   عمر ہے تھوڑی جلدی آؤ
آؤ کہ ہم تم اپنے   جامِ حیات کیف آور کے
عشق و الفت کی صہبا سے
پُر کر لیں جتنا جی چاہے
آؤ کہ مل کر اب ہم اور تم   راہِ طلب میں ہو جائیں گم
دن جا کر جب رات آتی ہے   اور جب ظلمت چھا جاتی ہے
تب سطحِ بامِ گردوں پر   آتا ہے مہتابِ منور
آؤ میرے دوست کہ باہم
آج کریں حل رازِ یہ تم — ہم
مہرِ عالمتاب کی کرنیں   اور مہ کی رنگین شعاعیں
آپس میں کیوں ملتی نہیں ہیں   وہ جو کہیں ہیں تو یہ کہیں ہیں
آؤ میرے دوست کہ باہم   آج کریں حل رازِ یہ تم — ہم
لیکن اے محبوب تمہارے
عارض پر یہ آنسو کیسے؟

علی احمد بی اے

کھلونے

تاریکی

شام کے دھندلکے میں کسی نے کسی کے شانے کو چھوا تو کوئی تڑپ کر مڑا۔

"تم!"

"جی! — خاکسار!"

"تم یہاں کیوں آئے؟"

"آپ اس قدر پریشان کیوں ہو گئیں؟ چلئے۔ بنچ پر تشریف رکھئے باتیں اطمینان سے ہو سکتی ہیں۔"

"میرے سوال کا جواب دو۔"

"کیا میرے آنے سے آپ کے کسی پروگرام میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے؟"

"میں پوچھ رہی ہوں تم یہاں کیوں آئے؟"

"کیا مجھے اب اتنا بھی حق حاصل نہیں رہا؟"

"کیسا حق؟"

"شاید آپ بھول چکی ہیں اور گواہ چاہتی ہیں۔ تو لیجئے۔ ذرا ان خاموش درختوں ہی سے پوچھئے۔ جنہوں نے آپ کو بنفس نفیس میری معیت میں اکثر یہاں دیکھا ہے۔ اس گھاس ہی سے دریافت کیجئے جس کے اوپر آپ کے اور میرے پاؤں کئی بار گذر چکے ہیں۔ جب آپ اپنے حسین جسم کی رعنائیوں کو مجھ ناچیز کا سہارا دے کر چلا کرتی تھیں! یہ بھی نہیں تو اس آسمان سے ہی پوچھئے جس کے نیچے آپ نے صدہا بار اسی بنچ پر بیٹھ کر اپنی گداز باہوں کو میری گردن میں ڈال کر میٹھی میٹھی سرگوشیاں کی ہیں اور یہ تاریکی جو لحظہ بہ لحظہ گہری ہوتی جا رہی ہے، یہ بھی تو شاہد ہے! اور سب سے بڑھ کر یہی وقت جس کے سینکڑوں لمحات نے آپ کو اور مجھے......"

"یہ سب فضول باتیں ہیں اور بالکل مہمل۔ کیونکہ ان کا اس ماضی سے تعلق ہے۔ جب میں نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل نہ تھی۔ میں تو صرف یہ پوچھتی ہوں کہ تم آج اس وقت یہاں کیوں آئے ہو جب کہ میں نے تمہیں کئی بار — کئی بار —"

"کئی بار کیا، ہزار بار، ہزار طریقوں سے ظاہر کیا ہے کہ آپ کو میری حقیر ہستی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی! یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ؟ مگر ذرا سوچئے تو سہی۔ کیا شمع کی بھسم کر دینے والی آنچ سے ڈر کر پروانے شمع کے پاس جانا چھوڑ دیتے ہیں؟"

"پھر وہی بے معنی الفاظ!"

"بجا فرمایا آپ نے۔ شمع کے نزدیک پروانے کی تڑپ اور بے قراری بے معنی ہوا کرتی ہے۔ اتنی بے معنی کہ وہ بے چارہ وہیں جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔"

"کیوں مجھے ناحق حیران کرتے ہو؟ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"اُف کتنی بے خبری! مگر میں گلہ کیوں کروں۔ شکر نہ کروں کہ آخر آپ نے یہ پوچھنا گوارا کر ہی لیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ آپ کے دہنِ شیریں سخن سے یہی الفاظ سننے کے لئے تو میں بے تاب تھا۔ مگر آپ نے اب بھی ایک چیز سے مجھے محروم ہی رکھا۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا خاکسار کا نام آپ کے لبوں پر ایک بار بھی نہ آئے گا؟ ایک وہ زمانہ تھا جب آپ ہی کے قول کے مطابق یہ نام آپ کے ہر سانس کے ساتھ وابستہ تھا۔!"

خاموشی۔

"تو میں یہ سمجھ لوں کہ اس کی حسرت ہی رہے گی؟"

خاموشی۔

کہا کہ مجھے اتنی تو اجازت مل جائے کہ میں آپ کا محبوب نام
اپنے ہونٹوں تک لے آؤں"
[illegible] جو کچھ کہنا ہو کہہ چلو
تاکہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] آپ کی۔
[illegible]
آپ ہی بتائیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] آپ [illegible]
اپنے آپ کو غلط [illegible] ہیں [illegible] میری لغو بات ہو یہ ممکن ہے
کہ میرا قیاس یا اندازہ غلط ہو اور آپ [illegible] کہ [illegible] کر رہی ہوں
مگر سچ پوچھیں تو مجھے یہ کھیل پسند نہیں۔ کیا آپ اپنا دل بہلانے کے لئے کوئی اور
کھلونا تلاش نہ کر سکیں گی؟
کھلو ——— نا!
زاہدہ! کیسے فتی ہو! میں ہوش میں ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا جو
تم نہ سمجھ سکو۔ غور سے سن لو شاہد سے مجھے ایک خاص قسم کا لگاؤ ہے۔ وہ ابھی
تک دنیوی آلائشوں سے پاک ہے اور اپنی خوبیوں سے بے بہرہ۔ اسی لئے
گھمنڈ کا اس میں شائبہ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ اور شاید تم بھی ——— کہ
اس میں وہ تمام جوہر موجود ہیں جو اس کی آئندہ زندگی کو شاندار بنا سکتے ہیں۔ صرف
ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ اس کی زندگی کا نازک پودا جو آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے
ابھی سے نہ کچلا جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا جادو اس پر نہ ڈالو۔
جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ابھی کچھ زیادہ بگڑا نہیں
اگر تم اس کا خیال ترک کر دو تو۔۔۔۔
"بس۔ بس۔ تم حد سے بڑھے جاتے ہو۔ بات کرنے کا موقع دیا تو اپنے
آپ کو بھول گئے اور میرے ہی سامنے کھڑے ہو کر اتنی جرأت کہ میرے نام، بلکہ
میرے خاندان کے نام پر بٹہ لگانے لگے۔ اتنی جرأت کہ مجھے ایک عام۔۔۔"
توبہ۔ توبہ۔ یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟ قطع کلامی معاف۔ بھلا میں اور
ایسی بے ادبی؟ میری کیا مجال کہ آپ کی شان میں ایسے گستاخانہ خیال کو بھی اپنے
دماغ میں جگہ دوں اور پھر آپ کے در دولت پر کھڑے ہو کر! دیکھئے میں اس
کمپاؤنڈ سے آپ کے عالی شان بنگلے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے بیش قیمت
اور رنگین پردے بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ کونے والا کمرہ جس کی کھڑکیوں پر
انگاروں کی طرح چمکتے ہوئے سرخ رنگ کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور جن
میں سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی ہے، میں جانتا ہوں وہ آپ ہی کا کمرہ
ہے، مطالعے کا کمرہ، جہاں کچھ عرصے سے میرے دوست شاہد ایک معلم کے
فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں ———"
آپ کی معلومات واقعی وسیع ہیں۔ مگر آپ میرے حال پر کرم فرمایئے
اور آپ تشریف لے جایئے"
یعنی اپنا مدعا بیان کئے بغیر؟
تو گویا آپ کی یہ تمام باتیں محض تمہیدی جملے تھے اور مدعا ابھی باقی ہے!
آپ برہم نہ ہوں۔ لیجئے میں مختصراً کہے دیتا ہوں۔ آپ نے فلسفے کے
مضمون میں رہبری کے لئے ایک معلم کی خدمات حاصل کیں۔ یہاں تک تو
ٹھیک ہے۔ مگر آپ کی نظر انتخاب شاہد پر کیوں پڑی؟ یہ مسئلہ ذرا غور
طلب ہے!
"تمہیں دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کا کیا حق
ہے؟
"وہی جو آپ کو کسی ناتجربہ کار انسان کی پرسکون زندگی میں ایک
عارضی جذبے کی تکمیل کے لئے ہلچل پیدا کرنے کا"
"یہ سراسر جھوٹ ہے"
"زاہدہ! ذرا میری آنکھوں سے آنکھیں ملاؤ۔ میرا نام عاقل ہے۔ تم
عاقل کی آنکھوں میں دھول نہیں ڈال سکتیں۔ تم فلسفے کا مطالعہ نہیں کرتیں۔ تم
فلسفۂ عشق کا سبق دے رہی ہو!
"یہ بہتان ہے! تم اس کے لئے پچھتاؤ گے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ چلے
جاؤ پیشتر اس کے کہ ———
"کہ آپ اپنے وفادار کتوں کو بلا کر میری تواضع کریں یا کسی تنومند ملازم کو
دروازے تک میری رہنمائی کے لئے میرے ساتھ بھیجیں! مگر مجھے یقین ہے کہ
آپ کی تہذیب آپ کو ایک مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی کبھی اجازت
نہ دے گی اور پھر شاہد کی کہانی تو کتوں کے بھونکنے یا دو انسانوں کے چند
نازیبا حرکتیں کرنے سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے"
کہانی! ——— نہیں۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ جاؤ۔ چلے جاؤ!

دیکھا! میں جانتا تھا کہ جہاں عورتوں کو کہانیوں میں حصّہ لینے کے بعد کہانیاں سننے کا بہت شوق ہوتا ہے تو آپ کیوں اپنے آپ کو اس کہانی سے جبراً محروم رکھنا چاہتی ہیں! چلو۔ میرے کہنے سے ہی سُن لو زاہدہ! میں سچ کہتا ہوں شاہد کی تخلیق کا قصّہ نہایت دلچسپ ہے۔"

"تخلیق؟"

"ہاں تخلیق! کیا تم یہ سمجھ بیٹھی ہو کہ وہ شاہد جسے آج کل اپنی قسمت پر ناز ہونا چاہئے ہمیشہ ایسا ہی تھا جیسا تم اُسے اب پاتی ہو؟ زاہدہ! تمہیں جانتے ہوئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم اس کو ایک سال پہلے دیکھ پاتیں تو اُسے راستے میں پڑے ہوئے سنگ ریزے سے زیادہ قابلِ التفات نہ سمجھتیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت ایک سنگتراش ایسا مجسمہ بنا ڈالتا ہے جس کی تمام تر خوبیاں اُس کی تحسین میں نگاہیں بھی نہیں دیکھ سکتیں!"

"اِس میں سنگتراشی کا کیا دخل ہے؟ کیا تم مجھے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر قصداً یہاں روکنا چاہتے ہو! میں اب ——"

"کتنی بے صبر ہو تم۔ زاہدہ؟ جب کہانی میری توقعات سے بھی بڑھ کر دلچسپ ہونے لگی تو تم ایسے بے بنیاد وہم میں مبتلا ہو گئیں۔ ذرا سنو تو سہی! سنگ تراشی کا ذکر یہاں ناگزیر ہے۔ جب آج سے ایک سال قبل شاہد سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ دیکھنے میں بالکل ایک گنوار معلوم ہوتا تھا۔ مگر مجھے جلد ہی محسوس ہونے لگا کہ اس سنگِ ناتراشیدہ میں کئی جوہر چھپے ہوئے ہیں۔ میں اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگا۔ اس دلچسپی کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ اُس زمانے میں میں برنارڈ شا کا مطالعہ کر رہا تھا اور اُس کا ڈرامہ "پگمیلین" پڑھ چکا تھا۔ شاید تم نے بھی پڑھا ہو۔ نہیں؟ خیر۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ تو اس ڈرامے میں ایک شخص۔ غالباً ایک پروفیسر۔ ایک ایسی لڑکی کو جو جاہل مطلق تھی اور شہر کے گلی کوچوں میں مختلف قسم کی اشیاء فروخت کر کے گذر اوقات کرتی تھی مہذب بنانے کا تہیہ کرتا ہے۔ اس پروفیسر کا دعوےٰ تھا کہ وہ ایک قلیل عرصے کی محنت کے بعد اُس لڑکی کو اونچے سے اونچے طبقے کی سوسائٹی کا ایک درخشاں رُکن بنا ڈالے گا۔ یہ دعوےٰ یہاں تک سچ ثابت ہوا کہ ایک وقت وہی جاہل لڑکی غلطی سے ایک نواب کی بیگم سمجھی گئی۔ میں اس ڈرامے سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ میں نے پوشیدہ طور پر خود ایک تجربہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ میں شاہد میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا۔ میرا کام پروفیسر کی نسبت آسان تھا کیونکہ شاہد میں قابلیت تو پہلے ہی تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ خارجی طور پر بھی مجھ جیسا ہی بن جائے۔ رفتہ رفتہ میری صحبت نے رنگ لانا شروع کیا۔ ایک ایک کر کے اُس میں تبدیلیاں ظاہر ہونے لگیں۔ اُسے لباس پہننے کا ڈھنگ آگیا۔ اُس کی حرکات میں وہ پہلی جھجک جاتی رہی۔ تہذیب یافتہ سوسائٹی میں وہ نہ صرف گفتگو کرنے کے قابل ہو گیا بلکہ اُس کے طرزِ کلام میں ایک دلکش بے تکلفی اور بے باکی پیدا ہو گئی اور لطف یہ کہ اُس کی جیب پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑا! میں خود حیران رہ گیا۔ ایک بے ڈھب پتھر میں سے ایک خوبصورت مجسمہ نکل آیا۔ میرا تجربہ کامیاب رہا۔ مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کامیابی اتنی عظیم الشان ہے۔ اس کا ثبوت تم نے دے دیا!"

"میں نے؟ کس طرح؟"

"ہاں بوجھ کر بھولی نہ بنو زاہدہ! تم ہی نے تو آخر اس مجسمے میں وہ خوبیاں پائیں جنہیں اُس کے بنانے والے کی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ لیکن جن کی تم پرستار بن گئیں۔ مگر اُس میں ایک خامی باقی ہے جو تمہاری نگاہوں سے بچ گئی۔ اس خامی کا صرف سنگتراش ہی کو علم ہے!"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ اس مجسمے سے آپ کے ہر اشارے کی تعمیل نہ ہو سکے گی۔ بلکہ —— معاف کیجئے —— آپ کے ایک ادنیٰ انداز کی بھی اُس طور سے داد نہ دے گی جو ایک سیم و زر سے کھیلنے والی عورت کے دل کو مرغوب ہے۔ کیونکہ یہ مجسمہ اندر سے کھوکھلا ہے۔ اس مسئلے پر غور کر لیجئے۔ اور یہ غضبناک نگاہیں مجھ پر نہ ڈالئے۔ میں اپنا فرض ادا کر چکا۔ یہ لیجئے میں جاتا ہوں۔ آداب عرض!"

زاہدہ غصّے سے بیدِ مجنوں کی طرح کانپتی ہوئی ابھی وہیں کھڑی تھی کہ بڑے دروازے سے آواز آئی۔

"اور ہاں! ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ اگر آپ کبھی اس بچارے کے ساتھ بھلائی کرنے کے خیال سے یا ایک کھوکھلے مجسّمے کی بجائے کسی ٹھوس چیز پر نظرِ التفات ڈالنے کی غرض سے اُسے آزادی دینا چاہیں تو خاکسار کے حقوق کو نظر انداز نہ کیجئے گا۔"

. . . .

روشنی

کسی نے اُس کی پکار نہ سُنی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا دن کے وقت رات ہو گئی ہے اور سب گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ہیں۔ شاہد نے آخری

واقعہ دروازے کی چٹخنی کو پکڑ کر دروازہ اندر کی طرف کھینچنے کی کوشش کی مگر بے سود
دروازہ کھلا تھا نہ کھلا۔ ستم ظریفی کسی کی!
تھک ہار کے آخر اپنے آپ کو زبردستی آرام کرنے کے سپرد کر دیا
اور فوراً ہی ناک میں انگلی ڈالی۔ ہم میں جا کے یہ سوٹ ... جب
دروازہ ہی ---
باہر سے ایک ... سنائی دی ... لیے ... مسکرا اور ساتھ
ہی ننھے ہاتھوں میں ایک بنڈل تھامے اندر داخل ہوا
... میں ... جیسے ... کہ ... اگر یہ ...
میں ... تو ہم اس وقت ... جاتے ... ہوتے ...
کام رہ جاتا ... کوئی تبدیلی ہو
جائے ... راستے ...
شاید ... ہو کر ... کے ... مطالعہ کر رہا تھا۔
زندگی ... آخر وہ کون ... ضروری
ہم تھا ہمیں نے آپ کے دماغ کو ... کرنے کی یہ انوکھی ترکیب بتائی!
دیکھئے۔ یہاں ... آپ کا ... کے ...
... سے نکالی گئی تھی قطع و برید کر ڈالا!
... دوست ... بات ... ہی سے
لگائی جا سکتی ہے آخر ہم کس لئے ہیں اگر یہ کام ... کیا جا سکتا تھا!
تو پھر ... !
بالکل۔ کیا جناب ... آج کیا ... ہے!
کیوں ... بارہ نومبر ہے۔
ٹھیک بارہ نومبر تو مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر ... آخر تمہارے
دماغ کو ہوا کیا ہے جو ایسی معمولی بات بھی ---
ٹھہرو! ٹھہرو! یاد آ گیا۔ آج ہماری پیدائش کا دن یعنی برتھ ڈے
ہے۔ یہی تھا نا تمہارا مطلب؟
اور کیا میں کوئی آسمانی مطلب تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں۔ سنبھالو یہ
اپنا بنڈل!
برتھ ڈے کا تحفہ! یہ قید تو بہت مفید رہی!
تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم کسی کو اذیت پہنچانے کے لئے قید کریں گے!
اب ذرا اکھولو تو اسے!
... سوٹ! ... کیا یہ تمہیں کیا سوجھی!

کیا آپ کو سادگی کی توقع تھی!
دو قہقہے۔
ارے! یہ اس کے اندر کیا ڈال لائے ہو؟
ایک موٹے لٹھے کا پاجامہ، دوسرا ایک کھردرا سا لمبے کالر کرتہ۔ سوٹ
بہت آپ کے کہنہ مشق درزی کے ہاتھوں سے سلے ہوئے!
اس مذاق کا مطلب!
مذاق۔ کیا آپ کو اپنے زمانۂ سلف سے کوئی دلچسپی نہیں رہی!
بالفاظِ دیگر ان کو بھی برتھ ڈے کا تحفہ سمجھوں؟
ٹھیک سمجھے آپ! اگر دونوں تحفوں میں سے انتخاب کرنا ہوگا!
انتخاب! بھئی خوب سوجھی اور ہم نے بھی انتخاب کر لیا!
تو سوٹ لو گے یا ---
بس! بس! ہمارے انتخاب میں یا کے لئے جگہ ہی نہیں۔ ہم
دونوں لیں گے۔
بہت سیانے ہو سو کیا پہنو گے بھی دونوں! پاجامے کے اوپر
پتلون اور ---
جی نہیں! پہنا جائے گا صرف سوٹ!
اور یہ کیا سا کرتہ اور پاجامہ؟
انہیں نہایت احترام و احتیاط کے ساتھ طے کر کے ایک بکس کی
گہرائیوں میں جو پہلے سے مقرر کر لی گئی ہوں گی لٹا دیا جائے گا اور وقتاً فوقتاً
یعنی جب کبھی ہمیں اپنے زمانۂ سلف کی یاد بہت ستائے گی تو دل کو ڈھارس
دینے کے لئے ان کی زیارت کر لی جایا کرے گی۔ کیوں کیا خیال ہے؟
خیال ... ہے۔ بتوں کا ذکر بھی اور خدا کی یاد بھی۔ دونوں باتیں ہو
جائیں گی! مگر آج یہ نیا سوٹ ہی پہن کر نکلنا۔ خصوصاً جب شام کے وقت
پڑھانے جاؤ!
یہ تخصیص کس لئے؟
تمہارے بھلے کی بات کہتا ہوں۔
اجی جناب! میں ٹھہرا موٹی عقل کا آدمی اور آپ باتیں کرنے لگے معقول
میں۔ ذرا سمجھائیے تو سہی کہ وہاں یہ سوٹ پہن کر جانے میں میری کیا بھلائی
ہو گی۔ اور کیونکر؟
خدا کسی کو موٹی عقل نہ دے! لو! ہم چلتے ہیں اور آپ بھی جہاں جانا
چاہتے تھے تشریف لے جائیں۔ مگر ایک بات یاد رکھنا کبھی کبھی مجھے

حل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے اور مزیدار نتائج برآمد ہُوا کرتے ہیں۔"

. . . .

پھر تاریکی

"کاش آج چاندنی رات ہوتی!"

"پھر کیا ہوتا؟"

"ہم دونوں اس سنسان کوٹھی سے بہت دور دریا کی رقص کرتی ہوئی نقرئی لہروں پر ایک چھوٹی سی ہلکی پھلکی کشتی میں بیٹھے کسی سمت بہے جا رہے ہوتے اور چاند کے سوا ہمیں کوئی اور دیکھنے والا نہ ہوتا۔"

"دیکھنے والا تو یہاں بھی کوئی نہیں۔ سب کچھ دیکھنے گئے ہیں اور نوکروں کو میں نے باہر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ البتہ چاند نہیں!"

"ہے تو، مگر صرف ایک! چاندنی رات ہوتی تو دو ہوتے اور میں اُس آسمانی چاند سے مخاطب ہو کر کہتا کہ دیکھ۔ ذرا زمین کے چاند کی طرف دیکھ! کیا اب بھی تجھے اپنی تابانی پر ناز ہے؟"

"پھر لگے شاعروں کی سی باتیں بنانے؟"

"یہ تو آپ ہی کا قصور ہے! آپ کیوں مجھ پر مہربان ہوئیں؟"

"تو لو میں الگ منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ہوں!"

"نہیں! نہیں! یہ ظلم نہ کرو زاہدہ! خدا جانے کتنی صدیوں کے بعد مجھے یہ لمحات نصیب ہوئے ہیں! میرے قریب ہی رہو تا کہ مجھے پختہ یقین ہو جائے۔"

"یقین؟"

"ہاں یقین! مجھے اب تک شبہ ہے کہ میں عاقل نہیں اور نہ تم زاہدہ ہو۔ بلکہ ہم دونوں کوئی اور ہستیاں ہیں جنہیں میں کسی بھولے بسرے مگر شیریں زمانے کے زاہدہ اور عاقل سمجھ رہا ہوں!"

"یہ کیا فلسفہ ہے؟"

"فلسفہ نہیں۔ زاہدہ! میری قلبی کیفیت کی ایک جھلک ہیں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک کھوئی ہوئی عزیز چیز واقعی واپس مل گئی ہے۔ زاہدہ! ایک بار مجھے عاقل کہہ کر تو پکارو تمہارے لبوں سے یہ لفظ سن کر میرا شک رفع ہو جائے گا۔"

خاموشی۔

"زاہدہ!"

"عاقل!"

تاریکی کا پردہ تاریک تر ہو گیا۔ مگر یہ دونوں وقت کی رفتار سے بے خبر بنچ پر پہلو بہ پہلو بیٹھے رہے۔ اس طرح کہ زاہدہ کا سر عاقل کے شانے کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

"کیا یہ واقعی سچ ہے۔ زاہدہ؟"

"بالکل!"

"اور تم اب ــــ اُس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو گی؟"

"پرانی باتوں کا ذکر کیوں چھیڑتے ہو؟"

"مگر کم از کم مجھے ایک بات تو بتا دو"

"کیا؟"

"تم شاہد سے یکایک کنارہ کش کیوں ہو گئیں؟"

"تم نے جو کہا تھا کہ وہ مجسمہ اندر سے کھوکھلا ہے!"

"تمہیں کیونکر معلوم ہوا؟"

"مجھے اس کا ثبوت مل گیا۔"

"وہ کیسے؟"

"ایک شام وہ ایک بالکل نیا سوٹ پہن کر آیا۔ بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔"

"زاہدہ ــــ!"

"یعنی اُس وقت!"

"تم نے کیا کیا؟"

"میں نے سنگتراش کے شاہکار کا اندرونی حصہ دیکھنے کا ارادہ کر لیا۔"

"اور کامیابی ہوئی؟"

"ہاں! میں نے کہا مجھے اسی وقت دس دس کے دو نوٹ درکار ہیں۔ کسی وجہ سے ابا سے نہیں مانگ سکتی۔ ایک ہفتے تک واپس کر دوں گی۔"

"خوبصورت عیار!"

"محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ پسینہ پونچھنے لگے اور کہا۔ کاش کہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کر سکتا۔ مگر یہاں تو تن کے کپڑے بھی تحفۃً پائے ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ مجسمہ واقعی کھوکھلا ہے۔ میں نے یہ بھی پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ تحفہ کس کی فیاضی کا ثبوت تھا!"

"اس کے بعد؟"

"چند ہی دنوں میں مجھے فلسفے کے مضمون سے کوئی دلچسپی نہ رہی اور اسی لئے مجبوراً معلم کو بھی زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا!"

"اچھا! خوش قسمت تھا؟"

"[illegible] طلب ہے!"

"اچھا [illegible] بہت [illegible] ہوئے دو [illegible] کرتے ہوں گے [illegible] اتفاق [illegible] نے یوں ہی ایک [illegible] کہا کہ جب وہ آپ کو [illegible] جائے تو وہی [illegible] ایک [illegible] اسی [illegible] لئے آمادہ نہیں ہوتی کہ کوئی عاقل [illegible] مضمون سے کچھ بھی دلچسپی ہو بالکل اس مضمون سے [illegible] ہے!"

"اور خوش قسمت کیوں!"

"اس لئے کہ وہ اسیری جس سے اب [illegible] جدا [illegible] کامل آزادی مل چکی ہے اس کے سوا حق حاصل نہ تھی۔ ایسی اسیری کے لئے قدرت نے مجھ جیسے لوگ [illegible] مخصوص کئے ہیں!"

"یعنی میں جیلر ہوئی اور آپ میرے قیدی! دلچسپ کھیل ہے!"

"نہیں۔ یہ الفاظ تو میں نے محض [illegible] کے لئے استعمال کئے تھے۔ درحقیقت آپ اس دور کی ایک شمع ہیں اور خاکسار اس عہد کا ایک حقیر پروانہ!"

"پھر وہی بے تکی باتیں!"

"بے تکی نہ کہو [illegible] یہ تو میرے دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں اور اتنے ہی سچے جتنی یہ حقیقت کہ تم اب [illegible] میں تمیز کرنے کے قابل ہو!"

"یہ آخری الفاظ تو شاید میں نے پہلے بھی کہیں سنے ہیں!"

"سنے ہوں گے! مگر ہم کیوں ان بے کار باتوں کے جنگل میں پھنس کر وقت گنوائیں۔ یہ لمحات تو بہت قیمتی ہیں!"

اور رات کی بے پناہ تاریکی میں دو چہرے ایک ہی چیز کی تلاش میں ایک دوسرے کی طرف جھکے . . .

. . . .

انور اعجاز قیصر

غزل

اب کے جنوں میں چاکِ گریباں نہ ہو سکا
کچھ اہتمامِ جشنِ بہاراں نہ ہو سکا

جینا طویل خوابِ پریشاں نہ ہو سکا
خوش ہوں کہ دل کے درد کا درماں نہ ہو سکا

راہِ درازِ عمر اسیری میں کٹ گئی
لیکن دماغ عادیِ زنداں نہ ہو سکا

حق بینیِ نگاہ کے قربان جائیے
خاشاک پر گمانِ گلستاں نہ ہو سکا

شکرِ جفائے یار سے فرصت نہیں ملی
دل وقفِ شکوہ سنجیٔ دوراں نہ ہو سکا

سکندر علی وجد

ایک گیت کے دو بھاؤ

ایک ہلکی جھلک ہی نظر آئی تھی دُور سے جس کی من موہنی ہو گئی ہے،
رات چھائی ہوئی تھی اندھیری مگر چاند نکلا ہے اور چاندنی ہو گئی ہے؛
دل کے آکاش پر کالی، کاجل سی کالی گھٹا نے ہی قابو جما یا ہوا تھا،
چھٹ گئی ہے گھٹا، ہٹ گئی ہے گھٹا، نور چھننے لگا، روشنی ہو گئی ہے۔
دل میں سویا تھا احساس جو روپ کا جاگ کر پریم کا راگ بننے لگا ہے،
آج تک آگ دل میں دبی تھی مرے، آج سے درد کی راگنی ہو گئی ہے۔

(۲)

کیسی دنیا ہے! اِسکھ سیج سپنا ہی، سیج کانٹوں کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی،
دل میں راحت کی اُمید کیسے پلے! زندگی بھی مجھے جانکنی ہو گئی ہے۔
ایک چاہے، نہ چاہے اُسے دوسرا، اِس کا انجام نفرت میں ظاہر ہوا ہے،
وہ محبت بھی اب تو بدل ہی گئی، کب محبت رہی؟ دشمنی ہو گئی ہے۔
زہرِ غم کو یہ ہر کوئی کہتا تھا رگ رگ میں نشتر کی مانند جا کر بسے گا،
روگ چاہت کا میٹھا ہے کیسا کہ تلخی بھی اب شہد کی چاشنی ہو گئی ہے۔
جی میں کہتے تھے تم سے ملیں گے کبھی، دل پہ گذری ہے جو وہ کہیں گے سبھی ہم
گفتنی تھی، مگر اب کہیں تم سے کیا، اپنی حالت ہی ناگفتنی ہو گئی ہے۔

میراجی

جھوٹ

میں نے اظہر کو بلا کر کہا "اظہر تمہارے ماسٹر صاحب شکایت کرتے ہیں کہ تم بہت جھوٹ بولتے ہو" اظہر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے اپنی معصوم سی ڈری ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا "نہیں ابا جی میں تو جھوٹ نہیں بولتا —— پر ابا جی ماسٹر [illegible]" اس چھوٹے سے لڑکے نے جھوٹ کا تمام فلسفہ بیان کر دیا۔ یعنی مخصوص حالات میں جھوٹ ایک کار آمد چیز ہے جو زیادہ تر اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ [illegible] عقل میں بچوں پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ماں کی محبت کو حاصل کرنے کے لئے رونا، روٹھنا، ضد کرنا اور اپنا [illegible] بہت مفید ہے۔ اسی طرح کسی روز ان پر یہ انکشاف بھی ہو جاتا ہے کہ ابا کی جھڑکیوں اور ماسٹر کی مار پیٹ سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا بہت ضروری ہے۔ [illegible] ایجاد ہے جو عام لوگوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

حسین عورتوں اور بڑے سیاست دانوں نے جھوٹ کو آرٹ کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ غالباً اس لئے کہ انہیں جھوٹ بولتے ہوئے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ عورتوں کے لئے گھر گرہستی کی زندگی میں جھوٹ ایک ایسی ہی آرام دہ چیز ہے جیسے خانہ داری کی اور چھوٹی موٹی چیزیں۔ مثلاً چوکی، پنکھا، پیالہ یا دست پناہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ نمائشی جھوٹ بھی ہوتے ہیں جو ان کے لئے ایک خوبصورت ساڑی یا کاجل اور پاؤڈر کا کام دیتے ہیں۔ وہ جھوٹ کی مدد سے صرف اپنا بچاؤ ہی نہیں کرتیں بلکہ دوسروں کو مغلوب کرنے کے لئے بھی کئی دلچسپ اور انوکھے جھوٹ ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ جھوٹ سی دلچسپ اور رنگین ایجاد کے لئے ہم سب کسی عورت کے مرہونِ منت ہیں۔

اتنا جھوٹ بولنے کے باوجود بھی مرد ابھی تک اپنی دروغ گوئی میں وہ لطافت نہیں پیدا کر سکے جو ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے ایک سرسری جھوٹ میں پیدا کر لیتی ہے۔ شاید اس لئے کہ مرد بہت سوچ بچار کے بعد جھوٹ بولتا ہے حتیٰ کہ اُس کے جسم کا بند بند یہ جان لیتا ہے کہ ابھی ایک جھوٹ بولا جائے گا۔ اس طرح یہ راز اُس کے تمام جسم میں مشتہر ہو جاتا ہے اور عورت پر جھوٹ بولتے ہوئے ایک بے خودی کی سی کیفیت چھا جاتی ہے جیسے وہ کوئی شعر کہہ رہی ہو۔ اس لئے اُس کے جھوٹ کو سوچ بچار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

شاید آپ نے بھی کبھی جھوٹ بولنے کی کوشش کی ہو اور یہ محسوس کیا ہو کہ بولتے ہوئے دل یوں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ کہہ رہا ہو "بھئی تم جانو تمہارا کام، میں اس بات میں دخل نہیں دیتا" آنکھیں بے قصور بھول جاتی ہیں کہ ان حالات میں انہیں کس قدر کھلا رہنا چاہئے اور کدھر دیکھنا چاہئے۔ ہاتھ حیرانی میں شانوں سے نیچے یوں آوارہ لٹکتے ہیں گویا وہ کسی لامتناہی خلا میں آویزاں ہوں۔ اس وقت آواز بھی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی۔ گویا کوئی درد بھرا گیت رکتے ہوئے سروں میں گایا جا رہا ہو اور جسم کی نس نس اُس کو جھٹلانا شروع کر دیتی ہے۔ "جھوٹ! جھوٹ!" اس کے باوجود اگر کوئی ہمارے جھوٹ کو سچ مان لے تو یہ اُس کا حسن اعتقاد ہے۔

شاید آپ نے بھی یہ محسوس کیا ہو کہ ہم صرف زبان ہی سے جھوٹ بول سکتے ہیں اور وہ بھی صرف لفظوں کی مدد سے۔ ہمارے باقی اعضا اُس وقت ہمارے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتے۔ اکثر تو وہ زبان کی اس دیدہ دلیری سے پریشان ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی نیکی یا بزدلی سے زبان کو جھٹلانا شروع کر دیتے ہیں۔

میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے اس قدر پریشانی اور پشیمانی ہوتی ہے کہ معاً میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اب کے اس خفت سے بچ جاؤں تو اپنے گزشتہ گناہوں سے توبہ کر لوں اور باقی عمر اللہ کی یاد میں بسر کر دوں۔ شاید اسی ڈر کے مارے میں زیادہ تر جھوٹ بولنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ یعنی راست گوئی میرے لئے ایک ناخوشگوار مجبوری ہے اور اس لئے زندگی ایک خشک اور پھیکی سی حقیقت۔

اس کے برعکس کسی کے جھوٹ پر ایمان لانے کے متعلق —— آپ مجھ سے کتنا بڑے سے بڑا جھوٹ بھی بولیں، میں آپ کی بات پر سچے دل سے ایمان لے آؤں گا۔ بولتے ہوئے چاہے آپ کا دل اپنی دھکا دھک سے کچھ ہی کیوں نہ کہے۔ منہ پر ایک رنگ آئے اور ایک رنگ جائے،

آنکھیں بھینچی رہیں یا پھٹی ہوئی۔ میں آپ کی بات تسلیم کر لوں گا۔ چونکہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرنے کی مجھے عادت ہی نہیں ہے۔ پھر کبھی کسی وقت بیٹھے بٹھائے میرے دل میں یکلخت یہ خیال آئے گا کہ اس روز آپ نے میرے روبرو جھوٹ بولا تھا۔ صریحاً جھوٹ تھا یعنی بالکل جھوٹ۔ سفید جھوٹ، اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر ٹوپی سر پر رکھوں، گھر سے نکلوں اور آپ کو کان سے جا پکڑوں اور صاف صاف کہہ دوں "اس روز آپ نے مجھ سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ شاید آپ کا خیال ہے کہ میں ابھی بچہ ہوں اور جھوٹ، سچ کو سمجھ نہیں سکتا"۔۔۔۔ پھر اٹھنا ٹوپی سر پر رکھنا اور اتنی دور چل کر جانا یہ تمام کام محض اپنی فہم رسا کے ثبوت اور آپ کو ہدایت دینے کے لئے!۔۔ اس خیال کے آتے ہی پھر بیٹھ جاتا ہوں اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔

اگر جھوٹ بولنے اور جھوٹ پر ایمان لانے میں لوگ مجبور واقع ہوئے ہوں۔ تو یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم سب فطری طور پر راست گو ہیں۔ البتہ ہم جھوٹ پر ایمان لا سکتے ہیں۔ یعنی انسان فطرتاً کافر نہیں بلکہ مومن جانور ہے اور ہماری منجملہ مشکلات کی وجہ ہماری دروغ گوئی نہیں بلکہ خوش اعتقادی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں ہمیشہ سے یہی تلقین کی گئی کہ جھوٹ نہ بولو۔ یہ نہیں کہ جھوٹی باتوں پر ایمان نہ لاؤ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ پیغمبر کو جس نے انسان کو جھوٹ سے پرہیز کی تلقین کی، بنات خود لوگوں کے حسن ایمان یا خوش اعتقادی کی ضرورت تھی یا شاید اس لئے کہ اس کا خیال تھا کہ اگر سب لوگ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں تو جھوٹی بات کا وجود ہی نہ رہے گا۔ اور جھوٹ پر اعتقاد کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا بہر صورت انہیں یہ خیال نہ آیا کہ یہ بات ایک اگر پر موقوف ہے اور ہر حرف شرط ایک نہ سلجھنے والا تانا بانا ہے اس کے علاوہ وہ یہ قطعی بھول گئے کہ جھوٹ نہ بولنے کی تلقین سے پیشتر یہ اشد ضروری ہے کہ لوگوں میں سچی بات سننے اور برداشت کرنے کی ہمت پیدا کر دی جائے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ ہم سب بے حد خوش اعتقاد واقع ہوئے ہیں تو ظاہر ہے کہ خوش اعتقادی ہمارے لئے مفید ہے۔ کیونکہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ انسان سا عقلمند جانور کسی غیر مفید بات کو پلے باندھ لے۔ یعنی ہم صرف اُن باتوں پر ایمان لے آتے ہیں جن سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے یعنی اعتقاد یا ایمان بنفسہٖ ہمیں قبول نہیں جب تک کہ وہ ہمیں خوشی نہ بخشے یعنی ہم کسی کی بات پر اعتبار نہیں کرتے بلکہ خوش کن اعتباروں کو اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہم صرف وہی جھوٹ بولتے ہیں جو ہمارے لئے خوش کن ہوں۔ اس لئے عام طور پر اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ میرے روبرو جھوٹ بول رہے ہیں تو میرا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی بات مجھے اچھی نہیں معلوم ہو رہی یعنی میرے اکٹھے کئے ہوئے اعتقادات کو جھٹلا رہی ہے یا میرے مطلب کے مطابق نہیں۔

اگر آپ مجھ سے کچھ کہیں تو میرا اُسے تسلیم کر لینا یا نہ کرنا آپ کے بیان کی سچائی یا جھوٹ پر مبنی نہیں۔ اگر آپ کوئی جھوٹ بول کر مجھے خوش کر دیں تو میرے نزدیک آپ ایک راست گو ہوں گے یعنی جھوٹ اور سچ بذات خود ہمارے نزدیک دو غیر ضروری اور مہمل باتیں ہیں۔

مجھے اکثر اپنے بزرگوں کی کئی ایسی باتیں سننی پڑتی ہیں جو میرے اپنے خیالات کے بالکل برعکس ہوتی ہیں اور میں اُن باتوں کے دوران میں "جی ہاں ٹھیک ہے، بالکل درست" کہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ اُس وقت میں وہ باتیں انہیں کے نقطۂ خیال سے سنتا ہوں۔ یعنی اگر بات سننے والا سنانے والے کے نقطۂ خیال سے سُنے تو جھوٹ کا وجود ہی نہیں رہتا اور یہ دنیا اور زندگی چند ساعت کے لئے جھوٹ اور سچ کی مصنوعی بندش سے بلند ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس وقت بیٹھے بٹھائے مجھے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ درحقیقت میں اُن بزرگوں کے نقطۂ خیال سے قطعی بیگانہ ہوں اور وہ خوش کن "جی ٹھیک ہے۔ بالکل سچ" صرف اس لئے میری زبان سے نکل جاتے ہیں کہ اُن کی مدد سے میں اپنے بزرگوں پر واضح کر سکوں کہ دیکھا میں کیسا سمجھدار آدمی ہوں!

عام طور پر چار قسم کے جھوٹ بولے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ جنہیں بولتے ہوئے بولنے والے کو واضح طور پر اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایسے جھوٹ اکثر اپنے بچاؤ، مطلب براری، اپنی آن قائم رکھنے کی غرض سے یا کسی ذاتی فائدے کے لئے بولے جاتے ہیں۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب باتیں حقیقتاً اپنے بچاؤ ہی کے لئے ہوتی ہیں۔ یہ جھوٹ مرد عام طور پر زیادہ بولتے ہیں۔ دوسرے وہ جھوٹ جو تفریحی بولے جاتے ہیں اور بولنے والے کو قطعی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا اگر ہو بھی تو ایک دھندلا سا شک ہوتا ہے جو اُس کی نفسی کیفیت پر کوئی اثر نہیں رکھتا۔ ایسے جھوٹ صرف عورت ہی بول سکتی ہے۔ اور صرف یہی جھوٹ آرٹ کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ عورتوں کے علاوہ شاعر، مصور اور دیگر آرٹسٹ بھی اس قسم کے جھوٹ بولنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان لوگوں میں عورت کا عنصر غالب

ہوتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر جسم میں عورت اور مرد خلط ملط ہو رہے ہیں۔ اور اکثر ایسے مرد دیکھنے میں آتے ہیں جن میں بڑی بڑی اور مونچھوں کے باوجود ایک عورت بھی رہتی ہوتی ہے۔

دوسری قسم کے جھوٹ وہ جھوٹ ہیں جنہیں بولتے ہوئے ہمیں پختہ یقین ہوتا ہے کہ ہم حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں اور ہمیں ... ہوتی ہے ... سیدھی بات ... سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ اس قسم کے جھوٹ بولنے سے ... اور یہی جھوٹ ... آپ ... اور ... بول چال ... جھوٹ ہی ... جھوٹ عام طور پر جاہل لوگ ... بولتے ہیں

چوتھی ... جھوٹ بولتے ہیں ... کو خوش رکھنے کے لئے ... مذہب اور ... مطابق بولتے ہیں ... اپنے متعلق پروپیگنڈا ... زندگی میں سب ...

... کے علاوہ ... جب ہمیں کوئی کام ... بیٹھے ہوئے اپنے آپ سے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ مجھے ... کی عادت ہو چکی ہے ... دیکھتا ہوں تو ... سمجھتا ہوں کہ ... لندن سے سڈنی تک کا سفر ... گھنٹے میں طے کر کے ریکارڈ ... ہے۔ پھر میری سائیکل ... ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ ... لوگ منہ اٹھا کر ... رہے ہوتے ہیں ... ہندوستانی ہوا باز کی ریکارڈ توڑنے والی پرواز کی خوشی میں ... اور تانگے چلتے پھرتے ہیں۔ لوگ یوں خوش نظر آتے ہیں گویا وہ ... ہوئے ہوں۔ تانگے والے ... جانا بھول ... راستہ صاف کرنے میں مصروف ہیں ...... البتہ جب میں ... جاگ پڑتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کسی دن یہ ہوائی سواری مجھے کسی لاری کے نیچے نہ کچل دے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ لندن سے سڈنی تک پرواز کرنا آخر خطرے سے خالی تو ہے نہیں البتہ مجھے اس خیال سے بے حد دکھ ہوتا ہے کہ کسی روز اگر میں مر جاؤں تو لوگ سمجھیں گے کہ ایک سائیکل سوار اپنی ... کی وجہ سے لاری کے نیچے آکر مر گیا۔ بے چاروں پر کوئی اس حقیقت کے ظاہر کرنے والا نہ ہوگا کہ وہ بظاہر سائیکل سوار در حقیقت وہ مشہور ہوا باز ہے جو چوبیس گھنٹے میں لندن سے سڈنی تک پرواز کرتے ہوئے اپنے جہاتی جذبے کی نذر ہو گیا۔

میں نہیں جانتا کہ اپنی اس ریکارڈ توڑنے والی ہوا بازی سے میرا مطلب کیا ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میری سائیکل اتنی پرانی ہے کہ چلتے ہوئے اس میں سے کئی ایک دلچسپ قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ خود یوں جھولتی ہے کہ اس پر بیٹھ کر لوگوں کو اپنی طرف دیکھنے اور گھورنے سے باز رکھنا ممکن نہیں اور چونکہ مجھ میں ایسی نگاہوں کے برداشت کرنے کی ہمت نہیں اس لئے میں نے خیال ہی خیال میں اُسے ایک ہوائی جہاز بنا لیا ہے یا یوں کہئے کہ میں اُس سائیکل پر بیٹھنے سے بچنے کے لئے ہوا بازی کا عادی ہو چکا ہوں یعنی اپنے بچاؤ کے لئے میں اپنے آپ سے یہ معصوم اور خوش کن جھوٹ بولتا ہوں جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے اس بات کا خیال آتا ہے۔ تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دنیا میں سب جھوٹ بولنے والے لوگ کس قدر رحم کے قابل ہیں۔ گویا وہ سب لولے لنگڑے اپاہج ہیں جو اپنے ہونے، جینے یا چلنے پھرنے کے لئے سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں، جو ان سہاروں کے بغیر چل پھر بھی نہیں سکتے۔ اس وقت مجھے اُن لوگوں پر بے حد غصہ آتا ہے جنہوں نے ہمارے دل میں جھوٹ اور جھوٹوں کے لئے اس قدر نفرت پیدا کر دی ہے۔

میری اس اوپر کی مثال سے ثابت ہوا کہ اکثر ہمیں اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا حقیقت میں ایک ایسی ٹیڑھی کھیر ہے جس کا نہ سر نہ پیر اور جس میں ہماری کوئی وقعت ہی نہیں تو ہمارا دل یوں بیٹھ جاتا ہے جیسے لامحدود گہرائیوں میں ڈوب رہا ہو اس وقت اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہمیں چند ایسے خوش کن اعتباروں کی ضرورت پڑتی ہے جو ہمیں تسلی دے سکیں اور جن کے سہارے سے ہماری اپنی شخصیت کی اہمیت پیدا ہو۔ اُنہی خوش کن اعتقادوں سے جنہیں عام طور پر ذاتی لاگ لگا کہا جاتا ہے ہماری دنیا قائم ہے۔ اور انہیں کی مدد سے ہم میں احساس انفرادیت پیدا ہوتا ہے یعنی ان کو اکٹھا کر لیا جائے تو یہ ایک "میں" بن جاتے ہیں۔ اگر "میں" کا احساس نہ ہو تو دنیا بکھر کر اک طوفان بد تمیزی ہو جائے۔ فطرت نے ہمیں یہ "میں" کا احساس دے کر زندگی کو زندگی بنا دیا ہے یعنی اس "میں" کے پردے میں فطرت خود چھپی بیٹھی ہے اور ہماری فطری جھوٹ نوازی ہی کی وجہ سے ہمارے لئے اندھیرا اندھیرا اور اجالا اجالا ہے تو ظاہر ہوا کہ ہماری خوش اعتقادی ہماری مشکلات کی وجہ نہیں بلکہ ہمارے لئے زندگی ہے! "میں" ہے!

یہ ہے عالی شان فلسفے کے خیالی ایوان جو انسان نے تعمیر

کئے ہیں۔ یہ مصوری کے شاہ کار یہ حسین مجسمے یہ سب رنگین جھوٹ نہیں تو کیا ہیں! اور وہ دو رنگین ستون جن پر ہماری زندگی کا انحصار ہے یعنی عورت اور تخیل وہ بھی تو محض رنگین جھوٹ ہیں اور اس لامتناہی کائنات کے دیوانہ کن پھیلاؤ میں خدا کا تخیل جو اسے محدود کرکے اس کی ابتدا اور انتہا کو قائم کرتا ہے اور اس نفسا نفسی اور بے ترتیبی میں نظام پیدا کرکے ہمارے لئے ایک تسلی کا باعث ہے وہ!———!

ممتاز مفتی

بیٹے کی موت

چشمِ معصوم طلبگارِ مدد تھی ہم سے
ہائے ہر موئے بدن چیخ اُٹھا اس غم سے
پھینک دیتی ہیں دوزخ میں قضا اُس کے عوض
ہم کو مقبول تھا ہر درد و سزا اُس کے عوض
بے بسی! حیف یہ انسان کا انساں ہونا
دی جو توفیق تو اتنی کہ پریشاں ہونا
درد ہی درد ہے اب درد کا یارا نہ رہا
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا نہ رہا
غم یہ وہ غم ہے کہ جس غم کی کوئی تھاہ نہیں
اس کی گہرائی سے خود ڈوب کے آگاہ نہیں
دل کو ٹھہراتے ہیں مدہوش کہ ٹھہرے بارے
اضطراب اور بڑھا سعیِ سکوں کے مارے

سنت پرشاد مدہوش

نامعلوم سرزمین کا سفر

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے
کس نے جھانکا ہے مجھے رات کی خاموشی میں
کروٹیں لیتی ہوئی دل میں تمنا سی ہے
یا کسی خواب کی آغوش سے بیدار ہوئی
حسرتِ مردہ میں جاں پڑ سی گئی
روحِ پُرنور کی نیندوں کا سماں طاری ہے

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے
کس نے جھانکا ہے مجھے رات کی خاموشی میں
بربطِ کاہکشاں پر کس نے
غم میں ڈوبا ہوا اک نغمۂ الفت گایا
اور غمِ عشق کو بیدار کیا
ایک عرصہ ہوا دل جس کو بھلا بیٹھا تھا
اور میرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا
اُس کی جانب سے مجھے دعوتِ عشق آئے گی

سسکیاں بھرتے ہوئے جن کے شبستانوں سے
بارہا لذتِ دیدار سے ناکام پھرے
اور اُسے اپنی جوانی کے حسیں خوابوں میں
یہ بھی معلوم کبھی ہو نہ سکا
اس کے ایوان کے تاریک و جواں سائے میں
سسکیاں بھرتا ہوا شاعرِ غمگین و نزار
اپنی ناکام جوانی کو لٹا بیٹھا ہے
آج اُسی نے مجھے پیغامِ وفا بھیجا ہے۔

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے
اُس نے دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا ہے۔
میں ہوں کہ جوشِ مستی میں سراپا کھو کر
دوشِ پرمست ہواؤں کے اُڑا جاتا ہوں۔
کسی گمنام سی اقلیمِ مسرت کی طرف

تابش صدیقی

کالج — گھر تک

میرا کالج تین بجے بند ہوتا ہے۔

دس بجے سے اِس وقت تک کلاسوں میں لیکچر سننا، اور خالی گھنٹوں میں بنچوں پر پہلو بدلنا، ہاتھوں سے چہرہ رگڑنا، ماتھا سہلانا، انگڑائیاں لے لے کر کوفت دور کرنے کی کوشش کرنا ہی کچھ کم تھکا دینے والا نہیں ہوتا، اور اوپر سے آخری گھنٹے میں اقتصادیات کی کلاس، اور لیکچرار صاحب کی بھدی، موٹی اور تھکی ماندی آواز اس احساس کو اور بھی تیز کر دیتی ہے۔ کلاس سے نکل کر قدم آہستہ آہستہ بے ترتیبی سے پڑنے ہیں، سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوتا ہے، اور کتابیں نیچے ہاتھوں میں لٹکی ہوتی ہیں۔ سڑک پر پہنچ کر اس خستگی میں کچھ کمی ہوتی ہے، اور پہلی دفعہ محسوس ہوتا ہے کہ اب کل دس بجے تک کے لئے آزادی ہے۔ یہاں میں لمبا سا سانس لیتا ہوں، اور پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ سامنے اقتصادیات کا کمرہ نظر آرہا ہے۔ میں فوراً گزرتے ہوئے تانگوں اور سائیکلوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔

مجھے جانا تو ہوتا ہے ڈیڑھ میل، اور گرمی کا گرم سورج میرے ننگے سر کے ساتھ کچھ بہت زیادہ خوش سلوکی سے پیش نہیں آتا۔ مگر پھر بھی میں قدم بڑھانے کی کوشش نہیں کرتا —— نہیں کرنا چاہتا۔ آخر یہی گھنٹے میں یہی تو وقت ہوتا ہے جب سکون کے ساتھ کسی بات پر غور کیا جا سکے۔ صبح سے اُٹھ کر پڑھنا پڑھنا لگا ہی رہتا ہے۔ کالج جاتے ہوئے یہ بے چینی ہوتی ہے کہ کہیں گھنٹہ نہ بج جائے —— بس بھاگم بھاگ، اور شام کو ٹہلنے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کمبخت دماغ کو تیچر کا بنا دیتی ہے، نہ کچھ سوچ سکو اور نہ کچھ..... بس جوتا پھٹ پھٹاتے جاؤ اور اگر پڑ رہو۔ رات کا وقت تو خیر بنا ہی ناول پڑھنے کے لئے ہے پھر آپ ہی بتایئے کہ کالج سے آنے کے وقت کے علاوہ اور کون سا وقت فرصت کا رہ گیا۔ آخر گھر ہی پہنچنا ہے نا! پہنچ ہی جائیں گے۔ اپنے آہستہ آہستہ! پھر جلدی کاہے کی؟

ذرا آگے چل کر تراہا آ جاتا ہے۔ یہاں سے اس سڑک پر میرے سوا کالج کا کوئی لڑکا نہیں ہوتا، اور تانگوں وغیرہ کی آمدورفت بھی معمولی سی ہوتی ہے، اس لئے مجھے سوچنے کے لئے اور بھی اچھا موقع مل جاتا ہے۔

میرے ڈھیلے بدقطع کپڑوں اور چال ڈھال سے لڑکے مجھے نرا گاؤدی سمجھتے ہیں۔ میں جو خواہ مخواہ دخل در معقولات نہیں کرتا، اور اخباروں کے تراشے پڑھ پڑھ کر سیاسیات پر اناپ شناپ بحث کرنے کو بے کار خیال کرتا ہوں، تو وہ لوگ سمجھ بیٹھے ہیں کہ میں کچھ جانتا ہی نہیں۔ جب وہ نئے قانونوں، اسمبلی کی تقریروں، بادشاہوں کی قدر و قیمت کے متعلق سرگرمی سے بحث کرتے ہوتے ہیں تو میری طرف پیٹھ کر لیتے ہیں جیسے یہ معاملات مجھ سے بالاتر ہیں۔ اچھا پھر سمجھا کریں تو سمجھا کریں، میرا ہی کون سا بڑا حرج ہوتا ہے۔ آخر اور بھی تو بہت سے بڑے بڑے آدمیوں کو اُن کے زمانے والے بے وقوف سمجھتے رہے ہیں۔ ہے تو یہ ٹھیک، مگر اُن لوگوں کے سامنے مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مجھ میں کوئی چیز کم ہے، اور میں بار بار اپنے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھتا ہوں، لیکن یہاں سڑک پر...... یہاں کون بیٹھا ہے جو مجھے کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرائے گا۔ یہاں تو میرا جس طرح جی چاہے چلوں، منہ بناؤں، ہاتھ ہلاؤں، بے چارے راہ گیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی پر ہنستے پھریں..... اور آخر میں اُن سے کسی بات میں کم بھی تو نہیں ہوں۔ سیاست..... بین الاقوامی معاملات..... ادب..... کیا نہیں آتا مجھے؟ بڑے آزاد خیال بن کر چلے ہیں وہاں سے —— مجھے دیکھیں: میں تو خدا کو بھی نہیں مانتا۔ وہ تھے نہ مولانا جواد علی، جو جمیعتہ العلما کی طرف سے تبلیغ کے لئے آئے تھے اور ہمارے ہی محلے میں ٹھیرے تھے۔ کیسے کیسے میرے پیچھے پڑے ہیں، مگر میں نے ہی نہ دی حضرت کو پڑھ کر نماز۔ کہیں یہ لوگ ہوتے تو دم سادھتے ہی بنتی۔ اور ہاں پھر میرے کمیونسٹ خیالات!

ایسے موقعوں پر اگر میں اپنی کھدر کی سفید شیروانی پہنے ہوئے ہوں اور اُس کے دامن ہوا سے دونوں طرف اُڑ رہے ہوں تو میں محسوس کرنے لگتا ہوں گویا میں ایک سفید پروں والا فرشتہ ہوں، اور سڑک پر چلنے والے

آدمیوں سے اونچا ہو گیا ہوں۔ ہوا جب میرے بالوں اور کانوں کے بیچ سے گذرتی ہے تو میری کن پٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے میں اپنا قد سپاہیوں کی طرح سیدھا کر لیتا ہوں، اور شیروانی کا دامن ایک ہاتھ سے پکڑ کر تھوڑی دیر تک ذرا تیز چلتا ہوں۔

لیکن مجھے یہ بھی تو چاہئے کہ ان لڑکوں پر ابھی طرح واضح کر دوں کہ میں ان سے کچھ ہیٹا نہیں ہوں۔ اچھا تو آنے دو اب کی ڈیبیٹ .... مگر .... نہیں مذاق اڑائیں گے تقریر کیسی کے ..... پھر کالج کے میگزین ہی میں ایک مضمون لکھ ڈالوں لیکن اگر نہ لیا میرا مضمون تو ..... کیا کرنا چاہئے ..... کیا .... کرنا .... ٹھیک، ٹھیک، اب کے چھٹیوں میں جو گھر جانا ہو تو اپنے پرانے اسکول میں ایک تقریر کر ڈالوں۔ یہ لوگ تو وہاں بھی میری تقریر نہ سن سکیں گے، مگر خیر مجھے تو تسلی ہو ہی جائے گی کہ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں .... بس تو یہی طے ہے ..... ہاں پھر تقریر کا مضمون کیا رہے گا۔

میں ذرا دبا دبا سا چہرہ کھجاتا ہوں، اور پھر تو بیدردوں کے عنوان اور ان کے متعلق فقرے ذہن میں چکر لگانے لگتے ہیں ..... موجودہ بین الاقوامی صورتِ حالات ..... فلم ..... روس کی معاشرتی حالت .... ہوں، ہوں ---- لینن، ٹراٹسکی، اسٹالن ---- کوئی دوسرا .... ورروس درتھ کی شاعری ..... نہیں نہیں ---- آج روس میں ہر ایک کسان ......" مگر اس بات کا تعلق تو پہلے مضمون سے ہے ...... اچھا پھر ...... ادب اور زندگی ...... یہ ٹھیک رہا۔ آخر جاننا چاہئے کچھ بے چارے ان اسکول کے لڑکوں کو بھی۔ انہیں پڑھایا ہی کیا جاتا ہے، بس وہی غالب ..... شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل ..... بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہوئی ...... ہونہہ ...... تو بس یہ مضمون ٹھیک رہا۔

اچھا اب اسے شروع کس طرح کیا جائے گا؟ ..... پہلے تو اپنی کم استعدادی کا اعتراف، اور پھر معافی کا مطالبہ وغیرہ ..... معزز اساتذہ اور بھائیو" ...... انگریزی میں کہتے ہیں لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ مگر عورتیں تو ہوں گی نہیں ..... تو پھر یوں .... "غیر حاضر خواتین اور حاضر اصحاب"...... اس سے ایک ہنسی کی بات تو کہہ دی گئی نا ..... "آپ سب مجھے جانتے ہیں ..... میں اسی اسکول میں پڑھا ہوں ..... میں کچھ زیادہ تو جانتا نہیں مگر آپ کی خدمت کے شوق میں حاضر ہو گیا ہوں ..... میری غلطیاں معاف کریں گے" ..... اب کوئی لطیفہ یا شعر ..... شعر ہی سہی ..... یہ مصرع مناسب ہو گا۔

یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ ..... پڑھ کر دیکھ لینا چاہئے ...... میں چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لوگ آجا رہے ہوتے ہیں۔ میں اپنا ہاتھ منہ کے پاس انداز سے رکھ لیتا ہوں کہ ہونٹوں کے ہلنے کو کافی جگہ رہے، اور ہلکی آواز میں پڑھتا ہوں۔

یہی زن ..... دگی حقی قت ..... یہی زندگی .....

فس آنا۔

آپ لوگ غالب کا کلام پڑھتے ہیں، قصیدے پڑھتے ہیں، غزلیں پڑھتے ہیں۔ کیوں پڑھتے ہیں؟ لکھنے والا کیوں لکھتا ہے؟ کبھی آپ نے سوچا! بتلائیے ..... آپ اس لئے ..... یہاں میری مٹھی بند ہو جاتی ہے، اور ہاتھ اوپر اٹھنے لگتا ہے، مگر میں شرما کر اسے جلدی سے نیچے کھینچ لیتا ہوں۔ ..... "آپ اس لئے پڑھتے ہیں شعر کہ آپ زندگی ..... ہاں ہاں اس عالم زندگی ..... کہ آپ زندگی کے متعلق جاننا چاہتے ہیں، اس کے گہرے رازوں کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان سمندروں کی تھاہ لانا چاہتے ہیں۔ اور شاعر کا بھی ......"

گھوڑے کے ٹاپوں کی زوردار آواز مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے ..... ہاں، وہی ہے۔ یہ لڑکیوں کا تانگہ مجھے اکثر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی انداز سے بڑی تمکنت کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں، اور وہ کبھی مجھ سے نگاہیں چرانے کی کوشش نہیں کرتی، بلکہ میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔ اس کا چہرہ بیضوی، سفید اور بھرا ہوا ہے، اس کے ہونٹ خوب سرخ ہیں۔ اور ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ میں سوچا کرتا ہوں، کاش! مائیکل اینجلو اس کا مجسمہ بناتا ..... لیکن مجسمہ پھر بھی بے جان ہی معلوم ہوتا ہے۔ آنکھیں تو خصوصاً مجسمہ میں پتھرائی ہوئی سی نظر آتی ہیں۔ مونالیزا کا مصور ہی کچھ اس کی نقاشی کرے تو کرے۔ خاص طور سے اس کا سینہ تو مجھے بے حد پسند ہے۔ اس کی سفید جالی دار ساڑھی اور بلکے جمپر میں سے اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہوں ..... سفید، ملائم، شعلے کو بھی نہیں چھو سکتا! اگر کہیں وہ بھی میری تقریر سن سکے تو مزا ہی آ جائے ..... ممکن تو ہے ..... ابھی تو چھٹیوں میں بہت دن پڑے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس عرصے میں میری اس سے ملاقات ہو جائے اور اتنی راہ و رسم بڑھ جائے کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکوں۔ پھر تو مجھے دوسری طرح شروع کرنا پڑے گا۔ میں کہوں گا۔ "اکیلی خاتون اور بہت سے حضرات" سب ہنس پڑیں گے۔ میرے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر کیسا کیسا رشک ہو گا لوگوں کو اور میں خوشی سے دیوانہ ہو ہو جاؤں گا۔

اپنے پرانے انگریزی کے ماسٹر صاحب سے مزید تعارف کراؤں گا اس کا، ..... تانگہ گذر بھی چکا ہے اور میں اُسی کے خیال میں غرق، اپنے نچلے ہونٹ کو اوپر کے ہونٹ سے رگڑتا ہوا سر لٹکائے، بائیں ہاتھ سے کتابیں دل کے قریب جمائے ہوئے، اور داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے برابر والی انگلی کو ملتا ہوا آہستہ آہستہ لڑھکتا رہتا ہوں۔

سورج کی گرمی سر کو جھلس کر رکھ دیتی ہے، بدن میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی ہیں، اور چہرہ پسینے میں ڈوب جاتا ہے۔ بے قرار ہو کر میں یکایک تیز چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ آگے درختوں کا سایہ آتا ہے جو کافی دور تک چلا گیا ہے اسے دیکھ کر میں لپکتا ہوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سر کو چکرا دیتی ہے، اور میرا دماغ تیز لہروں کی دھار پر گھومتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت ہر قسم کے خیالات میرے ذہن سے نکل جاتے ہیں، اور میری رفتار بہت دھیمی پڑ جاتی ہے۔

درختوں کے اختتام کے قریب سڑک کے کنارے ایک کمہار کا گھر ہے۔ درختوں کے سائے میں اس کی لڑکی اپنا چاک رکھے آبخورے بنایا کرتی ہے۔ وہ گھٹنوں سے اوپر تک کا پھٹا سا لہنگا اور آدھی بانہوں کا دھاری دار کرتا پہنے رہتی ہے اور اس کی اوڑھنی ڈھلک کر کندھے سے نیچے گر جاتی ہے اُسے اپنے تندرست اور نیم رس سینے کو ڈھکنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی جس کا کافی حصہ گریبان میں بٹن نہ ہونے سے راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کے سوکھے ہوئے سخت بالوں کے گچھے اور لٹیں بن گئی ہیں جن میں سے اکثر اس کے تانبا جیسے اور جابجا مٹی سے سنے ہوئے چہرے پر لٹکتی رہتی ہیں۔ جب وہ اپنے ڈنڈے سے چاک کو گھماتی ہے تو اس کے بازوؤں کی مچھلیاں گردش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی ٹانگیں بے پروائی سے چاک کے دونوں طرف پھیلی رہتی ہیں، اور اس کی برہنہ چکنی پنڈلیوں پر نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے اپنی تقریر پھر یاد آ جاتی ہے اور میں سوچنا شروع کر دیتا ہوں، میری بھنویں چڑھ جاتی ہیں اور میں بمشکل اپنے لفظوں کو ہونٹوں تک آنے سے روکتا ہوں۔

"آپ نے اپنی شاعری میں قوس قزح کی رنگینی اڑائی، اُسے گل و یاسمن میں بسا دیا، موجِ نسیم کے گہوارے میں پالا، بادۂ ناب اور مئے انگوری کی کیفیتیں اس میں بھر دیں، اور طور کی تجلیوں سے اسے ضیا بخشی ..... لیکن —— آپ نے زندگی سے کیا لیا —— زندگی ..... میرا مقصد ہے زندگی ..... کیا آپ نے کبھی خونِ گرمِ دہقاں کی جھلک دکھائی! کیا آپ نے مزدور کی کمر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی! کیا آپ نے ..... اُن مضبوط لیکن فاقہ کش اور بدحال مزدوروں کی جفاکشی کے گن گائے؟ ..... اگر نہیں تو آپ بے خبر سوتے رہے ..... آپ نے آنے والے انقلاب کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں ..... ہوشیار ..... بیدار ہو جایئے ..... اٹھئے اور اپنے ادب کا .....؟"

موٹر کے ہارن کی متواتر آوازیں مجھے جگا دیتی ہیں، اور میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔ یہ موٹر میری کلاس کے ایک کالے اور بدشکل لڑکے کا ہے۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھتا ہے اور مجھے ضرور پہچانتا ہوگا، مگر اپنی موٹر میں گزرتے ہوئے جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو ناک سکیڑ کر دوسری طرف منہ کر لیتا ہے۔ کرتا ہے تو کرے، مجھے کیا۔ ایسا کہاں کا لاٹ صاحب ہے بڑا۔ اور ہو بھی تو کیا ہے۔ انقلاب بھی تو نزدیک آ رہا ہے اور تھوڑے دن میں کمبے، پھر کھل جائے گی حقیقت! ..... اپنے منتقمانہ ارادوں کے پورا ہونے کی اتنی قریب اُمید پر ایک رمزیہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں تک آ جاتی ہے۔ اور اس طرف سے مطمئن ہو کر میں اپنی تقریر سوچنے لگتا ہوں۔ اس وقت مجھے سلسلے کی کچھ زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابھی تو خیالات کو جمع کرنا ہے اُن کی مناسب ترتیب تو موقع پر ہوتی رہے گی۔

کسی مشہور انگریزی مصنف کا قول بھی آنا چاہئے تقریر میں۔ آخر لوگوں کو یہ معلوم تو ہو کہ ہم نے بھی انگریزی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اچھا تو پھر کون سا مصنف ..... میتھیو آرنلڈ ..... ادب تنقیدِ حیات ہے ..... مگر نہیں، چھوڑو، بہت پامال ہے یہ ..... شیلی کا وہ شعر ایسی ایسی شکلیں جو بقا کی پروردہ ہیں ..... لیکن یہ تو میرے مقصد کے خلاف ہے گا! مجھے تو زندگی کے متعلق کہنا ہے ..... پھر ..... شاید لینن نے کہا تھا کہ یہ سر ہلانے کا وقت نہیں ہے بلکہ سر توڑنے کا .....! لیکن کوئی ٹھوس چیز ہونی چاہئے ..... کس نے لکھا ہے وہ؟ ..... والٹر پیٹر ..... بینٹ ..... فرائی ..... خیر کوئی بھی سہی۔ یوں کہا جاسکتا ہے "کتنی اچھی بات کہی ہے ایک انگریز نقاد نے کہ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے، زندگی سے نشو و نما پاتا ہے، اور زندگی پر ہی اثر انداز ہوتا ہے۔" اپنے میں یورپ کے مصنفین کے اقوال نقل کرنے کی صلاحیت پا کر مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں اپنی تقریر کو بھول کر کچھ دیر اسی خیال سے لطف اٹھاتا رہتا ہوں، اور بار بار مسکرا پڑتا ہوں، میں اُس دن کا تصور کرتا ہوں جب میں اپنی تقریر میں یہ اقوال دہرا رہا ہوں گا ..... لڑکے میری قابلیت پر تعجب کریں گے۔ فارسی

کے ماسٹر صاحب گردن بڑھا بڑھا کر مجھے گھوریں گے۔ مرعوب تو وہ بھی ہو رہے ہوں گے، مگر [illegible] جھنجھلا رہے ہوں گے کہ میں نے ابھی تک فارسی کا ایک شعر بھی نہیں پڑھا۔ اور آخر میں کیوں پڑھوں صاحب۔ بھلا کہاں انگریزی کہاں فارسی ..... مگر جاگیر بھی خواب ہے ......

[illegible] بھی جو آگے سے [illegible] ایک [illegible] میں شہرور [illegible] [illegible] سیا [illegible] ہوا [illegible] ہوئے [illegible] کھینچتے ہوئے [illegible] [illegible] اصلاح کا اضافہ بھی کرتا ہے [illegible] [illegible] حالات پر افسوس [illegible] ..... یہ حالات ہے [illegible] ..... یہ لوگ ..... [illegible] ..... [illegible] کے فلسفہ [illegible] ..... [illegible] پھر مجھے [illegible] ..... [illegible] ..... وہ اب [illegible] کی زبانی [illegible] ..... [illegible] ..... زندگی [illegible] ترتیب۔ اور [illegible] زندگی کے مصائب اپنے شعروں میں بیان [illegible] زندگی [illegible] سے پُر ہے ..... مصائب ..... ظلم ..... [illegible] ..... اور یہ مزدور ....."

میرا خالی ہاتھ کبھی اوپر آتا ہے، کبھی [illegible] کبھی گھونسے کی شکل اختیار کر کے ہوا کو مارتا ہے، میرے ہونٹ بھی کھلتے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب دو اسکول کے [illegible] اپنی سائیکلوں پر میرے پاس سے گزرتے ہیں اور مجھے دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہیں۔ میرے خون کی گردش رک سی جاتی ہے اور کن پٹیاں بھاری اور گرم ہو جاتی ہیں۔ لیکن میں آہستہ آہستہ اپنے بدن کو دوبارہ ڈھیلا کر لیتا ہوں۔ [illegible] ..... "آپ لوگ اب بڑے ہونے والے ہیں۔ آپ کو اپنے فرض کا احساس ہونا چاہیے۔ ..... بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے ..... اب آپ لوگوں کے ہاتھ بات ہے، آپ کو نیا ادب پیدا کرنا ہے ..... زندگی سے باہر آپ کہاں جا سکتے ہیں۔ زندگی ایک چیتا ہے ..... غور سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیے زندگی کو ..... ایک شاعر ہے آج کل انگریزی کا۔ وہ کہتا ہے کہ میں [illegible] گیا ہوں چائے کی پیالیوں سے [illegible] ....."

"پھوٹے نہ دیے نندی" —— بچہ نندو چیخ چیخ کر گا رہا ہے، اور ساتھ ہی سڑک پر ناچتا بھی جاتا ہے۔ لڑکے اسے چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں۔ اور خود بھی چلاتے جاتے ہیں "کیا کہنے ہیں بجھرو بیٹا کے"۔ [illegible] دور بیٹھا لڑکوں کو شہہ دیتا رہتا ہے۔ یہ بوسا پنواڑی کی دکان کے [illegible] پیپل کے نیچے چبوترے پر بوری بچھائے بیٹھا کڑوے تیل میں پکوڑیاں پکایا [illegible] ہے جس کی بو دور دور تک پھیلی رہتی ہے۔

اب گھر اتنا نزدیک آ چکا ہے کہ تقریر کے متعلق کچھ اور سوچنا مشکل معلوم ہونے لگتا ہے۔ باقی حصے پر کل غور کرنے کا ارادہ کر کے میں چال کو تیز کر دیتا ہوں۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے بارش آ گھیرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر بادل گھنٹہ ختم ہونے پر اٹھنا شروع ہوتے ہیں لیکن تب ان کی دہشت ناک شکل [illegible] ظاہر نہیں ہوتی۔ سورج کی چمک کا پتہ بھی نہیں ہوتا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا [illegible] رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں طبیعت کی روانی کا کیا پوچھنا —— جیسے جیسے [illegible] ہوں بھنگے اڑتے ہوئے۔ اور پھر یہ کوئی لازمی تھوڑی ہے کہ بارش ہو [illegible] یہی سوچتا ہوا چل دیتا ہوں —— اور دونوں سے بھی آہستہ آہستہ [illegible] نزدیک ہونے کا احساس مجھے اس وقت ہوتا ہے جب یکے اور تانگے پوری رفتار سے گھڑگھڑاتے ہوئے دوڑنے لگتے ہیں، سائیکلوں کی گھنٹیاں بے تحاشا زور زور سے بجتی ہیں، اور گھاس والیاں ایک ہاتھ سے لہنگے سنبھالتے ہوئے یہ کہہ کر بھاگنا شروع کر دیتی ہیں کہ "بھاگو بھئی پانی آ لیو"۔ میں بھی گھبرا کر جلد جلد قدم اٹھاتا ہوں۔ —— موٹی موٹی بوندیں پڑتی ہیں۔ اب میں بھاگنے کی تیاری کرتا ہوں مگر بارش ایک ساتھ آ جاتی ہے ..... یوں ہونے کو تو میں حاجی غلام رسول ٹرنک ساز کی دکان میں پناہ لے سکتا ہوں اور ایک دفعہ میں نے کیا بھی یہی تھا۔ بارش جو آئی تو میں سیدھا حاجی جی کی دکان پر چڑھ گیا۔ حاجی جی لکڑی کی کرسی پر دونوں پیر اوپر رکھے بیٹھے تھے، اور حقہ پیتے ہوئے کسی سے باتوں میں مشغول تھے۔ میں بھی کھڑا ہو کر سننے لگا۔ سکول کی لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاجی جی نے اپنے مخاطب کی طرف جھک کر میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا: "اور بھی لڑکیوں [illegible] تو خود مجھے [illegible] ہیں۔ جب بورڈنگ کی لڑکیوں کے بچے پیدا ہوئے ہیں آخر کچھ حد ہے بے حیائی

کی ہے۔"

میں بھی بول اٹھا "لیکن جب آپ کی بھینس بچہ دیتی ہے تو اسے بے حیا کیوں نہیں کہتے؟"

حاجی جی نے اس غیر متوقع جارحانہ حملے کو جس نے انہیں ہڑبڑا دیا تھا کچھ زیادہ پسند نہیں کیا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا، اور بعد ازاں حقے کو اس طرح اوپر اٹھاتے ہوئے بولے گویا وہ بھی ان کی دلیل کا ایک حصہ ہے: "تو آدمی اور بھینس کی کیا مثال؟"

"بھینس آدمی نہیں ہوتی کیا؟" میں نے بغیر سوچے جواب دیا۔

"بھینس آدمی؟" حاجی جی کے حقے کی نے نیچے گر پڑی۔

"ہاں آدمی، یعنی یہ کہ ..... جاندار تو ہوتی ہے۔"

میری اور حاجی جی کی خاصی جھڑپ ہو گئی جس کے دوران میں انہوں نے میری ذات کے متعلق کچھ بہت اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا حالانکہ انہیں میرے وہاں کھڑے رہنے پر فی الحال کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر میں بارش کے باوجود وہاں سے چل دیا۔ جب سے میں کبھی ان کی دکان میں نہیں جاتا، چاہے کتنے ہی زور کی بارش کیوں نہ آ جائے اور پھر بارش ہمیشہ اس وقت آتی ہے جب میرا ایک تہائی کے قریب راستہ رہ جاتا ہے اس لئے میں سیدھا بھاگ ہی لیتا ہوں۔ بارش کا زور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ بوچھاڑ آنکھوں کو بند کئے دیتی ہے کتاب کا رنگ پھوٹ پھوٹ کر کپڑوں پر ٹپکنے لگتا ہے۔ مگر میں بھاگے ہی چلا جاتا ہوں۔ بارش کے وقت پوسا پکوڑی والا اپنا سامان تیواڑی کے تخت کے نیچے سرکا دیتا ہے، اور چبوترے پر پیر نیچے لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بھی ایک دھوتی کے سوا اور پہنتا ہی کیا ہے، اس وقت تو وہ دھوتی کو بھی اوپر چڑھا لیتا ہے اور ران پر ہاتھ مار مار کر زور سے گاتا جاتا ہے۔ "برسو رام جھڑاکے سے۔ بڑھیا مر گئی فاقے سے۔"

جب میں بھاگ رہا ہوتا ہوں تو اس کی آواز ایک عفریتانہ تمسخر کے ساتھ، تند، کرخت، ایک دھمکی لئے ہوئے بارش کی دھار کو چیرتی پھاڑتی میرے تعاقب میں دوڑی چلی آتی ہے — "برسو رام جھڑاکے سے —!"

میں اپنے مکان کے سامنے کے میدان کو لمو ٹروں کی لید اور کیچڑ میں پھنستے ہوئے اور پرنالوں کے پانی میں چھپ چھپ کرتے ہوئے، طے کر کے سر سے پیر تک پانی میں ڈوبا ہوا زینے کے دروازے تک پہنچتا ہوں۔ جیب سے چابی نکالنا چاہتا ہوں تو جیب ایسی چپک جاتی ہے کہ چابی بڑی مشکل سے ہاتھ لگتی ہے۔ پھر تالا بھی کھلنے میں دقت پیدا کرتا ہے۔ جلد جلد اوپر پہنچ کر میں کتابوں کو چارپائی پر پھینک دیتا ہوں۔ شیروانی کو آہستہ آہستہ اتارتا ہوں، اور اسے الٹ پلٹ کر نہایت غور سے دیکھتا ہوں گویا میری نگاہ کی گرمی سے وہ خشک ہو جائیگی یا اس کی رگڑ سے کتاب کا بہا ہوا رنگ چھٹ جائے گا۔ پھر میں اسے نہایت احتیاط سے کواڑ پر ٹانگ دیتا ہوں، اور بغیر کپڑے اتارے، بالوں کو تولئے سے سکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اتنے میں چھدن بیگے والا اوپر چڑھ آتا ہے، اور کواڑ سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تو وہ تیز نظروں سے حالات کا جائزہ لیتا ہے، اور پھر چونکتے ہوئے مسکرا کر کہتا ہے۔

"کہو بابو جی، بھیگ گئے آج؟" اور ساتھ ہی اس کے دھکے سے شیروانی کواڑ پر سے نیچے کچی زمین پر گر پڑتی ہے، اور مٹی میں سن جاتی ہے۔

اور یہ وہی میری کھدر کی سفید شیروانی ہوتی ہے۔

....

اگلے دن میں دنیا کے آئندہ نظام کے متعلق تقریر سوچ رہا ہوں۔

محمد حسن عسکری

غزل

جو کچھ چاہیں وہ فرمائیں، اُن کو تم فرمانے بھی دو
میرے دل کی حالت دیکھو، اُن کو قسمیں کھانے بھی دو

خشک ہوا ہے نخلِ تمنا پھلنے کی امید نہیں ہے
باقی ہیں جو پھول کہیں پر اُن کو اب مرجھانے بھی دو

جینا کیا، جینے کی خوشی کیا، دل ہے جب برباد تمنا
جاؤ اب آنسو نہ بہاؤ مجھ کو تم مر جانے بھی دو

ناز و ادا سے کام رکھو تم، جور و جفا کی مشق کرو تم
کوئی اگر مٹتا ہے جہاں میں اس کو تم مٹ جانے بھی دو

رگ رگ میں اک آگ لگی ہے، دل ہے تیرِ غم کا نشانہ
رونے دو، رونے دو مجھ کو، آنسو کچھ بہہ جانے بھی دو

ختم نہ ہوگی غم کی کہانی، نیند تمہیں جھٹ آجائے گی
چھوڑو بھی اس افسانے کو، جانے بھی دو جانے بھی دو

عہدِ وفا کوکبؔ دھوکا ہے، کوئی کسی کا کب ہوتا ہے
غم نہ کرو اگلی باتوں کا، یاد آئیں یاد آنے بھی دو

کوکب شادانی

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

[illegible] جب کہ ہر ایک چیز اپنا ظاہری دلکش لباس بدلے [illegible] ان وجوہات کے مدِنظر کتنی [illegible] مختلف نہریں شائع کی جاتیں [illegible] کے بعد یہ انتخاب کیا ہے اور جو ایسے نظری [illegible] یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں [illegible] کے ہمراہ ظروف ان نمبروں کا مطالعہ کر کے ان [illegible]

افسانے

افسانے			[illegible]	[illegible]	۲	[illegible]	فضل حق قریشی	۱۲
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	حکیم احمد شجاع	۱۲
[illegible]			[illegible]	[illegible]	۱۲	[illegible]	مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	۱۲
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	گوئٹے	[illegible]
[illegible]	سعادت حسن منٹو	[illegible]	[illegible]			چھوٹے پیاں	نرائن محمد	۸
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible] کے مضامین	[illegible]	[illegible]	[illegible]	،	۸
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱۲	**منظومات**		
[illegible]	سید علی عباس حسینی	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	اقبال	[illegible]
شعلے	پروفیسر [illegible]	[illegible]			[illegible]	نقش و نگار	جوش ملیح آبادی	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	شوکت تھانوی	[illegible]	[illegible]	،	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	مضامین فلک پیما	[illegible]	[illegible]	[illegible]	مولانا ظفر علی خان	[illegible]
[illegible]	حجاب امتیاز علی	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	حفیظ جالندھری	[illegible]
[illegible]			[illegible]		[illegible]	[illegible]	،	[illegible]
[illegible]	کرشن چندر	[illegible]	[illegible]	،		[illegible]		[illegible]
اندھی دنیا	اختر انصاری	[illegible]	**ڈرامے**			[illegible]	احسان دانش	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	انار کلی	امتیاز علی تاج	[illegible]	[illegible]	نقش دوام عبدالحمید عدم	[illegible]

ملنے کا پتہ مکتبہ: کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

ترقی پسند ادب اور مزدور

ادب اور زندگی کا کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ زندگی کے بغیر ادب کا تصور بھی ایک بے معنی سی چیز ہے۔ ادب عکاسی ہے زندگی اور اس کے تجربات کی۔ درحقیقت زندہ ادب وہی ہے جس میں وہ گرم خون رواں دواں ہے جو زندگی کی روح ہے۔ ایک ادیب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم صدیاں گزر جانے پر بھی اس کے ماحول اور زمانے کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ایک ادیب بھی عام چلتے پھرتے انسانوں کا سا ایک انسان ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کے روز مرہ کے واقعات و حوادث اس پر اپنا اثر نہ چھوڑیں۔ ہاں وہ عام انسانوں سے اس بات میں ممتاز ہے کہ وہ ایک حساس اور سوز و گداز سے بھرپور دل رکھتا ہے اور کوئی چھوٹے سے چھوٹا حقیر حادثہ یا واقعہ بھی اس پر ایک گہرا اور دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ اس کی دوربین نگاہیں ان واقعات و حادثات کی ظاہری صورت ہی سے ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں کرتیں بلکہ ان کی نامعلوم گہرائیوں تک اتر جاتی ہیں اور وہ پورے غور و خوض کے بعد ایک ایسی دنیا کا تخیل پیش کرتا ہے جس کی ضرورت کی دلیل یہ حادثات ہوتے ہیں۔

آج کل ہر طرف ترقی پسند ادب کا چرچا ہے اور یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ادب کا ایک جگہ ساکن ہو جانا خودکشی کے مترادف ہے۔ زندگی اور تغیر دوش بدوش چلتے ہیں اگر ادب اپنی حقیقی اعلیٰ اقدار پر قائم رہنا چاہتا ہے تو اسے بھی لازمی طور پر زندگی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا پڑے گا۔ ہر زمانے کا ادب اس وقت کے مخصوص سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور مجلسی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ مثلاً جب مطلق العنان بادشاہت کا دور دورہ تھا تو اس زمانے کا ادب بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ایک مطلق العنان ذہنیت کا آئینہ دار تھا۔ اس وقت کے ادب کا اپنا نظریہ بھی وہی شاہانہ شان و شوکت اور درباری ٹھاٹھ تھا۔ اس ادب میں طبقہ وسطی اور جمہور کا حال تو کوئی ذکر ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو محض ثانوی حیثیت سے تشبیہ بھی اسی زمانے کی خاص ایجاد ہے۔ اس کے بعد یعنی طبقہ وسطی کی جمہوری حکومت کے زمانے کے ادب میں بھی عوام کی زندگی کی کوئی خاص تصویر نہیں ہے البتہ اتنا ضرور تھا کہ کہیں کہیں اس مظلوم طبقے کی حالتِ زار کا ذکر کر دیا جاتا تھا اور بس! آج جبکہ اشتراکیت کا سیلاب بڑھا آ رہا ہے اور حقیقی طاقت طبقہ وسطی کے ہاتھوں سے چھن کر جمہور کے ہاتھوں میں جاتی دکھائی دے رہی ہے۔ ہمارے ادب میں بھی کروٹ بدلنے کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس ذہنی انقلاب نے ہمارے سامنے ادب کی ایک نئی صنف لا کھڑی کی ہے۔ میری مراد ترقی پسند ادب سے ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی ترقی کو اب کوئی بڑی سے بڑی رجعت پسند طاقت بھی نہیں روک سکتی۔ کیونکہ یہ محض کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نتیجہ ہے اس مخصوص ذہنی انقلاب کا جو اس سیاسی اور اقتصادی تبدیلی کا پیدا کردہ ہے۔ لہٰذا جب تک اس سیاسی تبدیلی کو روکا نہ جائے (جو تقریباً ناممکن ہے) اس وقت تک ترقی پسند ادب کی رفتار ایک لمحہ کے لئے بھی رک نہیں سکتی۔

یہ خیال کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ ادب کو کسی ایک فلسفۂ حیات کا رفیق نہیں بننا چاہیئے۔ غیر جانبدار رہتے ہوئے تصویر کے دونوں رخ نمایاں کر کے فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ آخر ادیب کوئی فرشتہ تو ہوتا نہیں کہ جس پر حادثات اپنے تیز دھارے پر ہر نیک و بد کو اس کی آنکھوں کے سامنے بہائے لئے جائے اور وہ پتھر کی مورت کی طرح خاموش بیٹھا دیکھتا رہے وہ سماج کا ایک بے معنی فرد نہیں ہوتا۔ اس دنیا کو بہتر بنانے اور ایک شاندار مستقبل کی طرف لے جانے میں اس کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ بلکہ وہ دنیا کی رہبری کرنے کی اوروں سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے کیونکہ اس کی نظر غائر اور دل حساس ہوتا ہے۔ اگر موجودہ سماجی نظام سے مطمئن نہیں تو یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس نظام کی برائیاں عوام کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ خود اس سے بے نیاز ہو کر اس کو بدلنے پر تل جائیں اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایک خطرناک مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہے۔ ایک ادیب جب سرمایہ داری کے ریشم و اطلس و کمخواب کے حسین خوشنما طلسم میں الجھ کر دیکھتا ہے تو بے چین ہو جاتا ہے اور اس

ظلم کو روکنے اور دنیا کو اس خطرناک پستی سے نکال کر بلندی تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے جہاں امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہ رہے۔ یہ تمام معجزے ادب ہی کے ذریعے سے سرانجام ہو سکتا ہے اور عموماً کامیاب رہتا ہے کیونکہ وہ ایک ادیب ہے۔ لہٰذا مقصدی ادب ایک ایسی ضرورت ہے جس سے ذرا سا گریز ناممکن ہے مگر اس ادب کا مزدوری سے لگاؤ ایک نمایاں خصوصیت اولین ہے۔

بعض ادباء آج موجودہ تلخ حقائق سے بچنے کے لئے ان حقائق کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں لیکن اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حقائق کو نظر انداز کر دینے سے حقائق بدل ہرگز نہیں سکتے۔ ہاں وقتی طور پر نظروں سے اوجھل ضرور ہو جاتے ہیں لیکن آنکھیں کھلتے ہی وہ تلخ حقائق پھر سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ غم سے بچنے کے لئے اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ اس موجودہ نظام کو جس کی بدولت یہ تلخیاں پیدا ہوئی ہیں بدل دیں بلکہ وہ رومانیت کے حسین لیکن نازک پردے میں چھپ کر ان سے پناہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ ترانۂ مسرت کو غم و حزن کا لباس پہنا کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ غم سے دور جا رہے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ بہت جلد ان کو ایسی دنیا میں جہاں غم و حزن کے سوا کچھ نہیں ناقابل تردید حقیقت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لہٰذا ہمارے ادیب کو ان تلخ حقائق سے گریز نہیں بلکہ ان کے میدان میں آ کر ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئیے۔

لیکن آج بہت سے ناتجربہ کار نوجوان ادیب اس ترقی پسندی کی رو میں بہہ کر بے راہ ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کو ایک محدود سی چیز بنا کر اس کا اصلی جوہر یعنی زندگی کی ہمہ گیر ترجمانی کا جذبہ اس سے چھین رہے ہیں۔ یہ نئے ترقی پسند ادیب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جوش کے سے کسانوں اور مزدوروں کے مصائب بیان کرنے سے ہی شعر انقلاب بن گیا ہے۔ وہ احسان دانش کی مقبولیت کا راز صرف اس بات میں سمجھتے ہیں کہ انہوں نے مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت پر قلم اٹھایا ہے مگر وہ ان شعرا کی فنی خوبیوں اور ان کی شاعری کی اصل روح یعنی انقلاب کے لئے دلی تڑپ کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں (جو ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے) وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کے ذاتی تجربات یا گہرے مشاہدے کے تاثرات ہیں۔ وہ ادیب پہلے ہیں اور ترقی پسند بعد میں۔ لیکن یہ نئے ادیب یا نقال ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے ان کے کلام کی صرف ظاہری شکل و صورت کی نقالی شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح اس کارآمد فن لطیف کو رسوا کرتے ہیں۔

ان نقالوں کے کلام کو ترقی پسند ادب کہنا ادب کی توہین کے مترادف ہے۔ ہم ان کو ترقی پسند تو کہہ سکتے ہیں لیکن وہ ادیب ہرگز نہیں۔ کیونکہ ان کے کلام میں اس لطیف شے کا فقدان ہوتا ہے جو ادب کو پروپیگنڈے سے ممیز کرتی ہے۔ ہماری مراد جمالیات سے ہے۔ ان کے کلام میں جان نہیں ہوتی۔ رس نہیں ہوتا کیونکہ یہ دلی تاثرات کسی خاص تعمیری جذبے کے حامل نہیں ہوتے۔ بلکہ محض نقالی کے طفیل معرض وجود میں آتے ہیں۔ یہ ادیب ادب کو زندگی کے دوش بدوش چلنے کے لئے سوچتے ہوئے دماغ اور دھڑکتے ہوئے دل نہیں دے سکتے۔ ان کے ادب اور کامریڈ یوسف مہر علی اور ایم این رائے جیسے اشتراکی لیڈروں کی تقریروں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو یہ حضرات ترقی پسندی کے شوق میں عجیب و غریب اور مضحکہ خیز باتیں لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب کسان کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "جب کسان اپنے گھر سے ہل کاندھے پر رکھے بیلوں کی جوڑی کو ہانکتا ہوا کھیت کی طرف روانہ ہوتا ہے تو سورج جل کے چمکتے ہوئے جسم پر اپنی شعاعوں کے نیزے مارتا ہے لیکن وہ اس سے ٹکرا کر اپنی طاقت کھو دیتے ہیں اور فضا میں گم ہو جاتے ہیں" اب اس بے چارے ترقی پسند ادیب کو کون سمجھائے کہ میاں غریب کسان تو اس وقت بیدار ہو کر اپنے کھیت کو روانہ ہو جاتا ہے جب آپ ابھی خواب راحت میں مدہوش ہوتے ہیں اور جب ستارے آسمان پر ابھی انگڑائیاں ہی لے رہے ہوتے ہیں۔

ترقی پسند ادب کے علمبردار تین گروہوں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں پہلا گروہ ان ادیبوں کا ہے جو ذاتی تجربات کی بنا پر اپنے دل میں اس مظلوم طبقہ جمہور سے ایک بے پایاں ہمدردی رکھتا ہے۔ وہ اپنے ادب کے ذریعے سے لوگوں کی توجہ ان کی مشکلات اور ان کے مسائل کی طرف مبذول کرا رہے ہیں اور اس طرح ایک ذہنی انقلاب پیدا کر کے جس کا لازمی نتیجہ عملی انقلاب ہوگا ایک نئی دنیا کی تخلیق میں کوشاں ہیں۔ دوسرا طبقہ ان ادیبوں کا ہے جو ذاتی تجربات کی بنا پر تو نہیں البتہ اپنے گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے کے ذریعے سے سماجی نظام کی خرابیوں کو بھانپ گئے ہیں اور اس کو بدلنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ان کے دل موجودہ نظام کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو چکے ہیں اور وہ اس تمنائے انقلاب کا اظہار اپنے ادب کے ذریعے سے کرتے رہتے ہیں۔ تیسرا گروہ ان نقالوں کا ہے جو نہ تو تجربات و مشاہدات کے ذریعے سے اس طبقے کی بنیادی ضروریات اور مشکلات سے آگاہ ہیں اور نہ ان مسائل کا اچھی

طرح مطالعہ کر پاتے ہیں جو ہمدردانہ مشاہدے کے لئے مچل رہے ہیں۔ ان کے دل میں اس مظلوم طبقے کے لئے کوئی درد نہیں۔ ہاں کچھ بمقتضائے فیشن اور کچھ ترقی پسند کہلانے کی دُھن اور جھوٹی شہرت کے حصول کی خاطر ایک بے جان سا اشتہاری ادب پیدا کرنے کے مجرم بن رہے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ یہ تیسرا گروہ بجائے نقالی کے ادب کی کوئی حقیقی خدمت کرے جس کا وہ اہل ہو! ترقی پسند ادب صرف کسانوں کے ہل اور مزدوروں کے بوجھ تک ہی محدود ہو کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ اس کے دامن میں زندگی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے میں پروفیسر[1] فیض احمد صاحب سے اس بات میں تو متفق ہوں کہ مزدور اور کسان کا مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے اور اسے حل کئے بغیر ہماری سماج آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن کیا پروفیسر صاحب یہ بات گوارا کرلیں گے کہ وہ ادیب بھی جو اس کام کے کسی طرح اہل نہیں اس مسئلے کی طرف عوام کی توجہ مبذول کرانے کی ناکام کوشش میں خود ادب ہی کی تخریب کا موجب بن جائے اور خدا گواہ ہے کہ ایسے ادیب تعداد میں توقع سے بہت زیادہ ہو رہے ہیں۔ اگر ادب کو چند خشک حقائق کا مجموعہ بنا کر ہی پیش کیا جائے اور جمالیات کی چاشنی جو کہ ادب کی جان ہے اس سے الگ کرلی جائے تو کیا ہم اس کو ادب کہہ سکتے ہیں اور کیا ایسا ادب کسی کام کا بھی ہے؟

یہ ضروری نہیں کہ جو نوخیز ادیب مزدور اور کسان کی زندگی اور اُن کی نفسیات سے آگاہ نہ ہو وہ ان پر ہی خامہ فرسائی کرے۔ وہ یہی بات ایک دوسرے طریقے سے حاصل کرسکتا ہے اگر وہ مزدور کی مظلومی اور بے بسی کی منہ بولتی تصویر نہیں کھینچ سکتا تو نہ سہی وہ سرمایہ پرست کے غرور و تکبر ہوس زر اور مظلوم کش ذہنیت سے پردہ اتار کر اس کی مکروہ شکل تو دکھا سکتا ہے۔ اس کا نفسیاتی تجزیہ کرکے اُسے عریاں کرسکتا ہے اور اس طرح دنیا کو ایک خاص منزل کی طرف لے جانے میں مددگار ہو سکتا ہے اور یہی ترقی پسند ادب کا نصب العین ہے۔ اگر یہ بھی نہیں تو وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو تختۂ مشق بنا سکتا ہے اور اس طرح تعمیری کام کرسکتا ہے لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ وہ موجودہ نظامِ معاشرت سے غیر مطمئن ہو اور اس کو بدلنے کی ایک دلی آرزو رکھتا ہو نہ کہ محض کارل مارکس اور لینن کی نقالی کا خواہشمند ہو۔

پروفیسر صاحب موصوف جب یہ کہتے ہیں کہ ایک ترقی پسند ادیب کا کام ان مسائل کو حل کرنا نہیں بلکہ محض ان کی طرف توجہ دلانا ہے تو کیا وہ خود ہی ایسے ادیب پر وہ اعتراض نہیں کر دیتے جس سے وہ کمال ہوشیاری سے اس کو مبرا ثابت کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ کیا وہ ادیب کو محض ایک کیمرے کی حیثیت نہیں دے دیتے جو بغیر کسی تنقیدی اور اصلاحی عمل کے صرف ایک موجود کی عکاسی کرتا ہے۔ ادیب کا کام ان مسائل کی طرف جو فیض صاحب کے الفاظ میں ہی بنیادی مسائل ہیں اور جن کو حل کئے بغیر ہماری سماج آگے نہیں بڑھ سکتی۔ صرف توجہ دلانا ہی نہیں ہے بلکہ اُن کو حل کرنا بھی ہے اور ایک ایسا آدرش پیش کرنا ہے جو قابلِ عمل اور قابلِ حصول بھی ہو اور جہاں سماج کی موجودہ برائیوں کا کوئی نشان نہ ہو۔ یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے ادیب اگر عملی تجربے سے نہیں تو کم از کم ان مسائل کے وسیع مطالعے سے خود کو اس قابل بنائیں کہ ان پر خامہ فرسائی کرسکیں اور ان برائیوں کو دور کرنے کی کوئی عملی تجویز اور طریق کار پیش کرسکیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ کارل مارکس اور لینن خود مزدور نہیں تھے۔ لیکن ان کے دلوں میں مزدوروں کے لئے درد تھا۔ انہوں نے مزدوروں کے ساتھ میل جول پیدا کیا اور اس طرح ان کے بنیادی مسائل سے واقفیت پیدا کی بعد ازیں انہوں نے ان مسائل کی طرف صرف توجہ ہی مبذول نہیں کرائی بلکہ ایک مکمل نظامِ عمل پیش کیا۔ ہمارا ترقی پسند ادب صرف تخریبی ہی نہیں بلکہ تعمیری بھی ہونا چاہئے جبھی اس میں مزدوروں اور کسانوں کے لئے کوئی کشش پیدا ہو سکتی ہے۔ موجودہ خرابیوں کو دور کرنے کے لئے جہاں موجودہ نظام کی بنیادوں کو ڈھانا پڑے گا وہاں اس کی نئی تعمیر کی طرف بھی متوجہ ہونا ہوگا۔ جو ہماری اصلی منزل مقصود ہے۔ ہم کسی شخص کو اپنی بوسیدہ جھونپڑی گرا دینے پر اس وقت تک آمادہ نہیں کرسکتے جب تک اُسے یقین نہ دلایا جائے کہ اس کی بنیادوں پر ایک عمدہ عمارت بنائی جا سکتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اُس کو اس نئی عمارت کی ایک جھلک تو دکھا دیں خواہ وہ کسی نقشے وغیرہ میں ہی ہو۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال بھی اپنے پیشروؤں اور ہمعصروں کی طرح ملا کے غلط مذہب پر سخت تنقید کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ تعمیر کی طرف بھی متوجہ رہتے ہیں۔ وہ ایک مردِ مومن کی مکمل تصویر اور اُس کی صفات حسنہ بھی پیش کرتے ہیں تاکہ ہم بندِ صوفی و ملا سے آزاد ہو کر اس آدرش کی طرف پہنچنے کی کوشش کریں اور یہی چیز ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے ترقی پسند ادیب کے لئے اقبال کی اس خصوصیت کی پیروی ضروری ہے لیکن یہ بھی نقالی سے نہیں بلکہ وسیع مشاہدے اور مطالعے سے۔

[1] گذشتہ سالنامہ ادبی دنیا میں پروفیسر فیض احمد صاحب کا مضمون "ترقی پسند ادب اور تعمیر" شائع ہوا تھا۔ زیرِ نظر مضمون کا یہ حصہ اسی سے تعلق رکھتا ہے! ادارہ

[illegible]

مسعود احمد [illegible]

دو شعر

بچھڑ گئی ان آنکھوں کی بات — دنیا میں اب ان سے [illegible] :
سنتے جینے والے جی لیں گے — اب نہ ملو گے؟ — اچھی بات!

فراق گورکھپوری

کشمیر کا ایک آوارہ نغمہ

سربازارِ رسوائی پھری میری گنہگاری
ہوئی لیکن کسی نے جنسِ ارزاں کی خریداری

وہ آئے کارواں امیدوالوں کے لبِ منزل
نہیں یہ اہلِ غفلت کے لئے ہنگامِ بیداری

تجھے اے چشمِ حیرت کس نظارے کی تمنا ہے
کہ یہ پتھر کا بتخانہ ہے دردِ شوق سے عاری

خدارا اے بزمِ فطرت! میں وہ میخوارِ محبت ہوں
مری آنکھوں میں لٹتی ہے بہارِ ابرِ آذاری

تجھے بامِ ہمالہ سے صلائے شوق دیتا ہوں
سبق آموزِ عالم ہے مرا ذوقِ وفاداری

قسم ہے مجھ کو اپنے دیدۂ خوں بیں کے اشکوں کی
نہیں منظور مجھ کو دامنِ فطرت کی گلباری

حقیقت تیرے غم کی کوئی افسانہ نہیں ہستی
فسانہ کوہکن کا اب بھی اس وادی میں ہے جاری

بہالے جاؤ اے لمبودری کی تند رو لہرو!
پریشاں ہے مری خاکِ فسردہ کی سبکساری

دعا دیتے ہیں مجھ کو عارفانِ عشق اے تائب
لبِ عرشِ خدا تک ہے مری دنیا نے غمخواری

یہ نظم شہر سرینگر وادی لدر کشمیر کی ایک بلند چوٹی پر کہی گئی (مرادآبادی)

مراتب علی تائب

گیلی

یہ ذکر ۱۹۳۷ء کا ہے۔

صفدر بھائی اور میں دن کے آغاز ہی میں نوٹ کی سرسبز وادی میں پہنچ گئے۔ پہلا دن تو خیمہ لگانے اور سامان درست کرنے میں لگ گیا۔ دوسرے دن ناشتہ کے بعد دودھ مکھن کی فکر دامنگیر ہوئی۔ بازار کی جانب قدم اٹھائے ہی تھے کہ شاہ صاحب مل گئے۔ وہ مجسم کارٹون تھے۔ میں نے اپنا مدعا ان کے سامنے پیش کیا۔ حسب عادت بزرگانہ لہجے میں فرمانے لگے۔ تم خواہ مخواہ پریشان کیوں ہوتے ہو۔ [illegible] دودھ مکھن یہیں بہتیرے ہیں۔ [illegible] کا وقت ہوا ہی چاہتا ہے۔ میں ابھی انتظام کر دوں گا۔ ابھی وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ گوجر [illegible] کے پل پر [illegible] دکھائی دیئے۔ شاہ صاحب [illegible] آ گئے۔ جب وہ قریب پہنچے تو اکثر نے شاہ صاحب کو سلام کیا اور مزاج پرسی کی۔ یہ مختصر سی مٹیالی جماعت چند مرد اور عورتوں پر مشتمل تھی۔ شاہ صاحب تو مکھن اور دودھ کے قضیے میں الجھ گئے اور ہماری حسن بین آنکھیں گوجروں کا جائزہ لینے لگیں۔ ان میں سے اکثر کو میں پہچانتا تھا۔ شاہ صاحب کی ملازمہ وہی پچھلے سال والی قوی ہیکل مرد صورت آشنا تھی۔ کم بخت کس قدر جوان تھی۔ جوانی تھی کہ پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ چہرہ گویا انار کا دانہ۔ سرخ آنکھوں میں ایک سندر چمک۔ اس نے [illegible] میری مزاج پرسی کی۔ اس کے قریب [illegible] کس قدر حسین ہوتی ہے۔ لانبی لانبی پلکیں، سرمگیں آنکھیں، شرمیلی نگاہیں، بھولی صورت، سادہ چتون ــــــ ایک گجری اپنا آپ ہماری نگاہوں سے چھپائے اور سر جھکائے شاہ صاحب کے دیو قد کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

میں اس کو دیکھنے کے لئے کسی بہانے سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میری اس حرکت پر جھینپ سی گئی۔ جھکی ہوئی نگاہیں اور بھی زمین میں پیوست ہو گئیں۔ وہ دوسروں کی بہ نسبت قدرے صاف کپڑوں میں ملبوس تھی۔ گہرا سبز چوڑی دار پاجامہ اور سرمئی رنگ کا لانبا ڈھیلا کرتہ۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک سہا بھرا، ترو تازہ نوجوان بانکا پھول اگ رہا ہے۔ سڈول اعضا اور متناسب قد۔ بھری بھری بانہیں۔ طاؤسی گردن! میں نے پہلے اس کو نوٹ میں گوجروں کے ہمراہ نہ دیکھا تھا۔

اس نوٹ میں شاہ صاحب دودھ اور مکھن کے متعلق آشنائی سے طے کر چکے تھے۔ انہوں نے اس کے متعلق کچھ کہا بھی۔ مگر میں اپنی بدحواسی میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ شاید وہ کہہ رہے تھے۔ "لو بھائی۔ تازہ مکھن کھاؤ اور خالص دودھ پیو اور موٹے ہو جاؤ۔" شاہ صاحب بھی بڑے ظریف طبع واقع ہوئے ہیں۔ [illegible] کر کے وہ تو اپنے خیمے کو چلے گئے اور گوجر بازار کی جانب لانبے لانبے ڈگ بھرتے رخصت ہوئے۔ مجھ کو محسوس ہوا کہ ان میلے کچیلے گوجروں کے [illegible] ان سے مجھ میں سے کوئی چیز نکل کر لپٹ گئی ہے۔ صفدر بھائی سے میں نے کہا کہ آپ خیمے میں چلیں میں ذرا ڈاک دیکھ آؤں۔ مگر وہ کب میرا پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ ایک بے معنی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرے ساتھ ہو لئے۔

بازار میں حلوائیوں کی دکانوں پر گوجر دودھ مکھن بیچ رہے تھے۔ میری آنکھیں اس حسن مجسم کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اچانک وہ مجھے گردھاری کی دکان پر نظر آئی۔ گردھاری مجھ سے اچھی طرح سے واقف تھا۔ میں نے صفدر بھائی کو ڈاک خانے کی جانب رخصت کیا اور خود تیزی سے گردھاری کی دکان کی جانب بڑھا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ اور آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا تم ذرا گوجروں سے فارغ ہو لو تو بات کروں۔ وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میری نگاہیں اس شرمیلے چہرے پر جم گئیں۔ اس کی آنکھیں بہت کم اٹھتی تھیں اور وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک سنگ مرمر کا بت ہے جس کو پہاڑی بوسیدہ لباس پہنا دیا گیا ہو۔ حسن خاموش

بھی کسی قدر اظہار سے لبریز ہوتا ہے۔ اس کی پُراسرار خاموشی کہہ دیتی تھی کہ وہ میری گستاخ نگاہوں کو قطعاً پسند نہیں کرتی۔ میں اس کی جانب لگاتار دیکھا کیا اور وہ لگاتار نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اتنے میں گردھاری نے اس کا دودھ ناپ کر اُس کو آواز دی تھی! اُس آواز نے حُسن کو بیتے لطیف اور پُرکیف خواب سے چونکا دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنے برتن اٹھا کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

گردھاری میرا پرانا رازدار تھا۔ اس کے قریب بیٹھ کر میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا "اس کا نام کیلی ہے؟"

اُس نے متعجب ہو کر کہا "ہاں! —— کیوں؟"

"کیلی! —— کیلی!! کس قدر انگریزیت تھی۔ اسی نام کے ایک دستخط ہمارے کرنسی نوٹوں پر بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کچھ قیمت ہوتی ہے اور وہ انمول تھی۔

"خیر تو ہے؟"

"کیا تمہاری اس کے ساتھ لاگ، معاہدہ ہے؟"

"جی ہاں!"

"دیکھو گردھاری" میں نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا "میں اُس سے دودھ اور مکھن لینا چاہتا ہوں۔ تم اس کی لاگ ترک کر دو۔"

"بابو۔ وہی پرانی عادت!" گردھاری نے قہقہہ لگایا۔

"چپ —— بھئی دو مشکیاں تو ہمارے خیمے میں بھجوا دو اور یہ لو دو مہینے کا پیشگی کرایہ۔" کرایہ لیتے ہوئے گردھاری مسکرایا اور بولا "بابو جی ہم تمہارے کہا تو لاگ بھی چھوڑ دیں گے۔"

صفدر بھائی سے میں بہت بے تکلف ہوں۔ خیمے میں واپس آ کر میں نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا۔ وہ مذاقاً کہنے لگے "تم بھی عجیب دل پھینک واقع ہوئے ہو۔ جہاں کوئی جوان لڑکی دیکھی اُسی کو آسمانی حور سمجھ بیٹھے۔ ارے بھائی یہ سب جوانی کے کرشمے ہیں۔ جب تم میری طرح اس طوفانی عمر سے گذر جاؤ گے تو طبیعت صاف ہو جائے گی۔"

میں نے عرض کیا "مولانا وعظ و پند کا شکریہ! آپ غالباً انگلینڈ میں بھی درس و تدریس کا شغل رکھتے ہوں گے۔ وہ جیتی و الاقصہ، وہ فرانسیسی لڑکی والا رومان اور وہ مسکراتی حسینہ کے خطوط اور تصویریں تو غالب اسی واعظانہ طرزِ کلام ہی کی وجہ سے ہیں۔"

وہ زور سے ہنس دیئے اور کہا "بھائی خواہ مخواہ خفا کیوں ہو رہے ہو! تم جوان ہو۔ ابھی ان باتوں کی عمر ہے۔ کوشش کئے جاؤ۔ خدا کارساز ہے۔ ہماری بزرگانہ دعائیں تمہارے شاملِ حال تو ہیں ہی —— بس!" اس کے بعد بھی وہ دیر تک مذاق کرتے رہے۔ "حیرانی ہے کہ تمہیں عشق بھی ہوا تو ایک میلی کچیلی گجری سے ——

پھر شرارتاً "تمہیں تو آشاں اچھی لگتی ہے۔ پہلوان کا پہلوان اور عورت کی عورت۔ یار بڑی جوان ہے۔ کم بخت خون کی جھیل ہے۔"

رات کو جب میں چارپائی پر لیٹا تو دل بے چین تھا اور طبیعت مضطرب، آدھی رات گئے آنکھ لگ گئی۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر سڑک پر آ نکلا تاکہ کیلی کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ گھنٹہ بھر انتظار کے بعد گوجر آئے۔ میں نے ان کو روکا اور دودھ مکھن کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ کچھ تو گذر گئے باقیوں کو میں نے روک رکھا۔ آشاں دودھ دینے ہمارے خیمے کو چلی گئی۔ میں مُصر تھا کہ تم مکھن لاتے ہو اور چھپائے جاتے ہو، وہ بے چارے انکار کئے جاتے تھے اور میں اُن کے سروں سے برتن اتروا اتروا کر ان کی تلاشی لے رہا تھا۔ جن کے برتن میں دیکھ چکا وہ بازار کو چلے گئے۔ باقی کیلی، ایک ادھیڑ عمر گوجر اور ایک چھوٹا لڑکا رہ گئے۔ نہ جانے کس قدر کوشش کے بعد میں کیلی سے نظریں ملائے بغیر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارے پاس مکھن ضرور ہے!"

وہ خاموش تھی۔ مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس کے ساتھ دوسرے گوجروں کا سا سلوک کرتا اور اس کی بھی تلاشی لیتا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھ کر دوبارہ کہا۔

"کیلی تمہارے پاس مکھن ضرور ہے!"

وہ بدستور خاموش تھی۔ اتنے میں وہ گوجر بولا۔

"کیلی بولتی کیوں نہیں۔ اگر تیرے پاس مکھن ہے تو بتا دے۔ بابو جی سے دام بھی زیادہ ملیں گے، اور نقد بھی ملیں گے۔"

میں نے جرأت کر کے کہا "اگر آج نہیں تو کل ضرور لانا۔ تم جس قدر بھی مکھن یا دودھ لاؤ گی میں خرید لوں گا۔"

اس نے نہایت آہستہ آواز میں کہا "جی میری لاگ گردھاری شاہ سے ہے۔"

میں نے کہا "میں گردھاری سے دام زیادہ دوں گا۔ تم لاگ چھوڑ دو۔"

وہ بدستور نگاہیں زمین پر گاڑے خاموش کھڑی تھی۔ میں دھڑکتے

ہوتے دل سے اس کے زیادہ قریب ہو گیا اور یقین ہونے پر کہنے لگا میں واقعی اُس سے دام زیادہ دوں گا۔"

وہ شرما گئی اور پہلی بار اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ میرے دل میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"تم کبھی کبھی آیا کرتی ہو؟" اس نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جب بھی تم آؤ ہمیں دودھ دیا کرو" میں مُصر تھا۔ ساتھ ہی میں نے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ گوجر بہت لالچی لوگ ہوتے ہیں۔ وہ شاید اتنے بڑے نوٹ کو دیکھ کر انکار نہ کر سکے گی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس جال میں پھنس جائے گی۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب معاملہ قطعاً اس کے برعکس ہوا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں دودھ نہیں لایا کرتی" وہ جانے لگی۔

"تو اور جو کچھ بھی لائی ہو وہی سہی" میں نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

"میں کچھ بھی نہیں لایا کرتی اور میں کبھی نہیں آیا کرتی۔" اس نے چیں بہ جبیں ہو کر غصہ میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ کہے۔ ادھیڑ عمر گوجر جو کیلی کو سمجھا رہا تھا۔ کہ نوٹ لے لو ـــــ جب گردھاری شاہ سے دام بھی زیادہ ملتے ہیں اور روپے بھی پیشگی ملتے ہیں تو تمہیں اور کیا چاہئے؟ اس پر کیلی ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس سے مخاطب ہوئی۔

"کاکو تمہیں میرے معاملے میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟" اتنا کہہ کر وہ غصے میں چل دی۔

اس سے پیشتر میرا خیال ان غریب گوجروں کے متعلق کچھ اور ہوا کرتا تھا۔ مگر اس واقعے نے مجھے بتا دیا کہ ان میں حقیقی معنوں میں اخلاق موجود ہے۔ کیلی واقعی ایک با اخلاق اور باعصمت گوجری تھی۔ گو اس کے اس رویے پر مجھے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ مگر اس کی سچی قدر میرے دل میں مستحکم ہو گئی۔

ہر صبح اور دوپہر کو سڑک پر جا کر گوجروں سے باتیں کرنا میرا معمول ہو گیا تھا۔ کیلی ہمیشہ نظریں جھکائے خاموشی سے گزر جایا کرتی تھی۔ شاید میں اسے ناپسند تھا۔

ایک دن شام کے قریب میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آہیں بھرتے معلوم ہوتے تھے۔ میری روح پر ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ سورج دور پہاڑ کے پیچھے ڈوبا ہی چاہتا تھا۔ شام کا پہلا ستارہ افق پر نمودار ہو چکا تھا۔

کیلی کا خیال میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ باوجود ہزار کوشش کے اس روز کا اداس کرنے والا واقعہ میری نگاہوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ آخر کیلی جیسی غریب لڑکی میلے کچیلے گوجروں کے ساتھ رہنے والی اس قدر مغرور کیوں ہے؟ اگر اس کی زندگی کا واحد مقصد دودھ مکھن بیچنا ہی ہے تو یہ وہ خصوصاً میرے پاس دودھ بیچنے سے کیوں انکار کرتی ہے؟.....

میں انہیں خیالات میں غرق تھا کہ معذر بھائی ڈاک لے کر آئے۔ ڈاک دیکھ کر کھانا کھایا اور کچھ دیر گپ شپ کے بعد چارپائی پر پڑ کر سو رہے۔

دوسرے دن میں حسبِ معمول گوجروں کے انتظار میں سڑک پر جا کھڑا ہوا۔ گوجر آئے تو آشنا نے اشارے سے مجھے علیحدہ بلایا۔ میں اُس کی اس غیرمعمولی روش پر بہت حیران ہوا۔ علیحدگی میں اس نے مجھ سے کہا۔

"بابو جی ایک بات مانیے گا؟"

"ضرور" میں نے بے تاب ہو کر کہا۔

"گردھاری نے کیلی کی لاگ چھوڑ دی ہے۔" اس نے افسوس کے لہجے میں کہا۔

"تو پھر ـــــ میں ـــــ کیلی!" میں حیران تھا کہ کیا کہوں۔

"اگر آپ مہربانی کریں تو کیلی کا دودھ بھی خرید لیا کریں۔"

"اور مکھن بھی اور لسی بھی۔ اور ـــــ جو کچھ بھی وہ لایا کرتی ہے۔"

میں جذبات کی رو میں بہہ گیا۔

وہ حیران ہو کر میرا منہ تک رہی تھی۔ میں نے جذبات پر قابو پا کر کہا۔

"ضرور ـ ضرور ہمیں پہلے ہی زیادہ دودھ کی ضرورت تھی۔"

"وہ بےچاری غریب ہے۔ اس کا بھلا ہو جائے گا!"

"تو وہ آج بھی دودھ لائی ہے؟"

"وہ آج نہیں آئی۔ اس کا دودھ میں لائی ہوں۔ وہ خود آپ کے پاس آتے ہوئے شرم محسوس کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میں نے ان کے اصرار کے باوجود دودھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب کس منہ سے یہ درخواست لے کر جاؤں؟"

"بھلا اس میں شرمانے کی کونسی بات تھی ـــــ چلو اس کا دودھ نوکر سے تلواؤ۔ کل اس سے کہنا کہ خود آئے اور جس قدر دودھ مکھن ہو لے آئے ـــــ پیسے نقد ملیں گے ـــــ پیشگی چاہئے؟"

"اگر آپ چاہیں تو دے سکتے ہیں۔"

میں نے جھٹ ایک روپیہ نکال کر اس کو دے دیا۔ وہ مجھے کل کے انتظار میں چھوڑ کر چلی گئی۔

صفدر بھائی اپنے خیمے سے چلّا چلّا کر کہہ رہے تھے۔ "ارے بھائی اتنے دودھ کی کیا ضرورت ہے؟"

میں جھٹ ان کے پاس گیا اور خوشی سے ناچتے ہوئے کہا۔ "کیلی — اب کیلی دودھ دینے آیا کرے گی۔" انہوں نے لیٹے لیٹے جواب دیا "تم بڑے بدمعاش ہو۔ آخر تم ضد کے پکے نکلے۔ (پھر انگڑائی لے کر) تو لو بھائی آج منہ میٹھا تو کرا دو۔ آج تو تمہاری عید ہے نا؟"

رات بھر کیلی کے خیال میں نیند نہ آئی۔ صبح ناشتے کے بعد ڈاک دیکھنے گیا۔ واپسی پر گو حسبِ معمول آج کیلی بھی ان کے ہمراہ تھی۔ مگر اس کے سر پر کوئی برتن نہ تھا۔ خیمے میں پہنچنے پر نوکر نے کہا۔ "بابو جی آج تو بہت سا مکھن مل گیا ہے۔"

وہ کیسے؟

"آشاں اور اس کے ساتھ والی۔ آج دونوں مکھن لائی ہیں۔"

"ساتھ والی — ساتھ والی کون؟"

"بابو جی وہی جوان سی خوبصورت گجری۔" پھر رک کر "جس کو آپ غور سے دیکھا کرتے ہیں۔"

میں بظاہر سنجیدگی سے کرسی پر کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ مگر دل کو ہر لحظہ انتظار قیامت نظر آ رہا تھا۔ اتنے میں صفدر بھائی بھی انگڑائیاں لیتے پاس ہی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئے اور لگے اونچے سُروں میں گانے۔

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں؛ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔"

اُن کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک تھی اور وہ بار بار کنکھیوں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ بظاہر میں ان کی جانب سے قطعاً بے خبر تھا۔ مگر ان کی موجودگی کا ہر لمحہ مجھ پر شاق گذر رہا تھا۔ میں نے وقت کاٹنے کو کہا۔

"بھائی جان ہم جب سے آئے ہیں۔ ایک دفعہ بھی تو پکنک پر نہیں گئے۔"

"بھائی جان آپ جب بھی چاہیں ہم جا سکتے ہیں۔" وہ طنزاً کہنے لگے۔ "مگر مشکل تو یہ ہے کہ آپ کو عشق کے دھندوں سے ہی فرصت کم ملتی ہے۔ پکنک کے لئے کیا خاک وقت نکلے؟"

اتنے میں باہر آشاں کی آواز آئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو اس کے ساتھ کیلی بھی تھی۔ وہی خاموش، حسین اور مغرور کیلی۔ صفدر بھائی نے بھی جھانکا۔ اور کچھ کہے بغیر باہر نکل آئے۔ میں بھی اٹھ کر ان کے پیچھے باہر آ گیا۔ کیلی نے مجھے دیکھ لیا۔ مگر تجاہل سے نگاہیں پھیر کر باورچی خانے کے پاس بیٹھ گئی۔ جب تک وہ بیٹھی رہی اس نے شاید ایک بار بھی نگاہ اُٹھا کر نہ دیکھا۔

اب کیلی آشاں کے ہمراہ ہر روز آیا کرتی۔ میں ذرا محتاط ہو گیا تاکہ کیلی کا حجاب آہستہ آہستہ اٹھایا جا سکے۔ دو ایک دفعہ میرے اشارے پر باورچی نے انہیں کھانا بھی کھلا دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک دن باورچی خانے میں مرغ بھُن رہا تھا۔ اُس کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ کیلی کی پیاری پیاری آنکھیں بے اختیار باورچی خانے کی جانب اُٹھ گئیں۔ میں نے باورچی کو آواز دے کر کہا کہ ایک بڑی پلیٹ میں مرغ نکال کر لائے۔ پہلے تو انہوں نے کچھ جھجک محسوس کی پھر میرے — اور صفدر بھائی کے بزرگانہ اصرار پر انہوں نے نوالے اٹھائے۔ میں جان بوجھ کر خیمے میں چلا گیا تاکہ وہ حجاب محسوس نہ کریں۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا تو دونوں کمال اشتہا کے ساتھ کھا رہی تھیں۔ میرے دل کو ایک گونہ مسرت حاصل ہوئی۔ شاید ان بے چاریوں نے زندگی میں پہلی بار مرغ کھایا ہو گا۔

کیلی اور آشاں کو پیسے ہم پیشگی ہی ادا کر دیا کرتے تھے اور دام بھی قدرے بازار سے زیادہ دے دیا کرتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اکثر گوجر دودھ اور مکھن ہمارے پاس فروخت کرنا بہتر خیال کرنے لگے۔ ہم بھی جس قدر مکھن ملتا خرید لیتے۔ کیونکہ اب کئی ہمارے دوست اور واقفکار ہم سے مکھن خریدا کرتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مکھن کا ذخیرہ ہمارے ہاں سے ہی ملے گا۔ دوپہر کے وقت ہمارے خیموں کے سامنے بعض وقت بیس بیس پچیس پچیس گوجر اور گجریاں بیٹھی ہوتیں۔

ہم اُنہیں مختلف چیزیں کھانے کو دیتے۔ پھل وغیرہ کھلاتے — یہ سب کیلی کی بدولت تھا۔ آتے جاتے ہمارے ہاں رُک جانا اب گوجروں کا معمول ہو چکا تھا۔ ہم مذاق سے ان کو "اپنی برادری" کہا کرتے تھے۔ گلاب و للو آشاں۔ شاہی۔ درمیراں۔ رجیا۔ روڑی اور — کیلی کیا مرد اور کیا عورتیں سب کے سب ہمارے حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے۔ وہ ہم سے کچھ اس طرح بے تکلف ہو گئے کہ بے دھڑک ہمارے ساتھ چارپائیوں پر اور ہمارے برابر کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ خود بخود باورچی خانے میں گھس کر کھانا نکال لینا تو شاید ان کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ دو ایک دفعہ باورچی بھی ان سے بگڑا مگر میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ آئندہ اُن سے کوئی تعرض نہ کیا کرے۔

باوجود ان تمام باتوں کے کیلی کو مجھ سے نہ کھُلنا تھا نہ کھُلی۔ میں جس قدر اس کی طرف جھکتا اسی قدر وہ مجھ سے کھنچی رہتی۔ وہ عام گوجروں سے بے تکلف نہ تھی۔ صرف درمیراں ہی ایک ایسی عورت تھی جس سے وہ

بے تکلف تھی۔ اس کے ساتھ میں نے اس کو دو ایک بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے دانت کس قدر پیارے تھے!

لالو ایک ایسا مرد تھا جو گوجر مردوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا تھا۔ ایک او بار نہایت ہی سانولا تھا جسم پر میلا سا کرتہ اور کالی لنگوٹ باندھے رکھتا۔ وہ مجھ سے مذاق کرتا اور پرلے درجے کا مسخرہ تھا۔ اگر میں خیمے میں لیٹا ہوتا تو چارپائی کے پاس آ کے بیٹھ جاتا اور ٹپے عاشقانہ انداز میں گاتا مذاق پہ بھی آتا۔

ایک دن میں یونہی کیلی کے خیال میں لیٹا ہوا تھا اور باہر گوجر گپ شپ لڑا رہے تھے۔ لالو اندر آیا اور چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگا۔

"آپ اداس کیوں رہتے ہیں؟" میں نے اُسے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ کسی طرح ٹلنے والا نہ تھا۔ میں نے کہا نہیں تو۔ اس سے کیا مطلب؟

"میں تم سے ایک بات کہوں؟" اس نے نہایت معصومانہ انداز میں پوچھا

"کہو!"

"آپ یقین کریں گے؟"

"کیوں نہیں؟"

"مجھے آپ بہت اچھے لگتے ہیں۔" اس نے اپنے کانپتے ہوئے موٹے موٹے ہونٹوں سے اظہار محبت کیا۔ اس کی آواز میں بولا نرمی تھی وہ کہہ دیتی تھی کہ وہ سادہ گنواروں والے الفاظ واقعی اس کے پاک دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ میں نے اس کا چوڑا کرخت ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبا دیا۔ وہ میرے اعتراف کو سمجھ گیا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کیلی پر دیوانے ہیں ---- مجھے معلوم ہے۔" اس پر تہذیب حاضرہ کا وہ رنگ جس کو ریاکاری کہتے ہیں ابھی نہ چڑھا تھا۔ سادگی اس کا جسم تھا اور سادگی ہی اس کی روح۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بہت ہنسا اور میرے لئے کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔

دوسرے روز اس نے مجھے سکھایا کہ آپ لدّے کی دھار دیکھنے کے بہانے ہمارے ہمراہ چلیں۔ راہ میں ملاقات کا موقع پیدا کروں گا۔ اسی وقت میں نے چلا کر گوجروں سے کہا۔ "سنا ہے تمہاری دھار بہت خوبصورت جگہ ہے۔ اگر دکھا دو تو مہربانی ہوگی۔"

لالو نے چلا کر کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ ابھی چلیں۔ ہمارے ہاں چل کر مہمان رہیں، ہم آپ کے بستر اٹھا لیں گے۔" "ضرور چلئے تھوڑی تکلیف نہ ہوگی۔" سب گوجر متفق تھے۔ صرف ایک کیلی تھی جس نے مسرت کا اظہار نہ کیا وہ بدستور خاموش تھی۔ چونکہ اب تک کیلی کے متعلق میری کیفیت سے تمام گوجر آگاہ ہو چکے تھے اس لئے میں نے جرأت کر کے کہا "اگر کیلی کی خوشی نہیں تو ہم نہیں جائیں گے۔"

آخر لالو اور دوسروں نے کیلی سے رائے پوچھی، اس نے بے پروائی سے مختصراً کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

کیلی کی اس بے رخی نے مجھے رنجیدہ کر دیا۔ مگر لالو کے اصرار پر ہم دوسرے روز چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ دوسرے دن تمام گوجر بازار سے واپسی پر ہمارے خیمے میں پہنچ گئے۔ مختصر بستر، کیمرہ اور دوربین لے کر ہم اُن کے ساتھ ہو لئے

قریب دو میل چلنے کے بعد ہم جنوبی پہاڑ سے مغربی پہاڑ پر پہنچے جہاں سے بہت گھنا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ایک تو کچی سڑک محکمہ جنگلات کے زیر اہتمام ہے اور دوسری پگ ڈنڈی ہے جو گوجروں کے ننگے پاؤں کی مرہون احسان ہے۔ یہ پگ ڈنڈی گو نسبتاً جنگلات کی سڑک سے مختصر ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ غیر ہموار اور دشوار گذار ہے۔ دس میل تک برابر چڑھائی ہی چڑھائی ہے۔ اکثر جگہ پگ ڈنڈی اس قدر تنگ ہے کہ مشکل سے ایک آدمی ایک وقت میں گذر سکتا ہے۔ چنانچہ اس پر گوجر لوگ قطار باندھ کر چلتے ہیں۔

لالو نے پہلے ہی یہ انتظام کر دیا تھا کہ کیلی اور میں آگے پیچھے چلیں۔ باقی سب میرے پیچھے پیچھے تھے۔ ہم انگریزی میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ لالو مسکراہٹ بھرے ہماری نقل اتارتا جاتا تھا۔ کیلی خاموش چلی جا رہی تھی میں نے اس سے بات چیت کرنے کی بہت کوشش کی مگر سوائے گاہے گاہے مسکرانے کے اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ دوسرے گوجروں کی طرح نہایت تیز رفتار تھی۔ چند میل چلنے کے بعد میرا تھکن سے یہ حال تھا کہ پنڈلیاں مارے درد کے پھٹی جا رہی تھیں۔ بہت جی چاہا کہ راہ میں دم لینے کو بیٹھ جاؤں۔ مگر کیلی کی وجہ سے بے چون و چرا چلا جا رہا تھا۔ کم بخت کیلی ایک ہی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

یکایک پگ ڈنڈی کی بائیں طرف قدرے ایک فراخ جگہ پر یہ مختصر سا قافلہ رُک گیا۔ یہاں ایک صاف شفاف پانی کا چشمہ اُبل رہا تھا۔ یہ گوجروں کی عارضی آرام گاہ تھی۔ سب نے برتن اتار کر رکھ دئیے اور سستانے بیٹھ

گئے۔ ہماری بھی جان میں جان آئی۔ لالو مسکراتا ہوا میری جانب آیا اور میری ٹانگیں دبانے لگا۔ صفدر بھائی پسینہ پونچھتے ہوئے بولے "لالو ابھی کتنے میل اور باقی ہیں؟"

"بس دو چار میل!" اس نے جواب دیا۔

سب گوجروں نے چشمے سے پانی پیا۔ ایک ہی برتن تھا کیسلی کا بچا ہوا پانی لالو نے مجھے بھی تبرکاً پلا دیا، کیسلی بدستور خاموش تھی۔

یہاں پر ہم نے کیسلی کی بے خبری میں اس کی ایک تصویر کھینچ اتار لی۔ اس کے بعد سب گوجروں کی تصویر اتاری جس میں کیسلی نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ لالو پیراہیٹ پہنے درمیان میں کھڑا تھا۔ جب گوجر آگے جانے کو تیار ہوئے تو میں نے بڑھ کر کیسلی کے برتن اٹھا لئے۔ کیسلی نے بہت اصرار کیا مگر میں نے کہا۔

"تمہیں کیا حق ہے کہ تم اکیلے ہی ان کو اٹھاؤ"۔ اس پر وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی اور اس نے زمین پر سے میری دوربین اٹھائی اور سب گوجروں سے آگے نکل گئی۔ میں بھی ہمت کر کے اس کے پیچھے جا پہنچا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "آپ مجھے بہت ستاتے ہیں"۔ میں دل میں کہہ رہا تھا "کیسلی اور مجھ سے مسکرا کر بات کرے"!

میں نے محسوس کیا کہ اب کیسلی پہلے کی طرح مجھ سے گریزاں نہیں۔ میں اس سے کھلم کھلا اظہارِ محبت کرتا جاتا تھا۔ اور وہ مسکراتی جاتی تھی۔ وہ منہ سے کچھ نہ کہتی تھی۔ شاید وہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد میں نے سب گوجروں کو آواز دے کر کہا۔ "آؤ تمہیں انگریزی سکھائیں"۔

"جرور جرور!!" کئی آوازوں سے جنگل گونج اٹھا۔

"گڈ مارننگ" میں نے ان کو اپنے پیچھے کہنے کو کہا۔

"گڈ مانی" سب بہ یک آواز بولے۔

"مائی ڈارلنگ"

"مائی ڈارلیں"

"کس می!"

"کسیں!"

"گڈ مارننگ۔ مائی ڈارلنگ کس می!"

"گڈ مارنی۔ مائی ڈالیں کس ہیں!"

میں نے کیسلی کی طرف کان لگائے۔ اللہ اکبر! وہ بھی وہ کچھ کہہ رہی تھی جو اگر وہ سمجھتی تو شاید کبھی نہ کہتی۔ اب میں نے کہا۔

"تم میں سے بعض غلط کہتے ہو۔ سب علیحدہ علیحدہ سناؤ"۔ سب نے میرے حکم کی تعمیل میں باری باری سے اپنا سبق سنایا۔ اب کیسلی کی باری آئی اس نے چلتے چلتے میری جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کے سرخ ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ کھیل رہی تھی، ایک نہایت سریلی اور شرمیلی آواز سے میرا سازِ دل گونج اٹھا۔

"گڈ مارننگ۔ مائی ڈارلنگ۔ کس!" کس کے بعد اس نے میری جانب استفسارانہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "کس می!"

"کس می!" ایک بار پھر میرے دل کے تار لرز اٹھے۔ میں نے اس سے بار بار سنا۔ اس نے مجھے بار بار سنایا۔ جنگل کی فضا لہراتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب اس کے ہونٹوں سے کس می نکلتا تھا تو میرا جی چاہتا تھا کہ بے اختیار ہو کر اس کے رس بھرے ہونٹ چوم لوں ـــــ میں نے اس سے کہا کہ وہ ہر روز مجھے یہ سبق سنایا کرے۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔

گوجر لگاتار سبق دہراتے رہے۔ کیسلی بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی۔ آخر وہ مقام آ گیا جہاں سے ہمارے راستے علیحدہ علیحدہ سمتوں میں جاتے تھے۔ اس جگہ ہم سب ٹھہر گئے۔ کیسلی نے مجھ سے برتن لے لئے اور دوربین میرے حوالے کر دی۔ دوربین نکال کر میں نے سب کو دکھائی۔ بوٹ اس جگہ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ سب نے بڑے اشتیاق سے اس عجوبے کو دیکھا۔ کیسلی نے بھی دوربین ہاتھ میں لی۔ جونہی وہ دوربین کو آنکھوں کے نزدیک لے گئی۔ اس نے فوراً ڈر کر ہٹا لی۔ میرے کہنے پر اس نے پھر آنکھوں سے لگائی۔ اس دفعہ اس کے پیارے پیارے ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ اس آلے کے موجد کی ذہانت کی داد دے رہی تھی۔ دوربین میں وہ کوئی چیز تلاش کر رہی تھی۔ اچانک ایک جگہ دوربین رکی اور اس نے کہا۔ "وہ آپ کا خیمہ"! میرا دل چاہتا تھا کہ وہ یوں ہی کہتی رہے اور میں یوں ہی سنتا جاؤں۔ وہ یونہی دوربین دیکھتی رہے اور میں یوں ہی اس کو دیکھتا رہوں۔

چونکہ تاریکی پھیل رہی تھی اس لئے گوجر جانا چاہتے تھے۔ ہم ان سے صبح سویرے دھار پر آنے کا وعدہ کر کے سناسار کی جانب رخصت ہوئے ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ کیسلی کی آواز آئی۔

"گڈ لنگ کس می!" تلفظ بلا کا صاف تھا۔ صفدر بھائی نے میری جانب مڑ کر دیکھا تو میری آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک رہے تھے۔

سنا سار پہنچنے پر ہم تکان سے چور تھے ڈاک بنگلے میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ بھوک لگ رہی تھی کھانا جو ساتھ لائے تھے۔ کھایا۔ اور نیند کے غلبے سے چارپائی پر ڈال دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو نو بج چکے تھے دل کا خون ہو گیا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ گوجر تو کب کے دھار تک چل چکے ہوں گے۔ صفدر بھائی کی منتیں کر کے بوٹ کو واپس ہوئے۔ اس دفعہ اترائی کی وجہ سے مسافت بہ آسانی طے ہو گئی۔ بوٹ پہنچنے پر شبیر سے معلوم ہوا کہ کیلی نہیں آئی تھی اور آشاں ... دوپہر کو جب گوجر حسب معمول ہمارے خیمے میں آنے لگے تو درمیراں جو اب میری ساز دار بن چکی تھی۔ میرے پاس آ کر کہنے لگی۔

"کیلی تو آپ کے لئے نہیں آئی۔ ہمارے آنے تک وہ آپ کی منتظر تھی۔ وہ کہتی تھی وہ ضرور آئیں گے کیونکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ اگر ہم سب چلے گئے تو ان کو پوچھنے والا کون ہو گا۔"

"کیا یہ سچ ہے؟" میں نے حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

وہ کہنے لگی "وہ تو آپ کو بہت اچھا سمجھتی ہے۔ اور بہت یاد کرتی ہے اکثر آپ کی تعریف کرتی ہے۔ رات کو میرے قریب ہی تو سوتی ہے۔ رات گئے تک آپ کی باتیں کرتی رہتی ہے۔"

مجھے ان میں سے ایک بات کا بھی یقین نہ آسکتا تھا۔ کیونکہ کیلی کا طرز عمل ان باتوں کے قطعی برعکس تھا۔

ایک دن درمیراں نے مجھ سے علیحدگی میں کہا۔

"کیلی آپ سے الگ ملنا چاہتی ہے!"

"کیا وہ کیلی جو لدھے کی دھار کی شہزادی ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں وہی کیلی۔ جس کو آپ سے بہت محبت ہے۔ جو آپ کو دل سے چاہتی ہے" اس نے جواب دیا۔

"اور میراں جو کچھ تم کہہ رہی ہو خود بھی سمجھ رہی ہو؟"

"اگر آپ کو یقین نہیں تو آج ہی اس سے مل کر دیکھ لیں۔"

"آج ہی!!!"

"ہاں آج ہی" اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"کب؟"

"واپسی پر"

"وہ کیسے ــــــ؟ گوجر تمہارے ہمراہ ہوں گے۔"

"آپ ایسا کیجئے۔ ہمارے آنے سے پہلے ہی ہماری راہ میں جنگل میں جا بیٹھئے۔ ہم آج دوسروں سے پہلے ہی آ جائیں گی اور آپ سے آ کر مل جائیں گی۔"

میں مبہوت اس کی نہ یقین کرنے والی باتوں کو سن رہا تھا۔ میں نے اپنی بیداری کا اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے اس سے پوچھا

"تو کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ کیلی بھی آئے گی؟"

"آپ اس قدر حیران نہ ہوں۔ میری بات پر عمل کیجئے اور پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

اس دوپہر کو ہمارے ہاں کچھ مہمان کھانے پر مدعو تھے۔ میں ان کے آنے سے قبل ہی کھسک گیا۔ صفدر بھائی اپنے خیمے میں "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" الاپ رہے تھے۔

میں ایک میل کے فاصلے پر جنگل میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس جگہ سے سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ یکایک وہ مجھے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ جوں جوں قریب آتی جاتی تھیں میرا اشتیاق بڑھتا جاتا تھا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا جب مجھے کیلی ملے گی تو میں اس سے کیا کہوں گا اور کیا وہ سچ مچ آئے گی۔

اچانک مجھے ان کے پیچھے پیچھے ایک گوجر بھی آتا دکھائی دیا۔ نالے کے پل پر پہنچنے تک وہ کیلی اور درمیراں سے آگے نکل آیا۔ میں اس کی نگاہوں سے چھپنے کے لئے پگڈنڈی کے نیچے کی جانب اتر گیا۔ مگر وہ بہت قریب آ چکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے اب چھپنا بے کار سمجھا اور واپس چڑھنا شروع کیا۔ اس کو کچھ شبہ ہوا اور وہ قریب ہی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ مجھے اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے آنے سے قبل ہی اس کو وہاں سے بھگا دوں۔ میں نے اسے کرخت آواز میں پوچھا!

"تم اتنے جوان ہو کر اس قدر جلدی تھک گئے۔ دھار تک کیسے پہنچو گے؟"

"اور تم نہیں تھک گئے ہو کیا؟" وہ گستاخ لہجے میں بولا۔

اتنے میں کیلی اور درمیراں آ پہنچیں۔ وہ اٹھا اور ان کو ساتھ چلنے کو کہا۔ درمیراں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم چلو ہم ذرا سستا لیں۔" مگر اس کے اصرار پر مجھے غصہ آ گیا اور میں کہنے سے نہ رہ سکا۔

"تم جاؤ تمہیں ان سے کیا؟"

"اور تمہیں ان سے کیا؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

میں نے غضبناک ہوکر زور سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ اس نے اپنی چھڑی مجھے مارنے کو اٹھائی۔ میں نے وہی چھڑی چھین کر دو تین اس کے جا دیں۔ کیلی اور درمیاں یہ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ کیلی نے زور سے رونا شروع کر دیا۔ گوجر مار کھا کر بھاگا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا تاکہ اس کو دور تک پہنچا آؤں۔ جب واپس آیا تو کیلی رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"آپ نے میرے بھائی کو کیوں مارا؟"

"تمہارا بھائی؟ —— میں نے حیرانی سے کہا

"اگر آپ کو کوئی مارے تو؟" وہ اسی روتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

میں نے خاموشی سے وہی چھڑی اس کے ہاتھ میں دے دی اور کہا "لو تم مجھے اس سے بھی زیادہ مار لو۔"

اس کی سرمگیں آنکھیں نم تھیں۔ اس کے دنداسے سے سرخ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کے کپڑے میں نے کبھی اتنے صاف نہ دیکھے تھے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ سنوری ہوئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ سب اہتمام میری ملاقات کی وجہ سے ہے۔ اس وقت عجیب سماں تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو۔ اس کے ہونٹوں میں تھرتھراہٹ درمیاں اس کو بار بار چمکار رہی تھی۔

"چپ ہو جا بیٹی۔ آخر اس نے بھی تو بابو کو گالیاں دی تھیں —— اور بابو کو کب معلوم تھا کہ وہ تمہارا بہنوئی ہے۔ کل شام ہی تو وہ جہلم سے آیا تھا۔"

کیلی نے جب مجھے مار کھانے پر مصر دیکھا تو وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کی نم آلود آنکھیں وہ پیغام دے رہی تھیں۔ جس کو میرا رواں رواں سننے کے لئے عرصے سے بے تاب تھا۔

درمیاں نے اس کے برتن اٹھاتے ہوئے کہا "جاؤ پگ ڈنڈی سے پرے ہٹ کر بات چیت کر لو۔" وہ چلتے چلتے رک کر کہنے لگی ——

"کیلی اب راتوں کو کبھی شکایت نہ کرنا کہ بابو سے ملنے کا موقع نہیں ملتا۔ لو میں چلتی ہوں۔" کیلی نے خاموشی سے پگڈنڈی کو چھوڑ کر اوپر کی جانب چڑھنا شروع کر دیا۔ میں بھی اس ساحرہ کے پیچھے پیچھے ایک سحر زدہ کی طرح چلنے لگا۔ تھوڑی دور پگ ڈنڈی پر چلنے والوں کی نظروں سے اوجھل وہ ایک بڑی چٹان کے قریب رک گئی۔ میں اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کا تنفس تیز تھا، اور اس کا چہرہ سرخ —— وہ نظریں جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

وہی صبر آزما خاموشی ان قیمتی لمحوں میں بھی اس پر طاری تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے بلائے بغیر نہ بولے گی۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "کیلی!"

وہ خاموش تھی۔

"کیلی!!" میں نے دوبارہ اس کو مخاطب کیا۔

وہ سر جھکائے بدستور خاموش تھی۔

"کیلی!!!" میں نے مرتعش ہاتھ سے اس کی چاند جیسی ٹھوڑی کو چھوا۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔ گویا ایک بجلی کوند گئی۔ وہ ایک حسین مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ میں بے خود ہو کر اس سے لپٹ گیا۔ اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر مہر محبت ثبت کر دی۔ وہ بید مجنوں کی طرح کانپنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں غایت درجہ کی حیرت بس رہی تھی۔ اس کی آنکھیں زبان خاموشی سے کہہ رہی تھیں۔ "اس پرسرور اور پرکیف چیز کا نام کیا ہے؟"

کیلی کے بہنوئی کی کرخت صلواتوں نے مجھے اس رنگین خواب سے چونکا دیا۔ وہ سامنے کھڑا یہ تمام نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے بے طرح کوس رہا تھا۔ میں نے جوش میں آ کر کیلی سے کہا۔

"اس سے کہہ دو کہ چلا جائے۔"

آہ! وہ کس طرح کہہ سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی بے چارگی اور مجبوری عیاں تھی۔ وہ عورت تھی۔ وہ بغاوت کے لئے نہیں فرمانبرداری کے لئے پیدا کی گئی تھی —— دور سڑک پر گوجر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں موقع کی نزاکت کو بھانپ گیا۔ میں نے خاموش و مبہوت کیلی سے کہا "تو میں چلتا ہوں"۔ میں نے جب جانے کو قدم اٹھایا تو اس نے میری جانب حسرت بھری نگاہ اٹھا کر کہا۔

"بابو جی —— نہ جائیے!"

اس کے لہجے میں ایک دردناک استدعا تھی۔ اس کے انداز میں ایک دبی ہوئی گذارش۔ وہ محسوس کرتی تھی مگر اپنے احساسات کا اظہار نہ کر سکتی تھی۔ وہ فطرتاً خاموش تھی اور محبت کی سلگتی ہوئی آگ بھی خاموش ہوتی ہے۔

میں بزدلوں کی طرح چمپت ہونا چاہتا تھا۔ میں نے جاتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں برسات کی جھڑی لگ رہی تھی، اس نے بے بسی کے عالم میں میری جانب ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"مجھے بھی ساتھ لے جائیے —— بابو جی!"

مگر میں اس شخص کی طرح بھاگ رہا تھا جس کے تعاقب میں موت ہو۔ میں دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کر کے سرپٹ جا رہا تھا۔ "بدنامی، رسوائی

سماج کو مجھ پہ بہت ہنستے ہوئے میرا پیچھا کر رہے تھے اور میں اُن سے رہائی پانے جا رہا تھا۔

تم ... بجھ ... میں ... تو ... جا چکے تھے۔ ... مجھے دیکھ کر وہ بے طرح بگڑتے اور سخت ... اپنی برچھائیں وہ خاموش ہو گئے ... کیلی نہ آئی اور نہ آشا ... کا ... میں ... کیلی ... دن ... میں ... ایک دن ... سے پوچھا تو اس نے مختصر جواب دیا:

کیلی نہیں آئے گی!

... کا یہی جواب تھا۔

کیلی نہیں آئے گی!

... ان کی ... ناک خاموشی ہوا کرتی تھی۔

... آگیا ... چکے تھے ... میں ایک ... نگلیں ... گیا ... معمول تھا کہ ہر صبح ... کو گذرتے دیکھتا ... یوں محسوس ہوتا تھا کہ ... جسم ہیں۔ ان کی روح پرواز کر چکی ہے ... خوشی ان سے چھن چکی تھی۔ وہ میری جانب دیکھتے اور کچھ کہے بغیر پاس سے گذر جاتے۔

وسط اکتوبر تک ایک ہی مسافر ہوتا ہیں ... کی گم شدہ بچے کی طرح سڑک پہ گھومتا پھرتا تھا۔ میری آنکھیں کیلی کی منتظر تھیں۔ جنگل میں ہوا کی سائیں سائیں یہی کہتی معلوم ہوتی تھی۔

کیلی نہیں آئے گی!

مسعود شاہد

غزل

بھول سکتی نہیں وہ بزمِ شبینہ ساقی
ہم کو جب آیا ہے پینے کا قرینہ ساقی

سر جھکاتے ہی یہاں کھلتے ہیں اسرارِ وجود
درِ میخانہ ہے یا عرش کا زینہ ساقی

زندگی تلخ مصائب کا رواں دریا تھی
دل مرحوم تھا نازک سا سفینہ ساقی

تیرے رندوں نے بڑھایا جو سفینہ ہنس کر
پھٹ گیا وحشتِ گرداب کا سینہ ساقی

ہم نشینی پہ اضافہ ہے ترا لطفِ نظر
رند رکھ سکتا ہے کب رند سے کینہ ساقی

تیرے ساغر سے جو ٹکرا گیا ساغر میرا
ہنس پڑی گویا کوئی شوخ حسینہ ساقی

ذرہ ذرہ نگہہِ شوق کی رہ میں حائل
توبہ توبہ ترے پردے کا قرینہ ساقی

شکوۂ کم نگہی تجھ سے ؛ مگر کیا کیجے
تجھ کو آیا نہ محبت کا قرینہ ساقی

شوقِ نظارۂ فطرت ہے نہایت بے تاب
اشک خونیں ہیں نگاہوں کا پسینہ ساقی

عبدالعزیز فطرت

وقت کا راگ

مارچ میں جبکہ جہاں کیف سحر ہو پیدا
اس سے پہلے کہ بہاراں کو چمن سے رخصت

سادگی شوخ ہوا سے گل تر سے رونق
نکہت و ناز ہو ریحان دمن سے رخصت

مست بھونرے کی صدا میں ہو صبا محو خرام
وش نئی غنچوں کے دامن سے رخصت

پیشتر اس سے کہ ہو آگ بگولہ سورج
اور نادیدہ صبا مست ہو گلشن سے رخصت

ہمیشہ اس سے کہ ہو جائے محبت بیری
اور مایوس تمنا ہو وطن سے رخصت

مارچ میں ایسے ہی وقت آ مرے دیرینہ ندیم
اے مرے دوست! مجھے رنج و محن سے رخصت

(۲)

جون میں جب شب تاریک کا آنچل لے کر
مسکراتے ہیں مہکتے ہوئے تارے شب بھر

گدگداتی ہیں سیہ فام فضا کو کرنیں
کروٹیں لیتے ہیں بیتاب نظارے شب بھر

بھیگ جاتی ہے سکوں ریز خموشی سے ہوا
جاگتے رہتے ہیں دریا کے کنارے شب بھر

جب کھیتوں سے لگتے ہیں خموشی کے درخت
اور ہوتے ہیں محبت کے اشارے شب بھر

یا شب مہ میں کہ پانی میں مزا دیتا ہے
عکس رقصاں ہوا موجوں کے سہارے شب بھر

جون میں ایسے ہی وقت آ مرے دیرینہ ندیم
ہم جئیں عشق کی مستی کے سہارے شب بھر

(۳)

اور ستمبر میں کہ بدلا ہو گرما کا لباس
لامکاں چاندنی راتوں کی ہو وسعت جس وقت

بھیگے بھیگے سے ترانے ہوں فضاؤں میں رقصاں
عشق کو ہو غم ماضی کی بلندی جس وقت

بیخودی جھومتی پھرتی ہو چمن زاروں میں
اور کسی ساتھ کبھی جاتی ہو راحت جس وقت

جب فرشتوں کے پروں سے ہو رواں موسیقی
ساغر نور میں ڈھلتی ہو محبت جس وقت

ایک سا حال ہو سب کا ہو جمادات کہ خلق
رونق آرائے دو عالم ہو مسرت جس وقت

ہاں ستمبر ہی میں آ اے مرے دیرینہ ندیم
آ! تجھے کھینچ کے لائے مری الفت جس وقت

(۴)

پھر دسمبر میں کہ انگڑائیاں لیتا ہو شباب
آگ فرقت کے مصائب کو دکھائیں دونوں

اونگھتی ہوں شب تاریک کی لمبی گھڑیاں
بخت خوابیدہ مقدر کو جگائیں دونوں

مسکراتے ہوں در و بام قمر کی صورت
فرط احساس سے جب اشک بہائیں دونوں

بیٹھ کر گرم لحافوں میں اٹھا کر ساغر
اپنی دنیا کو ہواؤں میں اڑائیں دونوں

پیار کی باتیں ہوں جب سانس دھڑکا جائے
سر پھری کو زمانے سے مٹائیں دونوں

ہاں دسمبر میں بھی آ اے مرے دیرینہ ندیم
آج کے کام کو کل پر نہ اٹھائیں دونوں

یوسف ظفر

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

ساقی افسانہ نمبر جولائی۔

ٹوٹے ہوئے تارے۔ اس حیرت انگیز مطالعے کو اگر کردار نگاری کا معجزہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کرشن چندر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں فرد کی نفسیات کو سب سے اہم درجہ دیتے ہیں۔ اور اپنے بیان کی سب لطافتیں اور شوخیاں اسی عنصر کی تحلیل میں صرف کرتے ہیں۔ کہانی پن ان کے ہاں ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کے عام واقعات اور معاشرت کے معمولی حادثے جنہیں ہم ایک سرسری نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ ان کے اظہار فن کے لئے بہت کافی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیق میں کسی ڈرامائی تکمیل کے جویاں نہیں ہوتے بلکہ اپنے فن کو کردار کے نقوش ابھارنے اور پڑھنے والے کو افسانے کے ماحول میں غرق کر دینے میں بروئے کار لاتے ہیں اس لئے ان کے کارناموں کی ادبی حیثیت بسا اوقات بہت بلند ہو جاتی ہے۔

زیر نظر افسانے میں نازک ترین نفسیاتی کیفیتوں کے ایک لطیف اظہار کے علاوہ فن کار نے ایک علامتی اثر بھی پیدا کیا ہے۔ علامتیت

SYMBOLISM، جدید افسانہ نگاری کا ایک دلچسپ پہلو ہے افسانہ نگار بعض اوقات غیر شعوری طور پر کسی منظر یا صورت سے متاثر ہوتا ہے اور وہ منظر اس کے شعور پر چلتے ہی چند خاص کیفیتیں یا تاثرات کے چند خاص سلسلے پیدا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک خالص مادی اور خارجی صورت ایک مکمل نفسیاتی کیفیت کی کلید بن جاتی ہے۔ "ٹوٹے ہوئے تارے" کا پس منظر اسی قسم کی صورتوں اور ان کے نفسیاتی تاثرات سے معمور ہے۔ وادی کشمیر کی سڑک جو دیو زاد سیاہ پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ افسانہ نگار کے شعور پر وہی اثر پیدا کرتی ہے جو تیرہ کے گھنے اور گھنے جڑے سیاہ بالوں کے درمیان نکلی ہوئی سیدھی مانگ پیدا کرتی ہے۔ اس تصور کی تاریکی میں جو ایک امیر کی جیب کا سلسلہ دوسرے امیر کی جیب سے ملاتا ہے اور جو پہاڑوں، ڈاک بنگلوں، زلفوں اور دلوں کی تاریکیوں میں یکساں طور پر چمکتا ہے۔

افسانہ نگار کی روح پر اس دنیا کے اندھیرے نے ایک ناقابل بیان بوجھ ڈال رکھا ہے، وہ اس کے تلے دبی جا رہی ہے اور اس عالم میں وہ اپنا بے کیف اضطراب اپنا یاس انگیز درد و کرب اس تیلے میں منتقل کر دیتا ہے۔ جو آگے چل کر اس کے افسانے کا کردار بنتا ہے اور جو پھر اپنے ماحول کو اپنی ہر جنبش سے پھوٹنے والی ظلمتوں سے تیرہ و تار کر دیتا ہے۔

افسانے کا افسانہ فقط یہ ہے کہ ایک رئیس زادہ جو اپنے طبقے کا مثالی نمائندہ ہے کشمیر کو جانے والی سڑک پر اپنی خالی، بے کیف اور اداس زندگی میں رنگینی پیدا کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہے اور بار بار کہ وہ اپنے زہر کا تریاق زہر ہی میں ڈھونڈتا ہے اور سراب کو آب حیات سمجھ کر اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا ہے، اس کی سعی لاحاصل خبر نہیں کب تک یونہی جاری رہے گی۔ افسانہ نگار نے اس عالم اضطراب کی تمام بے قراریوں کو اپنی نادرہ کاری سے یوں اسیر کیا ہے کہ افسانے کی ہر سطر ایک مچلتی ہوئی موج بن گئی ہے۔ دیکھئے:

> "جب وہ چومیل کے ڈاک بنگلے پر پہنچا تو ہر طرف شام کی اداسی چھا رہی تھی۔ سامنے سیاہ پہاڑ کسی دیوزاد کی دیوار معلوم ہو رہا تھا، اور درختوں کی چوٹیاں پہرے داروں کی بندوقیں۔ اب وہ یہ آپ ہی آپ سے اپنے آپ سے قلعے کی دیواروں سے پہرے داروں کی بندوقوں سے، تنہائی سے، ڈر محسوس ہوا۔ اپنے آپ

سے [illegible] تیرگی سے [illegible] جو اس کی روح پر چھائی ہوئی تھی۔ [illegible] جیسے سایوں کی طرح جیسے وہ اس [illegible] دل کے عالم میں [illegible] ایک [illegible] کو [illegible] اس نے [illegible] اس کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] کا [illegible]

"ایک [illegible] دیکھو [illegible]"

"بہت اچھا [illegible]"

[illegible] اس نے [illegible] کے ہاتھ [illegible]

"[illegible] آؤ [illegible]"

[illegible] میں اس وقت کوئی نہ تھا اور اس نے سوچا کہ وہ اسی وقت گھر جا کر [illegible] آنسو بہا کر کہے میں اکیلا ہوں، میری جان میں اکیلا ہوں۔ مجھے تم سے [illegible] ہے...... [illegible] وہ میز پر جھک جائے گا [illegible] یکایک کسی نے اس کے شانے کو ہلایا۔ بیرا اُس کے پاس کھڑا تھا اور اس کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔

"تم کون ہو؟" اُس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا

"میرا نام زبیدہ ہے" عورت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا

وہ کرسی کا سہارا لے کر اُٹھا اور کمرے کے اندر [illegible] کے لئے [illegible] بیرے نے [illegible] جانا چاہا، لیکن اُس نے [illegible] کر کہا "ہٹ جاؤ۔ میں کمرے میں خود چلا جاؤں گا" [illegible] اس وقت اس جہاز کی طرح محسوس کر رہا تھا جو کسی [illegible] میں سفر کر رہا ہو۔ ایک سیاہ کھائی سی سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ صرف کمرے کے ایک کونے پر ایک چھوٹا سا لیمپ جل رہا تھا۔ روشنی ... چاروں طرف تاریکی کا سمندر اور بیچ میں روشنی کا [illegible]...... وہ اس روشنی کی طرف بڑھتا گیا۔ شاید وہ اب بھی بچ جائے گا۔

یکایک اُس نے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اور وہ چونک گیا۔ بیرے نے عورت کو اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ عورت دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"آؤ...... آؤ......" اُس نے عورت کی طرف ہاتھ بڑھا کر جھومتے ہوئے کہا "[illegible] آؤ روشنی [illegible] ہے"

[illegible] ہولے ہولے قدموں سے قریب آ گئی تھی۔ اس کے بالوں [illegible] میں سے ایک سفید سی [illegible] نکلی ہوئی تھی۔ چاندی [illegible] کی طرح......

آپ نے دیکھا اضطراب، مایوسی اور روحانی تنہائی کی یہ کیفیت جب خارجی دنیا میں اپنے وجود کا اظہار کرتی ہے تو اسے نمایاں کرنے کے لئے تمام متعلقات میں سے [illegible] اس روشن اندھیرے کمرے کے گوشے میں رکھا ہوا چھوٹا سا فانوس، اور زبیدہ کے گھنے بالوں میں چمکتی ہوئی چاندی کے تار کی سی مانگ کس طرح فن کار کی مدد کو آ پہنچتی ہے۔ اور پھر دل کی خلا میں جب "وہ" کوئی [illegible] موجود نہیں [illegible] تمہارے پاس میں ایسی موثر کارہی کر اپنی مردہ تمناؤں کا [illegible] ہے۔ [illegible] جذبات کی اس سے نازک ترمثال شاید ہی کہیں ملے۔ افسانے کا ہیرو دراصل ایک ٹائپ ہے، نمونہ ہے اس ذہنی مفلسی کا، اس جذباتی [illegible] کا جو ہمارے متوسط طبقے کے ایسے افراد میں عام طور پر پائی جاتی ہے، جن کی جنسی آرزوئیں پیدا ہونے سے پہلے پوری ہو جاتی ہیں۔ جن کی روحانی تمنائیں قبل اس کے کہ کسی مرکز کے گرد گھومنے پائیں، سیم و زر کے [illegible] آوازوں کے دباؤ سے ایسی منتشر ہوتی ہیں کہ پھر ان کا سراغ تک نہیں ملتا۔ اور جن کے لئے ایک بھٹی ہوئی مرغی اور ایک محبوب شبانہ میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ اور جن کے نزدیک مرغی کا دبلا پتلا ہونا ایسا ہی گھاٹے کا سودا ہے جیسا کہ عورت کا دبلا پتلا ہونا۔ اس ٹائپ کی جنسی بھوک "جوع الکلب" بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ طلب کی بلندیوں سے کبھی آشنا نہیں ہوتی۔ اس کے دل میں ہمیشہ ایک تبسم سا کھلایا جاتا ہے جو کبھی مہر و محبت کا طالب، کبھی لطف رفاقت کا جویاں کبھی سکون خاطر کا خواہاں رہتا ہے مگر اس سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ آگے دیکھیے!

"اُس عورت کے شانے پر جھک کر راز دارانہ لہجے میں کہا "کیوں؟"

"[illegible] ہو...... تمہارا نام کیا ہے؟"

"زبیدہ" اُس نے بے جان سے لہجے میں جواب دیا۔

"شبیدہ...... شبیدہ......" اس نے ہنس کر کہا "شبیدہ......

ہوں...... کیا خوب......" اس نے اُس کے چمکیلے بالوں پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "یہ کیا ہے ..... شبیدہ ..... پیاری
خ .... ش ..... شبیدہ .....؟"
"یہ تھا ہے۔ یہ موم اور جنگل کے جگنوں سے بنتا ہے اس سے بال
خوبصورت ..... "
"خوت شورت؟ ..... خوب شورت شبید آ.... آ ...... آ"
اُس نے ہنسی اور ہچکی کے بیچ کے لہجے میں کہا "تم بہت خوبشورت
ہو شبیدہ .....؟" اُس نے زبیدہ کے صاف اور گلابی رخساروں
پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور
انگلی سے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "تم ..... تم ....
شبیدہ ہو .....؟ ..... نہیں تم میری ماں ہو ہی ہی ہی۔"
اور وہ اس کے قریب گیا۔
عورت نے یکایک اُس کے بازوؤں کو جھٹکا ... جیسے اُسے
کسی سانپ نے ڈس لیا ہو "ماں ..... ماں ..... " وہ چلا کر
بولا "شش ۔شش ۔شبیدہ ماں ہے۔ شبیدہ میری بہن ہے
..... شش شش شبیدہ میں گناہ گار ہوں۔ شبیدہ تم یہاں کیوں
آئیں ..... آخ ..... ہیں!
"میں غریب ہوں" زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔
"غریب! ہی ہی ہی"
"میرا بچہ بیمار ہے! جرا، میرا ننھا سا جرا" ڈاگ دار ڈاکٹر نے
کہا اُسے نمونیا ہو گیا ہے۔ وہ چار روپے فیس مانگتا ہے، تم پہلے
نے مجھے صرف تین روپے دیئے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے ایک
روپیہ اور دے دو۔"
"نمونیا! ہی ہی ہی ..... اُسے غ ..... غ ..... خیراتی
ہسپتال لے جاؤ نا ..... نمونیا ..... ننھا جرا .....؟"
"یہاں ایک ہی تو ہسپتال ہے۔" عورت نے اداس لہجے میں
کہا "اور وہ بھی خیراتی ..... میرے اللہ ..... میں کیا کروں ...
میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں ..... خدا کے لئے مجھے ایک
روپیہ اور دے دینا ..... صرف ایک روپیہ"
"بش ..... بش ..... فکر نہ کرو ..... نہ ..... نہ ....
ننھی زبیدہ"۔ اس کی گردن سے لپٹ کر کہنے لگا "میں تم پر مرتا ہوں
خوبشورت شبیدہ ——— میں اکیلا ہوں ..... میں اکیلا ہوں ...
مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے بچاؤ شبیدہ ..... اس نے
اس کے شانے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
وہ سویا پڑا تھا، عورت کے گلے میں اس کے بازو حائل تھے۔ جیسے
وائٹ ہارس کی بوتل پر اُس کی انگلیاں ......
جب وہ جاگا تو خمار اتر چکا تھا، روشنی بجھ گئی تھی، سائے غائب ہو
چکے تھے ..... اور وہ ابھی تک اس کے آغوش میں مدہوش
پڑی تھی، برہنہ ..... اور سپید گردن کے اُن حصوں پر سرخ سرخ
نشان تھے جنہیں وہ بار بار چومتا رہا تھا۔ اُس نے نیم وا آنکھوں
سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا، سڈول، گداز سانچے میں
ڈھلا ہوا جسم، وہ آہستہ آہستہ اس کے پنڈے پر انگلیاں
پھیرنے لگا۔ عورت کے سارے جسم میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی
جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں ..... اس کے
رخساروں پر گری ہوئی پلکیں کانپیں، اس کے لبوں سے اک آہ
سی نکلی اور اُس نے آہستہ سے اُسی مدہوشی کے عالم میں کہا "جرے
..... پیارے ننھے جرے .....!" اور پھر اُس کے نیم وا لب
اسی طرح آپس میں ملے جیسے ماں اپنے پیارے بیٹے کو چوم رہی
ہو ..... ننھا جرا؟ ..... یکایک وہ چونک پڑا، گذری ہوئی
رات کے موہوم سے سائے اس کی آنکھوں کے آگے تنے گئے
..... ننھا جرا ..... نمونیا ..... ڈاگ دار ..... وہ کانپنے
لگا ..... تین روپے ..... چار روپے ..... صرف ایک روپیہ
..... اُس نے فوراً اپنے بازو اُس کی گردن سے ہٹا لئے۔ ننھا
جرا ..... اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنی ماں سے ...
اور وہ یکلخت بستر سے اچھل کر زمین پر کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی نگاہوں
سے اُس عورت کی طرف تکنے لگا جو اب جاگ گئی تھی اور برہنہ تھی
اور ساری رات اس کی آغوش میں رہی تھی۔
وہ چیخ کر کہنے لگا "چھپا لو۔ چھپا لو اپنے آپ کو اس کمبل میں ....
دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے ۔ کیوں اس طرح پریشان نگاہوں
سے میری طرف دیکھ رہی ہو ..... سنتی نہیں ہو کیا؟ ..... میں
کہتا ہوں اُٹھو، اُٹھو ..... میرے بستر سے ..... یہ لو .....
یہ لو ..... ایک روپیہ۔ دو روپے تین روپے۔ چار روپے۔
یہ سب لے لو، بھاگو یہاں سے بھاگو! بھاگو!! بھاگو!!!"

اور اس نے عورت کو کس اُٹھا کر اس کے کپڑے اس کے ہاتھ
میں دے کر اسے کمرے سے باہر نکال دیا۔"

اس اقتباس میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ چیز محبت کا وہ غیر جنسی یعنی مادی تصور ہے جسے خوشگوار جنسی زندگی مرکزی جذبے کی جگہ دینا چاہتا ہے جو جنسی ہونے کے باوجود منتقل لطیف اور ارفع ہو سکتا ہے مگر اسے اس جذبے سے ایسا واسطہ ... نہیں ... کے حصول اس کا سیدھا راستہ دکھاتی ہے اور جب مادی حسن اپنے جلوے دکھا کر اس کی روح کی تسکین نہیں کر سکتا اور غلط راستے پر ... زبیدہ کی تمام روحانی رعنائیاں حسن اس کے بچے کے لئے وقف نہیں تو وہ ایک زبردست الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے اور وہ حسن کی اس لاش سے یوں بھاگتا ہے جیسے اس نے کوئی آسیب دیکھ لیا ہو۔ مگر آہ منشر پریطرت انوکھے ... چاہے انسان کے لئے کیسے کیسے دام بچھا رکھے ہیں۔ دیکھئے:

"بہت دیر تک وہ بستر پر بیٹھا رہا۔ دل و دماغ پر ایک مبہم سی الجھن اور اداسی کے جانے کی حالت سی ہوئی تھی جو اسے بار بار پریشان کر رہی تھی اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ وہ بار بار اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس ... کو دور کرنے کی کوشش کرتا۔ ... جب بیرے نے آکر اس سے کہا صاحب غسل خانے میں گرم پانی دھرا ہے تو وہ بے دلی سے اٹھا اور تولیا شبنم رنگ ڈبے کی پٹاری اٹھا کر غسل خانے میں گھس گیا۔ طبیعت بے مزہ سی ہو گئی تھی اور سر کا ... اکسیلا ... ہوش آئے پر بھی ... نہا ... وصل ... ساگرہ برآمدے میں ... پر کرسیاں ... کا انتظار کرتا رہا ... ہوشیار بیرے نے ناشتے پر بیئر کی بوتل حاضر کر دی۔ بیئر کے ... رنگ سیال نے آہستہ آہستہ اس کے حالات کی ... کو بدل دیا۔ وہ آہستہ آہستہ گنگنانے اور سیٹیاں بجانے لگا بیتی ہوئی رات کے لمحے خوشگوار اور دلکش بنتے چلے گئے۔ سینے سے چپکتے ہوئے بال۔ سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے ابھرے ہوئے خم۔ نہالو کا غیر فانی حسن، بلبل کا نغمہ، پپیہے کی پی پی، اور سیب کے پھول ... ہنستے ہوئے۔ یکایک کسی راستے پر چلتے ہوئے چشمے کا ٹھنڈا اور شفاف ... اس کی آنکھوں کے سامنے خوشی سے اچھلنے اور زبل زبل کر قہقہے لگانے لگا اور ... سے اپنی کار یاد آئی جو گیرج میں پڑی اس کی راہ تک رہی تھی۔ اور وہ کمرا ... اور اس نے بیرے کو انعام دے کر پوچھا۔ "لڑمی کا ڈاک بنگلہ یہاں سے کے میل دور ہوگا؟"

ہمارا ہیرو جب صبح کے ناشتے اور خوش رنگ بیئر کی مدد سے جنسی ... دور کر لیتا ہے جو کبھی کبھی اس کے معمولات میں بیزاری کے ... پیدا کر دیتی ہیں تو وہ سرشاری اور مدہوشی کے کم از کم ایک اور دن ... نشاط حواس کا سامان بہم پہنچانے کی خاطر کمر ہمت باندھ کر اٹھتا ہے اور ڈاک بنگلہ اس کے تخیل پر ایک پرستانی تخت کی طرح چھا جاتا ہے، جو نہالو، سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے ابھرے ہوئے خم والی جسم جس کا ... چشمہ اور ... دوسرا چشمہ تھا، اپنے سے چپکتے ہوئے بالوں والی ... کا منتظر ... رہی ہوگی اور وہ ایک اور حسین شب اس کے پہلو میں بسر ... پھر اس کے منہ کا ذائقہ کسیلا ہوگا اور اس کے شانے بوجھل سے ہو گئے . . . .

اور پھر

"ڈاک بنگلے کے قریب ایک موڑ کاٹتے ہوئے اسے ایک نیلے رنگ کی کار نظر آئی جو ڈاک بنگلے کی طرف آ رہی تھی۔ ایک بھاری جسم اور دُہری ٹھوڑی والا آدمی جس سے سینہ بند ... والی رومی ٹوپی پہن رکھی تھی، کار چلا رہا تھا، اس کی بغل میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ بیل سوسی کی شلوار، سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے ابھرے ہوئے خم اور آنکھوں میں عادی مجرموں کی سی بے جان اداسی، اور وہ دل ہی دل میں مسکرایا، مجرم نہیں ہے تو ہی ... . . ."

مگر اس منظر کا پورا لطف اٹھانے کے لئے آپ کو ایک شب پیچھے پڑے گا۔ جب ہمارا ہیرو خوبصورت خبیدہ سے لذت یاب ہو کر پہلے صبح صبح تریشے کے ڈاک بنگلے سے روانہ ہوا ہے:

"اور اب تو وہ ڈاک بنگلہ بھی میلوں پیچھے رہ گیا تھا ..... رات کی تنہائیوں میں نہالو کا حسن غیر فانی اور غیر ارضی معلوم ہوتا تھا ..... اس کے لب، اس کی آنکھوں کی نرمی، اس کے بال سیاہ گھنے اور ملائم جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی اور پھر ان بالوں میں سیب کے چند چٹکے ہوئے غنچے جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی میں بلبل کے میٹھے نغمے ... وہ یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہ خاموشی کہاں شروع ہوتی ہے اور یہ موسیقی کہاں ختم ہوتی ہے ...... اور اس کے تخیل میں نہالو کے لب اور ... کی جھنک اور بلبل کا نغمہ اور بیئر کا سنہرا رنگ چاندی کے تار

طرح چمکتی ہوئی سڑک پر اڑتے گئے۔ نیچے جہلم کا پانی وحشی رنگ گھومنے لگا اور فضا میں سیب کے لاکھوں پھول آنکھیں کھول کر پھیلنے لگے اور اُس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنی موٹر کو اسی کھائی کی وسیع خلا پر ایک بے فکر پرندے کی طرح اڑا کر لے جائے۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کی اور اس کی نیم وا آنکھیں کھُل گئیں

راستے میں ایک چشمے کے کنارے اُس نے اپنی کار ٹھہرالی اور دیر تک ہاتھ پاؤں دھوتا رہا، آنکھوں کو چھینٹے دیتا رہا،

..... اُس نے اپنی اوک میں چشمے کا صاف وشفاف پانی پینے کے لئے بھرا او رُک گیا: خاموش قدموں سے ایک عورت اس کے قریب آگئی تھی۔ نوجوان سی اور کچھ کچھ فربہ اندام۔ اس نے نیلے پھولوں والی سوسی کی ایک بھاری شلوار پہن رکھی تھی اور اُسے سیاہ قمیص پر اس کی اُبھری ہوئی چھاتیوں کے گول خم نظر آئے اور چشمے کا صاف وشفاف پانی اس کی اوک میں چھلکنے لگا.....

عورت چشمے میں سے اوک بھر بھر کر اپنی پیاس بجھاتی رہی اور اُس کی پیاس تیز ہوتی گئی.....عورت کے لب اور گال گیلے ہو گئے اور کانوں کے قریب بل کھاتی ہوئی زلف بھی، اور پھر یکایک دونوں کی نگاہیں ملیں عورت نے مسکرا کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے شروع کئے۔

اُس نے پوچھا "تم کہاں جا رہی ہو؟"

عورت نے کہا "میں گرمیوں میں اپنے میکے گئی تھی۔ اب بلند کوٹ اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں۔"

"بلند کوٹ کدھر ہے"

عورت نے کہا "یہاں سے سات آٹھ کوس تک تو میں اسی سڑک پر چلوں گی.....؟"

اُس نے بات کا رُخ بدل کر کہا "کیا تم نے کبھی موٹر کی سواری کی ہے؟"

"ہاں ایک بار لاری میں بیٹھی تھی جب میری شادی ہوئی تھی۔"

"کتنا عرصہ ہوا؟"

"دو سال"

وہ اپنا رختِ سفر باندھنے لگا۔ عورت کی ناک پر پانی کی دو بوندیں

ابھی تک تھم رہی تھیں اور گیلی زلف داہنے گال سے چپک گئی تھی اُس نے کہا "تمہاری ناک پر پانی کی دو بوندیں ہیں؟"

اور پھر یکایک دونوں ہنسنے لگے۔ دو بوندیں، دو سال، دو گولائیاں اور اُس نے آہستہ سے کہا، "آؤ تم میری کار میں بیٹھ جاؤ کم از کم سات آٹھ کوس تک تو میں تمہیں ساتھ لے جاسکتا ہوں۔"

پھر کیا یہ موٹر بھی دو آدمیوں کے سفر کے لئے نہ بنائی گئی تھی! ایک مرد اور غالباً ایک عورت، اور اس نے غیر شعوری طور پر اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر پر رکھ دیا۔ عورت کے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری پیدا ہوئی جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں موٹر بھاگتی گئی اور اس کا ہر نفس آتشیں ہوتا گیا۔ آگ اور سمندر جن میں بلند کوٹ کی رفعتیں غرق ہو جاتی ہیں اور وقت مٹ جاتا ہے.....؟"

اب اس منظر کا سلسلہ پہلے منظر سے ملائیے اور آگے چلئے:۔

"ہاں تو وہ دل ہی دل میں مسکرایا، محرم نہیں ہے تو بھی نوا ہائے راز..... غریب عورتوں نے اپنی خیالی عصمت کی خاطر پہاڑوں پر بلند کوٹ بنائے تھے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اُن کے میکے اور سسرال ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک اور ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک محدود تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں خداوند لا یزال کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے ان لوگوں کو غریب بنا کر اُس کے لئے دلکش راہیں مہیا کی تھیں۔ زبیدہ، دائمنڈ ہارس، اور بھٹا ہوا مرغ..... الٰہی کیسی کیسی نعمتیں تو نے بنائی ہیں...... اس کے تخیل میں گڑھی کا ڈاک بنگلہ ایک پرستانی قلعہ نظر آنے لگا اور اس نے اپنی کار کی رفتار تیز کر دی۔——"

معلوم نہیں کہ ہمارے ہیرو کی کار آرمسٹرونگ نے جس کا نام موٹر کار تھا اسے کتنے اور پرستانی قلعے سر کرنے میں مدد دی۔ بہرحال آپ ذرا دیر کے لئے انہیں وہیں چھوڑیئے اور ذرا ہم سے مل کر فن کار کی اُن منظر نگاریوں کا لطف اٹھایئے جو کہانی کے دامن پر بہار کے پھولوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔

"اس کے بال سیاہ، گھنے اور ملائم! جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی اور پھر اُن بالوں میں سیب کے چند چمکتے ہوئے غنچے، جیسے رات

افسوس ہے کہ اس بے مثل سفرنامے میں زبان و کتابت کی چند غلطیاں بھی نظر آتی ہیں جو اس بات کی شاہد ہیں کہ مصنف اور مدیر دونوں کو نظرِ ثانی کی فرصت نہیں ملی یا شاید انہوں نے کرنظر پڑھنے سے بچانے کے لئے انہیں درست نہیں کیا گیا . . . .

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

۱

انسان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اب تک اس کی ذہنی ترقی کی یہ حالت ہے کہ وہ زمان و مکان کا عرفان تو حاصل کر چکا ہے لیکن زمان کا مسئلہ ابھی اس کے بس میں نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وقت ایک انسانی تصور ہے۔ اگرچہ تمدن و تہذیب کے موجودہ دور میں وقت کے متعلق جدید ترین نظریئے قائم ہو رہے ہیں لیکن ذہنِ انسانی اب بھی ماضی حال اور مستقبل کے سلسلے میں ماضی ہی کا پابند ہے اور فنونِ لطیفہ کے لحاظ سے فن کاروں کے ذہن تو خصوصاً ماضی ہی کے شیدا ہیں اور شعرا کے ذہن اس اعتبار سے اکثر رجعت پسند ہیں۔

سعیِ خام

چاندنی کے ساز پر ہے محبت نغمہ گر
میرے دل کا اہتزاز بن گیا ہے روح ساز
راگنی کوہ کے دور جا رہی ہے موجِ نور
بھیجتا ہوں تیرے نام
موجِ سیمیں پر پیام
آہ لیکن سعیِ خام
جس طرح بچہ کوئی ناؤ اپنی کاغذی
آبجو میں چھوڑ دے اور توقع یہ کرے
ناؤ اس کی جائے گی اور کھلونے لائے گی
مادرِ مرحوم سے شہرِ نامعلوم سے
پھر کنارِ جوئبار وہ سراپا انتظار
کشتیوں کو دور سے دور سے آتے ہوئے
دیکھتا ہو تا بہ شام

سید مہدی

ہمایوں دسمبر ۱۹۴۰ء

سید مہدی کی نظم سعیِ خام جہاں نقش نگاری اور تصور پرستی کی مثال ہے وہیں اس سے اردو شاعری پر انگریزی شاعری کے اثر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے دو مناظر سے اپنی دلی کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔ بظاہر اس نظم میں صرف چاندنی کا تاثر ہے۔ لیکن اس تاثر سے زیادہ دلچسپ وہ تسلسلِ خیال ہے جس کو چاندنی کے منظر سے تحریک ہوتی ہے۔ نظم کے دو حصے ہیں، اور دوسرے حصے میں پہلے حصے کی تشبیہ پیش کی گئی ہے لیکن یہ تشبیہ شاعر کے ذہن میں یونہی نہیں پیدا ہو گئی۔ وہ چاندنی سے لبریز فضا میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظروں میں دنیا نیلا صاف ساگر پھیلا ہوا تھا جس میں نور کی موجیں تھیں، چاندنی سناٹے تھے۔ اس من موہن منظر کو دیکھنے سے اس کے سازِ دل کے محبت بھرے سوئے ہوئے تار جاگ اٹھے۔ اسے تنہائی محسوس ہوئی، اس کا جی چاہا کہ کوئی محبوب ہستی ان لمحوں میں اس کی ہم جلیسی میں اس منظر کے حسن سے متاثر ہو۔ اس کے اپنے کیف میں حصہ بٹائے۔ لیکن وہ تنہا تھا۔ ہاں ماضی میں ایک محبوب ہستی اس کے پاس ہوا کرتی تھی۔ یا کم سے کم ایک محبوب ہستی ایسی تھی جس سے اس منظر کے کیف کی حصہ داری میں اسے مسرت حاصل ہو سکتی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی اس تک پہنچنے کی مجبوری کا احساس بھی ہوا اور اس لئے موجِ سیمیں پر پیام بھیجنے کی تحریک ہوئی۔ لیکن اس پیام کا پہنچنا بھی ویسا ہی ناممکن نظر آیا جیسی کہ یہ خواہش خیالی کہ وہ ہستی یہاں آن موجود ہو۔ اور پھر اس مجبوری کے متواتر احساس نے غیر شعوری طور پر شاعر کے ذہن کو گریز پر مائل کیا تاکہ یہ المناک احساس دور ہو سکے اور یوں وہ تشبیہ کی طرف راغب ہوا۔ لیکن یہ نسبت بھی کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئی البتہ اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنے احساسِ مجبوری کو کسی اور کا احساس بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یعنی مجبوری اور سعیِ خام کی کیفیت کے متعلق اسے یوں محسوس ہوا کہ یہ کیفیت تو اس بچے کی ہوا کرتی ہے جو اپنی کاغذی ناؤ کو کھلونوں کی توقع میں آبجو کے سپرد کر دے ——— یوں شاعر کا دل ہلکا ہو گیا۔ کیونکہ اس کا بارِ الم ایک اور شخص کا بارِ الم بن گیا اور اس کے اپنے دل میں اس بچے کے لئے ہمدردی کا احساس پیدا ہو گیا۔

لیکن تشبیہ کے لئے یہ بچہ اور اس کی ناؤ شاعر کے ذہن میں کیوں آئی؟ اس کی اپنی مجبوری سے ملتی جلتی کیفیتیں تو کئی اور بھی ہو سکتی تھیں — شاعر کی نظروں میں اونچا نیلا، صاف ساگر پھیلا ہوا تھا جس میں نور کی موجیں تھیں۔ چاندنی کشتی تھی۔ ستاروں کے بجرے تھے، شاید کہکشاں کی آبجو کے کنارے پر اسے چاند کی کاغذی کشتی کا دھیان آیا۔ آخری مصرعوں کے

تصور میں رہپر کنارِ جوئبار، وہ سراپا انتظار، کشتیوں کو دور سے، دور سے آتے ہوئے دیکھتا ہوتا بہ شام) شاعر نے اُس سکون کو اس دل کے ہلکا ہونے کو ظاہر کر دیا ہے جو اُسے اس تشبیہ سے ملا۔

اور اس نظم میں جوش بھی ماضی ہی کی طرف رجوع کر رہا ہے، اگرچہ اُس کے تخیل کی بنیاد حال پر ہے۔

پرانا باغ

آم کا باغ جو ہے پیشِ نظر — یہ مرے باپ نے لگایا تھا
یاد ہے، خوب یاد ہے کہ یہاں — ایک دن ان کے ساتھ آیا تھا
باغ کے پاسباں نے بہرِ سلام — ہاتھ اُٹھایا تھا، سر جُھکایا تھا
کس قدر دلنوازشاخیں تھیں — کس قدر دلفریب سایا تھا
پتے پتے پہ نوجوانی تھی — ذرّے ذرّے پہ رنگ چھایا تھا
خستہ چڑیوں کے چہچہانے سے — شام کا وقت گنگنایا تھا
میرے اک بار مسکرانے سے — باغ سو بار مسکرایا تھا
دل پہ اب تک خراش باقی ہے — دو گھڑی کو وہ لطف آیا تھا

اور آیا ہوں میں جو آج یہاں — باغ ہنستا نہ مسکراتا ہے
کل تو گاتا تھا، گنگناتا تھا — اب نہ گاتا نہ گنگناتا ہے
ذرہ ذرہ مری طرف صد حیف — آنکھ بیگانہ وار اٹھاتا ہے
باغ کب کا بھلا چکا ہے جو دور — اس لئے مجھ کو یاد آتا ہے
یادِ ماضی ارے معاذ اللہ! — دل تڑپتا ہے بیٹھ جاتا ہے
آہ! بیتے دنوں کی یاد کا درد — زندگی کو لہو رُلاتا ہے
صرف اِک بار مسکرا دینا — دل پہ سو بجلیاں گراتا ہے
کیا کہوں کس قدر مرے دل کو — نوعِ انساں پہ رحم آتا ہے
جانتا ہے، فریب ہے ہستی،
پھر بھی ناداں فریب کھاتا ہے

زمانہ جون ۱۹[illegible] — جوش ملیح آبادی

اس نظم کے عنوان ہی سے وہ فضا قاری کے ذہن میں قائم ہو سکتی ہے جہاں پہنچ کر شاعر اس نظم کی خود کلامی شروع کرتا ہے۔ اس لئے عنوان کے بعد نظم کی طرف جلد رجوع ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ عنوان کے انجام اور نظم کے آغاز میں ایک وقفہ درکار ہے تاکہ جہاں شاعر کھڑا ہے وہیں ہم بھی جا کھڑے ہوں اور اُس کی بات کو پورے طور پر سمجھ سکیں۔ باقی نظم میں بیان اور بے ساختگی کی جو خوبیاں ہیں ان کے اظہار کے لئے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

ہماری سوسائٹی

حوصلے سرنگوں، اُمیدیں شل
آرزو بارِ یاس سے بوجھل
نشہ، بجھتا ہوا سا ایک شرار
کیف گرتی ہوئی سی اک دیوار
ہر لطف کی تہ میں رنج و محن
ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن
شرم سے آب آب جولانی
ہر ہنسی شرمسار، کھسیانی
خال و خط پر دھواں بناوٹ کا
کرب بالقصد مسکراہٹ کا

ماہنامہ اضطراب لکھنؤ جولائی [illegible] — جوش ملیح آبادی

جوش کی دوسری نظم ماضی کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ جس "حال" سے گریزاں رہنے کی کوشش میں ہم ہمیشہ مصروف رہتے ہیں، وہی اس کا موضوع ہے۔

اردو میں اگرچہ ہجو ایک قدیم صنفِ سخن ہے۔ لیکن جدید مفہوم کے لحاظ سے طنزیہ نظموں کی ابھی بہت کمی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ طنزیہ نظم کی تخلیق آسان کام نہیں کیونکہ طنز کے ساتھ ساتھ شعریت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینا ایک ایسی مہم ہے جو ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس خیال کی روشنی میں یہ نظم خصوصاً قابلِ غور ہے۔ ایک اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ شاعر نے طنز کرتے ہوئے سماج کی سطحی اور بیرونی باتوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ سماجی روح اور کردار کی خامیوں اور پستی کی طرف توجہ دلائی ہے

میری رانی

پہلے پیکانِ محبت سے تھا دل پہلو میں،
خون کی گنگا بہا یا تو بنا رنگ محل
چپکے چپکے کوئی اس رنگ محل میں آیا
بجلیاں کانوں میں، سینے پہ وہ آدھی ہیکل

آتش حُسن سے گلنار ابھی کا چہرا
عہد ملتا ہوا آنکھوں سے وہ کافر کاجل
بول اُٹھے چمن داغ میں خوش رنگ کنول ۔ رخ کے پرتو سے چھپے نور کا لے کر آنچل
گھنے بڑھ کر اسے پہنا دیا ان پھولوں کا ہار
مانیں فرق پہ اک تاج زرافشاں رکھا
حسرتیں آ کے حضوری میں زمیں بوس ہوئیں
نازک ارمانوں نے دامان نظر بیاں رکھا
یاس نے تنگ سلامی دی بڑی شوکت سے
غم نے اس کے حضور آپ نمکداں ۔ کر
مات کرنے لگی تسلیم جنوں ہے رانی
میری ملقیس نے انداز سلیماں رکھا
کم نظر لوگ اسے کہتے ہیں فغاں کی بانی ۔ وہ ہے فی الاصل مرے رنگ محل کی رانی
رحمت باقی و ماستاب بانی

سب رس حیدرآباد جولائی ۱۹۵۰ء ــــــــ مختار صدیقی

اس نظم میں رانی کا پربت بنا ہے لیکن اس پربت کی چوٹی پر پہنچ کر شاعر نے دیکھا کہ ایک مندر ہے اور اس مندر میں کسی دیوی کی مورتی۔ دنیا میں کئی مندر ہیں اور ان میں کئی مورتیاں لیکن جب تک کسی مورتی کا نام ہمیں معلوم نہ ہو ہماری نظروں میں اُس مورتی کے مندر کی کوئی اہمیت نہیں پیدا ہوتی۔ شاعر نے بھی پربت پر پہنچ کر جب مندر میں دیوی کی مورتی کو دیکھا تو اس کا ایک نام رکھ دیا اور اس نام رکھنے ہی سے اس نظم کے مندر کی اہمیت ہماری نظروں میں پیدا ہو گئی۔ اگر شاعر اُس مورتی کو پریم کی دیوی پکارتا تو یہ ایک عام سی بات ہوتی۔ شعراء اور خصوصاً نوجوان ہر مورتی کو پریم کی دیوی ہی سمجھنے لگتے ہیں اور یہی اُن کی غلطی ہے۔ لیکن یہ شاعر عوام کی طرح غلط نظری کا مرتکب نہیں ہوتا۔ یہ اس دیوی کو فغاں کی بانی کہتا ہے اور اپنے رنگ محل یعنی دل کی رانی سمجھتا ہے۔ دل کی رانی سے مراد یہاں محبوبہ نہیں ہے۔ بلکہ اس نظم کا بنیادی موضوع اصل میں غم کی پوجا ہے۔ رانی کا مفہوم اُس تلازمِ خیال کی وجہ سے آ گیا ہے جس کی وضاحت ابھی کی جائے گی۔ اگر وہ تلازمِ خیال پیدا نہ ہوتا تو شاعر اس مورتی کو "فغاں کی بانی" کہہ کر ہی بات کو ختم کر دیتا۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ہمارے اردو شعرائے جدید عموماً نظم کے شروع ہی سے تلازمِ خیال کا اظہار نہیں کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شاید شدتِ احساس اُن کے ذہن کو باقاعدہ چال سے نہیں چلنے دیتی۔ لیکن جب وہ دو چار شعر کہہ کر اظہارِ نفس کے ابتدائی اظہار کی کسی حد تک تسکین کر لیتے ہیں تو ان کے ذہن میں آسودہ تصور جاگتے ہیں اور تلازمِ خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نظم کا بھی یہی حال ہے۔

شاعر کو چپ چاپ بیٹھے ہوئے اچانک خیال آتا ہے کہ اب تو دل کی حالت ہی بدل گئی۔ اب تو یہ دل ہی نہ رہا۔ محبت کا تیر لگنے سے پہلے یہ دل تھا۔ تیر لگا، خون نکلا، دل خون میں نہا گیا، خون کی گنگا نہا لیا ــــ گنگا کا تصور آتے ہی شاعر کی زبان بدل گئی۔ اور وہ "پیکانِ محبت" اور "پہلو" جیسے فارسی الفاظ سے ہٹ کر خالص ہندوستانی الفاظ کی طرف راغب ہو گیا۔ لیکن آگے چل کر پھر وہی فارسی الفاظ والی زبان جاری ہو گئی کیونکہ وہ شاعر کی اصل زبان ہے۔ "خون کی گنگا" کے خالص ہندوستانی استعارے سے "رنگ محل" کی آمد ہوئی اور پھر اس میں کوئی آیا۔ یہاں شاعر نے آنے والے کی تخصیص نہیں کی۔ قاری یہی سوچے کہ کون آیا۔ شاعر آخر میں حل کر بتائے گا۔ یوں ایک دلچسپی پیدا ہو گئی۔ قاری کا ذہن بیدار رہا اور اُس نے اپنے دل میں سوچا کہ شاعر کی محبوبہ رنگ محل میں آئی تھی لیکن آخر میں جا کر جب قاری کو معلوم ہوا کہ وہ آنے والی شاعر کی محبوبہ نہ تھی بلکہ "فغاں" تھی تو اسے یہ ایک غیر معمولی بات معلوم ہوئی کیونکہ یہ بات اس کی اپنی سوچ کے خلاف تھی۔

اس نظم کے دوسرے بند میں بہت سے شاہی سے تعلق رکھنے والے لوازم ہیں۔ تاجِ زرافشاں، حضوری، زمیں بوس، سلامی دی، شوکت سے، مات کرنے لگی، رانی، بلقیس، اور اندازِ سلیمان ــــ یہ سب چیزیں رنگ محل کے تصور کی پیدا وار ہیں۔

بیان کی خوبی کے لحاظ سے دو مثالیں "عہد ملتا ہوا آنکھوں سے وہ کافر کاجل" اور "چمن داغ میں خوش رنگ کنول نور کا آنچل لے کر چھپے"۔

آخری ٹکڑا جو خطوط وحدانی میں ہے اُس کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا۔ آپ خود کوشش کیجئے:۔

اس نظم میں بھی شاعر ماضی ہی کے دلکش زمانے کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اور ذیل کے منتخب اشعار میں اختر شیرانی بھی ماضی ہی کا نغمہ خواں ہے۔

فراق

حیراں ہے آنکھ جلوۂ جاناں کو کیا ہوا
ویراں ہیں خواب گیسوئے رقصاں کو کیا ہوا
قصرِ حسیں خموش ہے ایوان پُرسکوت ۔ آوازِ پائے سروِ خراماں کو کیا ہوا

پردوں سے روشنی کی کرن پھوٹتی نہیں — اُس شمعِ رنگ و بو کے شبستاں کو کیا ہوا
دنیا سیاہ خانۂ غم بن رہی ہے کیوں — اللہ میرے ماہِ خراماں کو کیا ہوا
طوفاں اٹھا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں — اس دستِ نرم و ساعدِ لرزاں کو کیا ہوا
نادان آنسوؤں کو ہے لذّت سے جستجو — آرام گاہ گوشۂ داماں کو کیا ہوا
سیراب کاریٔ لبِ گلگوں کدھر گئی — ہیں تشنہ کام ساغرِ جاناں کو کیا ہوا
کشتہ ادھر چلی تندرِ سمومِ غم — یارب نمودِ ابرِ خراماں کو کیا ہوا

روتا ہے بات بات پہ یوں زار زار کیوں
اختر خبر نہیں دل ناداں کو کیا ہوا

میراجی

شعر

شام بھی تھی دھواں دھواں حُسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

فراق گورکھپوری

نقد و نظر

اندھی دنیا

(افسانوں کا مجموعہ از اختر انصاری بی اے آنرز)
حجم ایک سو ساٹھ صفحے لکھائی چھپائی بھی کاغذ عمدہ قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ : مکتبہ جہاں نما ، اردو بازار جامع مسجد دہلی

تہذیب و تمدن کا عنصر اور انسان کی جنسی جبلت بھی گمراہی اور تخریب کا باعث بنتی ہے ۔ اس لئے ادب زندگی کا آئینہ دار ہے اس لئے اس گمراہی یا تخریب کے نمایاں نقوش ہمیں ادب میں ایک خاص صورت میں مل سکتے ہیں بعض اوقات تو ان نقوش کی نوعیت واضح ہوتی ہے ۔ لیکن کہیں کہیں اور کبھی کبھی یہ نقوش عجب پیچ در پیچ راستوں سے گذر کر اپنی ظاہری صورت سے اپنی اصلی نوعیت کو چھپا لیتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم تجزیہ نفسی کی مدد سے ادب کا جائزہ لے کر حقیقت کو پہنچ سکتے ہیں ۔ اردو زبان کے شعراء تو ابتدا ہی سے فارسی ادب کے اثرات کی وجہ سے اذیت پرست رہے ہیں اور دنیا میں انہیں رنج و غم کے سوا اور کوئی بات کم ہی نظر آئی ہے لیکن نثر نگاروں میں بھی مسرت کا ادب ہمیں کم ہی ملتا ہے۔ نثر میں غم و الم کے ادب کی پرانی نشوونما کی انتہائی بلندی راشد الخیری کی تصانیف ہیں لیکن گذشتہ پندرہ سال میں مغربی اثر سے جو نئی تحریکات ہمارے ادب میں آئیں اور جو نئے رجحانات پیدا ہوئے انہوں نے ہمارے فن کاروں کی تخلیقات میں بعض دلچسپ اور قابل تحقیق پہلو نمایاں کر دیئے ہیں خصوصاً ترقی پسند ادب کی تحریک نے ایک نئی قسم کا اذیت پرستانہ ادب پیدا کرنے میں ہمارے مصنفین کی بہت مدد کی ۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر شعراء عموماً اور افسانہ نگار خصوصاً زندگی کے مصائب ہی کا راگ الاپنے لگے ہیں ۔ اور چونکہ پہلے زندگی کے مصائب سے لبریز پہلو پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی اور صرف عشرت و مسرت کو ہی سراہا جاتا تھا اس لئے ردِ عمل کے طور پر ان نئے رجحان والے مصنفین کو پہلے عشرت پرستانہ تصورات ہی سے نفرت ہو گئی اور وہ جہاں ادب میں ایک اصلاح اور وسعت کا موجب بنے وہیں ایک غلط نظری کے بھی مرتکب ہوئے ۔ اختر انصاری کے افسانوں کے مجموعے کے شروع میں ایک صفحے پر جو فقرے لکھے ہوئے ہیں ۔ وہ اوپر کے خیال کی دلیل ہیں ۔ ان فقروں میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ۔ "افسانے ہجر و وصل اور بوس و کنار کی نغمہ داستانیں نہیں ہیں ۔ ان میں انفرادی جذبات کی کھچڑی نہیں پکائی گئی ۔ یہ افسانے ہماری اجتماعی زندگی کے ناسوروں کو بے نقاب کرتے ہیں ۔ اور سماج کے ٹپکتے ہوئے پھوڑے اور تہذیب کے سڑتے ہوئے اعضاء پر ایک بے درد نشتر کے کچوکے ہیں ۔ موجودہ نظام کا جنازہ اپنے کاندھوں پہ لئے ہوئے ہیں اور ایک مظلوم لیکن بیدار ہوتی ہوئی انسانیت کی حشر انگیز پکار ہیں ۔"

یہ کلمے اس مصنف (اور شاعر) کے افسانوں کے مجموعے سے پہلے تمہیدی طور پر لکھے ہوئے ہیں جو اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں صرف محبت ہی کے لطیف جذبے کا نغمہ خواں تھا ۔ لیکن اب عشق و محبت کو کیچڑ بلکہ غلاظت سے تعبیر کرتا ہے ۔ زندگی کے متعلق اس کے انداز نظر میں یہ تبدیلی کیونکر ہوئی ! ــــ اس سوال کا سراغ ان تمہیدی فقروں میں ہے جو میں شروع میں لکھ آیا ہوں ۔ اختر انصاری اپنی شعری تخلیقات میں ایک داخلی فن کار تھا نہ صرف یہ بلکہ اس داخلی پہلو کو اس کی انفرادیت نے ایک نمایاں اور ممتاز رنگ بخشا ہوا تھا ۔

اور میرے خیال میں وہ اب بھی ایک داخلی فن کار ہی ہے ۔ اگرچہ اس کے یہ افسانے ایک عام قاری کے ذہن پر اپنا اجتماعی پہلو ہی واضح کر سکیں گے یا اقتصادی مسائل کی ان الجھنوں کو ہی ظاہر کر سکیں گے جن سے دوچار ہو کر اس سرمایہ دارانہ دور میں ہر ہوشمند اور بے غرض انسان کے دل میں موجودہ نظام کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے ۔ لیکن ہمیں ان افسانوں کے نفسیاتی تجزیے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے ۔ افسانہ نگار ان افسانوں میں

آئینہ دیکھ رہا ہے وہ پہلے ہر افسانے کے خاص کردار کی شخصیت میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے اور پھر اُسی کی نظر سے سماج کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ یہ شخصیت کا تبادلہ اُس کی گویا فطرتِ ثانی بن چکا ہے اور اسی لئے بعض افسانوں میں جب وہ خاص کردار کو واحد متکلم سے نجات بھی دے دیتا ہے تو اُس کی کہانی اپنی نہیں بلکہ اُسی کردار کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورت کم ہی پیش آتی ہے کیونکہ اس مجموعے کے چوبیس افسانوں میں سے تین چار افسانے ہی ایسے ہیں جن میں وہ واحد متکلم کو افسانے کا خاص کردار نہیں بناتا۔ اور اجتماعی حالات کو اس طور پر انفرادی لحاظ سے دیکھنے میں ایک فائدہ ہوتا ہے۔ افسانہ ہمیں جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی معلوم ہوتا ہے اور ہمیں بھی اس بغاوت میں اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے جو مصنف کے مضطرب قلب و دماغ میں پیدا ہوئی ہے۔

ترقی پسند ادب میں ایک نقص عام ہے۔ اس سے مصنف کی محدود نظری کا اظہار ہوتا ہے لیکن اختر انصاری کے افسانے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سماجی مظلوموں میں سے صرف ایک ہی طبقے یا ایک ہی قسم کے افراد کو اپنا موضوع نہیں بناتا۔ وہ بجائے اس کے کہ مظلوم افراد کو اپنے افسانوں کا کردار بنائے، سماج کے غلط اور نقائص سے لبریز پہلوؤں کو ان میں زیرِ بحث لاتا ہے۔ اور اس لئے نہ صرف محدود نظری کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی وسعت کا آئینہ دار رہتا ہے۔ اس کی تحریر حقیقت اور خلوص کا اظہار کرتی ہے اور وہ قاری کی نظروں میں ایک عصبی بیمار کی بجائے (جو مظلوم کرداروں میں محض غیر شعوری جنسی تسکین کو ڈھونڈتے ہیں) ایک تندرست مصلح بن جاتا ہے۔ مثلاً "میں نے ایسا کیوں کیا"۔ اس افسانے کا موضوع وہ مصیبت زدہ یتیم لڑکا نہیں ہے جس کا ظالم اور خودغرض چچا اُسے ایک لاوارث ظاہر کر کے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے بلکہ ہمارے ملکی اور سماجی نظام کا وہ افسوسناک پہلو ہے جس میں یتیموں اور غریبوں کی تعلیم کا بندوبست اُن سے زیادہ خوش قسمت ہم وطنوں کے دوش بدوش نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح "خام مواد" اگرچہ بظاہر دو دوستوں کے تعلقات کا ایک دلچسپ نقشہ ہے لیکن حقیقتاً اس میں بھی بہت لطیف انداز میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ملک میں اکثر بلکہ بیشتر ایسے نوجوان ہیں کہ اپنی عمر کے اس دور میں جب انہیں تعلیم حاصل کرنا چاہئے اور ملک کے لئے اپنی ہستی کو مفید بنانا چاہئے۔ حالات کی مجبوری کی وجہ سے فکرِ معاش کے سلسلہ میں انہیں وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن کی مشقت ان کی روحِ حیات کو کچل دیتی ہے بلکہ اُن کے حواس تک کو معطل کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس افسانے کا نوجوان ایک پنکھا قلی ہے جسے گرمیوں کی راتوں میں اس لئے جاگنا پڑتا ہے کہ سونے میں ایک ایسے انسان کی مدد کرے جسے آرام سے سونے کا حق اس لئے زیادہ ہے کہ اُس کے پاس روپیہ ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر ہمارے دل میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ایسے نظام کو بدلنا چاہئے اور اقتصادی مساوات کو اصولِ حیات بنانا چاہئے لیکن ہمیں اس شخص پر غصہ نہیں آتا جو ساری رات پنکھے کی ہوا کے نیچے چین سے سویا رہتا ہے۔ اور یہ اختر انصاری کے افسانوں کی ایک اور خوبی ہے۔ اُس کا مقصد سرمایہ داروں کی سیاہ کاریاں اور اُن کے ظالم کرداروں کی رسوائی نہیں، اُسے ان کی ذات سے دشمنی نہیں اُسے اس نظام سے نفرت ہے جس کی وہ پیداوار ہیں۔

"اندھی دنیا" میں جس کے نام پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے، اسی تعلیم اور غربت کے مسئلے کو باقاعدگی سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے اپنے اندازِ نظر کو خارجی رکھا ہے۔ حمیدا ایک چھوٹا سا لڑکا ہے جس کے دل میں امنگیں ایک شدت اختیار کر لیتی ہیں جب وہ دیکھتا ہے کہ امتحان میں اول آنے پر اسے دو روپے ماہوار وظیفہ ملتا ہے تو اس وظیفے کو قائم رکھنے اور آئندہ زیادہ انعامات پانے کی دھن میں وہ انہماک سے پڑھتا ہے لیکن گھر میں صرف ایک مٹی کا دیا ہے۔ چاندنی راتوں میں کھیتوں کی منڈیر اس کا مسکن ہوتی ہے اور چاند کی دھندلی روشنی علم کا نورانی بادل۔ لیکن یہی بادل اُس کے لئے غم کی گھٹا ثابت ہوتا ہے جب اس طور کے مطالعے سے اُس کی پہلے ہی کمزور آنکھوں کی بینائی مستقل طور پر جاتی رہتی ہے اور اُس کی دنیا ہمیشہ کے لئے اندھی ہو جاتی ہے۔

ان افسانوں میں ایک اور خصوصیت بھی نمایاں ہے ان میں کوئی فالتو یا فضول بات نہیں بیان کی جاتی اور یوں وحدتِ تاثر قائم رہتی ہے۔ البتہ بعض دفعہ افسانہ نگار کی انفرادیت اُس کے افسانے کو کہانی سے ہٹا کر انشا پردازی کا ایک نمونہ بنا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر وہ "مضمون" ہے جسے "ڈپٹی صاحب" کا عنوان دیا گیا ہے۔ ایک صاحب، ڈپٹی صاحب، قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" کے عاشق ہیں اسی کتاب کے خیالات کا پرچار وہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں اور ہر جگہ یہی رونا روتے رہتے ہیں کہ ہماری سماج میں مرد عورت پر لگاتار بے انتہا مظالم کئے جا رہا ہے لیکن آخرکار جب ان کی بیوی مر جاتی ہے تو وہ بھی اپنی عمر کی زیادتی کے باوجود ایک نوعمر پہاڑی دوشیزہ سے نکاحِ ثانی کر لیتے ہیں۔ اس

الشا میں یہی آخری نکتہ ایسا ہے جس سے اس میں کہانی کا انداز پیدا ہو جاتا ہے اگر ان آخر کی چند سطروں میں افسانہ نگار پلٹا نہ لیتا تو یہ افسانہ رہا، محض تبلیغی خیالات کا ایک مرقع بن کر رہ جاتا لیکن مختصر افسانے کی ٹیکنیک کے لحاظ سے ایسی خام چیزیں اختر کے افسانوں میں شاذ ہی نظر آ سکتی ہیں اور غالباً اُن کی افسانہ نگاری کے دور میں یہ ابتدائی کوششیں ہیں جب ابھی اُن کے ذہن پر ان خیالات کا اثر زیادہ تھا اور اُس نے ابھی افسانے کے فنی پہلو پر قابو نہ پایا تھا۔ بعد کی چیزوں میں مگر اُس کی کہانیوں کا فنی پہلو بھی اپنی بلندی کو اسی زور کے ساتھ ظاہر کرتا ہے جس زور کے ساتھ وہ مصنف کے خیالات کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔

ہر افسانے کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں اور اس سے وہ صحیح تاثر بھی نہیں پیدا ہو سکتا جو اختر انصاری کی خصوصیت ہے۔ یہ افسانے چُنے ہوئے لفظوں میں صرف اپنے تاثر کے متعلقہ الفاظ ہی سے تیار کئے گئے ہیں اور اس لئے اقتباس سے ان کی خوبیوں کا اُس قدر اندازہ نہیں ہو سکتا جس قدر انہیں پڑھنے کے بعد۔

انداز بیان کے متعلق بھی صرف اسی قدر کہنا کافی ہے کہ وہی اختر انصاری جو اپنی شاعری میں سادگی، خلوص، بے ساختگی اور اختصار کی مثال تھا یہاں بھی اپنی اُنہی خصوصیات کو لئے ہوئے ہے۔ آخر میں ایک بات کا جتانا میں ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کتاب کے شروع میں جو تمہیدی فقرے درج کئے ہوئے ہیں وہ نہ صرف فالتو ہیں بلکہ افسانہ نگار کے اندازِ نظر کو متعصبانہ ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کے بغیر بھی مقصدی ادب کا کام بخوبی چل سکتا ہے۔ اور ترقی پسند ادب کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ درپیش نہیں آ سکتی۔

میرا خیال ہے کہ مختصر افسانوں کے اس بیش قیمت مجموعے کے صحیح درجے کو جانچنے میں ملک کبھی غلطی نہ کھائے گا اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اردو جاننے والے ادیب اس کے ترجمے کی طرف بھی رجوع ہوں گے۔

فضائی حملے سے بچاؤ

مؤلفہ خان صاحب چودھری بشیر احمد خان اے۔ آر۔ پی انسٹرکٹر۔ ناشر میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور۔ قیمت آٹھ آنے سائز [illegible] صفحات [illegible]

یہ چھوٹی سی کتاب وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور اسی لئے اور کتابوں کا حق مار کر اس پر تبصرہ لکھا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس سے پیشتر آپ انہی صفحات میں گیس کے دفاع کے متعلق ایک کتاب کا ذکر پڑھ چکے ہیں۔ لیکن یہ کتاب اسی موضوع کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس میں نہ صرف گیسوں کے اثرات اور اُن کے فوری علاج کے متعلق ابتدائی معلومات تفصیل کے ساتھ دی گئی ہیں۔ بلکہ ہوائی جہازوں اور بموں کی پہچان اور فضائی حملے کی صورت میں عوام اور متعلقہ افسروں کے فرائض سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ فضائی حملے کی صورت میں جس خوف و ہراس اور بدنظمی کے پھیلنے کا اندیشہ ہوا کرتا ہے۔ اس کو دور کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کتاب کو نہایت غور کے ساتھ پڑھا جائے اور اس میں جو باتیں لکھی ہوئی ہیں انہیں یاد رکھا جائے تاکہ خدانخواستہ اگر ہمیں ایسی صورت حالات کے مدِنظر کہ ہندوستان کو بھی براہ راست جنگ سے دوچار ہونا پڑے تو پبلک کے جان و مال کا کم سے کم نقصان ہونے پائے۔ ضرورت ہے کہ اس لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ اشاعت دی جائے۔

مؤلف کا اندازِ بیان سیدھا سادہ اور سلجھا ہوا ہے اور زبان بھی آسان ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب اپنے مقاصد کو مدِنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ فنی لحاظ سے اس میں جو معلومات ہیں اُن کے معیار کے لئے یہی کہنا کافی ہوگا کہ مؤلف نے اے آر پی اعلیٰ حصے کی مدافعت کا باقاعدہ امتحان پاس کیا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ کتاب میں جگہ جگہ نقشوں اور تصاویر کے ذریعے سے تمام مسائل کو آسان سے آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ موجودہ وقت میں یہ کتاب ہر ہندوستانی گھر میں پہنچنی چاہئے۔

"د م"

فولادی

رستم کو رستم زماں بنانے والی اکسیر

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی بیاض کا نادر نسخہ

جسے جناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب رئیس اعظم نے جدید سائنٹفک طریقے پر ترمیم کرکے سہل الاستعمال اور پر اثر بنادیا ہے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اپنی سیاحت عالم کے دوران میں ایک عجیب و غریب نسخہ کا پتہ لگایا ہے۔

جو رستم اور سہراب کی طاقت کا ضامن ہے

اور سلاطین اعظم کی لاثانی قوت کا موجب تھا۔ اجمل خاں اعظم نے اس نسخہ کے نادر اجزا سے ایک معجون تیار کی

یہ

نواب صاحب رام پور اور مہاراجہ پٹیالہ کی پسندیدہ معجون تھی جو اکثر والیان ریاست کے استعمال میں رہی مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب رئیس اعظم نے اس معجون کو جو صرف روسا کے لئے خاص طور پر تیار ہوتی تھی۔ جدید اصول پر ترتیب دے کر زیادہ پُر اثر بنا کر قرصوں کی شکل میں تبدیل کردیا اور [illegible] کے لئے ہندوستانی دواخانہ کو مرحمت فرمادی۔ اب یہ

فولادی قوت پیدا کرنے والی اکسیر

جو قوت کی لاثانی دوا ہے۔ اعضائے رئیسہ میں حیرت انگیز قوت پیدا کرتی ہے

اعصاب کو طاقتور بناتی ہے، بدن میں قوت، دل میں جوش، جسم میں چستی اور چہرے پر رونق پیدا کرتی ہے

سالِ نو کا لاثانی تحفہ

فولادی ہے جو زندگی، طاقت، ولولہ اور جوش سب ہی کچھ پیدا کرتی ہے اس سے جوانی کی اُمنگیں از سرِنو پیدا ہوتی ہیں اس کے چند روزہ استعمال سے

بوڑھے بھی جوان ہوجاتے ہیں!!

قیمت [illegible] معجون کی سربند شیشی [illegible]۔ صبح دو قرص دودھ کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔

تار کا پتہ۔ [illegible] [illegible] ۵۵۲۲ قایم شدہ سنہ ۱۹۰۳ء

مینیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — تصویر: دکھ کا دارو، پریم کا ساتھ — نمبر ۹

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
	بزم ادب		
۱	(۱)	صلاح الدین احمد	۷
۲	(۲)	میراجی	۷
	آئینہ عالم		
۳	ٹراٹسکی	جناب طاہر قریشی	۹
۴	آج کل کا پیرس	جناب تابش صدیقی	۱۲
	افسانے		
۵	زین العابدین	جناب راجندر سنگھ بیدی	۲۹
۶	واہمہ	جناب شیر محمد اختر	۴۸
۷	سید صاحب	جناب اختر انصاری	۵۸
	علمی و ادبی مضامین		
۸	اردو مزاح نگاری کی مختصر تاریخ	جناب بشیر علی صدیقی	۱۵
۹	اردو ناٹک کی شاعری	جناب مظفر حسین شمیم	۴۰
	حصۂ نظم		
۱۰	سسرال جانے پر	جناب روشن نکودری	۱۳
۱۱	قانون قدرت	جناب احمد ندیم قاسمی	۱۴
۱۲	تغزل	جناب محمد ایوب محسن	۲۷
۱۳	لگی کی لاگ	جناب شریف قمر جالندھری	۲۸
۱۴	زندگی اور موت	جناب شوکت واسطی	۳۷
۱۵	دو غزلیں	جناب قیوم نظر	۳۸
۱۶	شکوہ	میراجی	۳۹
۱۷	برسات کی رات	جناب اختر ہوشیارپوری	۴۷
۱۸	فتح	جناب روشن دین تنویر	۵۷
۱۹	حسین ارادے	جناب سلام مچھلی شہری	۶۰
۲۰	دو دن کا پیار	جناب نسیم محمود مخمور	۶۱
	دنیائے ادب		
۲۱	تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین کا جائزہ و تذکرہ		
	حصۂ نثر	صلاح الدین احمد	۶۲
	حصۂ نظم	میراجی	۶۵

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک رجسٹری پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام شیخ اولاد علی پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا لاہور سے شائع ہوا

دنیائے کاروبار

پربھات نگر کی خبریں

آج کل بارشوں کے باوجود "پربھات نگر" میں خوب چہل پہل نظر آتی ہے۔ "پڑوس" کی شوٹنگ بڑے زور و شور پر ہو رہی ہے چونکہ اس فلم کے تمام مناظر کی اچھی طرح ریہرسل ہو چکی ہے اس لئے مسٹر شانتا رام بڑی سرعت سے اپنا کام پورا کر رہے ہیں امید ہے کہ بہت جلد یہ فلم نمائش کے لئے تیار ہو جائے گی۔

پڑوس کے افسانے میں کیا ہے۔ یہ باہر کے لوگوں کو بالکل معلوم نہیں۔ ہم صرف اتنا بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس کا تعلق کسی مسئلے سے نہیں ہے۔ یہ دو پڑوسیوں کی داستان ہے اور بس۔ لیکن ہم یہ بات وثوق سے ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جب شانتا رام کوئی افسانہ منتخب کرتا ہے تو اس میں کوئی نئی چیز ضرور ہوتی ہے۔ "پڑوس" میں آپ کو ایک نہیں کئی نئی باتیں ملیں گی۔ شانتا رام نے اس فلم میں تکنیک کے کئی نئے زاویے پیش کئے ہیں جو ہندوستانی صنعت فلم میں خوشگوار انقلاب کا موجب ہوں گے۔

عمر خیام

پچھلے دنوں "پربھات نگر" میں ایک مشہور صحافی مسٹر شانتا رام کی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ گفتگو کے دوران میں شانتا رام صاحب نے آپ سے کہا "آج کل میں اس موڈ میں ہوں کہ کوئی عالی شان موضوع لے کر اس کا فلم بناؤں۔ اس گفتگو کے چند روز بعد ہم نے سنا کہ انہوں نے اپنے آئندہ فلم کے لئے عمر خیام کے سوانح حیات فلمانے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ خبر دلچسپی سے سنی جائے گی کہ اس فلم کی ابتدائی تیاریاں شروع ہیں۔ سید فتح لال صاحب عمر خیام کے وطن نیشاپور کے نقشے وغیرہ تیار کر رہے ہیں۔ اس زمانے کے ملبوسات بھی تیار کئے جا رہے ہیں۔

رباعی کے اس خدا کا پارٹ کون ادا کرے گا۔ یہ ایک پہیلی ہے۔ کیا آپ اسے بوجھ سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مسٹر شانتا رام نے اپنے دل ہی دل میں اس کردار کے لئے ایک آدمی چن رکھا ہے۔ پٹیل اور خواجہ احمد عباس کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ بس وہی اس افسانے کے مصنف ہیں۔ قریبًا ڈیڑھ سو کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے یہ فلمی کہانی لکھی ہے۔

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کردہ سب سے پرانی جہاز ران کمپنی ہے جو حاجیوں کو جدہ تک لے جانے اور واپس لانے میں امتیازی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کے جہاز نہایت کشادہ اور حفظان صحت کے جدید ترین اصولوں کے مطابق تیار کئے گئے ہیں۔ ڈیک کے مسافروں کے لئے نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے ایک وسیع میدان ہر جہاز میں چھوڑا گیا ہے۔ حاجیوں کو ہر طرح کا آرام پہنچانا ہر جہاز کے کارکنوں کا فرض ہے اور وہ اپنے اس فرض کو بدرجہ اتم ادا کرتے ہیں۔ جن حجاج کو مغل لائن کے ذریعے سے حج کرنے کا موقع ملا ہے وہ اس کے اعلیٰ انتظام کے متعلق رطب اللسان ہیں۔ گذشتہ موسم حج میں جبکہ جنگ کی وجہ سے کوئلہ کا نرخ غیر معمولی طور پر بڑھ جانے کے باعث جہاز رانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو کرایہ میں کسی قسم کا اضافہ کیا اور نہ ہی حج سروس بند کی۔ یہ اس شاندار کمپنی کی روز افزوں ترقی کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ حج کے موقعے پر مغل لائن کے جہازوں سے ضرور فائدہ اٹھائیں تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر مارسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶ اپنک سٹریٹ بمبئی۔

فضل الٰہی

مہتمم اشتہارات [illegible]



دُکھ کا دارو، پریم کا ساتھ

بزمِ ادب

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی!

آغا شاعر، اور سید عبدالرؤف عشرت کا غم ابھی تازہ تھا کہ ٹپنے سے مولانا احسن مارہروی کے افسوسناک انتقال کی خبر ملی۔ حضرت احسن جناب داغ کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ اور ان کا کلام اپنی نفاست، روانی، اور شباب انگیز تخیل کے لحاظ سے اردو نظم میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ مرحوم ایک مدت تک مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں اردیات کے معلم رہے تھے وہ درس و تدریس کے علاوہ اپنا وقت عزیز اردو کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔ ان کے بلند پایہ اشعار احسن الکلام کے عنوان سے ملک کے سر آوردہ رسائل و جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہے ہیں اور چند نہایت بیش قیمت ادبی مقالے بھی اُن سے یادگار ہیں۔ داغ مرحوم پر اُن کا ایک سلسلۂ مضامین خاص دلچسپی اور معلومات کی چیز تھی۔ مولانا احسن ادبی دنیا پر ہمیشہ نظرِ عنایت رکھتے تھے، اور اُن کی وفات ہمارے لئے ذاتی طور پر ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

حیدرآباد سے یہ روح افزا خبر آئی ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے استادِ طبیعیات پروفیسر رضی الدین صدیقی کو امسال دنیا کا سب سے بڑا علمی انعام نوبیل پرائز ملا۔ یہ انعام انہیں غالباً اُن کی کسی عظیم الشان طبیعی تحقیقات پر ملا ہو گا جس کی تفصیل سے ہم آشنا نہیں اور غالباً ہو بھی نہیں سکتے۔ لیکن ہم ادبی لوگوں کے لئے کیا اسی قدر کافی نہیں کہ ایک ہندوستانی کا علمی کارنامہ اس سال دنیا بھر کے علمی کارناموں سے بڑھ گیا۔ ع بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست۔ ہم ڈاکٹر صدیقی کو، اگر یہ سطور اُن کی نظر سے گذریں، اپنی اور ناظرین ادبی دنیا کی جانب سے پُرخلوص مبارکباد کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں غالباً تیسرے شخص ہیں جنہیں یہ عظیم الشان اعزاز نصیب ہوا۔

اس شمارے کے مضامین میں جستر علی صاحب صدیقی کا مقالہ اردو مزاحیہ نگاری کی مختصر تاریخ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ صاحبِ مضمون کی رائے سے بعض پڑھنے والوں کو کہیں کہیں ضرور اختلاف ہو گا لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنے جائزے میں غیر معمولی غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری مزاح نگاری نے ترقی کی دوڑ میں ادب کی دیگر اصناف کا ساتھ نہیں دیا لیکن اگر چند صاحبِ نظر نقاد اس طرف خاص توجہ دیں تو امید ہے کہ ہمارے ادیبوں کا یہ جوہر بھی کچھ نہ کچھ نکھر آئے گا۔

راجندر سنگھ صاحب بیدی ایک عرصے کے بعد ہماری بزم میں شامل ہوئے ہیں، ان کا ایک دلچسپ مطالعہ زین العابدین اس اشاعت کی زینت ہے، اور ہم اُسے بلا تامل "بوہیمین لائف" کا ایک کامیاب چربہ کہہ سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیدی صاحب ہماری معاشرت کا کوئی پہلو اچھوتا چھوڑنا نہیں چاہتے، ہمیں حیرت ہے کہ انہیں ایک مصروف زندگی کے باوجود انسانی مطالعے کے ایسے صبر آزما موقعے کیونکر میسّر آتے ہیں۔

آج تک ریڈیو سے نشر ہونے والے ادبی مضامین کے متعلق "ادبی دنیا" کی پالیسی یہی رہی ہے کہ رسائل کے ادب کو فضائی ادب سے علٰحدہ رکھا جائے تاکہ امتیازی طور پر معلوم ہو سکے کہ زمین کے رہنے والے کیا کہتے ہیں اور زمین سے ذرا اوپر والے کون سی راگنی الاپتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے آج تک کوئی نشر شدہ چیز شائع نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ آغاز میں ریڈیو کے ادیب محض ریڈیو ہی کے ادیب تھے۔ ادبی رسائل میں اُن کی ہستی مردہ ہو چکی تھی۔ لیکن اب جہاں آل انڈیا ریڈیو کا کام تجربوں سے بڑھ کر مستقل حیثیت اختیار کر گیا ہے وہاں چند خوشگوار تبدیلیاں بھی ظاہر ہوئی ہیں بعض سٹیشنوں پر کبھی کبھار اچھے لکھنے والوں کو بھی بلا لیا جاتا ہے اور اس طرح بعض ایسی چیزیں بھی نشر ہوتی رہتی ہیں جنہیں اگر رسائل کے ذریعے سے دوام نہ دیا جائے تو نامناسب نہ ہو گا۔ ان حالات کے مدِنظر آئندہ ادبی دنیا اپنی معین پالیسی میں مستثنیات کو بھی جگہ دے گا لیکن یہ استثنا بہت محدود ہو گا۔ چنانچہ اس دفعہ جب ہمارے خود فراموش کرمفرما جناب مظفر حسین شمیم نے اپنا اچھوتا مقالہ اردو ڈرامائک کی شاعری ہمیں اشاعت کی غرض سے بھیجا تو اُس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں مذکورہ بالا استثنے کا آغاز کرنا پڑا۔

صلاح الدین احمد

(۲)

جب سے اردو شاعری پر نظم کی حکومت ہوئی ہے، ہمیں نت نئے انداز دکھائی دینے لگے ہیں۔ یہاں تک کہ تشبیہ اور استعارے میں بھی جدید اسلوب پیدا ہو گئے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم اس کی ایک مثال ہے نظم کا بنیادی موضوع صرف اس قدر ہے کہ جس طرح دن کی روشنی کے بعد رات کا منظر اس دھرتی پر چھا جاتا ہے اُسی طرح دل پر بھی ایک کیفیت طاری ہوتی ہے — اُس وقت جب عورتوں کی دلکشی بصارت میں سما کر کھو جاتی ہے اور بصیرت پر قبضہ جما لیتی ہے۔ گویا شاعر کا اصل موضوع وہ گھونگھٹ والیاں ہیں جنہیں اُس نے کبھی دیہات میں دیکھا تھا اور جن کے "لہنگے کی لہروں کے تلے کمسن سے پاؤں رقص میں تھے"۔ اور

جن کے سینے چھلکتے میکدے تھے اور ہونٹ پیمانوں کے لب" —— یہ منظر پنگھٹ والیوں کا منظر کہ جب وہ چل رہی تھیں تو پگ ڈنڈیوں کے سمس طرف گاگر کی چھاؤں رقص میں تھی، شاعر کے تحت الشعور میں تھا —— اور پھر وہ اتفاقاً کسی شہر میں جا پہنچا، یہاں اس نے دیکھا کہ شام کے بعد بجلی کا کھمبا تھام کر بنگالی پاہی سو گیا اور مشرق کے پربت سے پرے یک بیک گھنگھور اُمڈی اور تارے نکلتی جلیاں سر ولف چھ گئیں اور پھر آخر میں جب سر پھیرے آنکھیں جلیں، ہر چیز بجم کر رہ گئی اور تغشاتی ظلمتوں کا جادو چھا گیا تو سنسان رات میں ستاروں کی درخشانی باقی رہ گئی لیکن ان ستاروں کی فضائے بعید میں صاف آسمان کی ظلمت تھی —— شہر کے اس منظر کو دیکھ کر شاعر کے ذہن میں وہ منظر تحت الشعور سے اُبھرا جو اس نے کبھی گاؤں میں دیکھا تھا۔ اور اس نے محسوس کیا کہ جس طرح دیہات میں پنگھٹ والیوں کے چلے جانے کے بعد اس کے دل کے شہر میں سہانی راتوں کا سماں طاری ہو جاتا تھا اسی طرح اس شہر میں دن کے بعد رات کا منظر بچھا جاتا ہے۔

اوپر کی عبارت میں جو ٹکڑے واوین میں دئے گئے ہیں وہ شاعر کے انداز بیان کی خوبیاں بھی پوری طرح ظاہر کر رہے ہیں۔

میرے خیال میں یہ نظم احمد ندیم قاسمی کی کامیاب نظموں میں سے ہے اور اُن کی انفرادی فن کاری کے ایک سے زیادہ پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہے، جس شہر میں جا کر احمد ندیم قاسمی کو دیہات کی پنگھٹ والیاں یاد آئی تھیں، اختر ہوشیار پوری شاید اُسی شہر کا رہنے والا ہے۔ برسات کی رات ہے گلی کوچوں میں خاموشی ہے" "نشیلے بادل" ہیں "ملائم تیرگی" ہے اور چونکہ ایک شہر کی رات کا منظر ہے، دن کا نہیں، اس لئے جب "ہوائیں رقص کرتی ہیں" تو پیچھے "تو خموشی گنگناتی ہے" اور کیوں نہ گنگنائے کہ منظر ہی ایسا ہے "گھر دل بند ہو رہا نے پھواروں سے کھنک رہے ہیں" اور اگرچہ شاعر کی نگاہوں کے سلسلے میں اب پانی ہی پانی ہے" لیکن جس طرح بجلی کے چمکنے سے سب گلی کوچے جھلکتے ہیں" اسی طرح شاعر کے دل پر بھی منظر کا اثر ہو رہا ہے اور اُسے ایسی ہی گذری ہوئی راتوں کی یاد آ جاتی ہے۔ وہ راتیں کیسی تھیں! کیا اُن راتوں میں اور آج کی رات میں کوئی فرق ہے؟ —— اس کا جواب ہمیں ذیل کے شعر کا لطیف کنایہ دے رہا ہے کہ "بدلتی ہیں گھٹائیں یوں قبائیں آسمانوں پر" کہ جس سے سنہری حاشئے چڑھتے ہیں دل کی داستانوں پر" —— اور آخر میں تو راز پوری طرح طشت ازبام ہو جاتا ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس رات میں شاعر ایک محبوب ہستی کی کمی کو محسوس کر رہا ہے۔

اس نظم میں بعض جگہ اندرونی توافی نے خوب موسیقی پیدا کی ہے۔ "بدلتی ہیں گھٹائیں یوں قبائیں آسمانوں پر" —— اور تنفّس کی روانی میں محبت کی کہانی ہے۔ نیز "نشیلے بادل" اور "ملائم تیرگی" کی ترکیبیں بھی بیانیہ لحاظ سے قابل غور ہیں۔ باقی اس کے بہتر ٹکڑے پہلی نظم کی طرح ہی اوپر کی عبارت کے واوین میں شامل ہیں۔

اختر ہوشیار پوری کی نظم میں داخلی احساس کو خارجی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن نسیم محمود مخمور کی نظم یکسر داخلی انداز لئے ہوئے ہے۔ دونوں نظموں میں محبت ہی کا جذبہ کار فرما ہے لیکن پہلی نظم کا شاعر اپنے جذبے کے متعلق ایک یقینی کیفیت کا مالک ہے اور دوسری نظم کا شاعر جذباً الجھنوں میں گرفتار ہے۔ پہلا شاعر اپنی محبوب کو دوبارہ دیکھنے کی ہوس رکھتا ہے، ایک اور "سامنا سامنا" چاہتا ہے، دوسرا شاعر ایک اور "آمنے سامنے" میں پہلے تعلق کا بے حقیقت پہلو ظاہر کر رہا ہے۔ اُس کا جذبہ اب ایک خوش آئند یاد بن کر رہ گیا ہے اب اُس کے احساس پہلے سے نہیں رہے اور محبت کی موت پر وہ خجل ہے، شرمندہ ہے!

"نگی کی لاگ" بظاہر ایک نظم ہے اور ہیئت کے لحاظ سے غزل لیکن دُھن اور کیفیت کے لحاظ سے ایک گیت کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا بہاؤ کسی پہاڑی ندی کے بہاؤ ایسا ہے جس میں ایک ترنم کا تواتر ہے اور سارنگی کے نغمے کا تسلسل۔

محمد ایوب محسن کا تغزل ایک اونچے پربت کی مانند ہے، پر وقار۔ اس میں اگرچہ ردیف صرف تین لفظوں پر مشتمل ہے۔ لیکن موضوع پر یہ بہت سی پابندیاں عائد کر دیتی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ اس غزل کا شاعر ان پابندیوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوا ہے۔

یہ سب شاعر دل کے مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے لیکن روشن دین تنویر کو ذہن کا ایک مسئلہ اُلجھائے ہوئے ہے۔ "فتح" آج کل خصوصاً ایک لائق توجہ نظم ہے۔ اس منظوم مکالمے میں نہ صرف باتوں کی سادگی شاعر کے بیان کو جلا دے رہی ہے بلکہ موضوع کی سنجیدگی اور اہمیت ایک دعوتِ تفکر ہے۔ اس نظم کو دو اور نقاطِ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک طنزیہ شاعری کے لحاظ سے اور دوسرے اردو شاعری میں مثنوی کی نئی صورتوں کے لحاظ سے۔ اس سے پہلے تنویر کی شاعری عموماً تخیل کی پروردہ تھی لیکن اس نظم میں عملی زندگی کا جو پہلو پیش کیا گیا ہے اس سے توقع ہوتی ہے کہ شاید آئندہ ہم اس شاعر کو ایک نئے رنگ میں دیکھیں گے۔

میراجی

آئینۂ عالم

ٹراٹسکی

ٹراٹسکی، صوبۂ یوکرین کے ایک شہر نکولائف میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک یہودی عطّار کا بیٹا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں اس نے پیٹروگریڈ کے مزدوروں کے نمائندوں کی ایک جماعت تیار کی۔ یہ جماعت اپنے مقاصد میں ناکام رہی، نتیجہ یہ ہوا کہ ٹراٹسکی جلا وطن کر دیا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں یہ بلند پایہ شخص وی آنا میں پناہ گزین ہو گیا اور روس میں سوشلزم کے قائم کرنے کے امکانات کا گہرا جائزہ لیتا رہا۔

جنگ عظیم کے آغاز ہی میں یہ پیرس چلا آیا۔ یہاں اس نے روسی زبان میں ایک اخبار جاری کیا۔ جس میں اس نے شہنشاہیت کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی حکومت نے اسے فرانس سے نکال دیا۔ اس نے پہلے سوئٹزرلینڈ میں اور پھر سپین میں قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ان دونوں ملکوں نے بھی اسے داخلے کی اجازت نہ دی۔ بالآخر اسے ریاست ہائے امریکہ میں جانا پڑا۔

۱۹۱۷ء میں جب اسے خبر ملی کہ زاریت تباہ ہو گئی ہے تو اس نے روس کا رُخ کیا۔ مگر راستے ہی میں حکومتِ انگلستان نے اسے گرفتار کر لیا۔ روس میں اس وقت مزدوروں کی ایک با اثر جماعت قائم ہو چکی تھی۔ اس جماعت کے ایما پر حکومتِ روس نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ ٹراٹسکی کو رہا کر دیا جائے چنانچہ ٹراٹسکی رہا ہو کر روس پہنچ گیا۔

روس پہنچ کر ٹراٹسکی نے لینن سے تعاون کیا اور یہ دونوں اشتراکی رہنما الیگزنڈر کیرنسکی کی طرزِ حکومت (جس کی بنیاد شہنشاہیت پر رکھی گئی تھی) کے استیصال کے فکر میں رہے۔ ٹراٹسکی اس دوران میں خارجی معاملات کا سیکرٹری بن گیا۔ اور شہنشاہیت کے زمانے کے اُن رازوں کو طشت از بام کرتا رہا۔ جن سے جمہور اب تک ناآشنا تھے۔ اس نے ساتھ ہی شہنشاہیت کے حامیوں کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ صلح کی گفت و شنید دیر تک جاری رہی۔ ٹراٹسکی اس گفت و شنید کو طوالت میں ڈالنا چاہتا تھا کیونکہ اسے امید تھی کہ وہ جرمنی میں اشتراکی تحریک جاری کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ۸ر فروری ۱۹۱۸ء کو گفت و شنید کا سلسلہ بند ہو گیا اور ٹراٹسکی نے مخالفین کو اپنے ساتھ ملا کر روس کی جنگ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

انہی دنوں جرمنی کی ایک جدید فوج نے لیوونیا اور استھونیا سے بالشویک لوگوں کو نکال باہر کیا۔ طرفین میں گفت و شنید شروع ہوئی اور ۸ر مارچ کو سوویٹ نمایندوں نے صلح نامے پر دستخط کر دیئے اور ٹراٹسکی نے اپنے عہدے سے علیحدگی اختیار کر لی۔

کچھ عرصے کے بعد ٹراٹسکی جنگ کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اس نے سرخ فوج کی تشکیل کی اور پولینڈ پر حملہ کیا۔ اس فوج کے چند دستے جرمنی کی سرحدوں پر چڑھ آئے۔ مگر انہیں شکست کھانا پڑی۔

بالشویک لینن کی پالیسی سے بیزار ہو چکے تھے۔ لینن نے شہنشاہیت پرست جماعت کو چند مراعات دے رکھی تھیں، اور بالشویک اس بات پر رضامند نہ تھے۔ انہوں نے ٹراٹسکی کو دعوت دی کہ آ کر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے۔ چنانچہ ٹراٹسکی بالشویکوں کا رہنما بن گیا۔ لینن کی وفات کے بعد ٹراٹسکی دیگر رہنماؤں کے ساتھ نئے نئے جھگڑوں میں مصروف رہا۔ اور بالآخر اپنے وقار کو کھو بیٹھا۔

ٹراٹسکی چاہتا تھا کہ بالشویکوں کی جماعت میں جتنے جھگڑے رونما ہوتے رہتے ہیں وہ سب مٹ جائیں۔ اور جماعت کے اراکین کو کسی نظریے کی پیروی کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اُس نے سٹالن، کامینف، اور زنیووف کی

پالیسی پر سخت نے دے کی۔ اس سے لوگ سمجھنے لگے کہ یہ شہنشاہیت کا حامی ہے اور اپنے مقاصد کو تکمیل کے درجے تک پہنچانے کی خاطر بالشویکوں کے ساتھ ملا ہوا ہے

اس دوران میں ٹراٹسکی کی صحت خراب ہو گئی مگر اس کے باوجود اس نے ۱۹۲۴ء میں اپنی مشہور کتاب "اکتوبر کا سبق" شائع کرائی جس میں اس نے اپنے دوستوں کی بے وفائی کے متعلق وضاحت سے بیان کیا کہ کس طرح سوشلزم کے ابتدائی ایام میں وہ اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے رہتے۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔ اور جنوری ۱۹۲۵ء میں جنگ کے سیکرٹری کے عہدے سے برخاست کر دیا گیا۔ سٹالن اور اُس کے رفقا نے کارکردگی کو پورا پورا قابو نہ تھا۔ اس لئے سیاسی مصلحت کی بنا پر ٹراٹسکی کو تین ماہ کے بعد پھر ایک معتد عہدے پر متعین کر دیا گیا۔

یہاں زینوویف اور کامینف جو ایک عرصے تک ٹراٹسکی کی شدید مخالفت پر تلے رہے تھے اب اس کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے دست راست بن گئے۔ ٹراٹسکی کا خیال تھا کہ سٹالن بالشویکوں کو شہنشاہیت کے اصولوں کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اور مزدور لوگ موجودہ نظام حکومت میں اسی طرح ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے ہیں جس طرح زار کے زمانے میں تھے۔ ٹراٹسکی اشتراکیت میں ایک انتہا پسند انسان کی طرح کام کرنا چاہتا تھا اور اُس کا منتہائے نظر یہ تھا ـــــ کہ دنیا بھر میں ایسا ہی نظام حکومت قائم ہو جائے۔

اسی سال ماہ اگست میں ٹراٹسکی کو دوبارہ معزول کر دیا گیا اور اس کی کتاب "اشتراکی آمریت میں تبدیلی کی کوشش" ضبط کر لی گئی۔ اکتوبر میں اس نے سٹالن کے اصولوں پر بڑا زبردست حملہ کیا اور اس کے دیگر رفیق اپنے اپنے عہدوں سے برخاست کر دیئے گئے۔ ٹراٹسکی کی بیوی کو بھی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ٹراٹسکی اور اس کی جماعت کے دیگر ارکین کا خیال تھا کہ سٹالن کی غلط پالیسی نے ملک کو مالی مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کی بیرونی پالیسی بھی اتنی کامیاب نہیں۔ اس کی آمریت میں مزدور کو اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت نہیں۔

اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ٹراٹسکی کی جماعت نے دور و نزدیک کے اشتراکی بھائیوں کو خطوط لکھے کہ وہ آمریت کے موجودہ نظام کو تباہ کر دیں۔ سٹالن کے کانوں تک جب یہ دہشت انگیز خبریں پہنچیں تو اُس نے ٹراٹسکی اور اس کی جماعت کے ملکی تیس ارکین کو ملک بدر کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔ ان کے خلاف الزامات یہ تھے کہ وہ روس میں رہنے والے غیر ملکی سیاسیین کی مدد سے آمریت کے موجودہ نظام کو الٹنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کی سرگرمیاں سویٹ نظام کے لئے بہلک ہیں۔

۱۶ر جنوری ۱۹۲۸ء کو ٹراٹسکی نے چینی ترکستان کی سرحد پر کے ایک گمنام سے گاؤں کا رُخ کیا۔ ماسکو کو الوداع کہتے وقت ٹراٹسکی اور اُس کے رفقا نے سٹالن کی جماعت کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں انہوں نے بتایا کہ ہم ایک بڑی قوت کے سامنے جھک رہے ہیں مگر ہمیں یقین ہے کہ آنے والی کشمکش میں ہم اسی طرح متحد نظر آئیں گے جس طرح ہم آج تک رہے ہیں۔ اس لئے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں دوبارہ اپنے عہدوں پر فائز کیا جائے۔

ورنی ایسی گمنام جگہ ہے، جو نزدیک ترین ریلوے سٹیشن سے ایک سو پچیس میل دور ہے۔ یہاں ٹراٹسکی اپنی بیوی اور اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ سادہ زندگی بسر کرتا رہا۔ سیاسیات میں اسے حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ یہ بات اس کے لئے مفید ثابت ہوئی اور اس کی گرتی ہوئی صحت بحال ہونے لگی۔ وہ ہر وقت پولیس کی شدید نگہداشت میں رہتا تھا۔ مگر جب اس بے کیف زندگی سے گھبرا اُٹھتا تو بندوق لے کر شکار کو چل دیتا۔ اشتراکی جماعت گذر اوقات کے لئے اسے پچیس پونڈ ماہوار بھیج دیتی۔ اس رقم کے علاوہ گورنمنٹ پبلشنگ ہاؤس بھی سالانہ کی رقوم اسے بھیجتا رہتا۔ ٹراٹسکی نہایت ہی سادگی سے زندگی گذارتا تھا۔ اور ان رقوم سے اس کا گذر اچھی طرح ہو جاتا تھا۔

ٹراٹسکی اپنے وقت کا بیشتر حصہ لکھنے پڑھنے میں گذارتا۔ قیام کے دوران میں اس نے تین کتابیں ـــــ (۱) اشتراکیت اور فاشیت (۲) چینی انقلاب سے سبق اور (۳) پائیدار انقلاب ـــــ لکھیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اس نے اپنی زندگی کے سوانح لکھے۔ نیز وہ اپنے روسی دوستوں اور جلاوطن ہونے والے دیگر دوستوں بالخصوص راکووسکی، اور رادک کو بے شمار خطوط لکھتا رہا۔

انہی ایام میں ٹراٹسکی ملیریا بخار سے بیمار پڑ گیا اور علاج کی غرض سے اسے ماسکو آنے کی اجازت مل گئی۔ سٹالن نے اسے کہا کہ اگر تم میری مخالفت سے باز آ جاؤ تو تمہیں یہیں رہنے کی اجازت دے دوں گا۔ مگر ٹراٹسکی نے بڑے استقلال سے اس درخواست کو ٹھکرا دیا اور ورنی واپس چلا گیا۔

۱۹۲۹ء میں ٹراٹسکی کے حامیوں پر سٹالن کے وضع کردہ نظام

حکومت کے خلاف ایک بڑی سازش کھڑی کرنے کا الزام لگایا گیا۔ ان میں سے بہت سے گرفتار ہوئے اور ٹراٹسکی کو ان سے مکمل طور پر جدا کرنے کی غرض سے، روس سے باہر نکال دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ٹراٹسکی اپنی بیوی اور لڑکیوں کو ساتھ لے کر ایک خفیہ نام — سیدب راف — اختیار کر کے قسطنطنیہ پہنچا۔ یہاں بھی سوویٹ حکومت نے اس کی نگرانی شروع کر دی اور وہ ایک طرح کا قیدی بن کر رہنے لگا۔ اسے روسی افسروں کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی۔

بالآخر ٹراٹسکی بحیرۂ مارمورا کے کنارے ایک جزیرے پرن پیکو میں رہنے لگا۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو اس کا چوبی مکان جلا دیا گیا۔ تمام فرنیچر اور لائبریری اور دیگر اشیا کا کافی حصہ جل کر راکھ ہو گیا۔ مگر لینن کے ساتھ اس کی خط و کتابت کے کاغذات اور روسی انقلاب کی تاریخ کے مسودات بچ گئے۔

نومبر ۱۹۳۲ء میں ٹراٹسکی نے ترکی کو خیرباد کہا۔ زیکوسلاویکیہ میں اسے داخلے کی اجازت نہ ملی۔ البتہ ڈینمارک جانے کی اجازت مل گئی کہ وہاں طلباء کو لیکچر دیا کرے۔ کولمبیا براڈ کاسٹنگ کمپنی نے تین سو پونڈ کے عوض میں اس کے لیکچروں کا ملخص خریدنے کی کوشش کی مگر ڈینش وائرلیس نے براڈ کاسٹ کی اجازت نہ دی اور یہ ملخص ٹیلیفون کے ذریعے سے لندن اور وہاں سے نیویارک پہنچایا گیا۔

ڈینمارک کو چھوڑ کر ٹراٹسکی نے فرانس میں رہائش اختیار کر لی۔ لیکن یہاں بھی کسی سوداگر کو اجازت نہ تھی کہ اس کے مکان میں اس سے ملاقات کر سکے۔ البتہ رات کے اندھیرے میں وہ چند ملاقاتیوں سے مل لیا کرتا تھا۔

ٹراٹسکی کے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سٹالن کے وہ احکام جن کے ماتحت ٹراٹسکی جلا وطن کیا گیا تھا۔ منسوخ ہو جائیں مگر سب اپنی اپنی کوشش میں ناکام رہے۔

کیرف، جو سٹالن کا دستِ راست تھا، دسمبر ۱۹۳۴ء میں قتل کر دیا گیا۔ جون ۱۹۳۵ء میں کیرف کے قتل ہونے کو ٹراٹسکی کی سازش پر محمول کیا گیا۔ زینوف، کیمی نف اور ٹراٹسکی کے دیگر چودہ رفقا، جو ما سکو جیل میں پڑے تھے، اس سازش کے بانی ٹھہرائے گئے اور گولی کا نشانہ بنا دئے گئے۔

ٹراٹسکی ۱۹۳۶ء میں ناروے چلا گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ سٹالن کی حکومت محض غلط فہمی کی بنا پر اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ناروے کی حکومت نے سیاسیات سے باز رہنے کا ٹراٹسکی سے وعدہ لینا چاہا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ حکومت ناروے نے اسے ایک قسم کا نظربند قرار دیا۔ اسے ٹیلیفون یا خط و کتابت کسی بات کی اجازت تھی۔ ملاقاتیوں کو بجز خاص حالات کے اس سے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ نیز اس کے سیکرٹری ناروے سے خارج کر دیئے گئے۔

۱۹۳۷ء سے ٹراٹسکی شہر میکسیکو میں قیام پذیر تھا۔ مئی ۱۹۴۰ء کے آغاز میں اس پر تیس اشخاص نے بندوقوں سے حملہ کیا۔ ٹراٹسکی اور اس کی بیوی نے فرش پر لیٹ کر اپنی جانیں بچائیں۔ ۲۱ اگست کو دوبارہ اس پر حملہ ہوا۔ حملہ آور فرینک جانسن نے ہتھوڑے کے ساتھ ٹراٹسکی کا سر کچل دیا اور وہ ۲۲ اگست کو سات بج کر پچیس منٹ پر زندگی اور موت کی کشمکش سے رہا ہو کر عدم کو سدھارا۔

ٹراٹسکی کے قاتل جانسن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ یا تو یونین آف سوشلسٹ سوویٹ ریپبلک یا فاشیئت کا ممبر ہے۔ اس نے بیان دیا ہے کہ مجھ پر ٹراٹسکی کے نظریات نے مسحور کن اثر کیا۔ اور میں پیرس سے میکسیکو پہنچا۔ ٹراٹسکی کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے یوں محسوس کیا گویا میں فریب خوردہ ہوں اور اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں دنیا کو ٹراٹسکی کے وجود سے نجات دلاؤں گا۔

ٹراٹسکی کو جب ایمبولینس کار پر ہسپتال پہنچا رہے تھے تو اس نے کہا ــ "مجھ پر حملہ کرنے والا یا تو سوویٹ ریپبلک کا کوئی نمائندہ ہے یا فاشیئت کا کوئی حامی ہے۔ میں ہر لمحہ موت کے قریب پہنچ رہا ہوں۔ میرے دوستوں سے کہہ دو، کام کئے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ فتح تمہاری ہوگی"۔

طاہر قریشی

آج کل کا پیرس

مہکی اخبارات کے ایک نامہ نگار نے ایک مضمون لکھا ہے جس سے آج کل کے پیرس کی صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون میں نامہ نگار لکھتا ہے۔

"جب میں پیرس سے روانہ ہونے لگا تو کیفے ڈی لا پیکس کے نوجوان ملازم نے میری طرف مخاطب ہوکر کہا: میں نے اس وقت جرمنی زبان میں گنتا سیکھ لیا ہے۔ مجھے یہ سن کر مطلق حیرانی نہ ہوئی۔ آخر اس میں حیران ہونے کی بات ہی کون سی تھی۔ لیکن میں نے سوچا اچھا ہی کیا اس نے گنتی سیکھ لی ہے۔ اس کا یہ فائدہ تو ہوگا کہ وہ اپنے جرمن گاہکوں کو جو پیرس پر بادلوں کی طرح چھائے ہوئے ہیں، اشیا کی قیمت آسانی سے بتا سکے گا اگر یہ تم ایسا نہ کرتا تو ہفتہ دو ہفتہ یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینے تک تو اسے ضرور ایسا کرنا پڑتا چنانچہ اس کی ایک مشکل تو کسی حد تک آسان ہو گئی ہے اب وہ اپنے جرمن گاہکوں سے کہہ سکے گا کہ اتنے فرانک دیتے جاؤ وغیرہ وغیرہ۔

"آج کل پیرس پر جرمنوں کا مکمل قبضہ ہے۔ پیرس میں جس طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھو جرمن ہلکی نیلی، گہری نیلی، اور بھوری وردیوں میں ملبوس نظر آئیں گے۔ ان رنگدار وردیوں سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں جرمن فضائی محکمے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور فلاں سمندری فوج کے دستوں سے۔

یہ لوگ اکثر دن کا بہت سا حصہ ہوٹلوں میں گذارتے ہیں۔ جہاں یہ چائے پیتے رہتے ہیں اور باتیں کرتے رہتے ہیں، ان میں بعض ہوٹلوں کی گیلریوں میں اپنے فوجی لباس میں کھڑے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے بلند قہقہے بالا دو میں سے سر جھکا کر گذرنے والے اہلِ پیرس کو سنائی دیتے ہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی گردن اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھتا ہے تو جرمنوں کے ہونٹوں کا تبسم جو اپنے میں نفرت کی تلخی لئے ہوتا ہے۔ ان کا استقبال کرتا ہے۔ اور وہ آنکھیں جھکا کر خاموشی سے گذر جاتے ہیں۔

"سقوطِ فرانس جرمنوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے اور ان کو ایک فائدہ یہ بھی پہنچا ہے کہ جرمن ریشتاغ کے نوٹ جن کی جرمنی میں کوئی قیمت نہیں وہی فرانس میں چل رہے ہیں۔ پیرس کی جرمن حکومت اُن دُکانداروں کے ساتھ نہایت سختی کا سلوک کرتی ہے جو ان کو قبول نہیں کرتے، جرمن ان نوٹوں سے ایسے ایسے تحفے خرید کر اپنے جرمن دوستوں کو بھیج رہے ہیں جنہیں وہ جرمنی میں نہ خرید سکتے تھے۔

"جرمن افواج جو پیرس میں مقیم ہیں، اکثر پیرس کی سڑکوں پر پریڈ کرتی نظر آتی ہیں۔ پریڈ کے اوقات کے علاوہ جو وقت ہوتا ہے وہ آرک ڈی ٹرائمف[1] میں جسے نپولین نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر بنوایا تھا، گذارتی ہیں۔

"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پیرس اور مفتوحہ علاقے کے تمام اخبارات پر جرمنوں کا پورا قبضہ ہے۔ اخبارات کے مالکوں کو حکم ہے کہ شائع کرنے سے پہلے مضامین اور خبریں جرمن سنسر آفیسر کو دکھا لیا کریں جو اخبار اس حکم کی متابعت نہیں کرتا اُس کی اشاعت کو روک دیا جاتا ہے۔

پیرس میں جرمنوں کے داخلے سے قبل کئی لوگ پیرس سے بھاگ گئے تھے اور کئی قہوہ خانے، عالی شان ہوٹل اور گودام بند ہو گئے تھے۔ اب ان کے متعلق جرمن حکومت نے ایک حکم نافذ کیا ہے کہ کوئی شخص حکومت کی اجازت کے بغیر اپنی دکانوں، گوداموں، قہوہ خانوں اور ہوٹلوں کو نہ کھولے بعض لوگوں نے جو پیرس پر جرمن قبضے کے بعد اپنے گھروں کو واپس آئے ایسا کیا اگر ان کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ جو مالک اپنی دکانوں وغیرہ کو کھولنے کے لئے اجازت حاصل کرتے ہیں ان کے سامنے ایسی سخت شرائط پیش کی جاتی ہیں کہ انہیں اپنا کاروبار شروع کرنے کی جرأت ہی نہیں پڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن حملے کے وقت پیرس کی جو دکانیں اور ہوٹل وغیرہ بند ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثر بدستور بند ہیں۔ ان کے علاوہ جرمن دن رات اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے لوگوں کو ہدایت کرتے رہتے ہیں کہ وہ فی الفور اپنے اپنے گھروں کو واپس آ جائیں اور اپنا اپنا کاروبار شروع کر دیں۔ مگر زبان سے وہ جو کچھ کہتے ہیں عمل سے اس کی تردید کر دیتے ہیں۔

"پیرس والوں میں سے اکثریت کی حالت سخت ناگفتہ بہ ہے اُن کے پاس مکانوں کا کرایہ ادا کرنے کے لئے بھی رقم نہیں ہے، اور جرمن حکومت لوگوں کی مشکلات کو حل کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی بلکہ وہاں اپنا فوجی قبضہ مضبوط کرنے پر تمام تر کوششیں صرف کر رہی ہے۔

"پیرس میں جرمن زبان پھیلانے کی کوشش بھی بڑے زوروں پر ہے کتب فروشوں کے پاس جرمن فرنچ ڈکشنریاں بکنے کے لئے پہنچ گئی ہیں جو

[1] لفظی معنی "فتح کی محراب"

جرمن حکومت نے فراہم کی ہیں اور جرمن زبان کا پروپیگنڈا اس قدر زیادہ کیا جا رہا ہے کہ ہوٹلوں کے کھانوں کی فہرستیں بھی جرمن زبان میں تیار کرائی گئی ہیں۔ اور دکانداروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ سائن بورڈ جرمن زبان میں لکھوائیں اور لوگوں کی رہنمائی کے لئے چوراہوں میں بورڈ بھی جرمن زبان میں لکھوائے گئے ہیں۔

غرضکہ پیرس کو بالکل جرمن رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔ جرمنوں کے لئے وہاں زندگی نہایت سستی اور فرانسیسیوں کے لئے نہایت گراں ہے۔ جرمنوں کے لئے ہر شے سستی ہے اور وہاں کے نرخ پیرس کی جرمن حکومت نے خود مقرر کئے ہیں۔ علاوہ ازیں جرمن فوج نے ایوانِ نمائندگان، اور دیگر سرکاری عمارتوں کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا ہے، مارشل فوش اور نپولین کے مقابر پر بھی جرمن جھنڈے لہرا رہے ہیں اور بازاروں پارکوں اور سرکاری عمارتوں پر بھی سواستیکا نظر آتا ہے جسے فرانسیسی بازوں نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر اُن کو اُسے سلامی دینا پڑتی ہے۔

تابش صدیقی

ایک نظم

اپنا اپنا راگ

اک کلی نے چٹک کے گل سے کہا کس قدر پُر سرور ہے دُنیا
جھوم کر گل بھی یوں لگا کہنے سیل اک رنگ و بُو کا ہے گویا
سُن کے یہ ایک قطرۂ شبنم
اشک کی طرح خاک پر ٹپکا

مسعود شاہد

سسرال جانے پر

(سانیٹ)

میں اتنی دور سے ملنے کی خاطر چل کے آیا ہوں
چھُپی جاتی ہو کیوں کونے میں، شرماتی ہو کیوں مجھ سے؟
کہو کچھ تو مری پیاری کہ گھبراتی ہو کیوں مجھ سے؟
اِدھر دیکھو، تمہارے واسطے کیسا کچھ میں لایا ہوں!

خدارا اب مرے جذبات کی کچھ تو کرو پروا۔
جو پردہ درمیاں حائل ہے اب اُس کو اُٹھا ڈالو،
جو دل میں ہیں شکوکِ ناروا اُن کو مٹا ڈالو،
نہیں چھُپ چھُپ کے رہنا مجھ سے یوں ہرگز نہیں زیبا۔

سمجھتا ہوں کہ تم مجبور ہو رسمِ زمانہ سے
مگر کچھ میرے حالِ زار پر بھی رحم فرماؤ
تڑپتا ہو جو پہلے ہی نہ اُس کو اور تڑپاؤ
دکھاؤ صورتِ زیبا کہ اب بے تاب ہیں سجدے

رہو گی مجھ سے چھُپ چھُپ کر، کہو جانِ وفا کب تک؟
کئے جاؤں گا میں آخر تغافل کا گلہ کب تک!

روشن نکودری

قانون قدرت

گلیوں کی شمعیں بجھ گئیں اور شہر سُونا ہو گیا
بجلی کا کھمبا تھام کر بانکا سپاہی سو گیا
تاریکیوں کی دیویاں کرنے لگیں سرگوشیاں
اک دھیمی دھیمی تان میں گانے لگیں خاموشیاں
مشرق کے پربت سے کئی اُبھریں گھٹائیں یک بیک
انگڑائیاں لینے لگیں بے خود ہوائیں یک بیک
تارے نگلتی بدلیاں چاروں طرف چھانے لگیں
چھم چھم پھواروں کی جھڑی دھرتی پہ برسانے لگیں
کُتّے اچانک چونک کر بھونکے دبک کر سو گئے
بے رس چچوڑی ہڈیوں کی لذتوں میں کھو گئے
مائیں لپکتی ہیں کہیں، بچے بلکتے ہیں کہیں
اور چارپائی کے لئے بوڑھے اُچکتے ہیں کہیں
اک سرسراہٹ سی اُٹھی، لہرائی، تھم کر رہ گئی
ہر چیز نے آنکھیں ملیں، ہر چیز جم کر رہ گئی
پھر گنگناتی ظلمتوں کا سحر ہر سو چھا گیا۔
بادل کہیں گم ہو گئے، تاروں پہ جوبن آ گیا،

قدرت کے سب چھوٹے بڑے قانون ہیں یکساں مگر
پردے پڑے ہیں جا بجا، چھنتی نہیں جن سے نظر
انسان کا معصوم دل، تاریک، سُونا شہر ہے
جس کے تلے احساس کی چنگاریوں کی لہر ہے *
جب دیکھتا ہے وہ کہیں بدمست پنگھٹ والیاں
گالوں کو جن کے چومتی ہیں تیتلی بالیاں
زلفیں گھٹاؤں کی طرح، آنکھیں ستاروں کی طرح
چلنا ہواؤں کی طرح، رنگت شراروں کی طرح
لہنگے کی لہروں کے تلے نکھرے سے پاؤں رقص میں
پگڈنڈیوں کے اس طرف گاگر کی چھاؤں رقص میں
سینے چھلکتے میکدے اور ہونٹ پیمانوں کے لب
ٹخنوں پہ بجتی جھانجھنیں، ہنسنا ہنسانا بے سبب
یہ دیکھ کر انگڑائیاں لیتا ہے دل انسان کا
ہوتا ہے ہر دھڑکن پہ کیوں مجھ کو گماں طوفان کا؟
گلیوں میں جا کر چھپ گئیں یہ چلتی پھرتی بجلیاں
اور روح پر طاری ہوا سنسان راتوں کا سماں!

احمد ندیم قاسمی

اردو مزاحیہ نگاری کی مختصر تاریخ

کسی زبان کے ادب کے لئے مزاحیہ مضامین (نظم و نثر) کا عنصر کافی تعداد میں ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ سنجیدہ مضامین کا۔ اس کے بغیر زبان کا شمار دنیا کی مستند اور مشہور زبانوں میں نہیں ہوسکتا۔ لاطینی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، عربی، فارسی غرضکہ دنیا کی تمام مشہور زبانوں کے ادب میں ہمیں مزاح کا عنصر کافی ملتا ہے۔ انگریزی ادب میں ڈرائیڈن، سوئفٹ، پوپ، تھیکرے، ڈکنز اور مارک ٹوین کا نام مزاح نگاری کے سلسلے میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مزاح نگاری کا سرمایہ اردو سے بہتر اور زیادہ مقدار میں کسی دوسری زبان کے پاس نہیں۔ اردو ادب بجا طور پر سودا، انشاء، غالب، نواب آزاد، ظفر علی خاں، رشید احمد صدیقی، پطرس اور فرحت اللہ بیگ کی ظرافت پر ناز کر سکتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اردو میں مزاح نگاری کی مختصر تاریخ بیان کریں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند الفاظ کے مفہوم کو واضح کردیں تاکہ آگے چل کر ہر چیز اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ طنز، ہجو اور مزاح میں فرق ہے۔ حالانکہ ایک کو دوسرے میں اچھی طرح شامل کیا جا سکتا ہے۔ کسی فرد یا قوم یا سوسائٹی کی کمزوریاں اس طرح اُجاگر کرنا کہ اس میں تیسری اور اصلاحی شان ہو طنز کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کمزوریاں یا تو مزاحیہ پیرائے میں بیان کی جاتی ہیں یا پھر معمولی خشک پیرائے میں۔ آخرالذکر صورت میں یہ صرف ایک پند و نصائح کا دفتر یا ایک وعظ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک کامیاب طنز نگار کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اُس کی طنز میں زہر نہ شامل نہ ہو ورنہ اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ ہجو میں اصلاحی مقصد اتنا پیش نظر نہیں ہوتا جتنا کہ دوسرے کی خامیاں عوام کو دکھا کر اپنے جذبے کو تسکین دینا ہوتا ہے۔ ہجو سے اصلاح کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن عموماً یہ کسی کی مخالفت یا کسی اور جذبے سے متاثر ہو کر لکھی جاتی ہے۔ اس میں زہر کی بلا کی ہوتی ہے۔ مزاح ایک جامع لفظ ہے۔ ایک طرف اس میں طنز شامل ہے (بشرطیکہ وہ مزاحیہ پیرائے میں ہو) اور دوسری طرف ہجو بشرطیکہ اُس نے گالی گلوچ کی شکل اختیار نہ کرلی ہو اور زبان بالکل عامیانہ نہ ہوگئی ہو۔ ہم اپنے اس مضمون میں صرف اُن انشاپردازوں اور شاعروں کو مزاح نگار تسلیم کریں گے جن کے کلام یا تصانیف کی عام خصوصیت مزاح ہو اور جو مزاح نگاری کے مسلّمہ معیار پر پورے اترتے ہوں۔ اسی لئے آپ کو اس میں چند نام ایسے نظر آئیں گے جن کے متعلق آپ نے کبھی یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ یہ مزاح نگار ہو سکتے ہیں اور اس کے برعکس چند ایسے نام آپ نہ پائیں گے جن کا شامل کرنا آپ کے خیال میں ضروری تھا۔

اس انتخاب میں صرف اول و دوم درجے کے مزاح نگاروں کو شامل کیا گیا ہے اس لئے ادنیٰ درجہ کے مزاح نگاروں کا اس میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات یہاں پر اور عرض کردینا ضروری ہے۔ راقم الحروف کی ناقص رائے میں ایک مزاحیہ مضمون یا تو اول قسم کے مضامین کی صف میں رکھا جا سکتا ہے یا پھر اس کا ٹھکانا کہیں نہیں رہتا۔ غرض ادب کی اس صنف میں تیسرے درجے کی چیز کی بہت کم کھپت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مزاح نگاری ناول اور افسانہ نویسی، شاعری اور تنقید سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اور مزاح نگار بس گنتی ہی کے دو چار ہوتے ہیں۔ طویل اقتباسات کے درج کرنے سے ایک حد تک پرہیز کیا گیا ہے تاہم کوشش کی گئی ہے کہ ہر مزاح نگار کی تصنیف سے کچھ نہ کچھ ضرور درج کیا جائے۔ مزاح نگاری کے تین بڑے بڑے دور قائم کئے جا سکتے ہیں یعنی پہلا دور ابتدا (جعفر زٹلی) سے اودھ پنچ سکول کے شروع تک، دوسرا دور اودھ پنچ اسکول کے اختتام تک، دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان ایک عبوری دور اور اس کے بعد مزاح نگاری کا تیسرا یعنی جدید دور۔

پہلا دور۔ میر جعفر زٹلی ۱۶۵۹ء سے ۱۷۱۳ء تک

اردو میں مزاح نگاری کی ابتدا میر جعفر زٹلی سے کی جا سکتی ہے۔ میر جعفر اورنگ زیب کے زمانے میں تھے۔ ۱۷۱۳ء میں انتقال ہوا۔ اردو میں میر جعفر اپنی ہزلیات کی وجہ سے مشہور ہیں۔ عبدالباری آسی تذکرۂ "خندۂ گل" میں لکھتے ہیں "ان کی ظرافت اگرچہ ہزل کے درجے پر پہنچ گئی ہے اور خوش طبعی مسخراپن کا درجہ

رکھتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مسخرا پن ہو، ظرافت ہو، ہزل ہو کچھ ہو، اس دست کی ہے جس کا جواب بڑے بڑے اہلِ کمال نہیں دے سکتے۔ ان کے ایک ایک لفظ میں ظرافت اور خوش طبعی کا ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ بیشتر طرح طرح ... کے خوگر ہیں اتنے ہی اخلاق کے دل دادہ ہیں۔ اور اخلاق کے نکات بھی کبھی مولویوں کی طرح بیان نہیں کرتے بلکہ ان میں بھی اپنا انداز خاص قائم رہتا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں ایسے کہتے ہیں کہ دل پر مسرت اور فرحت کی بارش ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ خاص یہ ہے کہ وہ ایک سحر ہیں۔ رنگین مزاج ہیں۔ گو علم فضل و فنون سے بہت ہی آشنا ہیں جیسے اس زمانے کے باکمال ہوتے تھے۔ عربی اچھی طرح جانتے ہیں، فارسی کے ایسے ماہر ہیں کہ اس کے اہلِ کمال معلوم ہوتے ہیں اور اس بے تکلفی سے اس کو استعمال کرتے ہیں کہ یہی ان کی زبان معلوم ہوتی ہے۔" اورنگ زیب کو جب دکن میں فتح نصیب ہوئی تو جعفر نے ایک "ظفر نامہ" لکھا لیکن میر صاحب کی دربار تک رسائی نہ ہو سکی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نبشتہ ست اورنگ شاہ بلی — کہ در ملکِ دکن پڑی کھلبلی
برآورد لشکر صد و مرد و عام — کہ دل چل پڑی بر سر بر دم و شام
درین پیر سالی و ضعفِ بدن — مچائی دھما چوکڑی در دکن
نبشتہ شہ اورنگ کہ وقتِ دغا — نہ ہلد نہ ملد نہ جنبید جا
کمر بستہ ہشیار میدان پر — شب و روز تیار گھمسان پر

اورنگ زیب کی وفات پر میر جعفر نے متعدد اشعار لکھے۔ صرف دو شعر ملاحظہ ہوں:-

اورنگ زیب اب مر گئے نیکی جگت میں کر گئے — تخت و چھتر کٹ دھر گئے آخر فنا آخر فنا
مت واحد کی یاد میں رکھا اورنگ آباد میں — خوش گنبد بغداد میں آخر فنا آخر فنا

سودا

سودا بحیثیت ہجو نگار کے مشہور ہیں اور اس صنف کی [illegible] سے [illegible] تک مقبولیت کا سہرا اردو میں ہمیشہ ان کے سر رہے گا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کی کن کن ہجووں میں مزاح کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سودا کو فطرت نے مزاح نگار پیدا کیا تھا۔ طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ جہاں کسی سے ناراض ہوئے ہجو لکھ ڈالی۔ ان کے شہر آشوب بھی مشہور ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہم اس عہد کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ سکتے ہیں۔ غم و یاس کے جذبات کی مصوری کرنا ان کے بس کا نہ تھا۔ وہ درباری زندگی کے عادی ہو چکے تھے۔ طنز و مزاح ان کی طبیعت میں رچ گیا تھا۔ چنانچہ شیخ چاند ان کی ہجو گوئی کے متعلق لکھتے ہیں "سودا کی ہجو گوئی کے دو پہلو ہیں۔ اُس نے کہیں کہیں لطیف مزاح سے کام لیا ہے، کمزوری، کوتاہی، برائی اور بدی کو ظریفانہ انداز میں عریاں تو کیا ہے لیکن مطمح نظر ہمدردی اور اصلاح ہے۔ طیش میں آ کر عام ذمائم پر غم و غصہ اور ناراضگی و بیزاری کا اظہار نہیں کیا بلکہ بااسلوبِ لطیف ان خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن کئی ہجویہ نظمیں ایسی ہیں جن میں لعن طعن طنز و تشنیع اور سب و شتم سے کام لیا ہے۔" شیدی فولاد خاں کی ہجو میں سودا نے جو ایک مثنوی لکھی ہے در اصل وہ شہر دہلی کی بے امنی کا سچا نقشہ ہے کوتوال شہر کی رشوت خواری، اُس کی چوروں سے سازباز، چوروں کی دلیری اور اس کے شہر کے بند و بست پر تباہ کن اثرات کا نہایت کھلا بیان اس میں درج ہے۔ کوتوال شہر چوروں سے فرماتے ہیں:-

چیز میری جو اب چراؤ تم — چوک میں بیچنے نہ جاؤ تم
قیمت اس کی جو کچھ مشخص ہو — آدھے کو تم اُسے مجھی کو دو

چور اس کا جواب دیتے ہیں:-

آپ کے سر پہ یہ جو پگڑی ہے — دو خریدار اس کے ہیں در پے
دس روپے وہ مجھے دلاتے ہیں — کہئے اب آپ کیا لگاتے ہیں

شہر کی بدامنی کی یہ حالت ہے:-

شام سے صبح تک یہی ہے شور — دوڑیو گٹھڑی لے چلا ہے چور
آنکھ تو کس بشر کی لاگے ہے — چوروں کے ڈر سے فتنہ جاگے ہے

شکایت کرنے پر کوتوال کتنا مضحکہ انگیز جواب دیتا ہے۔

بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار — گرم ہے چوٹوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول — میری پگڑی کا میرے سر پہ مول
یار کچھ چل سکے ہے میرا زور — دیکھو تو تک کہاں کہاں ہے چور
کس کو ماروں میں کس کو دوں گالی — چوری کرنے سے کون ہے خالی

قصیدہ تضحیکِ روزگار بظاہر ایک گھوڑے کی ہجو معلوم ہوتی ہے لیکن در اصل یہ اس زمانے کے فوجی نظام کی خرابی کا ایک مرثیہ ہے۔ گھوڑے کی حالتِ زار ملاحظہ ہو:-

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں — فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا — ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال — کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گلہ
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد — امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

جنگ کے میدان میں گھوڑے اور سوار کی حالت ملاحظہ ہو:-

جاتا تھا جب جھپٹ کے میں اس کو جو دیکھ کے — دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار

جب دیکھیں ہیں کہ جنگ کی یاں اب بنسی ہو کل — لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا وہاں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف — القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

انشا

انشا کا نام اردو مزاح نگاری میں نہایت اہم ہے۔ وہ بلا کے شوخ و بذلہ سنج تھے۔ ان کا ماحول بھی ایسا تھا کہ بغیر مزاح و طنز کے کامیاب ہونا مشکل تھا۔ نواب سعادت علی خاں کی مصاحبی کے زمانے میں انشا کو اپنے جوہر دکھلانے کا خوب موقعہ ملا۔ مصحفی سے بھی خوب معرکے ہوئے، جن کا تفصیلی ذکر آبِ حیات میں درج ہے۔ جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے تسلیم کرنا پڑے گا مصحفی ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ مصحفی سنجیدہ تھے اور انشا ہنسوڑ، پھر بھلا دونوں کا ساتھ کیسے ہو سکتا تھا۔ ریختی اردو شاعری کی وہ خصوصیت ہے جو آپ دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں نہ پائیں گے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ مخربِ اخلاق ضرور ہے لیکن اردو زبان کو اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ لکھنؤ اور دہلی کے بیگماتی محاورے اور الفاظ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔ اس صنف کی ابتدا گو دکن میں بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن انشا و رنگین کے ہاتھوں اسے فروغ ہوا۔ جان صاحب کے زمانے میں گویا یہ اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ ہم ابتذال کی وجہ سے اسے مزاح نگاری کے ذیل میں شامل کرنے سے قاصر ہیں۔ انشا کی شوخ طبیعت نے ریختی میں وہ گل بوٹے کھلائے ہیں کہ بایدو شاید۔ سید انشا کی طبعی ظرافت اور شوخی کو طبعی مصاحبت اور مذاق نے خراب کیا اور اس نے ان کی شاعری کو بھی بگاڑے بغیر نہ چھوڑا۔ شوخی او ظرافت بڑی پرلطف چیز ہے اور کلام کا رتبہ اس سے بعض اوقات بہت بلند ہو جاتا ہے اور دلوں کو شگفتہ کرنے اور بعض خیالات کے ادا کرنے میں یہ ایک سحر کا کام کرتی ہے۔ بشرطیکہ ایک حد تک اور مناسبت سے ہو اور کوئی لطافت بھی پائی جاتی ہو (جیسے مرزا غالب کے کلام میں) لیکن افسوس ہے کہ سید انشا اللہ کے کلام میں بعض اوقات یہ شوخی و ظرافت تمسخر اور پھکڑ کے درجے تک اور پھکڑ سے فحش اور شہدپن تک پہنچ گئی ہے جو کانوں کو ناگوار اور ذوقِ سلیم پر بہت گراں گزرتا ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی — نہ سم کی نہ تال کی نہ سُر کی
تاریخ کہی ہے کس لُر کی — جو بلی علی نقی خاں بہادر کی

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر — اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
سنا یارات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا — تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا
رات وہ بولے مجھ سے ہنس کر جا ہیں پھر کس نیر ہا میں ہوں ہنسنو اور تجھے متلع میرا تیرا میل نہیں

خیال کیجیے کہ کیا آج کام میں نے کیا — جب اُن سے ملی مجھے گالی سلام میں نے کیا

غالب
۱۷۹۷ء سے ۱۸۶۹ء تک

غالب قہقہہ کے نہیں بلکہ تبسم زیرِ لب کے قائل تھے۔ ایک انگریز ادیب کا خیال ہے کہ ایک بڑا ادیب یا شاعر اپنے زمانے سے بہت پہلے پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس طرز و رنگ کو معلوم کر لیتا ہے جو آگے چل کر مقبول ہوگا۔ غالب نے مزاح نگاری کا جو معیار پیش نظر رکھا تھا، آگے چل کر وہ مقبول ثابت ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ کسی جگہ پھبتی کہتے ہیں نہ ظرافت کے لئے انوکھی تشبیہیں تلاش کرتے ہیں۔ نہ لطائف پیا پنادار و مدار رکھتے ہیں۔ نہ غیر معمولی باتیں بیان کرتے ہیں۔ خوشی کی جگہ خوشی کے اور غم کی جگہ غم کے الفاظ لاتے ہیں۔ واقعات کا بے کم و کاست اظہار کرتے ہیں۔ مگر اُن کی فطری اور طبعی ظرافت اور زندہ دلی اس سادگی میں بلا کی شوخی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ روا روی میں ایک بات کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں، مگر سننے والا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔ چونکہ شوخی طبیعت پر غالب تھی لہٰذا خطوط میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "اے جناب میرن صاحب۔ السلام علیکم۔ حضرت آداب، کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کیا کرتا ہوں۔ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ وہ اب تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے، صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے کیا خفا ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا، اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جائے۔ میں اب پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا۔ اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔"

غرض کہ پہلے دور کی مزاح نگاری غالب کے خطوط کو چھوڑ کر نظم پر مشتمل ہے اور ہزل و ہجو اس کا خاص عنصر ہے۔ سودا کی ہجویات اور غالب کے

خطوط اور وہ اوصاف ہیں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

دوسرا دور — اودھ پنچ اسکول

اودھ پنچ لکھنؤ کے اجراء سے اردو مزاح نگاری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ ہفتہ وار مزاحیہ اخبار ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ اس نے اردو ادب کی جو خدمت کی وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ منشی سجاد حسین اس کے اڈیٹر تھے۔ ان کی وفات کے دس گیارہ سال کے بعد حکیم ممتاز حسین نے اسے پھر جاری کیا لیکن زیادہ عرصے تک نہ چل سکا۔ پہلے دور کے مشہور لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد خاں آزاد، سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی، منشی احمد علی شوق، منشی جوالا پرشاد برق، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی احمد علی کسمنڈوی وغیرہ تھے۔ اودھ پنچ اسکول میں مزاح نگاری کے عمدہ نمونے نثر میں ملتے ہیں، حالانکہ نظم لکھنے والے شاعر بھی تھے۔ ہم اس دور کے بعض مزاح نگاروں پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالتے ہیں۔

سرشار — ۱۸۴۶ء سے ۱۹۰۲ء تک

پنڈت رتن ناتھ سرشار حالانکہ بعض وجوہ کی بنا پر اودھ پنچ سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ لیکن مزاح نگاری کے سلسلے میں ان کا شمار اودھ پنچ اسکول ہی میں کیا جائے گا۔ وہ مزاح نگار بعد کو ہیں اور ناول نویس پہلے، انہوں نے متعدد دلچسپ ناول لکھے جن کے نام یہ ہیں:۔

سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، فسانۂ آزاد، ہشو، کرم دھرم، بچھڑی ہوئی دلہن، طوفان بے تمیزی، گور غریباں وغیرہ۔ دنیا جانتی ہے کہ سرشار "فسانۂ آزاد" کی وجہ سے زندہ ہیں اور ان کی دیگر تصانیف ان کے نام کی وجہ سے۔ ان کی ظرافت کے بہترین نمونے "فسانۂ آزاد" میں ملتے ہیں اور خاص طور پر خوجی کے کردار میں۔ ایک مختصر سا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مصاحب: حضور صبر کیجئے۔ ع صبر تلخ ست و لے بر شیریں دارد، آتش کہہ گئے ہیں۔ بڑے نواب صاحب مر گئے تو حضور نے کیا کر لیا۔ چچا حضور کو چھوڑ کر چل بسے تو حضور نے کیا کر لیا۔ دادا جان ساری ثروت سے منہ موڑ کر داغ جدائی دے گئے، حضور نے کیا کر لیا۔ اب صبر کیجئے، صبر کیجئے۔

نواب: میاں بات یہ ہے کہ باپ دادا تو سب ہی کے مرا کرتے ہیں، مگر صف شکن سے وفادار جانور کا ایک دم بھی جدا ہونا کھلتا ہے۔ نہ یہ کہ کابک سے اڑ جانا۔ خیر خدا ان کو بخشے۔ اس وقت دل ہے کہ بے اختیار امڈا چلا آتا ہے۔

خوجی: کیا بک دیا کہ صبر تلخ ست و لے بر شیریں دارد۔ آتش کہہ گئے ہیں واہ ری معلومات۔ اے حضرت یہ سعدی کا شعر شیخ جی کا کلام ہے۔

نواب: کیا خرافات بک رہا ہے۔ یہ شعر و شاعری کی تحقیقات کا بھلا کون موقع ہے؟ وہ سعدی نہیں رودکی کہہ گئے سہی۔ پھر اس سے واسطہ؟ معلوم ہے کہ آپ بڑے شاعر کی دم ہیں۔ عجب نامعقول آدمی ہے بھئی!

مصاحب: اور خداوند یہ ان میں سخت عیب ہے کہ کسی نے بات کی اور انہوں نے جھٹ کاٹ دی۔ یوں نہیں ووں ہے، ووں نہیں یوں ہے۔ آم نہیں املی ہے، پوچھئے ہم تو اپنے آقا کی تسلی کے لئے تشفی آمیز باتیں کر رہے ہیں کہ صبر کیجئے۔ یہ ٹیٹو کے پر چڑھے بیٹھتے ہیں کہ آتش نہیں۔ سعدی کا کلام ہے۔ جس میں لوگ سمجھیں کہ آپ بھی بڑے شاعر ہیں۔ اور اللہ کی درست نہیں۔ بھلا صف شکن تو اس کا غذ پر لکھ دیجئے۔

خوجی: بیٹے صاحب وہ ہم تو کہے، گھامڑ، گاؤدی سہی، آپ تو اپنے وقت کے افلاطون ہیں نہ۔ بس چھٹی ہوئی (فسانۂ آزاد۔ جلد اول)

منشی سجاد حسین — ۱۸۵۶ء سے ۱۹۱۲ء تک

منشی سجاد حسین نے جو مضامین اودھ پنچ میں بحیثیت اس کے مدیر ہونے کے لکھے، ان سے قطع نظر وہ کئی ظریفانہ ناولوں کے مصنف بھی ہیں۔ حاجی بغلول، احمق الذین، پیاری دنیا، میٹھی چھری، ان کے مشہور ناول ہیں۔ رینالڈ کے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ بھی "طلسمی فانوس" کے نام سے کیا ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ دلچسپ کتاب ان کی تصنیف "حیات شیخ چلی" ہے۔ عبد الباری آسی نے "تذکرۂ خندۂ گل" میں سجاد حسین کی ظرافت کو سرشار کی ظرافت پر ترجیح دی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے بھی "طنزیات و مضحکات" میں اس پر کافی بحث کی ہے عبد الباری آسی لکھتے ہیں۔

"رتن ناتھ سرشار جب ظرافت لکھتے ہیں تو کچھ رسوم و رواج کے نقشے کھینچ کر کچھ محاکات پیدا کرتے ہیں۔ کچھ اس فرقے کے حالات لکھتے ہیں، اور ان میں محاورات کو داخل کرتے ہیں۔ کچھ اصطلاحات خاص لاتے ہیں۔ کچھ ضرب الامثال سے زینت کلام میں مدد لیتے ہیں۔ کچھ ہنسنے ہنسانے والے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کچھ کلام کو طول دیتے ہیں۔ کچھ مشاہیر کے تڑپانے والے اشعار موقع بموقع لکھتے ہیں تب کہیں جا کر عبارت میں ایک لطف پیدا ہوتا ہے۔ اس میں بھی ایک نقاد کی پہلی نظر نکتہ چین کو آورد کا عیب صاف اور کھلا ہوا نظر آتا ہے۔ اور دوسری نگاہ خوردہ بین طوالت کلام کی وجہ سے ہر داستان کو لندھور

سنہ طرحدار لونڈی۔ (ادارہ)

بن سعدان کی داستان خیال کرنے لگتی ہے۔ رنگین الفاظ کے قالب ظرافت کے نقش و نگار سے مزین اور مزیّن معلوم ہوتے ہیں مگر وہ لعبتِ چین سے زیادہ نہیں ہوتے، نہ اُن میں کوئی روح ہے نہ جان ہے۔ عام نظروں کو دھوکہ دینے میں البتہ مدد کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سجاد حسین مرحوم کی عبارت کو دیکھئے تو وہ عربی فارسی کے بلیغ اور وزنی الفاظ کی ثقالت کے باوجود بھی اتنی رنگین ظرافت میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کو کوئی حصہ اور کوئی بیرونی اور اندرونی پردہ اس سے خالی نظر نہیں آتا۔ غور کرنے پر اس کے لطف میں برابر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایک سادہ فقرہ بھی ان تمام فرائض کو ادا کرتا ہے جنہیں سرشار ایک ایک کر کے جمع کرتے ہیں۔ ایجاد، ایجاز، اختصار، فصاحت، بلاغت ہر جگہ دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ ایک ایک پھبتی ظرافت کے ایک ملک و نثر کا جواب ہے۔ ہر فقرہ پکارتا ہے کہ جس جگہ میں ہوں اس کے لئے وضع ہوا ہوں۔ ہر جملہ بتاتا ہے کہ اس رنگِ خاص کا میں ہی آغاز ہوں۔ اور مجھی پر اس رنگ کا اختتام ہے۔" آسی صاحب نے سرشار کی ظرافت کے جو عناصر گنوائے ہیں ہمیں اُن سے اتفاق ہے لیکن جو نتیجہ انہوں نے مرتب کیا ہے وہ درست نہیں۔ ان کے نزدیک سرشار کی ظرافت میں کوئی روح ہے نہ جان، وہ محض عام نظروں کو دھوکا دینے میں مدد کرتی ہے۔ سرشار کی ظرافت میں روح بھی ہے اور جان بھی، وہ خواہ مخواہ ناظرین کو الفاظ کی بھول بھلیاں میں چھوڑ کر دھوکا نہیں دیتا۔ وہ عربی و فارسی کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کر کے اپنی علمی قابلیت کا اظہار بھی نہیں کرتا، نہ وہ ناظرین کو ہنسانے کے لئے کوئی عجیب و غریب پلاٹ بھی نہیں بنتا بلکہ وہ ماحول اور فضا سے ظرافت پیدا کرتا ہے۔ وہ ڈرائنگ روم کے لئے مزاح نگاری نہیں کرتا بلکہ عام پر اپنی مزاح نگاری سے لوگوں کو متوجہ کرتا ہے اس کی ظرافت ادنیٰ درجہ کی سہی، لیکن وہ عوام میں مقبول ہے۔ ایک چیز دونوں کے یہاں مشترک ہے یعنی سرشار اور سجاد حسین دونوں زبان اور اسلوب سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ سرشار کے یہاں اگر بے جا طوالت ناموزوں معلوم ہوتی ہے تو سجاد حسین کے یہاں ثقیل عربی و فارسی الفاظ کا استعمال بدنما لگتا ہے۔ دونوں کی ظرافت میں اکثر جگہ ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے دونوں کا شمار صفِ اوّل کے مزاح نگاروں میں نہیں کیا جا سکتا۔ بہرکیف سرشار اور سجاد حسین دونوں کی ظرافت اپنے اپنے رنگ میں کامیاب ہے سجاد حسین کے متفرق مضامین ہیں ان کے متعدد خطوط جو انہوں نے اپنے سالے، پیارے رسپانڈنیٹ، گلیڈ اسٹون وغیرہ کے نام لکھے ہیں۔ اہم ہیں اور پنچ اسکول کے مزاح کا اچھا نمونہ ہیں۔

نواب آزاد | نواب آزاد آئی۔ ایس۔ او۔ پنچ اسکول میں ایک مخصوص درجے کے مالک ہیں۔ ان کے یہاں عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ جیسا کہ سجاد حسین استعمال کرتے ہیں نہیں ہوتے، وہ بھی اپنے اسلوب سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ وہ خطا جو "مائی ڈیر پاپا" اور "مائی ڈیر بیگم" کے نام سے لکھے گئے ہیں بہت دلچسپ ہیں۔ مغربی معاشرت کی کمزوریاں اس سے زیادہ دلچسپ پیرائے میں اُجاگر کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ آزاد نے ایک مزاحیہ لغت بھی ترتیب دی تھی جو غالباً نامکمل رہی۔ اس میں بعض الفاظ کے معنی بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔

اکبر
۱۸۴۶ء سے ۱۹۲۱ء تک | لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے ظرافت کا نقاب ڈال کر طنز و مزاح کے پیرائے میں مغربی تہذیب و معاشرت کی اچھی طرح دھجیاں اڑائیں۔ وہ فطرتاً قدامت پسند تھے، اس لئے ہر نئی چیز کے مخالف تھے۔ دراصل اکبر کی شاعری حالی کی شاعری کا ردِ عمل تھی۔ ان کے کلیات کے تین حصے شائع ہو چکے ہیں، چوتھا حصہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ مزاحیہ اشعار کی تعداد درمیانی حصے میں زیادہ ہے۔ ابتدا میں تغزل کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی۔ آخر میں تصوف غالب آگیا تھا۔ اکبر کی ظرافت کے اہم اجزا یہ ہیں:۔

(۱) **رعایت لفظی یا ضلع جگت**:۔ اکبر چونکہ وحید کے شاگرد تھے۔ اور وحید کو آتش سے تلمذ تھا (طالب الٰہ آبادی کا بیان ہے کہ بشیر شاگرد آتش سے تلمذ تھا عسکری آتش کا شاگرد بتاتے ہیں اور رشید سلیمان ندوی آتش یا ناسخ میں سے کسی کا) اس لئے لکھنؤ اسکول کا رنگ ان پر چڑھا ہوا تھا۔ کوئی شے بذاتِ خود اچھی ہوتی ہے نہ بُری، اُس کا موقعہ اور طریقۂ استعمال اچھا یا برا ہوتا ہے۔ ضلع جگت اور رعایت لفظی کا استعمال سنجیدہ کلام میں کسی طرح نہیں کھپ سکتا۔ البتہ ظرافت میں اُن کا استعمال اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اکبر نے اکثر صنعت تجنیس سے کام لیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں مربّا کو ہضم — اس سے بہتر ہے غذا کے واسطے چورن نہیں
ملکی ترقیوں میں وہ والے نکالئے — پلٹن نہیں تو خیر رسالے نکالئے
سراسر نور تقویٰ سایہ پر قربان کر آئے — یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زر رکھو کے مس لائے
شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ — گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

۲۔ **جدّتِ قافیہ**:۔ اکبر کے ظریفانہ اشعار کی کامیابی ایک حد تک

ان کے قافیوں کی جدت پر منحصر ہے۔ اکثر وہ قافیہ کے لئے انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔

ہر طرف بے حجاب عاجزی ہم تن — اب جا ہے امام حنبل ہیں

ہوا سے طرز ہے اب نہ سوچیں۔ مرتے کوٹ ہے اب نغلوں

ہوس یہ ہے تو بس یہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائیں پلیڈ میں

بلبل میں آگ امام چمنستان لمپ کے — پروانہ گل نہیں مگر کلیسا کے لمپ کے

فکر بہشت دکر تر تسنیم ہو چکی — اب پارک کی ہوا ہے جو چھپ چکے

رکھتے تھے جو زنگ قدم پھونک پھونک کر — خوش بخت ہیں بیچ کے اسٹپ کے ہو چکے

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے — تو پھر اس کی کیا خوشی کہ کوئی جینٹلمین ہے

بعض اوقات ایسا قافیہ نکال لیتے تھے کہ خیال میں بھی نہ آتا تھا۔

اتنا نہیں مجھ کو تو بسِ قبلی — ہے بات یہ صاف بھائی تبلی

(۴) ایہام: کسی لفظ یا فقرے کے اگر دو مطلب ہوں، قریب تر مقصود نہ ہو بلکہ بعید تر مقصود ہو، اسے صنعتِ ایہام کہتے ہیں۔ اکبر نے اس کا استعمال اکثر جگہ کیا ہے۔

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے ایک مضموں لکھا

میرا مضموں رہ گیا ڈاسن کا جوتا چل گیا

بچئے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر — تم کیا ہو خدا کے بھی ٹکڑے کر دیں

(۵) قدیم شعرا کے خیالات دوسرے پیرائے میں:۔ اکبر بعض دفعہ قدیم شعرا کے خیالات اس طرح الٹ پلٹ کر بیان کرتے ہیں کہ بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔

سعدی کا مصرعہ ہے۔ ع چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

اکبر کہتے ہیں ؎ چو مسٹر نباشد ترا میہماں

چہ بر میز خوردن چہ بر روئے خواں

(۶) بعض مخصوص الفاظ اکبر کے یہاں اصطلاحات کا کام دیتے ہیں، مثلاً شیخ، مس، اونٹ، جمن، وفاتی، گائے، بسکٹ، پوری وغیرہ۔ اس قسم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی

بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

چھوڑیں جو گائے ماتا حسرت سے اونٹ بولے

افسوس شیخ جی نے ہم کو پتا نہ سمجھا

اولاد مرزا ہر طرف بدنام ہیں — ینگ بد حقوق وارثِ اسلام ہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے — کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب — بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے

(۶) جدید محاورات:۔ اکبر کا کمال ایک یہ بھی ہے کہ وہ ان جدید محاوروں کا خوب استعمال کرتے ہیں جو انگریزی زبان کے اختلاط سے پیدا ہو گئے ہیں۔ مثلاً

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں

کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

بیٹھا رہا میں صبح سے اس در پہ شام تک

افسوس ہے ہوا نہ میسر سلام تک

(۷) جدید تشبیہات و استعارات:۔ اکبر نے بہت سی نئی تشبیہات اور استعارات کا اپنے ظریفانہ کلام میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو — اس کو کالج اور اُسے کانووکیشن سمجھو

آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا دل — طپشِ قلب کو انگال ازیجی ٹیشن سمجھو

اتنا بھی نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی — شاید برسلیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

اودھ پنچ دس گیارہ سال کے بعد پھر جاری ہوا، لیکن پہلے کے سے مضمون نگار میسر نہ آئے۔ دوسرے دور میں خود مدیر حکیم ممتاز حسن اور ظریف لکھنوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اودھ پنچ کے دوسرے دور میں ریاض خیرآبادی نے گورکھپور سے "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" نکالا لیکن زیادہ عرصہ تک نہ چلا سکے۔ اردو مزاح نگاری کی تاریخ میں اودھ پنچ کا دور اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت دلچسپ ہے۔

<u>عبوری دور</u> دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان ہمیں ایک عبوری دور قائم کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس دور کے مزاح نگار خدا کے فضل و کرم سے سب بقیدِ حیات ہیں، لیکن ان کا رنگ موجودہ مزاح نگاروں کے رنگ سے قدرے مختلف ہے اور انہوں نے اس رنگ میں لکھنا بھی اب بند کر دیا ہے۔

<u>میر محفوظ علی</u> میر صاحب نے کبھی منظرِ عام پر آنا پسند نہ کیا اور ہمیشہ مضامین مختلف ناموں کے پردے میں لکھتے رہے۔ ناظرین کو شاید یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ مسافر، ملا، منشی جی، مضمون الصلی، شمع بے نور میر محفوظ علی کے ہی دوسرے نام تھے۔ مولانا محمد علی مرحوم نے جب ہمدرد نکالا تو میر صاحب کو بھی اس کے ادارۂ تحریر کا ایک رکن قرار دیا۔ انہوں نے "ہمدرد" میں اکثر شذرات اپنے مخصوص مزاحیہ رنگ میں لکھے۔ رسالہ نقیب بدایوں

میں بھی اکثر مضامین شائع ہوتے رہتے تھے، جن کا انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے۔ مولانا ماجد دریابادی لکھتے ہیں "قوم و ملت کے گمنام مشاہیر کا کوئی تذکرہ اگر مرتب کیا جائے تو اس کا سرعنوان بعد علامہ حمیدالدین رحمۃ اللہ علیہ انہیں کے نام نامی کو بتایا جائے گا۔ سچی مذہبیت اور پختہ دینداری کے ساتھ ذوقِ ادب اور حسن انشا کی اس جامعیت کی مثالیں شاذ و نادر ہی مل سکتی ہیں۔ میر صاحب کا قلم اردو میں مہذب ظرافت اور شریفانہ شوخ نگاری کے بہتر سے بہتر نمونے پیش کر چکا ہے۔" میر صاحب اکثر جگہ رعایت لفظی سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ کا زیادہ استعمال بھی ایک بدنما حد تک پہنچ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم میر صاحب کو صفِ اوّل کے مزاح نگاروں میں شامل کرنے پر مجبور ہیں۔ میر صاحب کی مزاح نگاری اپنے اسلوب اور معنویت کی وجہ سے بہت قابلِ قدر ہے۔ لیکن افسوس کہ انہوں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی اور آج کل تو تقریباً لکھنا بالکل بند کر دیا ہے۔ ذیل میں ان کے ایک اہم مضمون "محمد علی کی یاد میں" سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں۔

"جب وہ ولایت کو روانہ ہونے تو ان کے دماغ پر عقل مآل اندیش کا قبضہ مگر ان کے دل پر عشق مصلحت ناشناس کا غلبہ تھا اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں دونوں کی رقابت و مناقشت کارفرما تھی۔ عقل کی رائے تھی کہ وہ مسٹر ایم۔ علی آئی۔ سی۔ ایس بنائے جائیں مگر عشق کی صلاح کہ رئیس الاحرار مولانا حاجی محمد علی بنیں۔ عقل کی مرضی تھی کہ وہ انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں مگر عشق کی خوشی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ عقل نے انہیں سزا دینے کا طریقہ مگر عشق نے سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا۔ عقل نے ان کے لئے جج کا چغہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کرتہ اور حج کا احرام بنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ بریڈلا اور ڈانگر سال کے زمرۂ شاگردی میں مگر عشق کا حکم کہ اویس و بلال کے حلقۂ غلامی میں آئیں۔ غرض کہ عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید مگر عشق کا فتوےٰ کہ شہید ہوں!"

"ایک دن صبح کے وقت میں نے دیکھا کہ محمد علی کاغذ کا ایک پرزہ لئے پھاٹک پر کھڑے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس پرزے کو اونچی جگہ گوند سے چسپاں کریں میں نے کہا لاؤ میں لگا دوں۔ دیکھا تو انگریزی میں انہیں کے ہاتھ کا لکھا نوٹس تھا کہ جلسہ گیارھویں تاریخ ہونے والا ہے۔ گیارھویں کو انہوں نے 11 ST لکھا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا؟ کہنے لگے ٹن فرسٹ (Ten first) میں نے آہستہ سے کان گرم کئے اور اصلاح کر دی۔"

سلطان حیدر جوش

سلطان حیدر جوش نے "مخزن" اور "نقیب" میں کافی مضامین لکھے اور ملک میں ان کا شمار ایک افسانہ نگار اور مزاح نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ طنز نگاری میں بھی انہیں ایک ممتاز جگہ مل سکتی ہے۔" جوش کی طنز نہایت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا مضمون ابلیس ملاحظہ ہو۔ جوش صاحب کا قدم محسوسات کی دنیا میں بھی آ گے پڑتا ہے۔ وہ ایک لطیف طرز نگارش کے مالک ہیں، ایک طرح کے صنعت گر بھی ہیں اور ان کی انشا نگوں کے جڑنے سے کم نہیں، یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور معنی مل کر ان کے رنگ کو ایک پرشباب عورت سے زیادہ دلفریب بنا دیتے ہیں۔ جوش فلسفۂ شباب سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ موضوع لوٹ پھیر کر ہر مضمون میں وہ دہرا بھی دیتے ہیں۔ ان کو قدامت پسند کہنا بے جا نہ ہو گا (TRADITIONALIST) اس طبقے میں بات کسی مقصد کو پورا کرتی ہو یا نہیں سلیقہ سے کہنی چاہئیے۔ اس میں زبان کا چٹخارہ ضروری ہوتا ہے اور رعایت لفظی کی چاشنی بھی۔" اپنے ایک افسانہ "نادر زاد" میں ایک نوجوان بیرسٹر کا ذکر اس طرح کرتے ہیں "یہ نوجوان بیرسٹر ولایت جانے سے پیشتر محض حیدر کرار تھے۔ ایک مجلس میں ان کے برادرِ خورد خوش اطوار کا نام جعفر طیار اور بزرگوار کا نام احمد مختار معلوم ہونے پر ایک حاضر جواب نے بے ساختہ ان کے جدِ امجد کا نام پاک پروردگار" تجویز کیا تھا۔ اور یہ لطیفہ شہر بھر میں مشہور ہو گیا تھا۔ حیدر کرار ولایت کے زمانے میں آئی۔ سی۔ ایس، ڈاکٹری اور انجنیئری کے امتحانات کے لئے محمود غزنوی بنے رہے۔ فرق اس قدر تھا کہ محمود اپنے حملوں میں فتح یاب رہا اور یہ ہمیشہ شکست اٹھاتے رہے۔" اسی افسانے میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"خوش قسمتی سے وہ اس آزاد طبقے کی شگوفہ تھی جس کو دل گیری کی جدوجہد میں ماں باپ کا علم اس قدر بھی نہیں ہوتا جس قدر اسٹوارٹ مل اور ہکسلے کو خدا کا۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ پیدائش کا دارومدار ماں پر اور پیداوار کا انحصار زمین پر۔ دوپایہ مخلوق ہو یا ہزار پایہ، تخم ریزی کا فرض کوئی بھی ادا کرے، افزائش نسل کا سہرا مادہ ہی کے سر رہتا ہے۔ قانون فطرت کے پابند حیوان کو باپ کے معلوم کرنے کی ضرورت پیدائش سے لے کر موت تک ایک دفعہ بھی محسوس نہیں ہوتی۔"

ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں عبوری دور کی آخری کڑی ہیں۔ آپ نثار بھی ہیں اور شاعر بھی، مزاح نگار بھی ہیں اور طنز نگار بھی۔ ایک عرصے سے "زمیندار" نکال رہے ہیں۔ آپ صحیح معنی میں جرنلسٹ ہیں مزاح کا رنگ

نثر و نظم دونوں میں نمایاں ہے" نثر میں جس طرزِ نگارش کی آپ نے بنیاد ڈالی وہ ملک کے علمی و ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ آپ کی تحریر میں آپ کے لب و لہجے کی طرح ایک خاص وقار، ایک خاص متانت، ایک دلکش شستگی و شگفتگی، کیف اور والہانہ پن ہوتا ہے .... زمیندار کے سیاسی علمی و ادبی مقالات جو آپ کے قلم سے نکلے علم و ادب کی جان اور مستقل لٹریچر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں [illegible] سے انگوٹھا، جنگِ روس و جاپان، روحِ معانی، بہارستان، لطائف و ظرائف وغیرہ مقبول و معروف ہو چکی ہیں" ان کا جامہ طنز ہجو کی حد تک پہنچ جاتی ہے لیکن یہ ہجو بیشتر ذاتی نہیں ہوتی بلکہ برے وقتے یا ماحول کی ہوتی ہے۔ نظمیں بھی بیشتر سیاسی ہوتی ہیں لکھتے ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے رنگ میں خوب ہوتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ [illegible] انقلاب کو دیکھے   انقلابات ہیں زمانے کے

جب سے ہم میں آئے جل اور بہ پیدا ہوئے [illegible] اٹھے اور نثر پیدا ہوگئے
[illegible] تہذیبِ غرب [illegible] غیرت سے [illegible] پیدا ہوگئے
پاس ناموس شریعت [illegible] والوں کو نہیں [illegible] سب ہم [illegible] پیدا ہوگئے
دیکھا تھا ہم کو ان آنکھوں سے یہی نقشہ آدمی کم ہوگئے سب اور [illegible] پیدا ہوگئے

اس دورِ طبعاری کی وہ تنظیم کریں گے ٭ خود اپنی شریعت ہی میں ترمیم کریں گے
پاپاؤں سے بھی جو ابھی تک نہ ہوا تھا ٭ وہ کام یہ فرزندِ براہیم کریں گے

اگر بالشت بھر داڑھی ہی ایماں کی علامت ہے
تو پھر فرمائیے سکھوں کو مومن کیوں نہ سمجھیں ہم
گئے بن ٹھن کے ملنے مکتب سے حضرتِ واعظ
پھر اس بٹے کو اک معشوقِ کمسن کیوں نہ سمجھیں ہم

تیسرا دور اردو مزاح نگاری کا تیسرا دور اس کا زریں دور ہے۔ اس دور کے مزاح نگاروں کو ہم کسی زبان کے بہترین مزاح نگاروں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ مزاح کا معیار بھی اس دور میں بدل گیا ہے۔ اب قہقہہ لگنے کی ضرورت نہیں بلکہ تبسم زیرِ لب کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ مزاح نگاروں کا رجحان زیادہ تر نثر کی طرف ہے۔ اسلوب اور زبان کی چاشنی سے مزاح پیدا کرنا آج کل کمال سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ اس زمانے میں بھی مزاح نگاری کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ اگر پڑھنے والے نے قہقہہ لگا دیا تو مضمون بہت کامیاب ہے، مسکرا دیا تو بھی غنیمت ہے ورنہ مضمون نگار نالائق اور مضمون بے کار، در اصل ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں جواں مرگ ادیب مولوی عظمت اللہ مرحوم نے کیا خوب کہا تھا کہ ہنسی کے معنی یہ نہیں کہ آدمی قہقہہ کا بم ہی اڑا ئے یا کھل کھلا کر بند وقوں کی باڑھ ہی ہی داغ دے۔ ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ایک طرح کی بشاشت یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیئے کہ ایک نفسی انبساط ہے یعنی دل و دماغ پر ایک شگفتگی کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جائے۔ ناقدینِ فرنگ نے مزاح کے تین درجے رکھے ہیں، خوفناک، طنزیہ اور لطیف۔ ان تینوں اقسام کے مذاق ایک کامیاب مزاح نگار کے یہاں موجود ہونے چاہئیں۔ باتوں باتوں میں ایسی گہری طنز کر جائے کہ سننے والا کلیجہ مسوس کر رہ جائے۔ ہنستے ہنستے ایسا خوفناک فقرہ بول جائے جن کو سنہری حرفوں میں لکھوا کر عمدہ فریم میں جڑوا کر کوئی ڈرائنگ روم کی زینت کے کام میں لا سکے۔ ایک کامیاب مزاح نگار کے لئے بہت زیادہ ذاتی چیزیں پیش کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔ غیر ذاتی چیزیں بھی کامیابی کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہیں۔ اب ہمیں اس دور کے ہر ایک مزاح نگار کے مزاح پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالنا ہے۔

رشید احمد صدیقی اگر آپ کو فلسفہ، ریاضی، سیاسیات، تاریخ جغرافیہ، اور منطق کا ایک ساتھ مطالعہ کرنا ہو تو رشید کے مضامین پڑھئے۔ ابتدا میں آپ کے مضامین فلسفیانہ ہوتے تھے مگر اب رنگ نکھر گیا ہے۔ ریڈیو پر زیادہ تقریریں کرنے کی وجہ سے ان کی زبان اب بہت سلیس اور آسان فہم ہوگئی ہے۔ رشید کے مضامین پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں ذاتی و شخصی چیزیں بہت پیش کی جاتی ہیں، اور علی گڑھ سے باہر والے لوگ انہیں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ حال ہی میں ایک صاحب نے تو اپنے مضمون میں یہاں تک لکھ دیا کہ بہتر ہوگا اگر رشید اپنے مضامین چھپوا کر صرف اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیا کریں۔ بات یہ ہے کہ بعض حضرات نے آج کل تنقید کو بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ بغیر کسی معیار کو پیشِ نظر رکھ کر اور اپنے مطلب کے دو چار مضامین منتخب کر کے ان کے اقتباسات اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیا طامس ہارڈی نے محض ویسکس کے محدود علاقہ کا اپنی تصانیف میں خاکہ نہیں کھینچا اور کیا جین آسٹن نے صرف ایک خاص طبقہ اور ایک خاص سوسائٹی کی ترجمانی نہیں کی۔ کیا نذیر احمد نے دہلی کی مخصوص شریفانہ سوسائٹی کا نقشہ نہیں کھینچا؟ کیا ان کی طبی

عظمت پر اس سے کچھ اثر پڑتا ہے ہرگز نہیں، ان کی کامیابی مسلّم اور شعر و ادب میں ان کی جگہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔ کاروانِ بیداست، مرشد اور مولانا سہیل پر اعتراض کرنے والے پاسبان، چارپائی، اور آمد میں آورد کو بھول جاتے ہیں۔ رشید زیادہ تر اپنے مضامین کا مواد شعر و ادب سے اکٹھا کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایسی گہری طنز کر جاتے ہیں کہ اکثر پڑھنے والے کے دل کے پار ہو کر اتر جاتی ہے۔ وہ کسی خاص واقعہ یا پلاٹ سے مزاح پیدا نہیں کرتے بلکہ اپنے بے نظیر اسلوب، زبان کی چاشنی اور الفاظ کی بندش سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ غرضکہ وہ ایک ناکامیاب پروفیسر ہوں تو ہوں، ایک کامیاب مزاح نگار ضرور ہیں۔ ان کی تصانیف میں اُن متفرقات کو چھوڑ کر جو انہوں نے متعدد کتابوں پر لکھے ہیں، حسبِ ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

طنزیات و مضحکات، تاریخ یورپ (ترجمہ)، مضامین رشید۔ ان کے بیشتر مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو کر ملک میں کافی مقبول ہو چکے ہیں، اور اگر وہ چاہیں تو اُن سے کئی اور مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔ سنا ہے کہ اُن کی ریڈیو والی تقریروں کا مجموعہ حال ہی میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والا ہے۔ اپنے ایک مضمون کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں "عشاق اور انگریز دو ہی قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیراتِ ہند سے ڈرتی ہیں نہ میونسپلٹی سے۔ انگریز تو ممکن ہے یوں نہ ڈرتے ہوں کہ تعزیراتِ ہند اور میونسپلٹی دونوں اُن کی آوردہ ہیں اور ظاہر ہے عشاق یوں نہیں ڈرتے کہ رزق اور موت دونوں سے آزاد ہیں۔ انگریزوں کو آئی سی ایس نے خراب کیا اور عشاق کو شعراء نے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کو شعراء اور آئی سی ایس کے اثر سے آزاد کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ سوراج مل جائے۔" اپنے مضمون "چارپائی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"چارپائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت اور ضرورت و ایجاد کا آخری اور بہترین نمونہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے مانند شکستہ حال، داغ دار، ڈھیلی ڈھالی بے سر و سامان لیکن ہندوستانیوں ہی کی طرح غالب و حکمران کے لئے ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرنے کے لئے آمادہ رہتی ہے۔ کوچ اور صوفے کے مریض اور ڈرائنگ روم کے اسیر اس راحت اور عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جو باتوں کی کھری چارپائی پر میسر آتی ہے" مولانا سہیل کے متعلق ایک مضمون میں لکھتے ہیں "مولانا سہیل سے میری ملاقات ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے۔ یونین کے الیکشن لڑاتے تھے اور معجون کھاتے تھے۔ اب سنتے ہیں صرف مقدمے لڑاتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں جس کی ابتدا ایسی ہو اس کا انجام یہ کیوں نہ ہو۔" اپنی ایک تقریر "بیرا" کا اختتام یوں کرتے ہیں "میرا خیال ہے کہ مستثنیات کے سوا بیرا اور بیویوں سے زیادہ مزاج دان کوئی اور نہیں ہوتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ بیرا کے مزاج دان ہونے سے مالک کو آرام اور نفع حاصل ہوتا ہے، بیوی کے مزاج دان ہونے سے شوہر کچھ یوں ہی سا رہ جاتا ہے۔ بیرا کے مزاج دان ہونے سے دنیا میں راحت ملتی ہے اور بیوی کے مزاج شناس ہونے سے عقبیٰ سنورتی ہے بشرطیکہ عقبیٰ کو بیوی پر ترجیح دی جائے۔"

پطرس | پطرس نام ہے ادبی دنیا میں سید احمد شاہ بخاری کا جو کہ آج کل محکمۂ ریڈیو کے کنٹرولر ہیں۔ آپ کی ظرافت زیادہ تر مغربی قسم کی ہوتی ہے، اور آپ کبھی یہ کوشش نہیں کرتے کہ پڑھنے والا زیادہ مسکرائے یا قہقہہ لگائے محض اسلوبِ بیان سے ظرافت پیدا کرنا آپ کا طرّۂ امتیاز ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے اور عام فہم الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صفحۂ قرطاس پر موتی بکھیر دئیے ہیں۔ روزمرّہ کی معمولی چیزوں پر مضمون لکھنے میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ مثلاً سائیکل، بچے وغیرہ۔ زبان کی سلاست اور لوچ ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے پطرس کی ایک مستقل جگہ مزاح نگاری میں قائم کر دی ہے۔ آپ ان کے مضامین پڑھ کر شاید یہ کہہ اٹھیں کہ ان کا لکھنا تو بہت آسان ہے لیکن بڑے سے بڑا اہلِ قلم بھی جس وقت لکھنے کے لئے قلم اٹھائے گا۔ اپنے کو عاجز پائے گا اور یہی مضمون نگار کا کمال ہے۔ پطرس کے یہاں واقعات کی رنگ آمیزی بہت ہی مناسب اور موزوں کی جاتی ہے۔ وہ کوئی عجیب و غریب پلاٹ پہلے سے تیار نہیں کرتے بلکہ روزمرّہ کے واقعات عام فہم اور سلیس زبان میں ادا کر دیتے ہیں۔ "پطرس کے مضامین" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ یہ مضامین ناظرین سے خراجِ تحسین ضرور وصول کریں گے۔ مرید پور کا پیر، ہوسٹل میں پڑھنا۔ لاہور کا جغرافیہ، سویرے جو کل آنکھ میری کھلی وغیرہ۔ پطرس کی منظر کشی ملاحظہ ہو۔ "دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کی بار ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدّی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور جو برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور میں لائیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔" "بچے" پر پطرس نے ایک مضمون لکھا ہے اور اس کی ابتدا اس طرح کی ہے "یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے، مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے جن کی ظاہراً تو کئی قسمیں ہیں، کوئی پیارا بچہ ہے

اور کوئی ننھا بچہ ہے۔ کوئی چاند سا بچہ ہے اور کوئی پھول سا بچہ ہے لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک "الارم کلاک" کی شکل اختیار کر لی۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ | تمکین کاظمی لکھتے ہیں کہ فرحت صاحب نے ادب اردو میں ایک نئی چیز کا اضافہ کیا ہے، ایک مستقل باب کھول دیا ہے، ایک نئی روشنی پیدا کر دی ہے۔ آنے والی نسلیں اس چیز کو پیش نظر رکھ کر اور چیزیں بنائیں گی۔ اس باب میں متن اور حواشی کا اضافہ کیا جائے گا۔ اس روشنی میں ہزاروں چیزیں بن جائیں گی۔" ہماری رائے میں یہ محض کاظمی صاحب کا خیال ہی خیال ہے۔ مزاح نگاری فرحت اللہ بیگ کے لکھنے کے بہت پہلے سے اردو میں رائج ہے۔ ہم فرحت صاحب کو ایک کامیاب مزاح نگار تسلیم کرتے ہیں۔ اردو ادب میں ان کے مضامین ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ فرحت کا بڑا کمال شخص نگاری میں ظاہر ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے مضامین "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی" "شاہ ظفر اور پھول والوں کی سیر" اور "۱۲۶۱ھ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ" ملاحظہ ہو۔ آخرالذکر مضمون نے اردو ادب میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے۔ بعض دوسرے اہل قلم نے اس کی کامیابی کے ساتھ نقل بھی کی ہے۔ اس مضمون کے مطالعے کے بعد آپ کو محسوس ہوگا کہ غالب، ذوق، مومن اور بہادر شاہ ظفر آپ کے سامنے چل پھر رہے ہیں۔ فرحت کی زبان دہلی کی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی صاف و شستہ زبان ہے۔ لیکن کردار نگاری میں وہ اکثر جگہ بہک گئے ہیں۔ فرحت اپنے مضامین کا مواد زیادہ تر مردوں سے اکٹھا کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی "مضامین فرحت" کے تمام مضامین دلچسپ اور عمدہ ہیں لیکن ان مضامین کے علاوہ جو کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں مندرجہ ذیل مضامین بھی جو مختلف رسائل کے اوراق پر منتشر ہیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پرائمری اور مڈل اسکول کی شرارتیں، آزاد نگارستان اور داوا جان اُدھم وغیرہ۔ آخر الذکر مضمون بہت دلچسپ اور رنگین ہے۔ نتیجہ بھی اچھا مرتب ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ آخری مغل بادشاہوں کی اُدھم کو لیتے ہیں۔ پھر ہندوستان کے جمود کا تنہا ذمہ دار اُدھم کو قرار دیا جاتا ہے جلسوں کی کارروائی کی بے ثباتی کا اصلی سبب بھی "اُدھم" ہے۔ پھر طالب علم کی اُدھم کی باری آتی ہے اور پھر گھر والی اور میاں بیوی کی اُدھم کی۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"ہندوستان میں اس اُدھم کا کچھ کم زور نہیں رہا ہے۔ نادر شاہ چڑھا چلا آرہا ہے۔ محمد شاہ بادشاہ رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ پرچہ لگتا ہے کہ نادر لاہور تک آ گیا۔ بادشاہ سلامت اُدھم کر دیتے ہیں جس کا فارسی ترجمہ تاریخوں میں "این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ" کہا گیا ہے۔ بس اس کی ایک "اُدھم" سے دلی لٹ جاتی ہے، خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔ تخت طاؤس اڑ جاتا ہے"۔

"ہاں یہ ضرور ہے کہ میاں بیوی کی اُدھم بعض دفعہ وہ کام کر جاتی ہے جو بڑے بڑے افلاطون صلاح کار بھی نہیں کر سکتے۔ بیوی کو غصہ آیا میاں نے اُدھم کر دی۔ جھگڑا لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ میاں کسی بات پر بگڑے بیوی نے اُدھم کر دی۔ میاں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔"

"میری طرف سے کوئی ہندوستان کے لیڈروں کو سنا دے کہ سوراج حاصل کرنا ہے تو پہلے اپنے بھائیوں میں سے اس اُدھم کو نکالو۔ اس کے بعد ہندوستان کیا ساری دنیا تمہاری ہے۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو خواہ مخواہ چیخ چیخ کر کیوں اپنا گلا پھاڑتے ہو۔ ہم اُدھم کر دیں گے اور تم چیختے چیختے مر جاؤ گے۔"

شوکت تھانوی | شوکت کے مزاحیہ مضامین انگریزی کے موجودہ مشہور مزاح نگار الفا آف دی پلاؤ (ALPHA OF THE PLOUGH) کے مضامین سے ایک حد تک ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ شوکت بھی الفاظ کی بندش سے مزاح پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن زیادہ کامیاب نہیں ہوتے ان کے مزاح میں وہ بات نہیں جو رشید اور پطرس کا طرۂ امتیاز ہے، وہ فرحت کی سی شخص نگاری بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کا طرز نگارش اور اسلوب بیان جاذب نظر ضرور ہے۔ لکھنؤ میں ایک عرصے تک رہنے سے ان کی زبان خوب نکھر گئی ہے۔ شوکت کے سامنے ترقی کا ایک وسیع میدان ہے اور اگر وہ لکھنا کچھ کم کر دیں اور موجودہ معیار کو ذرا اور بلند کریں تو وہاں تک ان کی رسائی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن بعض لکھنے والوں کی یہ کوشش کہ ہر رسالے میں اُن کا نام ضرور ہو ان کی شہرت کے لئے سم قاتل ہے۔ زیادہ لکھنے کی بجائے موجودہ معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے اور یہ شاید اُن کے بس کی بات نہیں۔ شوکت جزئیات کے مطالعے کے بہت دلدادہ ہیں اور اس کے اظہار میں ایک حد تک کامیاب بھی ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے موج تبسم، بحر تبسم، سیلاب تبسم اور دنیائے تبسم وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ایک دو دن سے زائد

کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے یہ مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔ میٹھے چاول، سودیشی ریل، دوست، مطلب، اٹھو بیٹھے، چالیسواں، ہم زلف وغیرہ۔ ہم یہاں ان کے مضمون "سودیشی ریل" میں سے چند سطور نقل کرتے ہیں۔

"ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہوگیا مگر گاڑی بدستور کھڑی تھی۔ گھبرا کر ہم پھر پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ..... کمیٹی کا انتظار ہے۔ وہ کانپور جائیں گے۔ انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آجائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی بلانے کے لئے گیا ہوا ہے۔"

ملّا رموزی ملّا رموزی عرصے سے مزاح نگاری کر رہے ہیں اور مذاق ہی مذاق میں بعض اوقات بڑے کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اس لئے رموزی کے مضامین میں اصلاحی پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔ رموزی کے چند الفاظ اور فقرے مخصوص ہیں جو کہ قریب قریب ہر مضمون میں یکے بعد دیگرے دہرا دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً علی گڈھ کالج، ننھے میاں کی والدہ، کسان، ریل وغیرہ۔ رموزی ذاتی چیزیں ضرورت سے زیادہ پیش کرتے ہیں۔ آپ ایک درجن کتابوں سے زاید کے مصنف ہیں۔ کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں:۔ شادی، زندگی، صبح لطافت، عورت ذات، لاٹھی اور بھینس وغیرہ۔ رموزی فطرتاً قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ لہذا ہر نئی چیز کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ نازک اندامان کالج اور علی گڈھ کالج سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔ اکبر مرحوم نے بانیر اخبار کا مذاق خوب اُڑایا تھا، وہ وقت کی چیز تھی۔ رموزی اگر اب ایسا کرتے ہیں تو "مشتے بعد از جنگ" کا مصداق ہے۔ اس کا زمانہ گذر گیا۔ رموزی کو مزاحیہ خطوط لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ چنانچہ اکثر مدیروں کے نام وہ اس قسم کے خطوط لکھتے رہتے ہیں۔ ان کی بعض کتابوں میں بھرتی کی چیزیں بہت ہوتی ہیں۔ مثلاً اُن کی کتاب "شادی" میں ایک مہمل سہرا کتاب کے آخر میں بلا وجہ درج ہے۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں اس کو علیحدہ کر دیا جائے۔ غرضکہ اُن کی ظرافت چونکہ ابتدائی ظرافت ہے۔ لہذا ادبیات اردو کی تاریخ میں اس کی اہمیت ہے اور رہے گی۔ ہم اسے اعلیٰ پائے کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ اوّل تو اس لئے کہ ان کا سارا کھیل چند الفاظ کے متبادر معنی پر منحصر ہوتا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ وہ زمانے کے دوش بدوش چلنے پر قانع ہیں[1] چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"بھلا یہ انٹرنس پاس کیا جانیں مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی عظمت کو اور یہ ایف۔ اے پاس کیا پہچانیں۔ مولوی ظفر علی خاں کی بہار آفریں انشا پردازی کو اور یہ بی۔ اے پاس کیا محسوس کریں ملّا رموزی کی لطافت نگاری کو۔"

کھانسی کی مختلف کیفیتیں ملاحظہ ہوں۔

"بعض کے دونوں شانے اٹھ کر کانوں تک آجاتے ہیں۔ جب کھانسی پوری ہوتی ہے بعض کی کھانسی اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک انہیں مراد آباد کا اُگالدان پیش نہ کیا جائے بعض کی کھانسی کے درمیان اس قسم کے جھٹکے آتے ہیں جن سے ان کے مرحوم ہو جانے کا خطرہ اٹل ہوتا ہے بعض کے نزدیک وہ کھانسی کھانسی نہیں جس کے ترنّم کا سلسلہ مغرب سے صبح کی اذان تک اس طرح جاری نہ رہے کہ ماں باپ تک دعائیں کہ اے خدا اسے ایمان سے اٹھالے یا اس کی کھانسی کو بند کر۔"

عظیم بیگ چغتائی چغتائی کی مزاح نگاری کا دارو مدار زیادہ تر واقعات بیان کرنے پر ہے۔ انہیں خود اس بات کا اعتراف ہے چنانچہ وہ شوکت تھانوی کی کتاب "سیلاب تبسّم" کے مقدمے میں ایک جگہہ لکھتے ہیں "میری مزاح نگاری کا دارومدار لے دے کر صرف پلاٹ پر ہے اور یہ واقعہ ہے کہ پلاٹ انہیں عجیب و غریب سوجھتا ہے۔ وہ پڑھنے والے کی دلچسپی کو آخر تک قائم رکھتے ہیں۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

شریر بیوی، کولتار، ویمپائر، فل بوٹ، کمزوری، کھرپا بہادر، روحِ ظرافت، روحِ لطافت، مرزا جنگی، چغتائی کے افسانے وغیرہ۔ انہوں نے اپنے بعض ناولوں خصوصاً کولتار میں جس سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے وہ امریکہ اور یورپ کی ہو تو ہو ہندوستان کی تو ہے نہیں۔ معاف فرمایئے گا کوئی ہندوستانی لڑکی اتنی بے شرم نہیں ہو سکتی کہ اپنی شادی کے ایّام میں دوسروں کے مُنہ پر گلاب جامن دے مارے۔ ان کے بعض مزاحیہ افسانے بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً الشذری، ممتحن کا پان، چلہ، ٹیلیفون، یکہ وغیرہ۔ ہم یہاں ان کے ایک افسانے "خانم" سے چند سطور نقل کرتے ہیں۔

"خاں صاحب نے اپنا لکچر بڑے زوروں میں ختم کیا۔ میری رگ رگ میں غصے کی بھڑکن تھی۔ ایسی سرکش بیوی بغیر لڑے زیر نہ ہوگی۔ خاں صاحب

[1] اس خاص موقع سے قطع نظر کو تدارک شوخی مدیر سیاسی جماعتی کے متعلق جس سے پیشتر بھی اعتراض ہو چکے ہیں لیکن یہ اعتراض پیش ماسٹر نفسی بنائی را جہ سے ہیں ان دونوں کتابوں میں حقیقت سے ذرا بھی انحراف نہیں کیا گیا۔ ہم معترض کو مطمئن کر سکتے ہیں اگر وہ روپیہ اور وقت اس تحقیق پر صرف کریں اور ہمیں خدا اپنے ساتھ لے لیں۔ (ادارہ)

کا مشورہ درست ہے لاحول ولا قوۃ میری بھی حالت قابلِ رحم ہے کہتے ہیں لوگ کہ تمہاری بیوی بڑی اچھی ہے ادھر کچہری سے واپس آنے کا وقت ہوا اور دیکھ لو اسے کمرے کے دروازے پر کس بے چینی سے انتظار کرتی ہوئی ہے۔ وہ میرے ساتھی سنتے ہیں اور رشک کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کس طرح پھول کی طرح کھل کر وہ تمہارا استقبال کرتی ہوگی۔ تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہوں گی۔ کام کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہوگا۔ دوستوں کا کہنا بالکل درست ہے جیبوں کا بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ ادھر پہنچے اور آنکھ سے آنکھ ملتے ہی پہچان جاتی ہے کہ کچھ جیب میں ہے بس پھر کیا تھا مسکرا کر کندھے پر ہاتھ رکھا اور اندر باہر کی سب جیبیں ٹٹول لیں۔ تمام سحر آفرینیاں یہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ بیوی سے منت کر کے چلو کچھ تو رقم دے دیں گے۔ مگر وہاں تو سحر آفرینیوں کے پھندے اور تبسم کے جال بچھائے جاتے ہیں اور پوری جیب تلاشی ہو جاتی ہے۔" سلہ

موجودہ مزاح نگاروں کے متعلق نیاز فتح پوری کا خیال ہے "چغتائی صاحب کی مزاح نگاری اکثر وبیشتر منحصر ہوتی ہے۔ صرف پلاٹ یا واقعات پر یعنی وہ حالات ایسے پیش کرتے ہیں جو مشاہدے کے بعد یوں بھی ہر شخص کو ہنسا سکتے ہیں۔ رموزی کی مزاح نگاری منحصر ہے اس امر پر کہ وہ الفاظ یا فقروں کا استعمال ان کے عام متبادر معنی سے ہٹ کر کرتے ہیں۔ رشید صاحب کی مزاح نگاری کا دورِ اولیں فلسفیانہ مزاح نگاری کا بہترین نمونہ تھا۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ زیادہ تھک گیا ہے اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی اور کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں، تاہم کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ اُن کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے۔ پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی رنگ کی ہے جس میں واقعہ و اندازِ بیان دونوں سے مضحک کیفیات پیدا کی جاتی ہیں۔ لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ہمارے لئے یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس میں واقعی کسی تلخ حقیقت کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، حالانکہ ایک مزاح نگار کا حقیقی کمال یہی ہے شوکت کی مزاح نگاری بھی اس خصوصیت سے معرا ہے۔ اور وہ بھی سطحی طور پر اپنے موضوع سے گزرنا چاہتے ہیں" ہمیں سب سے پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ نیاز صاحب نے فرحت اللہ بیگ کا نام بالکل نظر انداز کر دیا، حالانکہ وہ موجودہ دور کے مزاح نگاروں کی صفِ اول میں ہیں۔ اُن کا ذکر کرنا ضروری تھا دوسرے انہوں نے پطرس کے متعلق ایک حد تک انصاف سے کام نہیں لیا۔ پطرس کے یہاں ایسے مضامین موجود ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان میں واقعی کسی تلخ حقیقت کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے "لاہور کا جغرافیہ" پطرس کا ایک کامیاب مضمون ہے۔ کیا اس کے مطالعے سے کسی تلخ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا! ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا پطرس کے متعلق ہمیں نیاز صاحب کی رائے سے ایک حد تک اتفاق نہیں ہے۔ رشید صاحب کے متعلق ہمیں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کا دماغ ضرور تھک گیا ہے لیکن نہ اس قدر جتنا کہ نیاز صاحب تھکا ہوا سمجھتے ہیں۔ وہ غور و تامل کی کلفت میں آج تک نہ خود مبتلا ہوئے نہ آئندہ ہونے کی اُمید ہے۔ لیکن دوسروں کو اس میں مبتلا کرنے کا جب موقع ہاتھ آتا ہے وہ کسی طرح چوکتے نہیں۔

اس دور میں ہمیں دو مزاح نگاروں کا نام سرسری طور پر اور گنانا ہے یعنی ایم۔ اسلم اور میر ولی اللہ ایبٹ آبادی۔ ایم اسلم ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں اور مزاح کے خفیف چھینٹوں سے اکثر اپنی تحریر کو پُر لطف بنا دیتے ہیں۔ میر ولی اللہ کے لئے اس میدان میں کافی گنجائش تھی لیکن انہوں نے یک لخت اس طرف سے مُنہ موڑ لیا۔ اُن کے مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ "ماہ و پرویں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس کے یہ مضامین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:- ذوالاستین، آٹھ، گرما و سرما وغیرہ۔ غرضکہ یہ ہے اردو مزاح نگاری کی تاریخ کا ایک اجمالی خاکہ جس میں رنگ بھر کر ایک مکمل تصویر بنائی جا سکتی ہے۔

کتب اور مضامین جن سے اس مقالے کی تیاری میں مدد لی گئی

(۱)۔ تذکرۂ خندۂ گل از عبدالباری آسی
(۲)۔ طنزیات و مضحکات از رشید احمد صدیقی
(۳)۔ سودا از شیخ چاند مرحوم
(۴)۔ اکبر کا ظریفانہ کلام (مضمون مشمولہ نقوشِ سلیمانی) از سید سلیمان ندوی
(۵)۔ مرزا غالب کی شوخیاں (نگار جنوری ۱۹۳۲ء)
(۶)۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اور خوش مذاقی از تمکین کاظمی (نیرنگِ خیال عید نمبر ۱۹۲۹ء)
(۷)۔ اردو کے موجودہ مزاح نگار از مبشر علی صدیقی بدایونی (علی گڑھ میگزین اگست ۱۹۳۵ء)

مبشر علی صدیقی

سلہ صاحبِ مضمون نے چغتائی کی یہ مناسب مثال نہیں دی۔ وہ خود مانتے ہیں کہ چغتائی کے مزاح کی بنیاد اُن کے اپنے قول کے مطابق بھی واقعات پر ہوتی ہے۔ مثال بھی ویسی ہی دینی چاہئے تھی مثلاً کونتارین انگوٹھی کی شرارت وغیرہ۔ (ادارہ)

تغزل

ذرّے ذرّے سے نمایاں وحشتِ یک سجدہ ہے
عالمِ ہستی خرابِ عشرتِ یک سجدہ ہے

دَیر سے اپنا تعلق ہے بقدرِ یک قیام!
ربط کعبے سے بقدرِ وسعتِ یک سجدہ ہے

رقص کرتا ہے نگاہوں میں جنونِ بےخودی
اور جبیں پر ارتعاشِ وحشتِ یک سجدہ ہے

اللہ اللہ زندگانی کے مصائب کا محاذ!
توبہ توبہ کس کو تابِ لذتِ یک سجدہ ہے

یہ کمالِ عجز ہے احساسِ ہستی سے گزر!
بےنیازِ زیست ہونا قیمتِ یک سجدہ ہے

دعوتِ نظّارہ تو ہے حُسنِ بےپروا کی شان
کیا نیازِ عشق کو بھی جرأتِ یک سجدہ ہے؟

میکدے میں پائے ساقی پر ہے محسنؔ سجدہ ریز
بےنیازی اُس کی نذرِ دولتِ یک سجدہ ہے!!

محمد ایوّب محسن

لگی کی لاگ

جس نے بنادی بانسری، گیت اسی کے گائے جا   سانس جہاں تک آئے جائے، ایک ہی دھن بجائے جا
ہاں مری ڈبڈباتی آنکھ، دیکھ بندھی رہے یہ دھاک   وہ بھی لگائے جائے آگ، تو بھی لگی بجھائے جا
دکھ ہے یہ دل لگی نہیں، کھیل نہیں ہنسی نہیں   پہلے لگاؤ کان ادھر، پھر یہ کہو سنائے جا
پھول میں باس پھل میں رس دیتا ہے جو وہ اور ہے   آس نہ توڑ جی نہ چھوڑ، جتنی پیوں پلائے جا
مٹی جہاں کی ہے وہیں سونپ دوں اس کو جیتے جی   مجھ کو تو سوجھتا نہیں، تو ہی جگہ بتائے جا
چھینا ہے جی کا چین بھی، اس پہ پھری ہے آنکھ بھی   الٹے بنا ہوں لٹ کے چور، بگڑی مری بنائے جا
ہونٹوں پہ آئے کیا ہنسی، جی ہے یہاں بجھا ہوا   پلکوں تک آنسو آگئے، اب تو نہ گدگدائے جا
سچی جو ہے لگی کی لاگ، اور بھڑک اٹھے گی آگ   پاس ہوں جتنی بجلیاں، سوچ نہ کچھ گرائے جا
مان لی کس نے اپنی ہار، بڑھ کے تھکن بتائے گی   میں یونہی تڑپے جاؤں گا، تو یونہی مسکرائے جا

۱ پل کو جو چپ ہوا ثمرؔ تھم گیا دوڑتا لہو
بات تری بنی رہے باتیں یونہی بنائے جا

شریف ثمر جالندھری

زین العابدین

اونگھ جانے کے عرصہ بعد تک سگریٹ کا ٹکڑا میری انگلیوں میں بے ارادہ سلگتا جلا گیا..... جلا گیا.....

اونگھنے کے عمل میں جو بجات کا پہلو ہوتا ہے میں اس سے کُلّی طور پر محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ بیداری کے تلخ حقائق کو کس طرح انسان خواب کے حسین بطلان میں کھوئے چلا جاتا ہے..... ایکدم سگرٹ کے بچھو نے مجھے دو انگلیوں کے درمیان کاٹا۔ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا، سگریٹ نے ایک لمبی جست لی اور چٹائی پر گر کر سلگنے لگا۔ اُسے پاؤں سے خاموش کرتے ہوئے میں نے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو ہاتھ سے چھوا۔ چائے شربت ہو چکی تھی اور نیو جہانگیر ریسٹوران کا خوبرو، ایرانی نژاد چھوکرا اور دہکتے ہوئے کوئلے، پاس پاس پڑے، ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہوئے، سوتے سوتے، سو ہی گئے تھے۔

سرد خون والے جانور، مثلاً ہماری سکموں کے عہدِ حکومت کی بنی ہوئی کوٹھڑی کی بوسیدہ چھت کے نیچے بسنے والے اجنبی کیڑے ہزار پا، چھپکلیاں انسان کے رینگنے والے بھائی منجمد ہو چکے تھے۔ خون کا دورہ ان کی رگوں میں سست پڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے خوراک کے لئے بھی جد وجہد چھوڑ دی تھی۔ وہ عیار چھپکلی جو ہر روز دبے پاؤں روشنی کے گرد طواف کرنے والے پروانوں کا شکار کرنے آیا کرتی تھی۔ اس روز نہ آئی اور جھینگروں نے بھی تو سر شام ہی شور مچایا تھا جبکہ ورج کی آخری شعاعوں کی جاں افزا گرمی کو بردوت تسخیر کر رہی تھی۔ آغاز زمستان میں میدان میں اتر آنے والی ابابیل جس نے ریسٹوران کے کلاک کے پیچھے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ پر پھڑ پھڑا کر اپنے بچوں کو ان میں لپیٹتے ہوئے ان کی حرارت کو صرف ہونے سے بچا رہی تھی۔

بہت سے کپڑوں میں ملبوس، نرم و گرم، اُس وقت میری تلخ یادداشت پر فراموشی کا عمل بتدریج شروع تھا۔ جبکہ سگریٹ نے مجھے جگا دیا۔ آنکھیں کھلتے ہی میری نظر چھت پر ایک بے قاعدہ دائرہ بناتی ہوئی ایک چارپائی کے نیچے دو سمٹے ہوئے پیروں پر جا پڑی میں کچھ دیر گو مگو کی حالت میں ان پیروں کو گھورتا رہا۔ پھر یکایک کسی خیال کے آنے سے میں نے ان پیروں کو چھو دیا۔ چھوا ہی نہیں بلکہ زور سے کھینچا اور چلایا۔

زینو کے بچے.....!

زینو، ان پیروں کا مالک، ایک تیس سالہ ننگِ پیری نوجوان، اجنبی کیڑے کی طرح سکڑ گیا۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اب وہ چھپ نہ سکے گا۔ اپنی کہنیوں کی مدد سے پیچھے کو سرکا، اکڑوں بیٹھا، بالوں کو جھٹکے سے سیدھا کیا۔ اور بے حیاؤں کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے نظریں چرانے کی بجائے اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں میں نے اُسے کان سے پکڑا اور کشاں کشاں لیمپ کے پاس لے گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ عیار چھپکلی کسی بڑے سے پروانے کو پکڑ کر روشنی کی طرف بڑھتی تھی۔

زینو کی آنکھیں آج معمول سے زیادہ خونی ہو رہی تھیں۔ بال بھی پہلے سے زیادہ منتشر تھے اور نچلا ہونٹ لٹک کر پان خوردہ دانتوں کی سیاہی کو نمایاں طور پر دکھا رہا تھا۔ اس کے زرد، مُبلّغاً آمدنی کم خرچ زیادہ چہرے کی لکیریں گہری ہو رہی تھیں، اور اُس کے چوری کے روز افزوں تجربے کو عیاں کر رہی تھیں۔ شاید زینو چوری کے ذریعے اپنی آمدنی کو خرچ کے برابر کرنا چاہتا تھا۔ چوری کے روپے آمدنی کو خرچ کے مساوی ہی نہیں کرتے، بڑھا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ آمدنی کم خرچ زیادہ چہرے کے خد و خال کو نہیں بھرتے اور شاید اسی لئے چوری کا سا نیک اور پر منفعت پیشہ بُرا ہے۔

میں نے قدرے درشتی سے کالر کو کھینچا۔ اسی وقت مجھے یاد آیا زینو کی پہنی ہوئی قمیص میری اپنی ہے وہی جو میں نے چند دنوں کے لئے اُسے پہننے

کو ذرا بھی گرفت کو ڈھیلا کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔
"کیوں بے مسلے، بدمعاش، بولتا کیوں نہیں؟ کیا ہو رہا تھا یہ سالے؟"

"میں یونہی پڑا تھا، میں سوتے سوتے چارپائی پر سے گر پڑا تھا، میں چارپائی کے نیچے آپ کے لال لال کپڑا کو ڈھونڈ رہا تھا ــــ وہی پھٹا ہوا کمبل جو آپ نے بس سمجھ کر پھینک دیا ہے، وہی، وہی جس میں بیا چڑیں چل گئی تھیں، یاد نہیں آپ کو؟ ہاں ہاں وہی ـــــ" اور اس قسم کی بیہودگی کی بجائے اس نے اپنے سر کو جھنجھوڑا اور بڑی بےترکی دو ٹوک جواب دیا:

"چوری!"

اس مختصر جامع النفسیات آمیز جواب نے مجھے چند لمحوں کے لئے خاموش کر دیا۔ میں ایک ایسی دنیا میں پرواز کرنے لگا۔ جہاں ایمان، شرافت ایک افسانوی بات ہو جاتی ہے اور تھوڑے سے تجربے سے دیانتداری اور چوری میں کانوں کو ہاتھ لگانے اور زنفاوت رہ جاتا ہے والی بات نہیں رہ جاتی۔ اس بےہنگات خاموشی کے عالم میں میں نے اپنے آپ سے سوال کیا "کیا سالا اپنی مذموم عادت سے باز نہ آئے گا؟ کئی مرتبہ اسے چوری کے الزام میں قرار واقعی سزا دی جا چکی ہے۔ . . . . . جس طرح نیلے رنگ کا شیشہ سفید روشنی کے باقی چھ رنگوں کو جذب کرتے ہوئے نیلے رنگ کو ہی گذرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسی طرح اس کی ذہنیت بھی پند و نصائح کی سب باتوں کو محبوس کرتے ہوئے چوری کی طرف آزادانہ رجوع کرتی ہے!

"تم نے خان کا سوٹ کیس کھولا ہے؟" میں نے اُسے آستین سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں"

"اگر خان دیکھ لے تو؟"

زینو کانپ رہا تھا، خوف سے نہیں، سردی سے، اور بولا "دیکھ لے تو پکڑ لے، اسی طرح آستین سے یا گریبان سے، جیسے آپ نے مجھے پکڑ رکھا ہے اور نہیں چھوڑتے، وہ بھی نہ چھوڑتا تو کیا بگاڑ لیتا میرا . . . . ؟"

میری بات کے جواب میں زینو یہ بھی کہہ سکتا تھا۔ آپ ہی کی قمیص پھٹ جاتی نا . . . . میرا کیا بگڑ جاتا، اور یوں دریدہ دہنی کے علاوہ ایک لطیفہ ہو جاتا۔ لیکن اب جو کچھ ہو رہا تھا کیا وہ لطیفے سے کم تھا! میں نے نفسیاتی طور پر مرعوب ہوتے ہوئے اس کی آستین کو چھوڑ دیا۔ جیسٹر کو اپنے گرد لپیٹا بٹن بند کئے۔ اس کے کندھے کو تھپکتے اور لبوں سے ایک بوسے کی آواز پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"شاباش! اللہ تمہارے نیک ارادوں میں برکت دے بیٹا!"

اور پھر پلٹتے ہوئے میں نے غصے سے کہا "جیل خانے کی ہوا راس آئے گی تمہیں، اُلو کے پٹھے!"

اسی وقت بیٹے نے انگلیوں کی کنگھی بنائی۔ اپنے منتشر بال درست کئے اور اپنے ٹخنوں سے مٹی جھاڑی۔ میری بات کے جواب میں وہ قدرے دلیری سے بولا۔

"آپ کے خیال میں جیل کی زندگی اس زندگی سے بُری ہے؟ وہاں بھی اللہ رزق دے گا۔ اللہ سب کا رازق ہے، واللہ خیر الرازقین . . . . . یہاں ہماری جورو بیٹھی ہے نا جو . . . . "

میں نے دل میں سوچا عجب ہے اللہ! اور پھر میں نے کہنا چاہا اللہ میرا بھی تو رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین مجھ پر بھی تو عاید ہوتا ہے اور بہتر طور پر اس خان پر جس کا سوٹ کیس تم نے ابھی ابھی ناپاک ارادے سے کھولا ہے۔ لیکن زینو کو سمجھانے سے فائدہ معلوم!

. . . . . اور پھر زینو خود ہی چپ چاپ ڈیٹسار کی خالی پیٹی پر بیٹھ گیا۔ میں نے سمجھا، شاید وہ اندھیرے میں بیٹھ کر اپنی ندامت کو چھپانا چاہتا ہے۔ میں جیسٹر اور جوتوں سمیت بستر میں جا گھسا اور ایک کونے سے اُسے دیکھنے لگا۔ زینو نہایت بےپروائی سے بیٹھا اپنے دانتوں کی میل کرید رہا تھا۔ پھر اُس نے احتیاط سے قمیص اتاری۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور سوچا۔ زینو کو کچھ بھی کہنا بےسود ہے۔ لاحاصل، لاحاصل۔ میں نے اُسے سلو وگرم کرنے کو کہا۔ اور خود اُٹھ کر خان کا سوٹ کیس بند کرنے لگا۔ اُس وقت خان نے چارپائی پر پہلو بدلا۔ چارپائی چیخی اور میں نے کانپ کر سوٹ کیس پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ خان اپنے پتلے سے لحاف میں سکڑ گیا۔ شاید خون کا دورہ اُس کی رگوں میں بھی سست ہو چکا تھا۔

. . . .

زینو کا پورا نام زین العابدین تھا۔ عابدوں کی زینت۔ لیکن چوری عجب قسم کی عبادت ہے جس کی تلقین ہماری مذہبی کتابوں میں شاید غلطی سے رہ گئی ہے۔ اگر ہمارا معبود حق تلفی اور زبردستی کو دیکھ کر بھی جابر رہتا ہے، اپنی تعریف سے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا یا وہ کوئی بڑا چور ہے تو زینو اسم بامسمیٰ تھا۔

حقیقت میں زینو کا کوئی معین نام نہ تھا۔ اس لئے کہ سب اُس سے وافر محبت کرتے تھے۔ محبت جو لغزت کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جس میں جذبات کو دخل ہوتا ہے ادراک کو نہیں۔ زینو کا نام وقت، جگہ اور مقامی حالات کے مطابق رکھ لیا جاتا تھا۔ اس مستقل نام کے نہ ہونے کا زینو کو گلہ تھا لیکن شدید نہیں۔ زینو میں شدت کسی چیز کی نہ تھی۔ نہ وہ کھکھلا کر ہنستا تھا اور نہ گڑگڑا کر روتا۔ اس کے رونے اور ہنسنے میں تمیز مشکل سے ہوتی تھی۔ والدین شاید زینو کو ہلال عید اور اس قسم کے مشکل ناموں سے پکارتے ہوں گے بجائے اس کے کہ حرامی یا ایسے ہی کسی آسان نام سے پکارتے۔

ہماری سکھوں کے عہد کی بنی ہوئی کوٹھڑی میں بسنے والے یاران طریقت سب کے سب زینو کے گرویدہ تھے۔ اسی لئے وہ اُسے ہر دفعہ اپنے من مانے نام سے پکارتے۔ خان اور وحید مستری اُسے بیٹا، کہہ کر بلاتے تھے۔ نجیب کانب اُسے سالا کہا کرتا تھا۔ اور زینو جب سالے کے نام پر لبیک کہتا تو نجیب کو ایک خاص قسم کی خوشی ہوتی۔ وہ خوشی جو گدگدی یا میٹھی میٹھی خارش کے مشابہ ہوتی ہے اور عموماً تعلق والوں ہی کے حصے میں آتی ہے کوئی بزعم خود باپ تھا اور کوئی ـــــ اور اس طرح کسی عورت کے بغیر ہی وہاں ایک بڑا کنبہ بس رہا تھا۔

ہماری کوٹھڑی میں ایک نومسلم راجپوت رہتا تھا۔ خان اُسے تکلف سے ہادی اسلام کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ اس شخص کا پیشہ نفسی چیزوں پر پیٹنٹ کے لیبل چسپاں کر کے بیچنا تھا۔ ہادی اسلام نومسلم ہونے کی وجہ سے بہت پارسا اور نمازی تھا اور چونکہ خود تجرد پسند تھا، اس نے زینو کو سالے کی بجائے ماموں کہہ دیا کرتا تھا۔

زینو کی مجھ سے پہلی ملاقات ایک حادثے کی نوعیت رکھتی ہے۔ پُل پختہ کے تاریخی بلوے میں میں مجروح ہو کر شفایابی کے لئے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں نمبر ۶ کے ساتھ زینو کی چارپائی تھی۔ اسے غالباً چوری کے الزام میں پیٹا گیا تھا۔ وہ بالکل ادھ موا ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے پیسوں، چٹکلوں، ردی شعروں اور حسین عورتوں کی تصویریں دکھا کر زندگی میں اس کے مٹتے ہوئے یقین کو جلا دی۔ میری رفاقت میں وہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔ میں نے اس سے بھی ایک قدم آگے اٹھایا۔ زینو جو کہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ اس کی بے کسی کا احساس کرتے ہوئے یا دوسرے لفظوں میں اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اُسے اپنے پاس بلا لیا..... جذبات بھی انسانی زندگی میں عجیب کھیل کھیلتے ہیں..... زینو نے آتے ہی مجھے گوناگوں مصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔ بارہا میں سوچتا ہوں میں نے کیا بُرا کیا۔ جو ایک کُتے کی طرح ارزاں، ایک کیڑے کی طرح بے قیمت انسان کو قعر ذلت سے اٹھایا۔ اور اپنی کوٹھڑی میں بسنے والے شریف زادوں کا ہم نشین بنا دیا..... پھر میرا ذہن خود ہی جواب دیتا ہے۔ تمہارا ہی تو سب قصور ہے کہ تم نے ایک کیڑے کو آستین میں رکھا۔ کیڑے کو گندگی میں سے اُٹھانے کی ضرورت نہیں تاوقتیکہ اُس کا ڈنگ سہنے کی اہلیت اپنے آپ میں نہ پیدا کر لو۔ جانور اپنی عادت سے مجبور ہے تو انسان اپنی فطرت سے کیوں منحرف ہو جائے؟

پھر خیال پیدا ہوا اس نیک کام کے کرنے میں جذبات نے تمہیں کتنا حظ دیا ہوگا۔ اسے تم روحانی حظ کہتے ہو۔ اُس تھوڑے سے حظ کی تمہیں قیمت دینا ہوگی۔ جذبات! ـــــ جذبات انسان کو ہمیشہ خرد سے بھگتے پڑتے ہیں لیکن اگر کوئی میرے بہت قریب ہو کر پوچھے۔ کیا تم دیرپا خرد کو پسند کرو گے یا وقتی جذبات کو، تو میں بلا تامل کہوں گا، ـــــ جذبات کو!

ہسپتال میں پہلی دفعہ جب میں نے زینو کو دیکھا تو اُس کا چہرہ خاک اور دھول سے اٹا پڑا تھا۔ اُن میں سے دو آنکھیں باہر گھور رہی تھیں منہ سے خون بہ رہا تھا۔ زینو کی جیب میں دو دانت تھے جو اُس نے نہایت احتیاط سے سنبھال رکھے تھے اور غالباً انہی دانتوں کے سلسلے میں اُس نے مجھے بلایا اور پوچھا۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"دار الترجمہ میں نوکر ہوں..... دبیر اوّل" میں نے کہا۔

"دبیر اوّل کیا ہوتا ہے؟"

"ہیڈ کلرک..... بڑا کلرک..... منشی، بڑا منشی، بڑا بابو"

میں نے ذرا وضاحت سے کہا۔

زینو جو اس وقت بیٹھا ہوا تھا مایوس سا ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا اس وقت دونوں دانت اس کے ہاتھوں میں تھمے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔ وہ جماہی لیتے ہوئے بولا۔

"اوخ!..... ہا!..... میں سمجھا آپ ضلع کچہری میں چپڑاسی ہیں۔"

میں نے اپنی خجالت کو چھپاتے ہوئے کہا "تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟"

"تمہاری شکل سے" اس نے بلا تامل کہا۔

میں نے شرمندہ ہو کر شکستہ دانت برآمد کرتے ہوئے زینو ایک رازدارانہ لہجے میں بولا "اُن شہدوں نے میرے دو دانت توڑ دیئے ہیں۔ کیا آپ کا کوئی وکیل واقف ہے؟ جس کی ہائی کورٹ تک رسائی ہو.... میں نے اتفاقاً دونوں دانت سڑک پر سے اٹھا لئے تھے جبکہ پولیس کے سپاہیوں نے مجھے اٹھایا۔ آپ جانتے ہیں کسی کا دانت توڑنے پر پچاس روپے ہرجانہ وصول کر کے دانت کے مالک کو دیا جاتا ہے۔ آپ ان دانتوں کو رکھ لیں سو روپیہ آپ کو مقدمے کے ذریعے مل جائے گا۔ مجھے بیس روپے دے دیں۔ بڑی ضرورت ہے مجھے...."

میں نے جی ہی جی میں ہنستے ہوئے سوچا۔ بھلا اس سے نفع بخش سودا اور کیا ہوگا۔ اور پھر میں نے زینو سے بھی زیادہ گہرے رازدارانہ لہجے میں اُسے کہا "سنو! .... شاید تمہیں ڈیڑھ سو مل جائیں۔ ان دانتوں کو نیلام کر دو۔"

....

عادت ہے.... میں سگریٹ پیتے پیتے اونگھ جاتا ہوں اور جب انگلی جلتی ہے تو چونک اٹھتا ہوں۔ ایک دن کسی مترجم کی وفات پر دارالترجمہ میں چھٹی تھی اور میں دوپہر ہی کو اپنی کوٹھڑی کی چھت پر دھوپ میں پڑا اونگھ رہا تھا اور میرے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ جب نیو جہانگیر ریسٹوران کے ایرانی نژاد چھوکرے نے بیک وقت لا کر میرے پاؤں میں رکھا۔ میں اس وقت بھی نہ جاگا اور ابھی سگریٹ نے میرا ہاتھ بھی نہ جلایا تھا کہ سیڑھیوں پر دھما دھم کی آوازیں سنائی دیں۔ میں جاگ اٹھا۔

خان، وحید، ہادی اسلام، ریسٹوران کا منیجر سب کے سب میرے سامنے کھڑے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

"میری گھڑی لے گیا ہے، سالا" نجیب نے کہا۔

"میری مشہدی لنگی" خان آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔

ریسٹوران کا منیجر کہنے لگا "تین روپے سات آنے کا بل دو ماہ سے واجب الادا ہے"۔

سب سے آخر میں ہادی اسلام بولا۔

"میرے پانچ روپے نکال لئے ہیں ماں کے خاوند نے ...."

ہادی نے وہ گالی ذرا وضاحت سے نہ دی تھی۔ میں نے سوچا۔ شاید ہادی نے ماموں بھانجے کا رشتہ بدل دیا ہے اور اُسے ماں کا خاوند بنا لیا ہے۔ یہ مجوزہ، نیا رشتہ عجیب ہے۔ آخر یہ پارسا اور غازی لوگ، گالی دینے کے لطیف فن میں ماہر کیوں نہیں ہوتے۔ معمولی سی وضاحت، ایک ادنےٰ سے اسم فاعل ترکیبی کی ضرورت تھی اور ایک جامع گالی ہو جاتی۔ خیر! میں نے سب کو ایک نظر دیکھا۔ وہ لوگ اپنے تمام نقصان کی تلافی مجھ سے چاہتے تھے۔ ان تمام باتوں کے لئے میں ہی ذمہ دار تھا کیونکہ میں نے ہی اُسے وہاں لا کر رکھا تھا۔ یہ کیا کم رعایت تھی کہ زینو سے کرایہ نہیں لیا جاتا تھا اور اُسے "دارالامان" (یہ ہماری کوٹھڑی کا نام تھا) میں پناہ دی جاتی تھی۔ شاید وہ سب لوگ مجھ سے بہت نامناسب سلوک کرتے اور لڑائی کی صورت میں تو شاید ایک ایک دو دو ہڈیاں بھی اُن کے حصے میں آ جاتیں۔ لیکن میں نے انہیں یقین دلایا کہ اگر زینو شام تک نہ لوٹا تو میں یکم کو سب نقصان چکا دوں گا۔ اُن سب کو یکم کی بندش پر اعتراض تھا۔ میں نے سوچا۔ بالفرض زینو شام تک نہ آئے تو بھی یکم میں صرف آٹھ پورے آٹھ دن پڑے ہیں اور میرے رفیق مجھے اتنی رعایت تو دے سکتے ہیں کہ زینو کے یکم سے پہلے پہلے آ جانے پر مجھے چھوڑ دیں۔

اس کے بعد میں کیچڑ دیکھنے کے لئے سینما چلا گیا۔ جب رات کے دس بجے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ خان کی لنگی کھونٹی پر ٹنگی تھی اور تبسم کی تپائی پر نجیب کی گھڑی رات کے سناٹے میں ٹک ٹک کر رہی تھی۔ کونے میں میرے سویڈ کے بوٹ رکھے تھے جو میں نے چند دن ہوئے بالکل نئے خریدے تھے۔ میں نے ابھی تک انہیں گھس جانے کے خوف سے نہیں پہنا تھا اور اپنے ٹوٹے ہوئے جوتوں کو ہی تین مہینے سے لگاتار استعمال کرتا آ رہا تھا اور اب وہ وہاں کیچڑ میں لت پت پڑے تھے۔ اور اژدہے کی طرح منہ پھاڑے ہوئے تھے۔ غالباً زینو انہیں بھی پہن گیا تھا۔ جس کا مجھے اس وقت تک علم نہ ہوا۔ اپنے بوٹوں کے یوں خراب ہو جانے پر میں بہت خشمگیں ہوا۔ میں نے وحید سے پوچھا زینو کہاں ہے؟ وحید نے ایک پرانی سی جنتری سے نیچے تکتے ہوئے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

کونے میں زینو بیٹھا تھا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ چہرہ مٹی سے اٹا پڑا تھا اور اُس کا زیریں لب بری طرح سے لٹک رہا تھا۔ میں نے اسی وقت بھانپ لیا کہ اُسے سب نے مل کر بری طرح سے پیٹا ہے۔ اور میں بھی پیٹنا چاہتا تھا۔ آخر اُس نے میرے سویڈ بوٹوں کا بھی تو ستیاناس کر دیا تھا میں نے اُسے گردن سے پکڑا۔ اور حسب عادت لیمپ کے نزدیک لے آیا۔ اور جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"تو میرے بوٹ پہن گیا تھا؟ کس نے اجازت دی تھی تجھے!"

یوں معلوم ہوتا ہے۔ زینو نے میری طبیعت کے کمزور پہلو کو پا لیا تھا۔ اور یوں بھی خطرے کے وقت جانور عقل حیوانی سے اپنے بل کو پا لیتے ہیں۔ وہ اپنے لبریز حقیقت، سینہ سے سادے لفظوں سے مجھ میں کسی ایسی غیبی طاقت کو بیدار کر دیتا تھا جو مجھ پر ایک خاص قسم کا جمود طاری کر دیتی۔ میرے دونوں ہاتھ مارتے مارتے رک جاتے وہ بولا۔

"آپ سب کو بوٹ پہنتے ہوئے شرم نہیں آتی جب کہ آپ کا ایک بھائی اتنی سخت سردی میں ننگے پاؤں چلے؟ یہ انسانیت ہے! میں کہتا ہوں کیا یہ انسانیت ہے؟ دیکھو تو میرے پاؤں کیسے سوج رہے ہیں"۔

اس وقت میں نے سوچا۔ دنیا میں چوری، اور حق تلفی کے علاوہ انسانیت بھی ایک چیز ہے۔ اور یہ سوچتے سوچتے مجھ پر ایک جمود سا طاری ہو گیا۔ اس وقت زینو اپنے ننگے پاؤں دکھا رہا تھا جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے اور سوج رہے تھے۔ ایڑیوں اور تلووں پر آوارگی اور مصائب کے ایک بھدے نقشے کی گولائیاں تھیں۔ ابھار، پیچ و خم تھے جس میں زمانے کے ترقی پسند مصور نے انتہا سے خون کے دریا بند کر رکھے تھے۔ میں نے زینو کی گردن چھوڑ دی اور بوٹوں کو پاؤں میں پہن کر دیکھا۔ میرے بوٹ، سویڈ کے بوٹ، نئے بوٹ تقریباً دو انگشت کے کھل چکے تھے۔

. . . .

بالکل ایک ہی کمرے میں کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک انسان دبیز بستر میں لیٹا رہے اور دوسرا اس کے سامنے سردی سے ٹھٹھرتا رہے۔ ایک انسان کے پاؤں سردی سے پھٹ جائیں اور دوسرا نرم و گرم موزے زیب تن کرے۔ ایک انسان گرم گرم چائے، کافی یا برانڈی پی کر دقت، فاصلہ اور اضافیت کے جدید نظریوں پر بحث کرے اور دوسرا ان باتوں سے بے بہرہ ایک کونے میں دبکا ہوا شدت کی تنہائی اور اجنبیت محسوس کرتا رہے۔ ایک شخص کے پاس ہوس رانی کے لئے وافر روپیہ پیسہ ہو اور دوسرے کو ان سے محروم رکھ کر اس میں جنسی عیوب پیدا کئے جائیں؟

ان دنوں میرے ہاتھوں نفسیات کی ایک کتاب آئی۔ اسے پڑھ کر میں نے زینو کی اس قبیح عادت کے ہر پہلو پر غور کیا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچ سکا کہ زینو کی اس فطرت کا باعث محرومی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں بچپن ہی سے اسے ہر چیز، ہر نعمتِ زندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ علم، تہذیب، مذہب، شرافت اور قانون کی آڑ میں اس کے قدرتی حقوق غصب کئے گئے ہیں، اسی لئے وہ چوری کرتا ہے۔ دوسروں کے بوٹ لنگیاں، گھڑی اور سویڈ کے بوٹ پہن کر دوسروں کو چھاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اب چوری ایک دیرینہ بیماری کی طرح جڑیں پکڑ چکی ہے۔ اس کے انسداد کے لئے کسی اکسیر کی ضرورت ہو گی۔ کتنا کام زیر زمین کرنا پڑے گا۔ کتنا وقت درکار ہو گا اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے . . . .

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ بوٹ میں زینو کو دے دوں گا دو انگشت تو وہ پہلے ہی کھل چکے ہیں۔ ان کا مجھے فائدہ ہی کیا۔ اس کے علاوہ میں نے سوا پانچ روپے میں کھردرا سا خاکی پٹی کا کوٹ زینو کے لئے خریدا تاکہ وہ سردی سے نہ کانپے بلکہ تن کر میری باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے اور میں جھینپ سے سہہ جاؤں ۔۔۔ جذبات ہی تو ہیں!

میں خراماں خراماں گھر لوٹ رہا تھا اور سوچتا تھا کہ آج زینو کتنا خوش ہو گا۔ وہ مجھے کیسا فرشتہ سیرت سمجھے گا۔ اس خوشی میں وہ کتنی چھلانگیں لگائے گا۔ مجھ سے لپٹے گا۔ کہے گا۔ اللہ تمہیں ایک خوبصورت بیوی دے۔ اللہ سب کا رازق ہے۔ واللہ خیر الرازقین۔ . . .

میں نے دارالامان میں قدم رکھا۔ زینو اسی طرح ایک اسفنجی کپڑے کی مانند سکڑ کر ایک کونے میں پڑا تھا۔ میں نے سوچا آج شاید پھر اس غریب الدیار کو کسی نے مارا ہے۔ میں ان جذبات سے کورے، عقلمند وحشیوں کو اس کی اچھی طرح سزا دوں گا۔ میں ان لوگوں کو اب بھی خرید سکتا ہوں۔ زینو کے ان سے تمام رشتے ناطے توڑ سکتا ہوں . . . . لیکن نہیں . . . . نہیں، زینو کو کسی نے نہیں پیٹا تھا۔

میں نے کونے میں پڑے ہوئے زینو کو کان سے پکڑ کر اٹھایا۔ یہ حرکت میں نے اس وجہ سے کی کہ زینو سمجھے گا کہ آج پھر مجھے کسی جرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی ہے اور اس شک و بیم کے درمیان جب اسے پتہ چلے گا۔ کہ اسے کوٹ اور بوٹ بخشش میں دیئے جا رہے ہیں۔ تو اس ڈر کے مقابلے میں خوشی کتنی ہولناک طور پر خوبصورت ہو گی۔

میں نے زینو کے کانوں کو اچھی طرح سے مروڑا۔ درد کے ایک احساس سے وہ آہستہ سے کراہ اٹھا لیکن اس نے مطلق نہ پوچھا کہ وہ سزا اسے کیوں دی جا رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اب کانپ رہا تھا۔ سردی سے نہیں، خوف سے کیونکہ اس نے کوئی جرم نہ کیا تھا . . . .

میں نے کہا: "دیکھ بیٹا، تیرے لئے کوٹ لایا ہوں"۔

ایک لمحہ میں زینو کا خوف دور ہو گیا۔ وہ میرے قریب سرک آیا۔ اور کھونٹے کی پٹی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی فرشتہ

بیٹھتے وقت اپنے پر سنوارتا ہے۔ اپنی آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"وہ بوٹ بھی اب تمہارے ہیں"

زینو مسکرایا۔ بالکل خفیف طور پر۔ اُس نے جھٹ بوٹ لے لیا۔

اور اسی وقت اُسے کندھوں پر ڈال لیا اور بولا۔

"میں جانتا تھا کہ آپ میرے لئے کوٹ لاؤ گے۔۔۔۔ تم مجھے بوٹ دے دو گے، یہ بھی جانتا تھا"۔

اور اس کے بعد وہ کوٹ کے بٹن احتیاط سے بند کرتے ہوئے اپنی چٹائی پر جا لیٹا۔ مجھے اس کی ناشکرگزاری پر سخت غصہ آیا۔ میں نے دل میں کہا۔ آئندہ میں زینو پر ایک پیسہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ اس کا فائدہ ہی کیا؟ اس نے میرا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ اس کے بعد جب میں کھانے کے ساتھ چارپائی پر لیٹا تو مجھے غصے کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک خیال رینگتا ہوا میرے دماغ میں آیا۔ کیا اس کے بعد شکرگزاری کی ضرورت ہے؟ گویا کیڑے کو گندگی میں سے اٹھانے اور ڈنک سہنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد مجھے ایک خاص قسم کا حظ محسوس ہوا۔ جیسے کوئی مجھے کوٹ اور بوٹ کی قیمت ادا کر رہا ہو!

. . . .

ایک دن میرا ایک مترجم دوست میرے پاس آیا۔ میں نے اُس سے زینو کا تذکرہ کیا اور خاص طور پر زینو کو کوٹ اور بوٹ مہیا کرنے کا واقعہ سنایا۔ اُس نے میرے جذبات کو سراہا۔ مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی۔ میری آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور میرا رواں رواں شدتِ احساس سے جاگ اُٹھا۔ میرے دوست نے بتایا۔ زینو کی چور ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ بچپن ہی سے اُس کے ہاتھ میں پیسہ نہیں دیا گیا جسے وہ آزادانہ خرچ کر سکے۔ وہ بولا تعجب ہی ہے جو زینو کو پیسے خرچ کرنے آتے بھی ہوں۔ ایک کوٹ یا جیسٹر کی بجائے اُس کے ہاتھ میں کچھ نقدی دینا بہتر ہوگا۔ ایسی نقدی جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرے۔

اس کے بعد وہ مترجم رخصت ہوا اور میں نصف شب تک اس بات پر غور کرتا رہا۔ اگلی صبح میں نے زینو کو پاس بلایا اور ایک روپیہ اُس کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔

"زینو، بیٹا۔۔۔۔ لو یہ خرچ کر لینا۔ لیکن ذرا احتیاط سے۔۔۔۔ جب ختم ہو جائے تو میں تمہیں اور دوں گا"

اُس دن میری طبیعت نہایت پرسکون رہی۔ شام کو آیا تو میں نے باتوں باتوں میں روپے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ زینو روپیہ کتنی احتیاط سے خرچ کرتا ہے۔ لیکن شام سے پہلے پہلے زینو نے روپیہ ختم کر ڈالا تھا۔ اور دوسرے روپے کی درخواست پیش کر دی تھی۔ جب میں نے جیب میں سے دوسرا روپیہ نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو میں ٹھٹھک گیا۔ اگر اس حساب سے روپے خرچ ہونے لگے۔ تو دیوالے کی درخواست دینی پڑے گی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ گویا خرد بہ بانگِ دہل کہہ رہی تھی۔ "اب کہو!"

لیکن میں نے خرد کو جذبات پر غالب نہ آنے دیا۔ میں نے جوشِ عمل کے جذبے سے ایک روپیہ نکالا۔ اور کہا۔

"زینو۔۔۔۔ لو ایک روپیہ اور۔۔۔۔ بس میں ایک ہی دے سکتا ہوں لیکن یوں گزارہ نہ ہوگا۔ احتیاط سے خرچ کرنا"۔

اس کے بعد جب میں شام کو دفتر سے لوٹا تو زینو پہلے سے موجود تھا میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے روپیہ میرے سامنے پھینک دیا۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں"

"کیوں زینو؟" میں نے پوچھا۔

"جب تک پیسہ میری جیب میں رہتا ہے" زینو بولا "مجھے سکون میسر نہیں ہوتا۔ گویا وہ میری جیب سے اُچھلا پڑتا ہے۔ جب تک اُسے خرچ نہ کر ڈالوں۔ مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔۔۔۔"

میں نے سخت تذبذب میں روپے کو ہاتھ میں تھامے رکھا اور لیمپ کے گرد طواف کرنے والے ایک پروانے کو دیکھنے لگا۔ عجیب بات تھی زینو میں ایک روپے کو خرچ کرنے کی بھی اہلیت نہ تھی۔ ایک روپیہ جیب میں ڈال کر اُسے خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ لذیذ ترین مٹھائیاں، خوبصورت ساڑیوں میں ملبوس عورتیں اور کیا کچھ نہیں خرید سکتا۔ گویا وہ ایک چھوٹا برتن ہے جس میں زیادہ چیز نہیں سماتی۔ وہ ایک روپیہ بھی جیب میں نہیں رکھ سکتا اور جب اُس کی جیب خالی ہو گی تو وہ چوری کرے گا۔ اس پر ایک جمود طاری ہو چکا ہے۔۔۔۔ لیکن کیا مجھ سے زیادہ جذباتی آدمی اور کوئی ہو گا جو اُسے ہر روز ایک روپیہ دے سکے۔۔۔۔ جذبات۔۔۔۔ جذبات جو کہ چوری سے بھی زیادہ جمود انگیز ہیں۔

چوری سے زینو کو روکنا بے سود سمجھ کر میں نے اس ضمن میں اُسے کچھ کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

. . . .

اسی شہر کے محلہ قاضی عبدالغفار میں میری ہمشیرہ رہتی ہے۔ میرے بہنوئی محکمہ ڈاک میں ایک اچھی، گذارے کے لائق آسامی پر متعین ہیں۔ میری ہمشیرہ کے تین بچے اور دو مکان ہیں۔ شہر میں میرے بہنوئی کا کافی رسوخ ہے کچھ دنوں سے میں شادی کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ اب تیس برس کا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے سے گرم ملک کا باشندہ تھا اور کثرت سے چاٹ کھانے کا عادی۔ شروع جوانی میں پھوپھی اور خالہ کے ہاں سے رشتے آتے تھے۔ مگر مجھے ان دونوں لڑکیوں سے کچھ چڑھ تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں خوبصورت اور بے وقوف تھیں۔ اس کے بعد بھی ہمشیرہ کہتی تھی۔ وقت گذر چکا ہے اور اب تو میرے سر میں کہیں کہیں سفید بال دکھائی دینے لگے تھے ہندوستان کی اوسط عمر سے زیادہ ہو چکا تھا اور یہی کیا کم غنیمت تھا لیکن میں ایک عورت کی شکل دیکھے بغیر ہی مر جاتا اور اس صورت میں کیا جنت کے دروازے مجھ پر کھلے رہتے؟ میں نے ارادہ کیا کہ کسی معتبر آدمی کے ذریعے شادی کے متعلق کہلوا بھیجوں اور جب ہمشیرہ تھوڑا سا بھی اصرار کرے تو مان جاؤں۔ آخر کھانا پکانے کے لئے بھی تو ایک عورت چاہیئے۔ گویا میں سارا دن مردانے میں بیٹھا رہوں گا۔ اور بیوی باورچی خانے میں!

اور دل کہہ رہا تھا۔ دارالامان کی جگہ المنظر کی ضرورت ہے، زینب خالہ کی لڑکی خوبصورت ہے تو خوبصورت ہی سہی۔ بے وقوف ہے تو بے وقوف ہی سہی کھانا پکانا تو اچھی طرح جانتی ہے۔

اس کام کے لئے میں نے جس معتبر شخص کو ڈھونڈا وہ زینو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ زینو کافی عرصے سے میری ہمشیرہ کے ہاں متعارف تھا۔ دیر سے حاجی لگوئم پاجی لگوئم کا سلسلہ شروع تھا۔ میں نے زینو کو رضامند کیا کہ وہ وہاں پہنچ کر میرے لئے زمین تیار کرے۔ میری شادی کا تذکرہ چھیڑے۔ ہمشیرہ جو مدت سے میرا گھر آباد دیکھنے کی خواہشمند ہے مجھ سے خود ہی اصرار کرے گی اور پھر میں زینب کا قصہ چھیڑ دوں گا۔

ایک نیک ساعت دیکھ کر میں اور زینو گھر پہنچے۔ ہمشیرہ قریب آکر بیٹھی تو میں عمداً کسی بہانے سے وہاں سے چلا گیا۔ دراصل میں بغل کے دروازے کے پاس کھڑا سب کچھ سنتا رہا۔ زینو کہہ رہا تھا۔

"ان کی شادی کیوں نہیں کر دیتے آپا؟"

"مانے بھی؟" آپا بولیں۔

"اصرار بھی تو نہیں کیا آپ نے کبھی"

"اصرار کی خوب کہی تم نے" ہمشیرہ غالباً ہاتھ پھیلا کر بولی "اس ڈھیٹ آدمی نے پھوپھی اور خالہ کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ اب تو میں اسے کبھی نہیں کہنے کی"!

میں تلملا کر رہ گیا۔ لیکن میرا ہوا خواہ وکیل کہنے لگا۔

"پچپن تھا نہ آپا اس وقت تو۔۔۔۔۔"

ہمشیرہ غالباً ایک چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی

"میں تو کبھی نہ کہوں گی، تم منالو اسے۔۔۔۔۔"!

میں موقع مناسب دیکھ کر کمرے میں داخل ہوا۔ اور ادھر ادھر تصویروں پر نگاہیں ڈالتے ہوئے بیٹھ گیا۔ ہمشیرہ چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"پی لو ایک پیالی" اور پھر بولی "شادی کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا"؟

ضروری تھا کہ ہمشیرہ کے سامنے میں جھوٹا سچا انکار کرتا۔ میں نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ "شادی؟ توبہ! توبہ! میں اس راہ میں بھٹکنا نہیں چاہتا میرا مطمح نظر شادی سے کہیں بلند ہے"!

زینو نے ایک آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "اور باورچن"؟

میں نے جلاتے ہوئے کہا "بکواس بند کرو، زینو کے بچے، جہانگیر ریسٹوران میں برا کھانا ملتا ہے کیا"؟

اب جو کچھ زینو نے کہا وہ بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ اور مجھ سے مانگ کر پہنی ہوئی پتلون کے گیلس کو کھینچتے ہوئے بولا۔

"ایسے بے ڈھب انسان مجھے بالکل پسند نہیں۔ خود ہی مجھے تیار کیا کہ میں جا کر شادی کے لئے زمین تیار کروں اور اب مجھے ہی خجل کرنا چاہتے ہو۔ ہات!۔۔۔۔۔"

زینو جتنا خجل ہو سکتا تھا وہ ہو چکا اب میری باری تھی۔ پسینے کے قطرے اتنی سردی کے باوجود میری پیشانی پر پیدا ہو گئے۔ میں ہمشیرہ کے سامنے برابر انکار کرتا رہا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔ زیادہ سے زیادہ میں نے یہ کیا۔ ننھے بھانجے کو گودی میں اٹھا لیا اور بہنوئی کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ کس کے ابا ہیں؟ تمہارے!۔۔۔۔۔ شیت۔۔۔۔۔ شیت، تھوکتے ہو؟ کتنے گندے ہو تم"!

اور پھر ہمشیرہ کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی کہتا ہوگا، اچھا ماموں ہے میرا بالکل خالی ہاتھ چلا آیا"

اور اپنے بھانجے کے گالوں کو چٹکی لیتے ہوئے میں نے کہا۔

اب کی دفعہ میں تمہارے لئے چیری لاؤں گا، چیری بڑے بڑے
گٹھلی والے اور ٹانی ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تم نے کبھی ٹانی بھی کھائی ہے یا چیری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ٹانی چیری سے بھی زیادہ میٹھی ہوتی ہے"۔

لیکن عورتیں نفسیات میں مردوں سے برتر ہوتی ہیں۔ میری ہمشیرہ مسکراتی رہی۔ اس کے بعد ہم نے رخصت لی۔ راستے میں میری ننھو سے خوب بے دے ہوئی۔ میں نے کہا "تمہیں دارالامان میں پڑے پڑے کئی سال ہوگئے۔ بیٹھنے کے لئے دارالامان سے زیادہ موزوں اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے"۔ میں پر آشوب دل کے ساتھ اپنی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اپنی بید کی چھڑی کو تلاش کرنے لگا۔ وہاں نادی اسلام ہمارا انتظار کر رہا تھا اور وہ بید کی چھڑی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ پتہ چلا کہ زینو نے نادی کا پین چرا کر اس کی نب مراف کے ہاتھ پیچ ڈالی ہے۔ یہی چار آنے لینے کے لئے ہوں گے۔

مقتول قسلم کا جسم نالی میں سے بلا لے جانے کے سر سے نیلا نیلا خون بہ رہا تھا۔ زینو کی قمیص کی جیب میں سیاہی کا ایک بڑا سا دھبہ چوری کا شاہد تھا۔

اس دن میں نے دونوں باتوں کے لئے زینو کو پیٹا اور کہا "نکل جاؤ سؤر کے بچے ۔ ۔ ۔ ۔ شہدے، حرامزادے، نکل جاؤ تو یہاں سے"۔

اُسی وقت میں نے زینو کو سیڑھیوں میں سے دھکا دیا۔ وہ دو چار سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا آخری سیڑھی پر جا رُکا۔ اُس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اُس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد زینو اُٹھا اور پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا اسے کسی بات پر یقین نہ آتا ہو جب وہ کچھ دور جا کر میری جانب دیکھنے کے لئے رُکا تو اس خوف سے کہ مبادا وہ اپنی عقلِ حیوانی سے مجھ پر فتحیاب نہ ہو جائے۔ میں نے دیوار کے قریب سے ایک اینٹ اٹھائی اور زینو کی ٹانگ پر دے ماری۔ زینو کی چیخ ریسٹوران تک سنائی دی اور وہ بلبلاتا ہوا بیٹھ گیا۔ میں نے ایک اور اینٹ پھینکی، زینو لنگڑاتا ہوا اٹھا اور اسی حالت میں رینگتا ہوا آہستہ آہستہ شام کے بے مہر منجمد اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا۔

. . . .

اس سخت سردی کی رات میں جبکہ جھینگر بھی سرِ شام ہی سے شور مچانا چھوڑ دیتے ہیں میں اپنے بستر میں لیٹا، اُس کی گرمی اور نرمی محسوس کرتا ہوں کہ میرے سینے میں دل حرکت کرتا ہے۔ میری قوتِ متخیلہ بڑی بلند ہے۔ جب وہ ریل کی لائنوں یا دریا کی گہرائیوں کو ماپتی ہے۔ تو یہ دل شدت سے دھڑکنے لگتا ہے۔ جب نجیب کاتب جغرافئے کے ایک کورس کی کتابت کرتا ہے تو مجھے واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ "زمین اپنے محور کے گرد حرکت کرتی ہے" میں سوچتا ہوں۔ کیا عجب کہ وہ ساکن ہو جائے اور جب کتاب کے ساتھ نقشہ دکھائی دیتا ہے تو میں حیرت سے پوچھتا ہوں یہ کس زمین کے ابھار ہیں۔ ہلکے ہلکے۔ پتلے پتلے دریا جو نیلے رنگ میں دکھائے گئے ہیں ان کا قدرتی رنگ تو سرخ ہے۔

یہ منزہ جسم اور مصنف کتنی سنجیدگی کے ساتھ وقت، فاصلہ اور اضافیت کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ سخت سردی میں منجمد ہو جائیں گے اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارا ایک معبود ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے تو اسی وقت مجھ پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں اس وقت دارالامان کے اندر بڑی تیزی سے ادھر اُدھر گھومتا ہوں اور کہتا ہوں میں کیوں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے مادر چین کی زیادہ ضرورت ہے یا زینو کی۔

خان کی مشہدی لنگی شب و روز کھونٹی سے لٹکی رہتی ہے اور نجیب کی گھڑی صبح و شام تپائی پر پڑی ٹک ٹک کرتی ہے۔ جہانگیر ریسٹوران کا بل ادا کیا جا چکا ہے۔ نوٹین پین کے پیسے بھی چکا دئے گئے ہیں لیکن اب بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے کسی کا کچھ ادا کرنا ہے لیکن میرا قرض خواہ کوئی بڑا بے نیاز آدمی ہے جسے اپنے پیسے کی رتی بھر بھی پروا نہیں۔

بھورے سے اپنا سوٹ کیس کھولتا ہوں تو مجھے فوراً ہی اُسے بند کر دینا ہوتا ہے۔ اس کے کونے میں دو دانت پڑے ہیں۔ اور ایک کونے میں سفیدے سے لکھا ہے۔ زین العابدین یعنی عابدوں کی زینت!

کل ہی میں نے فلیکس کا ایک نیا بوٹ خریدا ہے۔ جب میں اُسے پہنتا ہوں۔ تو وہ چیختا ہے چلاتا ہے۔ بھلا اُسے کس بات کا رونا ہے۔ وہ چلاتا ہے۔ ۔۔۔۔ نئے چمڑے کا رونا اور وہ کم بخت چسٹر بھی تو میرے لحیم و شحیم جسم پر پورا نہیں آتا۔

جب ہم شام کو سوٹ پہن کر دارالامان سے نکلتے ہیں تو ہم کتنے بہتر انسان دکھائی دیتے ہیں۔ ہم ہنستے ہیں لیکن تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ آخر والدین نے ہمیں تربیت دی ہے۔ ہم مفلر کو گلے میں اور موزوں کو پاؤں میں خوب کھینچتے ہیں تاکہ سردی لگ جانے کا خدشہ نہ رہے اور جب کوئی سڑک پر جاتی ہوئی لڑکی ہماری طرف دیکھتی ہے تو ہم فوراً اپنی ٹائی کی گرہ کو درست کرنے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی باتوں باتوں میں نجیب وحید کو سالا کہہ دیتا ہے۔ وحید

پورے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر جما دیتا ہے اور ایک ہفتہ تک وحید مستری کی ہتھوڑے پکڑنے والی انگلیوں کے نشان نجیب کے گالوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ اور جب ہم اپنے اردگرد غور سے دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں، نہ کوئی کسی کا بھائی ہے نہ بہنوئی نہ سالا، نہ ماموں نہ بھانجا، نہ باپ نہ بیٹا..... سب رشتے ناطے ٹوٹ چکے ہیں۔

اللہ! تمام دنیا یکسر شریفوں کی دنیا میں بدل چکی ہے۔ گویا ہم ایک دار القرار بلکہ اس سے بھی اُوپر ایک خدا بریں میں رہتے ہیں!

راجندر سنگھ بیدی

زندگی اور موت

حیات:-

ساغرِ ہستی شکستہ، جامِ مستی چور چور
عشق کی رنگین وادی تیرہ و تار و خموش
سردِ جذباتِ جوانی، گُم تمنّاؤں کا جوش
گرد تیرے نحس سے اصنامِ ہستی کا غرور
منتشر رومانِ فرحت، مضطرب ذوقِ سرور
محوِ قلبِ ملتہب ہے مستیٔ احساس و ہوش
عہدِ ماضی کا ترانہ، سازِ ہستی کا خروش
عرصۂ عالم میں مہلک کس قدر تیرا ظہور!

موت:-

حکمراں ہے مملکت پر تیری ہر سو اہرمن
دامنِ دوشیزگی بزمِ جنوں میں تار تار
عشق بجبر مضطرب، روحِ جوانی شرمسار
سرد کرتا ہے تمناؤں کو تیرا بانکپن
اس جہاں میں جور و استبداد کی تجھ سے نمود
طنز ہے آسودگیٔ روح پر تیرا وجود
میرا دامن کش ہے حسن و عشق کا شوقِ وصال
ورنہ میں اور تیرے اس محلِ شبستاں کا خیال!

شوکت واسطی

دو غزلیں

(۱)

دیوانگیٔ دل کی توقیر نہیں ہوتی
اب خاکِ محبت بھی اکسیر نہیں ہوتی

باہر ہو قدم کیسے وحشت کدۂ غم سے
مانا مرے پاؤں میں زنجیر نہیں ہوتی

اے برقِ فنا تو ہی تقدیر مری بن جا
غارت گرِ ساماں سے تدبیر نہیں ہوتی

کیوں دیکھتے ہیں مجھ کو حیرت سے جنوں والے
کیا غم کی یہاں کوئی تصویر نہیں ہوتی

تعزیر کے لائق ہوں یہ سچ ہے مگر سوچو
قسمت کا بگڑ جانا تقصیر نہیں ہوتی

کرتی ہے خموشی ہی چپکے سے بیانِ غم
جب دردِ تمنا کی تفسیر نہیں ہوتی

آدابِ وفا سیکھو، اندازِ جفا چھوڑو
یوں قصرِ محبت کی تعمیر نہیں ہوتی

کیوں درد نہیں بڑھتا کیوں موت نہیں آتی؟
اس خوابِ پریشاں کی تعبیر نہیں ہوتی

تاثیرِ محبت سے آہیں تو نکل آئیں
آہوں میں نظرؔ پیدا تاثیر نہیں ہوتی

(۲)

سازِ ہستی میں ہیں سوزِ غم کی تفسیریں کہیں
آرزوئے شوق کے خوابوں کی تعبیریں کہیں

کس تجاہل سے بدل دی تم نے میری زندگی
یوں نگاہِ ناز سے بدلی تھیں تقدیریں کہیں؟

حلقہ در آغوش ہوں دیوانگانِ نوبہار
ہل رہی ہیں موجِ بوئے گُل کی زنجیریں کہیں

سینکڑوں خاکے ہوئے برباد رنگِ عشق سے
حسن کے چھینٹوں سے جب چمکی ہیں تصویریں کہیں

حشر میں بھی مل رہی ہے توبہ کرنے کی سزا
میں کہیں برباد ہوں اور میری تقصیریں کہیں

جوشِ وحشت میں پریشاں حال ہیں بربادیاں
ڈھونڈتی ہیں مجھ کو شاید میری تدبیریں کہیں

پھونک ڈالا سرد آہوں سے ہی اپنا آشیاں
آتشِ غم کی نظرؔ چھپتی ہیں تاثیریں کہیں!

قیوم نظرؔ

شکوہ

شبِ تیرہ میں اک خفتہ جوانی کو کچل ڈالا
شکاری! آہ، اے ظالم شکاری! تیری نادانی!

اچانک تیر مارا، جذبۂ زہری سے آلودہ،
شگفتہ ہو گئی نکہت پھول کی بکھری فضائیں — ایک بےچینی!
پریشاں ہو گی اب دنیا میں یہ سفّاک رسوائی،
ہر اک بوسیدہ پتّی کھو کے حسنِ نرم و نازک کو،
بنی ہے ہمسفر اک رنگِ نَو کے تُند جلوے کی!

مگر تُو نے شکاری! آہ، اے ظالم شکاری! یہ بتا مجھ کو،
شبِ تیرہ میں کیوں خفتہ جوانی کو کچل ڈالا؟
کہ اب باقی نہیں پہلی سی وہ بےباک رعنائی؛
بجائے سادگی اب اک تکلف ہے،
جھجک ہے، عشوۂ ہشیار ہے،
احساس ہے جس کا
گلِ بوسیدہ کی زخمی جوانی کو!

بدل ڈالا ہے تُو نے رنگ فطرت کی اداؤں کا،
مچل کر جاگ اُٹھی ہے، درسِ وحشت دے گی دنیا کو،
بنی ہے ہمعناں اک رنگِ نَو کے تُند جلوے کی!

گلِ بوسیدہ کی زخمی جوانی ہر شکاری کو
مچل کر درسِ وحشت دے گی، نادانی سکھائے گی!
شکاری! آہ، اے ظالم شکاری! تیری نادانی!
شبِ تیرہ میں کیوں خفتہ جوانی کو کچل ڈالا!

میراجی

اُردو ناٹک کی شاعری

اس وقت تک اردو ڈرامے کی تاریخ کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے اُس سے یہی پایا جاتا ہے کہ اردو کا سب سے پہلا باقاعدہ ناٹک "اندر سبھا" ہے جو محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں میاں نواز دلہری نامی ایک صاحب نے سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ ناٹک "شکنتلا" کے قصّے کو ہی جس کا نام برج بھاشا اور پراکرت میں لکھا تھا۔ مگر اب یہ ناٹک الراست واقعی ناٹک کہا جا سکتا ہے تو لغ یہ نا پید ہو چکا ہے۔ البتہ اس کے ایک سلیس اردو ترجمہ کا پتہ چلتا ہے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ایک مترجم مرزا کاظم علی جوان کے قلم کا رہین منت ہے۔ اس کے بعد اردو کے جس ڈرامے کا پتہ چلتا ہے اور جسے حقیقی معنوں میں ڈراما کہا جا سکتا ہے وہ امانت کی "اندر سبھا" ہے۔ یہ اردو کا سب سے پہلا "اوپیرا" ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اب تک اس سے بہتر اوپیرا اردو میں نہیں لکھا گیا۔ آج بھی اگر کسی اسٹیج پر "اندر سبھا" دکھائی جاتی ہے تو دیکھنے والوں کے ذوق و شوق کا وہی عالم نظر آتا ہے۔ اندر سبھا امانت کی دیکھا دیکھی اُسی زمانے کے ایک شخص مداری لال نے بھی اندر سبھا لکھی۔ فنی اعتبار سے مداری لال کی اندر سبھا اور امانت کی اندر سبھا میں کوئی بڑا فرق نہیں پایا جاتا۔ لیکن امانت کی اندر سبھا میں زبان و بیان کی جو خوبیاں پائی جاتی ہیں اور جو روانی اور شاعرانہ نکتہ آفرینیاں موجود ہیں وہ مداری کے ہاں بالکل مفقود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امانت کے مقابلے میں مداری کی شعبدہ گری کامیاب نہ ہو سکی۔ "اندر سبھا" کی تقلید میں اردو میں اور بھی اوپیرا لکھے گئے مگر کسی کو "اندر سبھا امانت" سا قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔ اندر سبھا اپنی ڈرامائی خوبیوں سے قطع نظر خالص شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی ایک عمدہ تصنیف ہے اس کی شاعری میں شروع سے آخر تک ایک ہی سی روانی پائی جاتی ہے، فنی لحاظ سے بھی اس کی شاعری بڑی حد تک مکمل ہے، اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد ہی مشکل سے چند سقم نکالے جا سکتے ہیں، اس میں کئی شعر ایسے ملیں گے جو بندش کی چستی۔ الفاظ کی نشست۔ تخیل کی بلند پروازی اور تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت و رنگینی کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔ میں اس وقت اس کی شاعری کے بعض نمونے پیش کرتا ہوں۔ پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں درباری راجہ اندر کی آمد گاتے ہیں۔

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے — پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے
خوشی سے چہچے لازم ہیں صورتِ بلبل — اب اس چمن میں گلِ تر کی آمد آمد ہے

اندر سبھا میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ جس کے منہ سے جو کچھ کہلوایا گیا ہے وہ اُس کے مرتبے اور مقام کے عین مطابق ہے۔ اندر سارے پرستان کا بادشاہ ہے، چنانچہ دوسروں سے باتیں کرتے ہوئے یا اپنا تذکرہ کرتے ہوئے اسے اپنی برتری کا پورا پورا احساس ہوتا ہے۔ اندر بادل کے جھالے سے اُتر کر تخت پر جلوس فرماتے ہوئے کہتا ہے۔

راجہ ہوں میں قوم کا اور اندر میرا نام — بن پریوں کی دید کے نہیں مجھے آرام

سبھا میں داخل ہو کر پکھراج پری کہتی ہے۔

گاتی ہوں میں اور ناچ سدا کام ہے میرا — آفاق میں پکھراج پری نام ہے میرا
میں لاکھ کی دولت کی پروا نہیں کرتی — قاروں کا خزانہ ابھی انعام ہے میرا

نیلم پری کہتی ہے۔

حوروں کے ہوش اڑتے ہیں اڑنے کی شان پہ ٭ نیلم پری ہے نام مرا آسمان پہ
نیلم کو چوم چاٹ کے آنکھوں پہ رکھتے ہیں ٭ شہرہ ہے میرا جوہریوں کی دکان پہ

لال پری سبھا میں داخل ہونے کے بعد کہتی ہے۔

انساں کا کام حسن پہ میرے تمام ہے — جوڑا ہے سرخ لال پری میرا نام ہے
یاقوت زر خرید ہے سرکار کا مری — نوکر عقیق لعلِ بدخشاں غلام ہے
پوشاک میری سرخ ہے مکھڑا ہے چاند سا — دیکھو شفق میں رات کو ماہِ تمام ہے

سبز پری کہتی ہے۔

آتی ہے نئے انداز سے اب سبز پری ہے — لب سرخ ہیں پر سبز ہیں پوشاک ہری ہے
فیروزہ اسے دیکھ کے کھا جاتا ہے ہیرا — چہرے میں زمرد سے سوا جلوہ گری ہے

ہ راگ ناٹک (ادارہ)

اِن شعروں سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ امانت نے اندر سبھا کی شاعری میں اسی ماحول کی پوری پوری تصویر کھینچی ہے۔ جسے وہ بیان کرنا چاہتا ہے۔

جب لال دیو گلفام کو گرفتار کرکے اندر کے سامنے پیش کرتا ہے تو اندر غضبناک ہوکر اس سے پوچھتا ہے

ارے کون ہے تو ترا کیا ہے نام سبھا تو نے کی میری برہم تمام
تجھے لایا یاں کون لے بد صفات بیان مجھ سے کر جلد یہ واردات
کیا قصد تو نے پرستان کا نہ خوف آیا اپنی تجھے جان کا

اسی طرح اندر سبز پری سے کہتا ہے سے

اری او پری سبز او بے حیا مرے سامنے جلد آجیو ذرا
تھوڑی ہے تری ذات بنیاد پر کہ عاشق ہوئی آدمی زاد پر

سبز پری ندامت سے سر جھکا کر دست بستہ عرض کرتی ہے۔

جفا و سزا کی سزاوار ہوں حقیقت میں تیری گنہگار ہوں

غرض اندر سبھا اسی طرح کی رنگا رنگ رنگینیوں کا ایک رنگیں مرقع ہے۔ اس کا ہر شعر اپنی جگہہ پر ایک نگینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول مولانا حسرت موہانی" ظاہر میں یہ دیو پری کا ایک بے سر و پا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایک مرادی افسانہ (ALLEGORY) ہے۔ جس کے ذریعے سے امانت نے پاسِ شرافت اور حُسن و عشق کے نہایت نازک اور اہم معاملات کا فوٹو کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

امانت کے بعد بہت دنوں تک اردو ڈرامے کی قسمت سوئی رہی کیونکہ کسی بڑے شاعر نے ڈرامے کی طرف توجہ نہ کی جو لوگ اس فن کی طرف مائل ہوئے وہ یا تو بگڑے شاعر تھے یا بگڑے ادیب۔ جس طرح میر سودا کے زمانے میں یہ مشہور تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہو جاتا ہے اُسی طرح امانت اور امانت کے بعد کے زمانے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ بگڑا شاعر یا بگڑا ادیب تمثیل نگار بن جاتا تھا، چنانچہ خود امانت نے بھی اندر سبھا میں کئی جگہہ اپنے آپ کو بجائے امانت "استاد" لکھا ہے بلکہ شروع اندر سبھا میں یہاں تک لکھ دیا کہ یہ جلسہ کیا سب کو مرغوب تھا۔ مگر اپنے نزدیک معیوب تھا، اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں استاد تخلص کیا۔ لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب بندہ کا کام دریافت کر لیا۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ جس "جلسہ" کو امانت ایک معمولی سی چیز سمجھتے تھے۔ وہی اُن کے لئے شہرتِ دوام کا باعث بنا اور انہیں اردو ڈرامے کی سبھا کا اندر بنا گیا اور جن غزلوں پر انہیں ناز تھا، انہیں گردشِ ایام کے جھونکے نہ معلوم کہاں سے کہاں اڑا لے گئے۔

اندر سبھا کی مقبولیت سے یہ بڑا فایدہ ہوا کہ ملک بھر میں ڈراما دیکھنے کے شوق کو تقویت پہنچی اور جب ڈراما دیکھنے کا شوق بڑھا تو قدرتی طور پر کئی اہلِ قلم کو اس صنف کی طرف رغبت ہوئی۔ چونکہ اُس زمانے میں ڈراما لکھنا اور ڈرامے میں پارٹ کرنا دونوں معیوب سمجھے جاتے تھے، اس لئے ایک طرف تو اچھے لکھنے والوں نے اس فن کی طرف توجہ نہ کی اور دوسری طرف اداکاری بھی عرصہ دراز تک ڈوم ڈھاڑیوں اور میراثیوں کا پیشہ بنی رہی، جن لوگوں نے اردو میں پہلے پہل ڈراما نویسی کی طرف توجہ کی۔ وہ سنسکرت سے بالکل ناآشنا تھے۔ اور سنسکرت کے سوا ہندوستان کی کسی زبان میں ڈرامے کا کوئی اعلیٰ نمونہ موجود نہ تھا جسے یہ لوگ اپنے لئے مشعلِ راہ بناتے۔ ناچار انہیں اپنی طبیعت اور عام مذاق کو اپنا رہبر بنانا پڑا۔ سب سے پہلی اور بڑی جس ناٹک کمپنی کا نام اب تک معلوم ہو سکا ہے وہ بمبئی کی اوریجنل پارسی تھیٹریکل کمپنی ہے۔ اس کے ڈراما نگار رونق بنارسی تھے۔ ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ کسی زمانے میں گجراتی رسم الخط میں شائع ہوا تھا۔ انہیں اردو نظم و نثر دونوں میں بڑی اچھی مہارت حاصل تھی۔ اسٹیج سے تعلق رکھنے والے بعض پرانے لوگوں سے سنا ہے کہ رونق بڑے صاحبِ دل تھے۔ انہیں کسی ایکٹریس سے بہت لگاؤ تھا۔ ایک دن وہ بیٹھے بیٹھے کاٹ رہے تھے خبر ملی کہ اس محبوبۂ جاں نواز نے ملکِ عدم کو کوچ کیا، اُس دن رونق کوئی غزل لکھ رہے تھے۔ اور اس مصرعے پر پہنچے تھے ع

جہاں پہ اس کی لحد بنے گی وہیں پہ میرا مزار ہوگا!

یہ اندوہناک خبر سنتے ہی انہوں نے اپنے دل میں دہی چاقو گھونپ کر اپنا کام تمام کیا، نہ معلوم اس واقعہ میں کہاں تک صداقت ہے۔ اُن کے ایک ناٹک میں سے ایک شعر یاد ہے۔

کتا بستی کو پسند ہے اور نہ ویرانے کو دل
اب تو رونق چاہتا ہے اپنا مر جانے کو دل

رونق کے بعد حسینی میاں ظریف اسی کمپنی میں ڈراما نگار مقرر ہوئے، انہوں نے اردو میں کئی ڈرامے لکھے جو نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں ظریف کے بعد اس صنف میں حافظ محمد عبد اللہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حافظ صاحب کے اکثر ڈرامے منظوم ہیں جو "وکٹوریہ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی" اور "امپیریل تھیٹریکل کمپنی" وغیرہ نے بڑی کامیابی سے اسٹیج کئے۔ ان کے لکھے ہوئے ایک اوپیرا "زہرہ و بہرام" میں سے شاعری کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں۔ بہرام کہتا ہے سے

آئے عدو بہ فاتحہ اس کی بلا کو کیا غرض جائے دعا قبول تک میری دعا کو کیا غرض
موت کو لے دل حزیں اور بھلا نہیں بہت آئے جو اس کے ہاتھ میں میری قضا کو کیا غرض
اس کی گلی سے آئے کیوں نکہتِ زلف لائے کیوں مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض

حافظ عبداللہ صاحب کے ایک دوسرے ناٹک ہوائی مجلس و نہت ناٹک سے چند شعر اور سنئے۔ وزیر کہتا ہے ؎

شہزادے کو میں لایا شہ عالم سنئے ہے پری کا اسے سایہ شہ عالم سنئے
جو ویں اس شہر میں رمّال و نجومی جتنے جائے ہر ایک بلایا شہ عالم سنئے

حافظ محمد عبداللہ کے شاگرد رشید مرزا نظیر بیگ اکبر آبادی نے بھی کئی ڈرامے لکھے جو اسٹیج پر کامیابی سے کھیلے گئے اور مقبول ہوئے لیکن مرزا صاحب شاعری میں اپنے استاد سے بازی نہ لے جا سکے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ اس زمانے کے ڈرامانگار ڈرامانگاری کے اصول سے اس قدر بے خبر تھے کہ ڈراما اور ناول کے فرق کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ چنانچہ مرزا نظیر بیگ اپنے ایک ڈراما طلسماتی پتلا کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ ناول ایک بہت پرانی مثل طلسماتی سحر ساحری سے نیا ہے اور اس میں موقع موقع پر چند سین پرمذاق زیادہ ڈال کر گانے اور ڈرامے مقفیٰ عبارت کے بہت کوشش اور جانفشانی کے ساتھ بنا بنا کے شامل کئے۔"

مرزا نظیر بیگ کے بعد اردو ڈراما نویسی میں جو سب سے بڑا نام نظر آتا ہے وہ منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی کا نام ہے۔ طالب نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے اردو ڈرامے کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے اور کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں سے شاعری کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں ؎

دشمنی رکھتے ہیں آئینے سے صورت والے خاک ہیں دل کو ملاتے ہی کدورت والے
گورِ مقتولِ جفا سے یہ صدا آتی ہے مارے جاتے ہیں یہاں مفت محبت والے
شیراز کی شراب ہے شیریں ہے لال ہے زاہد کو بھی اگر یہ ملے تو حلال ہے

دل مرا لے کے کدورت سے دبا رکھا ہے تم نے اکسیر کو مٹی میں ملا رکھا ہے
کیوں نشانہ مجھے تیروں کا بنا رکھا ہے دل تو تم لے چکے اب سینے میں کیا رکھا ہے

طالب کے بعد جس شخص نے اردو اسٹیج کی ترقی میں بہت حصہ لیا وہ منشی مہدی حسن احسن لکھنوی ہیں۔ احسن صاحب کو نظم و نثر دونوں پر بڑی قدرت حاصل ہے، انہوں نے اردو اسٹیج کی شاعری کا مرتبہ اونچا کرنے میں پوری پوری کوشش کی، میں یہاں "خونِ ناحق" میں سے ان کی شاعری کی بعض مثالیں پیش کرتا ہوں۔

فرخ بیگم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

نکل سکتی نہیں اس ظلم سے حسرت مرے دل کی
رہے گا بارِ خونِ بے گنہ گردن پہ قاتل کی

بیگم بادشاہ کی موت کے بعد رعایا کا حال پوچھتی ہے۔ ہمایوں کہتا ہے

لٹ گیا جلد یہ مٹی کا گھروندا بگڑا موت کا کچھ نہ گیا کھیل ہمارا بگڑا

ہمایوں جہانگیر سے پوچھتا ہے۔

زرد رخ ہے یاس ہے چہرہ پہ کیوں چھائی ہوئی ہے طبیعت کس لئے اس درجہ گھبرائی ہوئی

جہانگیر جواب دیتا ہے۔

مجھ کو یاد آئی بزرگوں کی قضا آئی ہوئی جن کے مرنے سے مری دنیا میں رسوائی ہوئی
قبر میں بھی ساتھ لے جاؤں گا اپنا اضطراب بعد مردن بھی رہے گی روح گھبرائی ہوئی

جہانگیر مہ بانو سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

بے وفائی سے عزیزوں کے کھلا یہ عقدہ ہم ہیں دنیا میں کسی کے نہ ہمارا کوئی

ایک درباری فرخ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

جادۂ راہِ بقا غیر از فنا ملتا نہیں بے خودی جب تک کہ انساں میں خدا ملتا نہیں

احسن کے بعد اردو ڈرامے میں جو سب سے بڑا نام نظر آتا ہے۔ وہ پنڈت نارائن پرشاد بیتاب دہلوی کا ہے۔ "قتلِ نظیر" کو بیتاب کا سب سے اچھا اردو ڈراما سمجھا جاتا ہے۔ میں یہاں اس سے بیتاب کی شاعری کے بعض نمونے پیش کرتا ہوں، اس سے ظاہر ہوگا کہ بیتاب نے اردو اسٹیج پر شاعری کے کوئی اچھے نمونے پیش نہیں کئے۔ مہاجن کہتا ہے ؎

بنیا اپنا بھی گڑ جو کھاتا ہے ہر طرح اپنا منہ چھپاتا ہے
ایک یہ بے حیا ہے کم بدذات کھلے میداں مزے اڑاتا ہے

دوست جواب دیتا ہے۔ ؎

تم کو جس گاؤں کو نہیں جانا اس کے کوسوں سے کیا رہا مطلب!
واسطہ جب نہیں رہا اس سے کچھ کرے وہ بلا سے اپنی اب

انجم کرم الٰہی سے کہتا ہے ؎

اور تو کچھ نہیں ہے ایک کھٹک سی دل میں ہاں کوئی اس درد کا بتلائے مداوا کیا ہے
چبھ گئی ہے وہ مژہ دل میں جیوں یا نہ جیوں جان کانٹے کی انی پہ ہے بھروسا کیا ہے

نظیر بلدیوں کی چودھرائن فہمین سے کہتی ہے ؎

جو ہے سامان مرا کیا ہے وہ سب آپ کا ہے ہاں بوا جان مرا کیا ہے وہ سب آپ کا ہے

نظیر کا سارنگیہ کرم الٰہی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

مال یا دولت نہ آئے ہاتھ اس کا غم نہیں　　نام ہی دنیا میں جو رہ جائے تو کچھ کم نہیں

بیتاب کے ہمعصر آغا حشر کاشمیری کی طبیعت میں شاعری کا بہت بڑا جوہر تھا۔ انہوں نے اپنی ڈرامائی شاعری میں مختلف قسم کے جذبات کی بہت اچھی ترجمانی کی ہے، حشر کی ڈرامائی شاعری میں جو جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو اسٹیج کی شاعری میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

انسان اور انسان کے دکھ سکھ کی پہیلی　　اک راز ہے اور حشر تلک راز رہے گی

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ؎

جگہ جگہ پر کھڑی ہر سولی قدم قدم پر بچھے ہیں پھندے　دُکان کھولی ہر معصیت کی گناہ کرتے ہوئے ہیں دھندے
بگاڑ ناپاک نسل سیلی زبان جھوٹی خیال گندے　کچھ ایسا بدلا ہے اب زمانہ نہ وہ خدا ہے نہ وہ ہیں بندے
یہی ہر حالت تو ہے میں مذہب کو دور رہی ہے سلام ہوگا نہ ہوا ہندو نہ ہوں گے مسلم حیم ہوگا نہ رام ہوگا

"خوابِ ہستی" میں نواب عباس یہ کہتا ہے ؎

یہ دن میں تک ساتھ دیں گے جب تک کہ جو آس ہے
جب تک احمق ہے تو جس وقت تک نہ پاس ہے

اسی ڈرامے میں ایک جگہ حنا کہتی ہے ؎

محفلِ ہستی میں شمعِ انجمن آرا ہے یہ　　بیکسی کی رات میں امید کا تارا ہے یہ
آرزو کی آنکھ ہے یہ اور تمناؤں کی جان　　پیار بھی کرتا ہے جس کو پیار وہ پیارا ہے یہ

اسی ڈرامے میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

پھر کہاں یہ دوست ہوں گے اور کہاں یہ بزم چنگ
آ گئی پیری تو روئیں گے جوانی کے لئے

"سفید خون" میں ارسلان خاقان سے کہتا ہے۔

آب دریا میں سرورِ جامِ مل ہوتا نہیں　　خار کا گل نام رکھ لینے سے گل ہوتا نہیں
آہنی فولاد کی تلوار ہو یا کاٹھ کی　　غیر تب مانے گا لوہا جب کرا سے کاٹ کی

اسی زمانے کے ایک ڈرامانگار کشن چند زیبا ہیں۔ زیبا نے اپنے ڈراموں میں شاعری کے عجیب و غریب شگوفے چھوڑے ہیں۔ مثلاً

کس قدر ہے شوک یہ آگہات کتنا گھور ہے
محل کیا ٹھہرے گا جب بنیاد ہی کمزور ہے

اگر اس شعر کی گنگا جمنی زبان سے قطع نظر بھی کی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیبا صاحب نے محض مصرعۂ اولیٰ سے مصرعۂ ثانی کا وزن ملانے کے لئے محل کو بالسکون باندھ دیا ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

نرک ہے راج وہ جس میں پرجا سو رکھ ہے ان پڑھ ہے
پرجا ہی راج کی رونق ہے پرجا ہی راج کی جڑ ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر صنعتِ بے بحری میں کہا گیا ہے۔

منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی بھی ایک خاصے کامیاب ڈراما نویس گذرے ہیں۔ اگرچہ یہ کوئی اچھے شاعر نہ تھے اور کبھی کبھی مہمل بھی لکھ جاتے تھے مگر ان کے ڈراموں میں کوئی کوئی صاف شعر بھی دکھائی دے جاتا ہے۔

تیرِ نظر سے ایسا جادو چلا دیا ہے　　ظالم نے میرے دل پر سکہ بٹھا دیا ہے

منشی عباس علی بھی اردو اسٹیج کے ایک کامیاب ڈراما نویس ہوئے ہیں، شعر و شاعری کے لئے ان کی طبیعت موزوں نہ تھی لیکن چونکہ پارسی اسٹیج پر ڈراموں کو کامیابی کے لئے تھوڑی بہت شاعری ضروری سمجھی جاتی تھی اس لئے انہوں نے بھی اپنے ڈراموں میں جابجا شاعری فرمائی ہے۔ میں یہاں "شو بھتی منجری" میں سے ان کی شاعری کا ایک نمونہ پیش کرتا ہوں جس سے ان کی شاعرانہ قابلیت کا اندازہ ہوگا۔

کبھی صحرا عرب کا اور کبھی البیر یا کو سجا　　کبھی تو مہکتا پور اور کبھی تھا نینو آ کو بجا
سدا گو آج دھیمی ہے مگر وہ جوش رکھتی ہے　　اگر ہے محو بے ہوشی مگر کچھ ہوش رکھتی ہے

منشی عشرت حسین نیر نے بھی بعض ڈرامے لکھے ہیں جو مقبول ہوئے کبھی کبھی یہ کوئی اچھا شعر بھی نکال لیتے تھے۔ "نور کی پتلی" سے ان کے ایک دو شعر ملاحظہ ہوں۔

گھرے ہیں بدبختیوں کے بادل عذاب سر پر برس رہا ہے
زمیں کا ایک ایک ذرہ کمرِ عداوت پہ کس رہا ہے

نمایاں ہیں گُل خونِ شہیداں سحر کے دامن میں　　کہ گویا لگ رہی ہے آگ سی دریا کے دامن میں

منشی آرزو بدایونی "حشر اسکول" سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے اردو اور ہندی دونوں ڈرامے اسٹیج پر کامیاب ہوئے۔ "تصویرِ غم" سے اُن کے ایک دو شعر نمونتہً ملاحظہ ہوں

اماں ملتی نہیں مجھ کو کسی صورت تباہی سے　　لکھی تھی میری قسمت پھوٹنے والی سیاہی سے

ہے جستجوئے رحم امیروں کے گھر دل میں　　کرتے ہو تلاش آگ کو جگنوں کے پروں میں

ان حضرات کے علاوہ اور بھی متعدد اصحاب نے اردو میں ڈرامے لکھے اور وہ اسٹیج بھی کئے گئے مگر ان میں سے کوئی بھی اچھا شاعر نہ تھا۔

البتہ بمبئی والے شاعر مرحوم منشی محی الدین ناز آل دہلوی مرحوم اور آرزو لکھنوی کے ڈراموں میں شاعری کے کچھ اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ مولوی ظفر علی خاں نے بھی جنگ روس و جاپان کے نام سے نظم و نثر پر مشتمل ایک ڈراما لکھا ہے۔ اس میں شاعری کے کہیں کہیں بہت اچھے نمونے نظر آتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ اس ڈرامے کو اسٹیج نہیں کیا جا سکتا۔ احمد علی شوق قدوائی اور مرزا سودا لکھنوی نے بھی منظوم ڈرامے لکھے ہیں۔ مگر انہیں ڈرامے کے بجائے مثنوی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ ڈرامے بالکل اسٹیج کے کام کے نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اردو ڈراموں میں جو شاعری کی گئی ہے اس میں اصلی شاعری کے بہت کم نمونے نظر آتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اردو اسٹیج کی شاعری میں بادشاہت سے لے کر غریب سوسائٹی کے ہر طبقے کے افراد کے جذبات، احساسات اور خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے نیز مرقع اور ہر محل کی تصویر نظر آتی ہے۔

(آل انڈیا ریڈیو بمبئی)

مظفر حسین شمیم

ایک نظم

کل جواں کا الجھ گیا دامن چلتے چلتے روش پہ کانٹوں سے
مسکرا کر وہ یوں مڑے گویا اُن کے دامن کو میں نے تھاما تھا
دیکھا مجھ کو الگ تو حسرت سے
رہ گئے وہ یونہی کھڑے کے کھڑے

مسعود شاہد

برسات کی رات

گھٹا اُمڈی ہوئی ہے رات کی بھیگی جوانی ہے
دلِ محزوں کو راحت ہے نظر کو شادمانی ہے

گلی کوچوں میں خاموشی ہے اور پُر کیف خاموشی
ہے ذرّہ ذرّہ مخمورِ سکون و رہن مدہوشی

سحر کا اب تصوّر رات کے دل میں نہیں آتا
اُجالا بھول کر اس شب کے محل میں نہیں آتا

نشیلے بادلوں کی اوٹ میں روپوش ہیں تارے
ملاحت کی نگہبانی میں ہیں خوش رنگ نظارے

ملائم تیرگی قلبِ فضا میں تھرتھراتی ہے
ہوائیں رقص کرتی ہیں خموشی گنگناتی ہے

گھروں کے بند دروازے پھواروں سے کھنکتے ہیں
چمکتی ہے جو بجلی سب گلی کوچے جھلکتے ہیں

ستارے آنکھ جھپکاتے ہیں آغوشِ ملاحت میں
نظامِ برشگالی زور پر ہے بزمِ فطرت میں

گرجتا ہے جو بادل دل دہل جاتا ہے سینے میں
بس اب پانی ہی پانی ہے نگاہوں کے سفینے میں

ہوائیں گیت گاتی ہیں تو دل بے تاب ہوتا ہے
نگاہِ خواب میں ذوقِ طرب نایاب ہوتا ہے

لبِ فطرت پہ خوابیدہ جوانی کا فسانہ ہے
دلِ خرّم سے کوسوں دور رودادِ زمانہ ہے

محبت کی کہانی ہے تنفّس کی روانی میں
برستی ہے شرابِ ارغواں رِل مِل کے پانی میں

بدلتی ہیں گھٹائیں یوں قبائیں آسمانوں پر
سنہری حاشیے چڑھتے ہیں دل کی داستانوں پر

فلک پر نور کی قندیل یوں رُک رُک کے جلتی ہے
عروسِ نَو کوئی جس طرح دھیمی چال چلتی ہے

گھٹا کے پیرہن پر برق جس دم تھرتھراتی ہے
مجھے گذری ہوئی راتوں کی میٹھی یاد آتی ہے

وہ میرے غم کدے میں آج اگر بھولے سے آ جائے
تو ننھی بوندیوں سے میرے دل کا داغ دھل جائے

اختر ہوشیارپوری

واہمہ

کردار

۱۔ خداوند ۔۔۔ ۲۔ حُسن ۔۔۔ ۳۔ ہوس
۴۔ جسم ۔۔۔ ۵۔ محبت ۔۔۔ ۶۔ نفرت
۷۔ یاس ۔۔۔ ۸۔ استدلال ۔۔۔ ۹۔ اُمید
۱۰۔ خوف ۔۔۔ ۱۱۔ حرص ۔۔۔ ۱۲۔ اسرافیل (ایک فرشتہ)
۱۳۔ کروبی (ایک فرشتہ)

تاریکی کی طاقتیں

پہلی دوسری تیسری
چوتھی پانچویں چھٹی

ان کے علاوہ

لاتعداد پرندے، سانپ، مچھلیاں، چوپائے، انسان، پھول، درخت، ستارے، سورج

پہلا سین تخلیق

منظر: (تاریکی اور واہمہ — خلاء وقت کی ابدیت۔ خداوند ایک جامد ساکن طاقت کی صورت میں جلوہ افگن ہے۔ یکایک ایک حرکت سی پیدا ہوتی ہے:

ایک عظیم پیکر خلاؤں میں نمودار ہوتا ہے۔ اور فضا میں پھیل جاتا ہے۔ پیکر کے اعضا نمودار ہوتے اور غائب ہو جاتے ہیں کبھی بازو نظر آتا ہے کبھی ٹانگ۔ ابروؤں اور رخساروں کا ایک دھندلا سا نقشہ نمودار ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ وقت کی ابدیت بھی یکایک ختم ہو جاتی ہے پھر ایک واہمہ۔ روشنی مادی صورت اختیار کر لیتی ہے اور چند دن کے مینا۔ دن کی شکل میں نمودار ہوتی ہے چمکتے ہوئے سورج اور شہاب ثاقب خداوند کے سر کے گرد گردش کرنے لگتے ہیں عجیب و غریب مخلوقات نمودار ہو رہی ہے — جانور، پرندے، مچھلیاں سینگوں والی اور پردار مخلوق۔ وہ خیالات کی طرح نمودار ہوتے اور غائب ہو جاتے ہیں۔ خداوند آنکھیں بند کئے عرش معلیٰ پر متمکن ہے۔ وہ اپنے خیالی بازو پھیلا دیتا ہے اور پھر چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ چہرے کی حالت پر بار بار تغیرات ہوتے ہیں)

خداوند۔ تہ، تہ تہ: تہ تہ تہ! (نیچے کی طرف جھک جاتا ہے سر کے تھوڑے حصے کے سوا باقی کچھ نظر نہیں آتا)

حسن (ایک تخیل) (خداوند کے دماغ سے ایک پیکر خیالی نکل کر مادی صورت اختیار کرتا ہے) خداوند تم نے مجھے پیدا کیا۔ میں تمہارے تخیل کی تکمیل ہوں۔ اور تمہارے خیالی پیکر کی خوش کن تصویر — میری بھی پرستش ہوگی — ہاں پرستش! (گھومتے ہوئے اور تغیر پذیر گردن کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے ایک نورانی تبسم اس کے لبوں پر نمایاں ہے اور وہ دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے)

خداوند۔ (اپنے آپ کو مادی صورت میں ظاہر کرتے ہوئے۔ چہرے پر ایک پرہیبت مسکراہٹ۔ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ آنکھیں ظاہر ہوتی ہیں

اور حسن کو بغور دیکھتا ہے] کیا میں نے تمہیں پیدا کیا — ؟ قہ قہ قہ!
[وہ اپنے بکھرے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہے] میں تمہیں بھول نہیں سکتا!
میں تمہیں بھول نہیں سکتا۔ تم حسن ہو! [یکایک اس کی حالت تغیر پذیر ہونے لگتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک خوفناک ہیبت ظاہر ہوتی ہے جس پر کل ابدیت کا اثر ہے — آہستہ آہستہ وہ غائب ہونے لگتا ہے — ہوس ظاہر ہوتی ہے۔ ایک منحوس خیال لاٹھی ٹیکتے چلی آ رہی ہے۔ کریہ جسم۔ آنکھوں سے خوف ٹپک رہا ہے]

ہوس۔ [لاٹھی زور زور سے فرش پر مارتے ہوئے] میری اطاعت ہوگی! میری اطاعت ہوگی! خداوند تم نے مجھے اپنے غضب سے پیدا کیا۔
جنگ و جدل ہوں گے۔ جنگ — جنگ!! [وہ اکڑ اکڑ ادھر ادھر گھومتی اور گھورتی ہے]

خداوند۔ [تغیر — اطمینان چہرے پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ ہوس کو دیکھتا ہے] کیا میں نے تمہیں پیدا کیا! — اُف! میں تکان محسوس کر رہا ہوں! تکان! ۔ ۔ ۔ ۔ [وہ بازو پھیلا دیتا ہے] لیکن ٹھہرو! میں اکیلا ہوں۔ تم یہیں رہو — [وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور ارض و سما کی گہرائیوں اور بلندیوں پر چھا جاتا ہے۔

حسن۔ [سورجوں کے ہار سے کھیلتے ہوئے] میری پرستش ہوگی! میری پرستش ہوگی!

[وہ خوشی سے گنگنا تی ہے]

خداوند۔ [ایک تغیر — آنکھیں گویا دیو کا غصہ ہیں —] ابدیت!
ابدیت! قہ قہ قہ! ابدیت! یہ ایک خواب ہے ۔ ۔ ۔ ایک واہمہ
[وہ ڈگمگانے لگتا ہے۔ بڑے بڑے سانولے پروائی سے گر پڑتے ہیں۔ اُس کو زمان اور مکان کا خیال آتا ہے اور وہ دونوں حاضر ہو جاتے ہیں۔ وہ مکان و زماں میں ڈگمگاتے ہوئے پھیل جاتا ہے۔ اس کے ابرو دل سے نفرت۔ یاس۔ رحم۔ امید اور خوف ٹپک پڑتے ہیں۔ امید اور خوف کی بڑی بڑی گول آنکھیں ہیں اور دونوں کے منہ کھلے ہیں۔ یکایک فضا میں عجیب و غریب مخلوق کے بادل کے بادل نمودار ہوتے ہیں۔ خداوند کے تخیل کی مادی صورتیں۔ سورج۔ جہان — بجلیاں۔ پرندے۔ سانپ۔ مچھلیاں۔ چوپائے۔ انسان — ان گنت مخلوق، انسانی ادراک سے بالاتر۔ فضا میں ایک شور و غوغا بپا ہو جاتا ہے — اودھم۔ چیخیں اور غل غپاڑہ — انسان آگے بڑھتا ہے اور اس کے پیچھے خود اس کا تخیل ایک دھند کی صورت میں چلا آ رہا ہے۔ وہ خود صورت پیدا کرتا ہے۔ مگر خداوند کا تخیل اس کی صورتوں کو مٹا دیتا ہے۔ خداوند اپنی اس مخلوق کو دیکھ کر ہنستا ہے۔]

حسن۔ [ناچتے ہوئے] میری پرستش ہوگی! میری پرستش ہوگی!!

ہوس۔ [اس کے پیچھے بے چینی اور ڈراؤنی صورتوں کے بادل ہیں] خداوند کی قوت کی مظہر میں ہوں اور اس کی طاقت کا تخیل۔ میں اس کے غصے کی مادی تصویر۔ جد و جہد کی دیوی۔ قہ قہ قہ! [قہقہہ لگاتی ہے]
میری اطاعت کرو۔ میری ہی اطاعت — میں تباہی کا بیج بوؤں گی — ہر طرف یاس پھیلا دوں گی۔ قتل و غارت ہوں گے۔ تباہی — آگ — قہ قہ قہ! [قہقہہ]

خداوند۔ [وحشت سے — اس کے چہرے پر غضب نمودار ہوتا ہے]
قہ قہ قہ! میں تمہارا خدا ہوں۔ مالکِ کل — رب اکبر۔ میں اپنے خواب کی آپ ہی تعبیر ہوں — یہ سب میری مخلوق ہے [وہ فضا میں ہر طرف دیکھتا ہے۔ سامنے عجیب و غریب مخلوق حاضر ہے] قہ قہ قہ!
میرا آرٹ! محبت! ابد! موت! میرا خواب تمہارا خواب ہوگا۔ قسمت تقدیر اور مصیبت! میں خدا ہوں، ازل سے آخر تک۔ ابد عقل کل! قہ قہ قہ۔ [ہنستا ہے۔ ہنسی میں غصہ ہے۔ غصہ خوشی سے بدل جاتا ہے۔ ایک آہ — اور پھر ایک نہ ختم ہونے والا قہقہہ —]

رحم۔ [محبت سے] ہم خداوند کی مخلوق ہیں۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے!

محبت۔ ہرگز نہیں۔ اُس کام کے سوا جسے وہ چاہے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

رحم۔ [امید سے] کیا تم بھی ایسا نہیں کر سکتے؟

امید۔ ہرگز نہیں اُس کام کے سوا جسے وہ چاہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

نفرت۔ [یاس کے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے] آؤ ہمیں ان سے واسطہ ہی کیا ہے! ہم بھی خداوند کی مخلوق ہیں۔ بالکل ایسی ہی!

یاس۔ ہاں ہاں! ہم خداوند کے تخیل ہی کا نتیجہ ہیں۔ مگر یہ — خداوند کو ابدی نیند سو جانا چاہئے — ابدی نیند —

خداوند۔ [ڈگمگاتے ہوئے] قہ قہ قہ! قہ قہ قہ! میں خدا ہوں میں اپنا خواب آپ ہوں! میں نے اپنے عجائبات آپ پیدا کئے۔ لامحدود خوشیاں اور لامحدود خوف! قہ قہ قہ! [دیوانہ وار ڈگمگاتا ہے]

حُسن۔ خداوند میرے لئے عشق کا مندر تعمیر کیجئے — وہاں میری پوجا ہو

ہو جا!!

ہوس۔ خداوند تو نے بہت سے جہان پیدا کئے۔ ان میں فتوحات ہوں ــ بہت سے جہان ــ اور افواج کے ٹڈی دل۔ میری ان پر حکومت ہوگی ــ حکومت! قتل! آگ!

محبت۔ رب اکبر میرے لئے پھول۔ سکون اور امن۔ چند خوبصورت وادیاں جن میں روپہلی ندیاں بل کھاتی ہوئی رواں ہوں۔ چند نغمات ــ خداوند ہوس کی دعا کو قبولیت نہ بخشیو۔ اس سے دنیا کا امن تباہ ہو جائے گا۔ جنگ! آہ جنگ!!

نفرت۔ [خداوند کے روبرو آکھڑی ہوتی ہے] خداوند مجھے اپنے غضب کا ایک ذریعہ بنا دے۔ میں تیری مخلوق میں طرح طرح کے خوف پیدا کر سکوں۔ برائیاں مجھ سے نکلیں۔ مجھے بڑی بڑی بھاری زنجیریں عطا کر اور تاریک مقامات میرے قبضے میں ہوں۔ ناکامیوں اور مایوسیوں کا عذاب پیدا کر۔ عذاب! ــ اذیت!

رحم۔ اے کریم و رحیم! خوف و نفرت کو اپنی مخلوق سے دور رکھ! مجھے طاقت دے کہ میں تیرے بندوں کے دلوں میں ایک جذبہ بن کر انہیں غضب سے باز رکھ سکوں۔ نفرت کو محبت سے بدل سکوں ہوس کو تباہ کاریوں سے روک سکوں۔ خداوند میں تیری صفت رحیمی کا مظہر ہوں ــ رحیمی سے ہوں

خداوند۔ (بہکے ہوئے انداز میں) قہ قہ قہ! (ڈگمگاتا ہے)

خوف۔ خداوند مجھے اپنے سائے میں لے لے۔ رحم کی دعا قبول نہ کر۔ مجھے بھول نہ جا۔ میں خوف ہوں! خوف!!

یاس۔ خداوند تم اب آرام کیوں نہیں کرتے۔ سو کیوں نہیں جاتے ہم آخر کس لئے ہیں۔ تیرا تخیل! تیرے تخیل کی تکمیل! نیند! نیند! نیند!

خداوند۔ (ڈگمگاتے ہوئے) کون و مکان۔ وقت۔ میں نے انہیں پیدا کیا سورج، ستارے میں نے بنائے، محبت، نفرت میری مخلوق۔ امید۔ خوف میرا تخیل حسن! میں نے پیدا کیا ــ میرا پرتو! قہ قہ قہ!

[وہ ڈگمگاتا ہے اور زور زور سے قہقہہ لگاتا ہے]

حسن۔ (دہشت زدہ ہو کر) میری پرستش ہوگی! میری پرستش ہوگی!!

دوسرا سین۔ زندگی

منظر۔ بادلوں کا ایک حلقہ تمام فضا پر پھیلا ہوا۔ افق پر رنگ برنگ کا نظارہ، ایسا کہ جس سے انسانی آنکھیں ناآشنا ہیں سورج اور ستاروں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں، پس منظر میں ایک مسلسل تاریکی۔ ہر طرف ان گنت ستارے اور چاند بادلوں کے نیچے ٹمٹماتے ہیں۔ فضا میں عرش معلیٰ اپنی پوری شان و شوکت سے ایستادہ ہے۔ اس پر خداوند جلوہ افروز ہے اس کے ابروؤں سے فکر کے شعلے نکل رہے ہیں۔ وہ مادی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ اس کے سامنے مختلف جذبات اور تخلیلات ناچ رہے ہیں۔ یعنی حسن، محبت، رحم، امید اور شعور۔ رنگین سائے۔ آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے پیچھے انسانوں، حیوانوں اور عجیب و غریب مخلوقات کا ایک جم غفیر ہے۔ عرش کے اوپر دو فرشتے ایک دائیں اور ایک بائیں۔ نور کی کرنیں پھینک رہے ہیں۔ پس منظر میں ہوس نمودار ہوتی ہے۔ اس کے گرد نفرت، خوف، لالچ اور یاس کھڑے ہیں۔ ان کے پیچھے تاریکیاں، بادل، بجلیاں اور خداوند کی وہ مخلوق ہے۔ جن کے ذریعے وہ اپنے قہر کا اظہار کرتا ہے]

اسرافیل اور کروبی۔ (اپنے پروں کو ہلا ہلا کر پنکھا کر رہے ہیں) قابل ستائش ہے تو اے خالق اکبر اے مالک ارض و سما! تو اب تخیلی حالت سے بیدار ہو جا۔ تیری حقیقت قابل تعریف ہے اے ذوالجلال!

حسن۔ [ایک نورانی کرسی پر متمکن ہے۔ اور عرش معلیٰ سے بالکل قریب] خداوند کیا میں تیرا حسن نہیں! تیرا حسن اور تیرا پرتو۔ تیرا سب سے پہلا خیال۔ ازل سے ابد تک رہنے والا۔ تیرا ایک ادنیٰ سا اشارہ تیری مخلوق کو میری پرستش پر آمادہ کر دے گا۔ تیرا ارادہ انہیں حسن کو سب سے زیادہ عزیز رکھنے پر مجبور کرے گا۔

خداوند۔ (اسے دیکھتے ہوئے) میرا حسین خیال ــ خوش کن تخیل۔

ہوس۔ [ایک بھاری زرہ بکتر پہنے ہوئے گویا ایک ہیبت ناک دیو معلوم ہو رہا ہے۔ اپنے آپ سے] ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ انتظار! وہ اب ہماری طرف متوجہ نہیں۔ اس کے خیالات کا رخ دوسری طرف ہے۔ دوسری طرف حسن، امید اور امن ــ کمزوریاں۔ خداوند تیری چند کمزوریاں ــ یہ دو فرشتے بعض بڑ ہانکنے والے۔ تیری بے جا تعریف کرنے والے۔ اس وقت حسن کا دور ہے۔

امید، شعور اور رحم اس کے قدموں میں پڑے ہیں۔ اس کی مخلوق —— بے وقوف مخلوق والہانہ حسن کی طرف بڑھ رہی ہے۔

خداوند۔ [شانِ کبریائی سے چاروں طرف نگاہ دوڑاتا ہے۔ اور حسن سے مخاطب ہوتا ہے] تو اب تو خوش ہوگا۔ میں نے تیرے لئے سب کچھ پیدا کیا۔ خواب! خواب! پرلطف اور پرسکون خواب —— تخیل کی بلندیاں جنون افزا —— حسن اور جنون —— میں خود حسن ہوں اور خود ہی جنون ——

حسن۔ خدائے لایزال —— میں تیرا ہی پرتوِ اولیں ہوں۔ خالقِ ارض و سما تو ادراک سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی حسین ہے تو جمیل ہے۔ تیرا جنون کتنا فرزانہ ہے اور میں —— تیرا پرتو —— جمیل —— حسین، خداوند تیری نیند ارض و سما کو تباہ کر دے گی۔ تیری پرستش ہوتی ہے —— میری بھی پرستش ہو گی!

خداوند۔ اے میرے کن کی تفسیر میرا جنون کتنا پرلطف ہے۔ تیرے لئے زمان و مکان کی قید نہیں تو میری کائنات کا ایک حسین خواب ہے۔ جس کی انتہا نہیں۔ مگر میرا جنون —— کیا وہ ایک محدود دریغ نہیں؟

حسن۔ [بے پروائی سے] خداوند ایسا خیال نہ کر۔ تیرا جنون ایک خواب —— حسین خواب۔

خداوند۔ [فلسفیانہ لہجے میں] میں کیا ہوں؟ تم کیا ہو؟ یہ کیا ہیں؟ [وہ اپنا دراز ہاتھ ہلاتا ہے] میری کن کا نتیجہ! میرا مسلسل خواب —— اسے تم شیریں خواب کہتے ہو! تو تم نے شیریں خواب —— میں نے تخلیق کی کنجی گم کر دی ہے۔ گم کر دی ہے! [وہ زور زور سے ہنستا ہے مگر اس کی ہنسی سے ایک افسوس نمایاں ہے]

ہوس۔ [پس منظر میں گنگناتی ہے] کنجی گم کر دی —— کنجی گم کر دی ——

حسن۔ خداوند ایک حسین خواب! تیرا اور حسین —— خداوند اب نہ سو! کائنات کا نظارہ کتنا دلفریب ہے۔ [مسکراتا ہے]

ہوس۔ [بے چینی سے] خداوند کا خواب بھی کیا ہے! ہم خواہ مخواہ غم سے نڈھال ہو رہے ہیں [وہ اپنا زرہ بکتر آہستہ آہستہ ہلاتی ہے]

رحم۔ خداوند تیری عنایات بے پایاں ہیں۔ اور تیرا کرم بے حساب —— اپنی مخلوق پر اپنی رحمت نازل فرما۔ تیرے قہر سے تیری رحمت زیادہ ——

تاریکی کی قوتیں [یک زبان ہو کر] اے امید! —— اے محبت! —— اور اے رحم! تم سب دور ہو جاؤ۔

حسن۔ [اکڑا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ابروؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے] خداوند میں تیری سب سے پہلی تخلیق ہوں۔ یہ سب میرے بعد پیدا ہوئے [امید، رحم اور شعور کی طرف اشارہ کرتا ہے] میں تیرے تخیل کا پہلا شاہکار ہوں۔ تیرے حسن کا پرتو —— خداوند مجھے بھول نہ جانا۔ ہوس اور نفرت —— تیری مخلوق کو تباہ کر دیں گے اور مجھے بھی —— مجھے بھی! [مسکراتا ہے]

تاریکی کی قوتیں۔ [کڑک کر] حسن —— حسن کی حقیقت ہی کیا ہے۔ خداوند تو ہر بات پر قادر ہے۔ ہر چیز فانی ہے،

خداوند۔ حسن، حسن، آخر ہر چیز کو فنا ہو گی۔ تیری آنکھیں —— ان کی مستی —— حسن اور جنون۔ سب فانی۔

ہوس۔ [غصے سے] خداوند اونگھتا ہے اور مجھے بھول گیا ہے۔ میں اس کی تقدیر۔ اس کی قوت اس کا قہر اور اس کی جبروت۔ حسن اس کا منظورِ نظر گرمیں —— مجھے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کا غضب ابھی خوابیدہ ہے —— اس کا قہر کب بیدار ہوگا۔ خداوند میری طرف دیکھ —— میں تیری طاقت کی مظہر ہوں، اے نفرت! اے غصے! یاس اور خوف! ادھر آؤ، ادھر آؤ اور میرے پاس بیٹھو

خوف۔ اے خداوند میں تیری مدد مانگتا ہوں۔

حسن۔ [ہوس سے غصے میں] وہ تیرا خیال کرے۔ جس کا نتیجہ! تباہی۔ بربادی۔ طوفان۔ قتل و غارت، کیا یہی ہے تیری طاقت کا انجام میں —— حسن۔ نور اور نغمے میرے فرشتے، مگر تیرا صرف ایک تاریک سایہ، موت اور تباہی —— خداوند! اسے اپنی مخلوق سے دور رکھ۔ یہ تیرے چمن زار کو جلا کر خاک کر دے گی تباہ کر دے گی، تاریکی —— تاریکی کا سایہ . . . .

ہوس۔ [غصے سے] خداوند کیا میں تیری طاقتوں کی مظہر نہیں ہوں؟ کیا قہر، جبروت، قوت، موت یہ سب تیری صفات نہیں؟ اور میں —— اور میں ان کو حرکت میں لانے والی! ——

حسن۔ مگر میں —— محبت اور پیار کا مکمل پیکر، تیرا نور، راحت اور نغمات میری ہر سانس سے پھوٹے پڑتے ہیں ——

نفرت۔ خوف۔ حرص۔ یاس [مل کر] خداوند ہم سب بھی تجھ سے ہی ہیں۔

محبت۔ رحم۔ امید۔ شعور۔ [مل کر] اے رحیم و کریم ہم بھی تجھی سے ہیں۔

دو فرشتے۔ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ سب تعریف تیرے لئے ہے۔

ہوس۔ (غصے سے) دور ہو جاؤ ۔۔۔ خداوندا! ۔۔۔

خداوند۔ (حسن سے) ٹھہر تو میرا جمال ہے۔ ایک ابدی لوزاں اور شیریں خواب ۔۔۔ جہاں تو ہو گا وہاں میرا قہر نہیں جائے گا۔ میری تخلیق کی روح! میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ حسن! اے حسن! آ بچہ

(اس کے رخساروں کو تھپکاتا ہے)

پہلا فرشتہ۔ حسن کی دنیا پر حکمرانی ہو گی!

دوسرا فرشتہ۔ اور دنیا نغمات سے بھر جائے گی۔

ہوس۔ (تاریکی میں ایک کانپتا ہوا سایہ) حسن! حسن! مجھے خداوند بھول گیا۔ ابدیت کا درد دور ہو رہا ہے۔ موت کی گویا ضرورت ہی نہیں رہی ۔۔۔

(سایہ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتا ہے۔ ہستی نیستی کا جامہ پہن لیتی ہے۔ فرشتے بازو ہلاتے ہوئے غائب ہو رہے ہیں)

تیسرا سین۔ موت

منظر۔ ایک بہت بڑا ایوان، جس کی وسعت انسانی تخیل سے بھی بالاتر ہے۔ غضب اور قہر کی فوجیں صف بستہ کھڑی ہیں۔ بڑے بڑے اژدہے لاکھوں کی تعداد میں فرش پر رینگتے نظر آتے ہیں۔ زخمی اور مجروح لوگ زمین پر تڑپ رہے ہیں۔ خوفناک درندے منہ کھولے کھڑے ہیں۔ ایک نہایت ہیبت ناک نظارہ ۔۔۔ فضا میں ایک آتشیں تخت لٹک رہا ہے جس پر خداوند جلوہ افروز ہے۔ تخت کے چاروں طرف عجیب و غریب پرہیبت مخلوق ہوا میں اڑ رہی ہے۔ تخت کے پایوں سے زہریلے ناگ چمٹے ہوئے ہیں۔ یاس اور حرص ادھر ادھر بھاگے پھر رہے ہیں۔ حسن، شعور، رحم، امید اور محبت ایک زرد سایہ بنے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں۔

ہوس اپنی لاتعداد افواج کے ساتھ تخت کے سامنے کھڑی تباہی کا ناقوس بجا رہی ہے]

خداوند۔ اوہو ہو ہو! اوہو ہو ہو! موت! موت! اے موت! آ کہ اب میری تخلیق کی معراج، اپنا نذرانہ پیش کر۔ مُردوں کے انبار اور تڑپتے ہوئے لاشے۔ میرا غضب جوش میں آ جائے۔ لاؤ لاؤ بے بسی کے تلخ سانسوں، سسکیوں کے انجام۔ تباہیوں کا اثر۔ عذاب کے نظارے۔ اور قتل کے ثمرات۔ جاؤ۔ نفرت۔ غصہ۔ یاس اور خوف کو ساتھ لیتے جاؤ۔ زمانے میں برائی کو پھیلا دو۔ خوب پھیلا دو۔ کوئی جگہ خالی نہ رہے (تڑپتے ہوئے لاشے دیکھ کر) ان کو اور عذاب دو تاکہ خوب تڑپیں۔ میرا عذاب عام کر دو ۔۔۔

(خداوند کے الفاظ کے ساتھ تاریکی کی چھ طاقتیں نمودار ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ تاریکیوں کا ایک بے پناہ لشکر ہے]

حسن۔ (تاسف کی دھیمی آواز سے) خداوند مجھے بھول گیا (کوئی جواب نہیں ملتا)

محبت۔ (کمزور آواز سے) اور مجھے بھی خداوند ۔۔۔ (کوئی جواب نہیں ملتا)

امید۔ (نرم لہجے میں) خداوندا میں؟ ۔۔۔ (کوئی جواب نہیں)

رحم۔ اور میں ۔۔۔ (بالکل کوئی جواب نہیں)

ہوس۔ (تاریک بادل میں سے تاریکی کی چھ طاقتیں نمودار ہو رہی ہیں)۔ تم بھی ان کے ساتھ مل جاؤ۔ اور خداوند کے حکم کی تعمیل ہو۔

پہلی طاقت۔ (ہزار سر اور بے شمار بازو والی بجلی سے تیز تر) جلاد ہوا قتل۔

دوسری طاقت۔ (یہ طاقت بھی اسی طرح ہزار سر اور بے شمار بازو والی، بجلی سے تیز تر) ارشاد! عذاب ۔۔۔

تیسری طاقت۔ (یہ بھی ویسی ہی طاقت ہے) ارشاد! تباہی۔ بربادی۔ اور ناکامی!

چوتھی طاقت۔ (اور یہ بھی ویسی ہی ہے) ارشاد! جہاں امن ہو گا۔ میں وہاں رنج و غم لے کر پہنچوں گا۔

پانچویں طاقت (یہ بھی ویسی ہی ہے) ارشاد! خوشی کو مٹانا میرا کام ہو گا۔

چھٹی طاقت۔ (اور یہ بھی ویسی ہی) ارشاد کی تعمیل ہو گی! سکون اور محبت دنیا میں سے مفقود ہو جائیں گے

(تاریکی کی طاقتیں پھیل جاتی ہیں)

خداوند۔ پھیل جاؤ! تباہی بن کر! موت بن کر! میرے حضور پیش کرو۔ بربادی آنسو۔ بڑے بڑے آنسو۔ بے کسوں کی آنکھوں سے نکلے ہوئے یتیموں کے آنسو۔ جن میں جگر کے ٹکڑے ملے ہوں۔ خواب کو مٹا دو تخیل کی دنیا برباد کر دو ۔۔۔ تباہی! تباہی! ہر طرف غضب، موت رنج اور درد ہو۔ زندگی کو ایک مصیبت بنا دو ۔۔۔ میرا قہر ہی قہر دنیا پر چھا جائے۔ جاؤ ۔۔۔ جاؤ ۔۔۔ (غضبناک ہو جاتا ہے)

ہوس (تاریکیوں کے بادلوں سے) خدا کے احکامات کی تعمیل ہو! رحم اور امن کا زمانہ ہو چکا۔ اب بربادی ہوگی۔ سورج کو جلا کر راکھ کر دو۔ خون اور گوشت میں فساد پیدا کر دو۔ ہستی کو نیستی بنا دو۔ بربادی! بربادی! بڑھو۔ بڑھو!

تاریکی کی افواج (جھکتے ہوئے) جو ارشاد ہو!

خداوند (بے قرار ہو کر) میرے دائیں والو! میرے بائیں والو! پروالو! اور نیچے والو! پھیل جاؤ! پھیل جاؤ ہر طرف۔ تباہ کر دو۔ وقت کا احساس ہی نہ رہے۔ کون و مکان کا نشان مٹ جائے۔ ہر چیز کو مٹا دو —— مٹا دو!

ایک فرشتہ (زرد کرنوں میں تحلیل ہوتے ہوئے) اے خالق اکبر! اے مالک ارض و سما! کیا ہمیں تو نے پیدا نہیں کیا ——؟ ہم بھی ہیں —— اور تو —— (غائب ہو جاتا ہے)

حُسن (دکھڑا ہو کر خوابیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے) خداوند تیرا رحم کیا ہوا! تیرا انوار کیوں مدھم ہو گیا! تیرے چمکتے ہوئے سورج اور ٹمٹماتے ہوئے ستارے، تیرے لہراتے ہوئے کھیت اور مہکتے ہوئے گلستان وہ سب کیا ہوئے! موت۔ ہر طرف موت! میرے لئے بھی موت! میں خداوند کا پرتو —— اس کے تخیل کا شاہکار —— (ناامیدی کے لہجے میں) اچھا رخصت! (ہوس سے) کیا تم سمجھتی ہو کہ ہماری موت کے بعد تم زندہ رہو گی۔ ہرگز نہیں۔ میری موت تمہیں خود بخود مٹا دے گی۔ تم یقیناً مٹ جاؤ گی۔ خداوند ہی کو بقا ہے۔ تاریکی کے بعد ایک بار پھر اُجالا ہوگا۔ موت پیش خیمہ ہے۔ آنے والی ابدی زندگی کا —— سوچو! سوچو! برائی کو قرار نہیں —— وہی نعمات ہوں گے اور زندگی —— بلکہ اس سے بڑھ کر ——

ہوس (گستاخ لہجے میں) ہوگا! ایسا ہی ہوگا! تیرا سحر ٹوٹ چکا! اور طلسم باطل ہو گیا۔ اب قتل و غارت۔ موت و عذاب کا دور دورہ ہے۔ اب میں —— جو چاہوں وہی ہوگا —— میں خداوند کے قہر کی نظم ——

رحم (حسن کے قریب جا کر) خداوند کو کیا ہو گیا! میں بھی گھل گھل کر مر رہا ہوں۔ اب کیا ہوگا! امن کہاں گیا؟ دل پتھر ہو گئے ہیں۔ اب پسیجتے ہی نہیں۔

ہوس دور ہو! اب تمہیں کوئی نہیں پوچھتا! (رحم سایہ بن کر غائب ہو رہا ہے)

محبت (ایک زرد سایہ) وہ تمام خیالات جو خوشی کا باعث بنتے تھے، وہ اب کہاں گئے!

ہوس کم بخت دور ہو جاؤ! اب تمہاری ضرورت نہیں (ایک نقطہ بن کر رہ جاتا ہے)

شعور اور میں، عقل کل کا ایک ادنیٰ کرشمہ!؟

ہوس جاؤ! جاؤ۔

امید مگر میں تو مصیبت زدوں کو چھوڑ نہیں سکتی۔

ہوس دفع ہو جاؤ۔ خداوند کے قہر کو روکنے والی تو کون! (امید ایک زرد سا شعلہ بن کر رہ جاتی ہے)

حسن (مغرورانہ) میں خداوند کا پہلا پرتو ہوں۔ اے ہوس! تیرا یہ غصہ عارضی ہے۔ تیری بُرائی آخر مٹ جائے گی۔ تجھے بھی آخر فنا ہوگی۔ مگر میں —— میں ہمیشہ سے ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ حُسن، خدا کا جمال، اُس کا شاہکار! میں اس میں سے ہوں اور وہ مجھ میں ہے۔ آخر میری ہی پرستش ہوگی۔ پرستش!

خداوند زندگی کو ختم کر دو۔ فکر کو مٹا دو۔ حسن۔ امید اور نظام کو درہم برہم کر دو —— زندگی کا انجام یہی ہوگا —— بیماری —— موت، موت! آگ، بربادی۔ عذاب —— زندگی کا انجام۔

شعور خداوند کیا ہمارا انجام یہی ہوگا۔ میں جو تیرا نظام تھا، درہم برہم کر دیا جاؤں گا! میں تیری قوت تھا۔ اب کہ وہی کا جامہ پہن لوں گا! اب مجھے نیستی کی نیند سونا ہوگا! (وہ خداوند کے ابروؤں میں جا کر غائب ہو جاتا ہے)

محبت میں اس کی خوشی کے فکر کا نتیجہ تھی۔ مجھے بھی فنا کے گھاٹ اترنا ہوگا۔

(خداوند کے ابروؤں میں جا کر غائب ہو جاتی ہے)

امید خداوند میری صفت محبت اور امن کا محافظ —— (غائب ہو جاتا ہے)

حُسن (زرد رو) میرا فنا عارضی ہوگا۔ عارضی —— میری پرستش ہو کر رہے گی (خداوند کے ابروؤں میں بغیر تحلیل ہوئے داخل ہو جاتا ہے)

تاریکی کی پہلی طاقت (داخل ہوتی ہے) خداوند میرا کام مکمل ہو چکا ہے۔ جو کچھ تیرے دائیں ہاتھ کی طرف تھا، سب مٹا دیا گیا۔

خداوند خوب!

دوسری طاقت (داخل ہو کر) خداوند تیرے بائیں ہاتھ کی طرف جو کچھ تھا تباہ کر دیا گیا۔

خداوند خوب!

تیسری طاقت (داخل ہوتی ہے) خداوند جو کچھ تیرے آگے تھا وہ مٹ چکا ہے۔

خداوند۔ خوب۔

چوتھی طاقت۔ (داخل ہوتی ہے) خداوند جو کچھ تیرے پیچھے تھا۔ اُسے گہری نیند سلا دیا گیا۔

خداوند۔ خوب!

پانچویں طاقت۔ (داخل ہوکر) خداوند! جو کچھ تیرے اوپر تھا۔ اسے برباد کر دیا گیا۔

خداوند۔ خوب۔

چھٹی طاقت۔ (داخل ہوکر) خداوند۔ جو کچھ تیرے نیچے تھا وہ ختم ہو چکا ہے

خداوند۔ خوب!

ہوس۔ خداوند! قہر و جبروت کے مالک تیرے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے!

خداوند۔ او ہو ہو ہو! او ہو ہو ہو! میرا خواب! میرے قہر کا کمال! انجام!

اب پھر ابتدا ہوگی! ابتدا! امن!!

[یکایک حالت متغیر ہونے لگتی ہے۔ گویا درماندگی محسوس کر رہا ہے۔ تخت پر اس کا کچھ حصہ نظر آتا ہے]

پہلی طاقت۔ (خداوند کے دماغ میں غائب ہوتے ہوئے) اب میرا بھی خیال نہیں رہا خداوند آپ کو! (غائب ہو جاتی ہے)

ہوس۔ (افسوسناک لہجے میں) اب انجام آن پہنچا!

دوسری طاقت۔ (خداوند کے دماغ میں غائب ہوتے ہوئے) خداوند! اور میں ——— (غائب ہو جاتی ہے)

ہوس۔ (افسوسناک لہجے میں) انجام! حسرت ناک!

تیسری طاقت۔ (خداوند کے دماغ میں غائب ہوتے ہوئے) خداوند! (غائب ہو جاتی ہے)

ہوس۔ انجام!

چوتھی طاقت۔ (غائب ہوتے ہوئے) خداوند! (چلاتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے)

پانچویں طاقت۔ یہ کیوں خداوند؟ (غائب ہو جاتا ہے)

ہوس۔ افسوس!

چھٹی طاقت۔ مجھے بھی بھول گئے خداوند! (غائب ہو جاتی ہے)

ہوس۔ آہ! افسوس!

خداوند۔ (آہستہ آہستہ حسن کے خد و خال ظاہر ہوتے ہیں۔ چہرہ اور ابرو نمایاں ہیں) امن! امن! میرا قہر ختم ہوا۔ ختم! میرا شیریں خواب!

او ہو ہو ہو! (ایک آہ بھرتا ہے۔ درندے۔ اژدہے اور عجیب مخلوق سب غائب ہو رہی ہے۔ ہوس پر زردی اور مایوسی چھا گئی ہے۔ وہ مجسمۂ حیرت بنی خداوند کے روبرو کھڑی ہے)

ہوس۔ خداوند! یہ کیا۔ مجھے بھی تو نے بھلا دیا! ——— مجھے بھی؟ (غائب ہو جاتی ہے)

حُسن۔ (ایک ننھا سا ستارہ خداوند کے ابرو میں ٹمٹماتا ہوا) خداوند مجھے بھی بھول گیا ہے تو؟ میں تیری پہلی تخلیق ہوں۔ تیرا پرتو۔ میں تجھی سے ہوں!

خداوند۔ امن! امن! تو مجھ سے ہے۔ اس لئے مجھ میں ہی رہ (وہ آہ بھرتا ہے اور آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتا ہے)

حُسن۔ (خداوند کی نیند میں غائب ہوتے ہوئے) میری پرستش ہوگی۔ میری پرستش ہوگی۔ (مسکراتا ہے)

[خیالی فضا کی جگہ حقیقت لے لیتی ہے۔ سورج اور ستارے غروب ہو جاتے ہیں۔ زمان و مکان کی تمیز مٹ جاتی ہے]

(تھیوڈور ڈریزر)

شیر محمد اختر



باجلاس عالیجناب سید تفضل حسین شاہ صاحب منصف درجہ اول

چشتیاں ضلع بہاول پور

لالہ سنسار چند و نند لعل پسران البسر داس کھتری سکنہ چشتیاں منڈی مدعیان	بنام	غلام احمد اور برکت علی راجپوت سکنہ چک نمبر ۱۴ نہر ... تحصیل چشتیاں حال بمقام محالول تحصیل نواں شہر ضلع امرتسر مدعا علیہ

دعویٰ مبلغ ۲/۶/ ... مالعہ

اندریں مقدمہ سمن امور تنقیح اسمی غلام احمد مدعا علیہ بصیغہ رجسٹری بھجوایا گیا تھا۔ مگر ان کی واپسی رسید آ چکی ہے کہ وہ محنت مزدوری کے لئے چلا گیا ہے۔ لاپتہ ہے۔ لہذا اشتہار جاری کیا جاتا ہے کہ مدعا علیہ اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت ہذا بکم اکتوبر ۱۹۴۶ء ہو کر جوابدہی مقدمہ کرے۔ ورنہ اس کے خلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جائے گی۔

آج میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۶ء

دستخط منصف

مہر عدالت

فتح

مسافر

نعرے لگا رہے ہو کیوں؟ رقص میں آ رہے ہو کیوں؟
گلی کے چراغ بے شمار آج جلا رہے ہو کیوں؟

سپاہی

ہم پہ خدا کا ہے کرم،
دشمنوں کی فوج کا کوئی جواں نہیں رہا
دشمنوں کے اوج کا نام و نشاں نہیں رہا
جتنے تھے سر اُڑا دیئے جتنے تھے گھر جلا دئے
جشن منا رہے ہیں ہم!

مسافر

تم نے جنہیں مٹا دیا، تم انہیں جانتے تھے کیا؟
کون تھے اُن کے باپ ماں؟ کون تھا اُن کا خانداں؟

سپاہی

یہ تو ہمیں پتہ نہیں، پہلے نہ تھے ملے کہیں،
ہم سے نہ رسم و راہ تھی دیکھی نہیں تھی شکل بھی

مسافر

کاٹ دیں جن کی گردنیں اُن سے تھا بَیر کیا تمہیں؟
تم کو بُرا کہا تھا کچھ؟ رنج تمہیں دیا تھا کچھ؟

سپاہی

ایسی نہ بات تھی کوئی ایسا نہیں ہوا کبھی۔

مسافر

دشمنی نہ رنج تھا پھر انہیں کیوں مٹا دیا؟

سپاہی

پھر انہیں کیوں مٹا دیا؟ اس کا نہیں ہمیں پتا۔
ہم نے کیا جو حکم تھا

مسافر

اب وہ جواں نہیں رہے اب وہ جہاں نہیں رہا
شہر و دیار مٹ گئے نام و نشاں نہیں رہا
جشن منا رہے ہیں ہم!
آہ! یہ زندگی ہے کیا؟ آہ! یہ آدمی ہے کیا؟!

روشن دین تنویر

سیّد صاحب

پچھلے منگل کا ذکر ہے کہ ادھر اسکول کا گھنٹہ بجا اور کام شروع ہوا اور ادھر ایک لڑکے کے یکایک مر جانے کی خبر موصول ہوئی۔ اظہار غم کے طور پر اسکول فوراً بند کر دیا گیا۔ استاد اور لڑکے شاداں و فرحاں کلاسوں سے نکل پڑے۔ چھٹی تو سبھی کو بھاتی ہے نا۔ اور پھر نا جیب تو ہوتا ہی رہتا ہے لیکن غیر متوقع تعطیل کا لطف روز روز میسر نہیں آتا۔ آن کی آن میں بھرا اسکول خالی ہو گیا۔ دو چار استادوں کے سوا کوئی بھی نہ رہا۔

میں نے سوچا کہ گھر جانے سے پہلے کچھ نہیں تو تازہ اخبارات پر ہی ایک نظر ڈال لوں۔ چنانچہ دو تین روزنامے اکٹھے کئے اور اس خیال سے کہ ان سب کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں دیکھ لوں گا، سٹاف روم کی طرف چلا۔

وہاں اسکول کے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر، سید افتخار الدین صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ جس طرح ایک فارغ البال گھرانے کی سگھڑ بی بی اپنا صاف ستھرا پاندان ایک پُر تکلف انداز سے اپنے سامنے رکھے بیٹھی رہتی ہے۔ اسی طرح ہمارے سید صاحب بھی فرصت کے اوقات میں اپنے پانوں کی ڈبیا لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک پان کھاتے ہیں، اور اس درمیانی وقفے میں ڈبیا ان کے سامنے کھلی رکھی رہتی ہے جس میں سے کبھی چھالیا کے دانے نکال کر منہ میں ڈال لیتے ہیں، کبھی دہی، کبھی لونگ اور کبھی انگلی کو چونے میں بھر کر زبان پر چپک لیتے ہیں۔ اس وقت بھی پان کی ڈبیا ان کے سامنے موجود تھی۔

"پان حاضر ہے ماسٹر صاحب!" انہوں نے یہ جانتے ہوئے کہ میں پان نہیں کھاتا مجھ سے کہا۔

میں نے رسمی بات کا جواب رسمی انداز میں دیا ۔۔۔ "شکریہ!"

مگر سید صاحب کی طبیعت میں ایک شگفتگی تھی۔ غالباً غیر متوقع تعطیل کا اثر تھا۔

"ارے میاں! پان کھاؤ اور کوئی کام کی بات کرو۔ یہ کیا تم ہر وقت اخبار کے پیچھے پڑے رہتے ہو"، انھوں نے چھت کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔ ان کا منہ چھلکتے ہوئے ارغوانی ساغر کی طرح پیک سے لبریز تھا۔

ابھی میں کچھ جواب نہ دینے پایا تھا کہ وہ کرسی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر گئے۔ پیک تھوکنے کے لئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سید صاحب اخبار نہیں پڑھنے دیں گے اور میں نے پرچوں کو تہہ کر کے رکھ دیا۔

سید صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اور ڈبیا سے ایک نیا پان نکالتے ہوئے کہا: "آپ اخبار اس کثرت سے کیوں پڑھتے ہیں؟"

"کثرت سے تو نہیں پڑھتا، البتہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اماں کوئی اعلیٰ قسم کا لٹریچر پڑھا کرو۔ اس خرافات میں کیا رکھا ہے؟"

"ہاں اعلیٰ لٹریچر سے بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ایک وہ مولوی وحید الدین ہیں۔ جب دیکھو اخبار پڑھ رہے ہیں جب دیکھو اخبار پڑھ رہے ہیں۔ انقلاب اور زمیندار کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔"

"یہ تو واقعی غلط ہے کہ انسان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ارے بابا یہ تو سوچو کہ اخباروں میں ہوتا ہی کیا ہے ۔ ۔ ۔"

اب مجھے یقین ہو گیا کہ سید صاحب میری نہیں سنیں گے، اپنی ہی کہے جائیں گے۔ میں بالکل خاموش ہو گیا تاکہ یہ جی بھر کے بول لیں۔ چنانچہ انہوں نے یہی گوہر افشانی کا سلسلہ جاری رکھا۔

"یہاں چوری ہو گئی، وہاں ڈاکہ پڑ گیا۔ اس کی عورت بھاگ گئی، اس کے گھر میں آگ لگ گئی۔ ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ بھنگیوں نے ہڑتال کر دی۔ آخر کیا غرض مجھے اور آپ کو ان لغویات سے! میاں اس دنیا میں ہزاروں باتیں ہوتی ہیں۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ ہم ان سب باتوں سے واقف رہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

میں اب خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ سید صاحب کے تشدد کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنا عدم تشدد ختم کرنا ہی پڑا۔ میں نے کہا،

"جناب سید صاحب! میں صبح کے اخبار کو اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جتنا صبح کے ناشتے کو۔ جو شخص اخبار نہیں پڑھتا میرے نزدیک وہ اس دنیا میں نہیں رہتا بلکہ ۔ ۔ ۔ ۔"

سید صاحب نے پھر میری بات کاٹ دی" ارے میاں ماسٹر صاحب! رہنے دو اس فلسفے کو۔ اب کیا میں اس دنیا میں نہیں رہتا؟ آسمان پر رہتا ہوں! لیکن جناب میں نے اپنی زندگی میں کبھی اخبار نہیں پڑھا!"

سید صاحب چھت کی طرف مُنہ اٹھا کر زور سے ہنسے۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولے "آپ مذاق نہ سمجھئے گا ماسٹر صاحب! میں واقعی بالکل اخبار نہیں پڑھتا!"

میں سید صاحب کی اس محرومی پر ہمدردی کا اظہار کرنے والا تھا کہ مجھے چند سال پیشتر کی ایک بات یاد آگئی۔

مجھے اس اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے آئے ہوئے تقریباً چھ مہینے ہوئے ہیں لیکن میرا تعلق اس جگہ سے بہت پرانا ہے کیونکہ میں طالب علم کی حیثیت سے بھی کچھ وقت یہاں گزار چکا ہوں۔ تقریباً آٹھ سال پہلے میں اس اسکول کی آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تھا۔ سال بھر یہاں رہا۔ پھر میرے والد علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اور میری بقیہ تعلیم وہیں ہوئی۔ اب خوش قسمتی سے اسی اسکول میں ٹیچر ہو کر آیا ہوں۔ آٹھ سال کے اندر اسکول کچھ سے کچھ ہو گیا۔ نئی عمارت بن گئی، بورڈنگ ہاؤس قائم ہو گیا، لڑکوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی نئے آ گئے۔ اور بیسیوں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہو گئیں۔ لیکن ایک چیز بدستور قائم ہے۔ استاد اگرچہ نئے بھی آئے ہیں مگر جو اُس وقت تھے وہ سب کے سب موجود ہیں اور جیسے پہلے تھے بالکل ویسے ہی اب بھی ہیں۔ یہ میری زندگی کا ایک نہایت بصیرت افروز تجربہ ہے کہ وہ لوگ جو کبھی میرے استاد تھے اب میرے ہم چشم اور ہم مشرب ہیں۔ جن لوگوں کو میں کبھی دور سے دیکھتا تھا اور اُن کی عزت کرتا تھا اب ان کو قریب سے دیکھتا ہوں اور نفرت کرتا ہوں۔ پہلے یہ لوگ میری نظروں میں علم و فضل اور بصیرت اور فطانت کے مجسمے تھے۔ اب جہالت، تعصب اور کم نظری کے بدترین نمونے ہیں۔ سید صاحب ہی کو لیجئے۔ اس وقت بھی سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے، اور سید صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کا پورا نام میں کیا اکثر لڑکے نہیں جانتے تھے۔ ہم ان کو ایک بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ ہمارے نوخیز طفلانہ ذہنوں پر یہ ایک باعظمت انسان کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ کچھ تو اس لئے کہ اِن کی قابلیت کی بڑی دھوم تھی، اور کچھ اس لئے کہ یہ ہمیں نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ اِن کا فیض صرف اونچی جماعتوں تک محدود تھا۔ میں اپنے بگھی تانگے میں بیٹھ کر اسکول آیا کرتا تھا، کیونکہ گھر اسکول سے بہت دور تھا۔ میرے والد ایک سخت گیر اور ضابطہ پسند طبیعت کے آدمی تھے۔ تانگے والا اُن کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ وہ مجھے ہمیشہ وقت سے کچھ پہلے ہی اسکول پہنچا دیتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو میں اسکول شروع ہونے سے آدھ آدھ گھنٹہ پیشتر پہنچ جاتا تھا۔ گو میں پندرہ منٹ پیشتر پہنچوں یا آدھ گھنٹہ پیشتر، سید صاحب کو ہمیشہ اسکول میں موجود پاتا تھا۔ اور دفتر کے سامنے چبوترے پر ایک کرسی ڈالے بیٹھے ہوئے۔ ایک جہازی سائز کا کھلا ہوا اخبار اُن کے ہاتھوں میں ہوتا اور وہ اُس کے مطالعے میں منہمک نظر آتے۔ صدر دروازے میں داخل ہونے کے بعد جس طرح دو نیم کے درخت ایک لالٹین کا کھمبا، ایک کنواں اور اسی قسم کی چند چیزیں لازمی طور پر نظر آتی تھیں، اُسی طرح سید صاحب مع اپنے اخبار کے لازمی طور پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اُن کو روزانہ اس طرح مصروفِ مطالعہ دیکھتے دیکھتے میرے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ سید صاحب ایک بے حد قابل آدمی ہیں۔ اُن کی عظمت اور فضیلت میرے دل پر نقش ہو گئی تھی۔

چنانچہ اب جو انہوں نے یہ کہا کہ میں کبھی اخبار نہیں پڑھتا تو فوراً مجھے وہ آٹھ سال پہلے کی بات یاد آگئی اور میں نے اُن سے کہا "سید صاحب! آپ شاید بھول رہے ہیں۔ ایک زمانے میں آپ بہت شدت کے ساتھ اخبار پڑھا کرتے تھے"

"کبھی نہیں ——— ہرگز نہیں" سید صاحب نے نہایت قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔

"آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے جب میں یہاں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، میں آپ کو روزانہ صبح کے وقت اخبار پڑھتے ہوئے دیکھتا تھا"

سید صاحب پیشانی پر بل ڈال کر سوچنے لگے۔ "میں بہت سویرے اسکول پہنچ جاتا تھا اور اب جس جگہ حوض ہے وہاں ایک چبوترہ سا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا آپ اس چبوترے پر بیٹھے اخبار پڑھا کرتے تھے ——— روزانہ اسکول شروع ہونے سے پہلے ——— تعجب ہے آپ کو یاد نہیں ——— میں آپ کو تقریباً روزانہ دیکھتا تھا ———"

"اوہو ——— اچھا ——— ہاں ہاں ——— میں سمجھا ——— ارے میاں مجھے اس زمانے میں کرکٹ سے دلچسپی تھی۔ اور میں اسپورٹس کے کالم دیکھا کرتا تھا ——— لاحول ولاقوۃ ——— آپ نے بھی کس بات کا ذکر کیا ———"

میں نے بھی دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ اس کے سوا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

اختر انصاری

حسین ارادے

وہ دیکھو آسماں پر اک ستارہ جھلملاتا ہے — مجھے اِس کو جبینِ ناز کی افشاں بنانا ہے
خدا سیرِ فلک کو کہکشاں کی راہ آتا ہے — مجھے پھولوں بھرے رستے سے تم کو گھر بُلانا ہے
چھپا کر چاند کو دامن میں بادل مُسکراتا ہے — مجھے بھی اس حسیں پہلو میں اک دن مسکرانا ہے
افق پر آتشیں پوشاک میں خورشید آتا ہے — مجھے بھی چھیڑ کر اک دن تمہیں غصّے میں لانا ہے
کوئی قوسِ قزح کو آسماں پر جگمگاتا ہے — مجھے کیوپڈ کی اس رنگیں کماں کو آزمانا ہے
زمیں تک ابر بوندوں کے حسیں زینے لگاتا ہے — مجھے اس پر تمہیں لے کر فضا سے دور جانا ہے
تصوّر آسماں کے اُس طرف اک گیت گاتا ہے — مجھے تم کو اسی دُھن میں کوئی نغمہ سنانا ہے
وہ دریا تار ہائے موج پہ کچھ گنگناتا ہے — مجھے ان انگلیوں کے ساز پر اک گیت گانا ہے
پہاڑی کے کنارے آبشار اک گیت گاتا ہے — مجھے بھی اک فسانہ نظم میں تم کو سنانا ہے
قسم ہے منظرِ فطرت یہی پیغام لاتا ہے — قسم ہے منظرِ فطرت پہ اک دن تم کو چھانا ہے

ذرا ان منظروں کو اور بھی رنگیں تو ہونے دو!
ذرا میرے تخیّل کو طرب آگیں تو ہونے دو!

سلام مچھلی شہری

دو دن کا پیار

یہ دلِ وحشی مرا
طائرِ آوارہ تھا اس کو قفس کی کیا خبر
ایک بے رہرو مسافر منزلوں سے بے نیاز
ایک بچہ — توڑ کر اپنے کھلونے پھینک دے
ایک تتلی باغ میں ہر پھول کا رس چوس لے

سادگی کا تیری معصومی کا عفت کا گناہ،
تیرے نازک دل کا، دوشیزہ محبت کا گناہ
ان رسیلی، مدھ بھری مدہوش آنکھوں کی نفاست کا گناہ
تیری دیوانہ بنانے والی صورت کا گناہ

آہ دو دن کے لئے جانے میں کیسا کھو گیا
اک نئی دل میں لگن تھی اضطراب سا ہو گیا،
ایک ہی معبود کے سجدوں میں لطف آنے لگا
جذبۂ رنگینِ آذر کیا خبر کیوں سو گیا

آہ یہ دو دن کا پیار!
مجھ سے اب مت پوچھ تو جب میں نے کیا سمجھا تجھے
اپنی ہر اک آرزو کا منتہا سمجھا تجھے
ایک اندھی سی محبت، بے خودی، دیوانگی،
میں نے (اُف میرے خدا) اپنا خدا سمجھا تجھے
اب مگر دو دن کے بعد!
توڑ ڈالا ہائے کس کمبخت نے سارا فسوں
اب کہاں ہے میری مدہوشی، کہاں میرا جنوں؟
کس نے مجھ سے چھین لی میری متاعِ بے بہا
اس تلاطم میں بھرا ہے موت کا کس نے سکوں!

پھر وہی بے کیف دل ہے، پھر وہی سُونی حیات
پھر وہ بے معنی سی دُنیا، پھر وہی ہیں شش جہات
وہ جو تھا اک نور ہر ذرّے میں اب ناپید ہے
پھر ہے میرے سامنے اک اجنبی سی کائنات

اب خجل، شرمندہ، تیرے سامنے آیا ہوں میں
زندگی کا ایک موتی نذر کو لایا ہوں میں،
یاد میں اس شبنمی اُلفت کی ہے تجھ پر نثار
یہ مرا دو دن کا پیار!

نسیم محمود مخمور

کی علامات کے مطابق اس کے لئے کسی سنیٹوریم میں کوئی بیڈ خالی نہ تھا۔ اور قید کی اذیتیں مدت گذارنے سے پہلے اس کے ماں باپ وبائے طاعون کی نذر ہو چکے تھے اور وہ خود بتدریج حقیقت کی تاب نہ لاکر تپ دق کی ۔۔۔ ان واقعات کو بھی کئی سال گذر چکے ہیں۔ سب امجد اور جگو طوفان حیات کو عبور کر رہے تھے۔ کشتی ساحل کے قریب تھی، پچھلا ساحل دھندلا ہو کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور یہ ۱۴ نومبر کی رات تھی۔ امجد کی شادی کی رات، سردیوں کی چاندنی، ملوں میں سوتی، اور فضا میں سوچ رہا۔

"چہرے کی ایک لہر سی پر چاندنی ٹھنڈی سی کچھ سوچ رہا تھا۔ جگو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے بے کسی کے لہجے میں کہا "مجھے آج تک کسی عورت نے پیار نہیں کیا"

جگو، وہ سولہ سال کا کھیلنے کھانے والا لڑکا جس کی سب سے بڑی خواہش اور اس کی تکمیل کی تصویر صاحب افسانہ یوں کھینچتے ہیں:۔

"ایک دفعہ جیل میں میرا جی گنا چوسنے کو چاہا اور میری آنکھوں میں اپنے کھیتوں کی تصویر پھر گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایکھ کے کھیت تیار ہیں ..... کاٹ کاٹ کر گٹھے بنائے جا رہے ہیں۔ بیلا، بیل گاڑی میں بیل جوت رہا ہے ..... اور میری ماں درانتیاں لے رہی ہے ..... ایکھ کے گٹھے اٹھا اٹھا کر بیل گاڑی میں رکھ رہی ہے ..... پھر میں نے دیکھا کہ کولھو میں گنوں کا رس نکالا جا رہا ہے اور ایک طرف چلتے ہوئے الاؤ پر کڑاھائی میں تازہ اور سونے جیسا پیلا گڑ تیار ہو رہا ہے اور میں بے قرار ہو گیا اور میں نے وارڈر کے سامنے ہاتھ جوڑے اور اس سے کہا کہ مجھے کہیں سے تھوڑا سا گڑ لا دو اور اس نے میری پیٹھ پر ایک لات جمائی ....."

اور جب جگو جوان ہوتا ہے، تو فطرت اس کی سہل زندگی کی بھی پروا نہیں کرتی۔ اس کی حب وطن بھی جذبۂ جنسی سے دب جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں جس نامرادی کا سب سے زیادہ شکار ہے وہ عورت سے محرومی ہے۔ اور یہاں فن کار نے اخلاص اور جرأت کے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ دیکھئے۔

"ایک لمبے وقفے کے بعد امجد نے کہا "تم کسان کے بیٹے تھے تم اپنے وطن کے لئے مر مٹے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے آج تمہاری قربانی کے بل بوتے پر اپنے بھائی یہاں حکومت کر رہے ہیں۔ تمہیں اس پر فخر ہونا چاہئے"..... جگو بولا "امجد تم مجھے چڑایا نہ کرو۔ کیا ہوا اگر میں ایک کسان کا بیٹا ہوں میں تمہاری طرح شاعر نہیں تو نہ سہی لیکن آخر میں نے بھی گاؤں گاؤں کی خاک چھانی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ صوبجاتی لیڈروں سے لے کر بڑے بڑے ہندوستانی لیڈروں کی تقریریں سنی ہیں۔ تین بار جیل گیا ہوں۔ میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں۔ میں نے آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جسے اپنی زندگی سے محبت نہ ہو جسے اس دنیا کے نیلے آسمان، زمین کی سوندھی خوشبو اور عورت کی اٹھلاتی ہوئی جوانی سے عشق نہ ہو ..... کوئی بھی اس زندگی کو ختم کرنا نہیں چاہتا۔ میں خود جس کے پاس ایک مٹھی بھر ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک جونک کی طرح اس زندگی سے چپکا ہوا ہوں اور تم ہو کہ مرنا چاہتے ہو ..... یکایک وہ خاموش ہو گیا۔ دھیمے دھیمے قدموں سے نرس لوسی اس کے بستر کی طرف آ رہی تھی۔ جوان اور خوبصورت لوسی، وہ اس کے سرخ ہونٹوں کو دیکھ کر پاگل ہو جاتا تھا۔ وہ جس کی ساری عمر جیلوں میں چکیاں پیستے اور جیلوں سے باہر جیلوں سے بدتر دیہات میں لیکچر دیتے، جلسوں میں والنٹیروں کا کام کرتے اور قوم کے نام پر بھیک مانگتے گذری تھی ..... اس چاندنی رات میں وہ اور بھی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اسے جیل جانے اور اپنے ملک کے لئے فاقے کر گذرنے پر افسوس نہ تھا لیکن کاش اسے تپ دق تو نہ ہوتا۔ کاش وہ تندرست رہتا اور حسین لوسی کے ہونٹ چوم سکتا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ اس کے بیمار خون میں ایک وحشی آگ کا طوفان لہریں مارنے لگا۔ اس کے کانوں میں بجلیاں کڑکنے لگیں، اس کے رخساروں کے سیاہ گڑھوں میں شعلے لپکنے لگے، کاش کوئی اسے آج کی رات، صرف ایک رات کے لئے سچی تندرستی کی آگ اور پاک اور مقدس شباب کی حرارت عطا کر دیتا، صرف ایک رات کے لئے .....

نرس نے اپنا ہاتھ اس کے تپتے ہوئے ماتھے پر رکھا اور نیند سے مغلوب آواز میں کہا "کیا تمہیں نیند نہیں آتی۔ جگو، سو جاؤ، باتیں مت کرو۔ سو جاؤ پیارے جگو"۔ جگو نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے نرس کی کلائی پکڑ لی چند لمحوں تک اس کا پتلا، سوکھا ہوا ہاتھ نرس کی کلائی پر رہا پھر آہستہ سے تکیے پر گر گیا۔"

آپ نے دیکھا تپ دق کا مریض اور لب چومنے کی خواہش کیسی فطری اور جاں گسل تشنگی ہے۔ اور کانپتے ہوئے بخار زدہ ہاتھوں کا نرس کی کلائی پکڑ لینا جنسی یاس کا کیسا دردناک اظہار! اس بارے میں الفاظ کا حیرت ناک خلوص اور رمز و معانی کے پردے تار تار کر رہا ہے۔ راقم حروف کی نگاہ سے ایسے بہت کم پارے گذرے

ہیں جو اپنی شدتِ تاثر اور قوتِ اظہار کے اعتبار سے الفاظ کے اس چھوٹے سے مجموعے کی نظیر بن سکتے ہوں۔ اور اب ایک آخری منظر دیکھئے وہ اعجاز جسے اب کارگاہِ حیات کے سب سے بڑے فن کار کے شعبدوں پر بھی ہنسی نہیں آتی اور جو اب مایوسیوں اور تلخیوں کی حدود سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ جب ایک نگاہ دلچسپ اپنے ناکام ماضی پر ڈالتا ہے تو یوں محسوس کرتا ہے کہ

"اب تو مجھے کسی سے کوئی عداوت نہیں، شکوہ نہیں، ہرگز نہیں
نہ تمہارے بنانے والے سے، نہ خواجہ کریم الدین سے ... رضیہ
سے بھی نہیں ..... اچھا ہے کہ اب کسی کے دل میں ہمارے لئے نہیں
چاہ نہیں عزت نہیں ....."

لیکن یکایک اس تودۂ خاکستر میں ایک بجھی ہوئی چنگاری دمک اٹھتی ہے، آج تیرہ نومبر کی رات تھی ..... اس لئے

تھوڑی دیر کے بعد ہی اُس کے صبر کے بند ٹوٹ گئے اور وہ نہایت دھیمی گلوگیر آواز میں بولا ..... "لیکن میرے خدا ... میں آج کی رات کو نہیں بھول سکتا ..... آج کی رات ہی تو میرے ارمانوں کی بنا آباد ہوئی تھی ..... آج کی رات ہی تو میں نے خوشیوں کا چہرہ دیکھا تھا ..... یہی چاندنی رات تھی ..... یہی رات کا سناٹا ..... پیپل کا درخت ..... پھر رات کا سناٹا بڑھتا گیا، چاندنی پھیلتی گئی ..... ان سنے رنگ کی خاموشیاں غنودگی کی گہرائیوں میں اترتی گئیں ..... وقت کا شور تھم گیا ..... اور زندگی کی ہر دھڑکن حسن کے سیلِ نور میں آپ ہی آپ بہتی ہوئی کہیں چلی گئی ..... خدا جانے .....
کہاں ..... کدھر .....؟
اے حسن! اے انسان!! اے خدا!!!

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

اس مہینے حصۂ نظم کے جائزے کا مسافر میرا جی اپنے سفر کو بہت دلچسپ سمجھتا ہے۔ بظاہر یہ سفر پورا مہینہ جاری رہا لیکن واپس آکر جب تمام واقعات پر نظر ڈالی تو یوں محسوس ہوا کہ صبح سے بات چلتی ہے اور رات پر ختم ہوتی ہے، لیکن رات کے بعد پھر صبح کا سماں چھا جاتا ہے اور سفر سے جو چیزیں سوغات کے طور پر ساتھ آئی تھیں انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ سفر صرف شاعری کا نہ تھا، یہ سفر زندگی کا بھی تھا۔ پہلے پہل جب زندگی — انسانی زندگی — کرۂ ارضی پر نمودار ہوئی تو اس کے لئے صبح شام، دن رات کا ظاہری رنگ روپ ہی سب سے بڑھ کر دلچسپی کا باعث تھا۔ رفتہ رفتہ ان باتوں کا تصور اندھیرے اور اجالے کے لفظوں میں قید ہو گیا اور یہیں سے انسان نے اپنے ماحول سے آزادی حاصل کی اور اُس کے ذہن میں —— کب، کیوں، کیا، کیسے —— استفسارات کا ایک انبار جمع ہو گیا —— اس ماہ شاعری کے سفر کی بھی یہی کیفیت رہی۔

میرا جی ہندوستانی ہے اور پنگھٹ ہندوستانیوں کے لئے کرشن کنھیا کے دور دراز زمانے سے جاذبِ نظر۔ سفر کی صبح اور پنگھٹ، دونوں مل کر پنگھٹ کی صبح بن گئے۔ ماہر القادری نے اگست کے "نگار" میں اس منظر کے تاثر کو لفظوں کے جال سے گرفتار کرتا ہے۔

پنگھٹ کی صبح

ٹھنڈی ہوا، خموش فضا، بھاپ کا دھواں جاڑے کی رت، بہار کے دن، صبح کا سماں
لہروں پہ تیرتی ہے حبابوں کی کہکشاں موجوں سے کھیلتی ہیں درختوں کی ڈالیاں
آئی ہوا تو اوس کے موتی ڈھلک گئے
سرسبز پتیوں کے پیالے چھلک گئے
آئی کرن نگاہ کے پر تولتی ہوئی۔ کہرے کی ہر لطیف گرہ کھولتی ہوئی
شبنم کے تابناک گہر رولتی ہوئی پانی میں روشنی کی شکر گھولتی ہوئی
موجوں کی بے قرار جبینیں چمک گئیں
وہ جوشِ کیف ہے کہ ہوائیں بہک گئیں
اشنان کرنے آئی ہے لڑکی کسان کی کاندھے پہ ایک گیلی دھوتی پڑی ہوئی
ندی کے پاس جا کے جو انگڑائی اس نے لی ملاح کے بھی ہاتھ سے پتوار چھٹ گئی
موجوں نے بڑھ کے اُس کو گلے سے لگا لیا
شاعر نے بھی نگاہ کو اپنی جھکا لیا۔

اس نظم میں اختصار کی خوبی بھی ہے۔ جیسے بند کا پہلا ہی شعر دیکھئے۔ برسات کے منظر کو آنکھوں کے سامنے لاتی ہوئی جدت بھی ہے۔ دوسرے بند کے پہلے شعر پر غور کیجئے مثلاً بگلا ہی کا لطف بھی ہے، موجوں سے کھیلتی ہیں درختوں کی ڈالیاں، حقیقت پرستی کی ایک جھلک بھی موجود ہے۔ کسان کی لڑکی کے کاندھے پر جو دھوتی ہے وہ بھیگی ہے، اس لڑکی کی بیکسی کا ثبوت بھی ہے۔ ملاقات کے نتیجے تو ادھ جھوٹ گئی۔ اس منظر سے تحریک پانے والی دبی ہوئی خواہش کا جھلکاتا ہوا تذکرہ بھی ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں، یہ ایک سیدھی سی بات ہے، لیکن موجوں نے اسے بڑھ کر گلے سے لگا لیا ـــــ یہ التزام ایک ایسا پیچ ہے جو دبی ہوئی آرزو کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ آرزو شاید شاعر کے دل میں نہیں تھی، وہ تو صرف مشاہدہ کر رہا ہے۔ لڑکی کی آمد سے ملاقات پر ایک بے خودی چھائی تھی۔ آرزو اس کے دل میں تھی۔ تشنہ آرزو۔ اور شاعر بھی اس شرمیلی آرزو کی لاج کا لحاظ کرتا ہے۔ اس نے بھی نگاہ کو اپنی جھکا لیا۔ شاید شاعر نے کسی اور وجہ سے اپنی نگاہیں جھکائی ہوں، کیا پتہ! ـــ بہرحال اسے خیابوں کی کہکشاں" پر غور کرتے دیکھئے۔ جو راہوں پر بہتی ہے۔ ہم اپنے سفر پر چلتے ہیں۔ لیکن پنگھٹ سے گوپیاں یاد آگئیں، رادھا کی سکھیاں، سکھیوں سے جھولا اور جھولے سے ساون۔ اس ذہنی قلابازی نے صبح سے رات کر دی، ساون کی رات۔ اگست کے ہمایوں میں یوسف ظفر ساون کی راتوں کا نغمہ ایک اچھوتی دھن میں الاپ رہا ہے۔

پھر بھیگیں کالی راتیں

یہ مینہ برساتی راتیں ہر بوند میں ایک ترنم
یہ ہنستی گاتی راتیں ہرنے میں "تُم تُم -- تُم تُم"
بے تم ہوں کیسے باتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۲)

چھاتوں پر "ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ" کپڑوں پر "رس بس رس بس"
پتوں پہ "ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ" اور دور پہ "بے کس بے کس"
میں بے کس اور برساتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۳)

موٹر پہ "آؤں ـــ آؤں" تانگے پہ "ٹھنک ٹھنک شاں شاں"
میں کیسے بات بتاؤں سب الفت کے ہیں عنواں
سب الفت کی ہیں گھاتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۴)

کوٹھے پر "ٹم ٹم ٹم ٹم" شیشوں پہ "شن شن شن شن"
گرنے میں "چھم چھم چھم چھم" ہے دل میں "جھون جھون"
اور جھون ہیں برساتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۵)

کوچوں میں "سر سر سر سر" چھجوں پہ "چھن چھن جھو جھو"
نالوں میں "بھر بھر بھر بھر" اور فرش پہ "میں میں تو تو"
یہ میں اور تو کی باتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۶)

"ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ چھپ چھپ" کیچڑ پہ "تر تر، دل دل"
بوندوں میں "خوش ہو خوش ہو" میں بے کس اور تو بے کل
ساون پر سو صلواتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں
پھر بھیگیں

یوسف ظفر

اس نظم میں اسمائے صوت سے جو کام لیا گیا ہے وہ اردو میں ایک نئی چیز معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر یہ تلازم محض حسن تعلیل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کیسا نازک جیسا ماہر عشقیات کہہ گیا ہے کہ محبت میں ہر چیز محبوب کی یاد دلاتی ہے۔

یہ نظم محض جذباتی چیز ہی نہیں، حقیقت کی جھلک بھی اس میں جا بجا موجود ہے۔ موٹر، تانگہ، کوٹھا، کھڑکی یا دروازے کے شیشے، چھتریاں، گلی کوچے، چھجے، نالے، فرش، چھت بلکہ کیچڑ تک موجود ہے۔ کیچڑ سے بڑھ کر اور کیا حقیقت ہوگی جس میں سے زندگی کی نمود ہوئی! یہ حقیقت کی جھلکیاں اس نظم کی منظر نگاری کو مکمل کرتے ہوئے اس کے درجے کو بڑھا دیتی ہیں۔

لیکن یہ تو ساون کی رات ہے۔ اس سفر میں کوئی ایسی رات مہیا ہو جو ہر رات سمجھی جا سکے اور جس سے لطف اندوز ہونے کے لئے موٹر تانگے سے ذرا دوری ہی رہے ـــــ لیجئے ایسی رات بھی آن پہنچی۔ ہمیں اس

سے مطلب نہیں کہ چاند نکلا ہے یا رات کی تاریکی کو صرف ستاروں کا مدھم اُجالا ہی درخشاں بنا رہا ہے۔ ہمیں اتنا ہی کافی ہے کہ رات ہے، ایک بڑا شہر، کہیں سینما، کہیں تھیٹر اور کہیں کلب یا رقص گھروں کی رونق ہے۔ ہم رقص گھر کو چلتے ہیں۔ وہاں ہمیں اگست کے "ایشیا" میں ن۔م راشد تہذیب و تمدن کی اُلجھنوں میں خالص شہری شاعری کا جلوہ دکھائے گا۔

رقص

اے مری ہم رقص! مجھ کو تھام لے۔
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں۔
ڈر سے لرزاں ہوں، کہیں ایسا نہ ہو۔
رقص گھر کے چور دروازے سے آکر زندگی۔
ڈھونڈھ لے مجھ کو، نشاں پالے مرا،
اور جرم عیش کرتے دیکھ لے!
اے مری ہم رقص! مجھ کو تھام لے

رقص کی یہ گردشیں۔
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں۔
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں۔
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں
رقص گھر میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے۔
اے مری ہم رقص! مجھ کو تھام لے

زندگی میرے لئے۔
ایک خونی بھیڑیے سے کم نہیں۔
اے حسین و اجنبی عورت! اُسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لمحہ لمحہ اور بھی تیرے قریب!
جانتا ہوں تُو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری اُن آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!

عہد پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں۔
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں،
اس لئے اب تھام لے۔
اے حسین و اجنبی عورت! مجھے اب تھام لے!

ن۔م راشد ایم اے

راشد کے متعلق میں ایک اور جگہ بھی کہہ چکا ہوں کہ اُس کا سوچنے کا انداز مغربی ہے اور شاید اسی لئے اُس کی نظموں کا ماحول بھی عموماً مغربی ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں رقص گھر ہی کو لیجئے۔ خالصتہً مغرب کی چیز ہے۔ اگرچہ بمبئی اور کلکتے ایسے شہروں میں اب اسے ہندوستانی بھی نوازتے ہیں۔ اور اس لئے پڑھے لکھے یا سینما کے شائق انسانوں کے لئے اس نظم میں کچھ زیادہ اجنبیت نہیں ہونی چاہئے۔ راشد کی نظموں میں یہ بات اکثر موجود ہے کہ وہ ایک جھجکتے ہوئے، تھکے ماندے انسان کا تصور پیش کرتا ہے، ایک ایسے انسان کا تصور جس کے ذہن پر تہذیب و تمدن کی اُلجھنوں کا اثر ذرا حد سے زیادہ ہُوا ہو جو کسی بات سے جی بھر کر پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکتا ہو، ایک نقطے سے ہٹ کر دوسرے نقطے تک جاتا ہو، اور پھر دوسرے سے تیسرے تک۔ اس نظم میں بھی اُس کی عصبیت اسے زندگی کی وسعت اور ہماہمی سے تنگ آکر رقص گھر کے اندر لے گئی ہے اور اگرچہ وہ کہتا ہے کہ رقص کی گردشیں ایک خیالی چکی میں اُس کے غم کو پیس رہی ہیں، نہیں، رقص کی گردشوں میں اُس کے پاؤں غم کو روند رہے ہیں، لیکن اُسے اب بھی خدشہ ہے کہ کہیں زندگی، وہ زندگی جس سے وہ گریزاں ہو کر رقص گھر کی پناہ میں آیا ہے، اُس کا کھویا ہُوا سراغ نہ پالے۔ "اے مری ہم رقص! مجھ کو تھام لے"۔ اس مصرعے کا تواتر ہی ظاہر کر رہا ہے کہ اُسے زندگی کے قریب آجانے کا اندیشہ کس قدر ستا رہا ہے اور گویا وہ اپنی ہم رقص سے چمٹا جا رہا ہے۔ اُس میں اپنے کو کھو دینا چاہتا ہے، اس کے لئے رقص گھر کی پناہ کافی نہیں۔ شاید ابھی وہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ ایسی حرکت بعض دفعہ "زندگی" کی تخلیق کا باعث بھی بن جایا کرتی ہے۔ لیکن ہمیں اپنے دل میں یہ خیال نہیں لانا چاہئے۔ کیونکہ اُس کی ہم رقص اس کے لئے اجنبی ہے اس قدر

کہ اُسے دوبارہ ملنے کی بھی کوئی صورت نہیں۔ اُس کی یہ دل بستگی ہنگامی ہے، ایک علاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کہیں اُس کی ہم رقص، وہ حسین اور اجنبی عورت، رقص میں اُس کے غیر معمولی جوش سے کسی طرح کا شک نہ کرنے لگے، اس لئے وہ اُسے صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ اُس میں اُسے صرف ایک مماثلت نظر آتی ہے۔ اُس کا یہ جوش کسی قدیم مرد کی وحشت نہیں ہے، اُس کی خواہشیں تو تہذیب کی چاردیواری کے آگے متواتر سر جھکائے رہنے سے اپنی قدیم شدت کھو چکی ہیں، اُس سے کسی طرح کا خطرہ غلط نظری ہے، وہ تو رقص میں صرف جسم سے لپٹ سکتا ہے اور بس۔ زندگی پر وہ نہیں جھپٹ سکتا۔ یہاں زندگی کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ زندگی جو رقص گھر کے باہر ہے جسے چھوڑ کر جس سے تنگ آ کر شاعر اس چار دیواری میں آیا ہے اور دوسرے وہ زندگی جو اُسے اپنے پہلو میں دکھائی دے رہی ہے۔

راشد کے اس ٹکڑے سے آزاد نظم کے فنی فوائد کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس کی بحر سے رقص کا بہاؤ ظاہر ہے۔ بنیادی رکن فاعلاتن ہے۔ جھٹکے دیتا ہوا اور ہر گردش کو پورا کرتا ہوا رکن۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن۔ "فاعلا" میں بہاؤ ہے اور "تن" کا ٹکڑا اس بہاؤ کو روک کر گردش کے دائرے کو مکمل کر دیتا ہے، متواتر جب یہ پورا رکن دو یا تین یا چار بار چلتا ہے تو اس کے بہاؤ کا زور بڑھ جاتا ہے اور آخر میں فاعلن یا فاعلات کا چھوٹا رکن روک کا کام دیتا ہے۔

نظم کے شروع سے آدھے حصے تک شاعر ابھی رقص میں پوری طرح گم نہیں ہوا۔ اس لئے لمبے مصرعوں کے درمیان میں کہیں کہیں چھوٹے مصرعے بھی آ جاتے ہیں جو رقص کے بہاؤ کو کسی حد تک کم کر دیتے ہیں۔ جیسے دوڑنے میں کوئی شخص کبھی کبھی ٹھہر کر سانس لے۔ لیکن آدھی نظم کے بعد سے بہت دور تک مصرعوں کی روانی باقاعدہ چلی جاتی ہے۔ اب شاعر رقص کے بہاؤ میں اس کی گردشوں میں اور گردشوں کے آخر میں جھٹکے دیتی ہوئی پہلو بدلنے والی حرکتوں میں کھو چکا ہے۔ صرف آخر میں پہنچ کر جب اُسے شاید اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اظہار نفسی کر چکا، ایک دو چھوٹے مصرعوں کی آمد ہوتی ہے۔

رقص کے جس بہاؤ کی اس نظم کے "ہیرو" کی ذہنی کیفیت کے لحاظ سے ضرورت تھی، فن کار نے بنیادی رکن "فاعلاتن" اس کے عین مطابق منتخب کیا ہے۔ مفاعیلن، فعولن، فعلن، مفتعلن، فاعلن ـــــ کسی اور رکن میں ایسا بہاؤ، ایسی گردش اور ایسے جھٹکے نہیں ہو سکتے تھے۔

نظم میں ایک جگہ شاعر اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس رقص سے وہ یوں محسوس کر رہا ہے گویا ایک مبہم سی چکی چل رہی ہے اور وہ اپنے غموں کو پاؤں تلے روندتا جا رہا ہے۔ اس بنیادی رکن کی گردش اور جھٹکے میں کسی چکی کی گولائی ایسی کیفیت موجود ہے۔

رقص گھر کی اس رات کے سفر نے تو کسی قدر تھکا دیا، شاعر کی فطرت تو پہلے ہی ایک مچلتی ہوئی ندی تھی، تہذیب کی اُلجھنوں نے تو اُسے یکسر سیماب بنا دیا ہے ـــــ شاعر ـــــ سیماب ـــــ اگست کے "شاعر" میں مفکر سیماب (اکبرآبادی) دنیا اور زندگی کے موجودہ حالات کا جائزہ لے رہا ہے۔

قطعات

کیا زندگی و موت کی آویزش ہے
تا حدِ نظر سلسلۂ کاوِش ہے
وہ عہدِ شباب و شعور سفاغ گذرا
اب دورِ شراب و شاہد و شورش" ہے

ـــــــــــــ

جی کھول کے کوشش تباہی کر لے
بیداد گری و کج کلاہی کر لے
بے کس سے کہو، مآلِ شاہی دیکھے!
ظالم سے کہو کہ بادشاہی کر لے!

ـــــــــــــ

ارماں نہ خدائی میں ہلاکت ہوتی
انسان پر ایسی نہ مصیبت ہوتی
تخریب میں صرف ہو رہی ہے جو متاع
اے کاش! یہ تعمیر کی قسمت ہوتی

سیماب اکبرآبادی

شعراء انسانیت کے تعمیری نمائندے ہیں، اس لئے موت سے گریزاں اور زندگی کی طرف راغب ہیں۔ کیونکہ زندگی ہی قدرت کا بھی شاہکار ہے۔ اگست کے "شاہکار" میں مجید امجد بی اے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کہہ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ حال کی خوشگوار کیفیتوں ہی میں کھو یا رہے۔ جب تک سانس ہے تبھی تک لطف ہیں اور لطف ہی زندگی کا ماحصل۔

کہاں

موت کی گفتگو نہ کراے دوست! آہ یہ آرزو نہ کراے دوست!
جب تلک سانس کی روانی ہے تیرے جیون کی رُت سہانی ہے
جب تلک دل کے داغ روشن ہیں شش جہت میں چراغ روشن ہیں
دوست جب تک ترا حریم نگاہ دے رہا ہے جبینوں کو پناہ
زندگی نام ہے محبت کا زندگی جام ہے محبت کا
دل سے دل کی طرب نوازی ہے روح سے روح محو بازی ہے
آنکھوں آنکھوں میں مے انڈیلتی ہیں انگلیاں گیسوؤں سے کھیلتی ہیں
ہیں لبوں پر لبوں کے پیمانے ہیں نظر سے نظر کے افسانے
شانے سے شانہ بھڑ رہا ہے یہاں نغمے سے نغمہ چھڑ رہا ہے یہاں
ابھی ارماں دل حیات میں ہے آج تو دام ممکنات میں ہے
کل نہ معلوم کیا سے کیا ہو جائے کل کا مفہوم کیا سے کیا ہو جائے
کیسے اُلجھے اجل کے دھارے سے جا کے ٹکرائیں اُس کنارے سے
کس نشیمن میں، کس چمن میں، کہاں!
اپنی منزل ہو پھر نجانے کہاں؟

بحید امجد بی اے

اس کہانی کے متعلق اگست کے شب رس میں مخدوم محی الدین کا مضمون ہے۔ وہ اپنے بیان کو ایک عجیب پیچ دیتا ہوا سرمایہ داری کے در پر ایک حملہ بولتا ہے۔ اُس کا تخیل اُسے موجودہ وقت کے تلخ حالات کے بارے میں عجیب تصورات سے دوچار کرتا ہے۔ موت کو دنیا سب سے بڑھ کر غارت گر تصور کرتی ہے لیکن اس نظم کا شاعر ہمیں بتاتا ہے کہ شاہی اور سرمایہ داری نے موت سے بڑھ کر مصائب لائے ہیں۔

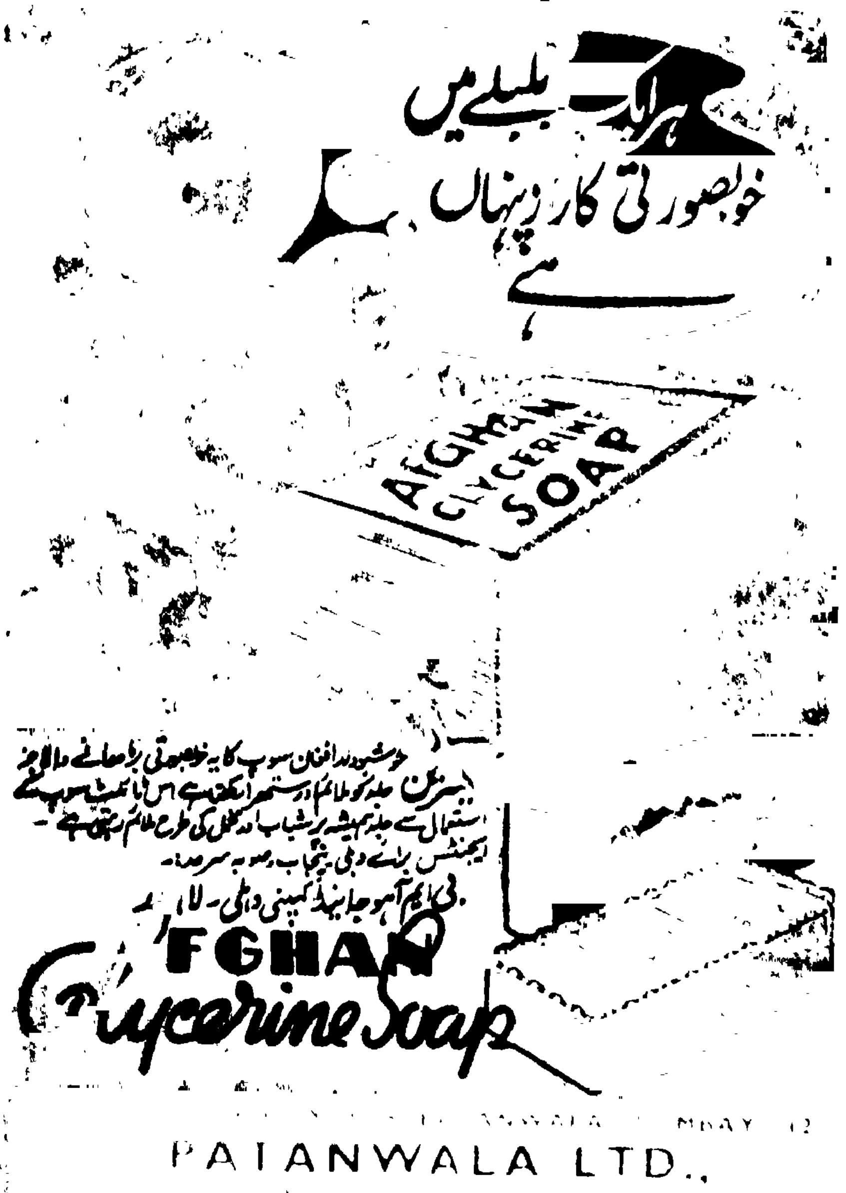
روح فغفور

دختر خانگی روح غارت گری موت کی ہم سفر مرگھٹوں کی پری
جہل وافلاس کے تخت پر جلوہ گر کچھ پکاری اِدھر کچھ پکاری اُدھر
...غضب اندام وہ قبر کی تیرگی میرے گھر میں وہ کل یک بیک گھس گئی
...کودتی شور کرتی ہوئی میری خوشبو سے جیبوں کو بھرتی ہوئی
...غم ہوا میں بجھاتی ہوئی مسکراتی ہوئی کھلکھلاتی ہوئی
...یوں سے دلوں کو کچلتی ہوئی خون پی پی کے گرتی سنبھلتی ہوئی
موت سے کہنے لگی یوں دم بدم اے مری ہم نفس اے مری ہم قدم!
...ترکش میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں! کونسی وہ ادا ہے جو مجھ میں نہیں؟
...کلوں میں بلائیں نہیں! کیا نفس میں مرے وبائیں نہیں؟
کیا مجھے جوع ارضی نے پالا نہیں؟ کیا یہ انسان میرا نوالا نہیں؟
پشتِ گیتی پہ میں بھی تو ناسور ہوں
دیکھ تو کون ہوں روح فغفور ہوں!!

مخدوم محی الدین ایم اے

یہ نظم اپنے کنائتی انداز، اپنے استعاروں اور اپنی تخیل پرستی کی وجہ سے میری نظروں میں ایک اونچا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن مجھے بھی اسے پڑھ کر وہی سوجھ آتی ہے جو اس کے خالق کو آئی ہے۔ کیا غیر معمولی زر و دولت کی اُمنگ انسان کو تباہی کے قریب نہیں لے جا رہی؟ ——
لیکن میں ان مسائل کو سوچنے والا کون ہوں — میں تو ایک فقیر ہوں، سیلانی، ایک مسافر جو اپنے شاعری کے سفر سے لوٹا ہے اور مجبوراً وہی پرانا کلمہ دہراتا ہے کہ اللہ بس باقی ہوس!

میراجی



THE ADABI-DUNYA

ادبی دنیا

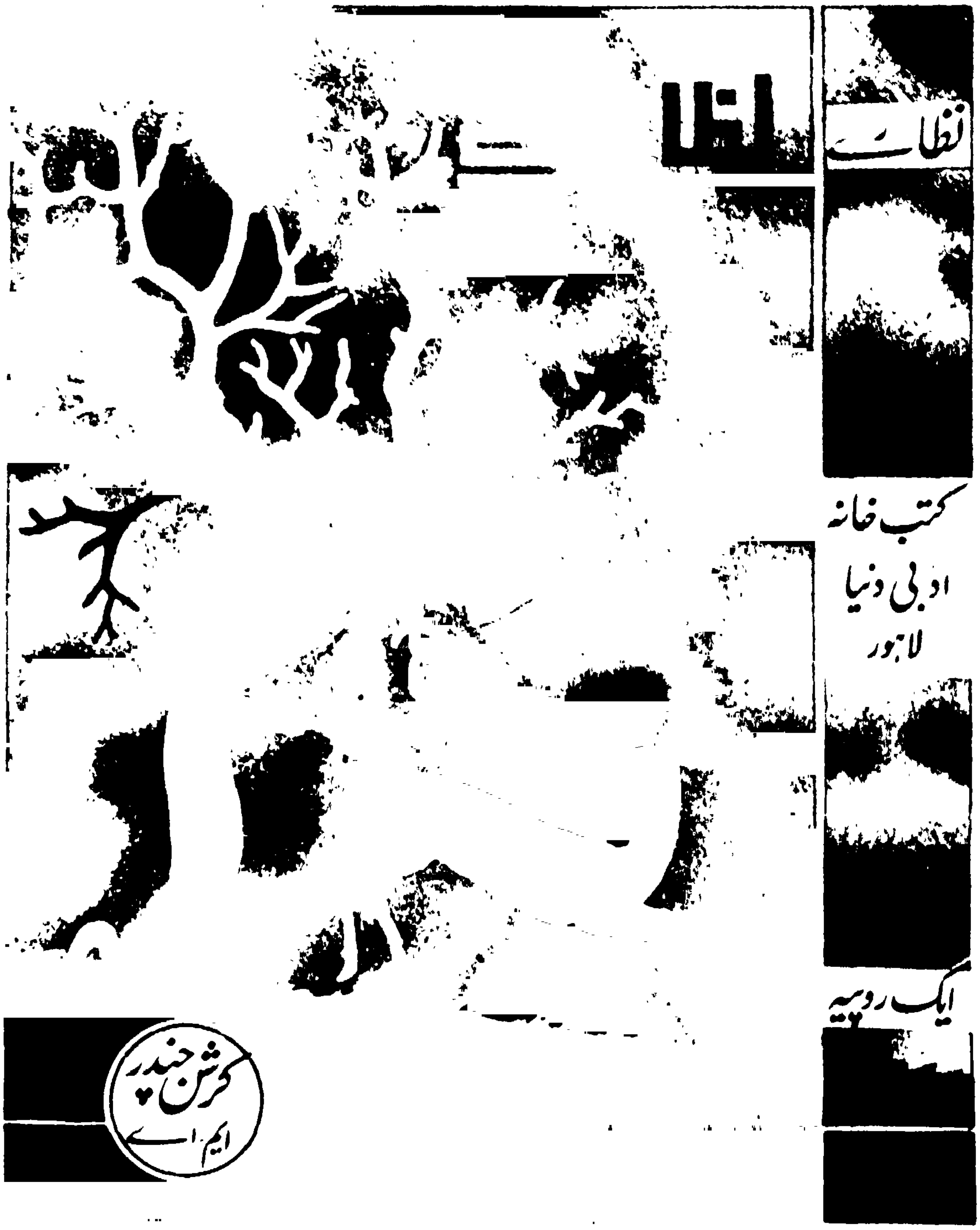
OCTOBER 1940

INDIA'S PREMIER MAGAZINE

Price As. 6

اس مجموعے میں ذیل کے افسانے شامل ہیں:

۱. جنت و جہنم
۲. بے رنگ و بو
۳. آنسوؤں والی
۴. بچپن
۵. گل فروش
۶. دو فرلانگ لمبی سڑک
۷. بندو والی
۸. ویکسین نیڈل
۹. خونی ناچ
۱۰. دل کا چراغ
۱۱. تلاش
۱۲. سفید پھول
۱۳. منگلیک



اس کتاب کے مقدمے میں صلاح الدین احمد لکھتے ہیں:-

"کرشن چندر ایک مجموعۂ اضداد ہے۔ وہ ادب میں رومانیت اور حقیقت پرستی، فرار اور پیکار، شادابی اور ویرانی، کامرانی و شکست، جنت اور جہنم کا ایک دلکش امتزاج پیش کرتا ہے۔ وہ ہماری مہذب تربیت اور تمدن وحشت کے خلاف سراسر بغاوت ہے۔ ایک شخص گرم جوش حقوق ہماری مسرت کے پرفریب آئین و رسوم پر ایک زندہ تبسم ہے، ایک تلخ مگر دلنواز تبسم۔ جب وہ زندگی کی لطیف ناکامیوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہے تو وہ اس کے پردے سے جھک اٹھتی ہیں۔ وہ نہیں دیکھتا ہے، نہیں دیکھتے اور خاموشی سے گذر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تلخیوں کا ایک ہجوم اس کے دل میں محشر بپا کیے رکھتا ہے مگر اس کے سینے کا طوفان اس کے چہرے پر خندۂ زیرلب کی ایک ہلکی سی موج بن کر رہ جاتا... جب تک ہم اس سے ہمکلام رہتا ہے اگرچہ داستان غم کہتا ہے لیکن ہم اسے نغمۂ فردوس سمجھ کر سنتے جاتے ہیں۔ وہ ایک آئینہ بنا ہے! تمہیں وہ کہ ہم سے اپنی صورت دیکھنے کو کہتا ہے اور خود ہنسنا شروع کر دیتا ہے اور ہم بھی ہنسنے لگ جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ بے ہودگی پر یا اس شعبدہ گر کی عیاری پر۔

اوٹین کریم اور سنو



فلم اور سٹیج کے درخشاں ستاروں کے رنگ و روپ کو بنائے رکھنے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے اعصاب اور پٹھوں کی صفائی پرورش کے لئے خوراک اور زندگی بخش طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اوٹین کریم اس بلند معیار کی تمام حاجتوں کو پورا کرتی ہے۔ یہ مسام سے فالتو مواد کو خارج کرتی ہے ان کے بند ہو جانے کو روکتی ہے اور اس طرح جلد کو ہوا سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقع دیتی ہے اس سے جلد کی دونوں طرف کے سوراخوں کی پرورش ہوتی ہے جلد کے نیچے خون کے جو ننھے ننھے ذرے موجود ہوتے ہیں اس سے وہ تازہ ہو جاتے ہیں اور خون کی گردش صحت کے صحیح اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور رنگ و روپ میں جوانی کی تازگی لوٹ آتی ہے۔

ہر روز سوتے وقت اوٹین کریم کی مالش سے چہرے اور گردن کے اعصاب زور حاصل کرتے ہیں۔ یہ کریم جلد کو ڈھیلا ہونے یا اس پر جھریاں پڑنے سے بچاتی ہے اور بہت آسانی سے قدرتی طور پر نیند کے دوران میں آپ کے حسن میں ایک نئی زندگی لاتی ہے۔

دن کے وقت اوٹین سنو کے استعمال سے ایک ٹھنڈک پہنچتی ہے اور حسن کو دن بھر دھوپ، ہوا، گرد اور پسینے سے محفوظ رکھتی ہے

خوبصورتی کو بڑھانے اور قایم رکھنے کے لئے صرف ان دو چیزوں کی ہی ضرورت ہے۔

ایک اور اشارہ

کتب خانہ ادبی دنیا نے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اچھی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے چنی ہوئی کتابوں کی تازہ بتازہ فہرستیں ادبی دنیا میں شائع کی جائیں گی تاکہ ناظرین ادبی دنیا کو اپنے مقبول رسالے ہی کے ذریعے سے ہر قسم کی اچھی کتابیں بہ آسانی مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی فہرست شائع ہو کر مقبول خاطر ہو چکی ہے۔ اس دفعہ کتب خانہ ان فہرستوں کی دوسری قسط آپ کے پیش نظر کر رہا ہے۔ موجودہ فہرست میں التزاماً وہی کتابیں درج کی گئی ہیں جو خواتین اور بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں جسب معمول اس انتخاب کی ضمانت بھی ادارہ ادبی دنیا کا نام ہے۔ مینجر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور

نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت
خواتین کے لئے		شمع خاموش نظمیں	۶ر	بچوں کا انصاف (ڈرامہ)	۳ر
		آئینہ جمال ،،	۱۲ر	مرغی اجمیر چلی - محترمہ رقیہ ریحانہ	۲ر
ناول اور افسانے		صنعت اور خانہ داری		نبیوں کے قصے	۵ر
عورتوں کے افسانے - کوثر چاندپوری	۸ر	گذشتہ کروشیا - فاطمہ بیگم انور علی	۶	تاریخ ہند کی کہانیاں	
تحفے اور دیگر افسانے - حجاب امتیاز علی	۸ر	عصمتی کروشیا	۸ر	پہلا حصہ	۳ر
خانم .. مرزا عظیم بیگ چغتائی	۸ر	بیوی کی تعلیم - خواجہ حسن نظامی	۸ر	دوسرا حصہ	۵ر
شریر بیوی .. ،،	۸ر	اولاد کی شادی ،،	۸	**تفریح اور معلومات**	
شام زندگی راشد الخیری	عہ	مشرقی اور مغربی کھانے	عار		
شب زندگی دو حصے ،،	عہ	مذاقیہ کھانے	۶ر	تعلیمی کھیل	۳ر
ماہ عجم .. ،،	۸ر	**متفرق**		سمندر کا عجائب خانہ	۸ر
شاہین و دراج ،،	۸ر	محبت نامے - مترجمہ پروفیسر رام سروپ کوشل	۷ر	ایورسٹ کی کہانی	۳ر
لاشوں کا شہر - مسز عبدالقادر	۸ر	ادب زرین - حجاب امتیاز علی	۸ر	**نظمیں**	
نرملا .. منشی پریم چند	۸ر	التفات محبت ،، ،،	۲ر	بچوں کی نظمیں	۴ر
یوسف نجمہ عبدالحلیم شرر	۸ر			بچوں کے اسمٰعیل	
بنات النعش - مولوی نذیر احمد مرحوم	۸ر	**بچوں کے لئے**		مرتبہ سعید انصاری، پرنسپل مدرسہ جامعہ	۱۵ر
یاسمین .. مرزا محمد سعید	۸ر	قصے کہانیاں			
نظم		ولایتی نسخی - راشد الخیری	۲ر	بچوں کی رباعیاں	۱ر
آئینۂ حرم - محترمہ ز خ ش کی نظمیں	۶ر	دادا اماں جھگڑا ،،	۸ر	بچوں کا علاج (طب کی کتاب)	للعہ

ملنے کا پتہ: کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء

جلد ۱۸ — نمبر ۱۰

تصویر:۔ چند اماموں کے

بزم ادب

آئینۂ عالم

افسانے

علمی و ادبی مضامین

حصۂ نظم

کی گئی اور سو سال کے اندر سلطنت برطانیہ دنیا کی چائے اور باغات اور بازار مانا گیا۔ دنیا کی مال تجارت میں چائے کی قیمت ایک فی صدی ہے اور ستر فی صدی سے زیادہ چائے کی پیداوار اور تقریباً ستر فی صدی اس کی کھپت سلطنت برطانیہ ہی میں ہوتی ہے۔

صد سالہ سالگرہ کے موقع پر دعوت ہوئی تھی اُس میں سر والٹر اسمٰعیل ایم۔ پی نے کمپنی کے صدر نے فرمایا کہ اس کمپنی کے قائم ہونے کے پچاس سال کے اندر اس کمپنی نے چین کی نسبت زیادہ چائے منگوائی ہے اور آج تمام دنیا کی چائے کے بازار پر لدی ہے۔ عموماً ہم دو شخص کے لئے چائے طلب کرتے ہیں مگر ہندوستان اور سیلون دو کروڑ لوگوں کے لئے چائے پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کی پیداوار آٹھ سو ملین پونڈ سالانہ ہے جس کے ہر پونڈ میں دو سو سے زیادہ چائے کی پیالی تیار ہوتی ہے۔

تمام ہندوستانی اور غیر ممالک کے باشندے اس ہر دلعزیز چائے کو اپنے گھروں میں پکا کر پیتے ہیں۔

فضل الٰہی ایڈورٹائزنگ منیجر
ادبی دنیا لاہور

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا سے شائع ہوا

دنیائے کاروبار

پاٹن والا لمیٹڈ عبدالرحمن سٹریٹ بمبئی

اس عظیم الشان کمپنی کی تیار کردہ "افغان سنو" اور "افغان کریم" ایک زمانے سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں اور دنیائے فلم کی تمام حسین ترین ستارہیں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ یہ خالص ہندوستانی کمپنی ہے جس کی تیار کردہ اشیا یورپ کے مقابلے میں اپنی نظیر نہیں رکھتی حال ہی میں اس کمپنی نے گلیسرین سوپ تیار کیا ہے جو جلد کو ملائم اور ستھرا رکھتا ہے اس کے استعمال سے جلد ہمیشہ پرشباب اور مخمل کی طرح ملائم رہتی ہے۔ ہندوستانی صنعت کے فروغ دینے والوں سے ہماری پرزور درخواست ہے کہ وہ ضرور گلیسرین سوپ کا استعمال کر کے اس کی خوبیوں سے مستفید ہوں اور اپنے عزیزوں کو اس کے استعمال کی سفارش کریں۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ استعمال کے بعد انہیں بھی ہماری رائے سے اتفاق ہو گا۔ اپنے شہر کے ہر بڑے سٹور سے طلب کیجئے۔

ڈونگرے کا بال امرت

دراصل یہ سوکھا اصلی اور خالص دودھ ہے جس میں سے سائنس کے ذریعے سے پانی خشک کر لیا گیا ہے۔ ننھے بچوں کے لئے بہترین طاقتور خوراک ہے جو نہایت آسانی سے ہضم ہو جاتی ہے۔ زچگی کے ایام میں زچہ کو بھی طاقت دیتی ہے۔ ڈونگرے کا بال امرت ہر شہر میں ہر اچھے سٹور یا کیمسٹ سے مل سکتا ہے۔

کتب خانہ ادبی دنیا

گذشتہ چند ماہ سے کتب خانہ ادبی دنیا نے اچھی کتابوں سے ناظرین کو متعارف کرانا شروع کیا ہے ایک مختصر فہرست ادبی دنیا کے ہر پرچے میں شائع کی جاتی ہے۔ ہمیں دیکھ کر نہایت مسرت ہوتی ہے کہ شائقین کتب اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ کتب خانہ ادبی دنیا یہ کوشش کر رہا ہے کہ اس فہرست میں اضافہ ہوتا رہے اور ناظرین کی خدمت میں چنی ہوئی کتابیں پیش کر سکے۔ شائقین کتب سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہر ماہ فہرست کتب کا مطالعہ کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا سے مل سکتی ہیں۔

چائے کی صد سالہ سالگرہ

دس جنوری ۱۹۳۹ء کو لندن میں امپائر ٹی انڈسٹری کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی چونکہ ٹھیک اسی دن ایک سو سال قبل ۱۸۳۹ء میں آسام کے نئے باغات کے چائے کا پہلا نیلام ہوا تھا۔

اسی وقت ہندوستان میں چائے کی زراعت کی ترقی میں بڑی کوشش کی گئی اور سو سال کے اندر سلطنت برطانیہ دنیا کی چائے اور باغات اور بازار مانا گیا۔ دنیا کی مال تجارت میں چائے کی قیمت ایک فی صدی ہے اور ستر فی صدی سے زیادہ چائے کی پیداوار اور تقریباً ستر فی صدی اس کی کھپت سلطنت برطانیہ ہی میں ہوتی ہے۔

صد سالہ سالگرہ کے موقع پر دعوت ہوئی تھی اس میں سر والٹر اسماعیل ایم بی نے کمیٹی کے صدر نے فرمایا کہ اس کمپنی کے قائم ہونے کے پچاس سال کے اندر اس کمپنی نے چین کی نسبت زیادہ چائے منگوائی ہے اور آج تمام دنیا کی چائے کے بازار پر لدی ہے۔ عموماً ہم دو شخص کے لئے چائے طلب کرتے ہیں مگر ہندوستان اور سیلون دو کروڑ لوگوں کے لئے چائے پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کی پیداوار آٹھ سو ملین پونڈ سالانہ ہے جس کے ہر پونڈ میں دو سو سے زیادہ چائے کی پیالی تیار ہوتی ہے۔

تمام ہندوستانی اور غیر ممالک کے باشندے اس ہر دلعزیز چائے کو اپنے گھروں میں پکا کر پیتے ہیں۔

فضل الٰہی ایڈورٹائزنگ منیجر
ادبی دنیا لاہور

بزمِ ادب

مقامِ مسرت ہے کہ جنگ کے باوجود ادبی دنیا کا سالنامہ انشاءاللہ حسبِ معمول نہایت آب و تاب سے دسمبر کے وسط میں شائع ہو جائے گا۔ یہاں اس امر کی توضیح نا موزوں معلوم ہوتی ہے کہ ایسے ناساعد حالات میں سالنامہ شائع کرنا کس قدر قربانی کا طالب ہے۔ اس لئے صرف یہی کہنا کافی ہے کہ وہ سب توقعات آپ کو ہم سے ہیں انہیں ہم پورا کرنے کی کوشش کریں گے اور اس کے ساتھ ہی ادبی دنیا کے معاونین اور ناظرین سے جو توقعات ہیں ہو سکتی ہیں ان کے پورا ہونے کی امید رکھیں گے۔

اس شمارے کے افسانہ نگاروں میں چودھری محمد علی صاحب ادبی دنیا کی محفل میں پہلی بار شریک ہو رہے ہیں اگرچہ اس سے پہلے موصوف کی وہ کہانیاں ہماری دنیائے ادب کی رونق بن چکی ہیں۔ چودھری صاحب اردو کے پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ مگر اُن کے انداز میں اس قدر جدت ہے کہ وہ مستقبل کے ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ موجودہ افسانے کا موضوع نہایت نازک اور اچھوتا ہے۔ ایسے موضوع پر قلم اٹھانا اور اسے حُسن و خوبی سے نبھانا کسی معمولی مصنف کا کام نہ تھا۔ اس کے لئے نہ صرف غیر معمولی سلیقے اور مہارتِ فن کی ضرورت تھی، بلکہ افسانہ نگار کا خلوص اور جرأت کی دولت سے مالا مال ہونا بھی ازبس لازم تھا۔ ہمیں مسرت ہے کہ چودھری صاحب نے موجودہ افسانے میں ان خصوصیات کے اجتماع کا ایک نہایت دلنشیں ثبوت پیش کیا ہے۔ افسوس ہے کہ "بزمِ ادب" کی تنگ دامانی ہمیں ان گلہائے معانی چننے کی اجازت نہیں دیتی جن کے رنگ و بُو سے افسانے کی فضا معمور ہے۔ اس لئے فقط اسی قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی ایسی جانچ اور انسانی فطرت کی نیرنگیوں کا ایسا مشاہدہ اور اظہار بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آیا کرتا ہے۔ زیرِ نظر افسانہ اپنی معنوی خوبیوں کے علاوہ زبان و بیان کی لطافتوں سے بھی سرتاسر معمور ہے اور اودھ کے روزمرہ کا نہایت اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔

اردو کے ایک اور کہنہ مشق اور نکتہ رس ادیب "تجلیات" کے روح افزو نام سے ایک اعلیٰ درجے کا سوشل افسانہ لکھا ہے، اس افسانے میں پہلی ہماری شہری معاشرت جس انقلابی دور سے گذر رہی ہے، اس کا قدرتی تقاضا ہے کہ ہمارے جنسی رجحانات اس سے شدید طور پر متاثر ہوں۔ ادھر اقتصادی مجبوریوں نے اور پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے نوجوانوں کی زندگیاں ایک خوابِ پریشان بن کر رہ جاتی ہیں، زیرِ نظر مطالعہ اسی قسم کے ایک خواب کی تفصیل ہے۔ اور واقعہ ہے کہ صاحبِ افسانہ نے اسے ایسے دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ تاثرات میں بھی ایک حلاوت پیدا ہو گئی ہے۔ اس پر زبان کی سلاست اور روانی گویا سونے پر سہاگہ ہے۔

اختر انصاری صاحب کے اتنے اچھے مطالعے ناظرینِ ادبی دنیا کی نگاہوں سے گذر چکے ہیں کہ اب ان کے اندازِ نگارش کی نسبت کچھ لکھنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ موجودہ مطالعہ غم نصیب ان کے بہترین افسانوں میں سے ہے اور ان کی تحریر کی خوبیوں کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

محترمہ ہاجرہ بیگم نے ایک نہایت دلچسپ مضمون "ہمارے گھریلو گیت" کے عنوان سے لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہاجرہ بیگم کو خود ان گیتوں کی فضا میں سانس لینے کا موقعہ ملا ہے اور اسی لئے ان کی اس تحریر میں اُس خلوص اور ہم آہنگی کی بہت سی علامتیں موجود ہیں جو زندگی سے بہت قریب رہنے والے فن کاروں کی تخلیق میں پائی جاتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ محترمہ ادبی دنیا کے لئے آئندہ بھی لکھتی رہیں گی۔

یادش بخیر جناب تسکین عابدی بہت دیر کے بعد ہماری محفل میں آئے ہیں مگر شاید کسی دور کے راستے سے آئے ہیں جبھی تو ایک بڑے مزے کی چیز ہمارے لئے لائے ہیں۔ "ریختی" نے ہمارے ادب میں کبھی کوئی سنجیدہ حیثیت حاصل نہیں کی۔ ایک عرصہ ہوا کہ اس کا رواج اُٹھ گیا مگر یہ کہنا شاید کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ہم نے اس صنفِ شاعری سے کبھی انصاف نہیں کیا اور اسے ہمیشہ تعصب کی عینک لگا کر دیکھا کئے۔ کچھ مدت گذری جناب تمکین کاظمی

نے اردو کے ایک مرحوم رسالے قوس قزح میں ریختی پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا تھا، اور ریختی لکھنے والوں کا ایک مختصر تذکرہ بھی ان کے قلم کا رہین ہے، مگر ادبی حلقوں نے بحیثیت مجموعی کبھی اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ موجودہ مضمون میں تسکین صاحب نے اردو کے ایک مشہور ریختی گو جناب عابد مرزا مرحوم المتخلص بہ بیگم کے کلام کا اپنے مخصوص انداز میں جائزہ لیا ہے اور حق یہ ہے کہ بہت خوب لیا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اسے خاص دلچسپی سے پڑھیں گے۔ اور ریختی کی نسبت اپنے نظریئے میں قدرے ترمیم کو راہ دیں گے۔

آخر میں موجودہ شمارے سے آپ کی توجہ کو ہٹا کر پھر سالنامے کی طرف لانا چاہتا ہوں۔ تاکہ جس طرح سالنامہ ابھی سے ادارے کے ذہن پر چھا چکا ہے آپ کے ذہن پر بھی چھا جائے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

اس دفعہ حصۂ نظم معذرت سے شروع ہو رہا ہے۔ گذشتہ شمارے میں دو فروگذاشتیں ایسی ہو گئی ہیں جن کے لئے مجھے ادبی دنیا کے پڑھنے والوں سے ندامت ہے۔ پہلی معذرت اُس نظم سے متعلق ہے جس کا عنوان "لگی کی لاگ" ہے۔ یہ چیز اصلاً حضرتِ آرزو لکھنوی کی ہے جن کے خالص اردو کے تغزل نے تمام اردو داں صاحبوں کے دلوں کو اپنی میٹھی دھن سے موہ لیا ہے۔ میں بھی حضرت آرزو کے متوالوں میں سے ہوں لیکن بدقسمتی سے ان کا مطبوعہ دیوان "بانسری" مجھ تک نہیں پہنچ سکا تھا اس لئے میں اس دلکش نظم سے ابھی روشناس نہیں ہُوا تھا۔ اب جو یہ چیز ایک اور نام سے شائع ہوئی تو مکرمی نسیم فراق گورکھپوری اور ایک غائبانہ کرمفرما نے اس چوری کی طرف توجہ دلائی۔ اس چوری کے کرنے والے حضرات کا نام شریف ثمر جالندھری ہے۔ ان کی جودتِ طبیعت کا اظہار مجھ پر ستمبر کے شمارے کی اشاعت کے عین بعد ہو گیا تھا۔ وہ یوں کہ ان صاحب نے تین غزلیں اشاعت کے لئے بھیجیں لیکن پہلی ہی غزل حضرت اصغر گونڈوی کی تھی۔ اتفاقاً یہ غزل مجھے یاد تھی۔ چنانچہ میں نے تینوں غزلیں لوٹا دیں اور بھیجنے والے کا نام ادبی دنیا کی سیاہ فہرست میں درج کر لیا۔ یہاں معذرت کے علاوہ میں دوسرے رسائل کے مدیروں کے فائدے کے لئے اس ادب چور کا اتہ پتہ بھی درج کئے دیتا ہوں تاکہ سب لوگ ان سے محتاط رہیں۔ شریف ثمر جالندھری رتہ امرال راولپنڈی۔

دوسری معذرت روشن دین تنویر کی نظم "فتح" سے متعلق ہے اس میں تین مصرعے غلط شائع ہو گئے ہیں۔ دوسرے بند کے پہلے دو شعر یوں لکھے گئے ہیں:۔

دشمنوں کی فوج کا ، کوئی جواں نہیں رہا
دشمنوں کے اوج کا ، نام و نشاں نہیں رہا

اصل یوں ہے:۔

دشمن اور اس کی فوج کا، کوئی جواں نہیں رہا
دشمن اور اس کے اوج کا، نام و نشاں نہیں رہا۔

تیسرا مصرعہ "دشمنی نہ رنج تھا"
کی بجائے "دشمنی تھی نہ رنج تھا" ہے

اس غلطی کی طرف توجہ دلانے کے لئے میں جناب حرماں خیر آبادی کا ممنون ہوں۔

دنیا کی بہت سی اور باتوں کی طرح شعریت کا تصور بھی ایک اضافی تصور ہے۔ اگر ایک شخص کو غالب پسند ہے اور دوسرے کو میر تو اس سے غالب یا میر کے اشعار کا درجہ کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ جب اردو شاعری میں نظم آئی تو غزل کے متوالے اسے کچھ مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے، اور نظم میں بھی جب پہلے پہل آزاد نظم نے اپنا جلوہ دکھایا تو لوگوں نے یہی کہا کہ یہ کیسی چیز ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ آزاد نظم بھی مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ ان باتوں سے میرا مقصد شاعری اور شعریت کے تصور کو ایک اضافی تصور ثابت کرنا ہے۔ غزل اگرچہ ہماری شاعری کی بنیادی صنف ہے لیکن اس صنف نے گذشتہ پچاس سال میں ہی مختلف پلٹے کھائے ہیں یعنی غالب اور [illegible] سے پہلے اکثر شعراء کا انداز یکساں ہی ہوتا تھا خواہ تھوڑی بہت [illegible] بھی رہی ہو، پہلے شاعروں میں میر تقی ایک ایسا شاعر دکھائی دیتا ہے جس کا [illegible] تغزل اکثریت سے نمایاں طور پر مختلف تھا، یا پھر اُس کے بعد [illegible] شاعر میر درد ہے۔ موجودہ زمانے نے ہمیں اس لحاظ سے بہت [illegible] کے غزل گو دیئے ہیں۔ جوش کی مسلسل غزل کو دیکھئے [illegible] بن گئی، اسی طرح مبسّر خیال میں فراق گورکھپوری کا حال [illegible] بات ہے کہ فراق کی چند غزلوں میں میر تقی کا انداز دکھائی دیا تھا، لیکن [illegible] جلد ہی بدل گئی اور پھر آہستہ آہستہ اُس نے اپنا ایک ایسا مستقل رنگ قائم کر لیا جس نے اُسے بظاہر صرف شاعروں یا نقادوں کا شاعر بنا دیا ہے۔ موجودہ شمارے میں اس کی جو غزل پیش نظر ہے، اس میں نہ صرف گرتے ہوئے حرفوں اور مناسب الفاظ کے انتخاب کی وجہ سے موسیقی کا عنصر نمایاں ہے بلکہ

مضمون آفرینی بھی کسی طرح کم نہیں۔ موضوع وہی فراق کا "ازلی اور ابدی" موضوع ہے یعنی حسن و عشق و اس کی مختلف کیفیتوں کا بیان، لیکن اس وحدت میں بھی جو کثرت موجود ہے اُس کا صحیح اور پورا پورا جائزہ لینے کے لئے خاص نگاہوں کی ضرورت ہے۔ یہ میری طرف سے ایک اشارہ ہے جو شاید صرف عقلمندوں ہی کو کافی ہوگا!

سعید احمد اعجاز اپنی نظم کو بے حرکت ذہن کی تیرگی سے شروع کرتا ہے اور اس کیفیت سے بھرپور تاریکی کو رات اپنی گود میں لئے ہوئے ہے یہ تاریکی رات پر نہیں چھائی ہوئی بلکہ رات اس کی آغوش میں ہے کیونکہ یہ رات کے منظر کی تاریکی نہیں یہ بے حرکت ذہن کی تیرگی ہے اور پھر اس اندھیرے میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ ایک شعلہ کانپتا ہے۔ یہ شعلہ واضح نہیں۔ شاعر اسے نورانی سا کہتا ہے۔ یونہی جب فنکار کا ذہن کسی وجہ سے تخلیق کی تحریک لیتا ہے تو اگرچہ ذہن میں پیدا ہونے والی چیز اس کی نظر کے سامنے پوری طرح جلوہ گر ہو جاتی ہے لیکن اکثر سب سے پہلے اُس کا مبہم سا احساس ہوتا ہے۔ تخلیقِ شعری کا شعلہ نظروں کے سامنے یوں کانپتا ہے گویا جھیل کے تاریک پانی میں کوئی تنہا کنول "ہو" رات کی آغوش کے پراسرار اندھیرے کا اثر ابھی دور نہیں ہوا ہوتا کہ جھیل کا پانی تاریک ہے۔ اگلے مصرعے میں "ایک زریں ساحرانہ روشنی کا دائرہ نمودار ہوتا ہے۔ دائرہ کیوں! — شاید اس لئے کہ شعلے کے گرد بھی نور کا ایک دائرہ سا بن جاتا ہے کیونکہ روشنی جب پھیلتی ہے تو یکساں رفتار سے ہر سمت رواں ہوتی ہے۔ کوئی سمت اس کے نفوذ سے بچ نہیں سکتی۔ یا [illegible] اس لئے کہ جھیل کے تاریک پانی پر تنہا کنول کسی سفید پتھر کی طرح گرا تھا۔ اور اس سے جو رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے حلقے پیدا ہوئے تھے انہی میں سے ایک زریں ساحرانہ روشنی کا دائرہ بن گیا۔ روشنی ساحرانہ اس لئے کہ پہلے جو اندھیرا تھا وہ بھی پراسرار تھا لیکن نور جب یوں پھیلنا شروع ہوا تو پھیلتا ہی نہیں چلا گیا۔ [illegible] تحریکِ شعری ابھی پوری طرح حرکت میں نہیں آیا اس لئے اس روشنی کے دائرے کے گرد دھندلے دھندلے رنگوں کے ہالے سے ہیں "ان ہالوں میں، اس ساحرانہ روشنی کے دائرے میں، اس تنہا کنول میں، اس نورانی شعلے میں ہی شعر و موسیقی کی پریاں رقص کرتی ہیں" — لیکن ان کا یہ رقص بہت ہی کم عرصے کے لئے ہوتا ہے۔ اس قدر کم عرصے کے لئے کہ آنکھ اس پر جمتی ہی نہیں کہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، بے کراں ظلمت میں، اُسی پہلے بے حرکت ذہن کی تیرگی میں اور تخلیقِ فن سے یہ محرومی شاعر کے دل پر چوٹ لگاتی ہے۔

فنکار کے ہاتھوں سے ساز چھوٹ جاتا ہے۔ یہ ساز کہاں سے آ گیا! اس نورانی دائرے میں شعر و موسیقی کی پریاں رقص کر رہی تھیں، شعر و موسیقی کا گہرا تعلق اس امتزاج سے ظاہر ہے اور شعر کو لکھنے کی کوشش بھی ایک طرح سے ایسی ہی تھی جیسی کسی مغنی کی ساز پر مضراب لگانے کی کوشش۔

ایک بات اور۔ دیر ہوئی مشہور غزل گو حامد علی خاں کی ایک نظم "معبد کا دروازہ" دیکھی تھی، اس نظم کا پہلا مصرعہ تھا "وقت کبھی گذرا ہی نہیں ہاں ہم گذریں تو گذریں" ——— اور اس کے بعد کچھ اس قسم کا مفہوم تھا کہ آج تک مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب میں اور تو دعا سے فارغ ہو کر معبد کے دروازے سے نکلے تھے۔ گویا شاعر کے لئے وہ لمحہ گذرا نہیں تھا، اس لمحے کا اثر اس کے ذہن پر اس قدر گہرا ہوا کہ اس کے ذہن نے مستقبل کی طرف حرکت کرنا ہی چھوڑ دیا۔ ماضی ہی کا ایک پل اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ لمحہ ماضی کا نہ رہا، ہمیشہ کے لئے حال کا لمحہ بن گیا۔ حامد علی خاں کی اس نظم میں وقت کا جو تصور پیش کیا گیا تھا وہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے عین مطابق تھا۔ اردو شاعری پر بیسویں صدی کے علوم کے اثرات کی مثال کے لحاظ سے یہ نظم ایک بہت اونچا درجہ رکھتی تھی۔

اعجاز کی موجودہ نظم میں بھی ایک ایسا ہی پہلو نمایاں ہو گیا ہے مصرعہ ہے "نور کے اک ذرے سے بھی مختصر، موہوم لمحے کے لئے"۔ پہلے سائنس والوں کا خیال تھا کہ روشنی کی ہستی چند لہریں ہیں، پھر بعض نے کہا کہ لہریں نہیں بلکہ یہ ذرے ہیں، لیکن اب پھر سر جیمس جینز نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ روشنی لہریں بھی ہے اور ذرے بھی۔ اس مصرعے میں "لمحے" کے وقفے کو نور کے ذرے سے بھی مختصر کہا گیا ہے۔ ذرہ جسامت رکھتا ہے، جسامت فاصلہ ہے وقت اور فاصلے کے متعلق یہ نکتہ بھی نظم کی ایک قابلِ توجہ خوبی ہے۔ نظم کے شروع میں دائرے کی پھیلتی ہوئی لہروں کا تذکرہ ہے اس مقام پر شاعر نے تحریکِ شعری کے دھیمے کو لہروں کے تصور سے ظاہر کیا ہے اور اب آگے چل کر واضح طور پر نور کے ذرے سے بھی مختصر کہا ہے، کیونکہ شعر نا تمام رہ گیا — لیکن یہ نظم مکمل ہو گئی۔ اور نظم بھی کیسی!

سکندر علی وجد کی نظم "شمع" ایک کامیاب طنز ہے۔ اور اس شعر میں حقیقت کی تلخی کو دیکھئے "گاہ بر [illegible] چڑھائی جان تو نے گل کربلا سپاہی کے لئے کون بدبخت آئے گا یاں داد خواہی کے لئے"۔ اور اس حقیقت کی تلخی سے شاعر کے حساس ذہن میں جو ردِ عمل ہوتا ہے اُس کی نفرت انگیز اور شعلہ سا

کیفیت کو آخری شعر میں دیکھئے "یہ طلسمِ ساحری بے اصل و بے بنیاد ہے،
یہ بھی اک جنت ہے، لیکن جنتِ شداد ہے!"

سُہاگ گیت "قدرت اللہ شہاب کا تازہ ترین ترجمہ ہے جو ایک طبعزاد نظم کی دلکشی لئے ہوئے ہے۔ اس سے پیشتر گذشتہ سال آپ اسی شاعر کے قلم سے شیلے ہی کا ایک ترجمہ "بادِ غرب" دیکھ چکے ہیں شہاب کے یہ ترجمے اگر زیادہ دیر تک جاری رہے تو شیلے کو بھی اردو ہی کا شاعر بنا دیں گے۔

میراجی کی نظم "دو نقشے" میں مرد اور عورت کے فرد دینے اور اثر لینے والے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے اور گیت میں ان دونوں طاقتوں کے اُس ملاپ کا ذکر ہے جس کے ناپائیدار ہونے کا شاعر کو یقین ہے کیونکہ وہ ہر چیز کی طرح "وفا" کو بھی فانی سمجھتا ہے۔

میراجی

غزل

ارج کا پستی میں پنہاں راز ہے — آسماں تک خاک کی پرواز ہے
ہیں فضائیں پردہ تیرے ساز کا — یہ خموشی بھی تری آواز ہے
ہو چکے رمز آشنائے مرگ ہم — زندگی کا راز اب تک راز ہے
ہر نفس سے ہے مایہ دارِ زندگی — میرا ہر نغمہ شکستِ ساز ہے
ہوشیاری ابتدا کی بات تھی — میری مستی انتہا کا راز ہے
خاک کی تقدیس کا باعث ہوں میں — میرے سجدوں پر حرم کو ناز ہے
اس کو کنجِ آشیاں سے کیا غرض — جو ہلاکِ لذتِ پرواز ہے
ہے نوائے رازِ خاموشی مری — عاشقی کا ساز بے آواز ہے
دیکھنے والوں کا رتبہ دیکھنا — خود مجھے اپنی نظر پر ناز ہے
کس نے دیکھا ہے مآلِ عاشقی — ختم ہو جانا یہاں آغاز ہے

کم کہاں ہوتی ہے تاباں دل کی آگ!
عشق کا انجام بھی آغاز ہے

ظفر تاباں

ایک قطعہ

بن گیا پیغمبرِ سنہری پتیوں کا بہار
پا گئی ہے عارضِ گلگوں میں رنگِ تشنہ حال
یوں سمٹتا جا رہا ہے شامِ رنگیں کا سماں
کھینچتا ہو جس طرح پانی سے ماہی گیر جال

ادیب مالیگانوی

آئینۂ عالم

آزاد فرانس کا آخری سانس — !

۲۱ جون کو تین بج کر ۱۵ منٹ پر کمپین کے جنگل میں ایک گاڑی آکر رکی جس میں سے ہر ہٹلر، مارشل گورنگ، ہر وان ربن ٹراپ، ہر ہس، جرنیل ولیم کیٹل، جرنیل بروشیش اور مارشل امیڈر اترے۔ یہ ساتوں فوجی لباس پہنے ہوئے تھے۔ ہٹلر کے کوٹ کے دائیں جیب کے ساتھ ایک سنہری سا آئرن کراس لٹک رہا تھا۔ یہ لوگ یہاں فرانس کی آزادی کو موت کی آغوش میں سلانے آئے تھے۔ اس جنگل میں جہاں آج سے ۲۲ سال پیشتر تاریخ عالم کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا جو موجودہ جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ اسی جنگل میں کئی تاریخی واقعات پیش آ چکے ہیں۔ اسی جنگل میں لوئی شانزدہم اور میری انٹونی کی ملاقات ہوئی تھی یہیں نپولین اور میری لوئی کی ملاقات ہوئی تھی اور اسی جنگل میں آج سے ۱۰ برس پیشتر ڈیوک آف برگنڈی نے فرانس کی مشہور محب وطن جون آف آرک کو شکست دی تھی اور آج یہاں وہ واقعہ پیش آنے والا تھا جو شاید آئندہ جنگ عظیم کا محرک ہو۔

جہاں ہٹلر کی گاڑی رکی اس کے بالکل سامنے سورین کے بہادروں کی یادگار میں بنایا ہوا عظیم الشان مجسمہ تھا جس میں فرانس کو ایک تلوار ظاہر کیا گیا تھا اور وہ تلوار جرمنی کے شاہ باز کے سینے میں گھونپی ہوئی تھی۔ مگر آج جرمنوں نے اس مجسمے پر جرمن جھنڈے لپیٹ رکھے تھے تلوار کھوا سنکر نے ڈھانپ رکھا تھا اور نیچے کندہ کیے ہوئے وہ الفاظ بھی جو سورین کے بہادروں کی یاد تازہ رکھتے تھے۔ جرمن جھنڈوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔

ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے اترتے ہی اس یادگار پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور آگے نکل گئے۔ کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ایک پتھر زمین سے ابھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ لوگ اس کے پاس پہنچ گئے اور اس پر کندہ الفاظ کو پڑھا۔ یہ پتھر گذشتہ جنگ عظیم میں فتح پانے کے بعد اتحادیوں نے نصب کیا تھا اور اس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

"اس مقام پر گیارہ نومبر ۱۹۱۸ء کو وہ آزاد اقوام کے ہاتھوں جنہیں جرمن اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے تھے جرمنوں کے مجرمانہ غرور کو شکست ہوئی تھی"

۲۲ جون کو یہ پتھر اکھاڑ دیا گیا۔

اس مقام سے وہ سب ریلوے لائن کی طرف گئے اور ایک اور پتھر دیکھا جو بالکل اس مقام پر نصب تھا جہاں گذشتہ جنگ عظیم میں جرمن نمائندے مارشل فوش سے عارضی صلح کی درخواست کرنے آئے تھے ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے اسے دیکھا اور مارشل فوش کی ڈائننگ کار میں جو عجائب گھر سے یہاں پہنچائی گئی تھی، چلے گئے۔ اندر آ کر ہٹلر مارشل فوش کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے مارشل فوش کا مجسمہ تھا۔ ہٹلر کے دائیں طرف مارشل گورنگ اور کیٹل تھے۔ میز کے ایک طرف بروشیش اور ہر ہس تھے اور میز کے دوسرے کنارے پر ربن ٹراپ اور جرنیل امیڈر تھے۔ میز کا ایک کونہ ابھی خالی تھا جہاں چار کرسیاں تھیں۔

۳ بج کر تیس منٹ پر ایک اور کار سورین کے بہادروں کے مجسمے سے کسی قدر فاصلے پر آ کر رکی جس میں سے جنرل چارلس ہنٹزگر، محکمہ فضائی کا جرنل جین میری جوزف بارگرٹ، امیر البحر موریس آکتیبی لی لک اور پولینڈ کا فرانسیسی سفیر لی اں نول برآمد ہوئے۔ یہ لوگ آج انہی جرمنوں سے عارضی صلح کی درخواست کرنے آئے تھے جنہیں انہوں نے گذشتہ جنگ میں شکست دی تھی۔ انہوں نے گاڑی سے اتر کر سامنے مجسمے پر ایک نگاہ ڈالی اور آگے چلے گئے۔ اتنے میں تین جرمن فوجی افسران کی

رہنمائی کے لئے آ گئے۔ انہیں جرمن گارڈ آف آنر نے سلامی دی اور وہ مارشل فوش کی ڈائننگ کار کے دروازے پر جا کر تھوڑی دیر کے لئے رکے اور سر جھکائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کے داخل ہوتے ہی ہٹلر اور اس کے ساتھی ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ہٹلر نے باری باری ہاتھ اٹھا کر نازی طریقے سے ہر ایک کے سلام کا جواب دیا۔ مارشل گورنگ اور مارشل امیڈر نے بھی اپنے ہاتھوں کو تھوڑا سا فضا میں بلند کیا۔ پر دشیش اور کیٹل نے فوجی طریقے سے اور ہیس اور ربن ٹراپ نے نازی طریقے سے سلام کیا۔ اس مختصر سے ڈرامے کے بعد ہٹلر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، اور ہیس نے جرنل کیٹل کو اشارہ کیا، اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور پڑھنے لگا۔

"گیارہ نومبر ۱۹۱۸ء کو اسی ڈائننگ کار سے جرمنی کے مصائب کا آغاز ہوا۔ پھر ۳ ستمبر کو فرانس اور انگلستان نے کسی وجہ کے بغیر جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اب چونکہ جرمنی نے فرانس کو شکست دے دی ہے۔ اس لئے فرانس عارضی صلح کی درخواست لے کر آیا ہے اور اگر اسی جنگل میں اس کا فیصلہ ہو رہا ہے تو اس بے انصافی کی تلافی ہو رہی ہے جو جرمنوں سے گیارہ نومبر کو کی گئی تھی اور جو جرمنوں اور فرانسیسیوں دونوں کے لئے شرمناک تھی۔ اگرچہ فرانس کو بپایان کار شکست ہوئی ہے مگر اس نے نہایت پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ اس لئے عارضی صلح کے عہد نامے میں اس بات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا جائے گا کہ فرانس سے ایسا سلوک کیا جائے جو ایک بہادر قوم ایک بہادر دشمن سے کر سکتی ہے۔"

۴ بج کر ۲۶ منٹ پر جب آفتاب کافی ڈھل چکا تھا فرانسیسی نمائندے مارشل فوش کی ڈائننگ کار سے نکلے اور انہیں ایک خیمے میں لے جایا گیا جہاں چار کرسیاں ایک میز اور ایک سٹول تھا جس پر ہاتھ دھونے کا سامان رکھا تھا۔ یہاں آ کر انہوں نے ٹیلیفون پر اپنی حکومت کو صلح کی شرائط سے آگاہ کیا جو فل سکیپ کے تیس صفحوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔

اس دوران میں بورڈو گورنمنٹ صلح کی شرائط کا نہایت بے تابی سے انتظار کر رہی تھی۔ اور مارشل پیتاں نے اہل فرانس کے نام ایک پیغام نشر کیا تھا جس میں اس نے وعدہ کیا تھا کہ ذلت آمیز شرائط ہرگز تسلیم نہیں کی جائیں گی۔ لوگ نہایت بے تابی کے ساتھ فیصلے کا انتظار کر رہے تھے اور ابھی تک جنگ بدستور جاری تھی۔

اس رات فرانسیسی نمائندوں کو پیرس سے ۵۲ میل دور ایک اور مقام پر رات بسر کرنا پڑی۔ جہاں سے دوسرے دن انہیں پھر اسی جنگل میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں آ کر وہ پھر جرنیل کیٹل سے ملے۔ اس دفعہ جرنیل کیٹل کے ساتھ اس کے پانچ سکرٹری تھے۔ انہوں نے صلح نامہ کی ایک ایک شرط پر بحث کی جس کے دوران میں فرانسیسی نمائندے کوشش کرتے رہے کہ جرمن کسی قدر نرمی کا سلوک کریں۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

"دل شاہیں نہ سوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است"

اسی دن جرنیل کیٹل نے فرانسیسی نمائندوں کو بتایا کہ وہ سوچ بچار کے لئے اب مزید وقت نہیں دے سکتے اس لئے وہ انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں جس پر فرانسیسی نمائندوں نے کہہ دیا کہ وہ حرف بحرف صلح نامہ سے متفق ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے جب جرنیل کیٹل اور فرانسیسی نمائندے مارشل فوش کی ڈائننگ کار میں رخصت ہونے سے پیشتر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے تو فرانسیسی نمائندوں کے سربراہ نے کہا۔

"ہم حکومت کے فیصلے پر عمل پیرا ہونے سے پیشتر آپ کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ جب مستقل صلح نامے کی شرائط ہوں تو اس وقت ہماری حالت کو پیش نظر رکھا جائے اور شرائط ایسی ہوں کہ دونوں ہمسائے باعزت زندگی بسر کر سکیں"۔

اس کے جواب میں مارشل کیٹل نے کہا۔

"شکست خوردہ دشمن کے ساتھ شرافت کا سلوک کرنا فاتح کے لئے عزت کا باعث ہوتا ہے"۔

جب مارشل کیٹل نے یہ الفاظ کہے تو فرانسیسی نمائندوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بار بار رومالوں سے آنکھیں صاف کر رہے تھے، اس وقت مارشل کیٹل نے ان کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں کہ اب دستخط کرنے میں دیر نہ ہونی چاہیئے۔ چھ بج کر ۵۰ منٹ پر (جرمن وقت) انہوں نے دستخط کر دیئے۔

فرانسیسی حکومت نے سرکاری طور پر صلح کی شرائط کے متعلق کوئی اعلان شائع نہ کیا لیکن لندن سے ان شرائط کا خلاصہ شائع ہوا جو حسب ذیل ہے۔

۱۔ ٹوار کا شمال مغربی علاقہ مع فرانس کی مغربی بندرگاہوں کے جرمن قبضے میں آ جائے گا۔

۲۔ ملک کا انتظام جرمن افواج کریں گی جن کا خرچ فرانس برداشت کرے گا۔

(۳)۔ فرانس کی حکومت غیر مفتوحہ علاقے میں اپنے لئے دارالحکومت چن سکتی ہے۔

(۴)۔ فرانس کی برّی، بحری، اور فضائی فوجیں بالکل غیر مسلح کر دی جائیں فرانس ملک کے انتظام کے لئے مزدوری فوج رکھ سکتا ہے۔

(۵)۔ فرانس کے بحری بیڑے کو اکٹھا کر دیا جائے۔ اُسے جرمن حکومت اپنے مقصد کے لئے استعمال نہیں کرے گی، بلکہ اس سے فقط ساحلی علاقوں کی حفاظت اور سرنگیں صاف کرنے کا کام لیا جائیگا

(۶)۔ فرانس تمام جرمن قیدیوں کو رہا کر دے گا۔ جرمن حکومت فرانسیسی قیدیوں کو صلح نامہ ہونے پر رہا کرے گی۔

(۷)۔ قلعہ بندیوں کے اسلحہ جرمنوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ برّی اور بحری حفاظت کے اسلحہ بھی جرمن حکومت کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

(۸)۔ غیر مفتوحہ علاقے میں اسلحہ سازی کار خانے بند کر دیئے جائیں گے

(۹)۔ فرانس کے تجارتی جہاز بندرگاہوں سے باہر نہیں جا سکیں گے اور جو جہاز اس وقت فرانس کی حدود سے باہر ہیں وہ فوراً غیر جانب دار ممالک کی بندرگاہوں میں چلے جائیں گے۔

(۱۰)۔ فرانسیسی طیارے پرواز نہیں کر سکیں گے، انہیں جرمنی اور اطالیہ کے قبضے میں دے دیا جائے گا۔

(۱۱)۔ فرانس کے تمام ریڈیو سٹیشن جرمن حکومت کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

(۱۲) مقبوضہ علاقے میں سے کوئی فرانسیسی اپنا قیمتی سامان لے کر باہر نہیں جا سکے گا

(۱۳)۔ فرانسیسی حکومت جرمنی اور غیر مقبوضہ علاقے کے درمیان آمد و رفت کی آسانیاں بہم پہنچائے گی۔

(۱۴)۔ یہ عہد نامہ اُس وقت تک قائم رہے گا جب تک صلح نامہ مکمل نہیں ہوتا۔ اگر جرمن حکومت کو پتہ لگا کہ فرانس نے اس عہد نامے کی کسی ایک شرط کی بھی خلاف ورزی کی ہے تو وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔

فرانسیسی نمائندے جرمنوں سے عارضی صلح کرنے کے بعد میونخ گئے۔ جہاں ہٹلر اور مسولینی سے ان کی ملاقات ہوئی وہاں سے وہ اطالیہ کے ساتھ صلح کرنے کے لئے روما گئے اور مع اور گھنٹے کے بعد واپس آ گئے۔ اس کے بعد ۲۵ رجون کو ایک بج کر ۲۵ منٹ پر جنگ ملتوی ہو گئی۔ ہٹلر نے دس دن تک جرمنوں کو جشن فتح منانے کا حکم دیا، اور فرانسیسی حکومت نے اتنے ہی دن تک ماتم کیا ——— !

تابش صدیقی

غزل

مری نگاہ کا مرکز ہے دو جہاں سے پرے
درِ زماں سے بروں حلقۂ مکاں سے پرے
حریمِ ناز میں داخل ہو کس طرح کوئی
کہ برقِ جلوۂ جاناں ہے آستاں سے پرے
قدم قدم پہ مٹا جا رہا ہوں منزلِ دوست!
میں جانتا ہوں کہ تو ہے مقامِ جاں سے پرے
فضائیں اور بھی ہیں دلکشا وہ کیا جانیں
اُڑے نہ ہوں جو کبھی کنجِ آشیاں سے پرے
خموش ہوں کہ خموشی ہے کائنات کا نطق
زباں یہ بولتے ہیں سرحدِ زباں سے پرے
مجھے ازل سے بنایا گیا ہے برقِ خیال
مری تلاش کرے کوئی کہکشاں سے پرے
سوادِ عرشِ بریں ہے مقامِ عشق امیںؔ
زمیں سے دور بہت دورِ آسماں سے پرے

امینِ حزیں

غزل

دنیا دنیا عالم عالم تھے اک روز یہی ویرانے
وادی وادی جنگل جنگل چھان گئے تیرے دیوانے

دبدھا پیدا کر دے دلوں میں ایمانوں کو دے ٹکرانے
بات وہ کہہ اے عشق کہ سن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے

امن واماں کی دنیا میں بھی ایسوں کو کب ملتے ہیں ٹھکانے
کئی بار تو عشق گیا ہے موت کے منہ میں جان بچانے

آنکھیں مل کر بھی نہیں ملتیں اپنے بھی ہیں یہاں بیگانے
کوئی تیری بزمِ ناز میں کس کو پوچھے کس کو جانے؟

کانٹا کانٹے سے نکلے گا ایسے میں پھول کا کام نہیں
چبھنے والی بات تو کہنے چلا ہے کوئی برا ہی مانے

اسی درد سے دنیا غافل اسی درد کا گھر گھر چرچا
ایک شبِ غم کی سو راتیں، ایک محبت سو افسانے

اوروں سے بھی ہنس کر رو کر جھوٹا سچا پیار کیا تھا
وہ بھی تھے نرے عشق کے حیلے وہ بھی تھے ترے غم کے بہانے

حسن کو حسن سمجھ لینا بھی اے اہلِ دل کارے وارد
تم بھی چلے ہو کس کے آگے ہنسنے ہنسانے رونے رلانے

اوپر سے خوش ہو لے ناداں کام دہن کی ہے خیر اسی میں
پریم کے سکھ لوہے کے چنے ہیں ہوتا ہو گر پڑ جائیں چبانے

تو نے ہوا کی نرم روی کو اپنے گنو پہ لگا ناچا ہا
صید گہِ ہستی میں ناداں یونہی خطا ہوتے ہیں نشانے

غفلت ہو تو کوئی چونکائے جاگے ہوؤں کو کون جگائے؟
ہائے وہ کارِ جہاں جس سے خود نکلیں بے عملی کے بہانے

عشق کی باتیں عشق کے چرچے گھر گھر میں ہیں، عشق پہ لیکن
آنکھیں پڑیں اگر دنیا کی دنیا مشکل سے بچانے

حسن کے پاس اس کا نہیں چارا عشق کا اس میں کیا ہے اجارا
یوں بھی پھر جاتی ہیں نگاہیں یوں بھی بدل جاتے ہیں زمانے

اپنی اپنی سب کو پڑی ہے کاش سمجھ میں یہ عشق کے آئے
حسن سے بھی امید نہ رکھے اک دنیا سے بیر جو ٹھانے

دنیا سے کیا پوچھ رہا ہے سو انجان نہ ایک سجان
دنیا کو پوچھ اس کی نظر سے دنیا کو دنیا کیا جانے؟

اس کی نظر پر حیراں حیراں مجبوری بھی آزادی بھی
وہی کہے جو سب کے دل میں سب کی سنے اور اپنی منانے

دنیا اپنے رنگ محل میں خواب خوشی کے دیکھ رہی تھی
جس میں خوشی نے آنکھیں کھولیں تھے وہ محبت کے غم خانے

حسن و عشق بے سادہ دلی کے آپ اپنی توہین میں گویا
تھوڑی دیر کو بھولے بن لیں ہم بھی سیانے تم بھی سیانے

عشق ہے بے بس یہ تو ہے ظاہر دنیا بھر میں غیب سے لیکن
کون لگا ہے آگ لگانے قہر اٹھانے آفت ڈھانے؟

غزل

ذرہ ذرہ گھل جائے گا اس دنیا کا وقت کی رو میں
تو نے سنا ہے لون کی پتلی چلی سندھ کی تھاہ لگانے

یہ آئین وفا بھی برحق یہ تسلیم و رضا بھی درست
لطف و ستم کیا! حسن بھی لیکن پیڑ پرائی کچھ تو جانے

ترک محبت بھی کرتا جا، دردِ محبت بھی سہتا جا
ایک ہی رٹ رکھتے ہیں ناداں دنیا بھر کے چتر سیانے

سنّاٹے کی چیخیں بھی اک دن انساں کو چونکا دیتی ہیں
بزم طرب میں خواب یہ دیکھا ہمیں چراغ ہمیں پروانے

حسن کی اوٹ میں جانے کب سے سوتی ہیں دنیا کی تقدیریں
نرگس رعنا دیکھ کے ہم بھی بیٹھے ہیں کس جادو جگانے

شعلۂ گل پر چیاد شبنم سر تا سر تصویر حیات
رو لینا ہے ہنستے ہنساتے ہنس لینا ہے غم کے بہانے

صبر و سکوں بھی کیف نہاں بھی ساز طرب بھی اس کا کرم بھی
پھر بھی رنگ اڑا جاتا ہے عشق کی باتیں عشق ہی جانے

یاد کسی کی کرتا بھی جا دل سے کسی کو بھلاتا بھی جا
پیتا بھی جا بھرتا بھی جا ہوش اور غفلت کے پیمانے

ذرہ ذرہ تارا تارا قطرہ قطرہ دریا دریا
ہوش و خرد میں حیراں ان کو کیا کوئی جانے کیا کوئی مانے!

بھولے بھٹکوں میں کیوں اکثر منزل سے آتی ہیں صدائیں
گر جائے پاتال میں لیکن گلی گلی کی خاک نہ چھانے

ایک تغافل لاکھ توجہ ایک تجاہل لاکھ پتے
اہل محبت تجھ سے چلے ہیں حال چھپانے بات بنانے

سوتی دنیا جاگ اٹھی ہے ذرہ ذرہ کانپ اٹھا ہے
بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی جو عشق لگا ہے قیامت ڈھانے!

مجبوری آزادی نکلی، رنج پرستی شادی نکلی
دنیا کی تقدیریں پلٹیں عشق کی محنت لگی ٹھکانے

غفلت کیسی، کیا ہشیاری! بیداری کیا، خواب بھی کیسا!
دونوں کا ہے ایک ہی عالم کیا دیوانے کیا فرزانے!

پئے بغیر یہ جوش ہے ساقی، پینے کا کب ہوش ہے ساقی
دور شراب کہاں کہ ابھی تو ٹوٹتے جاتے ہیں پیمانے

مٹ مٹ کر یہ ابھرنا گویا تیرے بائیں ہاتھ کا کھیل
تیری بڑی بات اے دنیا تیری مہما کون بکھانے!

پر سکھوں کے نربہیر ہے لیکن بات کے آ جانے پر
ضد تو وہی ہے جس کو زمانہ سو سمجھائے ایک نہ مانے

حسن بھی تھا اپنی پرچھائیں، شام غریباں دیکھ فراق!
عشق وہی ہے اب بھی لیکن چھوٹ گئے اپنے بیگانے

فراق گورکھپوری

بیگم کی ریختی

لفظ ریختی سے نہ صرف زمانۂ ماضی بلکہ حال کے ان بزرگوں کو بھی جن کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے کچھ ایسی کراہت ہونے لگتی ہے کہ جس کا اظہار میرے لئے دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ چونکہ اس وقت میرا موضوع صرف عابد مرزا بیگم مرحوم کی ریختی گوئی ہے اس لئے میں ریختی کی ابتدا اور انتہا میں الجھنا نہیں چاہتا، کیونکہ اگر میں ریختی کے موجد کے کھوج میں قدم اٹھاؤں اور اس کو کسی طرح ڈھونڈھ کر یہ بتلاؤں کہ ریختی کا موجد کون تھا اور اس کو ریختی کہنے کا خیال کیوں ہوا اور اس کے معاصر کون تھے اور میری تحقیق سے اور تذکرہ نویسوں کو اتفاق ہے بھی یا نہیں تو اس دلچسپ مجذوب کی بڑ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان حضرات کو تکلیف ہونے لگے جو اس لطیف صنف شاعری کو ظاہرا برا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت مجھے تحقیق کرنے کی ضرورت بھی نہیں اور وہ اس لئے کہ آج سے بہت پہلے قابل محققین نے اس کی انتہا کو پہنچ کر ایک موجد کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس وجہ سے بھی اس انتہا و ابتدا کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ البتہ اس کی پیدائش کیسے ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے، یہ باتیں آپ کو جناب تمکین کاظمی کی زبان سے سناتا ہوں جو انہوں نے آج سے دس سال پہلے اپنے "تذکرہ ریختی" کے مقدمے میں لکھیں۔ ان کا یہ کہنا از حد دلچسپ بھی ہے اور قرین قیاس بھی — وہ فرماتے ہیں کہ

"معدودے چند مردوں پر عورتوں کے خیالات کا زیادہ اثر پڑا یا کسی قدرتی کمی کو ان میں نسائیت پیدا ہو گئی تو وہ اپنے آپ کو عورت سمجھنے لگے حالانکہ قدرت نے انہیں مرد پیدا کیا تھا۔ مگر وہ منشائے قدرت کے خلاف نہ تو عورت بن سکے اور نہ مرد ہی رہے بلکہ ایک جداگانہ ہستی قائم ہو گئی۔ اسی طرح بعض عورتیں بھی اپنے اندر مردانہ جذبات اور مردانہ خصوصیات کو محسوس کر کے مرد بننے کی کوشش کرنے لگیں مگر وہ نہ تو مرد ہی بن سکیں اور نہ عورت ہی رہیں بلکہ ایک جداگانہ حیثیت قائم کر کے درمیانی قرار پائیں۔ اسی طرح آپ کو درمیانہ مرد اور درمیانی عورتیں اکثر ملیں گی۔ مردوں کے اس درمیانہ طبقے کے متعدد نام رکھے گئے اور مختلف ملکوں میں مختلف اسما سے مشہور ہیں مگر عورتوں کی اس درمیانی صنف کا کوئی نام ہی نہیں تجویز کیا گیا۔ اور نہ کسی ملک میں کسی خاص نام سے شہرت ہوئی، چونکہ بہ نسبت مردوں کے ان کی تعداد کم تھی اس لئے الشاذ کالمعدوم کے تحت انہیں بمنزلۂ صفر ہی سمجھا گیا۔

"مردوں میں نہ صرف بعض اس درمیانہ روش پر گامزن نظر آتے ہیں بلکہ بعض ایسے بھی ہیں کہ ان میں سوائے لطافت خیال کے اور کوئی بات عورتوں کی سی نہیں ملے گی اور اسی طرح بعض عورتیں بھی نسائیت کا مکمل نمونہ ہوں گی مگر ان کے خیالات مردوں کے سے ہوں گے بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مرد اپنے آپ میں نسوانی خیالات کی موجودگی اور ان کے جذبات کی لطافت کو محسوس کرتے ہیں اور عورتیں اپنے تئیں مردانہ خیالات کی حامل سمجھتی ہیں۔ انہیں عورتوں کے متعلق بیگم صاحب نے کہا ہے

انھیں جن کے قلم سے باتیں جنگی کی ملے بلاوہ عورتیں بھی مردوں سے کم نہیں
یہی نسوانی خیالات کی رو تھی جو مردوں میں پیدا ہو کر ریختی گوئی کی باعث ہوئی۔ نہ تو کوئی فحش خیال اس کا محرک ہوا اور نہ میلوں، تماشوں کی سیر ہی....."

ریختی شاعری کی ایک مستقل صنف ہے جس طرح کہ ریختہ میں مسدس، مخمس، قصیدہ، رباعی، سلام، مثلث، واسوخت، مثنوی وغیرہ موجود ہیں۔ اسی طرح ریختی میں بھی یہ تمام چیزیں موجود ہیں اور ان میں شعر کہے جاتے ہیں۔ ریختہ میں یہ ہوتا ہے کہ مرد ہی عاشق ہوتا ہے اور مرد ہی معشوق۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ریختہ کے شاعر کا معشوق عورت ہوتی ہے اور وہ مخاطب بھی عورت ہی سے ہوتا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں شاعری ایران سے آئی

اور فارسی شاعری میں عورت سے تشبیب کرنا معیوب سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے مرد کو اپنا مخاطب بنایا اور اسی کا تتبع ریختہ میں بھی کرنے لگے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ شعرائے زبان "بیٹی تجھے کہتی ہوں بہو تو سُن" جیسی دکنی کہاوت پر عمل کر کے مرد کے پردے میں عورت سے عشق کرتے ہوں۔ خیر کچھ بھی ہو مگر ریختی میں عورت عاشق ہوتی ہے اور مرد معشوق۔ چونکہ عورت شرم و حیا کی دیوی سمجھی جاتی ہے اس لئے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زبان سے اپنے معشوق یعنی مرد کو اپنے جذبات ہجر و فراق یا اس دکھ درد و غم سے آگاہ کرے۔

ریختہ اور ریختی کا فرق آپ نے محسوس کر لیا یعنی مرد اپنی مردانی زبان میں جو جذبات ظاہر کرتا ہے وہ ریختہ ہے اور عورت اپنی نسوانی زبان میں جو جذبات ادا کرتی ہے وہ ریختی ہے۔

عام طور پر ریختی کو فحش اور گندہ سمجھ کر ظاہراً اس سے احتراز کیا جاتا ہے کیونکہ اس صنف شاعری میں فحش استعارات اور گندی تشبیہات بہت ہوتی ہیں۔ مگر یہ گندگی ریختہ میں بھی موجود ہے۔ آتش، ناسخ، ذوق، وغیرہ کون ہے جو اس گندگی میں مبتلا نہیں بعضوں نے گندے اور فحش الفاظ استعمال کئے ہیں اور بعضوں نے گندہ تخیل پیش کیا ہے۔ غرض دونوں ایک حمام میں ننگے ہیں آتش کا تخیل ناف میں اٹک کر رہ جاتا ہے تو بے ساختہ چیخ اٹھتے ہیں کہ

یہ جانتے تو تمہیں ہم نہ باندھنے دیتے ۔ کمر کے ساتھ لپیٹے گا ناف کو پٹکا

ادھر ناسخ کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے اور وہ شکم صاف کے مخمل پر پھسل پڑتے ہیں

شکم صاف کے تقریب ہے مکر ۔ یاں ہے مخمل یہ خواب مخمل کا

استاد ذوق بھی "مرا عشق کم خرچ بالانشیں" ہے کہہ کر اپنے چاد ڑی بازار کے چکروں اور چکلہ گردی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں اور لوگ ان شعراء کے تمام اشعار کو غور سے نہیں دیکھتے۔ اس قسم کے اشعار چھوڑ کر صرف چند اچھے شعر چن لیتے ہیں، گویا باغ سمیٹ لیتے ہیں پھولوں کو چھوڑ کر کانٹے اگر افسوس ہے کہ ریختی کے مطالعے کے وقت ایسا نہیں کیا جاتا فحش اور گندے خیالات کو چھوڑ کر عمدہ اور اچھے خیالات نہیں لے لیتے!

صنف ریختی میں نہ صرف غزل، قصیدہ، مخمس، مسدس، ہی کہے گئے ہیں بلکہ حمد، نعت، منقبت، مدح اور ہجو وغیرہ بھی اس میں موجود ہے۔

ریختی میں جذبات نگاری اور نفسیاتی کیفیت کا بیان نہایت عمدگی کے ساتھ اس زمانے سے ہو رہا ہے جبکہ ریختہ میں یہ بات بالکل مفقود تھی۔ رنگین، انشا، قیس اور جان صاحب نے تو جذبات نگاری میں کمال کر دیا معمولی سے معمولی واقعہ کو اس عمدگی سے نظم کیا کہ تعریف نہیں کی جا سکتی،

ریختی کے ایک استاد عابد مرزا مرحوم بھی تھے جو لکھنؤ کے باشندے تھے۔ عمر جوانی میں حیدرآباد آ رہے۔ عابد مرزا نام ہے تخلص ریختہ میں بیگم اور ریختی میں بیگم تخلص کرتے تھے۔ ان کے اجداد شیراز سے آئے تھے اور کتاب خوانی کرتے تھے بیگم کے والد حسین مرزا الزاب خاص محل عالم اور نواب فخر محل محلات عالیات واجد علی شاہ اختر کی سرکار میں کتاب خوانی پر مامور تھے ۱۸۸۵ء میں بیگم لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور مٹیابرج کلکتہ میں جان عالم کے زیر سایہ پرورش پائی۔

بیگم کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ تیرہ سال کی عمر سے ریختہ میں شعر کہہ کر آغا مجو شرف سے اصلاح لینے لگے۔ الف الدولہ کے پاس خانم جان کو ریختی پڑھتے سنا تو آپ کو بھی ریختی کہنے کا شوق ہوا اور کچھ دنوں تک ریختی کا مطالعہ کر کے خود بھی ریختی کہہ کر مرزا علی بہادر گلشن الدولہ کو دکھانے لگے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں خاصی مشق پیدا کر لی، نواب لطف علی خاں ابن ابراہیم خاں نے ۱۹۱۱ء میں ایک بہت ہی دھوم دھام کا مشاعرہ کیا اور بیگم کو بھی دعوت دی گئی تو یہ بھی شرکت کے لئے پٹنہ گئے۔ یہ مشاعرہ تین دن تک رات دن ہوتا رہا۔ بیگم نے وہاں کئی ایک رباعیاں پڑھ کر مشاعرہ میں خاصی دھوم مچا دی، منجملہ رباعیوں کے ایک یہ بھی تھی، اس رباعی میں شعرائے عصر پر چوٹ کی گئی تھی۔

جو شاد تھا اس کے دل کو ناشاد کیا ۔ محفل کو مشاعرے کی برباد کیا

کہہ کے جو دوسرے سے لایا تھا غزل ۔ آ کے گھر سے کوئی نہ کیوں یاد کیا

اس کو سن کر شاد عظیم آبادی مرحوم اور ان کے ساتھی برافروختہ ہو گئے اور جنگ و جدل تک نوبت پہنچ گئی اور بڑی معرکہ آرائی رہی مگر آخر میں نواب لطف علی خاں نے مصالحت کرا دی، اس طرح پٹنہ میں بیگم کی ریختی گوئی کی دھاک بیٹھ گئی۔

جب اختر سیا جنت کو سدھارے اور مٹیابرج اجڑ گیا تو بیگم کلکتہ کو خیرباد کہہ کر عظیم آباد چلے گئے اور چند دن وہاں رہ کر پھر بھوپال ہوتے ہوئے حیدرآباد آ رہے۔ حیدرآباد آ کر نواب محبوب یار جنگ بہادر مرحوم کے توسط سے حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف کے دربار میں باریاب ہوئے حضور نے بیگم کی ریختی سماعت فرما کر مسرت کا اظہار فرمایا۔

بعدہ ہزار کا خلعت دوپٹہ مرحمت فرما کر سربلند فرمایا۔ اس زمانے میں استاد داغ کا طوطی بول رہا تھا بھلا انہیں کس طرح گوارا ہوتا کہ بیگم جو لکھنؤ کی تھیں۔ اپنی جناکوں کے برابر لا بٹھاتے اس وجہ سے انہوں نے بیگم کو آگے بڑھنے نہیں دیا مگر بیگم بھی تریاہٹ پر آمادہ ہو گئیں اور دامن گرداں و دپٹہ کر سے لپیٹ کر لپٹ ہی پڑیں اور حیدرآباد میں ایسے جھنڈے گاڑ کر رہیں کہ یہیں کی مٹی میں ۲۶ ر جنوری ۱۹۲۸ء کو مل گئیں۔

بیگم دُبلے پتلے میانہ قد، سرخ و سفید تھے، مزاج میں ظرافت تھی آخر وقت میں قوٰی بہت کمزور ہو گئے تھے کان جواب دے چکے تھے، بصارت ساتھ چھوڑ رہی تھی بعض بعض وقت ہوش و حواس بھی انجان ہو جاتے تھے مگر باوجود ان تمام باتوں کے طبیعت ایک برق تھی کہ ہر وقت جولانیوں پر آمادہ نظر آتی تھی، ہمیشہ شعر سنانے پر تیار۔ ہر مشاعرے میں غزل کہنے پر آمادہ ——— بیگم راقم کے کرم فرما تھے۔ جب کبھی ملتے کچھ نہ کچھ سناتے تھے آخر وقت میں اپنا کلام ترتیب دے رہے تھے مگر افسوس ہے کہ موت نے بیگم کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی، آپ مذہبًا اثنا عشری تھے اور کئی بار مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔

حیدرآباد آنے کے بعد مہاراجہ چندو لال کی بارہ دری میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا بہت سے مشاہیر مثلاً شمس العلما مولانا حالی صاحبِ عالم مرزا خورشید عالم بہادر گورگانی، اختر مینائی، اور علی برتر، حبیب الرحمٰن بیدل، استاد جلیل، شاد صوفی، نظم طباطبائی، شیفتہ لکھنوی، نواب آصف یاور الملک وزیر، منشی لچھمی نرائن عارف جود صپوری وغیرہ شریک تھے اس مشاعرے میں آپس میں چوٹیں ہوئیں اور بیگم نے لکھنؤ کی طرف داری میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ ایک طویل قصیدہ کہہ کر وہ دھوم دھام سے سنائی کہ دلی والوں کے چھکے چھوٹ گئے حقیقت میں یہ قصیدہ نہ صرف لکھنؤ کی بہترین زبان کا نمونہ ہے بلکہ اس میں اردو کی مختصر تاریخ بھی بیان کی گئی ہے اور اپنی داستانِ الم بھی سنائی ہے ——— ملاحظہ ہو:۔

سناتے ہو مجھے باتیں ہزاروں   کہوں میں بھی جو کچھ اپنی زباں سے
تو اس دم کرکری ہو جائے گی بس   سبھوں کے سامنے میرے بیاں سے
جسے کہتے ہیں اردو ہے وہ لشکر   سنی باتیں جو لشکر کی زباں سے
اسی کا نام اردو ہو گیا ہے   کوئی منکر نہیں میرے بیاں سے
ہوئی جب چھاؤنی دہلی میں کیے پی!   وہاں لوگ آ گئے سارے جہاں سے
ہوا ہر قوم کے لوگوں کا مجمع   کوئی کابل کوئی مازندراں سے
عرب تھا کوئی اور کوئی عجم تھا   کوئی شیراز کوئی شیرواں سے
جو کچھ آپس میں ان لوگوں نے باتیں   تو اردو کی زباں نکلی یہاں سے
زباں یا سست بجا سونا ہوا تھا   کہ گرما گرم آیا ہو دکاں سے
نمک مرچیں ملی ہیں لکھنؤ میں   کہ اب تک رال بہتی ہر زباں سے
وہ ارد و تھی کہ اک لکڑی کا چھیلا   نہ نکلے جس کے کانٹے باغباں سے
بنایا لکھنؤ والوں نے اس کو   تمہیں کیوں فخر تم لائیں کہاں سے
مری جاں لکھنؤ والوں کے آگے   بہت مشکل ہے کچھ کہنا زباں سے
نہ کہنا اب کبھی میں ہوں زباں داں   ذرا اللہ کو رد کو اس بیاں سے
میں اپنے وقت کی زیب النسا ہوں   جواب اپنا کوئی لائے کہاں سے
یہ کہنا ہے بہت سب بے جا دوگانہ!   کہ اچھی ہوں میں ہی سارے جہاں سے
نہیں کرتا زمانے کا ہے دستور   ثنا اپنی کوئی اپنی زباں سے
ہے خطمنا بڑی رو دلی میں آیا   ذرا پوچھو میاں! حافظ میاں سے
کیا خالق نے پیدا ایک پر ایک   سنا میں نے یہ آنو کی زباں سے
زباں کے خلد کی ہے حور عورت   اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں سے
زباں کے ملک کا سکہ ہے عورت   انوکھا ہے چلن سارے جہاں سے
زباں کا فیصلہ ہے عورتوں پر   یہ باتیں مردوے لائیں کہاں سے
زباں دانی ہے حصہ بیگموں کا   لڑائے کیا زباں کوئی زباں سے
نگوڑی سوت جل گڑی کے لچھن   بتنگ آ گئی بہت اب میں یہاں سے
یہ بیکاری بنی ہے سوت میری   نکلتی ہی نہیں میرے مکاں سے
وطن چھوڑا اسی شغل کے چلتے   دکن میں آئی میں ہندوستاں سے
چھڑایا مجھ کو پیاروں سے اسی نے   چھپا کے منہ چلی آئی وہاں سے
موئی کو لاگ مجھ سے ہو گئی ہے   یہاں بھی آن لپٹی میری جاں سے
سنا اس نے مجھے دی مفلسی کی   نتیجہ خوب نکلا امتحاں سے
غرض ہر ظلم ہے جو ہو جائے مجھ پر   میں کچھ کہتی نہیں اپنی زباں سے
مری اب پرورش فرمائیں آصف   کنیزی میں رہوں میں دل سو جاں سے
تو میری مفلسی یاس طرح بھاگے   کہ جیسے تیر چھٹتا ہے کماں سے
جو مجھ کو عرض کرنا تھا کیا بس   دعا بیگم یہ ہے دل سے زباں سے
بجے چاروں طرف آصف کا ڈنکا   خراج اس کو ملے سارے جہاں سے

آپ اس قصیدہ کو دیکھ چکے اب فرمائیے کہ اس میں کیا کچھ نہیں ہے؟ اس قصیدہ میں بیک وقت لطافت زبان، تاریخ اردو اور آپ بیتی کا

اتنا عجیب و غریب امتزاج ہے کہ دنیائے شاعری میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

بیگم کی اس قصیدی سے دلی اور لکھنؤ والوں میں ایک آگ بھڑک گئی مانین آمادہ شر و فساد ہو گئے جب یہ کیفیت کسی طرح حضرت غفران مکان تک پہنچی تو حضرت نے ایک زبان کے ذریعے دفع شر فرما دیا۔

شاعر وہی اچھا سمجھا جاتا ہے جس کے اشعار میں نفیس استعارات، خوبصورت تشبیہات، بہترین محاورات ہوں، روزمرہ صاف، نشست الفاظ عمدہ، تخیل میں بلندی ہو اگر اس کے ساتھ ہی ساتھ طنز کا استعمال بھی وہ لطیف پیرایہ میں کرے تو شاعری کو چار چاند لگ جاتے ہیں — اب آپ یہ تمام چیزیں بیگم کی ریختی میں ملاحظہ فرمایئے۔

یوں تو ریختی شاعری میں ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ مواد مل جائے گا لیکن اتنا بھی نہیں جس کے لئے مکمل کالو ڈا استعمال کرنا پڑے بلکہ ایک حد تک — اخلاق اور فلسفہ کے بعض نکات جنہیں ریختہ کے شعرا نے بھی بیان نہیں کیا آپ کو ریختی میں ملیں گے۔ جان صاحب کا ایک شعر ہے

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت ۔ سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں ہوتا

غور کیجئے یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں طرف پہنچتا ہے کسی پیر و مرشد کو سنا دیجئے تو پھڑک اٹھے گا کہ بھئی کیا کہنے واقعہ یہی ہے "بے پیرا بے دھڑا ہوتا ہے" ایک ہادی اور مرشد کی ضرورت ہے ہی — اور یہی شعر کسی دنیا دار کو سنا دیجئے تو بے تحاشا کہے گا کہ واہ حضرت! کیا بات ہے سچ کہا ہے "مربی بیار و مربہ بخور" مگر واقعہ یہ ہے کہ جان صاحب نے سرسری طور پر اپنی مخاطبہ بیگم کو "کسی ایک سے دل لگانے" کا سبق دیا ہے لیکن بیگم اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔ وہ بعض دفعہ ان رموز و غوامض کو اپنی ریختی میں بیان کر دیتے ہیں جو اہل حکمت و فلسفہ کے درس کا موضوع ہو سکتے ہیں یہ شعر سنئے۔

قطرے میں تھا انسان پڑا پیٹ میں جس دم
روتا ہوا جب گود میں آیا تو بشر تھا

اب آپ اس کو قرآنی آیت سے منطبق کیجئے یا علم التشریح سے ثابت کیجئے یا روزمرہ کے واقعات میں شمار کر لیجئے۔ مگر بیگم نے ایک بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ مصرع ثانی کی بے ساختگی دیکھئے

ع روتا ہوا جب گود میں آیا تو بشر تھا

نطفہ کہہ کر اشارہ کر دیا وضاحت نہیں کی ورنہ لوگ ناک بھوں چڑھاتے حالانکہ اس شعر کو طالب علم، مولوی اور مشائخ سبھی پڑھتے ہیں۔

اے قطرۂ منی سرِ بیچارگی بنہ ۔ کہ ابلیس را غرور منی خاکسار کرد۔۔۔

مگر اسی مادہ منویہ کو کہیں ریختہ یا ریختی میں بیان کیا جائے تو لوگ بدک جاتے ہیں، اسی خطرے کو محسوس کر کے بیگم نے قطرے کو محدود کر دیا ہے۔ نو مہینے کی ڈائری صرف دو مصرعوں میں بیگم نے بیان کر دی اور قطرے کا بیان کر کے ایک جیتے جاگتے بشر کو سامنے کھڑا کر دیا ہے۔

بیگم کے کلام میں محاسن شعری تقریباً کل موجود ہیں لیکن میں صرف چند شعر نقل کرتا ہوں، طنز، شعر کی جان ہے، اس کو بیگم بڑی عمدگی سے ادا کرتے ہیں، اللہ میاں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

مجھے غم سوت کو شادی ہے تیری شان کے صدقے ۔ میں روتی ہوں وہ خوش ہوتی ہے پرسن کر الٰہی تیری

"تیری شان کے صدقے" اللہ میاں سے تخاطب ہے اور پھر اس میں عجز و انکسار نہیں بلکہ گہرا طنز ہے۔

فراق کے مضامین ریختی میں بہت باندھے جاتے ہیں اور بیگم نے بھی ان مضامین کو خوب جی کھول کر باندھا ہے۔ یہ شعر بھی انہیں میں سے ایک ہے؛

وہ ہیں پردیس میں اور غیر ہے حالت یہاں میری ۔ نہ یہ ساون کا مہینہ اور یہ انگڑائیاں میری

ہندی میں ہزاروں گیت ساون کے متعلق ملیں گے جن میں فراقیہ مضامین ہوتے ہیں مگر بیگم نے اس ایک شعر میں ایک پورا گیت بھر دیا ہے ساون کے مہینے میں انگڑائیاں لے کر رہ جانا انتہائی فراق زدگی ظاہر کر رہا ہے۔ ساون میں جھولا جھولتے ہیں، پکوان اور تلن ہوتے ہیں، ہمجولیوں کے ساتھ چہلیں ہوتی ہیں۔ یہ سب چھوڑ کر انگڑائیاں لیتے ہوئے بیٹھے رہنا انتہائی حزن و ملال ظاہر کرتا ہے۔

بیگمات کا قاعدہ ہے کہ ماما چھوکری، انا، دایا کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہی رہتی ہیں۔ ان مضامین کو بھی بیگم نے افراط سے باندھا ہے۔

کرنی تھی ادھر کام ادھر دیکھ رہی تھی ۔ اے چھوکری اس وقت ترا دھیان کدھر تھا

نہ ٹلے گی اری تھوڑا سا پانی چھوکری جب تک ۔ مسالہ ہو گیا ہے خشک کیسے ٹکڑسل سو نکلے گا
ذرا جو لیئوں کا سوا لے بی دیا دیکھتی کیا ہو ۔ لیا ہے پھیر بچے نے بڑی مشکل سے نکلے گا

اس شعر میں بیگم نے زچگی کا پورا کورس بیان کر دیا ہے اور ایک محاورہ محلات کا بھی لکھ گئے ہیں،

بچہ ولادت کے وقت ٹیڑھا ہو جاتا ہے تو اسے پھیر لینا کہتے ہیں اس وقت بڑی مشکل ہوتی ہے۔ ہماری لیڈی ڈاکٹرز تو اس آڑے بچے کو عموماً کاٹ کر نکالتی ہیں مگر پرانی دایہ اسے راہ راست پر اس طرح لاتی ہے کہ

زچے کے پیٹ کو ہل کرنے کو سیدھا کر لیتی ہے۔ اس عمل کو چول اکا سنانا یا چاہین
اکا سنا کہتے ہیں۔ اس قسم کی اصطلاحات سے بیگم کا کلام بھرا ہوا ہے۔

اک ذرا سے گندے پانی کے لئے ہُو تو بہ اتو بہ توڑ ڈالی جائے گی؟

شراب کو عورتوں کی اصطلاح میں گندا پانی کہتے ہیں وہ اس ذرا سے گندے پانی کے لئے توبہ جیسی چیز توڑنے کے لئے تیار نہیں — کتنی حیرت سے کہتے ہیں "توبہ اتوبہ توڑ ڈالی جائے گی"

عورت کی فطرت کو بیگم نے بڑی عمدگی سے نمایاں کیا ہے اس قسم کی جھلک بیگم کے سیکڑوں اشعار میں پائی جاتی ہے اور عورتوں کی نفسیات کو بڑی سلیقگی سے ظاہر کیا ہے۔

جو نمک سے ہوا چھا اس کو دل سے پیار کرتی ہوں
میں بڑھیا ہو گئی ہوں پر طبیعت ہے جواں میری

کیا اثر بخشا ہے اللہ کی قدرت کے نثار نام سے مرتے کے آتی ہے فرحت دل میں

ریختی میں یوں تو جذبات نگاری بہت کی جاتی ہے مگر فطرت نسوانی کی بعض مثالیں بہت کم دی جاتی ہیں، مثلاً ماں کی محبت۔ جان صاحب وغیرہ نے اس پر بہت کم توجہ کی ہے مگر بیگم ان چیزوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

آگ جس طرح سے پتھر میں چھپی رہتی ہے ماں یوں ہی رکھتی ہے اولاد کی الفت دل میں

دیکھئے محبتِ مادری کی کتنی عمدہ مثال دی ہے۔

بیگم تھے تو عہد واجد علی شاہ کی پیداوار مگر نئی روشنی سے ان کی آنکھیں بھی کھل گئی تھیں نئے نئے مضامین بڑی عمدگی سے باندھتے تھے اور فخر سے سناتے بھی تھے،

الٰہی خیر ان کی جان کی ہو ایک مدت سے نہ وہ آئے نہ خط آیا نہ کوئی ان کا تار آیا

صرف یہی نہیں کہ تار اور ڈاک کی حد تک بیگم نے مضامین باندھے ہوں بلکہ وہ سیاسیات میں بھی عورتوں کو دخیل کرانا چاہتے ہیں اور کونسل تک پہنچانے کے آرزومند تھے۔

پھر تو کوئی عورتوں پر جو نہ ہو تھوڑا ہے ظلم کونسلوں میں جب کوئی خانم نہیں بیگم نہیں

یہ شعر بیگم نے کوئی بیس سال پہلے کہا تھا اللہ کی شان کہ آخر کونسلوں میں بیگمیں اور خانمیں آ ہی گئیں — اسی طرح بیگم نے عورتوں کو منظم ہونے کی تلقین بھی کی ہے۔

بیویاں بہتیری لیکن ان کی مجلس بھی تو ہو چند تصویریں ہیں حیراں اور کوئی انجمن نہیں

بیگم اس مرد کے قائل نہیں جو صرف تیوری پر بل ڈالے اینڈتا پھرے وہ تلوار کے کس بل کے قائل ہیں۔

مرد سے تلوار کا کس بل نہیں دم خم نہیں بل ہے تیوری پر تو ہو، بندی کو اس کا غم نہیں

ان مردوں سے زیادہ اُن عورتوں کے قائل ہیں جن کی بات میں اثر اور ہاتھ میں قلم ہو۔

ہاتھ میں جن کے قلم ہو بات میں جن کی اثر اے بوا! وہ عورتیں بھی مردوں سے کم نہیں

بیگم کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا روزمرہ تھا اس زمانے میں یوں تو کئی ایک ریختی گو ہیں مگر تین ریختی گو زیادہ مشہور رہیں، بیگم، شیدا، عنقا، بیگم چونکہ لکھنوی الاصل تھے محلاتِ واجد علی شاہ میں پرورش پائی تھی اور صحبتیں بھی استادوں کی رہیں۔ اس لئے ان کی زبان منجھ گئی۔ شیدا صاحب دریاباد کے ہیں ان کو بیگم پر صرف ایک فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے دیوان مرتب کر کے چھپوا لیا ہے۔ یوں ریختی خوب کہتے ہیں مگر بیگم کی سی بات ان میں کہاں — تیسرے عنقا بیگم ہیں جو ریاست بہاول پور کے رہنے والے ہیں۔ جان صاحب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر انہوں نے ریختیاں کہی ہیں مگر کوئی بات پیدا نہ کر سکے، شیدا اچھے بھی ان سے کروڑ درجے غنیمت ہیں۔ البتہ انہوں نے اپنا کلام شیدا سے پہلے چھپوا ڈالا۔ انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں شیدا اور عنقا کے کلام پر روشنی ڈالی جائے گی۔

بیگم کے روزمرہ کے شعر بھی سن لیجئے۔

دل کسی کو کیوں دیا ہی ہاتھ ملتی ہو جواب چیز اپنی جب تک اپنے پاس ہے، جو کھم نہیں

لے گئی جب سے مری سونے کی جوشن کندن بنا دہی کیا ننگے بُچے لگتے ہیں بازو میرے

اٹھا پردہ تو بی لیلیٰ کی عصمت کا یقیں آیا بوا، مجھ کو گماں تھا مردوا محمل سے نکلے گا

پکڑتا ہے کوئی یوں بھی کسی کا ہاتھ چھوڑ دو بھی ہوئی جاتی ہیں ٹھنڈی دیکھو مرزا چوڑیاں میری

جان اگر ہے جانے والی جائے گی بات تو اُن کی نہ ٹالی جائے گی
بھاگ جائے گی یہ جب ہو گی جواں چھوکری مجھ سے نہ پالی جائے گی

تشبیہات میں بھی بیگم کو کمال تھا بعض تشبیہیں بڑی عمدہ ہیں، غیر منظم اور منتشر بیویوں کو حیران تصویریں کہنا کس قدر بلیغ تشبیہہ ہے۔ یہ ان کی جدید تشبیہہ ہے مگر پرانی تشبیہیں بھی انہوں نے بہت استعمال کی

ہیں، مثلاً چاندنی خانم کے گورے منہ پر کالے تل دیکھ کر سپند رمانی کے دانے یاد آ گئے۔

نف نظر ہمارے دانے ہیں یہ سپند کے گورے منہ پر چاندنی خانم کے کالے تل نہیں

پریاں بہتیری لیکن ان کی مجلس بھی تو ہو چند تصویریں ہیں حیران اور کوئی الم نہیں

محاوروں کے استعمال میں بھی بیگم کو بڑی مہارت تھی چند شعر نقل کئے جاتے ہیں، جن میں بیگم نے محاورے باندھے ہیں بعض اشعار میں ایک ساتھ دو تین محاورے باندھ جاتے تھے چنانچہ اس شعر میں "پو بارہ ہونا" "لیم لیم کرنا"۔ "میاں ٹھو" تین محاورے باندھ دئیے اگر ریختی کا محاورہ "رہنا" بھی اس میں شمار کیجئے تو چار ہوتے ہیں۔

سانٹھ سنبرے کے رہے اب تو ہوا پو بارہ!   مجھ سے ٹیں ٹیں نہ کرو اے میاں مٹھو میرے

سوت تو جل گئی جل جل کے یوں اب مرتی ہو   کیا "تہا جو" بھی نہیں گے یہ دوا مجھو میرے

نہ کوئی دوست دستدار آیا نہ کوئی جاں نثار آیا   اگر آیا بھی کوئی یار تو مطلب کا یار آیا

کبھی آیا بھی اٹھ کر چلا، مردے ودم لیے   کبھی بھولے سے آیا بھی تو نگوڑے پر سوار آیا

اے بجلی الٰہی! ایسے ملتے کا پڑے ہی   گھٹائی ہیں موے نے ڈال رکھیں بالیاں میری

بیگم کے پاس مذہبی خیالات کی بھی بہتات ہے نعت خصوصاً اچھی کہتے تھے۔

پہنچے نہ جہاں وہم وہاں تیر گذرتا تھا   واری گئی تجھ پر تو ملک تھا کہ بشر تھا

اسی زمین میں معراج کا بیان کرتے ہیں۔

معراج کی شب سنتی ہوں احمد میں احد میں   تھا میم کا پردہ یہاں ادھر تھے وہ ادھر تھا

اہل حال اس میم کے پردے پر سر دھنتے ہیں، احد اور احمد کو میم کا پردہ بیچ میں ڈال کر جدا جدا کر دینا بیگم کی انتہائی مذہب پسندی اور توحید دانی ہے ورنہ عام نعت گو شعراء تو میم کا پردہ اٹھا کر احمد کو احد ہی بنا دیتے ہیں، اس سے بیگم کی احتیاط اور مذہبی واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔

یہاں تک تو میں نے صرف وہی شعر پیش کئے ہیں جو مجھے پسند بھی تھے اور جن کے متعلق کچھ کہنا بھی تھا۔ اب آپ ذیل کے کلام سے اپنی پسند کے شعر انتخاب کر لیجئے۔

نوچ ہو اس موسے بے دید کی چاہ دل میں   چھٹ مری سوت سے رکھے جو محبت دل میں

آنکھ کیا اوس سے لڑی کر دیا جادو مجھ پر   کھنچ گئی پل میں ابھی یار کی صورت دل میں

ایک سہیلی ہے سنوکہتی ہوں کچھ مشکل نہیں   ساری دنیا ہے مرا آنکھوں میں اک تل ہی نہیں

سوت کا پیغام آیا سوت کو یہ بل نہیں   کیوں وہ فکر نی ہوتی ہوتی ہو کچھ حاصل نہیں

ظلم کرتا ہے مرے اوپر خدا حق بے دھڑک   اد موئے کم سمجھ ہے تو شاید خدا عادل نہیں

آنکھوں آنکھوں میں کوئی دل کو اڑا کر لے گیا   ڈھونڈھتی پھرتی ہوں ہائے سہیلیوں کوئی دل نہیں

سخت باتوں کی نہیں سننے کی مجھ کو تاب کچھ   سنگدل تم ہو مگر پتھر کا میرا دل نہیں

محبت مجھ نگوڑی نے جہاں کی   تو اس نے خاک چھنوائی جہاں کی

میں دیوانی ہوئی ہوں اس جواں کی   نہیں پروا مجھے دونوں جہاں کی

بہن بے پوچھے میکے جاؤں کیونکر   اطاعت فرض ہے مجھ پر میاں کی

مزے میں نے اڑائے زندگی کے   نگوڑی سوت ہی نے خاک چھانی

نبھے گی کس طرح مرنا سے لوگو!   زمیں کی میں کہوں وہ آسماں کی

یونہی دیکھا کیا حسرت سے مجنوں   مگر لیلیٰ نہیں محمل سے جھانکی

نہ ماری مانتی ہے تو نہ جیتی!!   موئے کچھ میں ہے ہٹ دھرمی بلا کی

بوی ہوتی ہے ابھی شکل لے کی   یہ عزرائیل ہے سارے جہاں کی

شگوفے باغ میں لاکھوں کھلائے   جو نرگس چڑھ کے مہتابی پہ جھانکی

کیا جو چاہا تم نے ظلم مجھ پر   زباں سے میں نے کچھ بھی نہ ہاں کی

مقدر ہی برا ہے اپنا بیگم   شکایت کیوں کروں میں آسماں کی

جاں اگر ہے جانے والی جائے گی   بات تو اُن کی نہ ٹالی جائے گی

آہ میری یوں نہ خالی جائے گی   سوت سر منڈی نکالی جائے گی

خوب مہندی جب رچالی جائے گی   پھر نہ ان ہاتھوں کی لالی جائے گی

جب کہوں گی ان سے کچھ مطلب کی بات   بات میں بات اک نکالی جائے گی

یار کی تصویر کھینچی تو بوا   حشر کے دن جان ڈالی جائے گی

اب جواں ہونے کو آئی چھوکری   کب تری یہ لااُبالی جائے گی

دیکھو دولھا کیا اسے دیتا ہے نیگ   ماچھے کر چھوٹی سالی جائے گی

پان کیوں تو نے سحر کو کھا لیا   اب بھلا ہونٹوں کی لالی جائے گی

سب مزے ہیں چار دن کے اے سہیل   ساتھ گوری اور نہ کالی جائے گی

عشق میں عزت بھلا کیا چیز ہے   اونے پونے بیچ ڈالی جائے گی

مرتے تلوار کا کس بل نہیں وہ خم نہیں   بل ہے تیوری پر تو مہندی کی ہاتھ میں کم نہیں

زال تو بیشک ہے تو بیٹا اگر رستم نہیں   بار دو دو جوروؤں کا اور کمر میں خم نہیں

جنگ سے ہے صلح بدتر نوح ہوئی ملاقات   کونسا دن ہے یہاں جل کر نہیں کم دم نہیں
تیری باتوں کے سے دل میں ہزاروں گھاؤ ہیں   اور پھر بخیہ نہیں ٹانکے نہیں مرہم نہیں
یاد ہے گی سوت گھر میں ... ہم   اب تو دل میں ٹھان لی ہو وہ نہیں یا ہم نہیں

جن کو معلوم یہ کر تب ہیں یہ جادو میرے   بن کے ہمزاد وہی لوگ ہیں کالو میرے
مردوے ڈولی کے ساتھ آئے نقیروں کی طرح   یہ تو مجنوں سے سوا ہو گئے لالو میرے
دیکھو اب بارہ اماموں کی قسم کھاتی ہوں   لوں گی بدلہ نہ کبھی دو دو ہی جگنو میرے
لے گئی جب سے میری سونے کی جوشن کندن   ہو بہی کیا نکلے برسنے لگے ہیں بازو میرے
جو غضب لیتے ہیں ہر دل میں اس سیکم کی   یا الٰہی رہیں زندہ وہ کب ڈھیر میرے

سنا میرا آیا دسہلا سوت کا گھر بھی تھا   میں نے جو تمہیں ل دیا یہ اُس کا ثمر تھا
صدقے گئی اللہ نے پروان چڑھایا   سچ پوچھو تو یہ میری دعاؤں کا اثر تھا
برسات میں سمدھن بڑی تکلیف اٹھائی   تم کیوں نہیں آ بیں جی خالی میرا گھر تھا
میں جاتی ہوں میکے نہ رہوں گی میں رہوں گی   اب تک جو دیا ساتھ یہ میرا ہی جگر تھا
جھک مار کے پھر کیوں مجھے تم یاد کے لائے   رہنا ہی نہیں گھر میں نہ منظور اگر تھا
ملنے کے لئے کل میرے گھر آتیں جو بیگم   کچھ نفع تمہارا تھا نہ کچھ میرا ضرر تھا

کھٹکتا ہے جگر کا نشا سوت کا مشکل سے نکلے گا   نہ میرے دل سے نکلے گا نہ اس کے دل سے نکلے گا
پلا دو تلب گھوں میں نہ دوسرے تک سے شہہ بتا ہے   کسی کا کام کیونکر اس مُئے کاہل سے نکلے گا
پلاؤں گی اسے شربت کے بدلے زہر کا پیالہ   بڑی ہی سخت جاں ہے سوت دم مشکل سے نکلے گا
اٹھا پردہ تو بی لیلیٰ کی عصمت کا یقیں آیا   ہوا مجھ کو گماں تھا مردوا محمل سے نکلے گا
پڑھے گی ریختی بیگم تو اک تعریف کا نعرہ   کسی کے منہ سے نکلے گا کسی کے دل سے نکلے گا

محبت کا یہی برتاؤ ہے کیونکر قرار آیا   روانہ ہو گئی جب روح قالب تو یار آیا
مری باندی نے باہر جا کے پیلہر اس کو للکارا   نگوڑی سوت کے گھر سے جو کوئی چوبدار آیا
کہاں تھی رات کو چندو اس گھر میں اس گھر میں   تیرا عاشق تجھے دونوں جگہ جا کر پکار آیا
ابھی بیگم مری پاپوش جائے سوت کے گھر میں   سواری میرے دلانے پکلیا کے کہا آیا

چمن ہو وہ میں بلبل ہوں کیا میں کیا زباں میری   کلیجہ تھام لو بی! پھر سنو تم داستاں میری
کیا ہے یاد کس نے کون ہے وہ جانِ جاں   میں رو کے سے نہیں رکتی الٰہی ہچکیاں میری

۱۹۰۱ء میں بتقریب نوروز نواب مرزا شجاعت علی صفی ایران نے کلکتہ میں ایک مشاعرہ کیا تھا جس میں طرح دی گئی تھی۔ "بلبلیں شاد ہیں گلشن میں ہے سامانِ بہار"۔ ان دنوں بیگم بھی کلکتہ میں تھے چنانچہ اس مشاعرے میں شریک ہو کر انہوں نے طرح میں دو غزلہ پڑھا۔ چونکہ عورتوں کی زبان میں واوِ عطف یا اضافت ترکیبی نہیں ہوتی۔ اس لئے بیگم نے بلا اضافت شعر کہے ہیں، چنانچہ اس دو غزلے میں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

مجھ سے کیا پوچھتی ہو اے مری ناداں بہار   گل کی لالہ کی نہیں کیا تجھے پہچان بہار
خود ہی پھولوں کو دیا رنگ خود ہی بھول گئی   ایسی ننھی مری ایسی مری ناداں بہار
پانی پیتے ہیں گلستاں کی ہوا کھاتے ہیں   نازک اندام ترے گھر کے ہیں مہمان بہار

کنگھی چوٹی سے گیسوؤں کو جو رکھتا ہے درست   بال سنبل کے لگی آنے ہی سلجھانے بہار
آنکھ پتھرا گئی نرگس کی جو دیکھی آنکھیں   تیرے گالوں کو جو دیکھا لگی شرمانے بہار
ایک تو سوت موئی کا تھا جلاپا مجھ کو   دوسری آئی ہے تو دل مرا تڑپانے بہار
سُن کے بلبل کے ترانوں کو کہا بیگم نے   تیری تعریف کے گاتی ہیں یہ سب گانے بہار

قبل ازیں میں نے لکھ دیا ہے کہ بیگم نے تمام اصنافِ سخن میں فکر کی ہے لیکن مخمسہ کے نمونے نہیں پیش کئے گئے تھے چنانچہ اب دو مخمسوں میں سے ایک ایک بند نقل کیا جاتا ہے

صاف کھلتا نہیں کیا شے ہے بھری شیشے میں   اے میں صدقے گئی دیکھو تو ذرا شیشے میں
سن کے لاکن نے کہا مجھ سے اری شیشے میں   مے گلرنگ کی ہے جلوہ گری شیشے میں
بند کی ہے مرے ساقی نے پری شیشے میں

خاک ہے شاعروں کے پاؤں کی بیگم بہتر   رہیے جا اُو موئے جی بھر کے مجھے محسن گر
جا کروں گی میں تیری آنکھوں میں سرمہ بنکر   خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

۱۹۱۲ء میں حضور نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفران کی جوبلی کی تقریب میں بیگم نے ایک طویل قصیدہ کہی تھی جو انہیں دنوں گلدستہ "نغمہ عندلیب" میں شائع ہوئی۔ اتفاقاً اس مضمون کے اختتام پر مجھے وہ قصیدہ ملی مگر افسوس ہے کہ اس کے زیادہ شعر نقل نہیں کر سکتا کیونکہ مضمون کے زیادہ طویل ہو جانے کا خوف ہے۔ یہ قصیدہ بہت طویل اور شرائط قصیدہ گوئی کی پوری پوری حامل ہے صرف مطلع نقل کیا جاتا ہے۔

سونے میں پیلی!

"اچھا ہوا، ممتاز تم آگئیں۔ تمہارے وہ تو بالکل بدل گئے ہیں"۔
"سچ؟" (اس نے خیال کیا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں اداس اداس رہا ہوگا)

"ہاں، وہ تو اک دوسری کے گھر جا پڑے ہیں"۔

"جھوٹ"

"یقین نہ آئے تو تحقیق کرلو"۔

"کون ہے آخر وہ"؟

"بتا دوں کہ تم اس سے لڑائی مول لو"!

"نہ قسم لے لو جو میں اس سے بات بھی کروں"۔

"تو ہن بات کیے تو بن بھی نہ آئے گی"۔

"خیر پھر دیکھا جائے گا، ہاں تو کیا نام ہے اس کا"؟

"کس کا نام"؟

"اسی کا جس کے گھر وہ جا پڑے ہیں"۔

"ابھی کہاں، اب جا پڑیں گے (مستقبل کا تصور اس کی آنکھوں میں چمکا)

"ہٹو بھی تم مذاق کرنے لگے۔ تم ہی سفارش کر دو"۔

"کس بات کی"؟

"یہی کہ یہ اس کا نام بتا دیں"۔

"کہہ دو کہ تمہارے وہ اک بیاہتا کے گھر جا پڑے ہیں"۔ (وہ اک نامعلوم خوف سے لرزی)

"وہ اک بیاہتا کے گھر جا پڑے ہیں"!

"تم نام نہیں بتلاتے نہ بتاؤ۔ میں کیا ایسی بے وقوف ہوں کہ نہ سمجھوں گی"!

"ذرا ہم بھی سنیں کہ تمہارے دماغ میں کیا نام آیا"۔

"تمہارے ہی گھر آ پڑے ہوں گے۔ ہمیشہ سے یہیں بہت آتے ہیں"۔

"ممتاز بس مجھے تو معاف کرو۔ میں ایسے لوگوں کو منہ ہی نہیں لگاتی ہوں"۔

"تمہیں غلط فہمی میں کیوں رکھوں، بتا ہی دوں، حمیدہ نے ان کو اپنا لیا ہے"۔

"کیا کہا حمیدہ نے"؟

"ہاں ہاں حمیدہ نے"!

"حمیدہ نے، خوب"!

(۲)

دو دن ہوئے ممتاز لکھنؤ سے واپس آئی تھی، گیارہ مہینے کے قیام کے بعد۔ اس عرصے میں اس کا منگیتر کئی بار وہاں گیا تھا۔ وہ ایک بار اپنے محکمے کا کام انجام دینے اور کئی مرتبہ اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کی خاطر، یوں کہ اس کی بڑی آپا نے جس کے یہاں وہ ٹھہری تھی اسے آزاد چھوڑ دیا تھا، پہلے ہی دفعہ جب اس کا "وہ" اپنی سالی کے یہاں ٹھہرا تو اس کا پردہ توڑ دیا گیا تھا۔ زمانے کے تقاضات کو سمجھنے والی ماں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے سینما بھی دیکھا تھا اور جب وہ سب کے ساتھ نمائش گئی تھی تو اس نے اس کی بڑی آپا کے لئے ایک بند دن کا ٹکٹ بھی خریدا تھا۔ تب ہی سے ملاقات اور گفتگو کی راہیں کھل گئی تھیں یہاں تک کہ اس مرتبہ اس نے عید بھی لکھنؤ ہی کی تھی۔ اس کے ہر حصے میں اس نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اس کے دل میں اپنے خیال کو اس طرح بھر دے کہ کسی اور نازنین کا تصور اس میں سوئی کے برابر جگہ نہ پاسکے۔ کیا اپنی اس خواہش کی تکمیل میں وہ ناکام رہی تھی؟ غالباً ایسا نہ تھا — اب جب وہ اپنی سہیلی سے ملنے آئی تو اس کے شوہر نے جو کچھ کہا وہ کیا محض ایک مذاق تھا۔ کیا اسے صرف چھیڑنا مقصود تھا یا وہ اک حقیقت تھی جس سے اسے دوچار ہونا تھا۔ کیا اسے حمیدہ سے اس کے متعلق گفتگو کرنا چاہیئے؟ وہ سوچ

میں چلی گئی۔

اسے معلوم نہ تھا۔ اور مستقبل کا حال کون جانے کہ اس کی دلہن کو واپسی کے دو دن بھی نہ گذرنے پائیں گے کہ یوں اک نیا گُل کھلے گا جس کے کانٹے اس کے مخملیں سینے میں نامعلوم طریقے پر چبھ کر اسے اک خلش میں مبتلا کر دیں گے۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ حمیدہ اُسی کی آستین کا سانپ بن جائے گی جس کی موجودہ زندگی اسی کا ایک عطیہ تھی۔ کیا اس کا یوں بدلہ دیا جائے گا! جس کی زلفِ حیات کو سنوارنے میں اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا کیا وہی اس کی ترو تازہ پھول کی سی زندگی کو اس طرح پامال کرے گی! اپنی ایڑی سے اس طرح مسل ڈالے گی جیسے کوئی اک پتی کو شاخ سے جدا کر کے مرجھا دے!—— کیسی ہوسناک ہے یہ زندگی کہ جانے جانے کے باوجود دوسرے اس لئے اپنی اداؤں کا جال پھیلاتے ہیں کہ چند اُٹھنے نہ پانے والے گرفتار ہو جائیں—— اور یہ چاہت بھی اس طرح حاصل کی جاتی ہے کہ فریقِ مخالف کو اس حملے کا علم بھی نہ ہو، خالی میدان پا کر تو سب ہی صیاد اپنا اپنا نشانہ سنبھالتے ہیں اس طرح کہ بعض ابھی پر تولنے بھی نہیں پاتے کہ ان کا سینہ داغدار ہو جاتا ہے۔ ممتاز کا تصور اک زخمی قمری کی طرح پرواز کرنے لگا۔

وہ پرانے گھر جا پڑے ہیں؟ اس کی وہ طرح طرح کی تاویلیں کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ حمیدہ اس سے زیادہ خوبصورت نہیں، سانولی رنگت، درمیانی جسم، موٹے بھدے بازو۔ کیا اس کو صباحت چاہنے لگا! اس علم کے باوجود کہ وہ جس سے ملتی ہے اسے دوسروں کے سامنے بے وقوف اُلّو ظاہر کرتی ہے وہ باور نہ کر سکتی تھی کہ صباحت کی غیرت اس بات کو گوارا کرے گی۔ اس نے گھر پہنچتے ہی آئینہ دیکھا اور اس بات کا اچھی طرح یقین کر لیا کہ وہ حمیدہ پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے اس نے سوچا کہ شاید جمال کے بجائے صباحت کا نام لے دیا گیا۔ وہ ہرجائی اگر ایسا کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، وہ بھی اس کا رشتے کا بھائی ہے اور اس کو خاموشی کے ساتھ چاہتا رہا ہے شاید اس نے اپنا دل بہلاؤ تلاش کیا ہو—— وہی نا جس نے اس کے حنائی تلووں کو چوما تھا، وہ انجان بنی مسہری پہ لیٹی رہی تھی، جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی، اور شاید اب بھی کھیلتی اگر زمانہ بدل نہ گیا ہوتا اور وہ اپنی تعلیم جاری رکھنے کی وجہ سے اس سے دور، اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہوتا—— نظر سے دور، دل سے دور لیکن ابھی وہ اپنے اس خیال کو پختہ نہ کر سکی تھی اور یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ جمال اس تک کس طرح پہنچ پایا اور کیونکر اس کو رسم و راہ کے بڑھانے کا حوصلہ دیا گیا۔ اور خیال کے اس جال میں وہ اک مکڑی کی طرح پھنسی ہوئی تھی کہ باورچی خانہ سے اُس کی ماں کی آواز نے اُسے چونکا دیا "ممتاز لو تمہاری چچی بلا رہی ہیں، حمیدہ شاید رک گئی ہو گی"۔

جب وہ واپس ہوئی تھی تو اُس کی بیوہ ماں نے جسے صرف اس کو بیاہنا رہ گیا تھا۔ اسے بتایا تھا کہ حمیدہ سہ پہر کو اس سے ملنے آئی تھی اور شام کو ہی اپنے بنگلہ واپس جانے کو کہتی تھی اب جو اس کو چچی نے بلایا تو اس نے خیال کیا کہ حمیدہ میری وجہ سے ٹھہر گئی۔ اسے بن ملے جانا بھی نہ چاہئے تھا۔ اچھا ہوا ایک نازک معاملے کی صفائی کا موقعہ اتنی جلد مل گیا۔ وہ خوش خوش اٹھی سنگ مرمر کے آئینے میں اس نے بال دیکھ کر ان کو ہتھیلیوں سے جمایا اور پان کھا کر ملازمہ کے ساتھ باہر نکلی اور اک سنسان گلی میں چند قدم چلنے کے بعد حمیدہ کے مکان میں داخل ہوئی اور چچی کو سلام کرتی ہوئی سیدھی اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ حمیدہ نے اسے دیکھتے ہی کہا "یہ بھی کیا لکھنؤ ہے جہاں سے اتنے بلاؤں کے بعد آتی ہو" اس کے شوہر نے اس کو سبد سے ہاتھ کی آغوش میں لے کر اس کے صندلیں ماتھے کو چوما۔

"مجھے کیا خبر تھی کہ تم بیٹھی ہو گی!"

"میں تو تم سے بغیر ملے چلی جاتی نا اور یہ دو دن سے جو تمام میں گھوم رہی ہو میرے یہاں آنے میں کیا ہل بیل لگتے تھے؟"

"ہل بیل نہیں، اک تھوڑا نوتا لگے ہیں ضرور لگتا۔ تم اتنی دور تو رہتی ہو قریب کے گھروں میں ہی جانا نہیں ہوا، خالہ ہی کا گھر رہ گیا ہے"۔

"خیر خالہ کا گھر تو پھر دیکھا جائے گا —— جلدی سے اپنے کپڑے لے آؤ اور چلو میرے ساتھ"۔

"میں پرسوں کو آؤں گی"۔

"پرسوں ورسوں میں نہیں جانتی، نہیں چلو گی تو صباحت ہی کو رات بھر نیند نہ آئے گی"۔

"تو کیا وہ بھی تمہارے یہاں ہوں گے"؟

"اور کیا —— دفتر اور کلب کے علاوہ اس کا باقی وقت ہمارے ہی یہاں گذرتا ہے"۔

"خوب اپنی چیز کے ہوتے تمہیں پرائی سے کیا مطلب؟"

"اللہ رے پرائی —— گویا آپ بھی تو کوئی غیر ہیں —— یہ تو اب نہ جانے سے رہی، ذرا آپ چچی سے کہہ آئیے کہ ان کو ہم چار دن کے لئے مہمان لئے جا رہے ہیں"۔ اس کا شوہر تعمیلِ حکم میں اٹھ کر باہر چلا گیا تو ممتاز نے

پوچھا: تم نے ان پر کیا جادو کر دیا ہے"۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے شوہر کو کس طرح اتنا اطاعت شعار بنا لیا ہے۔ لیکن حمیدہ نے اُن کا اشارہ اُس کے منگیتر کی طرف سمجھا "میں تو جادوگرنی ہوں نا، پگلی کہیں کی، یہ سب تیری ہی خاطر کیا ہے۔ آخر وہ جاتا بھی کہاں، اس کی ماں آگرہ میں، بہن اپنی نند کے یہاں، اکیلا گھر میں کیا تمہارے تصور سے ہی دل بہلاتا اور ہمارے یہاں کوئی ایسا نیا جانا تو ہے نہیں کہ تم کچھ اور سمجھو۔ آخر کانپور رہیں بھی تو وہ ان کے پاس کئی سال رہا۔ اب چند دن کو یہاں بھی رہ گیا تو کیا بگڑ گیا"؟

"اچھا وعدہ کرو کہ آج سے چوتھے دن ان کی مہمانداری ختم"؟

"اچھی بات ہے تو اب چلو بھی ہو؟"

"ہاں ہاں امی جان منع نہ کریں"۔

اس کا شوہر اجازت لے کر آ گیا، وکٹوریہ تانگہ بھی آ گیا تھا، وہ حمیدہ کے ساتھ چلی گئی۔

(۳)

جمال ساڑھے چار بجے دفتر سے واپس آیا تو اُس نے خالہ کو موجود پایا جو اپنی بڑی آپا کے سلام اور اپنی بھانجیوں کو دیکھنے آئی تھیں۔ انہوں نے حسب معمول اس کو گلے لگایا اور اس کے جواب میں اس کی کمر پر بزرگی کا ہاتھ پھیرا۔ ناشتہ دیتے وقت اس کی ماں نے اپنی بہن کے برتاؤ کو دیکھ کر اس سے کہا "خالہ ناراض تو نہیں معلوم ہوتی" جب اس نے جواب میں کہا "ناراض ہونے کی بات بھی کیا تھی" تو اس کی بڑی بہن نے جو پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس کو تسلی دی اور کیا "ایسے بات بنانے والے کچھ بنا لیں تو کیا"۔ اس نے جلدی سے ناشتہ ختم کیا اور ہوا خوری کے لئے باہر نکل گیا

راستے میں وہ یہ سوچتا رہا کہ آخر اس خط، اک نامۂ محبت لکھنے کا اسے یہ صلہ کیوں دیا گیا کہ ممتاز کو بھی اس کی زندگی سے چھین لیا گیا۔ اس کی زندگی کی ناکامیوں کی تاریکی میں اک روشنی تھی جس سے اس کو محروم کر دیا گیا، اس کو اس طرح بے سہارا چھوڑ دیا گیا جیسے ایک اندھے سے اس کی لاٹھی چھین کر اسے بھٹکنے دیا جائے۔ اس کے دل میں آرزو کی چنگاری دبی ہوئی تھی جسے فراق کی تیز و تند آندھیوں نے بھڑکا دیا اور اس طرح سب نے اس کو جلتا دیکھ لیا۔ یوں تو اس خط میں کچھ بھی نہ تھا البتہ اس میں مرہم لگانے کی کوشش کی گئی تھی ان بھڑیوں پر جو ممتاز کی پنڈلیوں میں ابھر آئی تھیں لیکن اپنی قسم کا وہ پہلا خط تھا، جو اس کو پہنچا اور جس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکی سوائے اس کے کہ اُس نے اپنے مجلہ ناز پر کم نواب کے دبیز پردے کھینچ دیے یا وہ دور رہنے اور اس کے سامنے نہ آنے کے لئے مجبور کی گئی۔ گویا وہ کوئی آئینہ تھا۔

جس میں وہ اپنے شباب کا عکس دیکھ لیتی اور یہ چاہتی کہ دن میں کئی مرتبہ نہیں تو کم از کم اک بار ضرور، اپنی جوانی کی اس جھلک کو عریاں پا لیتی جسے ابھی ایک آدھ سال زریں ملبوسات سے آراستہ رہنا چاہئے تھا۔

اس نے اس کی آمد سے قبل خواب دیکھے تھے کہ ملاقات کا کمرہ جو کھلا ہوا تھا اس کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ گویا مندر کے دوار میں قفل ڈال دیئے گئے ہیں اور مورتی ــــ وہ اک دیوی تھی جس نے ابھی تک اپنے پجاریوں سے اعتنا نہ کی تھی؛ کئی ایوانوں سے معمور اک کمرے میں بند کر دی گئی ہے اور پجاری باہر کھڑا رہ گیا ہے۔ شاید اسی لئے وہ خالہ کے ہمراہ نہ آئی ہوگی۔ وہ تلافیٔ مافات کے لئے اک راہ تلاش کر رہا تھا۔ کسی طرح پہنچ کر وہ اپنے گذشتہ برتاؤ کی صفائی پیش کر دے لیکن یہیں اسے خیال آیا کہ ابھی ایک ہفتہ ہوا جب اس کے آنے کی خبر گرم تھی اس کے تصور نے استقبال کا ایک نقشہ اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اس کے یہاں گیا ہے وہ اپنے کمرے کی چھت پر اپنے بال سکھا رہی ہے یا سورج سے اپنے تمتماتے ہوئے چہرے کا مقابلہ کر رہی ہے وہ اس سوچ میں ہے کہ کون بہتر ہے وہ یا سورج اور اپنا پلہ اس لئے بھاری سمجھ رہی ہے کہ اس نے اک خرمنِ ہستی کو جلا دیا ہے "عشق وارفتہ کی آگ میں" اور وہیں سے اس نے اپنی نگاہوں سے یہ ظاہر کیا ہے کہ "تم نے مجھے رسوا کیا۔ جاؤ اب میں کبھی تم سے بات نہ کروں گی۔" اپنے تخیل کی اس سرد مہری کے باوجود اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس تک جائے گا اور اگر حقیقت میں وہ روٹھ گئی ہے تو وہ اس کو منائے گا۔ اسے روٹھوں کو منانے کا ایک بہت لطیف طرز آتا ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اک بار اس نے اسے ناراض سمجھ لیا تھا اور جب وہ اسے رخصت کرنے دروازے تک آئی تھی تو اُس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس سے پوچھا تھا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہیں"؟

"میں اور تم سے ناراض ــــ کیوں آخر"؟

"یوں ہی میرا خیال تھا"

"اچھا خیال تھا۔ میں تو ناراض نہیں ہوں" اتنا کہہ کر وہ جلدی سے اندر بھاگ گئی تھی۔ شاید اس کی آنکھوں میں کوئی چور تھا لیکن اگر اب وہ اسے رخصت کرنے نہ آئی یا اگر اس نے یہ کہہ دیا کہ "ہاں میں تم سے بہت ناراض ہوں" تو شاید وہ اس کے پیروں پر گر جائے گا۔ اور اپنی آنکھوں کے موتی اس کے حسین قدموں میں ڈال دے گا۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ناراضگی

اس کے جیون کو انتہائی کٹھن بنا دے گی۔ آخر اس سے دلچسپی رکھنے کی خاطر تو اس کی ماں نے اسے اپنا بیٹا سمجھنے سے انکار کر دیا تھا شاید وہ اسے پتھر کے ایک مجسمے کی طرح ایک بے حس بُت دیکھنا چاہتی تھی۔ ممتاز کو اپنانے کی حسین فردوسِ تخیل سے اس کو حقیقت ——(جو ہمیشہ تلخ ہوتی ہے ——) کے زندانِ تاریک میں پھینک دیا گیا تھا تو اب اس کو اس دوزخ میں رہنا کیوں ناگوار ہوتا جو ماں کے پیروں تلے نہیں ہوتی؟

وہ ٹہلتے ٹہلتے کافی دور نکل آیا تھا۔ اس وقت ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا یہیں وہ کلب واقع تھا جہاں امیر زادے تفریح کی غرض سے آیا کرتے تھے، اور جہاں پر جُوا بھی ہوتا تھا لیکن اسے خلافِ قانون تصور نہ کیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ سرمایہ داری تمام عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے پاس سے گذرتے ہوئے اسے اس بات کا تلخ احساس ہوا کہ وہ غریب ہے، وہ اگر اس سے ملنے جائے تو کم از کم ظاہرات تو اس بات کا اظہار کر سکیں کہ وہ اس کے نہ ملنے سے کچھ ایسے متاثر نہیں۔ قمیص پر ایک پُلوور ہونا چاہیئے پیروں میں مخمل کی سبک جوتیاں۔ اس لئے کہ فیستہ والے جوتے تو شیروانی کے ساتھ ہی پہنے جاتے ہیں اور اپنے عزیزوں کے گھروں میں، جو بہت ہی قریب ہوں، اسے پہن کر جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن اگر کسی دوپہر کو یوں ہی ایک قمیص پہن کر چلا جائے تو شاید وہ اس سے یوں کہے گی "ابھی آپنے پل او ور نہیں خریدا" اور اس کے جواب میں اسے یہ کہنے کا موقع مل جائے گا "میں خریدنا نہیں چاہتا بُنوانا چاہتا ہوں" اس پر اگر اس نے ہمدردی کے لہجے میں یہ کہہ دیا "تو اون لا دیجئے" تو وہ اون کہاں سے لائے گا۔ وہ اس کی نظروں میں حقیر ہونا نہیں چاہتا۔ اس کا معیارِ زندگی اتنا اونچا تو ہونا چاہیئے جتنا اس کے "ان" کا۔ لیکن اگر وہ اس قابل ہوتا تو اسی کو اپنا لیتا۔ آہ، دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے بھرپور جوانیاں، ان کا حُسن و شباب، رفیقانِ عشرت، غرض خدا کی خدائی اور شاید خدا بھی۔ اسے اس غیر مساوی تقسیمِ دولت پر غصہ آیا جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو منتقل ہوتی ہے لیکن غریب کو نہیں پہنچ پاتی۔ اس کی غربت میں آنکھ کھلتی ہے مفلسی میں بسر ہوتی ہے اور بے کفن ختم ہو جاتی ہے۔ اس پر خدا کی رحمتیں اولاد کی بے شمار تعداد میں یوں نازل ہوتی ہیں جیسے بارش کے قطرات —— جو ذرا سی دیر کو خشک زمین کو تر کرتے ہیں لیکن ایک کھیت کے لئے پانی کے علاوہ گرمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسی سے غریب ہمیشہ محروم رہ جاتے ہیں۔

جاڑے کی شام تھی مغرب کا وقت قریب تھا۔ اس نے دیکھا کہ سیکرٹریٹ کے آٹھ آٹھ روپیہ ماہانہ کے ملازم سُوں سُوں کرتے اپنے جھونپڑوں کو واپس جا رہے ہیں، قابلِ رحم ہیں یہ انسان جو صبح سات بجے اپنی ملازمت پر آتے ہیں، صاحب کے کمروں کی صفائی کرتے ہیں۔ مالی کے لائے ہوئے تر و تازہ پھولوں سے ان کی میزوں کو آراستہ کرتے ہیں، چونکہ اُن کا دفتر لنچ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اسی لئے دن کے ختم ہونے پر کام بند ہوتا ہے۔ اچھا ہوا اُس کے پاس اوورکوٹ نہ تھا۔ ورنہ اس وقت وہ اس کے جسم پر ناقابلِ برداشت بوجھ بن جاتا۔

وہ بڑھتے بڑھتے اسٹیشن کے قریب پہنچ گیا تھا اور جب واپس ہونے لگا تو چودھویں کا زرد چاند نکل آیا تھا۔ اس کے جذبات نے ایک جوان کروٹ بدلی۔ اس پر یہ خواہش غلبہ پانے لگی کہ کاش وہ ایسے میں تنہا نہ ہوتا۔ کوئی چمکتا ہوا تارا اس کے پہلو میں ہوتا۔ محل باغ کے کسی کنج میں وہ آرام کے بہانے بیٹھ جاتا۔ اک خوبرو لڑکی اس کے سودائی سر کو اپنے زانو پر رکھ لیتی اور وہ اس کے التفاتِ بے پایاں سے سرشار ہو کر آنکھیں بند کر لیتا تو اس کا چہرہ آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر جھکتا اور اُس کے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مل جاتے اور وہ محبت کی ان بنیادوں پر اک فردوسِ نو تعمیر کر لیتا۔ زندگی یکسر شباب و نغمہ بن جاتی!

یوں نہ ہوتا تو یوں ہوتا کہ جب وہ سرد ہوا نا چاہتا تو چند نازک انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگ جاتیں۔ اسے اپنی بھابی سے تو درخواست نہ کرنا پڑتی۔ آج صبح ہی انہوں نے جب اس کے سر میں تیل ملنے میں پس و پیش کیا تھا تو اس نے ایک بیوی کی ضرورت کا اندازہ کیا تھا۔ اسے دفتر جاتے وقت شیروانی کے بٹن بھی خود ہی ٹھیک کرنا پڑے تھے۔ اگر ممتاز موجود ہوتی تو وہ محبت سے اس سے کہتی "لایئے بٹن میں لگا دوں نا" اسے یاد تھا کہ اک بار جب وہ کالج جا رہا تھا تو اُس کی قمیصوں کی آستینوں میں اس نے بٹن ٹانکے تھے اور اسے جب بورڈنگ میں اس کی یاد آئی تھی تو اس نے اُن بٹنوں کو ہی چوم لیا تھا اور یہ خیال کر لیا تھا کہ اس طرح اس نے اس کے نفیس و ملائم ہاتھ پر اپنا بوسہ ثبت کر دیا —— آج اسے نہ معلوم کیوں اپنی زندگی میں ایک غیر معمولی خلا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں بائیں طرف ایک ایسا کاری زخم لگا ہے جو کبھی نہ بھر سکے گا۔ اس کا دل و دماغ مجروح ہو رہا تھا۔

اگر وہ اس سے شادی کر لیتا —— اسے حاصل کرنے میں کوئی خاص

دشواری تو نہ تھی ـــــ تو نئے زمانے کے میلانات کی تسکین کا کیا سامان ہوتا۔ اتنی قلیل تنخواہ میں اس کے لئے ساڑیاں اور زیورات کس طرح خرید پاتا۔ ہاں گر محبت اس کی سادگی میں چار چاند لگا دیتی لیکن وہ اپنے بجھے لہجوں میں بیٹھ کر اس کا کون سا ظاہری ثبوت پیش کرتی۔ وہ کیوں کر اس کی زندگی کو دلکش و جاذب توجہ بنا سکتا اور آج کل کی لڑکیاں اسے علم تھا کہ ایک خواہش، محبت کئے جانے کے علاوہ اور بہت سی خواہشات رکھتی ہیں جن کی تکمیل نہ ہو تو زندگی غیر دلچسپ ہو جاتی ہے!

غرض اس چاندنی رات میں، ان تصورات کی چادر سے اپنے آپ کو تسلی دیتا جب وہ گھر پہنچا تو اس نے اس قید کا احساس کیا جس میں غیر شعوری طور پر وہ مقید تھا۔ ان کبوتروں میں سے ایک کی طرح جو صبح کو اپنے آشیانے سے اڑا دیئے جاتے ہیں اور شام ہوتے خود بخود واپس آ جاتے ہیں۔ لیکن کبوتر تو زمانہ جنگ میں بھی پیام بر داری کرتے ہیں۔ کاش ان تخیلات کے حصار سے نکل کر وہ بھی اپنا کوئی پیام اپنی بہتی تک پہنچا آیا ہوتا لیکن اس کے تو پر کتر دیئے گئے تھے کیا اس کی ماں نے اسے منع نہ کر دیا تھا جب تک میں پوچھ نہ لوں وہاں نہ جانا۔ اسے اذن پرواز ہی کب تھا!

کہا جاتا ہے کہ عورتیں محبت کے بارے ـــــ اس راز کی باتیں بڑی جلد سمجھ لیتی ہیں۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ جب جمال کی بہن نے اس کو بے دلی سے کھانا کھاتے دیکھا۔ شاید وہ اپنے سامنے کی کرسی پر اک جانی پہچانی لڑکی کو بیٹھا دیکھنا چاہتا تھا جس کی طرف وہ کھانے کی پلیٹیں بڑھا دیا کرے ـــــ تو اس نے ممتاز کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس طرح اسے یہ معلوم ہوا کہ خالہ کے ساتھ اس کے نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لکھنؤ سے آنے کے فوراً بعد ہی حمیدہ کے ساتھ چلی گئی تھی۔

کھانے کے بعد وہ جلد سونا چاہتا تھا لیکن اس ذکر یک لمحے نے تو اس کے خیال کی چاندنی کو اور نکھار دیا ـــــ جو سونا چاہے اسے ملے چاندی تو نیند اچاٹ نہ ہو جائے گی، غرض رات کے گیارہ بجے، کتنی سرد رات خیالات کو یکسو کرنے میں گذر گئی، اس کی آنکھ لگی ـــــ وہ ممتاز سے ملنے کی آشائیں لئے سویا تھا، شاید اپنے ہی احساسات کا عکس تھا جو اس شام اس کے دماغ پر چھائے رہے تھے کہ اس نے بیداری کا ایک خواب دیکھا۔

رات کے نو بج چکے ہیں۔ ممتاز کئی گھنٹے سے حمیدہ کے پاس انگیٹھی کے قریب دالان میں بیٹھی لکھنؤ کے حالات سنا رہی اور وطن کے واقعات، جو اس کی غیر موجودگی میں پیش آئے سن رہی تھی کہ سائیکل کے چلنے کی آواز کانوں میں آئی۔ آواز ویسی ہی تھی جیسے اس نے دو ڈھائی ماہ کی سائیکل سے اس وقت سنی تھی جب ان کو اس میں تیل دیئے زمانہ ہو گیا تھا۔ اس کے سنتے ہی اس نے صباحت کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ اتنی جلد وہاں پہنچ گیا کہ وہ اٹھ کر بھاگ بھی نہ سکی۔ بس وہ اتنا کر سکی کہ اپنا چہرہ ایک طرف کو پھیر کر بیٹھ گئی۔

صباحت نے کہا "آپ کے یہاں بغیر اطلاع کے بھی مہمان آ جاتے ہیں۔"

"تو اور سنو، کہیں بیٹیاں بھی میکے میں مہمان ہوتی ہیں!"

"تب تو بیٹے بھی مہمان نہ ہوتے ہوں گے!"

"ایسا ہوتا تو تم اتنے دن تک یہاں کیوں رہتے!"

ممتاز کو یقین ہو گیا کہ وہ یہیں کھڑا رہے گا "تو یہ بڑوں کا بھی لحاظ نہیں!" اپنے دل میں کہتی ہوئی وہ نظر بچا کر بھاگی اور شرماتی لجاتی حمیدہ کے کمرے میں اس کے پلنگ پر جا پڑی اس نے اس گھبراہٹ کا سبب پوچھا ہی تھا "کیوں کیا کوئی ہوّا آ گیا" کہ صباحت آ موجود ہوا۔ وہ یونہی بے حس و حرکت پڑی رہی البتہ اس کی مزاج پرسی کے جواب میں اس نے صرف اتنا کہا "آپ نے خالہ کا بھی خیال نہ کیا۔"

"خالہ کو معلوم ہے کہ تم میری بیوی ہو۔"

"خوب، یہ کس شیطان نے کہہ دیا آپ سے، میں تو آپ کی بیوی نہیں ہوں۔"

"اب نہیں ہو تو کیا چند ماہ بعد ہو جاؤ گی!"

"یہ قبل از وقت کی راگنی کیوں۔"

"وقت قریب آ رہا ہے۔"

"جیسے آپ اس وقت قریب آ گئے ہیں! یہ تو بتایئے آپ اپنا گھر چھوڑ کے یہاں کیوں آ پڑے ہیں۔"

"یہاں ـــــ تم سے ملنے کی آزادیاں حاصل ہیں۔"

"میں یہاں روز روز تو نہیں آتی!"

"آج ہوا سی دن کے لئے تو یہاں آ گیا ہوں، تمہارے ساتھ ساتھ نقل مکانی ہوتا تو سب کو بات پکڑنے کا موقعہ ملتا۔"

"بہت دور اندیش ہیں آپ"

"اور تم بہت نکتہ شناس"

"اب باتیں ختم جناب، پہلے ہمارا شکریہ ادا کیجئے۔"

"تمہاری محبت کا شکریہ" ممتاز محبت کا لفظ درمیان میں آتے ہی اُٹھ بیٹھی اور اس نے کہا "میں کسی کا شکریہ نہیں ادا کروں گی بلکہ حمیدہ کو میرا شکرگزار ہونا چاہئے کہ میں نے اس کی بات مان لی۔"

"مجھے کیا پڑی ہے شکریہ ادا کرنے کی، یہ جانیں اور تم۔"

"میں آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں" عنایت کا لفظ سن کر وہ جل ہی تو گئی۔ غیر کی محبت اپنوں کی عنایت، بہت اچھا آپ کے اس نظریے کو بھی تبدیل کرنا ہے" اس نے اپنے دل میں طے کر لیا۔

اتنے ہی میں حمیدہ کا شوہر آ گیا اور یہ سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ میز پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ چاندنی رات کا لطف اٹھانے سنسان سڑکوں پہ جایا جائے۔ تجویز حمیدہ کی تھی اور تائید صباحت کی۔ ممتاز نے اس کی اس لئے مخالفت کی تھی کہ اس کے پاس جاڑے کی اس سرد رات میں پہننے کے لئے بڑا کوٹ نہ تھا۔ لیکن حمیدہ کے شوہر نے یہ کہہ کر کہ تم میرا اوورکوٹ پہن لینا اس تجویز کو پاس کر دیا تھا۔ تھی بھی آخر وہ اس کی داشاد دلہن کی اٹھائی ہوئی۔۔۔ چنانچہ کھانا ختم کرنے کے بعد یہ لوگ باہر نکل گئے، ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ رات کی رانی کی انتہائی مست خوشبو نے ان کے دل و دماغ کو معطر کر دیا۔ صباحت حمیدہ اور ممتاز کے درمیان آ گیا اب اس کے بائیں جانب حمیدہ تھی سیدھی طرف ممتاز۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چاندی تھی۔ یہ چاروں اس سہانی رات کو قہقہوں میں گزار دینا چاہتے تھے۔ خموشی میں جب ان کی گونج پیدا ہوتی تو ممتاز کو ایسا معلوم ہوتا جیسے آس پاس کے بنگلوں کے دالانوں میں کھڑے ہوئے جوڑے، بیلوں اور درختوں کی آڑ میں سے انہیں دیکھ کر مذاق اڑا رہے ہیں۔ صباحت ذرا خاموش چل رہا تھا ممتاز نے خیال کیا کہ شاید میں جو ان سے مخاطب نہیں تو ان کو یہی ناگوار گزر رہا ہے۔ اس کی طرف دیکھ کر اس نے کہا "کیا سوچ رہے ہیں آپ۔ کیا چپ کی نیند آ گئی ہے؟"

"نہیں اک خمار سا چھا رہا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ سردی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔"

"انگیٹھی پہلو میں تو ہے" حمیدہ بولی "کیا گلے کا ہار بنانا چاہتے ہو۔ سنا ہے کشمیر میں لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"حمیدہ، تمہارے ان کا پہلو بھی تو خالی ہے ادھر آ جاؤ نا۔" ممتاز کو ناگوار تھا کہ اس کے شوہر کا بایاں پہلو وہ گرم کرے۔

ابھی وقت نہیں آیا۔"

"کس بات کا؟"

"پہلو گرمانے کا۔ فی الحال تو ہوٹل چل کر چائے پئیں گے۔"

ٹرنک روڈ پر ہوتے، ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ، یہ دو جوڑے اسٹیشن کی سڑک پر جا رہے ہیں لیکن اب ان کے چلنے کا انداز یوں ہے کہ حمیدہ اور صباحت آگے ہیں اور اس کا شوہر اور ممتاز دس قدم پیچھے چل رہے ہیں۔ اس نے شادی کا ذکر چھیڑ دیا ہے اسے افسوس ہے کہ منگنی کو چار سال ہو گئے لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی اور وہ اس کو بتا رہی ہے کہ ابھی تو انتظامات میں دو تین ماہ اور لگ جائیں گے۔ "میں تو چاہتی ہوں کہ یہ جھگڑا جلد ختم ہو۔ اور کچھ نہیں تو ان کا یہ آوارہ پھرنا تو جائے میں نے سنا ہے یہ آپ سے ٹہلنے کا بہانہ کر کے ہوٹل میں جا کر شوق کرتے ہیں۔"

"اس میں حرج بھی کیا ہے۔"

"خوب شراب تو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔"

"کہتے ہیں کہ عورت اور شراب دونوں نشیلی چیزیں ہیں۔ جب وہ نہ ملے تو اس کو منہ لگانا ہی پڑتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہکے ہوئے ہیں۔"

"اس میں شک بھی کیا۔"

"اس وقت تو آپ ان کو نہ پینے دیں گے۔"

"میں کون ہوتا ہوں تمہارے ہوتے۔"

اس کے بعد گفتگو کا موضوع پلٹ گیا اور جب دونوں ہوٹل پہنچے تو دیکھا کہ درمیانی گیلری سے حمیدہ اور صباحت مسکراتے سیڑھیوں کی طرف آ رہے ہیں۔

ممتاز نے کہا "تم تو ہوا پر سوار ہو گئیں۔"

"بلکہ میرے کندھوں پر۔"

"آپ بھی بس ان ہی کا ساتھ دینا جانتے ہیں۔"

"تمہارا خیر مقدم تو کرنا تھا یہاں" اور یہ کہہ کر وہ تینوں کو ساتھ لئے اسی گیلری میں واپس ہوا۔ اس سے نکلا تو ہوٹل کے منیجر سے "سامان بھجوائیے" کہتا ہوا ان کو ایک کمرے میں لے گیا۔ اس میں یوں تو سب سامان تھا لیکن مسہری ایک ہی تھی۔ ممتاز کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کہ چائے اور پینے پلانے کا سامان آ گیا۔ حمیدہ چائے بنانے لگی تو صباحت نے ممتاز کے سامنے بوتل بڑھا کر کہا "تم اس کا کاگ اڑاؤ جام بھرو۔"

"افسوس ہے کہ میں ساقی نہیں ہوں"

"تو کیا آپ کوئی پیمانہ ہیں"

"اگر ایسا سمجھیں"

"پھر تو واقعی صراحی دار ہے —— لو، صباحت چائے پیو اور جب ممتاز کو منظور نہیں تو اسے انکار کرنے دو"

"اس شرط پر کہ انہیں اپنے ہونٹوں سے پلانا پڑے گی"

ممتاز سوچنے لگی کہ بن پیئے تو ان کا یہ حال ہے اگر کہیں چڑھا لی تو پھر تو شاید ہمیں لپٹ ہی گئے۔ اسے چائے کڑوی معلوم ہوئی اس نے حمیدہ سے کہا "مجھے نو ۹ معلوم ہو رہا ہے جلدی سے چائے ختم کرو واپس چلیں"

"لیکن ابھی تقریباً دس منٹ تو ٹھہرنا پڑے گا"

"وہ کیوں —— کیا دس پیالیاں چڑھاؤ گی"

"ذرا ان کے ساتھ یہاں کا ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم دیکھ لوں مجھے کوئی رت جگا تو نہیں کرنا کہ اتنی پی لوں"

اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا اور وہ یہ کہتا "ہم ابھی آتے ہیں" باہر نکل گیا۔ ممتاز نے اک لمحہ کی دیر کر دی ورنہ وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیتی لیکن ان کو تنہا چھوڑنا بھی تو مناسب نہ تھا —— اب وہ تنہا اس نئے ہوٹل میں کیونکر اتنی رات گئے جرأت حرام کرے۔ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھی تھی کہ اسی نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ صباحت اس کی طرف لپکا لیکن اس کے جھٹکا دینے سے قبل وہ بند ہو چکا تھا۔ ممتاز نے کہا "حمیدہ کی شرارت معلوم ہوتی ہے"

"اور کیا اب ہم ان کی واپسی تک اٹھ بھی نہیں سکتے صبر کریں اور کچھ"

اس نے انڈیل لی۔ لیکن ابھی جام لبوں سے لگانہ پایا تھا کہ ممتاز کا ہاتھ بڑھ گیا اور اس نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ "کیا مذاق ہے، چھوڑیئے میرا ہاتھ، چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی"

"ابھی چھوڑتا ہوں لیکن اک پیار" ممتاز محجوب ہو گئی اس نے آنکھیں نیچی کر لیں، صباحت نے اپنا چہرہ آگے بڑھا کر اس کے لبوں کا ایک بوسہ چرا لیا۔ کتنا شیریں تھا وہ، ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے گلاب کی پتیاں اس کے ہونٹوں سے چھوا دیں —— اور پھر تاش کی بازی شروع ہوئی۔

ممتاز نے اپنے ہونے والے شوہر کے جذبے کی دل ہی دل میں تعریف کی لبوں ہی کو چومنا چاہئے تھا لیکن جمال نے تو صرف اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا تھا، شاید وہ پر عظمت تھا اور یہ لطیف —— تاش کھیلنے میں وقت گذرتا معلوم نہیں ہوا۔ یک دم وہ کسی خیال سے چونکی اور غسل خانے میں جا کر اس نے منہ دھویا کہیں وہ بوسۂ اولیں چپکا تو نہیں رہ گیا۔ حمیدہ نے

میز پر رکھی ہوئی گھڑی ایک بجا رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ حمیدہ اب واپس نہیں آئے گی۔ اسے شک گذرا کہ اب اس کو کہیں کوئی اور قیمتی چیز نہ کھونا پڑے الفت کی قمار بازی میں وہ، بہت مدت ہوئی جمال کو ہار چکی۔ ابھی چند گھنٹے گذرے وہ اپنے ہونٹوں کی عفت کھو چکی، تاش میں وہ برابر ہار رہی تھی کیا اس کے بعد بھی کوئی ہار اس کے نصیب میں لکھی گئی ہے —— بہرکیف کسی نہ کسی صورت آج وہ اپنے ہونے والے شوہر کے دل سے اس سوئی کو نکال پھینکے گی جو کسی دوسری نے پرونا شروع کی ہے۔ اس نے واپس چلنے کی خواہش کی لیکن سب دروازے بند تھے۔ صباحت نے مجبوری ظاہر کی۔ اور کہنے لگا "یہ بستر موجود ہے اس پر آرام کرو"

اس نے پوچھا "اور آپ"

"میں اس آرام کرسی پر لیٹ رہوں گا"

"تکلیف تو نہ ہوگی"

"اگر تمہیں راحت پہنچانے کا خیال آئے"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

"اک جام پلا دو"

"باقی کا کیا ہوگا"

"تم شریک ہو جاؤ" اس میں اب مخالفت کی سکت نہ تھی۔ اس نے دوسرا جام بھرا اور ایک پی کر مسہری پر جا لیٹی۔ تھوڑی دیر بعد میز پہ رکھا ہوا لیمپ روشن ہوا اور پھر چند منٹ بعد اس نے اپنے جسم میں گرمی سی محسوس کی۔ کروٹ بدلی تو صباحت کرسی پر موجود نہ تھا اور شراب کی بوتل خالی ہو چکی تھی۔

(۵)

صبح کے روشن اجالوں میں جمال کی آنکھ کھلی اور اس نے آسمان پر اک ستارہ جھلملاتا دیکھا۔ دوپہر کو جب وہ کھانا کھانے مکان آیا تو ممتاز اسی کے یہاں موجود تھی۔ وہ بجائے رنگے ہوئے پاجامے کے سفید شلوار پہنے تھی اس کے پیروں میں سنڈلوں کی جگہ سچی کامدار جوتیاں تھیں۔ سرخ مخمل کی اور بالوں میں آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد دھودا تھا۔ یا شاید بسنت رت کی وجہ سے جمال کو ایسا دکھائی دیا۔ اس نے جمال کو سلام کیا اور فوراً ہی اپنی جگہ بدل دی۔ کمرے میں جاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ درخت میں جو کلیاں تھیں ان میں انار آ گئے ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ممتاز سونے میں سیپی ہو چکی لیکن موتیوں میں سفید نہ ہوئی، جمال کے اشکوں کی لڑیاں وہ اپنے پیروں میں کیوں ڈالتی۔ شاید وہ اپنا ہی موتی کھو چکی تھی، دوسروں کے موتیوں سے کیوں بوجھل ہوتی!

"حیات"

سہاگ گیت

لڑکے:- رات! جلادے جلدی جلدی دیپک مالا تاروں کی تُو،
بھر بھر تھال لُٹا دے موتی جھولی میں گلزاروں کی تُو،
چاند کی کرنوں کو بُن بُن کے سندر صورت سیج بچھا دے!
دُکھ داتا ہے دن کی اگنی، سورج دیو کی جوت بجھا دے!
آ جا، سندر سپنوں والی! جھوٹے حیلے اور بہانے!
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا ـــ ہائے، کوئی یہ کیا جانے!

لڑکیاں:- جا ری سکھی! آکاش کے تارے آج ترے رکھوالے ہوں گے!
سکھ سنگت کی ریت منانے، جھوم جھوم متوالے ہوں گے!
پریم کی اونچ اور نیچ سے تھک کر، پیاری سکھی جب تو سو جائے،
سندر سندر، کومل کومل، ٹھنڈے سپنوں میں کھو جائے!
رہ رہ کر یوں ڈرتا ہے من، تو اپنی ہے وہ بیگانے!
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا ـــ ہائے، کوئی یہ کیا جانے!

لڑکے:- رات کا پل پل بڑھتا جائے، دن کی گھڑیاں سوتی جائیں!
اونچے نیچے پربت بن میں سورج کی کرنیں کھوتی جائیں!
کوند کوند کے بجلی جیسے کالی بدلی میں کھو جائے!
جیسے کالے بالوں والی ناری بیٹھی بال سکھائے!

لڑکیاں:- ـــــ جا ری سکھی، پر تیرا جانا ـــ دل ہی نہ مانے دل ہی نہ مانے!
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا ـــ ہائے کوئی یہ کیا جانے!

سب مل کر:- نیند کے ماتے نیند بھلا دیں، پریم کا ساگر جب لہرائے
من کا راگی من مندر میں میٹھی میٹھی تان اُڑائے!
جیسے من کی پینگ بڑھا کر چنچل آشا جھولا جھولے!
یا جیسے رُت آئے بسنتی، کھیت کھیت میں سرسوں پھولے!
رُوٹھ رُوٹھ کے بیٹھے کوئی ـــ کوئی ڈھونڈے جوڑ بہانے!
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا ـــ ہائے، کوئی یہ کیا جانے!

(شملے) **قدرت اللہ شہاب**

دوغزلیں

(۱)

جلوے ہیں تیرے خشک وتر و کوہ وکاہ میں
جز تیرے کوئی جچ نہیں سکتا نگاہ میں

سو بار گُل کی اوٹ سے دیکھا گئے تجھے
سو بار سبزہ بن کے بچھے تیری راہ میں

چشمِ زمانہ روز بدلتی ہے ایک رنگ
مضمون ہے وہی کہ ہے تیری نگاہ میں

جاری ہے تیرا سکہ سپید و سیاہ پر
ساری ہے تیرا حُسن سپید و سیاہ میں

کس کس سے التفات ہے کس کس سے اجتناب
ساقی کی ہر نگاہ ہے میری نگاہ میں

امید و یاس۔ وصل و فراق۔ اور غم و نشاط
ہیں جمع کیسے کیسے عناصر اک آہ میں

حالِ تباہ میں ہے اُسی پر مری نظر
جس نے تباہ کر دیا پہلی نگاہ میں

آخر کو بس میں کر ہی لیا اُس نے میرا دل
آخر کو بس گیا ہے وہ کافر نگاہ میں

بھاگے ہیں بتکدے سے برہمن حرم سے شیخ
"واللہ کس بلا کی کشش ہے نگاہ میں"

وہ حُسنِ فتنہ کار۔ وہ عشقِ جنوں سرشت
فطرت کا ہر کمال ہے میری نگاہ میں

(۲)

نہ رہا اے مذاقِ فغاں بار بار
سماعت میسّر کہاں بار بار

نہ شعلے ہی بھڑکے نہ خرمن جلا
اُٹھا داغِ دل سے دھواں بار بار

خوشی سازگارِ محبّت نہیں
بدلتا ہے رُخ آسماں بار بار

وہ پہلی نظر کی حسیں سادگی!
وہ منظر میسّر کہاں بار بار

تلوّن جوانی کو مرغوب تھا
محبّت ہوئی بدگماں بار بار

نہیں یہ خیالات شایانِ عشق
نہ کر فکرِ سود و زیاں بار بار

مرے شوق کے کارواں نے کیا
نفس پر جرس کا گماں بار بار

جفا پر وفاؤں کو پیار آگیا
محبّت ہوئی بے زباں بار بار

غم آزارِ جاں تھا مگر شوق میں
ہوا ضبطِ غم کامراں بار بار

تخیّل کی فطرت فریبی ہے خوب
حقیقت ہے وہم و گماں بار بار

عبد العزیز فطرت

تجارت کے قدیم راستے

انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں تجارت اصول مقائضہ (تبادلۂ اشیاء بہ اشیاء) پر قائم تھی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے ہم ایسی تجارت کی ابتدا کے متعلق کوئی معلومات آپ کے سامنے پیش کر سکیں، اور نہ ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ان اشیاء کی فہرست آپ کے سامنے رکھیں جن کا باہمی تبادلہ ان دنوں ہوا کرتا تھا۔ البتہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ابتداء میں تجارت کا دار و مدار شکاری یا پالتو جانوروں کے تبادلہ پر تھا۔ کیونکہ انسان نے غلہ خوری گوشت خوری کے بعد شروع کی ہو یا یوں کہئے کہ جب انسان نے گیہوں، چاول، جو اور جوار زمین سے حاصل نہ کئے تھے۔ تو اس کی زندگی کا انحصار صرف گوشت پر تھا۔

اس مضمون میں انسانی تمدن کی ابتدائی حالت، اور اس وقت کی اشیائے تجارت پر تفصیلی بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف قدیم تجارتی راستوں کا کسی قدر ذکر منظور ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قدیم بحری بری راستوں کے متعلق کسی قدر معلومات آپ کے سامنے پیش کریں۔ جن کے ذریعہ اس زمانے کی اشیائے تجارت ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچائی جاتی تھیں۔

تجارت کا فروغ چند ضروری اسباب و عوامل کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر یہ مہیا نہ ہوں تو کسی جگہ تجارت کو فروغ بلکہ بعض حالتوں میں تجارت کا وجود ممکن نہیں۔ ان عوامل و اسباب میں ذرائع حمل و نقل راستوں کی تعیین اور امن عامہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد ضرورت و احتیاج، اور قیمت کے ذرائع، اور درآمد و برآمد کے محصول وہ عوامل ہیں جو تجارت پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔

قدیم زمانے میں دشوار گذار طویل راستے تجارت کی سب سے بڑی مشکل تھے اس وقت اونٹوں، گھوڑوں اور بیلوں کے علاوہ مشینی طاقتیں اور ہوا اور بجلی انسانی اقتدار میں کہاں تھی جو اس مشکل پر غالب آنے کے لئے بعد کے زمانوں میں کام آئی۔

قدیم تجارتی راستے عموماً غیر آباد صحراؤں کے وسط یا کم از کم اُن کے کناروں سے گزرتے تھے۔ آباد اور گنجان علاقوں کی بہ نسبت صحرائی علاقوں میں تجارتی قافلوں کی حفاظت سہل سمجھی جاتی تھی۔ چوروں اور رہزنوں کی جمعیتیں ان صحراؤں میں بھی مل جاتی تھیں، اور بڑی آفت و مصیبت ثابت ہوتی تھیں مگر یہاں ان کی اتنی بڑی تعداد نہ ہوتی تھی جتنی آبادی کے قریب ہوتی۔ تجارتی قافلے ایسے پیش آنے والے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی تیاریاں کر کے سفر شروع کرتے تھے۔ راستوں کا انتظام اس طرح کیا جاتا تھا کہ جا بجا منزلیں ہوں جہاں پانی کھانے کے علاوہ تجارتی سامان کی حفاظت کے لئے گودام بھی ہوتے تھے۔ ابتدا میں یہ تمام سامان خود تاجر مہیا کرتے تھے، حکومت کو ان معاملات سے سروکار نہ تھا۔

دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر اور وادی النیل میں بعض ملکی قدیم اقوام نے اسی طریقے پر تجارت شروع کی۔ ان اقوام کی تجارت بہت کامیاب اور اُن کی سوداگری بڑی نفع بخش تھی۔ اس زمانے میں دوسرے ملکوں، بلکہ دوسرے شہروں سے برآمد ہونے والی اشیاء بہت گراں پڑتی تھیں لیکن اس کی وجہ درآمد و برآمد کے محصولوں میں بے انصافیاں، اور ملکوں کی تجارتی مسابقت نہ تھی، بلکہ یہ تھی کہ دور دراز مقامات سے گھنٹوں اور ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں کی آبلہ پائی تجارتی سامان کو ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچانے میں کامیاب ہوتی تھی اور ان پر کثیر اخراجات حمل و نقل کا بار پڑتا تھا۔

ان اقوام میں جن اشیاء کی تجارت عام تھی وہ عموماً مسالے، خوشبو، دوائیں، رنگ، نفیس ریشمی ملبوسات تھے۔ کسی قدر معدنی اشیاء زینت بھی ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھیجی جاتی تھیں۔ معمولی ماکولات و ملبوسات اسی گرانی کی وجہ سے دوسرے ملکوں کو نہ جا سکتے تھے۔

ایک مدت تک تجارتی قافلے تجارتی حمل و نقل کا واحد ذریعہ رہے۔ لیکن بحری راستوں کے کھل جانے اور جہاز رانی کی ابتدا سے ان کی اہمیت

کم ہوتی تھی۔

جہاز رانی کی ابتدا

تجارتی منڈیوں کے لئے بحری راستے غالباً سب سے پہلے اہلِ فینیقیہ نے اختیار کئے۔ یہ لوگ شامی سواحل سے قبرص، روڈس، اور بحرایجین کے دوسرے جزائر و سواحل تک مال پہنچاتے تھے۔ اس کے بعد کے زمانے میں یہ لوگ مغرب کی طرف بڑھنے لگے اور جبل الطارق سے آگے بڑھ کر بحر ظلمات تک ان کی آمد و رفت ہونے لگی۔

قدیم زمانے میں صور و صیدا جو آب شام کے چھوٹے شہر ہیں، دنیا کی بڑی تجارتی منڈیاں تھیں۔ ان کے باشندوں نے بحر ایجین کے دوسرے سواحل پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔ شمالی افریقہ کا شہر قرطاجنہ اسی قسم کی ایک نوآبادی تھا۔ قدیم زمانے میں قرطاجنہ معدنی برتنوں اور شیشے کے سامان کے علاوہ مختلف قسم کے پارچہ جات کی مشہور منڈی رہا ہے

اہلِ فینیقیہ نے جہاز رانی کی ابتداء کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بحری راستوں کے خطرات اور ان کا طول ہولناک ضرور ہے۔ مگر بری راستوں سے زیادہ نفع بخش اور کہیں زیادہ سہل ہے۔

فینیقیوں کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی تجارت اصول مقایضہ (تبادلہ اشیاء با اشیاء) پر قائم تھی یہ لوگ سکوں کا استعمال خرید و فروخت میں نہیں کرتے تھے۔

سکوں کا استعمال عام طور پر فینیقیوں کے جانشین یونانیوں کے دور تمدن میں ہوا۔

یونانی تجارت

یونانیوں نے اپنے زمانۂ عروج میں جہاں اور بہت سی نئی چیزیں پیدا کیں، جہاز رانی کو بھی انہوں نے بہت ترقی دی۔ یونانی کشتیاں بحر یونان، بحر اسود، اور بحر روم میں چلا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں شہر "پیریہ" دنیا کی سب سے بڑی تجارتی منڈی تھی۔ شام اور ایشیائے کوچک کے وہ تاجر جو یورپ اور خصوصاً یونان سے اپنا کاروبار رکھتے تھے۔ اس منڈی میں اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔

یونانیوں کی تجارت، انجیر، زیتون، روغن زیتون، شہد، ظروف گلی، اور معدنی اشیاء و آلات کی تجارت تھی۔

یونانی شہنشاہیت کو ایک مرتبہ ایرانیوں نے اور دو بار مصریوں نے نقصان پہنچایا۔ لیکن بحری راستوں پر ان کی سیادت کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ پھر بھی قائم رہی۔

جب سکندر اعظم نے مشرق میں فتوحات حاصل کیں تو یونانیوں کے لئے ایشیا میں بحری و بری راستوں سے تجارتی مال پہنچانے کی آسان صورتیں پیدا ہو گئیں۔ اس وقت دنیا میں دو تجارتی راستے بہت طویل، بہت منافع بخش اور بہت اہم سمجھے جاتے تھے۔

اول۔ ایتھنز سے براہ بحر سمرنا، وہاں سے براہ خشکی کونیا، عرفہ، موصل اور یہاں سے دو شاخیں تھیں ایک عراق عجم، ایران و افغانستان ہوتی ہوئی ہندوستان تک، دوسری عراق عرب، شام و فلسطین ہوتی ہوئی مصر تک،

دوم۔ ایتھنز سے براہ بحر صقلیہ ہوتے ہوئے تونس تک اور وہاں سے براہ خشکی ایک طرف الجزائر، مراکش و ہسپانیہ تک اور دوسری طرف طرابلس، سوڈان و حبشہ تک۔

ان راستوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے اور بحری و بری راستے بھی تھے جو عموماً ان ہی بڑے راستوں سے مل جاتے تھے۔ مثلاً چین سے آنے والا راستہ چینی ترکستان سے گذر کر مشہد کے قریب بڑے راستے سے مل جاتا تھا۔ بحر کیسپین میں جہاز رانی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اسی طرح یمن سے آنے والا راستہ حجاز سے ہو کر فلسطین و شام میں مل جاتا تھا۔

یونانی دور تمدن کی بڑی یادگار اس کے نقرئی سکے ہیں، ان سے پہلے تک تجارت اصول مقایضہ پر قائم تھی مگر یونانیوں نے اپنے ابتدائی دور تمدن میں چاندی کے سکے بنا لئے، یہ سکے بہت مقبول ہوئے، خالص چاندی کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔ اور قیمت ظرفی METAL VALUE سے قیمت مہر FACE VALUE مختلف نہیں ہوتی تھی، اس لئے یہ تمام دنیا کی تجارتی منڈیوں میں مقبول تھے۔ حکومت کی طرف سے یہ ضمانت تھی کہ ان کی مقررہ قیمت کو گرنے نہیں دیا جائے گا۔

اسکندر بن فیلقوس شہنشاہ یونان نے جب دارا شہنشاہ ایران کو شکست دی تو اس فتح کی یادگار میں اس نے حلب و شام سے ۶۲ میل اور انطاکیہ سے ۳۳ میل کے فاصلے پر خلیج کے کنارے ایک بندرگاہ بنوائی اور ایک قصبہ آباد کیا۔ جسے قدیم یونانی جغرافیہ نویس اسکندریہ اسوس اور عرب جغرافیہ نویس اسکندرونہ کہتے ہیں، اس قصبے کو تجارتی اہمیت دینے کے لئے عراق و شام کا سامان تجارت یہیں سے کشتیوں میں بار کیا جانے لگا، لیکن اسکندرونہ کو کوئی قابل ذکر تجارتی اہمیت اس دور میں حاصل نہ ہو سکی، اس کی تجارتی اہمیت مسلمانوں کے دور حکومت میں پیدا ہوئی ہے، اس لئے اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔

تجارت رومن دورِ حکومت میں

روما والوں نے اپنے ابتدائی دور میں تجارت کی طرف توجہ نہ کی، رومن قبائل عموماً زراعت پیشہ تھے، ملک میں کوئی صنعت موجود نہ تھی جس کی وجہ سے نکاسی کا انتظام ضروری ہوتا۔ لیکن جب ۱۴۶ ق۔م میں شہر قرطاجنہ ان کے ہاتھ آگیا تو تجارت انہیں گویا یونانیوں سے وراثت میں مل گئی۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ تجارت ملک کے لئے نفع بخش اور خوشحالی لانے کا ذریعہ ہے۔

اغسطس قیصرِ روما جب تخت نشین ہوا تو اس نے اولاً اپنی تمام تر توجہ داخلی فتنوں کو دبانے اور بدامنیوں کو رفع کرنے میں صرف کی۔ لیکن جیسے ہی اُسے اس کام سے فرصت ملی، اُس نے ملک کی خوشحالی کے وسائل پر غور کرنا شروع کیا۔ اس سے پہلے یونانیوں نے دنیا کے مختلف حصوں تک اپنے تجارتی راستے بنا رکھے تھے، اس لئے اغسطس کو کچھ زیادہ غور کرنا نہیں پڑا۔ اس نے ان ہی راستوں پر کسی قدر زیادہ آسانیوں کا انتظام کر دیا۔

اس زمانے میں انطاکیہ دنیا کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہو گیا۔ یہاں سے دنیا کے مختلف حصوں میں تجارتی قافلے جاتے اور دنیا کے تمام اہم حصوں سے یہاں تجارتی مال آیا کرتے تھے

یہ عجیب بات ہے کہ انطاکیہ سے صرف ۲۲ میل کے فاصلے پر بندرگاہ اسکندرونہ واقع ہے، یہاں بری و بحری دونوں راستے آکر مل جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس دور میں اسکندرونہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جس کا وہ اپنی جغرافیائی حیثیت سے مستحق تھا۔ کسی قدر مال یہاں سے بھی روانہ ہوتا تھا۔ لیکن زیادہ حصہ خشکی کے راستے سے مصر بھیج دیا جاتا تھا۔ جہاں سے وہ بحری راستے سے روانہ کر دیا جاتا تھا۔

اس زمانے میں اسکندریہ (مصر) کو یہ اہمیت حاصل تھی کہ یہاں عرب و ہند سے تجارتی جہاز آتے تھے یہ سامان عموماً مسالے، خوشبو، دوائیں، ریشمی اور سوتی کپڑے اور اشیاء زینت ہوا کرتی تھیں۔ یہاں یہ کشتیوں سے اتارے جاتے اور مختلف مقامات کو قافلوں کے ذریعے روانہ کئے جاتے تھے۔ اور بحری راستے سے اطالیہ بھیجے جاتے تھے۔ اسی طرح شام و فلسطین کا مال یورپ جانے کے لئے یہیں سے جہازوں پر بار کیا جاتا تھا۔

شہر روما اور اس کے نواح میں گیہوں کی پیداوار کم تھی۔ اس لئے اسکندریہ سے گیہوں کی بڑی مقدار روما کو بھیجی جاتی تھی بعض تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ روما کی وسیع زرعی زمین مصر میں واقع تھی جس کی پیداوار لاکھوں من گیہوں ہر سال بذریعہ جہاز روما جاتی تھی، اغسطس نے اپنے فرمان کے ذریعے ایسے جہازوں کو روکنے یا کسی قسم کی تاخیر پیدا کرنے کی شدید سزائیں مقرر کی تھیں۔ یہ جہاز اسکندریہ سے روانہ ہو کر بندرگاہ "اوسٹیا" پر خالی کئے جاتے تھے جہاں سے سامان بذریعہ قافلہ روما پہنچایا جاتا تھا۔

بندرگاہ "اوسٹیا" شہنشاہ کلوڈیس نے بنوائی تھی، اور شہنشاہ ٹراگونس نے یہاں بڑے گودام اور تجار کے لئے سرائیں تعمیر کرائیں۔

چونکہ رومن شہنشاہیت تجارت کی اہمیت کو اچھی طرح جانتی تھی اس لئے حکومت کی طرف سے اس کی کافی نگرانی کی جاتی تھی اور تقریباً اتنی ہی توجہ تجارت کی طرف رکھی جاتی تھی جتنی آج کل حکومتیں رکھتی ہیں۔

پھر اغسطس نے عرب اور حبشی بحری ڈاکوؤں سے راستوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی ایک کامیاب مہم جاری کر رکھی تھی۔ اسی طرح اُس نے ان دریاؤں اور نہروں کی طرف بھی توجہ کی جن کے ذریعے سامان تجارت کی منتقلی ہو سکتی تھی۔ اس لئے اندرون ملک تجارتی ضروریات کے لئے دریاؤں اور نہروں سے کام لیا جانے لگا۔

جنوبی ہند کے بعض مقامات پر کھدائی کے سلسلے میں قدیم رومن سکے برآمد ہوئے ہیں جو اس امر کی قطعی دلیل ہیں کہ ہندوستان سے رومن شہنشاہیت کے تجارتی تعلقات تھے۔ اور مورخ "پلینوس" کا قول تو یہ ہے کہ رومن اس قدر تعیش پسند ہو گئے تھے کہ عرب اور ہندوستان سے درآمد ہونے والے سامان تعیش خصوصاً خوشبو اور باریک مہین ریشمی کپڑوں کی خریداری پر بُری طرح گرتے تھے۔ ان اشیاء کے تبادلے میں رومن سکے کی بڑی مقدار باہر چلی جاتی تھی، ایک بار تو وہاں سکے کی بُری طرح کمی محسوس کی گئی۔ اور حکومت کو اس کا نظم کرنا پڑا۔

روما اپنے انتہائی عروج میں بھی کوئی صنعتی ملک نہ تھا اس لئے جن ملکوں سے یہاں مال آتا تھا اُن کے تبادلے میں روما کے پاس دینے کے لئے کچھ چیزیں موجود نہ تھیں بلکہ اُن کی قیمتیں زر کی شکل میں ادا کی جاتی تھیں۔

رومن شہنشاہیت کے مختلف حصوں سے جو تجارت ہوتی تھی۔ اس پر حکومت کی طرف سے کافی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ اگرچہ بحری ڈاکوؤں سے سمندر بالکل پاک تو نہ تھا مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت سمندر بڑی حد تک حکومتی اقتدار میں تھا، باہر نہ تھا۔

اس وقت، موافق موسمی حالت میں اسکندریہ سے اوسٹیا نو دس دن میں اور خلیج فارس سے اوسٹیا سولہ سترہ دن میں جہاز پہنچ جاتا تھا۔ موسمی حالت کی خرابی یا بحری ڈاکوؤں کی وجہ سے جو خطرہ بحری قافلوں

کو بحری راستوں میں خطرات کے مقابلے میں بہت کم تھا جو خشکی کے راستے تجارتی مال کو پہنچانے میں قافلوں کو پیش آتے تھے۔ رومن بادشاہوں کی توجہ سے بحرابیض، بحراحمر اور بحر روم میں جہاز رانی کو بڑی ترقی ہوئی اس زمانے کے تاجر خشکی کے راستوں کی بہ نسبت جہازوں کے ذریعے مال بھیجنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تجارت یہودیوں، یونانیوں اور شامیوں کے قبضے میں تھی خود روما کے فاتح اور حکمران باشندے اس معاملے میں کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تجارت کا کوئی حصہ ان کے قبضے میں رہا ہو۔

تجارت بازنطینی دورِ حکومت میں

جب فاتحین سورماؤں نے۔ رومن شہنشاہیت پر قبضہ کر لیا اور دنیا کا یہ عظیم الشان تخت الٹ دیا گیا تو تجارت کو بھی بڑا نقصان پہنچا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ تجارت اتنے بڑے انقلاب میں مامون رہ جاتی۔ تجارت کی بقا اور ترقی کا انحصار جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں سمندروں کے امن پر تھا، رومن شہنشاہیت کے پارہ پارہ ہوتے ہی یہ امن رخصت ہو گیا۔ ساحل پر بسنے والی آبادی نے سمندروں میں دست درازیاں شروع کیں اور کوئی مضبوط طاقت ان بدامنیوں کی روک تھام کرنے والا باقی نہ رہا اس لئے اب بحر روم و بحراحمر میں جہاز رانی تقریباً بند ہو گئی۔ بحرابیض کا مشرقی حصہ البتہ اب تک مامون تھا۔ اس علاقے میں تجارتی جہاز اب بھی چلا کرتے تھے۔ اور انطاکیہ اب بھی اچھی خاصی تجارتی اہمیت رکھتا تھا، مگر ۵۴۰ء میں ایرانیوں نے سکندر بن فیلقوس کا انتقام اردشیر بابک کی قیادت میں لیا اور اس قدر سخت خونیں انداز میں لیا کہ خدا کی پناہ شہر انطاکیہ جو بھرا بھرا شہر اور آباد منڈی تھی، اُن کے ہاتھوں جل کر خاک سیاہ ہو گیا بازنطینی حکومت نے اگرچہ انطاکیہ کو دوبارہ بسایا مگر اس کو تجارتی اہمیت حاصل نہ ہو سکی، ۶۳۶ء میں یہاں مسلمانوں کا قدم آیا اور انطاکیہ مقبوضات خلافت کا جزو ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے عہد سے مسلمانوں نے سمندروں پر اپنی نگرانی شروع کی۔ بحرابیض، بحر روم بڑی حد تک مامون ہو گیا۔

بازنطینی دورِ حکومت میں قسطنطنیہ کو عظیم الشان تجارتی اہمیت حاصل تھی، قسطنطنیہ مشرق و مغرب کے نقطۂ اتصال پر واقع ہے، اور ایک بڑی سلطنت کا صدر مقام بھی تھا، اس لئے اس کا تجارتی مرکز بن جانا تعجب خیز نہیں یہاں سے اس زمانے میں یورپ و ایشیا کو بحری و بری قافلے روانہ ہوتے تھے قسطنطنیہ کی یہ مرکزیت کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ حروب صلیبیہ تک قائم رہی۔

قسطنطنیہ اس زمانے میں نہ صرف ایک بڑی تجارتی منڈی تھا، بلکہ وہ ایک بہت عمدہ صنعتی شہر بھی تھا۔ اعلیٰ درجے کے سوتی و ریشمی ملبوسات معدنی اشیاء سے تیار شدہ ظروف و سامان آرائش مٹی کے برتن، ہاتھی دانت کی اشیاء اور بہت سے دیگر مفید مصنوعات یہاں تیار ہوتے تھے۔

قسطنطنیہ سے جو تجارت ہوتی تھی وہ اصول تبادلہ پر قائم تھی۔ وہاں کی دوسرے ممالک کو مصنوعات بھیجے جاتے تھے، اور دوسرے ملکوں سے خام اشیاء درآمد ہوتی تھیں۔ اس وقت بازنطینی طلائی سکہ جو "بیزانت" کہلاتا تھا۔ دنیا میں معیاری سکہ سمجھا جاتا تھا اور دنیا کی تمام تجارتی منڈیوں میں طلائی اشرفیوں کی طرح مقبول تھا۔

اس وقت تاجروں میں "بنک" کا رواج موجود تھا، ہنڈیاں، چیک حوالہ نامے اور تجارتی قرضوں کے لئے ادارے موجود تھے۔ اگرچہ مشترکہ سرمایہ سے کسی ایسے ادارے کا ثبوت نہیں ملتا لیکن اشخاص کی طرف سے یہ کام ہوتے تھے، اور عام رواج موجود تھا۔

کسی ماخذ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کرنسی نوٹ کا رواج کہیں موجود تھا۔ کہیں کہیں وقتی ضرورت کے لئے کاغذی دستاویزیں حکومت کی طرف سے زر تبادلہ کی جگہ برآمد کر دی گئیں تو انہیں کرنسی نوٹ کہنا صحیح نہ ہو گا جس طرح آج مختلف قیمتوں کے چھوٹے بڑے کرنسی نوٹ رائج ہیں، اس طرح پر ان کا رواج چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں شروع ہوا ہے۔ تبریز میں نوٹ کی ابتدا ۶۹۲ھ میں صدرالدین صاحب دیوان الممالک کے حکم سے ہوئی،

"وفیها وضع صدر الدین صاحب دیوان الممالک
بتبریز "الچاو" وهو کاغذ علیه نمغة السلطان
عوض السکة علی الدنانیر والدراهم وامر الناس
ان یتعاملوا به وکان من عشرة دنانیر الی دون
ذلک حتی ینتهی الی درهم ونصف وربع فتعامل
به اهل تبریز اضطرارا لا اختیاراً ابالقسر والقهر"

(الحوادث الجامعة والتجارب النافعة لعبد الرزاق بن الفوطی المتوفی ۷۲۳ھ ذکر حوادث ۶۹۳ھ)

اور اسی سال صدرالدین وزیر مالیات نے تبریز میں "الچاو" جاری کیا، یہ ایک کاغذ ہوتا ہے جس پر دیناروں اور درہموں کی طرح سلطان کا شاہی نشان ہوا کرتا ہے۔ وزیر نے لوگوں کو حکم دیا کہ معاملات میں

اسے استعمال کریں یہ دس دینار اور اس سے کم کے تھے یہاں تک کہ ایک درہم اور نصف و ربع درہم تک کے ہوتے تھے، اہلِ تبریز نے مجبوراً دباؤ کی وجہ سے اسے معاملات میں استعمال کرنا شروع کیا۔

بہرحال کرنسی نوٹ جب کبھی بھی جاری ہوئے ہوں، پرامیسری نوٹ اور بنکوں کے چیک وغیرہ بازنطینی دور میں جاری ہو چکے تھے اور نہ صرف بنک کا رواج ہو چکا تھا بلکہ اس زمانے میں جہازوں کا بیمہ بھی رائج تھا۔ اور بالکل موجودہ زمانے کی طرح جہازوں کا روانگی سے پہلے اور پوری مدت کارکردگی کے لئے بیمہ ہوا کرتا تھا۔ بازنطینی دور میں جو تجارتی ترقی ہوئی اس میں بیمے کے رواج نے بھی ایک موثر عامل کا کام کیا۔

آزاد تجارت کے خلاف بندشیں

بازنطینی دور سے پہلے تجارت بالکل آزاد تھی، نہ کسی ملک کی طرف سے درآمد برآمد پر کوئی پابندی عاید کی جاتی تھی اور نہ کوئی ٹیکس لیا جاتا تھا۔ حفاظت قوافل کے لئے ایک بہت معمولی رقم کہیں حکومت اور کہیں خود تاجروں کی جماعتیں وصول کرتی تھیں۔

- شہنشاہ یوسٹیانوس (۵۲۸ــــ۵۶۵ء) کے زمانے میں درآمد برآمد پر محصول لگایا گیا اور اسی شہنشاہ کے زمانے میں دنیا سب سے پہلی بار احتکار (تجارتی منافع کے لئے مال کو روک دینا) سے واقف ہوئی، اس سے پہلے کبھی یہ ظلم غالباً نہیں ہوا تھا۔

احتکار کی صورت یہ ہوئی کہ اس زمانے میں اعلیٰ ریشمی مبوسات کی تجارت تمامتر ایرانیوں کے ہاتھ میں تھی، دنیا کے بازار ان کے مال سے پٹے پڑے تھے۔ قیصر یوسٹیانوس نے ایرانیوں کو نقصان پہنچانے کے لئے اپنی مملکت سے ریشمی کپڑوں کی درآمد و برآمد دونوں ممنوع قرار دی۔

اسی قیصر کے زمانے میں قسطنطنیہ اور سالونیکا میں سالانہ تجارتی نمائش کا انتظام کیا گیا۔ یہاں تمام دنیا کے تاجروں کو دعوت دے کر بلایا جاتا تھا۔ مگر جنوی۔ اور بندقیہ کے تاجروں کو محصول درآمد سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح ان دو شہروں کے تاجروں کو بعض ایسی رعائتیں دی گئی تھیں جو دوسروں کو میسر نہ تھیں۔ تجارت میں امتیاز قائم کرنے کا غالباً دنیا میں یہ پہلا واقعہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر جنوی و بندقیہ تو آہستہ آہستہ تجارت کے مراکز بن گئے اور دوسری منڈیاں ویران ہونے لگیں۔ جس وقت ۱۲۰۴ء میں سلطان محمد فاتح رحمتہ اللہ علیہ نے قسطنطنیہ فتح کیا ہے تو اس وقت عالمی تجارت کا مرکز بندقیہ و جنوی تھے۔ قسطنطنیہ نہ تھا۔

جنوی و بندقیہ

فتح قسطنطنیہ کے وقت اطالیہ کو تجارت میں مرکزیت حاصل تھی، اور خصوصاً اس کے شہر جنوی اور بندقیہ کو۔ بندقیہ تو اپنی جغرافی حیثیت سے بھی مرکز کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ساحل اڈریاٹیک پر واقع ہے۔ اس زمانے میں دنیا کے مختلف حصّوں سے جہاز یہاں آتے تھے، یورپ کے تجار ہالینڈ اور جرمنی کا مال لے کر پہنچتے تھے اور مشرق کا مال یہاں جبل الطارق کے راستے سے آجاتا تھا۔

فتح قسطنطنیہ سے پہلے ہی بندقیہ والوں نے بحری راستوں پر قبضہ و اقتدار حاصل کرنے کی منظم کوششیں شروع کر دی تھیں۔ حروب صلیبیہ میں ان کی طرف سے جو مالی امداد ان صلیبی حملہ آوروں کو دی جاتی تھیں، اُن میں کوئی مذہبی جذبہ موجود نہ تھا بلکہ وہ محض تجارتی منافع اور اس امید و شرط پر دی جاتی تھیں کہ فاتح صلیبی بندرگاہوں کو تجار بندقیہ کے قبضے میں دے دیں گے۔ چنانچہ تیسری صلیبی جنگ میں اڈریاٹک کی بندرگاہ زارا انہیں سپرد بھی کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ تمام بندرگاہوں پر انہیں امتیاز حاصل تھا۔ جلب منفعت کے لئے ان کے اور نہ جانے کیا کیا ارادے تھے۔ مگر سارا نقشہ خراب ہو گیا چوتھی صلیبی جنگ کا نتیجہ قسطنطنیہ کا سقوط نکلا۔

فتح قسطنطنیہ اور اس کے پہلے چند سال کے مسلسل حوادث و واقعات سے بندقیہ والوں نے تجارتی فائدے اٹھانے میں کوتاہی نہ کی، جس قدر ممکن ہو سکا اٹھایا۔ صلیبیوں کو امداد دی اور آل عثمان کی خوشامد کر کے اُن کو اپنی اطاعت و وفاداری کا یقین دلایا۔ اس طرح انہوں نے دونوں طرف سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

اس وقت ان کے تجارتی قافلے مشرق میں شرقی بحر ابیض تک اور مغرب میں جزائر برطانیہ تک جاتے تھے۔ اس طرح بندقیہ مشرق و مغرب کا نقطۂ اتصال بنا ہوا تھا۔

اہلِ بندقیہ کی اشیا تجارت میں، مسالے، خوشبو، مفرد ادویہ نفیس کپڑے اور شام و مصر کی خام پیداوار داخل تھی۔

عبدالقدوس ہاشمی

دو نقشے اور ایک گیت

دو نقشے

جنگل سُونا اور سنسان
ہیبت والا، جرأت والا، شوکت والا اک حیوان!
ہاتھوں میں آیا ہے شکار،
ہر حرکت ہے گویا طاقت کی تلوار،
خونی آنکھیں
وحشی نظریں،
کرتی ہیں اس کا اظہار
کوئی نہیں جگ میں بلوان!

منڈل سُونا اور سنسان
خلوت والا، رغبت والا، چاہت والا اک انسان!
پتلی ڈالی ہے بے خار!
ہر حرکت ہے گویا اُلفت کی جھنکار!
ٹھنڈی آہیں
نرم نگاہیں،
کرتی ہیں اس کا اظہار،
آؤ آؤ لے لو دان!

گیت

اک بستی جانی پہچانی، یہ دُھن تو ہے بہت پُرانی
دل میں ہے دھیان ہمارے
نیلے منڈل کے تارے
اور چندر جوت کے دھارے
سب گائیں میٹھی بانی۔
اک بستی جانی پہچانی یہ روپ کی اٹل کہانی۔

دل کو ہے رس کا بندھن
اِس اُجلی رات کا جوبن،
آکاش کا اُونچا آنگن
ظاہر میں ہے لافانی
اک بستی جانی پہچانی، یہ دُھن تو ہے بہت پرانی

تو آئی، میں بھی آیا،
دونوں نے قول نبھایا،
لیکن ہر بات ہے مایا،
جگ کی ہر بات ہے فانی۔
سب فانی — فانی — فانی، یہ دھن بھی بہت پرانی

دوا

ہمارے رحمانی کے یہاں زمینداری تو کبھی نہ تھی مگر گاؤں میں آبرودار گھر سمجھا جاتا تھا۔ دو بیل کی سیر ہوتی تھی اور عورتیں پردے دار تھیں۔ بھرا پُرا گھر تھا ان کے شوہر ہمت خاں کی توقیر گاؤں میں کسی سے کم نہ تھی۔ گاؤں پٹی داری کا تھا جس میں حصہ دار گھٹے ہوں یا بڑھے سبھی رہتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ برابری کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اگر ان کا گاؤں کسی بڑے علاقے میں شامل ہوتا تو رعایا رعایا سب برابر ہوتے۔ تعلقدار نائب صاحب اور ضلعدار سب کی حکومت اٹھاتے اٹھاتے لوگ محکومی کے زیادہ عادی ہو جاتے۔ ان کا گاؤں ایسا نہیں تھا۔ چھوٹے زراعت پیشہ کہ بستے بستے کچھ دیر نہیں لگتی دو فصلیں اچھی ہو گئیں۔ اناج سے گھر بھر گیا، لگان بھی نکل گیا۔ پرانے بیلوں کی جگہ نئی گوئی بھی آ گئی اور اپنے ہم چشم عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ایک فصل خراب ہو گئی لیجئے صاحب لیکھا ڈیوڑھا برابر ہو گیا۔ اگر کہیں دو فصلیں بالترتیب بگڑ گئیں تو کسان ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اگر کہیں خدانخواستہ کوئی بیماری چلی پڑ گئی یا کوئی مقدمہ اٹھ کھڑا ہوا تو فاقے کی نوبت آ گئی اور گھر بار چھوڑ کر دیس بدیس نکل گئے۔ نہیں تو دو تین برسوں میں پھر حالت سنبھل گئی اور کام چلنے لگا۔

ہمت خاں کے دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ بڑا لڑکا سولہ سترہ برس کا تھا۔ لڑکی کا سن دس گیارہ برس کا تھا۔ چھوٹا بچہ سات سال کا رہا ہوگا۔ رحمانی کے یہاں بچے تو آٹھ ہوئے مگر جیتے تین ہی باقی کوئی چیچک میں کوئی سوکھے میں یا اسی طرح کی دوسری بیماریوں میں جن میں حفاظت ہو سکتی تھی مگر نہیں ہوئی مرتے گئے۔ گاؤں میں ایسی عورتیں بھی تھیں کہ جن کے بچے تو بہت سے ہوئے مگر جیتا ایک بھی نہیں۔ ان کے دیکھتے رحمانی اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھیں اور اللہ کا شکر بجا لاتی تھیں۔ زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا۔ اسی کو اہلِ جہاں انقلاب سمجھتے ہیں۔

ایک سال گاؤں میں ہیضے کی بیماری آئی جس میں ہمت خاں کا انتقال ہو گیا۔ رحمانی نے بڑے بیٹے کی مدد سے کھیتی باڑی سنبھالنے کی کوشش کی مگر بیٹے کی وجہ سے کام بگڑتا ہی گیا۔ باہر جا کر پردہ چھوڑ دینا ممکن تھا مگر اپنے گاؤں میں رہ کر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ بڑا لڑکا بھی کچھ بیمار رہنے لگا۔ کھٹ کھٹ کھانسی تو گذشتہ جاڑوں ہی سے آتی تھی اب تو تیسرے پہر کو حرارت بھی رہنے لگی رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ کھیت بے جوتے بوئے پڑے رہنے لگے۔ کچھ شکمی اٹھا دیئے کچھ جوت بوئے بھی گئے تو بسارہ بھی مشکل سے نکلا۔ فاقوں نے بڑے لڑکے کی بیماری اور بڑھا دی۔ گاؤں سے دس کوس پر ایک بڑا قصبہ تھا جہاں حکیم ڈاکٹر اور سرکاری شفا خانہ سب ہی کچھ تھا۔ وہیں رحمانی کی خالہ زاد بہن رہتی تھی جو کسی رئیس کے یہاں نوکر تھی۔ رحمانی نے علاج کے بہانے وہیں چلے جانے کا ارادہ کیا۔ اڑوسیوں پڑوسیوں سے روز روز قرض مانگتے مانگتے تھک گئی تھی۔ کہاں تک مانگتی کسی سے آٹا کسی سے دال کہاں تک ادھار ہے۔ اگر گاؤں چھوڑ کر چلی گئی تو زمیندار کا پیادہ لگان بھی مانگنے روز سر پہ نہ کھڑا رہے گا۔ لڑکے کا بھی علاج ہو جائے گا۔ گاؤں میں سوا نیم کے سینکوں کے اور دوسری دوا نہیں تھی۔ ایک دن اللہ کا نام لے کر چل کھڑی ہوئی۔

قصبے میں آ کر پتہ چلا کہ لڑکے کو بڑی بیماری ہے پہلے حکیم صاحب کا نسخہ پلایا۔ پھر خیراتی ہسپتال سے دوا آنے لگی مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" اور تھوڑے دنوں میں چارپائی سے لگ گیا۔ ایسے بیمار کو کون گھر میں رکھتا مگر رحمانی کی بہن نے نکالا نہیں البتہ بیمار کے برتن الگ کر دیئے۔ رحمانی کی خالہ زاد بہن ایسی خدا ترس کہاں تھیں کہ بال بچوں والا گھر رکھا کر ایسے بیمار سے گھبراتیں نہ مگر وجہ یہ تھی کہ رحمانی کی لڑکی کو اپنے لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتی تھیں اسی کی خوشامد تھی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ کسی رئیس کے یہاں نوکری کرنے کے بعد رحمانی کی لڑکی کا پیغام دینے کی جرأت بھی نہ پڑتی۔ آج یہ دن تھا کہ وہی رحمانی خود ان کی محتاج دکھتی تھیں۔ اللہ جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے۔ لڑکی کا سن بارہ تیرہ برس کا تھا پڑھے لکھے خوش حال لوگوں کے یہاں یہ سن کھیلنے کا ہے۔ غریب اگر اپنی لڑکی کا بیاہ کر کے ذمہ داری دوسرے پر نہ

ڈالنے کی کوشش کرے تو کیا کرے۔ رحمانی کا لڑکا گودیوں میں صاحبِ فراش ہو چکا تھا۔ ساون کے مہینے میں ختم ہو گیا۔ اتنی لمبی بیماری اور بیمار کی تکلیف دیکھ دیکھ کر شخص کے دل میں آتا تھا کہ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔ اس دعا میں ماں بھی شریک تھی۔ مگر ایسی بات کون ہندوستانی ماں منہ سے نکال سکتی تھی۔ انتقال کے بعد رحمانی نے بین ایسے کئے کہ ہر شخص کے دل پر چوٹ لگی۔ تجہیز و تکفین کے بعد ہمدردوں نے رحمانی کے غریب کو کھانا کھلایا۔ لڑکے کے انتقال سے پہلے ۔ سوم کے وقت فاقہ کیا تھا۔ اس وقت بھی کھانا کیا اچھی طرح کھایا جاتا مگر جب تک دنیا میں آدمی ہے بغیر کھائے چارہ نہیں لیکن اس وقت تو رحمانی نے بین ایسے کئے کہ سننے والے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس باضابطہ رونے میں کتنا رونا رواج کا تھا کس قدر دل کے تقاضے کا اور کس قدر دماغ کے اشارے کا۔ اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔

رحمانی مصیبت میں گھر سے نکلی تھی اس کے پاس تھا ہی کیا؛ جو نثار چھلّہ ہا بھی ہو گا۔ وہ لڑکے کی بیماری میں اڑ گیا۔ اب نام خدا رسول اللہ تھا۔ جس چیز کا خیال گھر پر خواب میں بھی نہ آیا تھا۔ اور جس کو یہاں آکر منہ سے نکالنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی وہ سامنے آئی یعنی رحمانی ماماگیری کرنے پر تیار ہو گئیں اور لڑکے کے سیوم کے بعد منہ چھوڑ کر بہن سے کہہ بھی گذریں۔ بہن نے کہا اس کی فکر ہو جائے گی۔ مگر جوان لڑکی کو کیونکر ساتھ لے جاؤ گی جو ان کے دل میں تھا وہی ان کی خالہ زاد بہن کے دل میں تھا۔ قصہ مختصر لڑکے لڑکی کی نسبت ہو گئی اور دو بول شرع کے بھی ہو گئے۔ گھر میں اتنی بڑی موت ہو چکی تھی اگر چہ ہوتا بھی تو ڈھول کیونکر رکھی جاتی لیکن ان کی سمدھن نے بھی اتنا لحاظ کیا کہ گانا وانا نہیں ہوا۔ لڑکی کے فرض سے سبکدوش ہو کر رحمانی نوکری کرنے چلیں اور رحمانی سے بوا رحمانی ہو گئیں۔ یہ تو ماماگیری کرنے پر تیار تھیں مگر تقدیر کی اچھی تھیں۔ ایک بڑے گھر میں کھانا پکانے پر نوکر ہو گئیں۔ بہت بڑی سرکار تھی۔ باہر کا باورچی خانہ جدا تھا اندر کا کارخانہ جدا۔ نوکروں چاکروں کی کثرت تھی اندر باہر ملا کر خدا جھوٹ نہ بلائے پچاس ساٹھ آدمیوں کی روٹی رہی ہوگی۔ نوکر تو پھر نوکر لیکن اتنا غنیمت تھا کہ ماماگیری کی ذلت سے بچ گئی تھیں۔ زمانہ گذرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ قصے کہانی میں تو کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔ دس برس ایک سطر سے دوسری سطر پر نگاہ دوڑاتے گذر جاتے ہیں۔ اتنے زمانے میں بوا رحمانی کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ بہن کا گھر کھیتی باڑی۔ وہاں کا رہنا سہنا پچھلے جنم کی باتیں ہو گئی تھیں۔ اس کے بجائے صاف ستھرا چھوٹا سا گھر رئیس صاحب کی مدد سے اور انہیں کی زمین پر بن گیا تھا۔ تھوڑی گذرتی بھی حیثیت کے موافق ہو گئی تھی۔ بوا رحمانی ادھیڑ عمر میں تو آ ہی گئی تھیں۔ اب اچھی خاصی بوڑھی ہو گئی تھیں پہلے دُبلی تھیں اب بلغم نے بھاری بھر کم بنا دیا تھا۔ ناک میں کیل تو پہن نہیں سکتی تھیں۔ مگر ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے اور بتانے لگیں۔ مالدار طوق اطمینان کا پتہ دیتے تھے۔ سونے کی بجلیاں بھی بنوائی تھیں مگر وہ بہو کے لئے رکھی تھیں۔ ساتھ کی ماما اصیلوں نے کہا بھی کہ بوا کان میں ڈال لو اپنے جیتے جی بہو کو کیوں دو گی۔ تمہارے ابھی تو اس پیسے ہی۔ اس سے ذرا بہو پر رعب رہے گا اور تابعدار رہے گی۔ مگر رحمانی نے نہ پہنا۔ اللہ وہ دن بھی لایا کہ بوا رحمانی بہو بیاہ کر لائیں مگر اپنے قدیم دیہاتی اعزا کو نہ انہیں نے بھیجی اور نہ وہ بلاتیں بھی تو شاید وہ نہ آتے۔ وجہ یہ تھی کہ جس لڑکی سے انہوں نے لڑکے کی نسبت کی تھی۔ اس کی پرورش ایک دوسرے رئیس کے گھر میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں کسی زمانے میں انہی طرح رانڈ دکھیا دیہات سے آکر دودھ پلانے پر نوکر ہوئی تھی۔ پہلا ہی لڑکا گود میں تھا۔ نوکری کے بعد اس کو کافی دودھ نہ مل سکا اور وہ دُبلا ہو کر مر گیا۔ قاعدہ کے موافق اَنا کا لڑکا اوپر کا دودھ پاتا تھا چورا چھپا کر کسی وقت اَنا بھی پلا دیتی تھی مگر کسی نے نہ دیکھا تو خیر۔ اگر دیکھ لیا تو آفت آتی تھی۔ جس لڑکے کو انہوں نے دودھ پلایا تھا۔ اس کی دودھ بڑھائی کے بعد یہ کچھ معطل سی ہو گئیں۔ گو گھر میں عزت توقیر وہی رہی جو ہونا چاہیئے تھی۔ مگر دھندا کم ہو جانے سے خیالات کچھا چاٹ رہنے لگے جو وقت بچے کی خدمت میں صرف ہوتا تھا وہ بناؤ سنگار میں گذرنے لگا۔ دودھ بڑھ جانے کی وجہ سے پرہیز کی بھی قید اٹھ گئی تھی۔ مرچیں کھانے کو زبان ترس گئی تھی کھٹاس کا مزا خواب ہو گیا تھا وہ پھر لوٹ آیا۔ کچالو چٹ پٹے اور چنے جور گرم کا چٹخارہ بھلا جانے لگا۔ کپڑے اور زیور تو اَناؤں کے پاس اچھے ہوتے ہی ہیں ان کے پاس بہرول جوانی کا بھی خزانہ تھا۔ جوانی میں دانت نکال کر طاق پر رکھ دو تب بھی نکلے ہی رہیں گے یہی حال اَنا کا تھا۔ کسی مرد سے آنکھیں چار ہوئی نہیں کہ ہونٹوں کی کلی بکس گئی ———

اسی زمانے میں بیگم صاحبہ نے ایک آدھ مرتبہ رئیس صاحب کو بھی آنکھیں ملتے اور اَنا کو مسکراتے دیکھ لیا۔ آدمی بڑی سمجھدار تھیں۔ بجائے اس کے کہ سوئی کا بھالا بناتیں۔ بات کا بتنگڑ کرتیں رہنا مت ڈالتیں۔ گھر کا پالا پوسا ایک لڑکا تھا انہوں نے اسی کے سر اَنا کو تھوپ دیا۔ بیچئے صاحب اس کا بھی گھر آباد ہو گیا اور قاضی صاحب نے اپنی عنایت سے آئندہ اور گذشتہ تہمتوں کا دروازہ بھی مسدود کر دیا۔ مجال ہے کہ شوہر دار عورت پر کوئی دوکھ رکھ سکے یا بانددھنو باندھے۔ مگر سال کے اندر ہی لڑکی پیدا ہوئی۔ حساب نکالئے سے بیاہ کے آٹھ ہی مہینے ہوتے تھے۔ اب کیا تھا عورتوں اور عورت مزاج

مردوں کے ہاتھ ایک مشغلہ آگیا جہاں سنئے اسی کی باتیں ہوتی ہیں۔ کہیں غصہ ہے کہیں ہنسی ہے کہیں تعجب ہے کہیں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا جا رہا ہے "توبہ توبہ" کہیں ماتھا کوٹ کر کہا جاتا ہے، اللہ ہر آفت سے بچائے کہیں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "اوئی بہن یہ کیا ہوا؟" کی آواز آتی ہے۔ کوئی چار دن کے بچے میں رئیس صاحب کی مشابہت دیکھ لیتی ہے کوئی پہلے ہی سے سر پر پورے بالوں کا ذکر کر کے کہتی ہے اطلو اسی تو ہو نہیں سکتی۔ لیکن متشرع بزرگ شوہر کو ہرگز نہ صلاح دے سکتے ہیں کہ بیٹا پھر سے نکاح پڑھوا لو۔ قصہ مختصر جتنے منہ اتنی زبانیں۔ جتنی زبانیں اتنی باتیں۔ ہر شخص اپنی چھوڑ پرائی بات طے کرنے پر تیار تھا۔ اگر یہ دیہات میں پیدا ہوئی ہوتی تو اس کا نام کوئی رسولن۔ امامن وغیرہ ہوتا یہاں اس کا نام جوہی خانم رکھا گیا۔ یہی لڑکی تھی جس کے ساتھ بوا رحمانی کے لڑکے کی شادی ہوئی تھی۔ بوا رحمانی نے بہو نہایت سلیقہ کی پائی۔ سینا پرونا۔ کھانا پکانا۔ ہر چیز میں بے مثال تھی گھر کے انتظام میں صفائی، کفایت شعاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ آنے جانے والوں سے برتاؤ، ان کی خاطر مدارات میں اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر کام کرتی تھی اور گو بڑے لاڈ پیار کی پالی ہوئی تھی اور جس گھر سے آئی تھی گو وہاں نوکر چاکر اس کی قدر و منزلت نہ معلوم کس وجہ سے نوکروں کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ کرتے تھے پھر بھی یہ سسرال میں ہر طرح کی کڑی جھیلنے کو تیار رہتی تھی۔ بوا رحمانی جہاں نوکر تھیں وہاں کے نوکر چاکر مختلف موقعوں پر ان کے گھر آنکلتے تھے اور ہر شخص کے ساتھ ایسا برتاؤ ہوتا تھا کہ بوا رحمانی کی بہو کی ہر طرف واہ واہ تھی۔

اب دو باتیں بوا رحمانی کے لڑکے کی بابت سن لیجئے۔ ان کا نام دائم خاں تھا۔ بوا رحمانی کی سرکار میں یہ بھی رہتے تھے۔ پہلے چلم وغیرہ بھرتے تھے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو پھر خدمت گاری کرنے لگے۔ نوکروں کی طرح تنخواہ ان کی نہ مقرر ہوئی گو مہینے میں تنخواہ سے زیادہ پا جاتے تھے غیر ذمہ داری کا کام رفتہ رفتہ سیر گشت زیادہ اور کام کم کرنے لگے۔ عمر بھر یہی رہا کہ گھر کا خرچ اسی سرکار سے چلا کیا۔ وقتاً فوقتاً کام بھی کیا کئے مگر مقررہ تنخواہ کبھی نہیں پائی ایسے لوگوں کو لواحق کہتے ہیں۔ آدمی نیک تھا مگر بے وقوف نوکروں میں ایک کہاوت ہے جس کی بڑھیا محل کے اندر اس کا طالع بڑا سکندر۔ بچپن سے پتے پکانے ہوئے کھانے کے عادی رہے۔ مزے سے مزے کی چیز جو گھر میں پکی اس میں ان کا حصہ ضرور لگا اوپر کا نہ سہی چیندی کا سہی تو ان کا کہیں گیا نہ تھا بغیر محنت کئے کھانے کی سزا چھوٹے بڑے ہر شخص کو ملتی ہے ان میں کیا سرخاب کے پر لگے تھے جو یہ بچ جاتے اسی وجہ سے کاہل بھی ہو گئے تھے۔ غریبوں کے لڑکے لڑکوں کا دستور ہے کہ دس ہی بارہ برس کی عمر میں یا اپنے آبائی یا کسی نہ کسی دوسرے کام پر لگا دئے جاتے ہیں۔ بعض اسی وقت سے کرنے لگتے ہیں بعض جب مصیبت پڑتی ہے تب کرتے ہیں لیکن ماں باپ کوشش یہی کرتے ہیں کہ کام کرنے کی عادت شروع ہی سے پڑ جائے۔ میاں دائم خاں کو ان کی ماں نے اس ڈھرے پر نہ لگایا۔ اسی طبقے کے دوسرے لڑکے جب دوپہر کو کام پر سے لوٹتے تھے تو موٹا جھوٹا جو کچھ ملا بے تابی میں کھا گئے بھوک کی شدت نے شکوے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میاں دائم خاں کی یہ عادت پڑی تھی کہ گھومنے پھرنے کے بعد جب دوپہر کو لوٹے تو جو ڈالی ماں سرکار سے لے کر آئی ہیں، سامنے رکھ کر کھانے لگے۔ اگر کسی دن سالن کم بچا تو جائزہ لیتے ہی وہیں سے شکوے کے انداز میں پکارے "اور اماں اس میں تو ہڈی ہی ہڈی دکھائی دیتی ہے۔ بوٹی تو ہے ہی نہیں" ماں نے کہا "کھا لو نہیں بچی تو میں کیا کرتی۔۔ دیکھو طاق پر کاغذ میں لپٹی ایک برفی کی ڈلی رکھی ہے وہ کھا لینا۔ اس کے بعد دائم چپ چاپ کھا کر باہر چلے جاتے تھے۔ حق بات کہنا چاہئے۔ کھانا چاہے اچھا ہو چاہے برا میاں دائم خاں اس معاملے میں مذکورہ بالا شکایت سے زیادہ کبھی نہیں کرتے تھے۔

شادی کے بعد ایک نئی آفت نازل ہوئی یعنی نہ فاتح کے اوپر غنودگی کے آثار دکھائی دئے جو مفتوح پر فتح ہو جانے کا وہ اطمینان جو تسلط کے بعد ہوتا ہے۔ آٹھ دس دن تو بات چھپی رہی مگر رفتہ رفتہ یہ راز دائم خاں کی سسرال سے کھلنا شروع ہوا۔ بوا رحمانی بہت گھبرائیں بیٹے کو حکیم صاحب کے پاس لے جانے کو تیار ہوئیں۔ لڑکا پہلے تو جانے ہی سے انکار کرتا رہا۔ اس کے بعد مجبور ہو گیا۔ حکیم صاحب نے وہی سوالات کئے جو دواؤں کے اشتہاروں میں دیکھے جاتے ہیں اور یہی سبب مرض کا ٹھہرایا۔ معجون کا نسخہ لکھ دیا کہ صبح کو کھانے کے دودھ کے ساتھ ہو۔ کئی روپے کا حلوا بنا دیا۔ جب اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا تو کہا ذرا سردی اور پڑنے لگے تو علاج شروع ہوگا۔ اب یہ راز پوری طور سے افشا ہو چکا تھا ساتھ کے نوکروں چاکروں نے دائم خاں سے صاف صاف پوچھنا شروع کیا۔ دائم خاں کبھی جز بز ہوئے کبھی شرمائے کبھی ہمدردی کا اظہار پا کر ہنس دئے "یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے ویسے تو ہم اچھے ہیں مگر دلہن پہنچ کر نہ معلوم کیا ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ جب ناقص مواد نکل جائے گا تو اچھے ہو جائیں گے۔ دیکھو بھائی کیا ہوتا ہے"۔

بوا رحمانی اپنی پریشانی میں دائم کو لے کر لکھنؤ بھاگیں۔ ایک بڑے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے حال سن کر کہا یہ روحانی شکایت ہے جس کو غلطیوں

سے کوئی واسطہ نہیں ممکن ہے غلطیوں سے کچھ بیماری زیادہ ہوگئی ہو مگر اصل وجہ روحانی ہے۔ اس علاج میں دیر لگے گی اور یہاں رہنا پڑے گا۔ بوا رحمانی کے پاس نہ اتنا وقت تھا نہ روپیہ نا چار نسخہ لکھوا کر واپس آئیں۔ اس کے بعد پھر حکیم صاحب کا علاج شروع ہوا پھر میاں دائم خاں عطائیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ نہ معلوم کتنے زخم ڈالے گئے کتنا خون مواد ہو کر بہہ گیا۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ تقریباً دو سال یہی ہوا کیا اس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ سسرال والے پہلے ہی سے طلاق مانگ رہے تھے اب بڑے زور شور سے اس کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی زمانے میں بوا رحمانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ لڑکی کے ماں باپ مقدمہ چلانے پر تیار ہوئے مگر جو ہی خانم نے صاف صاف کہہ دیا کہ میری تقدیر میں جو کچھ ہونا تھا ہوا اور جو ہونا ہوگا ہو کے رہے گا۔ پہلے تو بے سوچے سمجھے جھونک دیا اب فارغ خطی لکھواتے ہیں۔ میں طلاق ولاق نہ لوں گی اور خدا نے چاہا تو عمر بھر یوں ہی پار کر دوں گی بہت سی کم سنی میں رانڈ ہوتی ہیں آخر وہ نہیں پہاڑ ایسی جوانی کاٹ دیتی ہیں۔ دائم خاں میاں بی بی کا سلوک جوں جوں اغیار در اندازیاں کرتے گئے اور اچھا ہی ہوتا گیا۔ لوگ کہتے ہیں اور دیکھنے میں بھی یہی آیا ہے کہ بغیر زناشوئی رشتے کے محبت قائم نہیں ہوتی۔ یہی فرق بہن بھائی اور میاں بیوی کی محبت میں بتایا جاتا ہے مگر دائم خاں میاں بیوی کی یگانگی وہ آشنا سمجھئے جس سے ہر قاعدہ مضبوط ہوتا ہے۔ اسی طرح دس پانچ برس گذرتے گئے اور بات پرانی دھرانی ہوتی گئی۔ دوسروں پر اعتراض جانے کو نت نئے معاملات نکلا کرتے ہیں۔ معاشرتی۔ مالی جنسی گڑبڑیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ اس قدیم فضیحتے کو لوگ کب تک لئے بیٹھے رہتے آخر بھول گئے۔ اگر کچھ لوگ نہیں بھولے تھے تو محلے کے دو چار دل پھینک لونڈے تھے۔ اور خود دائم خاں کی سرکار کے دو ایک نوجوان نوکر جو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی عذر سے دائم خاں کے گھر پہنچ ہی جاتے تھے لیکن یہاں عجیب رنگ تھا۔ لوگ نہ معلوم کیا کیا ارادے اور کون کون منصوبے گانٹھ کر آتے تھے مگر وہاں نگاہیں کچھ ایسا برف۔ کافور۔ کتیرو۔ کیلے کا پانی۔ بردہ یانیڈ گھلا ہوا تھا کہ لونڈے کیا بڑے بڑے تماشبین سٹ پٹا جاتے۔ مسز سڈنس انگلستان کی بڑی مشہور ایکٹرس کی پرستش کرنے والوں کی کمی نہیں تھی شاہزادوں سے لے کر متوسط درجے تک پجاریوں کا شمار سیکڑوں میں تھا۔ شریڈن بھی انہیں میں تھے۔ کسی نے کہا تعجب ہے کہ تم نے باوجود اس گرم جوشی کے مسز سڈنس سے کبھی اظہار عشق نہیں کیا۔ شریڈن نے کہا، ارے اس کے رعب حسن میں وہ دبدبہ ہے کہ جو شخص اس سے اظہار عشق کر لے وہ آرچ بشپ آف کینٹربری سے بھی اظہار عشق کر لے گا۔ یہی حال جوہی خانم کا تھا۔ ایک آدھ بے تکے بے ہودہ آنے جانے والے نے مذاق میں یا کسی اور بھدے طریقے سے منہ پھوڑ کر اظہار مطلب بھی کیا مگر ایک ہی نگاہ میں کھسیانے ہو کر بھاگ آنا پڑا۔ زمانہ گذرتا گیا۔ لوگوں کی کوششیں جاری رہیں۔ میاں بیوی کی بے واسطہ محبت مضبوط ہوتی گئی۔ ہر ہر مرحلے میں یہ حال ہوتا تھا کہ اگر ایک کی انگلی دکھی تو دوسرا بے چین ہو گیا۔ عورت کو مرد کا ڈھونڈھ مونڈھ کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے لیکن مرد کو بھی ہمدردی کم ضرورت نہیں ہوتی۔ ظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی تھی کہ یہ لوگ ایک جان دو قالب تھے۔ ورنہ معاملات ایسے تھے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کون تعجب کی بات تھی بعض عورتیں جو ہمدرد تھیں اور جن سے یہ بھی اپنے دل کا حال کہہ دیتی تھی۔ ان سے اکثر باتیں ہوئیں۔ اس نے صرف یہی کہا کہ مجھکو کوئی تکلیف نہیں ہے یہ بھی کہا کہ جب کوئی موا اس طرح کا کوئی کنایہ کرتا ہے تو نہ صرف سر سے پاؤں تک آگ لگ جاتی ہے بلکہ یہ بھی جی چاہتا ہے کہ کنوئیں تالاب میں پھاند پڑوں۔ کہتی تھی کہ آبرو پر سے سو جانیں قربان ہیں۔ مختلف مرضوں کے ڈورے ڈالنے کی مصیبت اس غریب پر اس وجہ سے اور زیادہ تھی کیونکہ میاں دائم خاں رشک کے مادے سے بالکل بے واسطہ رہے۔ اگر کوئی مرد کسی بہلانے سے گھر میں آیا تو انہوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اگر نہ آیا تو کوئی پوچھ گچھ نہ کی گویا ان کے دماغ میں اس مادہ کا خانہ ہی خالی تھا۔ میاں دائم خاں کو کبھی زکام ہو گیا کبھی یوں ہی طبیعت سست ہو گئی۔ مگر ان کی بیوی ہمیشہ عورتوں کی بیماری میں گرفتار رہتی تھی۔ کمر میں درد سر میں درد۔ آنکھوں میں تکلیف غرضکہ آئے دن روز کی بیمار تھی۔ ایسے وقتوں میں میاں دائم خاں کی بے چینی قابل دید ہوتی تھی۔ کہیں سر دبا رہے ہیں کہیں حکیم صاحب کے یہاں دوڑے جاتے ہیں کہیں قابلہ کی خوشامدیں کر رہے ہیں۔ غرضکہ یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔

دائم خاں کی شادی کو تقریباً دس بارہ برس ہو چکے ہیں جو ہی خانم جوانی کے بے آب ریگستان کو پار ہی کیا چاہتی ہیں۔ مگر مثل ہے عورت کو تین دن قبر میں بھی بھاری ہیں۔ عاشق تن لوگ اس کی طرف سے کم و بیش مایوس ہو چکے ہیں۔ تاڑ لگانے والی عورتیں طوطیا طوفان اٹھانے والیاں بھی بے پرواسی ہو گئی ہیں کہ ایک نیا گل کھلا۔ پڑوس میں ایک آدمی کوئی پینتیس چھتیس برس کے سن کا آکر رہا۔ ڈھونڈھے نام نہ صورت نہ شکل نہ ایسی کمائی نہ

اٹھتی جوانی۔

رمضان شریف کے دن ہیں رات کے دس بجے ہیں۔ میاں دائم خاں شبینہ پڑھنے بڑی مسجد گئے ہیں کہ جعفر نامی ایک خدمتگار کچھ بچی کھچی افطاری بیگم صاحب کے حکم سے لے کر آیا۔ صدر دروازے کی طرف تو گیا نہیں کھڑکی قریب تھی اسی طرف گیا کھڑکی بند تھی مگر کچھ آہٹ پا کر اُس نے نہ آواز دی نہ زنجیر کھٹکھٹائی بلکہ دروازے میں کان لگا کر سننے لگا کیا سنتا ہے کہ دائم خاں کی بی بی آہستہ آہستہ کہہ رہی ہیں عورت کی دوا مرد۔ میں ہمیشہ کی بیمار۔ برسوں ہو گئے ٹھیک وقت پر نہ سر دھویا نہ بغیر تکلیف کے ایک مہینہ گذر گیا۔ اور وہی اب ہوں کہ کوئی بیماری نہیں۔ دن بھر سر جھکا کر بیٹھا کرو نہ آنکھوں کے ڈھیلے دکھیں نہ سر میں دھمک پیدا ہو کمر کا درد تو جیسے تھا ہی نہیں!

میاں جعفر بھی اُن کھسیانی بلیوں میں تھے جو کسی زمانے میں کھمبا نوچ چکے تھے اب کیا تھا پیٹ پکڑے دوڑے اور دوسروں کو خبر سنائی۔ آبرو بڑی قیمتی چیز ہے مگر دوسرے کی آبرو کوڑیوں کے مول بکنے میں سب کو لطف آتا ہے۔ بس کیا تھا لوگ چڑھ دوڑے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خود ناکامیاب رہے تھے اور وہ بھی تھے جو مفت کی سیر دیکھنا چاہتے تھے اور چور چور کا ہلڑ کر دیا دو چار آدمیوں نے چور کی ہانک لگائی۔ چالیس پچاس آدمیوں نے ڈنڈے لاٹھی لے کر گھر گھیر لیا۔ کچھ لوگ چاروں طرف اپنے اپنے کوٹھوں پر چڑھ گئے کہ چور نکل کر نہ جانے پائیں۔ وہاں چور رہتے تب تو نکلتے میاں ڈھونڈے سے تو پائے نہ جائے پریشان حال نکلے اور کہنے لگے میں تو آگ لینے آیا تھا۔ لوگوں نے ایک نہ سنی بعض منچلوں نے دو چار گھونسے بھی رسید کئے اور پکڑ کر رئیس صاحب کے پاس لے آئے دائم خاں کی بیوی بھی طلب ہوئیں۔ نہایت سراسیمہ سر سے پاؤں تک کانپتی ہوئی منہ چادر سے چھپائے آئی اور رئیس صاحب کے قدموں پر گر پڑی۔ رئیس صاحب کو ترس آیا اُس کو اندر بھیج دیا اور مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دے دیا۔ اتنے میں پولیس کا آدمی بھی آگیا مگر صورت حال دیکھ کر دست اندازی کی کوئی وجہ نہ پائی۔ اگر وہ عورت عزیب آشنائی میں پختہ کار ہوتی تو نہ معلوم کتنے بہانے ڈھونڈھ لیتی اور دوسروں کے پہلے شاید خود ہی چور چور پکار اٹھتی مگر وہ ایسی کرتی نہیں۔ رئیس صاحب سے نہائی میں اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ آج اتنے دن مجھ کو اُن کے گھر میں آئے ہوئے جو حال ہے آپ سے چھپا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ آبرو پر سے جان قربان کرتی رہی البتہ اس معاملے میں مجھ کو جو رد سیاہی بدی تھی وہ ہوئی اور میں تو کہوں گی کہ اس میں بھی میرا قصور نہیں کیونکہ اٹھتی جوانی کا جو زمانہ تھا اس میں نہ معلوم کتنوں نے میری آبرو لینی چاہی مگر میرا پاؤں نہ ڈگا۔ اب آدھی عمر گذر چکی تب لکھا پورا ہوا اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب میں نے اس مرد کو دیکھا تو میری حالت ہی بدل جانے لگی۔ ادھر اس کا سامنا ہوا اور اُدھر میرا دل دھڑکنے لگا اور سر سے پاؤں تک تھرتھری سی پڑ گئی۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہو گئی زبان سے نہیں نکلنا مشکل ہو گیا۔ دل میرا آبرو جانے پر رو دیا کیا مگر ہونٹھ بلا اختیاری میں مسکراتے رہ گئے میں اُس کو نہ تب چاہتی تھی نہ اب چاہتی ہوں۔ اب چاہے سر منڈوا کر اور منہ میں کالک لگا کر گدھے پر سوار کیجئے چاہے اجازت دیجئے کہ کچھ کھا کر سو رہوں اسی کے ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ اگر میں مرگئی تو پھر اُن کی (دائم خاں کی) کون خبر لے گا۔

جو ہی خانم کا ڈھونڈھے کی محبت سے انکار۔ ممکن ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ محبت سے انکار عورت اپنا فطرتی حربہ سمجھتی ہے۔ ممکن ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ دائم خاں سے شادی کے بعد وہ سمجھنے لگی ہو کہ عورت کا جنسی حق اور مرد پر جان دے دینے کی صفت قسام ازل کے یہاں سے اُس کو ملی ہی نہیں ہے۔ رہی دائم خاں سے محبت وہ کوئی بلند چیز رہی ہو یا ہندوستانی رسُوم کی گنگا میں پھسل پڑنے کے بعد صرف ہر گنگا رہی ہو اس میں کلام نہیں کہ ان میاں بیوی کا تعلق وہ تعلق نہ تھا۔ جو عورت اور مرد کی محبت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رئیس صاحب پڑھے لکھے نیک دل آدمی تھے یہ بیان اس صفائی سے سُن کر دنگ رہ گئے اور بجائے نفرت کے عبرت سی ہوئی۔ میاں دائم خاں مسجد سے واپس ہوئے انہوں نے ہاں ناں کچھ نہ کہا۔ اور بیوی کو ساتھ لئے گھر چلے آئے وہاں پہنچ کر کہنے لگے۔ سب کے سب سالے ہماری آبرو لینے پر لگے ہیں مگر تم کچھ پروا نہ کرو لو مسجد سے یہ مٹھائی تمہارے لئے لائے ہیں کھا لو تمہارا سحر گہی کا دودھ لا کر طاق پر رکھ دیا تھا تب مسجد گئے تھے دیکھنا بلی تو نہیں پی گئی۔

لیجئے صاحب قصہ ختم ہو گیا۔ میاں دائم خاں کے رقیب صاحب دوسرے دن غائب ہو گئے۔ دائم خاں کی بیوی کا کچھ خطرہ سا ٹل گیا اور تب ہی سے کچھ بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگیں مگر اس حالت میں بھی میاں بیوی ایک دوسرے پر فدا ہی رہے بلکہ کچھ ایک دوسرے کا سہارا اور زیادہ ڈھونڈھنے لگے۔

(چودھری) محمد علی

چشمِ منتظر

دن بیت چکا ہے، مہرِ حسیں پنہاں ہے شفق کے پردے میں
ہر شے گم ہوتی جاتی ہے سایوں کے عمیق دھندلکے میں
یہ وقت ہے دریا کی جانب تنِ تنہا گھر سے نکل جاؤں
اور اپنی رنگیں بانی سے وہ سوز کے شعلے برساؤں
جو چرخ کی نیلی نیلی سی بے پایاں گہری وسعت میں
تھرانے لگیں جگمگ جگمگ کرتے انجم کی صورت میں
مخمور ہے شام کی نرم ہوا کوئل کی نوائے شیریں سے
صد چاک ہے سینۂ خاموشی پانی کے ترانۂ غمگیں سے
آوارہ ہیں بھینی بھینی سی خوشبوئیں سُرفضاؤں میں
پنچھی چپ بیٹھے ہیں اُلجھی شاخوں کی گمبھیر گپھاؤں میں
اِس کوچۂ تنگ و تنہا کی تاریکی بڑھتی جاتی ہے
اور لمحہ بہ لمحہ نسیمِ شبی کچھ زور پکڑتی جاتی ہے
معلوم نہیں واپس گھر کو میں جا کر آؤں گا کہ نہیں
ڈر ہے کہ اچانک راستے میں مجھ کو نہ کوئی مل جائے کہیں
ممکن ہے مجھے کچھ ان جانی ان دیکھی روحیں تاروں سے
رہ رہ کے بلانے لگیں اپنی جانب انجان اشاروں سے
سونی پگڈنڈی کے موڑ پہ اوٹ میں جھاڑی کے وہ کھڑی ہوگی
اپنی گھبرائی نگاہوں سے میرا رستہ دیکھ رہی ہوگی۔

تخت سنگھ

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

لیکن ہر شخص کو اچھی اور بری کتابوں میں تمیز کا موقعہ حاصل نہیں۔ خصوصاً آج کل کے تیز رفتار زمانے میں جب کہ ہر بری چیز اپنا ظاہری دلکش لباس پہنے نگاہوں کو دھوکا دینے کے لئے ہر طرف موجود رہتی ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لئے سکون اور وقت کی ضرورت ہے ان وجوہات کے مدنظر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور عام پبلک کے لئے وقتاً فوقتاً چنی ہوئی کتابوں کی مختلف فہرستیں شائع کی جائیں۔ اس انتخاب کی ضمانت صلاح الدین احمد اور میرا جی مدیران ادبی دنیا کا نام ہے۔ انہوں نے نہایت محنت اور وقت صرف کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے اور جو بلند نظری اور معیار کی خوبی ادبی دنیا کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے اُسی کا لحاظ ان فہرستوں میں بھی رکھا ہے۔ ناظرین کی آسانی کے لئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں فراہم کر لی گئی ہیں تاکہ ایک ہی جگہ سے بغیر کسی وقت کے آپ کو یہ چنی ہوئی کتابیں مل سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہر باذوق ناظرین ان فہرستوں کا مطالعہ کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت
افسانے		ساز فطرت حسن عزیز جاوید	۱؍	بیسنا حکیم احمد شجاع	۱۲ر
فردوس خیال منشی پریم چند	۱؍	محبت اور نفرت اختر حسین رائے پوری	۱؍	ہملٹ مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	عہ
پریم پچیسی اول و دوم ″	۱؍	ہیبت ناک افسانے امتیاز علی تاج	۱؍	فاوسٹ گوئٹے	۱؍
نظارے کرشن چندر	عہ	**مزاحیہ**		چند لڑکیاں نور الٰہی محمد عمر	۸ر
منٹو کے افسانے سعادت حسن منٹو	۱؍	پطرس کے مضامین احمد شاہ بخاری	۱؍	چند ڈرامے ″	۸ر
سحر فرانس طاہر قریشی	۱؍	حاجی لق لق کے افسانے حاجی لق لق	۱۱ر	**منظومات**	
دانہ و دام راجندر سنگھ بیدی	۱؍	مطائبات سندباد جہازی	عہ	بانگ درا اقبال	۱؍
ہاسی پھول سید علی عباس حسینی	۱؍	جدید جغرافیہ پنجاب ″	عہ	نغمۂ حرم اختر شیرانی	۱؍
شعلے پروفیسر احمد علی ایم اے	″	دنیائے تبسم شوکت تھانوی	۱؍	نقش و نگار جوش ملیح آبادی	۱؍
سوز ناتمام عاشق حسین بٹالوی	۱؍	مضامین فلک پیما فلک پیما	۶	فکر و نشاط ″	عہ
چغتائی کے افسانے مرزا عظیم بیگ چغتائی	ے	روح لطافت مرزا عظیم بیگ چغتائی	۱؍	بہارستان مولانا ظفر علی خاں	للعہ
صنوبر کے سائے حجاب امتیاز علی	عہ	روح ظرافت ″	۱؍	سوز و ساز حفیظ جالندھری	۶
میری ناتمام محبت ″	۱؍	کولتار ″	۶	نغمہ زار ″	۱؍
طلسم خیال کرشن چندر	۱؍	**ڈرامے**		گیت مالا	۲ر
اندھی دنیا اختر انصاری	″	انارکلی امتیاز علی تاج	۲؍	آتش خاموش احسان دانش	۱؍
ڈاچی اپندر ناتھ اشک	۱؍	ریڈیو ڈرامے فضل حق قریشی	عہ	چراغاں ″	۶ر
پس پردہ چندر بھوشن سنگھ	۱۲ر	منتوش حکیم احمد شجاع	″	نقش دوام عبد الحمید عدم	۶

مینجر کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

ہمارے گھریلو گیت

دنیا کی ہر قوم کے پاس ایک خزانہ ایسے ادب کا ملتا ہے جو نسلاً بعد نسل سینہ بسینہ محفوظ رہتا چلا آیا ہے۔ اس ادب کی یعنی Folk-lore کی دوسرے ملکوں کے رہنے والوں نے تو خوب قدر کی لیکن ہمارے یہاں یہ ذخیرہ یوں ہی خاک میں مل رہا ہے۔ یوں تو پرانے ادب میں قصے۔ کہانیاں۔ کہاوتیں۔ گیت۔ پہیلیاں۔ ٹونے ٹوٹکے سبھی کچھ آ جاتے ہیں لیکن ایک خاص چیز ہے۔ لوریاں اور بچوں کے بول۔ جن کو انگریزی میں Nursery Rhymes کہا جاتا ہے۔ یہ وہ میٹھے میٹھے بول ہوتے ہیں کہ جن کو ماں بچے کو بہلاتے اور سلاتے وقت سناتی ہے اور زبان کھلنے پر جن کو بچہ اپنی ٹوٹی پھوٹی طرز میں ادا کرنا سیکھتا ہے۔

ہمارے یہاں بدیشی تمدن نے آن کر مردوں کو تو نقلی صاحب بنا دیا۔ لیکن عورتوں کو کہیں کا بھی نہ رکھا۔ چنانچہ آج اگر آپ کسی کم سن ماں سے پوچھیں کہ بچوں سے کھیلتے وقت وہ انہیں کیا سکھاتی ہے تو یا تو وہ حیرت سے آپ کا منہ دیکھ کر کہہ دیں گی "کچھ بھی نہیں" یا شرما کر بتائیں گی کہ سلاتے وقت آ جا ری نندیا گا دیتی ہیں۔ بچوں سے معلوم کیجئے تو وہ بہت باتمیز ہوئے تو انگریزی کے "جیک اینڈ جل" وغیرہ آپ کو سنا دیں گے لیکن اس کے معنی مطلب سے ان کو واسطہ نہ ہوگا۔ یا اگر مذہبی گھرانے کے نونہال ہوئے تو اقبال کا ترانہ یا حفیظ کے کچھ اشعار ان کو یاد ہوں گے۔ ورنہ بہت شوقین ہوئے تو نیو تھیئٹرز کی "بن کی چڑیا"[*] ان کو آتا ہوگا!

لیکن ہمارے پرانے تمدن کی نشانی ابھی مٹی نہیں ہے۔ کالج کی پڑھی ماؤں کو چھوڑیئے اور دادی اماں اور نانی جان کے پاس جائیے۔ کیسے میٹھے میٹھے بول اور اچھوتے فقرے آپ کو وہ سنائیں گی کہ بچپن کی سہانی تصویر آنکھوں میں پھر جائے گی۔ یہ بول دو دو چار چار بند کے ہوں گے۔ زبان بھی بالکل سہل ہوگی اور گو وزن اور قافیہ کچھ انوکھا ہو لیکن اس راگ کا ترنم ان میں ضرور ہوگا جس کی دھن پر بچے کی زندگی بنتی ہے۔

بچوں کو تو جانے دیجئے۔ بزرگوں کے لئے بھی ان فقروں میں بہت دلچسپی کا سامان بھرا ہوا ہے۔ یہ بول ہمیں اپنے بڑے بوڑھوں کی زندگی۔ بول چال۔ رسم و رواج آپس میں برتاؤ اور سماج کے مختلف پہلوؤں کے سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر لیجئے:۔

"میاں آویں دوروں سے
گھوڑا باندھوں کھجوروں سے
میاں آویں گلی گلی
پھول بکھیروں گلی گلی
میاں آویں دور سے
پاؤں جھاڑوں منقول سے"

ماں کی مامتا کی کیسی سادی اور سچی تصویر ہے۔ بیٹا بڑا ہوگا پردیس جائے گا اور ماں کی آنکھیں اس کے انتظار میں دروازے پر لگی ہوں گی اس کی دعا ہوگی کہ بچہ خیر و عافیت سے پلٹے اور اس کو ارمان ہوگا کہ بیٹے کے آنے پر پھول بکھیرے گلی گلی:

یا دوسرا بول دیکھئے۔ سادے اور گھریلو الفاظ ہیں لیکن ایک ایک لفظ نے محبت کرنے والی ماں کے دل کی کیفیت ظاہر کی ہے۔

چوموں تیرا ماتھا۔ دکھ اور درد سب جاتا
بنے پھر بھی چوموں گی
چوموں تیری آنکھیں نیری ماں ٹوپی ٹانکیں
بنے پھر بھی چوموں گی

[*] بن کی چڑیا والا گانا سیٹھ مایکر نے ایک فلم میں تھا البتہ نیو تھیئٹرز کے ایک فلم پریزیڈنٹ میں بھی بچوں کی دلچسپی کا ایک گیت تھا جس کے پہلے بول تھے "اک بنگلہ بنے نیارا" (ادارہ)

چوموں تیرے ہاتھ۔ تیرے پاؤں دلشاد
بنتے پھر بھی چوموں گی
چوموں تیری ایڑی۔ تو کھیل سونے کی گڑیا
بنے پھر بھی چوموں گی

اتنا ہی نہیں کہ ان بولوں سے ماں کی ممتا کی جھلک نظر آئے بلکہ یہ بول پرانے رسم و رواج کا اتا پتا دینے میں بھی ہماری مدد کرتے ہیں جیسے کہ اوپر والے بول ہیں تو کھیل سونے کی گڑیا۔ یہ سن کر بچہ خواہ مخواہ پوچھے گا کہ گڑیا کیا چیز ہوتی اور اس طرح اس کو معلوم ہو سکے گا کہ ناک سیکھنے سے پہلے بچے لکڑی کی گڑیوں سے کھیلتے تھے۔ یا دوسری مثال لیجیے۔

کودوں دل بھابی کو دوں دل
کودوں کا بھات پکے گا۔
میری بھابی کا لکن پکے گا۔
تو بول بھابی بھت
ستھورا مانگوں تجھ سے
ستھورے میں کی رائی
جیویں تیرے باپ اور بھائی

کودوں ایسا اناج ہے جس کا نام شہری بچے بھول گئے ہیں لیکن دیہات میں اب بھی اس کا بھات کھایا جاتا ہے۔ بھابی اب چاہے لکن نہ پہنتی ہوں لیکن پرانی تصویروں میں جہاں اور زیور ہوں گے وہاں یہ بھی چمک رہا ہوگا۔ اسی طرح رائی پڑا ستھورا بھی معلوم ہو گیا کہ بچے اس زمانے میں شوق سے مانگ مانگ کر کھایا کرتے تھے جبکہ (TOFFee) ٹافی اور چاکلیٹ کا مزہ نہیں معلوم تھا۔ اور دیکھئے۔

گھو مر گھو مر دودھ بلوئے
جاٹنی کا چھورا روئے
روتا ہے تو رونے دو
موکو دودھ بلونے دو

شاید آج بھی پنجاب کے گاؤں میں اس نظم کی زندہ مثال نظر آجائے گی گو شہروں میں نہ ملے۔

ایک اور بڑا فائدہ جو ان بولوں سے ہوتا ہے وہ یہ کہ بچوں کو مختلف نام سیکھنے میں مدد ملتی ہے بچپن میں نام ہوتا ہی ہے انوکھی چیز گھر کی چیزوں کے نام سیکھ کر بچہ جانوروں کے اور پرندوں کے نام پوچھتا ہے۔ پھر ذرا بڑا ہو کر وہ نئی نئی جگہوں کے نام سن کر گھنٹوں ان پر غور کرتا ہے کس کو یاد نہیں کہ بچپن میں مصر اور سمرقند۔ بندھیاچل اور مانسرور کے ناموں میں کیسا طلسم بھرا تھا جس کو اسکول کے بھونڈے نقشے بھی بعد کو مٹانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ دادی یا ماں ننھے کو وہ طلسمی دنیائیں دکھاتی ہیں۔

آگرہ ملتان صدقے
سارا ہندوستان صدقے
کابل اور قندھار صدقے
لونڈی کا گھر بار صدقے
میں جاؤں صدقے تیرے
تیری ساس صدقے میرے

ساتھ ہی سمجھنے والے یہ بھی سمجھ گئے کہ اس گیت کا واسطہ اس زمانے سے ہے جب کہ اکبر کی حکومت تھی اور سارا ہندوستان اور کابل اور قندھار تک ایک سلسلے میں بندھا تھا یا دوسرا گیت ہے۔

ہم ننھی ننھی بیٹیاں
تال کھودے کنیاں
تال نے ماری لات
میں جا پڑی گجرات
گجرات کی بوی موٹی
وہ کھائے چنے کی روٹی

یا ایک اور لمبی نظم کا حصہ ہے۔

بڑے گڑو کی چھپن چھری
بل بل کانپے ہین پوری
ہین پوری کے آئے امیر
کھائے گڑ و ندا مارے تیر
ماروں گا سبلے ماروں گا
جا دلی پکاروں گا
دلی ہے دو کالے کوس
وہاں پڑی ڈھلم کی چوٹ
ڈھلم ڈھیل مجیرا باجے
ہاتھی چھوڑ ملک کو بھاگے

ظاہر ہے کہ یہ بن پورسی کے کسی امیر کا قصہ ہے جو کہ دلی کے بادشاہ کے پاس فریاد کرنے گئے تھے۔ لیکن جب وہاں پر الٹی اُن کی آفت آئی تو اپنی فوج اور ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر ملک کو بھاگ گئے۔

آپ نے دیکھا کہ ظاہر میں اٹل بے جوڑ چیز بھی غور کرنے پر با معنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہمارے یہاں تو بھلا کا ہے کو اتنی توفیق ہوتی لیکن دوسرے ملکوں میں تو ماہروں نے یہی بچوں کی NURSERY RHYMES کو لے کر ان کی تحقیق کی ہے اور یہ معلوم کیا ہے کہ ہر گیت کب بنا۔ کیوں بنا اور کہاں کہاں پھیلا اور اس کو پھیلانے والے کون لوگ تھے اور اس طرح قوموں کی اور زبانوں کی تاریخ کی چھان بین میں مدد لی ہے۔

اتنا تو ہمارے یہاں بھی ہوا ہے کہ امیر خسرو کی کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں اردو زبان کی بنیادی حالت کی تصدیق کرنے کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ لیکن اگر ہم ان بچوں کے بولوں کو گہری نظر سے دیکھیں تو ہم زبان کے مسئلہ اور اردو زبان کی اولیں حالت پر بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً

ننھی ننھی کلھیوں میں چھنک بھنگار وں۔
لونگوں کا دے دوں دھونگار
راجہ کے جائے رانی کہلائے۔

چیری کا جایا غلام۔
گھوڑی کا جایا الل بچھیرا۔
جگ میں کھیلے چوگان

اُس میں کلھیوں یعنی چھوٹے چھوٹے گول برتن اور دھونگار دل یعنی دھوئیں سے بساؤں کے الفاظ یوپی میں اب بھی بولے جاتے ہیں کسی زمانے میں عام استعمال ہوں گے۔ چیری یعنی باندی کا جایا یعنی بیٹا شاید ہر ایک نہ سمجھے۔ اور چوگان یعنی پولو کا لفظ تو اب سمجھنے والے بہت ہی کم ہوں گے۔ لیکن آپ نے دیکھا حالانکہ چوگان خالص فارسی لفظ ہے لیکن اس کے ساتھ جگ اور بچھیرا ہندی کے لفظ بھی اس زمانے میں ملنے لگے تھے جب یہاں کے رئیس چوگان کھیلتے تھے۔

باوا تیرا ہفت ہزاری
دادا صوبہ دار
اماں تیری سدا سہاگن
بچے برخوردار[1]

ظاہر ہے کہ یہ بول اس وقت بنا ہوگا جب ہفت ہزاری۔ پنج ہزاری وغیرہ عہدے یہاں رائج ہوں گے یعنی مغلوں کے زمانے میں لیکن چونکہ مغل ہندو بیویاں بیاہ کر لاتے تھے اس لئے ماں کے منہ سے اپنے لئے سہاگن کا ہی لفظ نکلا۔

ان پرانی چیزوں میں آپ ہندو اور مسلم فرق کہاں پائیں گے کیونکہ وہ تو اس زمانے کی یاد ہیں جب کہ یہ سوال ہی مرٹ چلا تھا۔ کنہیا کرشن کا نام ہے۔ لیکن سب بچے جس وقت کاندھے پر ڈنڈا رکھ کر ڈولی ڈولی کھیلتے تھے تو کہتے تھے۔

"ننھی گھوڑا پالکی
جے کنہیا لال کی"

یا جس وقت بارش نہ ہوتی تھی اور ابر آتا تھا تو کود کود کر چلاتے تھے۔

"برسو رام دھڑا کے سے
بڑھیا مر گئی فاقے سے"

آخر میں ایک التماس ان لوگوں سے ہے جو اس فکر میں رہتے ہیں کہ عام فہم زبان کیا ہے۔ ہندوستانی کسے کہتے ہیں اور جنتا کس زبان کو سمجھتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ بچوں کی ان چیزوں کو دیکھئے۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں صدیوں سے اسی لئے محفوظ رہیں کہ عام فہم تھیں۔ دور دور پھیلیں کہ جنتا کی زبان میں تھیں۔ ہر دل عزیز ہوئیں کیونکہ اس ملک کی چیز تھیں اور اس ملک کے رہنے بسنے والوں کی روز مرہ کا صحیح آئینہ تھیں۔ کیا آدھے ہندوستان کو پیارے یہ بول سچے طور پر "ہندوستانی" نہیں ہیں کہ۔

"چندا ماموں دور کے | بڑے پکائیں بور کے
آپ کھائیں تھالی میں | ہمیں دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ | چندا ماموں گئے روٹھ
پیالی اور لائے | چندا ماموں دوڑ آئے"

یا نیند کی وہ میٹھی آواز جس نے ہندوستان کے کونے کونے میں لاکھوں بچوں کو سلایا ہے۔ ہمارے لکھنے والوں کے لئے ایک نمونہ نہیں؟۔

آ جا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا | میرے بالے کی انکھوں میں گھل مل جا
آتی ہوں بیری میں آتی ہوں | دو چار بالے سلاتی ہوں

ہاجرہ بیگم

[1] اس سے انگریزی کی ایک نرسری رائم یاد آئی :— O! hush Thee MY BABY THY FATHER WAS A KNIGHT THY MOTHER A LADY BOTH LOVELY And BRIGHT [illegible]

ایک غزل اور ایک نظم

شملہ

چوٹیوں پر کوہ کی فرشِ حریرو پرنیاں
جامۂ اہلِ وطن کی اُڑ رہی ہیں دھجیاں !
برق کی رو سے یہاں ہر ذرّہ ہے کیواں دماغ
گاؤں میں بے تیل ہیں مُدّت سے مٹی کے چراغ
ہر چڑھائی جاں گُسل کر اہلِ سپاہی کے لئے
کون بدبخت آئے گا یاں دادخواہی کے لئے!
روحِ ہمدردی یہاں پھرتی ہے گھبرائی ہوئی
ہر مکاں پر ہے سراپا بے حسی چھائی ہوئی
زندگی کی موج اُٹھے کس طرح دل سرد ہیں
اِس زمیں پر اہلِ ہمّت ہیں نہ اہلِ درد ہیں
یاں سکوتِ قبر ہے کوئی جئے کوئی مرے
جس طرف دیکھو کھڑے ہیں مقبرے ہی مقبرے!
یہ طلسمِ سامری بے اصل و بے بُنیاد ہے۔
یہ بھی اک جنّت ہے، لیکن جنّتِ شدّاد ہے۔

سکندر علی وجد

غزل

یارب کبھی تسکینِ دلِ زار بھی ہوگی،
تدبیرِ گراں جانئ بیمار بھی ہوگی؟
ہونے کو ترے جلوۂ انوار میں مدغم
اصرار بھی ہوگا! کششِ دار بھی ہوگی!
اقرار ہو جب تجھ کو مرے جوشِ جنوں کا
اُس وقت تجھے صورتِ انکار بھی ہوگی!
ساقی نے کیا سحرِ عجب جلوہ گری سے
محفل میں کوئی آنکھ تو ہشیار بھی ہوگی!
کیوں کس لئے بیتے ہوئے دن یاد دلائے؟
اس یاد سے تسکینِ دلِ افگار بھی ہوگی؟
معلوم نہ تھی شادئِ خاطر کی حقیقت
یہ دشمنِ جاں دشمنِ افکار بھی ہوگی.

نذیر مرغوب

غم نصیب

عمر کے لحاظ سے تینتیس سال کا نوجوان لیکن افکار و تردّدات کے اعتبار سے ساٹھ سال کا بوڑھا! بظاہر خوش حال اور فارغ البال لیکن در اصل نہایت غمزدہ اور دردمند!

وہ اپنی المناک زندگی کو بہلانے کے لئے کبھی کبھی سینما چلا جاتا ہے!

"کیا سینما گئے تھے؟ کیسا کھیل تھا؟"

سینما سے واپسی پر اپنی ماں سے کھیل کے متعلق باتیں کرنا اور اُس کے دیکھنے یا نہ دیکھنے کی بابت مشورہ دینا اُس کا دستور ہے لیکن اس دن وہ سینما سے واپس آیا تو بالکل خاموش تھا ــــ اپنے بے پایاں غم کی سوگوار فضا میں کھویا ہوا! مجبور ہو کر خود ماں نے باتوں کا سلسلہ شروع کیا۔

"کیا سینما گئے تھے؟ کیسا کھیل تھا؟"

"کچھ نہیں امّاں! ــــ بالکل فضول اور مہمل!"

"کس کمپنی کا تھا؟" ماں نے سوال کیا۔

"فلم بنانے والے بھی بالکل گدھے ہوتے ہیں۔ ذرا بھی تو شعور نہیں ہوتا اُن کو! ایسی بے تکی باتیں اسکرین پر دکھاتے ہیں کہ گالیاں دینے کو جی چاہتا ہے۔ یعنی اب جو بھی اندھا پیش کریں گے اُس کو بعد میں آنکھیں ضرور مل جائیں گی۔ یہ ان کے نزدیک زندگی کی ترجمانی ہے۔۔۔۔"

ماں نے اپنے مطالعے کی بنا پر بات کاٹ کر کہا "ویسی ہی کہانی ہوگی جیسی اُس کتاب میں پڑھی تھی۔ کیا نام تھا اُس کا۔۔۔۔"

"اب اس میں ایک اندھی عورت ہے اور ایک اندھا مرد۔ دونوں کی آنکھوں کا اپریشن ہوتا ہے اور بینائی واپس آجاتی ہے۔ لاحول ولاقوۃ! کیسی مہمل بات ہے! ہم نے تو دیکھا نہیں کسی اندھے کو دوبارہ آنکھیں مل گئی ہوں"

"ہاں، نظر کمزور ہو جاتی ہے تو آنکھیں بنوائی جاتی ہیں اور فائدہ بھی ہوتا ہے لیکن کوئی بالکل ہی اندھا ہو تو بھلا اُس کا کیا اپریشن ہوگا!"

"اگر ایسا ہی ہوتا کہ جیسا یہ لوگ فلموں میں دکھاتے ہیں ــــ آپریشن کے ذریعے بینائی مل جایا کرتی ــــ تو ہم بھی انیس کی آنکھوں کا اپریشن کرا لیتے ــــ"

پھر وہی! انیس کی آنکھیں! انیس کی آنکھیں! آخر کب تک انیس کی آنکھوں کا غم کرو گے! تم نے تو اپنی زندگی اجیرن کر لی۔ سینما کا ذکر ہو رہا ہے، اُس میں بھی انیس کی آنکھوں کو لے بیٹھے۔ اس کی آنکھیں جاتی رہیں، خدا کو ایسا ہی منظور تھا۔ اب عمر بھر اُس کا سوگ منانا تو کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے!"

اُس نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی ــــ خاموشی جو در اصل ایک دلیل تھی۔

اُس وقت اُس کے ذہن میں یہ الفاظ گونج رہے تھے:۔

تم کیا جانو امّاں! تم ایک حسّاس اور بدنصیب باپ کے دُکھ کو نہیں جان سکتیں۔ تم ایک عورت ہو، اور عورتیں فطرتاً صابر و شاکر ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی غم پرست عورتیں! وہ غم کو اپنی ہستی کا جزو بنا لیتی ہیں اور اس کو زندگی سمجھ کر ہنسی خوشی برداشت کرتی ہیں۔ وہ غم کو غم ہی نہیں سمجھتیں لیکن ایک باپ جو محبت بھرے دل کے ساتھ ایک فلسفیانہ دماغ بھی رکھتا ہو، تقدیر پرستی کا جذبہ کہاں سے لائے؟ وہ اپنی بیٹی کے دکھ کو کس طرح نظرانداز کرے! اُس کے لئے اِس دنیا میں سکون کہاں ہے امّاں؟۔۔۔"

وہ بے شک ایک فلسفی ہے، اس معنی میں کہ سوچنے سمجھنے اور زندگی کی حقیقتوں پر غور کرنے کا ایک فطری ذوق اُس کی طبیعت میں ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔ وہ ایک قنوطی واقع ہوا ہے، اور اُس کا یہ میلان بھی بالکل پیدائشی ہے چنانچہ اُس کا بچپن دوسروں کے بچپن کی طرح بےفکری اور بے پروائی کا زمانہ تھا جس عمر میں کہ بچے عام طور پر کھیل کود اور بے معنی ہا و ہو کے سوا کوئی دوسرا شغل نہیں رکھتے

وہ ایک بوڑھے مفکر کی طرح دنیا کو ایک غم کدہ اور زندگی کو ایک مصیبت ناک حادثہ خیال کرتا تھا، اور گھنٹوں دکھی انسانیت کے آلام پر غور کیا کرتا تھا۔ بیماری، پیرانہ سالی اور موت کے روح فرسا مناظر جس طرح راج کمار سدھارتھ کے لئے ہیجان انگیز ثابت ہوئے، اسی طرح اس کے لئے بے اندازہ غم واندوہ کا موجب تھے۔ تاریخ ہند کا وہ صفحہ جس پر گوتم بدھ کے حالات زندگی درج تھے، وہ بار بار پڑھتا تھا اور کبھی سیر نہ ہوتا تھا۔ اُن چند سطروں میں گویا اُس کے اپنے غم کی داستان مرقوم تھی۔

پھر وہ جوان ہوا۔ اس کی جوانی کاونٹ ٹالسٹائے کی جوانی کی طرح بے چین اور غیر مطمئن تھی۔ اُسے کہیں سکون نہ ملتا تھا اور وہ روسی مفکر کی طرح خودکشی کے مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا کرتا تھا۔

جب وہ چودہ سال کی عمر میں انٹرنس کا امتحان پاس کرکے کالج میں داخل ہونے کے لئے گیا تو پرنسپل نے اُس کے داخلے کے فارم پر کھیل کے خانے کو خالی دیکھ کر سوال کیا، "تم کوئی کھیل نہیں کھیلتے؟"

"جی نہیں،" اُس نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ کھیل کود بے مغز انسانوں کا کام ہے، ذہین اور سنجیدہ آدمیوں کا کام نہیں۔"

بوڑھا پروفیسر چونک پڑا۔ اُس نے پھٹی ہوئی نظروں سے اس ذہین اور سنجیدہ چھوکرے کو دیکھا۔ وہ خود بھی فلسفے کا عالم تھا اور کھیل کی نفسیات پر بڑے بڑے ماہرین علم النفس کی تصانیف کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اس کے نزدیک کھیل کے متعلق اس لڑکے کا خیال جراءت آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ غلط اور مہمل بھی تھا۔ مگر آہ! وہ بوڑھا عالم جس کی فلسفیانہ علمیت کتابوں کی مرہون منت تھی، اُس لڑکے کے احساس کو کیا جان سکتا تھا جس کے قلب و جگر میں سارے جہان کا درد سمایا ہوا تھا اور جو زندگی کو انسانیت کی ایک دلدوز کراہ خیال کرتا تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی، اور انیس سال کی عمر میں وہ ایک بچی کا باپ بن گیا۔ لیکن ایک خوبصورت بیوی اور ایک پھول سی لڑکی کی محبت بھی اُس کو دردِ دل اور دردِ زندگی سے غافل نہ کرسکی، اور اُس کے دماغ کو سکون کی نیند نہ سُلا سکی۔ وہ بدستور بے چین اور دردمند رہا، اور پھر جب اُس کی بچی دو سال کی عمر میں اندھی ہوگئی اور بیوی عین اٹھتی جوانی میں داغِ مفارقت دے کر راہی ملکِ عدم ہوگئی تو وہ جیتے جی موت کے منہ میں

چلا گیا۔ اُس کی اُمید کی کشتی جو شکستہ بھی تھی اور نازک بھی، اس طوفان کے تھپیڑے برداشت نہ کرسکی اور پاش پاش ہوکر غرق ہوگئی۔

وہ یاس اور نامرادی کی آخری سرحد پر پہنچ گیا۔ اور اس عالم میں ایک دکھ بھری آواز اُس کے دل سے نکلی:۔

"میرے معبود! کیا سینے کے اندر ایک حساس اور دردمند دل رکھنا کوئی جرم ہے جس کی سزا ہولناک مصائب کی شکل میں دی جاتی ہے! یا دل کا ذکی الحس ہونا بذاتِ خود کوئی ایسی چیز ہے جو آفات وآلام کی دعوت دیتی ہو؟ بارِ الہا! میری زندگی یوں ہی کیا کم ستم آلام اور مصیبت ناک تھی کہ اُس میں ان بھیانک غموں کا اضافہ ضروری خیال کیا گیا؟ تیری حکمت کس قدر ناقابلِ فہم ہے میرے معبود!"

اس زمانے میں اگر کوئی چیز اُس کو خودکشی کے اقدام سے باز رکھ سکی تو وہ دو سال کی معصوم بچی تھی جو گویا اس دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی آنکھوں سے محروم ہوگئی تھی، جو اپنے سفر کی پہلی ہی منزل میں اپنا زادِ راہ کھو بیٹھی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کی تاریکی میں ملفوف، خاموش اور حیران بیٹھی رہا کرتی اور نطق کی بجائے (کہ وہ اُس کے پاس نہ تھی) اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس تاریکی کو چیرنے کی کوشش کیا کرتی۔ اُس کا بدنصیب باپ جب اُسے اس حالت میں دیکھتا تو اُس کا جی چاہتا کہ خود بھی اپنی آنکھیں پھوڑ لے۔ "میرے اللہ!" وہ خدا سے فریاد کرتا۔ "یہ تو دوہری سزا ہے، اور دوہرا عذاب ہے۔ اگر تیرے کرم سے بھی میں بھی اندھا ہو جاتا تو کم از کم ان آنکھوں سے اس بچی کی تکلیف کو تو نہ دیکھ سکتا!" پھر وہ محبت کے ایک بے اختیار جذبے سے مغلوب ہوکر لڑکی کو گود میں اٹھا لیتا، بھینچ بھینچ کر اُس کو پیار کرتا، اور بالکل بے ضرورت اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا جیسی کہ عام طور پر بچوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔

اس طرح اُس کی محبت بچی کے ساتھ شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی اور بہت جلد دیوانگی کی حد کو پہنچ گئی۔ اس کا جذبۂ دل سوزی وہمدردی جو کل انسانیت کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا، اب صرف ایک بچی کے لئے وقف ہوکر رہ گیا۔ عالمِ انسانی سمٹ کر ایک ننھا سا وجود بن گیا، اور اس ننھے سے وجود نے اُس کی بے کراں محبت پر قبضہ کر لیا۔ اب وہ اکثر اپنے دل میں سوچتا، "یوں تو دنیا میں شاید ہی کوئی بدبخت باپ ہو جو اپنی اولاد کے ساتھ محبت نہ رکھتا ہو، لیکن کیا کوئی ایسا باپ بھی ہوگا جو اپنی بیٹی سے اس حد تک محبت کرتا ہو جس حد تک کہ میں کرتا ہوں؟ یہ بے اندازہ اور بے پایاں محبت جو میرے دل میں اُس کے لئے ہے، قدرت کا ایک عطیہ ہے، اور قدرت کا یہ عطیہ

یقیناً ایسے والدین کو بہت کم ارزانی ہوتا ہے جن کی بیٹیاں میری بیٹی کی طرح بے بصر نہیں ہوتیں۔ لاریب قدرت نے میرے حالِ زار پر ترس کھایا اور میرے ناقابلِ تلافی نقصان کی تلافی کر دی۔“

تھوڑی سی مدت میں اُس کا اندازِ نظر کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اُس کے ذہنی اُفق پر ایک نئی روشنی نمودار ہوئی۔ یاس کی گہرائیوں سے سکون و اطمینان کا سوتا پھوٹا، قنوطیت کے بطن سے رجائیت نے جنم لیا، اور نامرادی کی انتہا سے مراد مندی کا آغاز ہوا۔ وہ دنیا کے سارے غموں کو بھلا کر بیٹی کی محبت میں سرشار ہو گیا، اور اس محبت کی بنیادوں پہ تصورات کے محل اور ارمانوں کی جنتیں تعمیر کرنے لگا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا "یہ بچی گو بے بصر ہے، پھر بھی میری روح کا اجالا ہے۔ یہ میری زندگی کی تاریکیوں میں ماہتاب کی ضیا بن کر آئی ہے۔ میں اس کو اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا! میں اس کی قدر کروں گا! میری دولت جو اب تک بے مصرف رہی ہے اس کے لئے راحت اور آرام مہیا کرے گی۔ یہ اچھے سے اچھا کھائے گی عمدہ سے عمدہ پہنے گی۔ خادمائیں ہر وقت اس کے حکم کی منتظر رہا کریں گی اور اس طرح خدمت بجا لائیں گی کہ اس کو اپنی بے بصری کا ذرا بھی احساس نہ ہوگا۔ اس کی دنیا بے شک تاریک ہے۔ لیکن میں اس تاریکی کو اپنی تابناک محبت کے ذریعے روشنی اور نور میں تبدیل کر دوں گا!"

اور در اصل اُس نے ایسا ہی کیا۔ لڑکی کی محبت اور خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اُس کی زندگی جو مقصد سے خالی ہونے کے باعث بے لطف اور بے کیف تھی، لطفِ مقصد اور کیفِ مدعا سے لبریز ہو گئی۔ اُس کے ارمانوں کی دنیا جو ایک بے آب و گیاہ میدان کی طرح ویران، اُجاڑ اور سنسان تھی ایک ہرے بھرے باغ کی مانند جگمگا اٹھی۔ اُس کے دل میں جو خلا تھا وہ پُر ہو گیا، وہ دنیا کے غموں کو بھول گیا اور انسانیت کے آلام سے غافل ہو گیا۔

اِس طرح اُس کی زندگی کے بارہ سال گذر گئے۔

اور اب کہ وہ تینتیس سال کی عمر کو پہنچ چکا ہے، اُس کی زندگی پھر کروٹ بدل رہی ہے۔ اس کی حیاتِ معنوی میں ایک نئے انقلاب کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ انیس جوانی کی حدود میں داخل ہو چکی ہے۔ اب وہ دس بارہ سال پہلے کی ننھی بچی نہیں ہے جو اپنے ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتی ہوئی آتی تھی۔ اور ابا ابا کہتی ہوئی باپ کی گود میں چڑھ جاتی تھی۔ جوان ہونے کے ساتھ ساتھ اُس میں ایک حجاب اور نسوانی حیا کا ایک احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اب وہ باپ سے بات کرتے ہوئے بھی شرماتی ہے بلکہ اُس کے سامنے بھی نہیں آتی اور ہمیشہ دور دور رہتی ہے۔

اور باپ یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی دنیا پھر اُجڑ رہی ہے، اور اُس کی تعمیر کی ہوئی جنت جہنم بداماں ہوتی جا رہی ہے۔ وہ حسرت کے ساتھ اُن دنوں کو یاد کرتا ہے۔ جب اُس کی پیاری بیٹی اُس کی گردن میں باہیں ڈال کر گھنٹوں میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتی تھی۔

"ابا جی!" وہ کہا کرتی۔

"ہاں بیٹی!" وہ جواب دیتا۔

"ابا!"

"ہاں بیٹی۔ کہو کیا بات ہے؟ انیس!" اور وہ محبت سے اُس کے گالوں پہ ہاتھ پھیرتا۔

اور وہ کچھ کہے بغیر اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیتی اور اس کے سینے سے چمٹ جاتی۔

وہ اُس کو اپنی آغوش میں بھینچ لیتا اور خوب پیار کرتا۔

پھر جب وہ ذرا اور بڑی ہو گئی تو خوب کھل کر باتیں کرنے لگی۔ وہ اُسے اپنی گود میں اٹھا لیتا اور کہتا۔ "آہا! آج تو انیس نے نئے کپڑے پہنے ہیں۔ کیسی اچھی معلوم ہو رہی ہے ہماری بیٹی!"

اور انیس اپنا ہاتھ اپنے ریشمیں کپڑوں پہ پھیرنے لگتی، اور ایک مسرت بھری مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے پھوٹ کر سارے چہرے پر پھیل جاتی۔

پھر وہ اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا، "ہماری بیٹی کتنی خوبصورت ہے! اور بیٹی کے ماتھے پہ ایک تل ہے!"

"ابا! کس جگہ ہے میرا تل؟" وہ سوال کرتی۔

وہ اپنی انگلی اُس کے تل پر رکھتا۔ ٹھیک اُس جگہ جہاں ہندو سہاگنیں صندل کا قشقہ لگاتی ہیں، اور کہتا "اس جگہ ہے۔ یہ ہے تمہارا تل!"

اور پھر وہ بھی اپنی انگلی اُسی جگہ رکھتی اور لمس کے ذریعے تل کو دیکھنے کی کوشش کرتی۔

"اچھا بتاؤ، ہمارے چہرے پر تل کس جگہ ہے!" وہ اس سے کہتا۔

"میں نے تو آپ کا چہرہ دیکھا ہی نہیں ابا جی!" وہ جواب دیتی۔

"نہیں بیٹی، تم نے میرا چہرہ دیکھا ہے۔ تم بھول گئی ہو۔ جب تم چھوٹی

سی تھیں، ننھی منی سی، تو تم نے مجھے دیکھا تھا —— ہاں —— تم مجھے دور سے پہچان لیتی تھیں۔ اور جب میں بازار سے آتا تھا، تو تم فوراً ابا ابا کہتی ہوئی میری طرف دوڑتی تھیں ——"

وہ یہ سن کر خاموش ہو جاتی، اور ایک معصوم سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچنے لگتی گویا اس بے خبری کے زمانے کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ گویا ایک خواب دیکھ رہی ہے۔ باپ اُس کی پیشانی چوم لیتا اور اس کا خواب ختم ہو جاتا۔

مگر یہ سب باتیں اب قصۂ ماضی بن چکی ہیں اور صرف اُن کی ایک تکلیف دہ یاد اس کے دل میں باقی رہ گئی ہے۔

صرف یہی نہیں کہ اب لڑکی اُس سے دُور دُور رہنے لگی ہے، بلکہ اس دوری اور علیحدگی میں وہ اُداس بھی رہتی ہے اور یہ چیز اُس کے باپ کے لئے سب سے زیادہ اذیت کا باعث ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی گوشے میں خاموش بیٹھی ہوئی ہے۔ اس طرح کہ اس کا چہرہ اُداس ہے اور پیشانی پر غمناک تصوّرات کے نقوش ہیں، تو اُس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ اور دل پر چھریاں سی چلنے لگتی ہیں۔

"یہ کیا سوچ رہی ہے؟" وہ اپنے دل میں کہتا ہے "میری بدقسمت بچی! یہ کن خیالات میں ڈوبی ہوئی ہے میرے معبود! شاید اب اس کو باپ کی محبّت کی ضرورت نہیں، شوہر کی محبّت کی ضرورت ہے میرے اللہ! . . . . ."

وہ محسوس کرتا ہے کہ اب اس سے زیادہ اپنے آپ کو فریب دینا ناممکن ہے۔ یہ دنیا ایک غم کدہ ہے، اور زندگی ایک مصیبت ناک حادثے کے سوا اور کچھ نہیں، اُس کی قنوطیّت پھر اس پر اپنا تسلّط جما رہی ہے۔

وہ رات کو سینما دیکھ کر آتا ہے تو حسرت کے ساتھ سوچتا ہے کہ کاش اس دنیا میں کوئی سبیل ہوتی جس سے کھوئی ہوئی آنکھیں واپس آجایا کرتیں!

اور کبھی کبھی وہ خودکشی کے مسئلے پر بھی غور کیا کرتا ہے۔

بدقسمت باپ اور ناکام فلسفی!

اختر انصاری